
ماہنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ
کراچی
Greeting


ٹوتھ پیسٹ
کا
ٹوتھ پیسٹ
عِلاج کا
علاج
English
MEDIPAC
انگلش
میڈی پیک
نہ مسوڑھوں سے خون نہ ہی
ان میں ورم
MEDIPAC
جادو ہے اس ٹیوب میں
MEDIPAC
Money
Back
Guarantee

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

قارئین کی گرم و نرم، شہد، کچھ ادائیں
ہمدردیاں، محبتوں کے سلسلے۔

لہو لہو بوسنیا کی عریاں تصویر
اس ماہ کی پہلی ناقابلِ فراموش داستان

ایک سادہ دل اور نیک سیرت انسان
کی زندگی کا اہم ترین موڑ۔

دلچسپ اور حیران کن انجام کی کہانی۔
ایک مسکراتی ہوئی تحریر۔

جرائم کے گرد بکھرے ہوئے
کرداروں کی داستان

سیم و زر کی پُر فریب چمک سے
اندھا ہونے کا عبرت اثر واقعہ۔

اُس شخص کی کہانی جسے اپنی
بیوی کے قاتل کی تلاش تھی۔

لہو کے سفاک تاجروں کی دہشت گردی
اور سیاہ کاریوں کا لرزہ خیز قصہ۔

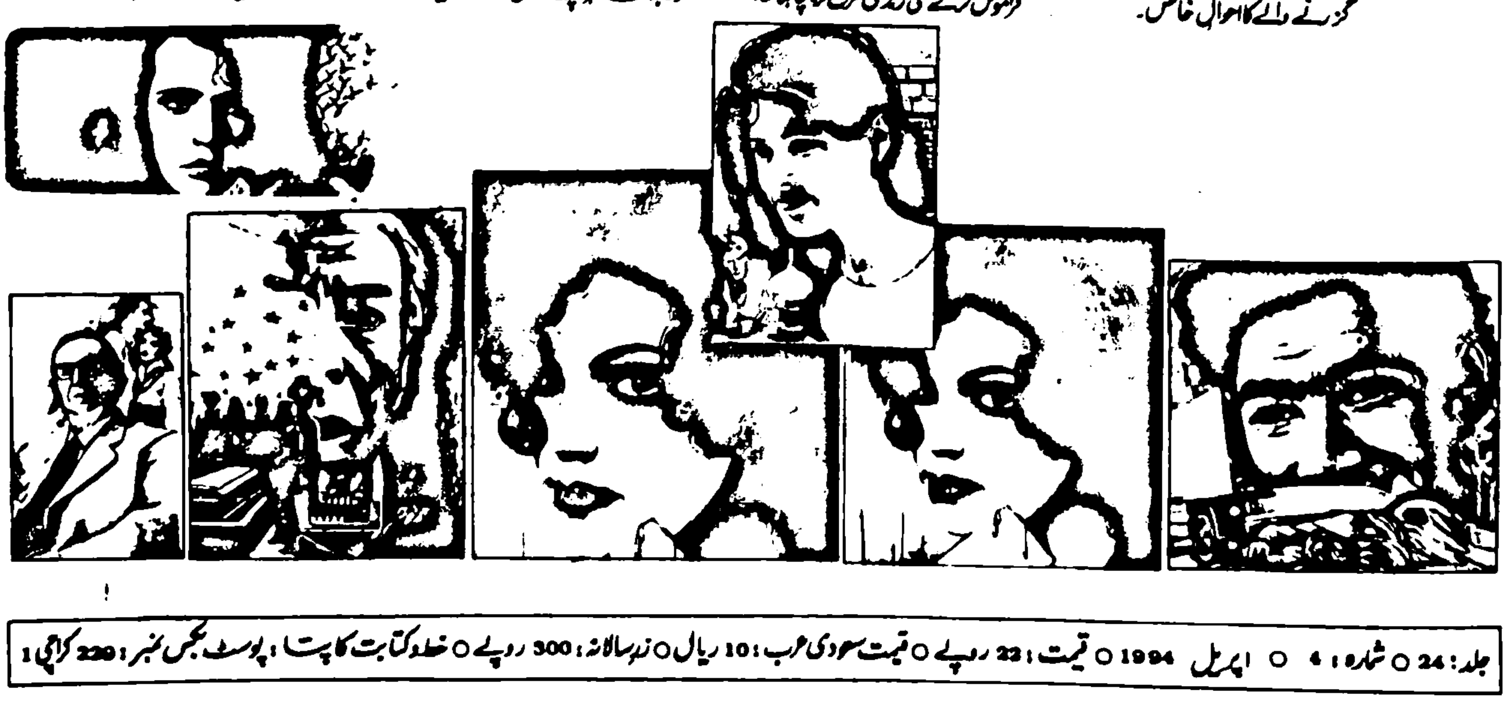


پبلشر: معراج رسول ○ مقام اشاعت: سیم ٹلشن ٹیوٹا اسٹریٹ آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی ○ پرنٹر: ابن حسن ○ مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم، کراچی۔ تار کا پتا: جاسوسی کراچی

مدیر اعلیٰ: معراج رسول

معاون مدیر: اعجاز رسول ○ سید انور فراز

مصور: شاہد حسین



جلد: 24 ○ شمارہ: 4 ○ اپریل 1994 ○ قیمت: 22 روپے ○ قیمت سعودی عرب: 10 ریال ○ زرسالانہ: 300 روپے ○ خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر: 220 کراچی 1

چیں بہ چیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! السلام علیکم۔

عید کے رخصت ہوتے ہی موسم گرم ہوگیا ہے اور یہ گرمی رفتہ رفتہ شدت اختیار کررہی ہے۔ اس سے پہلے کہ سورج سوا نیزے پر آجائے' ہواؤں کے رُخ پہچان لیجیے۔ ابھی تو اپریل کی ابتدا ہے' مئی جون' جولائی بہت دور ہیں۔ ابھی سے حکمت ودانش کا دامن تھام لیا جائے تو بہتر ہوگا ورنہ عین وقت پر تو اکثر تدبیریں اُلٹی ہی پڑتی ہیں۔ بوکھلاہٹ میں انسان غلط کھڑکی کھول بیٹھتا ہے۔ جس سے آنے والے تیز لُو کے جھکڑ گھر بھر کو جھلسا ڈالتے ہیں۔ چنانچہ تمام اچھی بُری سمتوں کا تعین کرکے ابھی سے اطمینان بخش اقدام کرلیے جائیں تاکہ آنے والے موسم کی سختی بعد ازاں ناگوار محسوس نہ ہو۔ ویسے تو ہم لوگ بدلتے موسموں کی چیرہ دستیاں سہنے کے اس قدر عادی ہوچکے ہیں کہ اب کوئی زیادتی' زیادتی محسوس ہی نہیں ہوتی۔ ہرحال میں شکر بجالانا اور ہر صورت میں صبرو برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑے سے بڑے سانحے کو فراموش کردینا ہمارا قومی مزاج بن چکا ہے تو پھر رونا کس بات کا ہے! آیئے نا' اپنی چوپال کی جانب جہاں آپ کی ہی باتیں ہیں' آپ کے ہی خیال ہیں۔

خان عتیق الرحمٰن جلال زئی' لیہ سے اس ماہ پہلے انعام کے مستحق قرار پاتے ہیں' ان کے طویل تبصرے کی جھلکیاں "سب سے پہلے نظر ٹائٹل پر پڑی۔ تھوڑی سی حیرانی ضرور ہوئی کیونکہ اس مرتبہ ایک انوکھے انداز کا ٹائٹل تھا۔ لہو کے تاجر دیکھ کر حیران رہ گیا کہ پروازِ عقاب شاید اس مرتبہ گم ہوگئی ہے مگر خدا کا شکر ہے کہ آگے دیکھنے پر بہت جلد مل گئی اور جب نظر ادا + کار پر پڑی تو اور خوشی ہوئی کیونکہ احمد اقبال ہمارے پسندیدہ رائٹر ہیں۔ فہرست کا اگلا صفحہ پلٹا ہی تھا کہ مرزا غلام کبریا صاحب کی وفات کا پڑھ کر دلی طور پر رنج ہوا۔ خدا انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ چیں بہ چیں میں پرنس اے بی کشمیری کا تبصرہ پڑھا۔ اس تبصرے میں اتنا مزہ نہیں تھا جتنا آپ کے جوابات میں تھا۔ اب سب سے پہلے علیم الحق حقی کی لہو کے تاجر کو شروع کیا۔ علیم الحق حقی نے لہو کے تاجر واقعی بڑے موقعے پر لکھی ہے۔ اس موضوع پر لہو کے تاجر سے زیادہ معیاری کہانی لکھنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ ان کا اندازِ تحریر واقعی انوکھا ہے۔ اس کہانی میں نہ صرف ملک دشمن عناصر پر روشنی ڈالی گئی ہے بلکہ کئی عبرت آموز سبق بھی موجود ہیں۔ جس طرح علیم الحق حقی نے انڈین فلموں کی آڑ میں ہونے والے گھناؤنے کھیل کا پول کھولا ہے وہ نوجوانوں کے دلوں میں انقلاب لانے کے لئے کافی ہے اگر اس کہانی کو پڑھ کر بھی ان کی آنکھیں نہیں کھلیں تو ان کے لئے یہ ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ یہ کہانی جاسوسی کے معیار پر بالکل پوری اُترتی ہے اگر اسی طرح کی اور تعمیری اور معیاری کہانیاں لکھی جائیں تو وہ وقت دور نہیں کہ ہمارا معاشرہ پاکیزہ اور جرائم سے پاک ہوجائے اور آج کا بے راہرو نوجوان سیدھے راستے پر گامزن ہوجائے۔ نجمہ مودی کی خرابی بھی ایک انوکھی طرز کی کہانی ہے۔ نجمہ مودی کی ہر کہانی میں ایک عبرت موجود ہوتی ہے۔ وہ جس طرح مغربی کہانیوں میں کاٹ چھانٹ کرتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں دوسروں کی چیزوں میں سے پسند کی چیز ڈھونڈنے کا فن آتا ہے۔ جس طرح وہ دوسروں کی کہانیوں میں انوکھا پن ڈھونڈتی ہیں لگتا ہے کہ ان کی زندگی میں بھی ضرور کوئی انوکھا پن ہوگا۔ (محمود احمد مودی صاحب جلوہ افروز ہیں) خرابی میں کیرول کا جو کردار دکھایا گیا ہے وہ عام ہے۔ چوری چھپے کسی کی باتیں سُننا یا کسی کی ٹوہ میں لگے رہنا' کسی بھی مذہب میں جائز نہیں۔ معاہدہ بھی اچھی رہی۔ مغرب تو ویسے ہی بُرائیوں کا گڑھ ہے۔ دنیا جہان کے تمام جرائم مغرب کی تہذیب میں موجود ہیں مگر معاہدہ میں جس طرح میاں بیوی دونوں کی مشترکہ بے وفائی پیش کی گئی ہے وہ واقعی عبرت آموز ہے۔ اس کہانی کا انجام صرف اس نقطے میں پنہاں ہے کہ انسان ناشکرا ہے اور کسی بھی حال میں خوش نہیں رہتا۔ سرکش کی یہ قسط پہلی قسط کی نسبت زیادہ دلچسپ رہی۔ محمود احمد مودی اس کہانی کو جاری رکھنے کی تگ ودو میں مصروف نظر آتے ہیں۔ اب افضل خان خدائی فوجدار بن چکا ہے اور دنیا جہان کے غم ختم کرنے کے لئے سردھڑ کی بازی لگانے میں مصروف ہے۔ بروقت بھی ایک اچھی اور معیاری کہانی تھی اور جاسوسی کا جو انوکھا انداز اپنایا گیا ہے اور سراغ رسانی سے جو کام لیا گیا ہے وہ ہماری اور جاسوسی کی فطرت کے عین مطابق ہے۔ ایسی کہانیاں پڑھ کر پتا چلتا ہے کہ جاسوسی کیا ہوتی ہے۔ پروازِ عقاب پہلے شماروں کی طرح اس شمارے میں بھی مجاہدین کی جدوجہد سے بھرپور رہی بلکہ اس مرتبہ مجاہدین کچھ زیادہ فارم میں نظر آتے ہیں۔ اس کہانی کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم حقیقتاً افغانستان پہنچ گئے ہوں۔ جاسوسی ڈائجسٹ میں یہ واحد کہانی ہے جس میں حقیقتاً اتنی معلومات جمع کی گئی ہیں۔ اس کے لئے ہم واقعی کہہ سکتے ہیں کہ دریا کو کوزے میں بند کردیا گیا ہے۔ میں نے تو ایک لسٹ بھی بنا رکھی ہے جس میں' میں اس کہانی میں استعمال ہونے والے تمام ہتھیاروں کا نام' کام اور رینج لکھتا ہوں۔ اس طرح میری معلومات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ عائشہ جمال کی خوف میں کتّے اور انسان کی محبت کی مثال اس کہانی سے بہتر کہیں نہیں ملتی۔ اس کہانی سے یہ بھی ظاہر ہے کہ جانور بھی وفاداری میں انسان سے سبقت لے گیا ہے۔ شکاری میں احمد اقبال صاحب نے جس طرح اچانک ایک نیا کردار غزالہ متعارف کرایا ہے اس پر ہم مبہوت رہ گئے کہ احمد اقبال کو یہ اچانک کیا سوجھی۔ کیا پہلے ہی کردار کم تھے کہ ایک اور کو پکڑ کر لے آئے۔ اس قسط میں غزالہ نے جو گُل افشانیاں کی ہیں ان میں سے چند ایک کی جھلک ہم نے دیکھ لی ہے۔ احمد اقبال سے ایک شکایت یہ بھی ہے کہ بسا اوقات وہ کہانی کو مزاحیہ انداز میں چلاتے ہوئے اچانک فلسفہ بگھارنے لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی کہانی میں کرداروں کو ہسٹیریا کے دورے بہت پڑتے ہیں۔ ان کی کہانی پڑھ پڑھ کر ہمیں بھی تجربہ ہوگیا ہے کہ کہانی پڑھنے سے پہلے ہی ہم پر ہسٹیریا کا دورہ پڑجاتا ہے۔ غلام' بیگم' بادشاہ بھی ایک اچھا تحفہ ہے جو کہ شائستہ نعیم نے بھیجا ہے۔ اس سے جاسوسی اور سراغ رسانی کے انداز کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس کے بعد باری آئی رنگوں کی۔ پہلے رنگ میں قید

باشقت پڑھی۔ واقعی اس کہانی میں شاد صاحب نے جو واقعات دیے ہیں وہ سرورق کے مزاج کے عین مطابق ہیں۔ جس طرح انہوں نے کہانی کا تانا بانا بُنا وہ واقعی ان کا ہی کام ہے۔ اس کہانی میں ہمارے معاشرے کی ایک کمزوری کو عیاں کیا گیا ہے جس طرح محسن علی نے اپنی اولاد اور بیوی کی خاطر ایک عرصۂ دراز ملک سے باہر گزارا اور ان کو ہر آسائش مہیا کی اور اس کو اس کا جو صلہ ملا وہ واقعی عبرت ناک ہے اور باقی کرداروں کو ان کے کیے کی جو سزا ملی اس کو پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ واقعی ہر کردار کو جو سزا ملی وہ انصاف پر مبنی تھی۔ اس میں ان والدین کے لئے عبرت ہے جو اپنی بہو بیٹیوں کو فلمی دنیا میں بھیج دیتے ہیں۔ ان کو زندگی کے اس پہلو پر بھی نظر رکھنی چاہئے۔ دوسرے رنگ میں سرور اکرام کی دوسرا مخص کو پڑھا مگر وہ مزہ نہیں آیا اور نہ اس کہانی میں وہ چاشنی ہے جو کہ ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس کہانی کو سرورق کے مطابق بنانے کے لئے انہوں نے کہانی کو عجیب موڑ دیا۔ شروع شروع میں تو مجھے بھی حیرانی ہوئی کہ سمندر اور ستارہ جو کہ روحیں ہیں ان کا انجام کیا ہوگا مگر جب نتیجہ سامنے آیا تو سرپیٹ کر رہ گئے کہ سمندر اور ستارہ تو انسان تھے۔ اس کہانی میں پہلی سطر سے آخری سطر تک تجسس ہی تجسس ہے کہ اب کیا ہوگا۔ (اور یہی مصنف کی کامیاب کوشش کا منہ بولتا ثبوت ہے) اب آخر میں باری آئی تیسرے اور آخری رنگ کی۔ بڑی مدت بعد احمد اقبال کو پڑھا۔ مستزاد یہ کہ بدیع الزماں دلنواز لالہ موسوی عرف بزدل کا نام پڑھا تو خوشی سے اُچھل پڑے۔ واقعی اس میں احمد اقبال نے جو مزہ دیا ہے وہ معیاری اور موقعے کے مطابق تھا۔ ہم چند دوستوں نے جب اسے پڑھا تو ہنس ہنس کر ہمارا بُرا حال ہوگیا لیکن ہمیں اس بات پر بھی افسوس ہے کہ بزدل صاحب کی بزدلی ہی کی وجہ سے نیلم بھاگ گئی اور ان کو مع پھپھی پھینک گئی۔ بزدل نے اتنا کام تو کرلیا ہے کہ شادی کے لئے لڑکی خود پسند کرلی ہے اور ہے بھی وہ ڈاکٹر۔ اب آگے کام احمد اقبال صاحب کا ہے کہ وہ بزدل کی شادی کب کراتے ہیں۔ جب یہ کہانی ختم ہوئی تو ہم حیران رہ گئے کہ جاسوسی ڈائجسٹ ختم۔ بہت افسوس ہوا کہ آپ نے اتنا چھوٹا ڈائجسٹ کیوں بنایا؟ پانچ چھ سو صفحے اور ہونے چاہئیں تھے تاکہ ایک مہینہ تو چل جاتے!"

محمد عظیم نفیس کی حاضری راولپنڈی سے۔ "جاسوسی اس بار خاصا انتظار کروانے کے بعد بک اسٹال پر رونق افروز ہوا۔ دور سے نظر پڑنے پر تو میں بالکل نہیں پہچان پایا کہ یہ جاسوسی ہے۔ خیر ذرا قریب گئے تو وہی 'دشمنِ جاں' تھا لیکن کچھ انوکھے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ شاہد صاحب نے اس بار کچھ نیاپن پیش کیا ہے۔ خاتون نے کیمرے اور قلم پر مشتمل عجیب و غریب پیرہن اوڑھ رکھا ہے۔ ہیروئن پر تبصرہ ہو سکتا ہے تو عرض ہے کہ یہ بی بی خاصی خوبصورت ہیں البتہ عمر کچھ زیادہ ہے۔ نیچے کونے میں کسی نگار خانے کا منظر ہے جہاں کوئی پنجابی فلم فلمائی جارہی ہے۔ اب آتے ہیں چینی نکتہ چینی کی طرف تو اس بار پرنس اے بی کشمیری پہلا انعام حاصل کرکے مس جاسوسی اینڈ کمپنی کے سینوں پر مونگ دلنے میں کامیاب رہے۔ ویل ڈن پرنس۔ مس جاسوسی آف گوجرانوالہ غائب تھیں۔ ان بی بی کے نہ ہونے کے باعث اس بار حالات پُرسکون تھے۔ ورنہ تو اودھم مچا ہوتا ہے۔ اظہر صاحب نے تو اس ماہ اپنے ہی لیڈر کے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش کردی ہے خدا خیر کرے۔ یہ ملتان کی شائلہ بی بی پر بھی مس جاسوسی کا سایہ ہوگیا ہے شاید۔ بہت دُھواں چھوڑ رہی تھیں۔ ابتدائی صفحات کے جادوگر حقی صاحب بھی جلوہ گر ہیں۔ حقی صاحب نے ثابت کردیا کہ پہلی کہانی لکھنے میں کوئی دوسرا ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ "لہو کے تاجر" ایک یادگار تحریر ہے۔ اس تحریر میں ملک پاکستان کو درپیش ان خطرات کی نشاندہی کی گئی ہے جو اس کے دشمنوں کی طرف سے اس کو لاحق ہیں۔ نجمہ مودی کی 'خرابی' ہمارے حق میں تو اچھی رہی کیونکہ اس سے ہمیں یہ سبق مل گیا کہ دوسروں کے معاملات کی ٹوہ نہیں لینی چاہیے۔ نسیم جاوید کی تحریر 'معاہدہ' کچھ عجیب سی تھی۔ اب بات ہوجائے سرکش کی۔ تو میرے خیال میں اب اس سلسلے میں وہ پہلی والی تندی اور تیزی نہیں رہی جو اس کہانی کی اصل خوبصورتی تھی۔ پاکیزہ خان کی بروقت اچھی تحریر تھی۔ منہ کا مزہ بدلنے کے لیے ایسی مختصر تحریریں ٹھیک رہتی ہیں۔ عائشہ جمال کی کہانی 'خوف' اچھی تھی۔ اس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کُتّا بہت حسّاس جانور ہے۔ شکاری اس وقت رسالے کی جان ہے اور احمد صاحب خوبصورتی سے اسے آگے بڑھا رہے ہیں۔ اس ماہ غزالہ یا شیلا کا کردار پوری قسط میں چھایا رہا۔ سکندر اور رابعہ کے درمیان ناراضگی خاصا طول کھینچ گئی ہے اُمید ہے کہ اگلے ماہ صلح صفائی ہوجائے گی۔ سودمند غلط فہمی' شگفتہ شام کی اچھی پیشکش تھی۔ شائستہ نعیم کی "غلام' بیگم' بادشاہ" بس ٹھیک تھی۔ موضوع اس کا خاصا منفرد تھا۔ اس بار چونکہ سرورق دلچسپ تھا لہٰذا ظاہر ہے کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ شاد صاحب تو بے جان سرورق میں بھی جان ڈال دیتے ہیں۔ اس بار بھی انہوں نے خوبصورت تخلیق پیش کی۔ 'قیدِ بامشقت' ان کی ایک اور خوبصورت تحریر تھی۔ دوسرا رنگ یا یوں کہہ لیں کہ دوسرا مخص کچھ عجیب و غریب تھا۔ کچھ زیادہ ہی پُراسراریت ٹھونس دی گئی ہے اس کہانی میں۔ اپنے پلّے تو کچھ نہیں پڑا۔ یا شاید ہمارا پلّا ہی خراب ہے۔ احمد اقبال نے اس بار شکاری کے ساتھ ساتھ سرورق پر بھی طبع آزمائی کی اور اپنے روایتی شگفتہ انداز میں ایک خوبصورت تحریر لکھ ڈالی۔ ادا + کار = اداکار۔ نام سے ہی پتا چل جاتا ہے کہ یہ احمد اقبال جیسے قلمکار کی تحریر ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار بدیع الزماں دل نواز لالہ موسوی عرف بزدل بہت ہی عجیب اور کئی صفات کا حامل ہے۔"

محمد اجمل طاہر کا مختصر مکتوب میلسی سے۔ "اس دفعہ جاسوسی کا سرورق کچھ عجیب سا تھا۔ کوئی بھی رنگ اس تصویر کو کور نہ کرسکا۔ علیم الحق حقی صاحب کی تحریر لہو کے تاجر بہت خوب تھی۔ دوسرے حصے کا شدت سے انتظار ہے۔ محمود احمد مودی صاحب کے سرکش چوہدری افضل صاحب زر تاج کمر کے ہو کر رہ گئے ہیں' وہاں سے نکلنے کا نام نہیں لے رہے۔ سرکش میں پہلے جیسی تیزی نہ تھی جو کہ آغاز کے وقت تھی۔ پاکیزہ خان کی بروقت بھی واقعی چکرا دینے والی تحریر تھی۔ اب ذکر اقبال کاظمی صاحب کی تحریر "پروازِ عقاب" کا جو کہ جہادِ افغانستان کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ کہانی ... میں .... وہاں کے واقعات کی جس طرح عکاسی کی گئی ہے اس کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے ہم بھی اس جگہ پہنچ گئے ہوں۔ بہرحال بہت اچھی تحریر تھی۔ عائشہ جمال کا 'خوف' بھی اچھی تحریر تھی۔ احمد اقبال کے شکاری پاکستان پہنچ کر افراتفری میں پڑ گئے ہیں۔ سرورق کے رنگوں میں عبدالقیوم شاد صاحب کی تحریر قیدِ بامشقت بہت ہی سبق آموز تحریر تھی۔ اس دفعہ رسالے میں کترن کی کمی تھی۔"

عبدالرحمٰن صابر تورڈھیر سے لکھتے ہیں۔ "سرورق حسبِ معمول منفرد مزاج اور عید کا ذائقہ لیے ہوئے تھا۔ کونے میں عید مبارک دیکھا تو جناب جاسوسی کو بھی بہت بہت عید مبارک۔ سرورق کے خیالات میں اُلجھتے ہوئے اور اشتہارات کو نظرانداز کرتے ہوئے فہرست پر نظر ڈالی۔ عنوانات کے صفحے میں ہر ماہ کچھ نہ کچھ تبدیلی اچھی بات ہے۔ چینی نکتہ چینی کی نگری میں پہنچتے ہی جناب پرنس اے بی کشمیری کا اوّل انعام یافتہ تبصرہ پڑھا....

علیم الحق حقی صاحب ہمیشہ قارئین کو معیاری کہانی پڑھنے کو دیتے ہیں۔ دہشت گردی اور اغوا کے واقعات نے ہمارے سوہنے دیس کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ ’لہو کے تاجر‘ ایک معیاری اور برسوں تک یاد رکھنے والی تحریر ہے۔ ’خرابی‘ ایک قابلِ تعریف کہانی تھی۔ نجمہ مودی ہمیشہ منفرد تحریر پیش کرتی ہیں۔ (THE DEAL) یا معاہدہ خالصتاً مغربی تحریر تھی۔ نزیون ایک بزدل انسان تھا لیکن ڈریا کے فریب میں آگیا تھا۔ محمود احمد مودی کے تو ہم شروع سے پرستار ہیں۔ وہ لفظوں سے کھیلنا خوب جانتے ہیں۔ ’سرکش‘ میں صرف اس وقت بوریت محسوس ہوتی ہے جب مودی صاحب اس میں فلسفہ بکھیر دیتے ہیں۔ مجموعی طور پر اس قسط نے ہمیں پوری طرح اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ پاکیزہ خان کی ’بروقت‘ میں بوڑھی عورت یا سراغ رساں نے واقعی بروقت کارروائی کی۔ انسانی کھوپڑیوں کو جس بے دردی سے کولر میں رکھا گیا اسے پڑھ کر جھرجھری سی آگئی۔ ’پروازِ عقاب‘ کے لیے اقبال کاظمی صاحب کو جتنا سراہا جائے کم ہے۔ عائشہ جمال کی ’خوف‘ بس ٹھیک ہی رہی۔ ’شکاری‘ کا ٹیمپو شروع میں جتنا تیز تھا اب اتنا ہی سست ہو گیا ہے۔ ’شکاری‘ بہت اچھی ہے۔ بس ذرا شکاری کو چست کردیں۔ ’سودمند غلط فہمی‘ شگفتہ شام کی ایک اچھی کوشش تھی۔ سراغ رسانی کے موضوع کو بڑے مؤثر پیرائے میں ترتیب دیا گیا تھا۔ ”غلام‘ بیگم‘ بادشاہ“ شائستہ نعیم کی پیشکش تھی۔ کہانی میں بڑی حد تک سسپنس تھا۔ محمود توفیق کا کردار دلچسپ تھا۔ سرورق کا پہلا قوس و قزح جیسا رنگ عبدالقیوم شاد صاحب کی تخلیق کا رنگ تھا۔ ’قید با مشقت‘ ایک تلخ حقیقت تھی۔“

محمد اعجاز جاجی، اسلام آباد سے رقم طراز ہیں۔ ”میں نے کافی عرصے سے سوچ رکھا تھا کہ آپ کی اس چینی نکتہ چینی میں تھوڑی اپنی طرف سے شکر ملادوں مگر ہر دفعہ جب یہ دیکھا کہ چینی نکتہ چینی کو شکر کی ضرورت بالکل نہیں ہے اسے تو گڑ چاہیے کیوں کہ اس پر تو آتش فشاں‘ طوفان‘ مسٹر جاسوس‘ مس جاسوسی وغیرہ وغیرہ مخلوق کا قبضہ ہی چلا آرہا ہے تو ہماری کون سُنے گا۔ میری تین پسندیدہ کہانیاں شکاری‘ سرکش اور سرورق کے رنگ ہیں۔ شکاری اب شکار کے قابل نظر نہیں آتے کیونکہ وہ تو خود ہی شکار ہو رہے ہیں۔ سرکش میں چوہدری افضل صاحب اب کچھ زیادہ ہی سرکشی دکھا رہے ہیں۔ انہیں واپس لاہور کا ٹکٹ دیں۔ لہو کے تاجر یہ اس سال متاثر کرنے والی دوسری خوبصورت تحریر ہے۔ میری علیم حقی صاحب کو مبارکباد ضرور دیں۔ سرورق کے تمام رنگ خوبصورت اور سبق آموز تھے۔ خاص کر عبدالقیوم شاد صاحب کی ’قید با مشقت‘ نے بہت متاثر کیا ہے اور ’بزدل‘ صاحب نے تو کمال کردیا خاص کر توپ صاحب سے گفتگو جس انداز میں کی گئی اپنی مثال آپ ہے۔ بزدل صاحب نے صحافیوں کی حالت خوبصورت پیرائے میں بیان کی ہے۔“

راحت علی خاں کا اظہارِ بیان‘ رحیم یار خان سے۔ ”بڑی مشکل سے جاسوسی حاصل کیا کیونکہ ”بہت پا+بندیاں ہیں اسیروں پہ میرے دوست۔“ خیر صفحہ نمبرا پر ہم نے خود نمبر درج کیا اور خیر مبارک بھی مگر سرورق نے بے حد بور کیا۔ سُنا تھا تصویریں بولتی ہیں مگر یہ تصویریں تو عجیب تھیں پھیکی‘ روکھی‘ بے جان۔ صفحہ ۱۰ پر مرزا غلام کبریا صاحب کی مراجعت کی خبر پڑھی۔ دعا ہے خدا مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ (آمین) موت سے کس کو رستگاری ہے۔ آج مرزا جی کل ہماری باری ہے۔ چینی واقعی بڑی میٹھی ہے۔ بھیا! مجموعی طور پر آپ نے ۱۰ تبصرے شائع کیے اور جو مساوات آپ نے صنفِ سخت اور صنفِ نازک میں برتی اس کے لیے آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔ ”لہو کے تاجر‘ علیم الحق حقی صاحب کی کاوش اچھی لگی۔ انہوں نے واقعی قابلِ داد پھرتی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اِدھر رات ہوئی اُدھر چراغ جلا دیا۔ اس قسط میں انہوں نے کہانی کلائمکس تک پہنچادی ہے۔ ان کو پہل کرنے کی مبارک ہو۔ صفحہ ۶۷ پر نجمہ مودی کی ’خرابی‘ ملاحظہ کی۔ خرابی قابلِ تعریف ہرگز نہیں۔ لگتا ہے ایک ہی کمپنی کے اتر کام تھے۔ صفحہ ۷۱ پر قسیم جاوید سیّد کا ”معاہدہ‘ پڑھا۔ لفظ بہ لفظ ترجمہ کردیا بھیا! واہ۔ کردار انتہائی بے وقوف اور رموزِ محبت سے ناآشنا۔ محمود احمد مودی صاحب کو ”سرکش‘ میں دیکھا‘ لائقِ تحسین ہیں کہ کہانی کہیں بھی جھول نہیں کھاتی۔ لفظوں سے منظر کشی خوب کی ہے اور نیکی کی طرف تبلیغ کا یہ غیر محسوس طریقہ بے حد اچھا اور معیاری ہے۔ یقین کیجیے تھکن اُتر گئی۔ صفحہ ۱۱۷ پہ پاکیزہ خان کو ”بروقت‘ دیکھا۔ کہانی خوب تھی واقعی ذہن کی چولیں ہل گئیں اور اپنا نتیجہ آخر میں غلط ہوگیا۔ صفحہ ۱۲۲ پر اقبال صاحب کی ”پروازِ عقاب‘ آنکھوں میں بس گئی۔ کہانی میں جس طرح منظر کشی کی ہے۔ وہ اقبال صاحب ہی کا خاصہ ہے۔ افغان قوم کی غیرت اور اسلام کی عظمت صفحے صفحے پر جاگزیں نظر آئی۔ صفحہ ۱۴۳ پہ عائشہ جمال کے ”خوف‘ کو محسوس کیا۔ کتّوں کی عظمت کے ہم بھی پطرس کی طرح کم ہی قائل تھے مگر یہ پہلوئے وفاداری جو ہویدا ہوا تو بے اختیار پیار آگیا۔ صفحہ ۲۲۱ پہ پہنچ گئے اور شائستہ نعیم کے ساتھ غلام‘ بیگم‘ بادشاہ کو دیکھا۔ کھینچا تانی کا عجیب نظارا اور لفظوں کی بازی گری محسوس کی۔ کہانی خوبصورتی سے تراشی گئی ہے۔ ترجمہ کرنا اور پھر یوں کہ اجنبیت بالکل نہ ہو۔ فسوں خیزی برقرار رہے۔ شائستہ نعیم صاحبہ کو مبارک ہو! صفحہ ۲۳۰ پہ سرورق کا پہلا رنگ دیکھا۔ عبدالقیوم شاد صاحب نے واقعی ایک عجیب قصہ بیان کردیا ہے مگر یہ داستان مجموعی تاثر اچھا نہیں چھوڑ سکی کیونکہ جو لوگ دیارِ غیر میں جاتے ہیں ان کے پیچھے صرف ان کے بیوی بچے نہیں ہوتے ان کے اور بھی اپنے ہوتے ہیں پھر جب وہ سال بعد واپس آتے ہیں تو انہیں پُن کُن بھی مل جاتی ہے۔ کہانی کو مشاقی سے بُن تو دیا مگر تاثر نہ چھوڑ سکی۔ صفحہ ۲۴۲ پہ سرور اکرام صاحب نے سرورق پہ دوسرا رنگ بھردیا۔ کچھ زیادہ خوبصورت نہیں لگا۔ صفحہ ۲۸۴ پہ احمد اقبال صاحب کی اداکار کے روپ میں جناب بدیع الزماں دلنواز لالہ موسوی صاحب کا کارنامہ پڑھ کر واقعی بے حد ہنسی آئی۔ یوں سمجھئے کہ آپ نے زعفران کی کاشت ہی کرڈالی۔ لب و لہجہ غالب کی چٹکی کھاتا رہا۔“

مریم انصاری کی آمد‘ کراچی سے۔ ”مارچ کے شمارے کا سرورق بہت ہی دلچسپ لگا۔ سرورق دیکھ کر ہی ذہن میں ایک کہانی سی اُبھر آئی۔ لڑکی بالکل چینج تھی۔ آنکھ کی جگہ کیمرا تھا اور مزا تو جب آیا جب اس کے کپڑے دیکھے جو نیگیٹو کے تھے۔ سرورق کو دیکھ کر ہم چلے چینی نکتہ چینی میں۔ پرنس اے بی کشمیری انعام کے حقدار ٹھہرے ہیں ان کو میری طرف سے مبارک باد قبول ہو۔ آگے پتا چلا کہ ایک اور مس نکل آئیں ہیں جو کہ اپنے آپ کو آتش فشاں لکھتی ہیں۔ ان سے گزارش ہے کہ خواہ مخواہ کی دھمکی دینے سے کچھ فائدہ نہیں ہے۔ اس طرح لکھ کر آپ نے صفحہ ضائع کیا ہے۔ یہ مس ایشیا نے بھی نہ جانے کیوں خط لکھا‘ نہ انہوں نے ابھی تک مکمل ڈائجسٹ پڑھی بس جو الٹا سیدھا دماغ میں آیا لکھ دیا۔ اب چاہے تبصرہ معیاری ہو یا نہ ہو۔ بروقت مس جاسوسی کی اسپون بنی رہتی ہیں۔ (ہوں۔۔ ہوں۔۔ اپنی ہی قوم سے بگاڑ!) اگر آپ سب کو تبصرہ کرنا ہے تو صرف کہانیوں پر کیجیے۔۔۔ خواہ مخواہ سیاسی سچویشن پیدا کرنے سے فائدہ۔ انکل آخر پہلے بھی تو ایک معیار تھا۔ اب لوگ معیار سے گرتے جارہے ہیں۔ خیر کہیں میں بھی نہ گر جاؤں لہٰذا

میں نے سوچا پہلے اپنے پسندیدہ رائٹر علیم الحق حقی کی کہانی "لہو کے تاجر" پڑھ لوں۔ انکل کہانی کے انٹرو میں آپ نے لکھا ہے کہ "اس معصوم دوشیزہ کا احوال جو کھیل ہی کھیل میں دہشت گرد بن گئی تھی۔ انکل میں یہاں آپ سے اتفاق نہیں کرتی کیونکہ میں نے کہانی پڑھ کر اندازہ کیا ہے کہ نہ تو شہناز معصوم تھی اور نہ ہی وہ کھیل ہی کھیل میں دہشت گرد بن گئی بلکہ وہ ایک سمجھدار لڑکی تھی۔ اپنے شوق کے خاطر وہ فلمیں دیکھنے سائرہ کے گھر جایا کرتی تھی پھر اس کی بربادی شروع ہوئی۔ وہ چاہتی تو وہیں سے پلٹ سکتی تھی‘ خیر کہانی اچھی رہی۔ "خرابی" بہت ہی دلچسپ کہانی ثابت ہوئی۔ کیول سمجھتی ہے کہ صرف اس کے انٹر کام میں خرابی ہے لیکن بے چاری کو یہ کیا معلوم تھا کہ دوسرے انٹر کام میں بھی خرابی ہو سکتی ہے۔ خرابی کے بعد ٹریون کو دھوکا دینے والی کہانی "معاہدہ" پڑھی۔ اس کہانی میں ذریا اور اس کا شوہر نیوبال دونوں کو دھوکا دے رہے ہوتے ہیں۔ نسیم جاوید سیّد نے The Deal کا اچھا ترجمہ کیا۔ "سرکش" ہر دفعہ کی طرح اس دفعہ بھی بہت دلچسپ‘ تجسس اور سسپنس کا عنصر لیے ہوئے تھی۔ "خوف" یکے بعد دیگرے رونما ہونے والی کتوں کی اموات سے شروع ہونے والی کہانی بھی عام موضوع سے ہٹ کر تھی۔ "شکاری" بھی اپنی جگہ اچھی چل رہی ہے۔ "سودمند غلط فہمی" اور "غلام‘ بیگم‘ بادشاہ" بھی اچھی رہیں۔ احمد اقبال کی کہانی "اداکار" میرے لیے عید کا تحفہ ثابت ہوئی۔ ہر ایک صفحے میں طنز و مزاح کا عنصر پایا جاتا تھا۔ ویسے انکل احمد اقبال صاحب پولیس پر زیادہ طنز کرنے لگے ہیں خیر یہ کہانی جو کہ بزدل کی تھی بہت دلچسپ لگی۔"

غلام عباس نازش کا مکتوب "چلیانوالہ" سے۔ "جاسوسی کچھ لیٹ ملا۔ شاہد صاحب کا بنایا ہوا ٹائٹل اس بات کی تفسیر تھا کہ کیا ہم کسی (ذاکر صاحب) سے کم ہیں۔ جانے موصوف نے کتنے رت جگے منائے ہیں کیسے کیسے رنگ ملائے ہیں تب جا کے کرشمے نظر آئے ہیں۔ پرنس اے بی کشمیری صاحب عید سے قبل جاسوسی کی طرف سے اس سے بہتر تحفہ نہیں لے سکتے تھے۔ موصوف اب پہلوانوں کی کہانیاں پڑھا کریں گے۔ ونڈر بوائے جیسے دل موہ لینے والی حقیقتیں ان کی نظروں کو خیرہ کریں گی۔ مبارک ہو۔ اب آئیے کہانیوں کی طرف "سرکش" پڑھی چوہدری صاحب بھی بھول بھلیوں میں کھو گئے ہیں۔ اب اُمید بندھی ہے کہ ریڈ ذات کی طرف پلٹیں گے۔ زرتاج ہیروئن بنی جا رہی ہے اور افضل ہیرو لگتا ہے۔ شکاری سے متعلق بہت سے قارئین کے ہم بھی ہمنوا ہیں کہ اسے اب محض طوالت دی جا رہی ہے۔ اب موصوف ایک ڈاکٹر صاحبہ سے مل کر گلچھرے اُڑا رہے ہیں۔ شاد صاحب کی قید بامشقت پڑھی ایمان سے شاد صاحب کو عید مبارک کے ساتھ ساتھ عید کے اس شاندار تحفے پہ بھی مبارک دیجیے گا۔ سرور اکرام نے دوسرا مخلص پیش کی۔ یقیناً کہانی کی انٹروڈکشن نہ پڑھتا تو یہ بے سروپا دکھائی دیتی اور میں کہہ دیتا کہ فضول سی تحریر تھی لیکن اب کہہ سکتا ہوں کہ معیاری چیز ہے۔ اب آئیے بزدل صاحب کی طرف کیا خوب تحریر ہے‘ احمد اقبال کی مزاحیہ تحریروں کو اکثر قارئین پسند کرتے ہیں ان میں ہمیں بھی شامل سمجھیے۔ توپ صاحب کی پیک اور بزدل کے تبصروں نے دل خوش کر دیا آخر میں ڈاکٹرنی صاحبہ سے پھیرے بھی لگوا دیتے کیا ہرج تھا۔ امید ہے یہ کردار مزید آگے چلے گا۔ انکل پروازِ عقاب آزادی کے جذبوں کی عکاسی ہے اور کتنی درست عکاسی ہے۔ یہ حقی صاحب ایبٹ آباد میں کیا کر رہے ہیں۔ کہانی پڑھی ایس پی جلیس کا کردار پسند آیا بالکل اصلی واقعات دکھائی دیتے ہیں لیکن آخر میں دوسری و آخری قسط پڑھ کر ایسا ہی حال ہوا جیسا دل پسند کھانا کھانے والے یا محبوبۂ دلنواز سے باتیں کرنے والے کا اس وقت ہوتا ہے جب مجبوراً پاس سے اٹھنا پڑے۔ خرابی نجمہ مودی کی اچھی تحریر تھی۔ باقی چند کہانیاں ابھی پڑھنی ہیں۔"

مس جاسوسی فرام گوجرانوالہ "سب سے پہلے تو ہماری جانب سے آپ کو‘ تمام اراکینِ جاسوسی اور دوست قارئین اور دشمن قارئین جن میں سرفہرست اے بی سی ڈی اور آصفہ صاحبہ ہیں اس کے بعد آپ کے کیپٹن صاحب ہیں اور اظہر صاحب تو معصوم سے کاکے ہیں جن کی اپنی کوئی رائے نہیں ہے جس طرف لگایا‘ لگ گئے بہرحال سب کو عید کی مبارک باد۔ اس بار کا سرورق سپر گرل حسینہ سے سجا ہوا تھا جو ہمیں بہت پسند آیا۔ کچھ مہینوں سے ایک ہی طرح کی شکلیں دیکھ کر بہت اکتا چکے تھے یہ تبدیلی اچھی لگی۔ دوستوں اور دشمنوں کی مشترکہ محفل میں داخل ہونے ہی لگے تھے کہ پرنس اے بی سی ڈی مال گاڑی کی طرح طویل ترین تبصرے کے ساتھ ہمارا راستہ روکے کھڑے تھے۔ ہمیں ان کی دماغی حالت پہ شبہ تو کچھ پہلے ہی تھا لیکن ان کا تبصرہ پڑھ کے مزید یقین ہو گیا کہ واقعی ان کے ساتھ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ بہرحال سب باتوں سے قطع نظر ان کا خط بہت اچھا تھا اور اس کی تعریف نہ کرنا ان کے ساتھ تو نہیں البتہ ان کی تحریر کے ساتھ ضرور زیادتی ہوگی لہٰذا ہم فراخ دلی کے ساتھ انہیں کانگریچولیشن کہتے ہیں۔ نیا نام مس آتش فشاں‘ کراچی سے وارد ہوئی ہیں اور ایک ہی حملے میں سب کو زیر کرنا چاہتی ہیں جو کہ ان کی خوش فہمی ہو سکتی ہے۔ (زیر ہونے والوں میں خود کو شمار نہ کریں‘ انہوں نے ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا) آپ تو لگتا ہے کہ ڈائریکٹ کسی آتش فشاں پہاڑ سے تشریف لائی ہیں اور ہاں آپ کو کس نے کہا کہ اس محفل میں کوئی پارٹی بن رہی ہے اور یہاں لیڈر کی ضرورت ہے‘ تو خاتون نہ تو ہم کوئی پارٹی بنا رہے ہیں اور نہ ہی آئندہ ارادہ ہے۔ ہم تو یہاں ایک جوائنٹ فیملی کی طرح ہیں جس کے سربراہ ہیں انکل اور ہاں انکل‘ آپ کے جو کیپٹن صاحب ہیں نا‘ اپنی غلطی کبھی بھی تسلیم نہیں کریں گے تو جناب نہ ہم حد سے بڑھے ہیں اور نہ ہی ہمیں حد سے بڑھنا اچھا لگتا ہے لہٰذا ہوش کے ناخن ہمیں نہیں بلکہ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو لینے چاہئیں۔ آپ لوگوں کا حساب وہی ہے کہ اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے‘ ویسے ڈھٹائی کا اچھا طریقہ ہے جو آپ نے اختیار کیا ہوا ہے۔ چلیے یوں کیجیے چھوڑیے پُرانی باتوں کو جو ہوا اس کو بھول جائیں۔ (یعنی‘ چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں) کیونکہ اگر انا آپ میں ہے تو کم انا پرست ہم بھی نہیں۔ بے معنی بحث کرنا بالکل فضول ہے نہ آپ قائل ہوں گے اور نہ ہم ہار مانیں گے۔ بحث کرنے کا مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ ایک فریق قائل ہو جائے اور جب دونوں ہی ضدی ہوں تو بات بن نہیں سکتی اور یہ سرد جنگ ہے کہ بڑھتی ہی جا رہی ہے اور بلاوجہ دوسرے لوگ بھی اس میں ملوث ہو رہے ہیں۔ (دوسرے لوگ بلاوجہ ملوث نہیں ہو رہے‘ بلاوجہ تو کچھ بھی نہیں ہوتا) لہٰذا یوں کیجیے کہ "ہار جیت کی بات کل پر چھوڑیں۔ آئیں آج دوستی کر لیں۔" (یہ خیال شاید عید کی وجہ سے آگیا ہے۔ چلیے اچھا ہے "بکرا عید" تک کے لئے) اور اب "بے زبان" اظہر صاحب کی بات ہو جائے۔ واقعی اظہر صاحب‘ آپ جیسے لوگ ہوتے ہیں دوسروں کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلانے والے۔ تاکہ جب بھی موقع آئے صاف بچ نکلیں کہ جی ہم نے تو کچھ کیا ہی نہیں۔ رئیلی یہ آپ کی معصومیت ہی تو ہے جس نے اچھا خاصا ہنگامہ کروا دیا ہے بہرحال آپ کی انفارمیشن کے لئے عرض ہے کہ ہماری عقل ہمیشہ ٹھکانے رہتی ہے۔ ہاں دوسروں کے متعلق ہم کہہ نہیں سکتے کیونکہ ہم ان سے خاصے دور ہیں آپ البتہ ان کے نزدیک ہیں‘ آپ کو زیادہ اندازہ ہوگا۔ ویسے انکل کیا خیال ہے آپ کا اگلے

ماہ ہم اپنے اصلی نام سے دھماکا نہ کردیں' رائے ضرور دیجیے گا۔" (چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں' ہم کو عبث بدنام کیا۔ پہلے بھی ہم سے پوچھ کر کچھ کیا ہے! اور ہم نے کب روکا ٹوکا ہے؟)

مس ایشیا فرام کراچی "ایک خوب صورت شام کو خوب صورت جاسوسی نے ہمارے ہاتھ میں لینڈ کیا۔ سرورق دیکھ کر انکل ذاکر کو داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔ ارے ارے نہیں جناب' یہ تو شاہد صاحب کا شاہکارِ عظیم ہے' ویسے یہ اپنے ذاکر انکل کہیں عید منانے اپنی سسرال تو نہیں چلے گئے؟ (عید وغیرہ پر کبھی کبھی بھتیجے کے پائے کھانے چلے جاتے ہیں) ارے بھئی' اے ٹی رولا پٹ گیا' بونگا بازی لے گیا۔ یقین نہیں آتا کہ بونگا صاحب اتنے لائق فائق بھی ہوسکتے ہیں۔ بونگا صاحب سچ سچ بتائیں' کس سے لکھوایا ہے اور انکل جی' یہ اپنے کیپٹن صاحب نے کہیں سیاست میں حصہ تو نہیں لے لیا؟ قسم سے ان کا خط پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اخبار پڑھ رہے ہوں۔ (بھئی کراچی میں ہیں نا آج کل' بس آب وہوا کی تبدیلی کے اثرات تو ظاہر ہوتے ہی ہیں) اور انکل جی یہ اظہر رپھڑی صاحب پھر نمودار ہوگئے۔ یہ جب بھی آتے ہیں کوئی نیا رپھڑ ہی ڈال جاتے ہیں۔ ویسے بائی داوے آپ کا کس بے زبان مخلوق سے تعلق ہے اور آپ کو شرمندہ ہونا ہی چاہئے تھا۔ کیونکہ بات سرے سے ہی غلط تھی۔ ویسے حیرت ہے کہ آپ بھی شرمندہ ہوتے ہیں۔"

شائلہ شاہین' ملتان سے یوں پریشان ہیں "سب سے پہلے اپنی پسندیدہ ترین کہانی یعنی شکاری پڑھی' اس دفعہ رابعہ کے ڈپریشن کی وجہ سے ہم بھی ڈیپریس ہوگئے۔ سکندر واقعی بہت جذباتی ہے اسے چاہئے کہ حقیقت پسندانہ سوچ رکھے جیسی کہ رابعہ کی ہے اور رابعہ کی بات مان لے۔ یہ ایک اُداس قسط تھی۔ اس کے بعد ہم سرکش کی طرف بھاگے تو پتا چلا کہ اپنے چوہدری صاحب تو ایک خطرناک کارنامہ انجام دے کر بے نیاز بنے گھوڑے سدھارے ہیں واہ کیا بے نیازی ہے! یہ قسط ایکشن سے بھرپور رہی۔ جانو کے انجام سے خوشی ہوئی۔ پہلا رنگ عبدالقیوم شاد کا "قید بامشقت" پڑھا۔ پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ باہر رہنے والے لوگوں کو اس سے عبرت پکڑنی چاہئے۔ مجموعی طور پر کہانی اچھی تھی۔ دوسرا رنگ سرور آرام کا تھا کہانی اچھی تھی لیکن خواب سی لگتی ہے۔ عجیب سا لگتا ہے کہ ایک قاتل کو پکڑنے کے لئے اتنا لمبا ڈراما کھیلا جائے۔ تیسرا رنگ بزدل کا تھا جو بہت پسند آیا۔ اب بات ہوجائے "لہو کے تاجر" کی بہت ہی فنٹاسٹک کہانی ہے پڑھ کر جھرجھری آگئی۔ باقی ابھی کوئی کہانی پڑھی نہیں کیونکہ عید کی وجہ سے مصروف تھی۔ عید کی وجہ سے سفر کرنا پڑا تو توبہ کرنی پڑی ہر طرف اونگا بونگا صاحب کی برادری بکھری پڑی تھی۔ مجال ہے جو لیڈیز کا احترام کرنا آتا ہو۔ سگریٹ تو یوں پی رہے تھے جیسے اس زمانے کے عامر خان تو یہی ہوں اور مزے کی بات تو یہ کہ راستے میں ہماری پولیس کے جانباز جوان گاڑیوں کو روک روک کر اپنی عیدی وصول کررہے تھے' واہ کیا شان ہے! وہ ہماری محفل میں پولیس والے بھی ہیں نا' ارے بھئی ان کی عیدی کتنی بنی؟ یہ آپ نے کیا کردیا یعنی پرنس اونگا بونگا صاحب کو انعام دے دیا حالانکہ انہوں نے اُلٹی سائڈ سے شروع ہوکر اپنی اُلٹی کھوپڑی کا ثبوت پیش کردیا ہے اور تبصرہ بھی کوئی اتنا خاص نہیں تھا۔ اس دفعہ کترنیں بہت اچھی تھیں۔"

ریحانہ ضیاء کی آمد بھالیہ سے "سب کام چھوڑ کر جاسوسی کی طرف متوجہ ہوئی تو سب سے پہلے ٹائٹل پر نظر پڑی بالکل گھٹیا ناموزوں اور بکواس سا ٹائٹل تھا۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری بک بک کا برا نہیں منائیں گے۔ (منائیں بھی تو کیا حاصل ہوگا؟) بہرحال وہی بیان کررہی ہوں جو دماغ نے سوچا تھا اگر برا لگے تو پھر میری بلا سے۔ (اور آپ کی بلا سے بہرحال ڈرنا چاہئے) پہلے بھی چینی نکتہ چینی پڑھتی تھی مگر اس دفعہ تو مزہ ہی آگیا۔ مس ایشیا نے تو مزہ ہی کردیا۔ ہمیں بہت خوشی ہوئی کہ وہ مردوں کا مقابلہ کرسکتی ہیں۔ (ابھی تو صرف باتیں ہی باتیں ہیں' زیادہ خوش نہ ہوں) سرکش اور شکاری میری پسندیدہ کہانیاں ہیں۔ پرواز عقاب زبردست تحریر کے طور پر انعام کی مستحق ہے' ہماری طرف سے نیک جذبات۔"

مس رخ خان کی رخ بدلتی باتیں' کراچی سے "اس بار تو ہم کوئی عید کارڈ جیسا خوب صورت سا سرورق دیکھنے کے لئے بے تاب تھے مگر سرورق دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے سائنس فکشن فلم دیکھتے رہے ہیں۔ خیر سرورق اس بار کافی انوکھا سا لگا۔ سرورق دیکھنے کے بعد میدانِ جنگ میں باوقار طریقے سے داخل ہوئے۔ محفل میں اپنا خط نہ پاکر اتنا دکھ نہیں ہوا جتنا پرنس اونگا بونگا صاحب کا انعام یافتہ تبصرہ دیکھ کر ہوا۔ تبصرہ نو بجے کا خبرنامہ لگا۔ (واہ! کیا تبصرے پر تبصرہ ہے) جیسے بونگا صاحب فرما رہے ہوں کہ پہلے خلاصہ پھر خبریں تفصیل کے ساتھ اور یہ اپنے کیپٹن رولا صاحب فضول میں سیاسی رولا ڈالتے رہتے ہیں ان کو ہمارا ایک مشورہ ہے کہ اپنا نام بدل کر تحریکِ استحقاق رکھ لیں۔ مس آتش فشاں زبردستی نمبر بڑھوانے کے چکر میں ہیں۔ ان کا تعلق طوفان گروپ سے زیادہ شیطان گروپ سے لگا۔ مس ایشیا کے تو کیا کہنے ہیں اب تو ان کے خط پڑھ کر ہمارا دل بھی گارڈن گارڈن ہونے لگتا ہے۔ (پھر تو آپ پر لازم ہے کہ ان کے گلے میں پھولوں کا ایک ہار ڈال دیں) اس کے بعد ہم کہانیوں کا کورٹ مارشل کرنے نکلے۔ سب سے پہلے شکاری پڑھی شکاری کی کیا تعریف کریں۔ چوہدری دلاور کی بہن غزالہ ہماری سمجھ میں نہیں آئی اور خدا جانے رابعہ کو کیا ہوگیا ہے؟ (کچھ بھی نہیں' بس رُخ بدل رہی ہے) کہانی بہت اچھے موڑ پر ختم ہوئی ہے اس کے بعد سرکش پڑھی۔ افضل سب ڈاکو مار کر زرتاج کی نظر میں ہیرو بن گئے۔ اس بار کہانی ایکشن سے بھرپور تھی' اس کے بعد پرواز عقاب پڑھی ایسی کہانی کبھی فراموش نہیں کی جاسکتی۔ لہو کے تاجر کہانی کی دوسری اور آخری قسط پڑھ کر ہی فیصلہ کریں گے ویسے پہلی قسط بھی بہت زبردست ہے۔ باقی کہانیوں سے ملاقات نہ ہوسکی کیوں کہ عید کی وجہ سے ہم بہت مصروف تھے یعنی کہ عید کی خوشی نے مجھ جیسی لڑکی کو دیوانہ بنادیا۔ کپڑا تھا قمیص کا پاجامہ بنادیا اور اب عید پر پاجامہ ہی پہننا پڑے گا اور ہاں انکل جی ہمارا عید کارڈ آپ تک پہنچایا نہیں' ہمیں بتا ضرور دیجیے گا۔" (آپ کا عید کارڈ مل گیا تھا' بہت شکریہ اس یاد فرمائی کا)

راحیلہ خان' کراچی سے "اپنا دوست جاسوسی اس دفعہ ذرا لیٹ ملا لیکن خیر مل گیا۔ آخر کسی نہ کسی طرح ظاہر ہے نظر تو پہلے ٹائٹل پر پڑنی تھی' ٹائٹل ذرا منفرد اسٹائل کا لگا پھر نظر دوڑائی تو پتا چل گیا کہ یہ کارستانی ذاکر نہیں بلکہ شاہد صاحب کی ہے۔ کچھ عجیب ہی اسٹائل تھا بلکہ ہے لڑکی کا۔ انعام یافتہ بھی اس دفعہ پرنس اے ٹی کشمیری کا تھا پسند آیا لیکن انکل اگر یہ واقعی تبصرے کی جھلکیاں تھیں تو تبصرہ کتنا ہوگا؟ (بس یوں سمجھ لو کہ شیطان کی آنت والی مثال کا ہمیں یقین آگیا تھا) ہماری طرف سے پرنس صاحب کو بہت بہت مبارک باد ہو۔ چینی نکتہ چینی اچھے دوستوں کی محفل ہے تو پھر یہ ہمارے دوستوں کو کیا ہوگیا ہے جو الگ الگ گروپ بنانے پر تلے بیٹھے ہیں اور پھر کیپٹن مشتاق صاحب سے تو مجھے ہرگز یہ اُمید نہ تھی کہ یہ بھی اپنا الگ

گروپ بنانے لگے ہیں۔ جناب آپ تو ہم سے پرانے قاری ہیں جاسوسی کے، ہم تو سمجھے تھے کہ آپ تو آپس میں صلح کرائیں گے لیکن آپ لوگوں نے تو الٹا اتنی پیاری سی محفل کو سیاست کا میدان بنانا شروع کردیا ہے۔ ایک یہ مس آتش فشاں کی کمی تھی سو وہ بھی پوری ہوگئی۔ سچ کی جھنڈی لہرائیں بھئی یہ عجیب عجیب نام رکھنے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ اپنے اصل نام سے دوستوں سے محبت سے اور تپاک سے ملئے لیکن جو بھی نیا داخل ہوتا ہے بجائے اس کے کہ محبت سے ملے یا باقی ساتھیوں کو سمجھائے وہ بھی اندر آکر الٹا لڑنے لگتا ہے۔ مشتاق صاحب بھی گروپ بنانا چاہتے ہیں۔ آتش فشاں بھی طوفان گروپ کے ساتھ آئی ہیں جن دوستوں کو ڈائجسٹ عزیز نہیں ہے تو میں تو یہ ہی سمجھوں گی کہ وہی گروپ بنانا پسند کریں گے۔ کم ازکم میں تو کسی طور پر قبول نہیں کروں گی۔ کراچی کے حالات کی طرح ہماری محفل کے حالات بھی کچھ اچھے نہیں رہے چند نقاب پوش دہشت گردوں نے شامل ہوکر محفل کو ایسا کردیا ہے۔ رخسانہ انجم کا تبصرہ بھی اچھا لگا۔ اس دفعہ اظہر صاحب بھی نظر آئے البتہ عاجز صاحب کافی عرصے سے غیر حاضر ہیں پھر تبصرے ہٹاکر کہانیوں کی طرف آئی سب سے پہلے شکاری کی طرف آئی۔ اس دفعہ کی قسط نے بھی کافی متاثر کیا۔ غزالہ کے اوہ سوری شیلا کے کردار میں ہم بھی الجھ گئے۔ رابعہ اس دفعہ بھی ڈیپریشن کا شکار رہی۔ اس کے بعد کہانی نمبر دو یعنی سرکش پڑھی۔ اس دفعہ بھی کہانی میں جان تھی پھر رنگوں کو دیکھا ہر ماہ کی طرح اس ماہ کا پہلا رنگ بھی عبدالقیوم شاد کا تھا' پڑھا تو ہے' پہلی کہانی "لہو کے تاجر" جو کہ علیم الحق حقی صاحب کی قلم کی تحریر تھی۔ حال ہی میں پیش آنے والے اسلام آباد والے واقعے سے میچ کرتی ہوئی تھی' یہ بھی پڑھی ہے۔ البتہ باقی کہانیاں معروفیت کی بنا پر نہ پڑھ سکی اس لئے تبصرہ یہیں پر ختم کرتی ہوں۔" (خدا کا شکر ہے کہ آپ نے تبصرہ ختم کردیا ورنہ آپ کی تحریر کو سمجھ سمجھ کر پڑھنے کی مشقت سے ہمارے سر میں درد شروع ہوچکا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جان بوجھ کر خراب لکھنے کی کوشش کی گئی ہے)

استر تیجران جاسوسی' کی آرا واہ کینٹ سے۔ "انکل مجھے سمجھ نہیں آتی کہ میں خط کا آغاز کس طرح کروں اور نہ ہی میں سمجھنا چاہتا ہوں۔ اس خط سے قبل میں دو خط آپ کی خدمت میں اس طرح بھیج چکا ہوں کہ ان پر میری قیمتی پاکٹ منی کا ایک بٹا دسواں حصہ یعنی onetenth خرچ ہوگیا مگر بقول شاعر! حسرت ان غنچوں پہ...! آج کے خط میں' میں کسی کہانی پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔ صرف اور صرف آپ پر اور آپ کی چینی نکتہ چینی پر اظہارِ خیال کروں گا کیونکہ آپ نے مجھے بڑا تنگ کرر کھا ہے۔ کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ آپ کا معیار کیا ہے اور کون سے خط آپ شائع کرتے ہیں۔ میں سوچ سوچ کر تھک گیا ہوں کہ آخر میرے خط شائع کیوں نہیں ہوتے۔ حالانکہ میں پورے بیس سال اور دو تین سو مہینوں کا ہوگیا ہوں اور میرے پورے بتیس دانت ہیں جبکہ چینی نکتہ چینی میں کئی حضرات و خواتین ایسے ہیں جن کے (۲۷) ستائیس دانت ہیں مگر ان کے خط شائع ہوتے چلے جارہے ہیں۔ مثال کے طور پر میں کیپٹن مشتاق اور ان کے چیلوں کا نام لوں گا۔ یقین کیجئے جس طرح یہ لڑرہے ہیں اس سے تو یہی لگتا ہے کہ ان کے ستائیس دانت ہیں۔ اس جنگ میں' میں مس جاسوسی اور ان کی دوسری ساتھیوں کے ساتھ ہوں۔ یہ خط میں اس امید پر بھیج رہا ہوں کہ اس سے بہتر سلوک کیا جائے گا۔"

فاروق احمد سیف کا 'بحرین سے محبت نامہ۔ "یہ سرکش ہی کا کمال ہے کہ مجھ جیسے شخص کو جو جاسوسی کو کبھی کبھار ہی ہاتھ لگاتا تھا اب مستقل قاری بنا دیا۔ چوہدری افضل جس خوبصورت انداز میں ہمارے معاشرے کی بدصورت معاشی' سماجی تصویر اور اخلاقی شکست وریخت نمایاں کررہے ہیں بہت خوب۔ اتنی اچھی تحریر کے لیے جناب محمود صاحب نے اللہ جانے کتنے رت جگے کیے ہوں گے۔ آخری تین کہانیاں تو بس آئینہ ہوتی ہیں آئینہ جن میں اللہ جانے کتنے لوگ اپنا چہرہ دیکھ کر نادم ہوتے ہوں گے۔ اپنے دیس کی خوشبو میں گندھی ہوئی کہانیاں جی کو اچھی لگتی ہیں۔ شکاری کا ٹیمپو بہت ست ہے! بہتر یہی ہے کہ کوئی خوبصورت موڑ دے کر اسے رخصت ہی کردیں! چینی نکتہ چینی کا نام بہتر ہے آپ مرچ مسالہ رکھ دیں۔ کیپٹن' پرنس اور مس جاسوسی جیسے لوگوں کو یہ پلیٹ فارم مہیا کرکے آپ نے بہت اچھا کیا ورنہ یہ لوگ کسی اسمبلی میں پہنچ کر ہی دم لیتے۔"

احمد سعید مومل قطب پور سادات سے رقم طراز ہیں۔ "مارچ کا شمارہ عید کے خاص موقع پر خاص شمارہ تھا۔ ہر کہانی خاص تھی اور سنسنی خیزی سے بھرپور تھی۔ ٹائٹل کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے چینی نکتہ چینی میں جاری جنگ کی فلم بن رہی ہو خیر کیمرے کی آنکھ سے بچتے ہوئے چینی نکتہ چینی کے ایوان میں داخل ہوئے۔ واہ کیا بات ہے یہاں پر ہر ایک اپنی عمر چھپانے کی کوشش کررہا ہے یعنی "عمر چور" انکل اگر چور بھی قائدِ ایوان بن گئے تو ایوان کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔ شائلہ شاہین کا تبصرہ اور مس ایشیا کا تبصرہ کسی لطیفے سے کم نہیں تھا' یہ دونوں بزرگ خواتین ذہنی مریضہ لگتی ہیں۔ ان کا علاج بہت ضروری ہے۔ اب چلتے ہیں کہانیوں کی طرف سب سے پہلے حقی صاحب کی "لہو کے تاجر' پڑھی۔ علیم الحق حقی نے بڑے اچھے انداز میں موجودہ واقع پر کہانی لکھی۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ پرواز عقاب' اس کہانی نے پہلی قسط سے آخری قسط تک بور نہیں ہونے دیا۔ اقبال کاظمی کی اس تحریر کو مدتوں تک یاد رکھا جائے گا۔ "شکاری' اور "سرکش' اس مرتبہ بہت خوبصورت اور سنسنی خیز تھیں۔ سرورق کے رنگوں میں عبدالقیوم شاد کی "قید با مشقت' بہت اچھی تحریر تھی۔ سرور اکرام کا "دوسرا شخص' بس گزارے لائق تھی اس کے بعد احمد اقبال کی "ادا + کار = اداکار" کی تو بات ہی اور ہے۔ احمد اقبال کی اس کہانی نے بہت متاثر کیا ہے۔"

خالد محمود حیدر کا گرامی نامہ 'ملتان کینٹ سے۔ "میں تقریباً عرصہ چار سال سے جاسوسی ڈائجسٹ کا مطالعہ کررہا ہوں مگر آپ کی اس محبتوں بھری محفل میں پہلی بار شرکت کی جسارت کررہا ہوں۔ اس دفعہ جاسوسی بہت دیر سے ملا۔ اس بار کا سرورق پسند آیا۔ دل کررہا تھا کہ ادھر ہی بیٹھ کر جاسوسی کو پڑھنا شروع کردوں لیکن انسان کی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔ جناب کینٹ میں پہنچ کر جاسوسی کا مطالعہ شروع ہوا۔ سب سے پہلے چینی نکتہ چینی میں جھانکا جناب پرنس اے بی کشمیری صاحب کا تبصرہ انعام کا مستحق قرار پایا۔ کشمیری صاحب کو بہت بہت مبارک باد قبول ہو۔ اس کے بعد جناب سرکش شروع کی اور ختم کرکے دم لیا۔ جاسوسی میں میری سب سے پسندیدہ کہانی سرکش ہے۔ "لہو کے تاجر' پڑھی۔ واقعی علیم الحق حقی صاحب نے ایک یادگار تحریر پڑھنے کو دی ہے۔ باقی کہانیاں ابھی پڑھنی ہیں اس لیے ان کے متعلق رائے محفوظ ہے۔ یہاں ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتا چلوں کہ میرا ایک دوست تھا سجاد احمد بہت اچھا دوست جس کی معرفت میں نے جاسوسی شروع کیا تھا۔ ہم اکٹھے پڑھتے رہے۔ تقریباً ایک سال ہوا ہے میرا وہ دوست اچانک غائب ہوگیا۔

اس کے لمر وا۔ ، امید ہے کہ وہ جہاں بھی ہوگا جاسوسی ڈائجسٹ ضرور پڑھتا ہوگا۔ خدا سے دعا ہے کہ مجھے میرا دوست اور والدین کو ان کا بچھڑا ہوا بیٹا مل جا۔

آشار مینگل کا مختصر نامہ' حیدر آباد سے۔ "ڈائجسٹ ہاتھ لگتے ہی ٹائٹل پر ٹائم ضائع کیے بغیر ہم دوستوں کی محفل میں پہنچے۔ یہاں کا اندھا قانون دیکھ کر ہمیں سخت مایوسی ہوئی۔ پرنس کشمیری کا اتنا بڑا تبصرہ ہم سے ہضم نہ ہوسکا۔ دو لمحے ضائع جانے کا افسوس رہا۔ باقی تبصروں میں مشتاق صاحب کا وہی فضول سا تبصرہ جس میں وہ اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں اور خواتین میں مس ایشیا' جاسوسی صاحبہ وغیرہ جو پتا نہیں اپنے آپ کو آسمان کی حور کیوں سمجھتی ہیں۔ "لہو کے تاجر' حقی صاحب کی ایک اچھی کاوش ہے۔ پرواز عقاب کاظمی صاحب کی ایک اچھی تخلیق تھی۔ شکاری ایک نیا موڑ اختیار کرچکی ہے۔ سرورق کے رنگوں میں شاد صاحب کی "قید بامشقت' ایک اچھی کہانی تھی۔ "دوسرا مخلص' سرور صاحب کی نہ سمجھ میں آنے والی تحریر تھی اور اداکار میں بزدل صاحب کی بزدلی اچھی لگی۔"

عبدالحمید کا تبصرہ' رنگپور بکھور سے۔ "چونکہ میں علاقہ تھل میں رہتا ہوں اس لیے ڈائجسٹ تقریباً ۵ یا ۶ تاریخ کو ملتا ہے۔ میرا پسندیدہ رسالہ جاسوسی ہے کیونکہ اس میں تمام کہانیاں ایک دوسرے سے بڑھ کر ہوتی ہیں اور خاص کر پہلی کہانی تو بہت ہی اچھی ہوتی ہے۔ البتہ آج کل شکاری بور کررہی ہے۔"

مبشر احمد ضیا' منڈی بہاؤالدین سے لکھتے ہیں۔ "میں تقریباً پندرہ سال سے آپ کا قاری ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ جاسوسی ڈائجسٹ کا قاری ہوں۔ یہ میری زندگی کا ساتھی تصور کرلیں۔ قسم سے پورا ماہ رسالہ اپنے بیگ میں رکھتا ہوں۔ مکمل پڑھ لینے کے بعد پھر بڑی توجہ سے چینی نکتہ چینی کو پڑھتا ہوں اور خوب لطف اندوز ہوتا ہوں۔ اس ماہ جاسوسی کا ٹائٹل زبردست رہا۔ میں بذات خود فوٹوگرافر ہوں۔ بہت سے قدرتی مناظر میرے کمرے کی خوبصورتی میں اضافہ کررہے ہیں۔ جاسوسی میں سرکش اور شکاری میری پسندیدہ کہانیاں ہیں اور ساتھ ہی آج کل پروازِ عقاب بڑا مزہ دے رہی ہے۔"

بیگم اے زیڈ ناہید کا مختصر نامہ' گجرات سے۔ "زندگی کے تقریباً ۲۵ سال گزر گئے ہیں جن میں سے ۸ سال جاسوسی کی رفاقت میں گزارے ہیں۔ کیا بتاؤں کیسے مزے سے دن مہینے اور سال گزر گئے۔ آج پہلی بار خط لکھ رہی ہوں امید ہے کہ میرے ان حروف کو ردّی کی ٹوکری کی نذر نہیں کریں گے۔ اس ماہ ٹائٹل بے حد پسند آیا۔ وہ اس لیے کہ میں خود فوٹوگرافی کرتی ہوں' یہ میرا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ سرکش اور شکاری دونوں مجھے بے حد پسند ہیں۔ پروازِ عقاب کی تمام قسطیں بے حد پسند آئیں۔ مزید تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں کیونکہ باقی رسالہ ابھی میری پہنچ سے دور ہے۔" (بات سمجھ میں نہیں آسکی کہ رسالہ کیوں آپ کی پہنچ سے دور ہے؟)

اور اب ان قارئین کے نام جن کے خطوط جگہ کی کمی کے باعث شاملِ اشاعت نہ ہوسکے۔ شاہد علی تشنہ' پانوین۔ پرنس احسان الحق حقانی اور محمد نواز صابر' رباط۔ محمد صادق کالا براواں' سیالکوٹ۔ احمد رضا' گلشن اقبال۔ غلام نبی سرہندی' ٹیاری۔ سیما سید' سواتے خان۔ رانا محمد قاسم الطاف' بیلہ۔ خالد نواز عامر' کوہاٹ۔ حوالدار کلرک احمد شیر ملک' پشاور۔ طاہر شاہ' کوئٹہ۔ کشور حسین' کراچی۔ پرنس اے بی کشمیری' بہاول پور۔ شبنم کوکب' اکال گڑھ۔ محمد نعیم' اٹک۔ مرزا تنویر احمد ناچیز' بوہڑیاں (بھائی تبصرے کو تبصرہ ہی رہنے دیا کرو' رپورٹنگ نہ بناؤ)

قارئین' چینی نکتہ چینی کے لئے مخصوص صفحات کا کوٹہ تمام ہوا۔ آئندہ ماہ تک کے لئے اجازت دیجیے۔ بہ شرطِ زندگی پھر ملاقات ہوگی۔۔۔ محبتوں کے اسی صدراہے پر۔۔۔ خدا حافظ

بوسنیا کے کوچہ و بازار میں ناچتی وحشتوں کا احوال

رقصِ ابلیس

فرحان شیخ

سوویت یونین کی شکست و ریخت کا عمل شروع ہوا تو وسط ایشیا کی مسلمان ریاستوں کو آزادی کے سانس میسر آئے لیکن اس موقع پر وہ اسلام دشمن قوتیں بھی بے نقاب ہوگئیں جو بہ ظاہر ساری دُنیا میں انسانی حقوق کی علمبردار بنی ہوئی ہیں اور اس موقع کی تاک میں رہتی ہیں کہ ہر مُسلم مُلک کو مخصوص پابندیوں میں جکڑ کر رکھا جائے ورنہ اُسے دہشت گرد قرار دے دیا جائے.

بوسنیا ہرزگوینا کی خود مختاری یورپ کے متعصب ذہنوں نے قبول نہ کی اور قتل و غارت گری کا وہی کھیل شروع کر دیا جس کا مظاہرہ تقسیمِ ہند و پاک کے وقت ہندو ذہنیت نے کیا تھا۔ زیرِ نظر داستان کا مرکزی کردار اُس وقت بھی سب کچھ لٹا کر پاکستان آیا تھا اور پھر ایک کاروباری سفر اُسے میں اس وقت بوسنیا لے گیا جب وہاں سرب درندوں کی وحشت و بربریّت کا رقص شروع ہونے والا تھا۔

ایک پاکستانی کے جذبۂ اسلامی کا احوال۔ اُس نے اپنے مسلمان بھائیوں کا ساتھ نہ چھوڑا

شملہ ۱۹۴۷ء

وہ اپریل کے آخری ہفتے کی ایک دوپہر تھی۔

بوڑھا رنگ علی بستی سے تقریباً نصف میل دور گنگناتی ہوئی پہاڑی ندی کے کنارے اخروٹ کے درختوں کے سائے میں بیٹھا سوت کی رسّی بٹ رہا تھا۔ وہاں سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر شملہ کی طرف سے آنے والی وہ سڑک تھی جو بستی میں سے ہوتی ہوئی سرسبز پہاڑیوں میں بل کھاتی' نارکنڈہ کی طرف چلی گئی تھی۔ شملہ سے چالیس میل کے فاصلے پر ہندوستان تبت شاہراہ پر واقع نارکنڈہ سیب کے باغات اور خوب صورت مناظر کی وجہ سے پورے ہندوستان میں شہرت رکھتا تھا۔

رنگ علی ایک چھوٹی سی چرخی پر سوت کی رسّی بٹتے ہوئے بار بار شملہ کی طرف سے آنے والی سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تقریباً پانچ ہزار نفوس پر مشتمل یہ بستی شملہ سے تقریباً بیس میل کے فاصلے پر واقع تھی اور یہاں دن میں دو تین بسیں آیا کرتی تھیں جو اس بستی سے ہوتی ہوئی نارکنڈہ کی طرف چلی جاتی تھیں۔

آج ہفتے کا دن تھا اور رنگ علی کو اپنے بیٹے نصیر کا انتظار تھا۔ نصیر شملہ ریلوے اسٹیشن کے انجن شیڈ میں ملازم تھا۔ اتوار کو اس کی چھٹی ہوا کرتی تھی۔ وہ ہفتے کی شام سے ذرا پہلے یہاں آجایا کرتا تھا۔ شیڈ میں استعمال شدہ اور بعض اوقات غیر استعمال شدہ سوت وہی لایا کرتا تھا جس سے رنگ علی رسّیاں بٹتا رہتا تھا۔ رنگ علی اچھی طرح جانتا تھا کہ نصیر پانچ بجے سے پہلے کبھی نہیں آتا تھا لیکن آج دو بجے سے ہی اسے بیٹے کا انتظار لگ گیا تھا۔

پہاڑ کے دامن میں یہ چھوٹی سی بستی بڑی پُرسکون اور بڑی خوب صورت تھی۔ مکان زیادہ تر لکڑی کے بنے ہوئے تھے۔ تمام مکانوں کا طرزِ تعمیر ایک جیسا ہی تھا۔ چھتیں خیمے کی طرح دونوں طرف سے ڈھلوان تھیں۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ مون سون کے موسم میں یہاں بڑی شدید بارش ہوا کرتی تھی اور پانی چھتوں پر رکنے کے بجائے بہہ جاتا تھا جس سے چھتوں کو نقصان نہیں پہنچتا تھا۔

اس بستی کی آبادی تقریباً پانچ ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ ان میں ہندو بھی تھے' مسلمان بھی اور چند گھرانے سکھوں کے بھی تھے۔ بستی کا ہر شخص ایک دوسرے کا شناسا تھا۔ دلوں میں ایک دوسرے کا احترام تھا۔ وہ لوگ کئی نسلوں سے یہاں شیر و شکر ہو کر رہ رہے تھے۔ ایک دوسرے کی خوشیوں اور دکھ درد کے شریک تھے۔ کوئی ایک شخص بیمار ہوتا تو بستی کے سارے ہی لوگ اس کی عیادت کو چلے آتے۔ کسی گھر میں بیٹی کی شادی ہوتی تو ڈولی اٹھانے کے لیے چار کہاروں کے بجائے بستی کے بیسیوں لوگ کہار بن جاتے۔

بستی کے چاروں طرف سبزے سے ڈھکی ہوئی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں۔ سامنے والی پہاڑی کا منظر تو بے حد دلفریب تھا۔


BOSINA
KASHMIR
MUSLIMS
PALESTINE

سبزے سے ڈھکی ہوئی ڈھلان اس طرح تہ در تہ تھی جیسے قدرت نے بڑی بڑی سیڑھیاں بنادی ہوں جو اوپر تک چلی گئی تھیں۔

اس بستی کے لوگ درختوں کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے کیونکہ چاروں طرف پھیلے ہوئے یہ درخت ہی ان کا ذریعۂ معاش تھے۔ سیب، اخروٹ کے باغات اور..... چیڑ کے فلک بوس درختوں کے علاوہ یہاں ایسے درختوں کی بھی بہتات تھی جن کی لکڑی عمارتوں اور فرنیچر کے کام آتی تھی۔ باغات کے علاوہ اس بستی کے لوگ تھوڑی بہت کھیتی باڑی بھی کرتے تھے۔ باغات اور کھیتی باڑی کے علاوہ اس بستی کے لوگوں کے معاش کا ایک اور وسیلہ بھی تھا۔ گرمیوں کے موسم میں یہاں سیاحوں کی آمد و رفت شروع ہوجاتی۔ میدانی علاقوں کی شدید گرمی سے بچنے کے لیے بہت سے لوگ شملہ کا رخ کرتے اور پھر سیر و تفریح اور قدرت کی نیرنگیوں سے محظوظ ہونے کے لیے بہت سے لوگ اس بستی میں بھی آجاتے۔ یہاں کچھ لوگوں نے تو باقاعدہ ریسٹ ہاؤس بنا رکھے تھے اور بعض لوگ اپنے گھروں کے کمرے سیاحوں کو کرائے پر دے دیتے تھے جس سے انہیں معقول آمدنی ہوجاتی تھی۔

رنگ علی اسی بستی میں پیدا ہوا اور یہیں اس پر بڑھاپا آیا تھا۔ یہاں اس کی تھوڑی بہت زمین تھی اور اس کی ساری زندگی کھیتی باڑی کرتے ہوئے گزری تھی۔ نصیر اس کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ رنگ علی نے اس کی شادی بڑی دھوم دھام سے کی تھی اور جب نصیر کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تو اس وقت بھی بڑی خوشیاں منائی گئی تھیں۔

نصیر کچھ عرصہ تو باپ کے ساتھ کھیتی باڑی میں ہاتھ بٹاتا رہا لیکن پھر اچانک اس کے دماغ پر یہ بھوت سوار ہوا کہ شہر جاکر نوکری کرے گا۔ وہ بستی کے مڈل اسکول سے صرف چھ جماعت پڑھا ہوا تھا۔ رنگ علی نے اسے سمجھانے کی بے حد کوشش کی کہ اس جیسے ان پڑھ آدمی کو شہر میں کہاں نوکری ملے گی لیکن نصیر اپنی ضد پر قائم رہا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ شملہ چلا گیا۔

رنگ علی کی دو بیٹیاں تھیں۔ ایک شملہ میں بیاہی ہوئی تھی اور دوسری ابھی بن بیاہی تھی۔ زبیدہ کی عمر اس وقت بیس اکیس سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ بھرپور جوان اور بلا کی حسین تھی یہ لڑکی۔ وہ مست ہرنی کی طرح اپنی سکھیوں کے ساتھ اس بستی میں اور آس پاس مرغزاروں میں قلانچیں بھرتی رہتی مگر کیا مجال کہ بستی کے کسی نوجوان نے کبھی میلی آنکھ سے زبیدہ یا کسی اور لڑکی کی طرف دیکھا ہو۔

رنگ علی جلد سے جلد زبیدہ کے ہاتھ پیلے کرنا چاہتا تھا لیکن اب تک نہ تو کوئی ڈھنگ کا لڑکا مل سکا تھا اور نہ ہی رنگ علی کے پاس کچھ تھا کہ دے دلا کر لڑکی کو رخصت کرسکے۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس جیسے غریب گھروں میں بیٹیاں بر کے انتظار میں بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہوجاتی ہیں۔ اسے ہمیشہ یہ خوف لگا رہتا کہ رشتے کے انتظار میں زبیدہ کی عمر ہی نہ ڈھل جائے۔

نصیر کے شملہ چلے جانے کے بعد کھیتی باڑی اکیلے رنگ علی کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس نے اپنی زمین اپنے ہی محلے میں رہنے والے پریم چند کو بٹائی پر دے دی۔ نصیر کو شملہ ریلوے اسٹیشن کے انجن شیڈ میں نوکری مل گئی تھی۔ وہ شملہ میں اپنی بہن عذرہ کے پاس رہتا تھا۔ اس کا بہنوئی عبدالرشید میونسپل کمیٹی میں ہیڈ کلرک تھا۔ نصیر کا کھانا پینا بھی انہی کے ہاں تھا۔ اس کی تنخواہ کا بیشتر حصہ خود اس کی اپنی ذات پر خرچ ہوجاتا اور کچھ بچتا تو باپ کے ہاتھ پر لا کر رکھ دیتا۔ اس کی بیوی اور بچے کا خرچ بھی رنگ علی کو برداشت کرنا پڑتا تھا۔

رنگ علی کا دو منزلہ مکان بستی کے کنارے اس سرسبز پہاڑی کے عین سامنے واقع تھا جو ایک دلفریب منظر پیش کرتی تھی۔ گرمیوں کے موسم میں رنگ علی بھی اپنے مکان کی اوپر کی منزل کے تین کمرے سیاحوں کو کرائے پر دے دیا کرتا تھا جس سے کچھ اضافی آمدنی ہوجاتی تھی لیکن اس مرتبہ اپریل کا مہینہ ختم ہونے والا تھا مگر سیاحوں کی کوئی پارٹی اس بستی کی طرف نہیں آئی تھی۔

رنگ علی درختوں کے نیچے ندی کے کنارے بیٹھا اس بٹتے ہوئے ملک کے موجودہ حالات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کل شام محلے کے بعض دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی آتما رام کی بیٹھک میں موجود تھا۔ سب لوگ ملکی سیاست کے بارے میں بات کررہے تھے۔ انگریزوں کے ہندوستان چھوڑنے کی باتیں ہورہی تھیں۔ دہلی جیسے بڑے شہروں میں ہندو مسلم فسادات ہو رہے تھے۔ ہندو، فرنگیوں کے ساتھ مسلمانوں کو بھی ہندوستان سے نکالنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ جناح کے 'دو قومی نظریہ' کے تحت برصغیر کی تقسیم کا مطالبہ آخری اسٹیج پر تھا۔

ہندوستان کے بڑے شہروں میں ہندو مسلم فسادات کی خبریں تو اکثر سننے میں آتی رہتی تھیں مگر مخلوط آبادی پر مشتمل یہ چھوٹی سی بستی ابھی تک بالکل پُرسکون تھی۔ یہاں کے ہندو مسلم اب بھی شیر و شکر ہو کر رہ رہے تھے۔ ایک دوسرے کی خوشیوں اور دکھ درد میں شریک ہو رہے تھے۔ آتما رام کی بیٹھک میں روزانہ رات کو محفلیں جمتیں اور یہ عہد و پیماں کیے جاتے کہ پورے ہندوستان میں قیامت ہی کیوں نہ آجائے، اس بستی کا سکون برباد نہیں ہونے دیا جائے گا۔ ہندو، مسلم اور دوسرے لوگ مل کر آہنی دیوار بنے رہیں گے اور کسی کو اس دیوار میں رخنہ ڈالنے کی اجازت نہیں دیں گے۔

رنگ علی سوچ رہا تھا کہ غاصب فرنگی ہندوستان سے چلا جائے گا تو یہاں کے لوگوں کی تقدیر بدل جائے گی، غلامی سے نجات مل جائے گی، خوشحالی کا دور دورہ ہوگا۔

رنگ علی سوت کی رسّی بٹتے ہوئے یہ سب کچھ سوچ رہا تھا کہ کھنکتے ہوئے قہقہوں کی آواز سن کر چونک گیا۔ اس نے جھکا ہوا سر

اٹھا کر دیکھا۔ اس کی بیٹی زبیدہ اپنی دو سہیلیوں کے ساتھ اچھلتی کودتی اس طرف آرہی تھی۔ ان میں ایک شاردا تھی اور دوسری کامنی۔ شاردا، آتما رام کی بیٹی تھی اور کامنی ان کے پڑوس میں رہنے والے لالہ بھگت رام کی بیٹی۔ بھگت رام اور رنگ علی کے گھرانوں میں گہرے تعلقات تھے۔ کوئی انہیں دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ پڑوسی ہیں یا ایک دوسرے کے قریبی رشتے دار۔

”ارے! تم لوگوں کو کئی بار منع کیا ہے کہ اکیلی بستی سے اتنی دور مت آیا کرو۔“ رنگ علی نے رسّی بٹنے والی دستی چرخی روکتے ہوئے کہا۔

”اکیلی کب ہیں چاچا۔“ شاردا نے کہا۔ ”ہم تین ہیں اور پھر کامنی کا ویر سریش بھی تو ہمارے ساتھ ہے۔ وہ دیکھو، درختوں کے پیچھے چُھپ کر آرہا ہے۔“

رنگ علی نے گردن موڑ کر دیکھا۔ کامنی کا بھائی سریش کسی درخت سے تازہ توڑی ہوئی ایک پتلی سی شاخ ہاتھ میں گھماتا ہوا ان کی طرف آرہا تھا۔ سریش کی عمر چھبیس سال تھی۔ جوان ہونے کے بعد بھی رنگ علی کے گھر میں اس کی آمد و رفت اسی طرح تھی جیسے گھر ہی کا فرد ہو۔

”نمسکار چاچا۔“ اس نے قریب آکر رنگ علی کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

”جیتے رہو بیٹا۔“ رنگ علی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ ”آج تم کام پر نہیں گئے؟“

”نہیں چاچا، آج جی نہیں چاہا تھا اس لیے نہیں گیا۔“ سریش نے جواب دیا۔ وہ بستی کے بڑھئی احمد دین کے پاس کام کرتا تھا۔ اسے اگرچہ یہ کام کرتے ہوئے دو تین سال ہی ہوئے تھے لیکن احمد دین کی توجہ اور خود اپنی محنت و لگن سے وہ اخروٹ کی لکڑی کے نقشین فرنیچر کا بہت اچھا کاریگر بن گیا تھا۔

”ابا!“ زبیدہ نے رنگ علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اماں تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ تم نے آج دوپہر کی روٹی بھی نہیں کھائی۔“

”تم لوگ چلو، میں آرہا ہوں۔“ رنگ علی نے جواب دیا اور ایک بار پھر ہاتھ میں پکڑی ہوئی رسّی بٹنے کی چرخی چلانے لگا۔ تینوں لڑکیاں اور سریش ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے ہوئے بستی کی طرف چلے گئے۔ رنگ علی ان کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔

لڑکیوں کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد پہاڑیوں میں موٹر کے انجن کی گونج سن کر رنگ علی چونک گیا۔ اس نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ بل کھاتی ہوئی ڈھلوان سڑک پر بہت دور بس آتی ہوئی نظر آئی تو وہ اپنا سوت اور چرخی وغیرہ ایک تھیلے میں سمیٹ کر سڑک کی طرف چل دیا۔ کچھ ہی دیر بعد بس اس کے قریب آکر رک گئی۔ اس کا بیٹا نصیر نیچے اترا اور بس بستی کی طرف روانہ ہوگئی۔

”آج تم نے اتنی دیر کردی بیٹا۔“ رنگ علی نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”دیر کہاں ہوئی ابا۔ اسی بس سے تو آیا ہوں جو روزانہ اسی وقت آتی ہے۔“ نصیر نے جواب دیا۔ ”آج تنخواہ کا دن تھا۔ ورکشاپ سے ہم نے جلدی چھٹی کرلی تھی۔ موہن کو بازار سے کچھ چیزیں خریدنا تھیں جس کی وجہ سے کچھ وقت لگ گیا تھا لیکن ہم بروقت لاری اڈے پر پہنچ گئے۔ وہ بھی یہیں اُتر رہا تھا لیکن میں نے اسے روک دیا کہ بستی کے اڈے پر جا کر اُترنا لیکن تم یہاں بیٹھے کیا کررہے تھے ابا؟“ نصیر نے پوچھا۔

”تمہارا ہی انتظار کررہا تھا۔“ رنگ علی نے جواب دیا۔ وہ دونوں پگڈنڈی پر چل رہے تھے۔ ”تم سے ایک بات کرنی تھی۔ گھر میں تو شاید موقع نہ ملے اس لیے میں یہاں بیٹھا تمہارا انتظار کررہا تھا۔“

”خیریت تو ہے ابا! کوئی خاص بات؟“ نصیر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں خیریت ہی ہے۔“ رنگ علی نے جواب دیا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد پھر بولا۔ ”بات دراصل یہ ہے کہ دو تین دن پہلے لُدھیانہ سے کریم بخش آیا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کے لیے زبیدہ کا رشتہ مانگ رہا ہے۔ لڑکا لدھیانہ کی اناج منڈی میں آڑھت کا کام کرتا ہے۔ آٹھ جماعت پڑھا ہوا بھی ہے۔ میرے دیکھے بھالے لوگ ہیں۔ اچھا گھر ہے۔ کماؤ لڑکا ہے مگر تمہاری ماں کو شاید یہ رشتہ پسند نہیں ہے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ تم سے مشورہ کرلیا جائے۔“

”میں بھی ان لوگوں کو جانتا ہوں ابا۔ بہت اچھے لوگ ہیں۔ ویسے تمہارا کیا ارادہ ہے؟“ نصیر نے گردن گھما کر سوالیہ نگاہوں سے باپ کی طرف دیکھا۔

”میں تو چاہتا ہوں کہ زبیدہ کے ہاتھ جلد سے جلد پیلے کردیے جائیں اور وہ اپنے گھر کی ہوجائے۔ حالات دن بہ دن خراب ہوتے جارہے ہیں۔ کوئی بھروسہ نہیں، کس وقت کیا ہوجائے۔“

”کیسے حالات ابا؟“ نصیر نے اُلجھی ہوئی نگاہوں سے باپ کی طرف دیکھا۔

”سنا ہے کہ مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن کا مطالبہ مان لیا گیا ہے۔ فرنگی راج ختم ہوجائے گا۔ انگریز ہندوستان سے جانے کی تیاری کررہا ہے اور ملک تقسیم ہونے والا ہے۔ فسادات بڑھتے جارہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر مسلمان ایک الگ ملک میں رہنا چاہتے ہیں تو ہندوؤں کو کیا اعتراض ہے۔“

”یہ فسادات صرف بڑے شہروں تک ہی رہیں گے ابا، جہاں نفسا نفسی کا عالم ہے۔ بھلا ہماری بستی میں کوئی دنگا فساد کیوں ہونے لگا؟ یہاں تو سب لوگ ایک خاندان کی طرح مل کر رہ رہے ہیں۔ کسی ایک کو معمولی سی تکلیف ہوتی ہے تو سب دوڑے آتے ہیں۔ شہروں کی طرح تو نہیں کہ کسی کو یہ بھی معلوم نہیں، ان کے پڑوس میں کون رہتا ہے اور وہاں کیا ہو رہا ہے؟“

"خدا کرے ایسا ہی ہو لیکن مجھے آثار کچھ اچھے نظر نہیں آرہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ جتنی جلدی ممکن ہو' زبیدہ کے ہاتھ پیلے کردیے جائیں۔" رنگ علی نے جواب دیا۔

"تو پھر۔ تم چاچا کریم بخش کو ہاں کردو۔" نصیر نے کہا۔

"لیکن تمہاری ماں نہیں مانتی۔ وہ کہتی ہے کہ لڑکے کا رنگ کالا ہے اور منہ پر ماتا کے داغ ہیں۔ وہ تو اپنی بیٹی کے لیے کسی شہزادے گلفام کی تلاش میں ہے۔"

"شہزادے گلفام کے انتظار میں تو زبیدہ کی یہ عمر ہوگئی ہے۔" نصیر نے گہرا سانس بھرتے ہوئے جواب دیا۔ "چاچا کریم بخش اب کب آئے گا؟"

"اگلے اتوار کو۔" رنگ علی نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ اتوار کو میں بھی ہوں گا تو بات کرلیں گے۔" نصیر نے کہا۔

وہ اسی طرح باتیں کرتے ہوئے گھر پہنچ گئے۔ نصیر نے ماں کو سلام کیا اور ہاتھ میں پکڑا ہوا تھیلا اپنی بیوی سکینہ کو دے کر شیر خوار بچے کو اس سے لے لیا اور اسے پیار کرنے لگا۔

اسی رات کھانے کے بعد نصیر نے اپنی ماں سے زبیدہ کے رشتے کی بات چھیڑ دی۔ دونوں باپ بیٹا اسے قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن وہ ضدی عورت کسی طرح بھی مان کر نہیں دی۔ اس کی بس ایک ہی ضد تھی کہ لڑکا بدصورت ہے اور وہ اپنی چاند سی بیٹی کی شادی اس سے نہیں کرے گی۔

اگلے اتوار کو لدھیانہ سے کریم بخش آیا تو اسے رشتے سے انکار کردیا گیا۔

وقت پر لگائے اُڑا جا رہا تھا۔ اس بستی میں اگرچہ کوئی اخبار وغیرہ نہیں آتا تھا لیکن شملہ سے آنے والے لوگوں سے ملک کے حالات کا پتا چلتا رہتا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ملک بھر میں ہندو مسلم فسادات بڑھ رہے تھے۔ تمام بڑے بڑے شہران فسادات کی لپیٹ میں تھے۔ راہ چلتے میں چھرا گھونپنے کی وارداتیں عام ہو چکی تھیں۔ مسلمانوں کے گھروں اور دُکانوں کو لوٹا جا رہا تھا اور انہیں نذرِ آتش کیا جارہا تھا۔ بہت سے مسلمان خاندان اپنے گھربار چھوڑ کر ان علاقوں کا رخ کررہے تھے جو اُن کے خیال میں مسلمانوں کے لیے مجوزہ نئی مملکتِ پاکستان میں شامل ہونے والے تھے۔

آتما رام کی بیٹھک میں اب بھی رات کو محفلیں جمتی تھیں۔ رنگ علی جب بیٹھک میں جاتا تو سب لوگ خاموش ہوجاتے۔ رنگ علی کئی دنوں سے محسوس کررہا تھا کہ اس کے ہندو دوست اب اس سے کچھ چھپانے کی کوشش کررہے تھے۔ کوئی بات ہو رہی ہوتی تو اس کے آنے پر موضوع بدل دیا جاتا۔

رنگ علی کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اندر ہی اندر کوئی کھچڑی پک رہی تھی۔ آتما رام کے گھر میں اس نے وقتاً فوقتاً بعض ایسے ہندوؤں کو بھی آتے دیکھا تھا جو اس بستی کے رہنے والے نہیں تھے۔ وہ ایک آدھ رات آتما رام کے گھر رہتے اور پھر واپس چلے جاتے۔ رنگ علی نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ جب بھی کوئی ایسا اجنبی' آتما رام کے گھر قیام پذیر ہوتا' بستی کے بعض سرکردہ ہندو اس کے گھر میں گھسے رہتے۔ ان کا آمد و رفت کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اپنی سرگرمیوں کو دوسروں سے پوشیدہ رکھنا چاہتے ہوں۔

اگست کا مہینہ شروع ہوچکا تھا۔ پورا ہندوستان فسادات کی لپیٹ میں تھا۔ مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کیا جا چکا تھا۔ نئی مملکت پاکستان میں شامل ہونے والے علاقوں کا اعلان ہو چکا تھا اور ہندوستان کے کونے کونے سے مسلمان جوق در جوق ان علاقوں کا رُخ کررہے تھے۔

ایک روز شام سے کچھ پہلے رنگ علی اپنے گھر کے سامنے چارپائی پر بیٹھا حُقّہ گُڑگُڑا رہا تھا کہ ایک آدمی اس کے پاس آکر رک گیا۔ سلام دعا کے بعد وہ رنگ علی کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"میرا نام شفیع ہے' انبالہ کا رہنے والا ہوں۔ نارکنڈہ اپنے ایک عزیز کے پاس جا رہا تھا۔ بس یہاں بستی کے اڈے پر رُکی تو میں چائے پینے کے لیے ہوٹل میں چلا گیا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ بس یہاں پندرہ بیس منٹ رُکے گی لیکن دس منٹ بعد واپس آیا تو بس جا چکی تھی۔ یہ آخری بس تھی۔ مجھے رات گزارنی ہے۔ یہاں ایک دو ریسٹ ہاؤس ہیں تو مگر وہ ہندوؤں کی ملکیت ہیں اور میں وہاں ٹھہرنا نہیں چاہتا۔ دودھ دہی کی دُکان پر اعظم پہلوان نے بتایا تھا کہ آپ کے مکان میں رات گزارنے کے لیے کمرا مل سکتا ہے۔"

رنگ علی نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ شفیع کی عمر پینتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس نے سفید شلوار قمیص اور سر پر ٹوپی پہن رکھی تھی۔ پیروں میں سیاہ رنگ کے موکیشن تھے۔ خشخشی داڑھی اس کے چہرے پر بہت بھلی لگ رہی تھی۔

"کیوں نہیں بیٹا۔" رنگ علی نے کہا۔ "تمہیں یہاں رات گزارنے کو جگہ بھی مل جائے گی اور کھانا بھی۔ تمہارا سامان کہاں ہے؟"

"وہ تو بس میں ہی رہ گیا تھا۔" شفیع نے جواب دیا۔

"اوہ! یہ تو میں بھول ہی گیا تھا کہ تم بس سے رہ گئے تھے۔ کوئی قیمتی چیز تو نہیں تھی تمہارے سامان میں؟" رنگ علی نے پوچھا۔

"نہیں چاچا جی۔ چھوٹا سا سوٹ کیس تھا جس میں دو جوڑے کپڑے اور دو چار کتابیں تھیں۔" شفیع نے جواب دیا۔

وہ دونوں باتیں کر ہی رہے تھے کہ آتما رام اور لدھا رام بھی وہاں پہنچ گئے۔ لاری اڈے کے قریب لدھا رام کی کریانے کی دُکان تھی۔ وہ دونوں کچھ دیر تک کھڑے رنگ علی سے باتیں کرتے رہے۔ رنگ علی نے محسوس کیا تھا کہ وہ دونوں جتنی دیر وہاں کھڑے رہے تھے' شفیع کو بڑی تیکھی نظروں سے دیکھتے رہے تھے۔

رنگ علی نے شفیع کو مہمان سمجھتے ہوئے بیٹھک ہی میں اس

کے رات گزارنے کا بندوبست کردیا تھا۔ رات کو کھانے کے بعد وہ خود بھی دیر تک اس کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا تھا۔ شفیع انبالہ میں اسکول ماسٹر تھا اور نارکنڈہ میں اپنی بہن سے ملنے جارہا تھا۔ ملک کے موجودہ حالات کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے اس نے یہ سنسنی خیز انکشاف کیا کہ انبالہ شہر میں بھی ہندو مسلم فسادات شروع ہوچکے ہیں۔ دو دن پہلے ہونے والے ہنگامے میں دو مسلمانوں کو چھرا گھونپ کر ہلاک کردیا گیا تھا اور مسلمانوں کے کئی مکانوں کو نذرِ آتش کردیا گیا تھا۔

شفیع صبح پہلی بس سے نارکنڈہ چلا گیا لیکن رنگ علی کے سوچنے کے لیے بہت کچھ چھوڑ گیا۔ اس کے ایک دو روز بعد رنگ علی نے محسوس کیا کہ اس بستی کے ہندو نہ صرف اس سے بلکہ دوسرے مسلمانوں سے کھنچے کھنچے رہنے لگے تھے۔ وہ لوگ کئی نسلوں سے اس بستی میں رہ رہے تھے۔ بستی کے ان ہندوؤں سے رنگ علی کی نصف صدی کی رفاقت تھی۔ وہ سب اسی بستی کی فضا میں پل کر جوان ہوئے تھے اور پھر بڑھاپے میں قدم رکھا تھا لیکن وہ کئی روز سے محسوس کررہا تھا کہ اس بستی کی فضا بدل رہی تھی، گھٹن کا احساس بڑھ رہا تھا۔ ہندو اب مسلمانوں سے کترانے لگے تھے۔ سیدھے منہ ان سے بات نہیں کرتے تھے۔

رنگ علی کو صورت حال کی نزاکت کا کچھ احساس ہورہا تھا لیکن چند روز پہلے ہی تو اس بستی کے ہندوؤں اور مسلمانوں نے یہ عہد کیا تھا کہ پورے ہندوستان میں خواہ قیامت ہی کیوں نہ آجائے وہ اس بستی کا سکون برباد نہیں ہونے دیں گے اور بھائی چارے، پیار و محبت اور اتحاد کی اس فضا کو برقرار رکھیں گے جو صدیوں سے اس بستی میں قائم تھی لیکن اب یہ سب کچھ کیا ہورہا تھا؟

چند روز بعد رنگ علی نے نمایاں طور پر بستی کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی کا احساس کرلیا۔ کشیدگی روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔ ایک دوسرے کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھنے والوں کے دلوں میں کدورت بھر گئی تھی، نگاہوں میں میل آگیا تھا۔

رنگ علی بستی کے ہندوؤں کی پُراسرار سرگرمیوں سے پریشان تھا۔ آتمارام کے ہاں رات کی وہ محفلیں ختم ہوچکی تھیں۔ اب تو ہندو، مسلمانوں سے بات کرنے کے بھی روادار نہیں رہے تھے تو محفلیں کیسی؟ لیکن وہ اس حقیقت سے بے خبر بھی نہیں تھا کہ ہندوؤں کی خفیہ میٹنگز ہورہی تھیں اور بستی میں اجنبی ہندوؤں کی آمدورفت بڑھ گئی تھی۔

وہ ہفتے کا دن تھا۔ صبح کے گیارہ بجے تھے۔ رنگ علی لاری اڈے کے قریب اعظم پہلوان دودھ والے کی دُکان پر بیٹھا موجودہ صورت حال کے بارے میں باتیں کررہا تھا کہ شملہ سے آنے والی پہلی بس اڈے پر آکر رُکی۔ بس سے اترنے والے مسافروں میں اپنے بیٹے نصیر کو دیکھ کر اسے خوشی بھی ہوئی اور حیرت بھی۔ خوشی بیٹے کی آمد کی ہوئی تھی اور حیرت اس بات پر ہوئی تھی کہ نصیر ہفتے کے روز عام طور پر شام پانچ بجے والی بس پر آیا کرتا تھا مگر آج صبح ہی آگیا تھا۔

نصیر کے فوراً ہی بعد تین اور آدمی بھی بس سے اُترے تھے۔ وہ تینوں ہٹے کٹے تھے اور چہروں ہی سے چھٹے ہوئے بدمعاش لگتے تھے۔ وہ تینوں ہندو تھے اور انہیں پہلی مرتبہ یہاں دیکھا گیا تھا۔

"لو، تمہارا بیٹا آج صبح ہی آگیا ہے لیکن یہ تینوں کون ہیں؟" اعظم پہلوان نے کہا۔

نصیر بس سے اُتر کر سیدھا اعظم پہلوان کی دُکان پر آیا تھا۔ اس نے باپ اور اعظم پہلوان کو سلام کیا اور پھر وہ دونوں باپ بیٹے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔

"آج تم سویرے کیسے آگئے؟" رنگ علی نے راستے میں پوچھا۔

"شملہ میں بھی ہندو مُسلم فسادات شروع ہوگئے ہیں ابا۔" نصیر نے جواب دیا۔ "تم تو جانتے ہی ہو کہ شملہ میں بندروں کی کس قدر اکثریت ہے اور یہ بندر لوگوں کو کس قدر پریشان کرتے ہیں۔ کل شام ایک بندر نے حلوائی کی کڑاہی اُلٹ دی۔ کھولتا ہوا دودھ ایک گاہک پر گرا جو بُری طرح جھلس گیا۔ حلوائی مسلمان تھا۔ بندر اس وقت ایک درخت پر چڑھ رہا تھا۔ حلوائی نے ایک اینٹ اٹھا کر بندر کو کھینچ ماری۔ اینٹ بندر کی کمر پر لگی۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ بندر کے شور کی آواز سن کر بہت سے لوگ جمع ہوگئے۔ ان میں سے بیشتر ہندو تھے۔ ایک آدمی نے چیخ کر کہا کہ ایک مُسلے نے ہنومان جی کی ہتیا کردی۔ کھولتے ہوئے دودھ سے جُھلسے ہوئے مسلمان گاہک سے کسی نے ہمدردی نہیں کی۔ سب کو ہنومان کی فکر تھی جو سڑک پر تڑپ تڑپ کر مرچکا تھا۔ پھر کیا تھا، ہندوؤں نے مسلمان حلوائی کو مار ڈالا اور اس کی دُکان لُوٹ کر جلادی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورے شہر میں ہنگامہ پھیل گیا۔ اس ہنگامے میں ایک ہندو اور تین مسلمان مارے گئے۔ صبح ذرا سکون تھا۔ بھائی عبدالرشید نے مجھے کام پر نہیں جانے دیا بلکہ زبردستی یہاں آنے کے لیے بس میں

سوار کرادیا۔"

"یہ تو بہت برا ہوا۔" رنگ علی کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ "یہ قتل و غارت گری ہمارے دروازے تک آن پہنچی ہے۔ اللہ خیر کرے۔"

دوپہر کو اعظم پہلوان' رنگ علی کے گھر پہنچ گیا۔ اعظم پہلوان کبھی کبھار رات کو اس کے گھر آجایا کرتا تھا لیکن دن کے وقت دُکان چھوڑ کروہ پہلی بار آیا تھا۔ اسے دیکھ کر رنگ علی کا ماتھا ٹھنک گیا۔ پریشانی اعظم پہلوان کے چہرے سے نمایاں ہو رہی تھی۔

"اعظم پہلوان! خیریت تو ہے' تم دُکان چھوڑ کر کیسے آگئے؟" رنگ علی نے پوچھا۔

"صبح وہ تین آدمی نصیر کے ساتھ بس سے اُترے تھے نا؟ ارے وہی بدمعاشوں جیسی شکل والے۔" اعظم پہلوان نے جواب دیا۔ "صبح بس سے اترتے دیکھ کر ہی مجھے ان پر شبہ ہوا تھا۔ میں تو صبح سے ان کی نگرانی کررہا ہوں۔ پہلے وہ ارجن کے گھر گئے پھر سریندر کے گھر جہاں ایک گھنٹا رُکنے کے بعد آتما رام کے گھر گئے۔ آدھا گھنٹا وہاں رُکنے کے بعد وہ رگھو کے ہوٹل چلے گئے جہاں کھانا ٹھونسنے کے بعد اب وہ اس کے چوبارے میں چارپائیوں پر پڑے اینڈ رہے ہیں۔ ابھی جب میں دُکان پر گیا تو اسی وقت دوسری بس بھی وہاں آکر رکی تھی۔ ایسی ہی منحوس شکلوں والے چار چھ آدمی اس بس سے بھی اترے تھے۔ وہ لوگ بھی رگھو کے ہوٹل کی طرف گئے ہیں۔ مجھے تو کچھ گڑبڑ لگتی ہے۔ تم ذرا ہوشیار رہنا۔ زبیدہ بٹی سے خاص طور پر کہنا کہ وہ گھر سے باہر نہ نکلے۔"

"اللہ خیر کرے۔" رنگ علی نے کہتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا۔ "ایک اور بات سنی تم نے؟"

"ہاں۔ گیارہ بجے آنے والی بس کی آمد کے تھوڑی ہی دیر بعد یہ بات پوری بستی میں پھیل چکی ہے کہ شملہ میں ایک مسلمان نے ہنومان کی ہتیا کردی ہے۔ میں اسی وقت سے بستی کے ہندوؤں کے تیور بھی بگڑے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔"

"بستی کے ہندو تو پُرامن لوگ ہیں۔ انہوں نے آڑے وقت میں ایک دوسرے کی مدد کا وعدہ کیا ہے۔ یہ لوگ کچھ نہیں کریں گے البتہ باہر سے آنے والے جو غنڈے اور بدمعاش یہاں جمع ہو رہے ہیں ان سے خطرہ ہوسکتا ہے۔ وہ بستی کا امن برباد کرنے کی کوشش کریں گے۔ میرا خیال ہے' ان کے بارے میں پریم چند اور آتما رام جیسے لوگوں سے بات کرنی چاہیے۔"

"بڑے بھولے ہو رنگ علی۔" اعظم پہلوان مسکرا دیا۔ "ہندوؤں میں رہ کر بوڑھے ہوئے ہو مگر ان کی فطرت کو اب تک نہیں سمجھ سکے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو زبان سے تو رام رام کی مالا جپتے رہتے ہیں مگر ان کی بغل میں چھری چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ موقع ملتے ہی پیچھے سے وار کردیتے ہیں۔ ہندوستان کے تمام شہروں میں یہی ہو رہا ہے۔ موقع پاتے ہی ہندوؤں نے اپنے مسلمان پڑوسیوں کو جانوروں کی طرح ذبح کر ڈالا' ان کے گھروں کو لوٹ کر آگ لگا دی' عورتوں کو سڑکوں پر بے آبرو کیا اور پھر انہیں زندہ جلا ڈالا۔ اب بھی پورے ہندوستان میں یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ مسلمان اپنے گھربار چھوڑ کر پاکستان کی طرف ہجرت کررہے ہیں لیکن راستے میں ان کے قافلوں پر حملے کیے جارہے ہیں' انہیں لوٹا جا رہا ہے' جانوروں کی طرح ذبح کیا جا رہا ہے۔ پریم چند اور آتما رام کے بارے میں کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔ یہ اسی قوم کے فرد ہیں جس کا خمیر جھوٹ' مکر و فریب' تعصب اور دھوکے کی مٹی سے اٹھایا گیا ہے۔ مجھے تو آثار کچھ اچھے نہیں لگتے۔ بچوں کو لے کر شام سے پہلے پہلے میرے گھر پر آجاؤ۔ تم جانتے ہو کہ میرے آس پاس مسلمانوں کے کئی گھر ہیں۔ اکٹھے رہیں گے تو ایک دوسرے کا سہارا رہے گا' کچھ حوصلہ رہے گا۔"

"میرا خیال ہے کہ کم از کم آج رات تو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ میں نے جیسے ہی کوئی گڑبڑ محسوس کی' بچوں کو لے کر تمہارے گھر پہنچ جاؤں گا۔" رنگ علی نے جواب دیا۔

اعظم پہلوان اسے خبردار رہنے کی تلقین کرکے رخصت ہوگیا۔ اس کے جانے کے بعد رنگ علی دیر تک بیٹھا صورت حال پر غور کرتا رہا۔ پھر جب اس کا دل نہیں مانا تو شام سے ذرا پہلے پریم چند کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں آتما رام اور بستی کے چند دیگر سرکردہ ہندو بھی موجود تھے۔ وہ کسی اہم مسئلے پر بات کررہے تھے۔ رنگ علی کو دیکھ کر خاموش ہوگئے۔

"آؤ رنگ علی! کیسے آنا ہوا؟" آتما رام نے کہا۔ اس کے لہجے میں کھردرا پن نمایاں تھا۔

"اچھا ہوا تم لوگ بھی یہاں موجود ہو۔ میں ایک بہت ضروری بات کرنے آیا تھا۔" رنگ علی نے ایک موڑھے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کہو' ہم سن رہے ہیں۔" اس مرتبہ پریم چند بولا۔

"میں نے سنا ہے کہ شملہ سے کچھ غنڈے اور بدمعاش یہاں آئے ہوئے ہیں۔ میں نے سوچا' تم لوگوں کو اطلاع کردوں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ لوگ یہاں کسی قسم کی گڑبڑ پھیلانے کی کوشش کریں۔" رنگ علی نے کہا۔

"ارے وہ لونڈے لپاڑے کیا کریں گے۔" آتما رام نے کہا۔ "میں ان میں سے دو تین کو جانتا ہوں۔ ان کا تعلق ہم جیسے شریف گھرانوں سے ہے۔ شملہ کے ہنگامے سے ڈر کر بھاگ آئے ہیں۔ ایک دو دن یہاں رہیں گے اور سیر و تفریح کرکے واپس چلے جائیں گے۔"

"پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں رنگ علی۔" پریم چند بولا۔ "ہم نے یہ عہد کیا ہے کہ کسی کو اس بستی کا سکون برباد کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ تم گھر جاؤ اور یہ اطمینان رکھو کہ جب تک ہم لوگ زندہ ہیں' کوئی تمہارے گھر کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں

"دیکھ سکتا۔"

رنگ علی کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا پھر گھر واپس آگیا۔ شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ نصیر گھر پر نہیں تھا۔ پوچھنے پر سکینہ نے بتایا کہ وہ اپنے دوستوں سے ملنے گیا ہوا ہے۔ رنگ علی اس وقت تک پریشان رہا جب تک نصیر گھر واپس نہیں آگیا۔

کھانا کھانے کے بعد وہ لوگ اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

رنگ علی اپنے کمرے میں چارپائی پر لیٹا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ سامنے والی چارپائی پر اس کی بیوی سو رہی تھی اور تیسری چارپائی زبیدہ کی تھی۔ زبیدہ کا کمرا اگرچہ الگ تھا لیکن رنگ علی نے آج اس کی چارپائی اپنے کمرے میں ڈلوالی تھی۔ نصیر اور سکینہ اپنے کمرے میں تھے۔

وقت کی رفتار جیسے تھم گئی تھی۔ ابھی گیارہ ہی بجے تھے لیکن لگتا تھا' بہت زیادہ رات بیت گئی ہو۔ اس وقت عام طور پر ادھر اُدھر سے کچھ نہ کچھ آوازیں آتی رہتی تھیں لیکن آج گہرا سناٹا تھا۔ اس سکوت میں کبھی کبھار کسی کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دیتی تو بڑا عجیب سا لگتا۔

رنگ علی اچانک چونک گیا۔ وہ دروازے پر دستک کی ہلکی سی آواز تھی جس نے اس کے کان کھڑے کردیے تھے۔ وہ چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دوسری مرتبہ دستک کی آواز سنائی دی تو رنگ علی نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ ٹھیک اسی وقت نصیر بھی اپنے کمرے سے نکل آیا۔

"کون ہے؟ اس وقت کون ہو سکتا ہے اتنی رات کو؟" رنگ علی نے کہا۔ اس کی آواز میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔

"میں دیکھتا ہوں ابا۔" نصیر نے باہر والے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "سریش ہوگا۔ اس نے کہا تھا کہ روٹی کھانے کے بعد میرے ساتھ شطرنج کھیلنے کے لیے آئے گا۔"

"لیکن اس وقت!" رنگ علی کے لہجے میں حیرت بھی تھی اور پریشانی بھی۔

"سریش کو تو تم جانتے ہی ہو ابا! ہمیشہ بے وقت آتا ہے۔" نصیر نے جواب دیا۔

رنگ علی' سریش کی اس عادت سے واقف تھا۔ جب نصیر آیا ہوا ہوتا تھا تو وہ رات بھر اس کے ساتھ بیٹھک میں شطرنج کھیلتا رہتا تھا۔

رنگ علی اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑا تھا۔ آنگن میں لکڑی کے ایک کھمبے پر لالٹین ٹنگی ہوئی تھی۔ اس کی مدھم سی روشنی پورے آنگن میں پھیلی ہوئی تھی۔ نصیر نے دروازہ کھول دیا پھر وہ یکدم پیچھے ہٹ گیا۔

"تک..... کون ہو تم لوگ.....؟"

اس کی آواز رنگ علی کے کانوں تک پہنچ گئی تھی۔ اس کی چھٹی حس نے فوراً ہی خطرے کی گھنٹی بجا دی۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف لپکا۔ اس دوران تین چار آدمی دروازے کو دھکیل کر اندر داخل ہو چکے تھے۔ ان کے چہروں پر ڈھاٹے بندھے ہوئے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں بندوق تھی' دوسرے کے ہاتھ میں خنجر اور دو کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں۔ انہوں نے نصیر کو دبوچ لیا۔ نصیر کے منہ سے چیخ نکلی مگر ایک نقاب پوش نے اس کا منہ دبا دیا۔

رنگ علی دروازے کی طرف دوڑا۔ وہ نصیر کو چھڑانے کے لیے نقاب پوشوں سے اُلجھ گیا۔ بوڑھا ہونے کے باوجود اس کے بازوؤں میں بے پناہ قوت تھی۔ اس نے خنجر والے کو دھکا دے کر گرا دیا لیکن عین اسی وقت ایک اور نقاب پوش نے اس کے سر پر ڈنڈے سے حملہ کیا۔ ضرب خاصی زوردار تھی۔ رنگ علی چیختا ہوا ڈھیر ہوگیا اور نقاب پوش' نصیر کو گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔

نصیر اور رنگ علی کی چیخوں کی آواز سن کر رنگ علی کی بیوی' بہو اور بیٹی بھی اپنے کمروں سے نکل آئیں۔ انہوں نے رنگ علی کو دروازے میں پڑے دیکھا تو چیختی ہوئی اس کی طرف دوڑیں۔ رنگ علی کے سر کی کھال پھٹ گئی تھی اور وہ بے ہوش تھا۔ سر سے بہنے والا خون اس کی گردن کو بھی تر کر رہا تھا۔ زبیدہ نے جلدی سے دروازہ بند کرکے کنڈا چڑھا دیا اور تینوں' رنگ علی کو اٹھا کر کمرے میں لے آئیں۔ منہ پر پانی کے چھینٹے دینے کے... تقریباً پندرہ منٹ بعد رنگ علی کو ہوش آسکا تھا۔

"وہ..... وہ لوگ نصیر کو لے گئے۔" رنگ علی اٹھتے ہوئے چیخا۔

"ہائے ہائے میرا بیٹا۔" رنگ علی کی بیوی نے سینے پر دوہتڑ مارا۔ "کون لے گئے میرے بیٹے کو؟"

"پتا نہیں کون تھے۔ ان کے چہرے ڈھاٹوں میں چھپے ہوئے تھے۔" رنگ علی بولا۔ "مجھے جانے دو۔ میں دیکھتا ہوں۔ بستی والوں کو اکٹھا کرتا ہوں۔"

وہ اٹھ کر باہر دوڑ گیا۔ اس کے سر پر اگرچہ خاصی چوٹ لگی تھی جس سے خون بہہ رہا تھا مگر بیٹے کی جان کے خوف سے وہ اپنی تکلیف بھول گیا تھا۔

نصیر کی بیوی سکینہ شیر خوار بچے کو گود میں اٹھائے زار و قطار رو رہی تھی۔ رنگ علی کی بیوی اللہ رکھی بیرونی دروازے کے قریب کھڑی چیخ رہی تھی۔ ان کے گھر کے ایک طرف مسلمانوں کا گھر تھا اور دوسری طرف بھگت رام کا۔ اللہ رکھی کے چیخنے کی آواز سن کر بوڑھا ہاشم تو گھر سے باہر آگیا مگر اور کسی نے اپنے دروازے سے باہر جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔ رنگ علی، بھگت رام کے مکان کا دروازہ دھڑ دھڑا رہا تھا۔

”بھگت رام! درواز کھولو۔ میرے بیٹے کی زندگی خطرے میں ہے۔ بھگت رام! جلدی سے دروازہ کھولو۔“ رنگ علی دروازہ پیٹتے ہوئے چیخ رہا تھا۔

تقریباً پانچ منٹ بعد بھگت رام نے دروازہ کھولا۔ اس کے ساتھ اس کا بیٹا سریش بھی تھا۔

”کیا بات ہے رنگ علی، کیوں چیخ رہے ہو؟“ بھگت رام کی آواز نیند میں ڈوبی ہوئی تھی اور لہجے میں ناگواری تھی۔

”وہ لوگ میرے بیٹے کو پکڑ کر لے گئے ہیں۔ نصیر کو بچالو بھگت رام۔“ رنگ علی روتے ہوئے بولا۔

”کون لوگ لے گئے ہیں تمہارے بیٹے کو؟“ بھگت رام نے پوچھا۔

”پتا نہیں وہ کون تھے۔ چہروں پر ڈھاٹے بندھے ہوئے تھے۔ میں نے نصیر کو بچانا چاہا تو ان میں سے ایک نے مجھے بھی زخمی کردیا۔ یہ دیکھو، سر سے خون بہہ رہا ہے۔“ رنگ علی نے بتایا۔

”دیکھو رنگ علی!“ بھگت رام خشک لہجے میں بولا۔ ”آدھی رات ادھر اور آدھی رات اُدھر۔ تم یہ بھی نہیں جانتے کہ تمہارے بیٹے کو لے جانے والے کون تھے۔ بستی کے لوگ سو رہے ہیں۔ شملے کے ہنگامے کی وجہ سے سب لوگ خوفزدہ ہیں۔ کوئی تمہاری آواز سُنے گا بھی تو دروازہ نہیں کھولے گا۔ تم اس وقت گھر جاؤ اور دروازے کو اچھی طرح اندر سے بند کرلو۔ صبح پتا کریں گے کہ وہ کون تھے اور تمہارے بیٹے کو کہاں لے گئے ہیں۔“

”تم سمجھتے کیوں نہیں بھگت رام! میرے بیٹے کی زندگی خطرے میں ہے۔ صبح تک نجانے کیا ہو جائے۔ سریش بیٹا!“ رنگ علی سریش کی طرف گھوم گیا۔ ”تم ہی کچھ کرو۔ تم دونوں تو ایک دوسرے کو بھائیوں کی طرح چاہتے ہو۔ اپنے دوستوں کو ساتھ لے کر نصیر کو تلاش کرو۔“

”رنگ علی، میری بات تو تم نہیں سمجھ رہے۔ آدھی رات کو کوئی بھی دروازہ نہیں کھولے گا۔ اب تم گھر جاؤ، صبح دیکھا جائے گا۔“ بھگت رام نے کہتے ہوئے دروازہ دھڑ سے بند کردیا۔

رنگ علی کچھ دیر بعد آتما رام کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا پھر اس نے پریم چند کا دروازہ کھٹکھٹایا مگر ان دونوں سے بھی بڑے خشک لہجے میں یہی جواب ملا کہ صبح دیکھا جائے گا۔

اب رنگ علی کو جیسے ہوش آگیا۔ وہ ان ہندوؤں کے بارے میں واقعی خوش فہمی میں مبتلا تھا۔ اب اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں لیکن پانی سر سے گزر چکا تھا۔ اعظم پہلوان نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ یہ اس قوم کے فرد ہیں جن کا خمیر جھوٹ، مکر و فریب، ریا، تعصب اور دھوکے کی مٹی سے اٹھایا گیا ہے۔ ان سے وفا کی توقع کرنا ایسا ہی ہے جیسے خونخوار بھیڑیوں کے غول میں گھر کر یہ توقع رکھی جائے کہ بھیڑیے کچھ نہیں کہیں گے۔

رنگ علی گھر واپس آگیا۔ اس کی بہو، بیٹی اور بیوی زار و قطار رو رہی تھیں۔ رنگ علی بھی روتا رہا اور وہ سب گڑگڑا کر خدا سے نصیر کی سلامتی کی دعائیں مانگتے رہے۔ وقت کا ایک ایک لمحہ صدیوں پر بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ رنگ علی بار بار کمرے سے نکل کر آسمان کی طرف دیکھتا کہ صبح کی روشنی کے آثار ظاہر ہوں تو وہ نصیر کی تلاش میں نکلے۔ اس کے سر میں تکلیف شروع ہوگئی تھی۔ گھر میں کوئی دوا وغیرہ تو تھی نہیں، زبیدہ نے کپڑا جلا کر راکھ زخم پر باندھ دی تھی جس سے خون بہنا بند ہوگیا تھا مگر چوٹ ٹھنڈی ہونے کے بعد اب تکلیف شروع ہوگئی تھی۔ جوان بیٹے کی جان کا خوف زیادہ تھا اس لیے وہ اپنی تکلیف کو نظرانداز کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

شاید چار بجے تھے کہ بستی کی خاموش فضا گولی کی آواز سے لرز اٹھی۔ یہ اس بستی کی پُرسکون فضا میں چلنے والی پہلی گولی تھی جس کی آواز وادی میں ارتعاش پیدا کرتی چلی گئی۔

رنگ علی گولی کی آواز سن کر اچھل پڑا۔ وہ صحن میں نکل کر آسمان پر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ گولی کی آواز کس طرف سے آئی تھی۔ اس نے مُڑ کر دیکھا، کمرے میں جلنے والی لالٹین کی روشنی میں اس کی بیوی، بیٹی اور بہو کے چہروں کی رنگت کچھ زیادہ ہی پیلی ہو رہی تھی۔ ان میں سے ہر ایک یہ سوچ کر ہی کانپ اٹھا تھا کہ یہ گولی نصیر کے سینے میں تو نہیں اتری۔

گولی کی آواز کی بازگشت ختم ہوتے ہی یوں لگا جیسے بستی میں چاروں طرف سے شور و غوغا کی آوازیں ابھر رہی ہوں۔ یہ آوازیں بتدریج بلند ہوتی گئیں۔ عجیب سا شور تھا۔ مارو۔ پکڑو۔ بچاؤ کی آوازیں بھی صاف سنائی دے رہی تھیں۔ لگتا تھا جیسے بلوائیوں کی فوج نے بستی پر حملہ کردیا ہو۔

رنگ علی دوڑ کر چوبارے میں آگیا۔ شور چاروں طرف سے سنائی دے رہا تھا۔ اور پھر دائیں طرف بستی میں ایک جگہ شعلے اٹھتے دیکھ کر وہ کانپ اٹھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ دوڑ کر نیچے آگیا۔

”زبیدہ کی ماں!“ وہ کمرے کے دروازے میں رک کر چیخا۔ ”دونوں لڑکیوں کو لے کر سکینہ والے کمرے میں چلی جاؤ۔ دروازہ اندر سے بند کرلو۔“

"کیا ہوا! یہ شور کیسا ہے؟" اللہ رکھی کی آواز کپکپا رہی تھی۔
"ہندو بلوائیوں نے حملہ کردیا ہے۔" رنگ علی نے جواب دیا۔ "میں نے پہلوان اعظم کے گھر کی طرف سے شعلے اٹھتے دیکھے ہیں۔"

اللہ رکھی، زبیدہ اور سکینہ کو لے کر دوسرے کمرے کی طرف دوڑی۔ اس کمرے کا دروازہ خاصا وزنی اور مضبوط تھا، اس کے جلد ٹوٹنے کی توقع نہیں تھی۔ ٹھیک اسی لمحے پچھلی گلی سے شور کی آواز سنائی دی۔ یہ ہندو بلوائیوں کا جتھا تھا جو جے رام، جے ہند کے نعرے لگاتا ہوا جا رہا تھا۔ رنگ علی کانپ کر رہ گیا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ہندو غنڈوں کا یہ گروہ اصغر سُنارے کے گھر کی طرف گیا تھا۔ اس کا مکان اسی گلی میں تھا۔

اللہ رکھی کمرے کا دروازہ بند کرنا ہی چاہتی تھی کہ بیرونی دروازہ زور زور سے دھڑدھڑایا جانے لگا۔ وہ سب کانپ اٹھے۔ موت ان کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ اسی لمحے ایک زوردار آواز سنائی دی۔

"چاچا رنگ علی! دروازہ کھولو۔ تمہارا بیٹا مل گیا ہے۔"
یہ ان کے پڑوسی بھگت رام کے بیٹے سریش کی آواز تھی۔ رنگ علی اسے بھی نصیر کی طرح ہی چاہتا تھا۔ رات کو اس نے روکھے پن کا مظاہرہ کیا تھا مگر بالآخر وہ اس کے بیٹے کو تلاش کر لایا تھا۔

"کھول رہا ہوں دروازہ سریش بیٹے، رک جاؤ۔" رنگ علی دروازے کی طرف لپکا۔

اللہ رکھی اور دونوں لڑکیاں بھی سریش کی آواز سن کر کمرے سے نکل آئیں۔ رنگ علی نے دروازہ کھول دیا۔ سریش دیوانہ وار اندر گھس آیا۔ اس کے ہاتھ میں برچھی تھی۔

"کہاں ہے میرا بیٹا؟ نصیر کہاں ہے؟" رنگ علی نے بے صبری سے پوچھا۔

"اس کے بیٹے کو اندر لے آؤ رامو! بڑا بے تاب ہو رہا ہے یہ بڈھا اپنے بیٹے کو دیکھنے کے لیے۔" سریش باہر کی طرف رخ کر کے بولا۔

تین چار آدمی کوئی چیز گھسیٹتے ہوئے اندر داخل ہوئے اور اسے آنگن میں پٹخ دیا۔

وہ نصیر تھا۔ رنگ علی کا بیٹا۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے اور جسم لہولہان تھا۔ جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جہاں گہرا زخم نہ ہو۔ چہرہ بھی خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ دونوں رخسار کٹے ہوئے تھے اور آنکھوں کی جگہ تاریک گڑھے نظر آرہے تھے۔ بازو صرف کلائیوں تک تھے۔ دونوں ہاتھ غائب تھے۔ اپنے بیٹے کی لاش اس حالت میں دیکھ کر رنگ علی ایک لمحے کو سکتے میں رہ گیا پھر سیدھا ہوتے ہوئے چیخا۔

"کس نے مارا ہے میرے بیٹے کو؟ میں اس کے ٹکڑے......"

رنگ علی کو جملہ پورا کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ سریش کی برچھی اس کے پیٹ میں پیوست ہوگئی۔ اس نے جب برچھی باہر کھینچی تو رنگ علی کے پیٹ سے خون کا فوارہ بہہ نکلا۔ وہ چیختا ہوا بیٹے کی لاش پر گر گیا۔

سکینہ، شوہر کی لاش دیکھ کر دھڑام سے کمرے کے سامنے گر گئی۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ اللہ رکھی چیختی ہوئی بیٹے کی لاش اور زخمی شوہر کی طرف دوڑی۔ وہ جیسے ہی قریب پہنچی، سریش نے اسے زوردار ٹھوکر رسید کی۔ وہ نیچے گر کر تڑپنے لگی۔

زبیدہ نے کمرے میں گھس کر دروازہ بند کرلیا۔ اس کا پورا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا اور وہ بری طرح چیخ رہی تھی۔ سریش اور اس کے دو ساتھی دروازے کو دھکے دینے لگے۔ دروازہ اگرچہ خاصا مضبوط تھا لیکن زیادہ دیر تک مزاحمت نہ کرسکا۔ سریش، زبیدہ کو گھسیٹ کر کمرے سے باہر لے آیا۔

"چھوڑ دو مجھے کمینے۔ چھوڑ دو۔ میں تمہاری بہن کی طرح ہوں۔ میں نے تمہیں ہمیشہ اپنا بڑا بھائی سمجھا ہے۔ مجھے چھوڑ دو شیطان۔" زبیدہ چیخ رہی تھی۔

"لیکن میں نے تمہیں کبھی اپنی بہن نہیں سمجھا۔ تم جب سے جوان ہوئی ہو، میرے سینے میں آگ لگی ہوئی ہے۔ آج میں یہ آگ بجھاؤں گا۔" سریش نے قہقہہ لگایا۔

"شرم کرو بے غیرت، میں تمہاری بہن......؟"

سریش جملہ پورا کرنے کا موقع دیے بغیر زبیدہ پر جھپٹ پڑا۔ اس نے لحہ بھر میں زبیدہ کا لباس تار تار کردیا۔ دو آدمی ہوش میں آتی ہوئی سکینہ پر پل پڑے تھے۔ اس کا لباس بھی تار تار ہو رہا تھا۔ رنگ علی ہوش میں تھا مگر اس میں اپنی جگہ سے ہلنے یا بات

کرنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ اللہ رکھی اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے چیخ رہی تھی۔ وہ سریش کو اس کے بھگوان اور دیوتاؤں کے واسطے دے رہی تھی مگر وہ شیطان کے پجاری تھے اور شیطان کے پجاریوں کے دلوں میں رحم نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔

”رامو! اگر یہ بڑھیا اب چیخے یا ان دونوں میں سے کوئی اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش کرے تو برچھیاں مار مار کران کے ٹکڑے کردو۔“ سریش چیخا۔

اس وقت پڑوس میں ہاشم کے گھر سے بھی چیخوں اور شیطانی قہقہوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

رنگ علی نے آنکھیں بند کرلیں‘ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں مگر زبیدہ اور سکینہ کی چیخیں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اس کے کانوں میں اتر رہی تھیں۔

ابلیس رقص کررہا تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو ان کے مسلمان ہونے کی سزا مل رہی تھی اور رنگ علی آنکھیں اور کان بند کیے سوچ رہا تھا کہ اس رقصِ ابلیس پر زمین کیوں نہیں تھرا اٹھی‘ آسمان کیوں نہیں کانپ اٹھا۔

○☆○

لاکھوں جانوں اور ماؤں‘ بہنوں‘ بیٹیوں کی عصمتوں کی قربانیاں دینے کے بعد بالآخر برِّصغیر کے مسلمانوں کو ایک علیحدہ وطن مل گیا۔ مسلمانوں کو انگریزوں اور ہندوؤں کی غلامی سے نجات مل گئی۔ پاکستان معرضِ وجود میں آگیا۔

قیامِ پاکستان کے وقت ہندوستان سے پاکستانی علاقوں کی طرف ہجرت کرنے والے مسلمانوں کے قافلوں پر ہندوؤں اور سکھوں نے حملے کرکے جس طرح مسلمانوں کا قتلِ عام کیا وہ ایک الگ خونچکاں داستان ہے لیکن حیرت چھ ماہ کے اس شیر خوار بچے پر تھی جو شملہ کی نواحی بستی میں مسلمانوں کے قتلِ عام سے بچ نکلا تھا۔ چھ ماہ کا یہ شیر خوار بچہ نصیر کا بیٹا اور رنگ علی کا پوتا شبیر تھا۔

بھگت رام کا بیٹا سریش اور اس کے غنڈے‘ نصیر کی لاش لے کر جب رنگ علی کے مکان میں داخل ہوئے تو ننھا شبیر اپنی ماں کے بستر پر میٹھی نیند سو رہا تھا۔ جب سریش اور اس کے ساتھیوں نے زبیدہ اور سکینہ پر دست درازی شروع کی تو چیخوں کی آواز سن کر اس معصوم بچے کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اپنے بستر پر پڑا ہاتھ پیر پٹختا اور روتا رہا مگر اس کے رونے کی آواز ماں اور پھوپی کی چیخوں کی آواز میں دب گئی۔ دن چڑھنے پر ہندو غنڈے‘ زبیدہ اور سکینہ کو گھسیٹتے ہوئے بستی سے نکال کر جنگل میں لے گئے۔ بستی میں دن بھر مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جاتی رہی۔

رنگ علی زخموں کی تاب نہ لاکر ختم ہوچکا تھا۔ اللہ رکھی زندہ تھی۔ وہ بھوک سے بلبلاتے بچے کو گود میں لے کر مکان سے باہر نکلی لیکن فوراً ہی ہندو غنڈوں کی نظروں میں آگئی۔ یہ نوجوان ہندو غنڈے اسی محلے کے رہنے والے تھے۔ چند روز پہلے تک یہی نوجوان‘ اللہ رکھی کو نانی اور دادی کہہ کر پکارا کرتے تھے لیکن اب تمام اخلاقی رشتے ختم ہوچکے تھے۔ انہوں نے بوڑھی اللہ رکھی پر ڈنڈوں اور لاٹھیوں سے حملہ کردیا۔ اللہ رکھی چیختی ہوئی زمین پر گر گئی۔ اس نے شیر خوار پوتے کو اپنے جسم کے نیچے چھپالیا تھا۔ اللہ رکھی لہولہان ہوگئی‘ اس نے اپنی جان دے دی لیکن پوتے پر آنچ نہیں آنے دی۔

بستی کے دو مسلمان اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ رہے تھے۔ انہوں نے اللہ رکھی کی لاش کے قریب ایک معصوم بچے کو بلبلاتے ہوئے دیکھا تو ان میں سے ایک نے اسے اٹھالیا اور سینے سے لگائے اپنے ساتھی کے ساتھ جنگل کی طرف بھاگتا چلا گیا۔ وہ لوگ چھپتے چھپاتے کسی طرح شملہ اور پھر وہاں سے انبالہ پہنچ گئے۔ چند مسلمان گھرانوں پر مشتمل ایک قافلہ انبالہ سے لدھیانہ کی طرف جانے کی تیاری کررہا تھا۔ انہوں نے ننھے شبیر کو ایک خاندان کے حوالے کردیا۔ مسلمانوں کا وہ قافلہ جالندھر اور کپور تھلہ سے ہوتا ہوا کسی نہ کسی طرح امرتسر پہنچ گیا۔ یہاں مسلمانوں کا ایک اور بہت بڑا قافلہ ٹرین کے ذریعے لاہور جانے کو تیار تھا۔ یہ لوگ بھی اسی قافلے میں شامل ہوگئے۔ امرتسر اور لاہور کے وسط میں ایک چھوٹے سے غیر آباد اسٹیشن پر ٹرین رک گئی اور تھوڑی ہی دیر بعد مسلح سکھوں کے ایک بہت بڑے جتھے نے ٹرین پر حملہ کردیا۔ لوٹ مار اور قتل وغارت کا بازار گرم ہوگیا۔ ننھا شبیر جس بوڑھی عورت کی آغوش میں تھا‘ وہ خون میں نہا گئی لیکن شبیر ایک بار پھر بچ گیا۔

اس قافلے کے لُٹے پٹے‘ بچے کھچے مسلمان بے سروسامانی کی حالت میں کسی نہ کسی طرح لاہور پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ والٹن کے مہاجر کیمپ میں داخل ہونے والے مسلمان مہاجرین میں شبیر بھی شامل تھا۔ بھوک سے ایڑیاں رگڑتے ہوئے شبیر کو مہاجر کیمپ کا دورہ کرنے والی ایک بے اولاد‘ دولت مند عورت نے گود لے لیا۔

اپنی ماں کی گود سے بچھڑنے کے بعد شبیر کئی ہاتھوں سے ہوتا ہوا بالآخر ایک ایسے گھر میں پہنچ گیا جہاں اب اسے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس گھر میں آسائش کی ہر چیز موجود تھی۔ وہ اس بے اولاد عورت کی شفقت بھری آغوش میں پرورش پانے لگا۔

سترہ سال کی عمر میں شبیر نے میٹرک کا امتحان پاس کرلیا۔ اس کی ”ماں“ اسے مزید پڑھانا چاہتی تھی لیکن شبیر کا میٹرک کا رزلٹ نکلنے کے ایک ہفتے بعد اس کے ”باپ“ کا انتقال ہوگیا۔ اس کے انتقال کے بعد شبیر کو انار کلی میں اس کی دُکان سنبھالنی پڑی اور اس طرح تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔

بیس سال کی عمر میں شبیر کی شادی کردی گئی اور اس کے اگلے سال وہ ایک بیٹے کا باپ بن گیا۔ بچے کا نام نصیر رکھا گیا۔ حالانکہ شبیر کو اس حقیقت کا علم نہیں تھا کہ نصیر خود اس کے باپ کا نام

تھا۔

○☆○

بوسنیا ۱۹۹۲ء

نصیر پچیس سال کا بھرپور نوجوان بن چکا تھا۔ اس نے پنجاب یونیورسٹی سے گریجویشن کرلیا تھا اور اب اپنے باپ کے ساتھ کاروبار میں اس کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ اس دوران شبیر اپنے کاروبار کو ترقی دے چکا تھا۔ امپورٹ کے سلسلے میں کئی یورپی ممالک سے اس کے رابطے تھے اور وہ اکثر کاروباری سلسلے میں ان ممالک کے دورے پر جاتا رہتا تھا۔ ایک دو مرتبہ اس نے نصیر کو بھی بعض ممالک کے دورے پر بھیجا تھا۔ نصیر کو غیر ممالک بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ کاروبار کی اونچ نیچ کو اچھی طرح سمجھ لے۔

بعض کمیونسٹ ممالک سے بھی شبیر کے کاروباری تعلقات قائم تھے۔ ان میں یوگوسلاویہ سرِفہرست تھا۔ وہ ۱۹۹۱ء کی پہلی سہ ماہی تھی۔ شبیر کو ایک اہم کاروباری سلسلے میں یوگوسلاویہ جانا تھا لیکن اچانک اس کی طبیعت خراب ہوگئی۔ اس نے نصیر کو تمام معاملات سمجھا کر یوگوسلاویہ جانے کے لیے تیار کرلیا۔

گیارہ سال تک افغانستان میں پٹنے کے بعد روس کی فوجیں افغانستان سے نکل چکی تھیں۔ اس کے فوراً ہی بعد سوویت یونین میں شکست و ریخت کا عمل شروع ہوگیا۔ تقریباً ایک صدی تک کمیونزم کی غلامی کی زندگی بسر کرنے والی وسط ایشیا کی مسلمان ریاستیں آزاد ہو رہی تھیں۔ افغانستان سے روس کی بدترین شکست اور سوویت یونین کے اندر ٹوٹ پھوٹ اس صدی کا اہم ترین واقعہ تھا۔ اس کے اثرات دنیا کے دیگر کمیونسٹ ممالک پر بھی رونما ہونے لگے۔

یوگوسلاویہ کی دو کمپنیوں سے شبیر کے تجارتی تعلقات تھے۔ ایک زغرب میں اور دوسری موستار میں تھی۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد اٹلی کے شہر میلان بھی جانا تھا۔ اس طرح نصیر کو اس تجارتی دورے میں بیس بائیس دن لگ سکتے تھے۔ شبیر نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ کہاں کس انداز سے بات کرنی ہے۔

مارچ کی آخری تاریخیں تھیں۔ لاہور میں اگرچہ مارچ شروع ہوتے ہی گرمی کا آغاز ہوجاتا تھا لیکن زغرب کے ہوائی اڈے پر جہاز سے اترتے ہی نصیر کو بڑی شدت سے یہ احساس ہوا کہ اس نے اپنے ساتھ گرم کپڑے نہ لا کر بہت بڑی غلطی کی تھی۔ باپ کے اصرار کے باوجود اس نے صرف جرسی ساتھ رکھی تھی۔ جہاز کے لینڈ کرنے سے پہلے مسافروں کو بتا دیا گیا تھا کہ شہر کا درجۂ حرارت کیا ہے اور نیچے اترنے کے بعد انہیں کس قسم کی موسمی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ نصیر نے جہاز سے اترنے سے پہلے ہی جرسی پہن لی تھی لیکن یہ جرسی زغرب کے برفانی موسم کا مقابلہ کرنے کے لیے قطعی ناکافی تھی۔ ٹھنڈی اور یخ بستہ ہوا ہڈیوں کے گودے تک میں اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ جہاز سے اترنے کے بعد ائرپورٹ پر کسٹمز، امیگریشن اور دیگر امور سے نمٹنے اور ہوٹل پہنچنے تک ایک گھنٹا لگ گیا اور اس دوران وہ مسلسل ٹھٹھرتا رہا۔ ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے تو اس کے دانت بج رہے تھے اور ڈھنگ سے بات بھی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے ڈرائیور کو بتا سکا تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ ہوٹل میں اس کا کمرا پہلے سے مخصوص تھا۔ ہوٹل اور کمرے کی فضا خاصی گرم تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ بیڈ پر کمبل میں گھس گیا۔ اس نے سامان لانے والے ویٹر کو کافی لانے کے لیے بھی کہہ دیا تھا۔

نصیر پر بری طرح کپکپی طاری تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک کمبل میں دبکے رہنے اور گرم گرم کافی کے دو کپ پینے کے بعد اس کے حواس ٹھکانے آسکے۔ اس وقت دن کے گیارہ بجے تھے۔ جس کمپنی سے ان کے کاروباری تعلقات تھے اس کے ایم ڈی سے اسے آج ہی ملنا تھا۔ اس نے فون پر کمپنی کے ایم ڈی مسٹر گوڈنی کو اپنی آمد کی اطلاع دے دی اور اسے یہ بھی بتا دیا کہ وہ کہاں ٹھہرا ہوا ہے۔

"ویل ویل۔" مسٹر گوڈنی نے اس کی کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے والد مسٹر شبیر نے مجھے کل ہی فون پر تمہارے بارے میں اطلاع دے دی تھی۔ تم دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھاؤ گے۔ ساڑھے بارہ اور ایک بجے کے درمیان میں ڈرائیور کو بھیج دوں گا، تم اس کے ساتھ آجانا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں انتظار کروں گا۔" نصیر نے جواب دیا۔

کچھ دیر بعد نصیر ہوٹل سے باہر نکلا۔ سب سے پہلے اس نے ایک قریبی دکان سے موٹی اون کا سوئٹر اور بھاری سا اوور کوٹ خرید کر پہنا اور احمقوں کی طرح منہ اٹھائے سڑک پر ٹہلتا رہا۔ پچھلی رات یہاں بڑی شدید بارش ہوئی تھی اور آسمان اس وقت بھی بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ دو سوئٹر اور بھاری اوور کوٹ پہنا ہوا ہونے کے باوجود وہ سردی محسوس کر رہا تھا۔ لاہور میں رہتے ہوئے تعلیم کے دوران وہ دو تین مرتبہ اپنے دوستوں کے ساتھ برف باری کے موسم میں مری اور سوات وغیرہ جا چکا تھا لیکن زغرب جیسی سردی کا اسے کہیں بھی سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑی چوٹیوں کو چھو کر آنے والی ہوا کے جھونکوں میں خنجر کی سی کاٹ تھی۔ وہ زیادہ دیر تک باہر نہ رہ سکا اور بارہ بجے کے قریب ہوٹل واپس آگیا۔ ہوٹل کے ریسٹورینٹ میں بیٹھ کر اس نے گرم گرم کافی کا ایک اور کپ پیا اور اپنے کمرے میں آگیا۔

بارہ بج کر چالیس منٹ پر دروازے پر دستک کی ہلکی سی آواز ابھری۔ اس کا خیال تھا کہ ویٹر کافی کے برتن لینے آیا ہوگا یا مسٹر گوڈنی کا ڈرائیور ہوگا۔

"یس! دروازہ کھلا ہے۔ اندر آجاؤ۔" اس نے کرسی پر جیسے بیٹھے کہا۔

دروازہ کھلا اور ہوا کے ٹھنڈے جھونکے کے ساتھ جو قیامت اندر داخل ہوئی اسے دیکھ کر نصیر اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ بیس

اکیس کے لگ بھگ وہ ایک بے حد حسین لڑکی تھی لیکن اس نے جو لباس پہن رکھا تھا اسے دیکھ کر نصیر پر کپکپی سی طاری ہو گئی۔ بلاؤز پر اگرچہ اس نے سرخ رنگ کی جیکٹ پہن رکھی تھی لیکن اسکرٹ گھٹنوں سے اوپر تھا۔

"مسٹر ناصیر۔۔۔؟" لڑکی نے کمرے میں داخل ہو کر سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ناصیر نہیں نصیر۔" نصیر نے تصحیح کی۔ "یہ میرا ہی نام ہے لیکن تم شاید غلط کمرے میں آگئی ہو۔"

"میں بالکل ٹھیک جگہ پر آئی ہوں۔" لڑکی مسکرائی۔ "میرا نام لیزالی ہے اور مجھے مسٹر گوڈنی نے بھیجا ہے۔ تمہیں لینے کے لیے۔"

"مگر وہ تو ڈرائیور کو بھیجنے والے تھے۔" نصیر بولا۔

"ڈرائیور کو کسی اور کام سے بھیج دیا گیا تھا۔ میں مسٹر گوڈنی کی سیکریٹری ہوں۔ اگر تم تیار ہو تو چلیں۔ مسٹر گوڈنی ٹھیک ایک بجے لنچ پر تمہارا انتظار کریں گے۔" لیزالی نے جواب دیا۔

نصیر نے کرسی کی پُشت پر پڑا ہوا اوور کوٹ پہنا اور لیزالی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا۔

ہوٹل کے پارکنگ لاٹ میں سرخ رنگ کی ایک شاندار کار کے قریب رک کر لیزالی نے دروازہ کھولا۔ نصیر کے پسنجر سیٹ پر بیٹھنے کے بعد وہ خود بھی اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ گئی اور انجن اسٹارٹ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کار کا ہیٹر بھی آن کر دیا تھا۔ چند سکنڈ میں کار کے اندر کی فضا گرم ہو گئی۔

کار شہر کی مختلف سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔ ہر سڑک پر ٹریفک کا اژدحام تھا۔ فٹ پاتھوں پر راہ گیروں کی بھیڑ تھی۔ سڑکوں پر ہر قسم کی گاڑیوں کی بھرمار ہونے کے باوجود کہیں ایک لمحے کو بھی ٹریفک جام نہیں ہوا تھا۔ کوئی گاڑی آگے نکلنے کی کوشش میں دوسری گاڑیوں کا راستہ نہیں روک رہی تھی۔

کار شہر کی پُرہجوم سڑکوں سے نکل کر نواحی علاقے میں آگئی اور پھر ایک ایسی سڑک پر مُڑ گئی جو بل کھاتی ہوئی ایک پہاڑی پر چلی گئی تھی۔ پہاڑی درختوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف کہیں کہیں گیٹ بنے ہوئے تھے اور ہر گیٹ پر پرائیویٹ پراپرٹی کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ کار ایک ایسے ہی گیٹ میں داخل ہو گئی۔ بل کھاتی ہوئی سڑک مسلسل اوپر کی طرف جا رہی تھی۔ بالآخر تقریباً نصف میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد کار ایک عمارت کے پورچ میں رک گئی۔ درختوں میں گھری ہوئی سفید رنگ کی یہ دو منزلہ عمارت بہت خوب صورت تھی۔ پورچ میں پہلے سے دو گاڑیاں اور بھی کھڑی تھیں۔ لیزالی نے اپنی کار ان کے پیچھے روکی تھی۔

راہداری میں داخل ہوتے ہی لیزالی نے نصیر کو روک لیا اور اس کا کوٹ اتارنے لگی۔ نصیر رک کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا کر رہی ہو؟" اس نے بدحواس نگاہوں سے لیزالی کی طرف دیکھا۔

"تمہارا کوٹ یہاں ٹانگ دوں۔" لیزالی نے مسکراتے ہوئے لکڑی کے ایک خوب صورت اسٹینڈ کی طرف اشارہ کیا جہاں پہلے ہی دو تین کوٹ لٹکے ہوئے تھے۔

نصیر نے خاموشی سے اپنا کوٹ اتار کر لیزالی کے حوالے کر دیا جسے اس نے اسٹینڈ پر ٹانگ دیا اور نصیر کو لے کر ایک کمرے میں داخل ہو گئی۔ یہ وسیع و عریض کمرا ڈرائنگ روم کے طور پر آراستہ تھا۔ قیمتی ساز و سامان سے صاحبِ خانہ کی امارت کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

کمرے میں صوفوں پر تین افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے والے صوفے پر نیلے رنگ کے سوٹ میں جو شخص بیٹھا ہوا تھا اس کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ کلین شیو اور سر کے بال بالکل سفید تھے۔ اس کے ساتھ دوسرے صوفے پر ایک ادھیڑ عمر عورت بیٹھی تھی۔ اس کی عمر چالیس سے کچھ اوپر رہی ہو گی لیکن خاصی حسین عورت تھی۔ تیسرے صوفے پر بیٹھے ہوئے شخص کی عمر پینتیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ اس نے بھی نیلے رنگ کا کوٹ پہن رکھا تھا۔

لیزالی نے کمرے میں داخل ہوتے ہی نصیر کے نام کا اعلان کیا اور پھر کمرے میں موجود افراد کا اس سے تعارف کرانے لگی۔ سفید بالوں والا کمپنی کا چیئرمین مسٹر گوڈنی، ادھیڑ عمر اس کی بیوی البرٹہ اور تیسرا آدمی مسٹر مائیکل تھا جو کمپنی کے پروڈکشن کے شعبے کا سربراہ تھا۔ ان تینوں نے بڑی گرمجوشی سے نصیر کا استقبال کیا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے باتوں کے دوران انکشاف ہوا کہ لیزالی سیکریٹری نہیں گوڈنی کی بیٹی تھی۔ اس انکشاف پر نصیر نے چونک کر لیزالی کی طرف دیکھا۔ لیزالی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد بٹلر نے آکر بتایا کہ کھانا تیار ہے۔ وہ سب اٹھ کر کھانے کے کمرے میں آگئے۔ کھانے میں خاصا اہتمام کیا گیا تھا۔ کئی قسم کی ڈشز تھیں مگر یہ تمام کھانے نصیر کے لیے اجنبی تھے اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کھائے۔ بالآخر اس نے فرائی گوشت پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔

کھانے کے بعد وہ پھر ڈرائنگ روم میں آگئے۔ اس مرتبہ کاروباری موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔ مسٹر گوڈنی نصیر کو بتا رہا تھا کہ افغانستان میں روس کی شکست اور سوویت یونین میں ٹوٹ پھوٹ کی وجہ سے دوسرے ممالک بھی متاثر ہو رہے ہیں۔ مشرقی برلن، روس کے اثر سے نکل چکا ہے، دیوار برلن ڈھا دی گئی ہے اور یوگوسلاویہ بھی اس وقت تاریخ کے بدترین دور سے گزر رہا ہے۔ عام تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ یوگوسلاویہ کی ریاستوں کو بھی آزادی دے دی جائے گی۔ ان حالات کی وجہ سے ہر قسم کا کاروبار بالکل ٹھپ ہو کر رہ گیا ہے۔ بڑی بڑی تجارتی کمپنیاں دیوالیہ ہو رہی ہیں۔

مسٹر گوڈنی کی کمپنی الیکٹرانک کے آلات تیار کرتی تھی اور نصیر

کے باپ نے ان کے پاس تقریباً پانچ لاکھ ڈالر کی رقم پھنسا رکھی تھی۔ نصیر کی چھٹی حس خطرے کی گھنٹی بجا رہی تھی لیکن پھر اس نے یہ سوچ کر اپنے دل کو تسلی دی کہ انٹرنیشنل کمپنیاں عام طور پر ایسی کوئی حرکت نہیں کرتیں جس سے ان کی ساکھ متاثر ہو۔

"اب صورت حال یہ ہے مسٹر نصیر۔" مائیکل نے کہا۔ "خام مال دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے ہماری پروڈکشن تقریباً ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ تمہارے والد کے ساتھ ہمارے بہت پرانے کاروباری تعلقات ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہماری وجہ سے انہیں کوئی نقصان اٹھانا پڑے اس لیے ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ بعض دیگر ممالک میں ہمارا جو مال رُکا ہوا ہے وہ پاکستان بھجوا دیا جائے لیکن یہ معلوم کرنے میں دو تین دن لگ جائیں گے کہ ہمارا مال کہاں کہاں رُکا ہوا ہے۔"

"تم دو تین دن یہاں رہو۔ لیزالی تمہیں یہاں کی سیر و تفریح کرائے گی۔ اس دوران ہم تمام اعداد و شمار جمع کرلیں گے۔" مسٹر گوڈنی نے کہا۔

"ٹھیک ہے لیکن میں دو تین دن سے زیادہ نہیں رہ سکتا۔ اس کے بعد مجھے موستار جانا ہے اور پھر اٹلی۔" نصیر نے کہا۔

"مطمئن رہو، تمہیں اس سے زیادہ نہیں روکا جائے گا۔" گوڈنی نے جواب دیا۔

میٹنگ ختم ہوگئی۔ مسٹر گوڈنی اور مائیکل دفتر چلے گئے جبکہ نصیر وہیں بیٹھا لیزالی اور اس کی ماں سے باتیں کرتا رہا۔ چار بجے کے بعد جب نصیر نے رخصت ہونے کی اجازت چاہی تو لیزالی بھی اس کے ساتھ ہی نکل آئی۔

نصیر کار کی پسنجر سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور لیزالی ڈرائیونگ کر رہی تھی... لیزالی اسے شہر کے مختلف علاقوں کے بارے میں بتاتے ہوئے یوگوسلاویہ کے بحران کے پس منظر سے بھی آگاہ کر رہی تھی۔

چند چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے علاوہ تین بڑی ریاستیں کروشیا، بوسنیا ہرزیگوینا اور سربیا، یوگوسلاویہ کے اس وفاق میں شامل تھیں۔ یوگوسلاویہ کی آبادی تین بڑی قوموں عیسائی، مسلمان اور کمیونسٹوں پر مشتمل تھی لیکن تسلط کمیونسٹوں کا تھا۔ سوویت یونین کی ٹوٹ پھوٹ کے بعد یوگوسلاویہ کی ریاستوں نے بھی وفاق سے علیحدگی اور مکمل خود مختاری کا مطالبہ کردیا تھا۔ اس بحران نے ملک کی معیشت کو بُری طرح تباہ کردیا تھا۔

"عیسائی، مسلمان اور دوسری قومیں یہاں عرصے سے مل کر رہتی ہیں۔ چھوٹے موٹے جھگڑے تو ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن ان قوموں میں کبھی کوئی بڑا اختلاف نہیں ہوا لیکن...." لیزالی بتا رہی تھی۔ "جب سے ریاستوں نے آزادی اور خود مختاری کا مطالبہ کیا ہے، یہاں آپس میں کشیدگی بڑھ رہی ہے۔ مسلمان اپنے گھر چھوڑ کر ان علاقوں میں منتقل ہو رہے ہیں جہاں ان کی اکثریت ہے اور عیسائی اپنی اکثریت والے علاقوں کا رخ کر رہے ہیں۔ البتہ کمیونسٹ ہشت پا کی طرح پھیل رہے ہیں۔ وہ پورے یوگوسلاویہ پر اپنا حق جتاتے ہیں۔ کمیونسٹ اب کھل کر یہ دعویٰ کرنے لگے ہیں کہ وقت آنے پر وہ عیسائیوں اور مسلمانوں کو اس ملک سے نکال باہر کریں گے۔"

نصیر تین دن تک لیزالی کے ساتھ زغرب اور اس کے گرد و نواح کی سیر کرتا رہا اور بالآخر موستار کے لیے روانہ ہوگیا۔ مسٹر گوڈنی نے وہ کاغذات اس کے حوالے کردیے تھے جن کی رو سے یورپ کے تین ممالک سے ان کے مطلوبہ مال کی ترسیل ہونی تھی۔

موستار، ریاست بوسنیا کا ایک بڑا شہر اور تجارتی مرکز تھا۔ بوسنیا ہرزیگوینا مسلمان ریاست تھی۔ اس ریاست میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب اگرچہ ۴۵ فی صد تھا لیکن سربوں اور کروٹس نے ان کے حقوق سلب کر رکھے تھے۔ ان سے تیسرے درجے کے شہریوں کا سلوک کیا جا رہا تھا۔ مسلمانوں نے بھی خود مختاری اور آزاد مسلم ریاست کا اعلان کردیا تھا۔

نصیر کو موستار میں جس تجارتی کمپنی سے کاروباری معاملات طے کرنا تھے، اس کا مالک مسلمان تھا۔

کمپنی کے مالک علی لیزبلی نے نصیر کو ایک معزز مہمان کی طرح اپنے گھر میں ٹھہرایا۔ اس کی بیوی کا انتقال ہوچکا تھا۔ ایک اٹھارہ سالہ بیٹا تھا اور ایک تیرہ سال کی بیٹی۔ گھر کی دیکھ بھال کے لیے دو ملازمائیں موجود تھیں۔ علی کا بیٹا شجر علی ایک ذہین نوجوان تھا۔ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد وہ کمپیوٹر ٹیکنالوجی کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ وہ بہت جلد نصیر سے بے تکلف ہوگیا اور اس دن نصیر کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر سارا دن موستار شہر اور اس کے گرد و نواح کی سیر کراتا رہا۔ یہ علاقہ قدرتی حسن سے مالا مال تھا۔ شہر کے چاروں طرف سبزے سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں تھیں۔ شہر کی سیر و تفریح کے دوران شجر علی نے نصیر کو اپنے چند دوستوں سے بھی متعارف کرایا تھا۔ ان میں لڑکے بھی تھے اور لڑکیاں بھی۔ دو سرب لڑکوں نے بڑی خشمگیں نگاہوں سے نصیر کی طرف دیکھا تھا۔ وہ دونوں ہٹے کٹے نوجوان تھے۔ چہروں پر کرختگی نمایاں تھی۔

اس رات نصیر، شجر علی اور اس کی بہن شوانا کے ساتھ بیٹھا انہیں پاکستان کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ دونوں بڑی دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ اچانک باہر سے شور کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ یہ شور بڑھتا جا رہا تھا۔ اب فائرنگ کی آوازیں بھی اس شور میں شامل ہوگئی تھیں۔ شجر علی اٹھ کر باہر کی طرف دوڑا۔ نصیر بھی اس کے پیچھے ہی تھا۔ وہ جیسے ہی باہر نکلے، ایک دلچسپ منظر ان کے سامنے تھا۔ سیکڑوں لوگ سڑکوں پر جمع تھے، ان میں مرد بھی تھے، عورتیں بھی اور بچے بھی۔ وہ سب خوشی سے رقص کر رہے تھے۔ آتش بازی چھوڑی جا رہی تھی اور بعض لوگ ہوائی فائرنگ کر رہے تھے۔

بوسنیا کو آزادی مل گئی تھی۔ سرب اور کروٹس ظاہر ہے، مسلمان ریاست بوسنیا کی آزادی سے خوش نہیں تھے لیکن مسلمان اپنے گھروں سے نکل آئے تھے اور ناچ گا کر اپنی خوشی کا اظہار کررہے تھے۔ نصیر اور شجر علی بھی لوگوں کے اس ہجوم میں شامل ہوگئے۔ بوسنیا کے مسلمانوں کو آزادی ملنے پر جو خوشی تھی وہ تو تھی مگر نصیر کو شاید ان سے زیادہ خوشی ہوئی تھی۔ وہ والہانہ انداز میں ناچتے ہوئے اپنے جذبات کا اظہار کرتا رہا۔

رات بھر سڑکوں پر یہ ہنگامے جاری رہے۔ مسلمان خوشی سے ناچتے گاتے رہے۔ دن طلوع ہوتے ہی ان ہنگاموں میں اضافہ ہوگیا۔ شہر کی تقریباً ہر عمارت پر آزاد بوسنیا کا پرچم لہراتا ہوا نظر آرہا تھا۔ ہر شخص کے ہاتھ میں بوسنیا کا پرچم تھا۔ بچے چھوٹے چھوٹے پرچم لہراتے ہوئے خوشی سے ناچ گا رہے تھے۔

شام کا اندھیرا پھیلتے ہی شہر روشنیوں سے جگمگا اٹھا۔ پورے شہر میں چراغاں کیا گیا تھا۔ مسلمانوں کے گھروں کے در و دیوار رنگ برنگی روشنیوں سے جگمگا رہے تھے۔ شہر کے مختلف علاقوں سے مشعل بردار جلوس نکالنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ شجر علی بھی ان تیاریوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا۔ اسے اپنے محلوں کے بچوں کے مشعل بردار جلوس کی قیادت کرنی تھی۔ سیکڑوں مشعلیں اس نے اپنے ذاتی خرچ سے تیار کروا کے بچوں میں تقسیم کی تھیں۔ بچے اپنی اپنی مشعلیں روشن کررہے تھے اور جلوس مرکزی چوک کی طرف روانگی کی تیاری کر رہا تھا۔

نصیر ان کے قریب کھڑا بڑی دلچسپی سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ ننھے منے بچوں کے ہاتھوں میں جلتی ہوئی مشعلیں بڑا دلچسپ منظر پیش کررہی تھیں۔ یہ مشعل بردار جلوس روانہ ہونے ہی والا تھا کہ شہر کا شمالی علاقہ زبردست فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھا۔ پہلے تو لوگ یہی سمجھے کہ مسلمان آزادی کی خوشی میں ہوائی فائرنگ کررہے ہیں لیکن چند منٹ بعد ہی یہ خوفناک اطلاع ملی کہ مسلح سرب غنڈوں نے شہر کے شمالی علاقے پر حملہ کردیا ہے۔

یہ اطلاع ملتے ہی بھگدڑ سی مچ گئی۔ شجر علی کے اس مشعل بردار جلوس میں پچاس ساٹھ بچے شامل تھے۔ ان بچوں کو ان کے گھروں تک پہنچایا جانے لگا۔ نصیر بھی اس کام میں شامل تھا۔ وہ کئی بچوں کو ان کے گھروں تک پہنچا چکا تھا۔

شہر میں فائرنگ کی آوازیں پھیلتی جا رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد یوں محسوس ہوا جیسے پورے شہر میں محاذ کھل گیا ہو۔ ہر طرف سے فائرنگ کی خوفناک آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ نصیر دو بچوں کو ان کے گھروں پر چھوڑ کر لوٹ ہی رہا تھا کہ اس سڑک سے فائرنگ کی آوازیں گونجنے لگیں جہاں کچھ دیر پہلے بچے ایک جلوس کی صورت میں منظم ہو رہے تھے۔ نصیر گلی سے نکل کر سڑک پر آیا ہی تھا کہ مخالف سمت سے تیز رفتاری سے دو کاریں آتی ہوئی دکھائی دیں۔ ان کاروں پر سرب غنڈے سوار تھے اور آٹومیٹک رائفلوں سے سڑک کے دونوں طرف اندھا دھند فائرنگ کررہے تھے۔ فضا فائرنگ کی چیخ و پکار کی آوازوں سے گونج رہی تھی۔ سربوں کی اس فائرنگ سے کئی مسلمان شہید ہو کر گرے تھے اور کئی زخمی ہوئے تھے۔

نصیر نے بڑی تیزی سے سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی ایک کار کے پیچھے چھلانگ لگا دی۔ ٹھیک اسی لمحے وہ دونوں کاریں فائرنگ کرتی ہوئی تیزی سے گزر گئیں۔ نصیر اگر بروقت کھڑی ہوئی اس کار کے پیچھے چھلانگ نہ لگا دیتا تو اس کا جسم چھلنی ہو جاتا۔

پورا شہر ہنگاموں کی لپیٹ میں آچکا تھا۔ سرب اور کروٹس غنڈوں نے پورے شہر میں قیامت بپا کر رکھی تھی۔ وہ مسلمانوں کے گھروں میں گھس گھس کر انہیں قتل کررہے تھے۔ بوسنیا کے مسلمانوں کو ان کی آزادی کی سزا مل رہی تھی۔

تاریخ اپنے آپ کو دُہرا رہی تھی۔ چھیالیس سال پہلے برِ صغیر کے مسلمانوں کو آزادی کی سزا دی گئی تھی۔ لاکھوں مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور ان کی املاک کو نذرِ آتش کردیا گیا تھا۔ اب پھر منظر وہی تھا مگر اسٹیج بدل گیا تھا۔ چھیالیس سال پہلے برِصغیر میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی تھی اور اب شیطانی قوتوں نے خون کی ندیاں بہانے کے لیے یورپ کے اس خطے کا انتخاب کیا تھا جہاں اسلام کے نام لیوا آباد تھے۔ یہ طاغوتی قوتیں یورپ سے مسلمانوں کا نام و نشان تک مٹا دینا چاہتی تھیں۔

نصیر کار کے پیچھے سے نکل کر علی کے گھر کی طرف دوڑا۔ وہ بمشکل مکان کے دروازے تک پہنچ پایا تھا کہ سرب غنڈوں کا ایک گروہ فائرنگ کرتا ہوا اس طرف نکل آیا۔ مکان زمین کی سطح سے تقریباً چار فٹ اونچا تھا۔ دروازے تک پہنچنے کے لیے تین سیڑھیاں چڑھنا پڑتی تھیں۔ تمام مکان اسی طرح بنے ہوئے تھے اور سیڑھیوں کے نیچے مکانوں کے ساتھ ساتھ نو انچ چوڑی وہ گندی نالی تھی جس میں گھروں سے نکلنے والا پانی بہتا تھا۔ نصیر نے تیسری سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ سنساتی ہوئی ایک گولی اس کے بائیں بازو پر لگی اور وہ لڑکھڑا کر چیختا ہوا دروازے کے سامنے نالی میں گر گیا۔

مسلح سرب غنڈے سر پر پہنچ چکے تھے۔ وہ اندھا دھند فائرنگ کرتے ہوئے گزر گئے۔ کئی گولیاں نصیر کے سر کے اوپر سے گزر گئی تھیں۔ اگر وہ زخمی ہو کر نالی میں نہ گرتا تو شاید سرب غنڈوں کی فائرنگ سے زندہ نہ بچ سکتا۔ وہ سرب غنڈوں کے جانے کے بعد کافی دیر تک نالی میں پڑا رہا اور پھر وہ اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ ایک آدمی دوڑتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ اندھیرے میں نصیر اس کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا۔ وہ خاموشی سے اپنی جگہ پر دبکا رہا۔

وہ علی تھا جو دروازہ دھڑ دھڑا رہا تھا۔ اس نے جب شجر علی کا نام لے کر پکارا تو نصیر اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے منہ سے بے اختیار کراہ نکل گئی۔ سیڑھیوں پر کھڑا ہوا علی آواز

سن کر چونک گیا۔ وہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کا رخ نصیر کی طرف کر کے غرایا۔

"کون ہو تم؟ اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔ گولی مار دوں گا۔"

"مم.... میں نصیر ہوں۔" نصیر کے منہ سے بمشکل آواز نکل سکی۔

علی چھلانگ لگا کر سیڑھیوں سے اتر آیا۔ اس نے سہارا دے کر علی کو اٹھایا اور پھر اس کے بازو سے خون بہتے دیکھ کر چونک گیا۔

"اوہ! تم زخمی ہو۔" وہ بولا۔

"ہاں۔ مجھے گولی لگی ہے۔ سرب غنڈے فائرنگ کرتے ہوئے بھاگ رہے تھے' میں ان کی زد میں آگیا۔ بازو پر پہلی گولی لگنے کے بعد اگر میں نالی میں نہ گر پڑتا تو اس وقت میری لاش ملتی۔" نصیر نے کہا۔

علی اسے سہارا دے کر سیڑھیوں پر لے آیا اور شجر علی کو پکارتے ہوئے ایک بار پھر دروازہ دھڑدھڑانے لگا۔ چند منٹ بعد اس کی بیٹی شوانا نے دروازہ کھول دیا۔ خوف اور دہشت سے اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ علی' نصیر کو لے کر اندر داخل ہو گیا۔ شوانا نے دروازہ بند کرنے سے پہلے باہر جھانک کر دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا بھائی بھی ان کے ساتھ ہو گا مگر وہ نہیں تھا۔

"شجر کہاں ہے؟" شوانا نے کپکپاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"شجر گھر میں نہیں ہے!" علی اچھل پڑا۔

وہ نصیر کو لے کر کمرے میں آگیا۔ اس کے بازو سے ابھی تک خون بہہ رہا تھا۔ گولی کہنی سے ذرا اوپر گوشت چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ علی نے زخم صاف کر کے ڈریسنگ کر دی اور اٹھتے ہوئے بولا۔

"تم لوگ دروازہ اندر سے بند رکھنا' میں شجر علی کو دیکھتا ہوں۔"

وہ دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ علی نے پستول ہاتھ میں لے لیا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ شجر علی تھا جس نے اندر داخل ہو کر جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔

"سربوں اور کروٹس نے پورے شہر میں قیامت مچا رکھی ہے۔ مسلمانوں کو چن چن کر ہلاک کیا جا رہا ہے۔ کئی عمارتوں کو آگ لگا دی گئی ہے۔ شہر میں ہر طرف شعلے ہی شعلے نظر آ رہے ہیں۔ چچا حسین کے گھر کو بھی آگ لگا دی ہے۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے بچوں کو لے کر مکان سے نکل سکے ہیں۔ اب وہ اسی طرف آ رہے ہیں۔" شجر علی نے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد علی کا دوست حسین اپنی بیوی بچوں کو لے کر پہنچ گیا۔ حسین کی عمر پینتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ ایک کی عمر آٹھ اور دوسرے کی عمر چھ سال تھی۔ حسین کی بیوی ایک پرکشش عورت تھی۔ ان سب کے چہرے خوف سے دھواں ہو رہے تھے۔

"شہر کے حالات لمحہ بہ لمحہ بگڑتے جا رہے ہیں۔ سربوں اور کروٹس نے جو آگ لگائی ہے وہ آسانی سے بجھنے والی نہیں ہے اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تم لوگوں کو کچھ عرصے کے لیے کونجک بھیج دیا جائے۔ مراد اور باسیونی بھی اپنے بچوں کو لے کر یہاں پہنچنے ہی والے ہیں۔ شوانا' تم اپنی اور شجر کی ضروری چیزیں پیک کر لو۔ ان لوگوں کے آتے ہی تم لوگ روانہ ہو جاؤ گے۔ رات کی تاریکی میں شہر سے نکل جاؤ تو بہتر ہے۔" علی چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر نصیر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "نصیر بیٹا! مجھے افسوس ہے کہ یہاں آتے ہی تمہیں اس قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ تمہاری حفاظت میری ذمے داری ہے لیکن یہاں حالات نہایت مخدوش ہو چکے ہیں۔ تم بھی ان کے ساتھ ہی کونجک چلے جاؤ۔ وہاں میری بہن ہے اور وہ جگہ فی الحال محفوظ ہے۔"

"کیا آپ ایک مسلمان نوجوان سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنے میزبان اور محسن کو تنہا چھوڑ کر چلا جائے؟ یہ صرف آپ کی نہیں' ہر مسلمان کی جنگ ہے۔ یہ حق و باطل کی جنگ ہے۔ کفر و الحاد کے خلاف جہاد ہے اور آپ مجھے جہاد سے روکنا چاہتے ہیں۔" نصیر نے کہا۔

"میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔" علی نے کہا۔ "میں تمہیں جہاد سے روک نہیں رہا ہوں۔ یوں سمجھ لو کہ میں تمہیں خواتین اور بچوں کی حفاظت کے خیال سے ان کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ انہیں تمہاری زیادہ ضرورت ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ اب تم انکار نہیں کرو گے۔"

نصیر خاموش ہو گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد عقبی گلی میں دو گاڑیوں کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ علی نے پچھلا دروازہ کھول کر دیکھا' ایک کار اور ایک اسٹیشن ویگن گلی میں آکر رکی تھی۔ علی کی اپنی کار بھی گلی میں کھڑی تھی۔ آنے والی ویگن میں دو جوان لڑکیاں' دو بوڑھی عورتیں' تین بوڑھے اور چار بچے تھے جبکہ دوسری کار میں ایک جوان لڑکی' ایک ادھیڑ عمر عورت اور دو آدمی تھے۔

دوسری کار میں بیٹھے ہوئے دو آدمیوں میں سے ایک کے پاس روسی ساخت کی کلاشنکوف رائفل تھی جبکہ کسی اور کے پاس اسلحہ نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ علی نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا پستول نصیر کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"یہ اپنے پاس رکھ لو۔ شاید راستے میں اس کی ضرورت پڑ جائے۔ اس کے کلپ میں گیارہ گولیاں ہیں۔ فاضل راؤنڈ نہیں ہیں۔ اگر برا وقت آن پڑے تو احتیاط سے استعمال کرنا۔"

شجر علی اپنی کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ شوانا پچھلی نشست پر ڈھیر ہو گئی اور نصیر پسنجرز سیٹ پر بیٹھ گیا۔ علی نے اپنے

بیٹے شجر اور دوسری کار میں سوار مُراد اور باسیونی کو چند ہدایات دیں اور یہ مختصر سا قافلہ حرکت میں آگیا۔ اپنوں سے جُدا ہوتے ہوئے ہر آنکھ اشکبار تھی۔ کسی کو یقین نہیں آتا تھا کہ وہ دوبارہ ایک دوسرے سے مل سکیں گے یا نہیں۔

شہر فائرنگ سے گونج رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد بموں کے دھماکے بھی سنائی دے رہے تھے۔ شہر میں لاتعداد عمارتیں آگ میں جل رہی تھیں، شعلے آسمان سے باتیں کررہے تھے۔ یہ تمام مسلمانوں کی املاک تھی جسے متعصب سربوں اور کروٹس نے نذرِ آتش کردیا تھا۔

وہ لوگ مختلف سڑکوں اور گلیوں میں چکراتے ہوئے تقریباً ایک گھنٹے بعد شہر سے نکلنے میں کامیاب ہوسکے۔ شہر سے باہر نکلتے ہی انہوں نے ترتیب بدل لی۔ اب سب سے آگے مُراد اور باسیونی کی کار تھی۔ مُراد ڈرائیونگ کررہا تھا اور باسیونی کے پاس کلاشنکوف تھی۔ اس کے بعد اسٹیشن ویگن تھی اور آخر میں شجر علی والی کار۔ پسنجرز سیٹ پر نصیر پستول ہاتھ میں پکڑے بیٹھا تھا۔ یہ پستول اور باسیونی کی کلاشنکوف محض دل کی تسلی کے لیے تھی۔ نصیر جانتا تھا کہ اگر بُرا وقت آیا تو یہ معمولی سے دو ہتھیار ان کا دفاع نہیں کرسکیں گے کیونکہ وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ سرب غنڈے جدید ترین اسلحہ سے لیس تھے۔

شہر سے نکلتے ہی گاڑیوں کی رفتار تیز ہوگئی۔ چند میل تک یہ سڑک بالکل سیدھی چلی گئی تھی لیکن پہاڑی سلسلہ شروع ہوتے ہی گاڑیوں کی رفتار کم کرنی پڑی کیونکہ اب بل کھاتی ہوئی سڑک بتدریج بلندی کی طرف جارہی تھی۔ تقریباً پچاس میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک ہموار وادی میں داخل ہوگئے۔ اس وادی میں کہیں کہیں اِکا دُکا روشنیاں ٹمٹماتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی وہ بستیاں تھیں جو اس وادی میں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ علاقہ انگور کی کاشت کے لیے مشہور تھا۔ انگور کے باغات دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔

"اگر تھک گئے ہو تو میں ڈرائیونگ کروں؟" نصیر نے شجر علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ میرا خیال ہے کہ بوُدنا تک تو میں ہی ڈرائیو کروں گا، اس سے آگے تم سنبھال لینا۔" شجر علی نے جواب دیا۔

چاروں طرف تاریکی اور گہرا سناٹا تھا۔ شیشے بند ہونے کے باوجود تیز ہوا کی سائیں سائیں سنائی دے رہی تھی۔ اگر کار میں ہیٹر نہ لگا ہوا ہوتا تو شدت کی سردی میں ان کی قلفی جم چکی ہوتی۔

مزید بیس پچیس میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اگلی کار اور اسٹیشن ویگن کی رفتار کم ہونے لگی۔ شجر علی نے بھی بالآخر رفتار کم کردی اور تینوں گاڑیاں آگے پیچھے رک گئیں۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟" نصیر نے تاریکی میں گھورتے ہوئے پوچھا۔

"یہ جگہ بوُدنا موڑ کہلاتی ہے۔ یہاں سے ایک سڑک بائیں طرف ڈوبجی واکوف سے ہوتی ہوئی بنجالوکا کی طرف چلی گئی ہے اور دائیں طرف کو نیمک سے ہوتے ہوئے سرائیوو تک جانے والی سڑک ہے۔ بائیں طرف والی سڑک پر تقریباً چھ میل آگے بوُدنا نامی شہر ہے لیکن..... مجھے حیرت ہے کہ یہاں تاریکی کیوں ہورہی ہے۔ یہاں ایک گیس اسٹیشن اور دو چھوٹے چھوٹے ریسٹورنٹ ہیں جو رات بھر کھلے رہتے ہیں۔" شجر علی نے تاریکی میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"کہیں ہم راستے میں غلط سڑک پر تو نہیں مُڑ گئے؟" نصیر نے کہا۔

"نہیں۔ یہ وہی جگہ ہے۔ دائیں طرف مینار کا وہ ہیولہ دیکھ رہے ہو؟" شجر علی نے ایک طرف اشارہ کیا۔ "یہ مینار تقریباً دو سو سال پرانا ہے۔ کسی زمانے میں یہاں کاؤنٹ کا محل ہوا کرتا تھا لیکن اب اس محل کے صرف کھنڈر ہی رہ گئے ہیں۔ یہ مینار اس جگہ کی شناخت بن گیا ہے۔ ٹھہرو، میں دیکھتا ہوں۔ چچا باسیونی نجانے اپنی کار میں بیٹھے کیا کررہے ہیں۔"

شجر علی نیچے اتر گیا۔ نصیر بھی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ کار سے اترتے ہی ٹھنڈی ہوا کا تیز جھونکا نصیر کے چہرے سے ٹکرایا۔ سردی کی لہر اس کی ریڑھ کی ہڈیوں تک میں اترتی چلی گئی۔ اس نے اوور کوٹ کے کالر گردن تک اٹھا دیے اور ایک ہاتھ میں پستول سنبھالے شجر علی کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اگلی کار کے قریب پہنچ کر وہ رک گئے۔ مُراد اور باسیونی کار کے قریب کھڑے تھے۔

"کیا بات ہے، آپ لوگ یہاں کیوں رک گئے ہیں؟" نصیر نے پوچھا۔

"یہاں بھی موستار کی طرح تباہی پھیل چکی ہے۔" باسیونی نے کہا۔ "اس جگہ ایک مسلمان کا گیس اسٹیشن اور دو ریسٹورنٹ ہوا کرتے تھے۔ وہ ریسٹورنٹ بھی مسلمانوں کی ملکیت تھے لیکن اب صرف کھنڈر دکھائی دے رہے ہیں۔ لکڑی کے جلنے کی بُو بھی محسوس ہورہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آج دن میں کسی وقت سربوں نے یہاں حملہ کرکے سب کچھ تباہ کردیا ہے۔"

"یہ تو بہت برا ہوا۔" نصیر بولا۔

"میرا خیال ہے، ہمیں یہاں مزید رُکنے کے بجائے نکل جانا چاہیے۔" باسیونی بولا۔

"ٹھیک ہے۔ چلو گاڑیوں میں بیٹھو۔ دیر مناسب نہیں ہے۔" مُراد نے کہا۔

نصیر اور شجر علی اپنی کار کی طرف بڑھنے لگے۔ ٹھیک اسی وقت خاموش اور تاریک فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی مُراد علی کی چیخ بھی سنائی دی تھی۔ نصیر نے مُڑ کر دیکھا، مُراد اپنی کار کے دروازے کے سامنے گر چکا تھا اور باسیونی کار کے پیچھے پناہ

لینے کی کوشش کررہا تھا۔ شور کی آواز سن کر نصیر نے بائیں طرف دیکھا' آٹھ دس انسانی ہیولے درختوں کے جُھنڈ سے نکل کر شور مچاتے اور فائرنگ کرتے ہوئے ان کی طرف دوڑے آرہے تھے۔ نصیر اور شجر علی اپنی کار کے قریب پہنچ چکے تھے۔

"شجر علی!" نصیر کار کے پیچھے پوزیشن لیتے ہوئے چیخا۔ "شوانا کو لے کر سڑک کی ڈھلان پر جھاڑیوں کی طرف چلے جاؤ۔ میں انہیں روکتا ہوں۔"

شجر علی نے کار کا دروازہ کھولا اور شوانا کو بازو سے پکڑ کر باہر کھینچ لیا اور پھر اسے تقریباً گھسیٹتا ہوا سڑک کی ڈھلان پر جھاڑیوں کی طرف دوڑتا چلا گیا۔ نصیر کار کی آڑ میں پوزیشن لیے کھڑا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ کار کی چھت پر ٹکے ہوئے تھے اور اس نے پستول کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ سامنے سے دو آدمیوں کو اپنی طرف دوڑتے دیکھ کر وہ محتاط ہوگیا۔ تین چار آدمی اسٹیشن ویگن کی طرف اور دو تین باسیونی کی کار کی طرف دوڑ رہے تھے۔ باسیونی نے کلاشنکوف سے فائر کھول دیا۔ ایک آدمی ڈھیر ہوگیا اور باقی دو جوابی فائرنگ کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔

نصیر کی طرف آنے والے دونوں آدمی تقریباً پندرہ گز کے فاصلے پر تھے۔ نصیر نے ایک کو تاک کر پستول کا ٹریگر دبا دیا۔ گولی نشانے پر لگی اور وہ شخص چیختا ہوا نیچے گرا۔ اس دوران دوسرا آدمی فائر کرتا ہوا کار کے قریب پہنچ چکا تھا۔ نصیر جھک کر کار کی آڑ میں بیٹھ گیا۔ وہ شخص جیسے ہی کار سے آگے نکلا' نصیر نے اپنا پیر آگے کردیا۔ وہ شخص اس کے پیر میں اُلجھ کر لڑکھڑاتا ہوا منہ کے بل گرا۔ اس طرح لڑکھڑا کر گرنے کے باوجود آٹومیٹک رائفل اس کے ہاتھ میں رہی تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا' نصیر چھلانگ لگا کر اس کے سر پر پہنچ گیا اور ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اس شخص کی کھوپڑی پر فائر کردیا۔ اس کی کھوپڑی پاش پاش ہوگئی اور وہ شخص منہ سے آواز نکالے بغیر ڈھیر ہوگیا۔

نصیر نے جھک کر اس شخص کے ہاتھ سے آٹومیٹک رائفل جھپٹ کر پستول جیب میں ڈال لیا اور رائفل سنبھال کر دوبارہ کار کے پیچھے پوزیشن لے لی۔ وہ شخص جسے پہلے گولی لگی تھی' اٹھ کر دوبارہ آگے بڑھنے کی کوشش کررہا تھا۔ گولی غالباً اسے زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکی تھی۔ نصیر نے اس پر رائفل کا برسٹ مارا۔ وہ شخص چھلنی ہو کر ڈھیر ہوگیا۔ نصیر نے دوڑ کر اس کی رائفل بھی اٹھالی اور شجر علی کو آوازیں دینے لگا۔ شجر علی ایک منٹ میں اس کے پاس پہنچ گیا۔

"شوانا کہاں ہے؟" نصیر نے پوچھا۔

"اسے جھاڑیوں میں چھپا دیا ہے۔" شجر علی نے جواب دیا۔

"یہ رائفل پکڑو۔ اب ہم آسانی سے ان غنڈوں کا مقابلہ کر سکیں گے۔" نصیر نے کہا اور رائفل اس کی طرف بڑھا دی۔

اسٹیشن ویگن سے عورتوں اور بچوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اسی دوران دو سرب غنڈے دو لڑکیوں کو لے کر اسٹیشن ویگن سے اترے اور انہیں گھسیٹتے ہوئے درختوں کے جُھنڈ کی طرف لے جانے لگے۔ وہ لڑکیاں بری طرح چلا رہی تھیں۔ تین اور غنڈے ویگن میں سے دو اور عورتوں کو نیچے اتارنے کی کوشش کررہے تھے۔ نصیر نے فائر کھول دیا۔ ویگن سے عورتوں اور بچوں کی خوفناک چیخیں بلند ہوئیں۔ وہ سرب غنڈہ فائرنگ کرتا ہوا اب پیچھے کی طرف ہٹ رہا تھا۔ شجر علی کی رائفل کی دو گولیاں اس کے پیٹ میں لگیں مگر وہ سرب غنڈہ فائرنگ کرتا رہا۔ اس کی ایک گولی اسٹیشن ویگن کے فیول ٹینک پر لگی۔ ایک زوردار دھماکا ہوا اور ویگن کے پرخچے اُڑ گئے۔ ویگن میں موجود عورتوں' بچوں اور دونوں بوڑھوں کے بھی پرخچے اُڑ گئے۔ ان کے اعضا چاروں طرف بکھر گئے۔

باسیونی ابھی تک ڈٹا ہوا تھا۔ اس کے مقابلے پر دو سرب تھے جنہیں اس نے کار کے قریب نہیں آنے دیا تھا۔ اسٹیشن ویگن سے آگ کا گولہ بلند ہوا تو دونوں سرب غنڈے ایک لمحہ کو رک گئے۔ باسیونی نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں اپنی کلاشنکوف کی گولیوں سے بھون ڈالا۔

"شجر علی' باسیونی!" نصیر چیخا۔ "سرب غنڈے دو لڑکیوں کو لے گئے ہیں۔ میں ان کے پیچھے جارہا ہوں۔ تم لوگ یہاں کا خیال رکھو۔"

نصیر درختوں کے جُھنڈ کی طرف دوڑا۔ تقریباً پچاس گز آگے خطرناک ڈھلان تھی۔ بلند درختوں اور قدِ آدم جھاڑیوں میں آگے بڑھنے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ اس گھاٹی میں اترنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ نصیر کچھ دیر وہاں کھڑا رہا پھر واپس آگیا۔

اسٹیشن ویگن والوں میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچا تھا۔ ان کی لاشوں کے جھلسے ہوئے ٹکڑے چاروں طرف دور دور تک بکھرے ہوئے تھے۔ مراد کی لاش اپنی کار کے سامنے پڑی تھی۔ اس کا جسم گولیوں سے چھلنی تھا۔ یہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ انہوں نے مراد کی بیوی اور بیٹی کو شجر علی کی کار میں منتقل کردیا اور مراد کی لاش کار کی پچھلی سیٹ پر ڈال دی۔ اسٹیشن ویگن میں ہلاک ہونے والوں کے لیے وہ کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ شوانا اور دوسری دونوں عورتیں یہ سب کچھ دیکھ کر بری طرح چیخ رہی تھیں۔ کار کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں ایک بچے کی جھلسی ہوئی لاش کے اعضا دیکھ کر تو ان پر ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا۔ انہیں بڑی مشکل سے سنبھالا گیا۔ نصیر نے سرب غنڈوں کا اسلحہ جمع کرلیا۔ یہ آٹھ آٹومیٹک رائفلیں تھیں جس کا مطلب تھا کہ وہ تعداد میں دس تھے جن میں سے آٹھ مارے گئے تھے اور دو بھاگنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

"باسیونی! تم گاڑی چلا سکو گے یا نہیں؟" نصیر نے پوچھا۔

"میں گاڑی چلا لوں گا' تم میری فکر مت کرو اور اب یہاں

سے نکل چلو۔" باسیونی نے کہا اور کار کا دروازہ کھول کر اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ گیا۔

نصیر اور شجر علی اپنی کار میں آ گئے۔ نصیر نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ شجر علی پسنجر سیٹ پر بیٹھا' اس کی بہن شوانا اور مراد کی بیوی اور بیٹی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں اور وہ لوگ کو نجک کی طرف روانہ ہو گئے۔

انہوں نے ۲۱۵۵ میٹر بلند سلسلۂ کوہ پرنج میں مزید چند میل کا فاصلہ طے کیا تھا کہ بارش شروع ہو گئی۔ گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ بارش کی شدت میں تیزی آتی گئی۔ اونچی نیچی' بل کھاتی سڑک پر شدید بارش میں گاڑی چلانا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ انہوں نے گاڑیاں ایک محفوظ جگہ پر روک لیں اور بارش رکنے کا انتظار کرنے لگے۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک بارش ٹوٹ کر برستی رہی۔ پوری وادی میں جل تھل ہو گیا تھا۔ سڑک کئی فٹ پانی میں ڈوب گئی تھی۔

"میرا خیال ہے ہمیں کئی گھنٹوں تک یہاں رکنا پڑے گا۔ یہ پانی جلد اترنے والا تو نہیں لگتا۔" نصیر نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ پہاڑی علاقہ ہے' زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں پانی نشیبی علاقے کی طرف بہہ جائے گا۔" شجر علی نے جواب دیا۔

شجر علی کا کہنا درست ثابت ہوا۔ آدھے گھنٹے میں پانی اتر گیا۔ دس پندرہ منٹ مزید انتظار کرنے کے بعد وہ پھر آگے روانہ ہو گئے۔

وہ لوگ جب دریا کے پل پر پہنچے تو صبح کا اُجالا پھیل رہا تھا۔ کونجک نامی قصبہ ہائی وے سے ہٹ کر تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ایک پہاڑی کے دامن میں واقع تھا۔ جب وہ لوگ قصبے میں داخل ہوئے تو وہاں زندگی بیدار ہونا شروع ہو گئی تھی۔ ان کی آمد کی خبر چند منٹ کے اندر اندر پورے قصبے میں پھیل گئی۔ دونوں گاڑیاں شجر علی کے پھوپھا عالی جاہ کی حویلی میں رکی تھیں۔

عالی جاہ اس علاقے کا بہت بڑا زمیندار تھا۔ سیب اور انگوروں کے کئی باغات اس کی ملکیت تھے۔ اس علاقے کے لوگ اس کا بے حد احترام کرتے تھے۔ اس قصبے میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ کچھ عیسائی بھی تھے اور کیمونسٹ بھی۔ وہ کئی نسلوں سے یہاں اکٹھے رہ رہے تھے۔ ان میں کبھی کوئی جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ جب ہنگاموں کا آغاز ہوا تو قصبے کے کیمونسٹ اور عیسائی خوفزدہ تھے لیکن عالی جاہ اور قصبے کے دیگر سرکردہ مسلمانوں نے انہیں یقین دلایا تھا کہ یہاں انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔

عالی جاہ کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ انہوں نے ایک عیسائی بچے کو گود لے لیا تھا۔ پیٹرک جب آٹھ سال کا تھا تو اس کے والدین دریا میں کشتی اُلٹ جانے سے ڈوب کر ہلاک ہو گئے تھے۔ شجر علی کی پھوپی نے پیٹرک کو اپنی اولاد کی طرح پالا تھا اور اب پیٹرک چوبیس سال کا کڑیل جوان تھا۔

قصبے کے لوگوں کو جب شجر علی وغیرہ کی آمد کا پتا چلا تو وہ لوگ جوق در جوق حویلی میں جمع ہونے لگے۔ عورتیں آہ و زاری کر رہی تھیں اور شوانا' مراد کی بیوی اور بیٹی سے گلے مل مل کر رو رہی تھیں۔

مراد کی نعش کو کار سے اتار کر چارپائی پر ڈال دیا گیا تھا۔ کچھ لوگ اس کی تجہیز و تکفین کی تیاری کرنے لگے اور بالآخر سورج طلوع ہونے کے تھوڑی دیر بعد اسے قصبے سے تقریباً نصف میل دور قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ اس کے جنازے میں سیکڑوں لوگ شریک تھے۔

جنازے کے شرکا تدفین کے بعد مرحوم کی مغفرت کی دعا مانگ رہے تھے کہ ایک موٹر سائیکل سوار وہاں پہنچ گیا۔ وہ بے حد خوفزدہ اور بدحواس نظر آ رہا تھا۔

"وہ..... وہ سرب فوجی..... تین ٹرک ہائی وے سے قصبے کی طرف آ رہے ہیں۔" موٹر سائیکل سوار نے ہانپتے ہوئے کہا۔

دعا ختم کرتے ہی وہ لوگ قصبے کی طرف دوڑے۔ نصیر کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اب اس پُرامن اور پُرسکون قصبے میں بھی شیطانی رقص شروع ہونے والا ہے۔ جب وہ لوگ قصبے میں پہنچے تو ٹرکوں پر آنے والے لاتعداد سرب فوجی قصبے کو گھیرے میں لے چکے تھے۔ ان کے پاس جدید ترین اسلحہ تھا۔ قصبے میں آمد و رفت کے راستوں پر بھاری مشین گنیں نصب کر دی گئی تھیں۔

کچھ فوجی زبردستی مسلمانوں کے گھروں میں گھس کر تلاشی لے رہے تھے۔ مزاحمت کرنے والے کو گولی سے اڑا دیا جاتا۔ قصبے میں مختلف سمتوں سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ فائرنگ خوف و ہراس پھیلانے کے لیے سرب فوجی کر رہے تھے جو جدید ترین اسلحہ سے لیس تھے جبکہ قصبے کے مسلمانوں کے پاس کسی قسم کا اسلحہ نہیں تھا۔

قصبے کے نہتے مسلمانوں نے مقابلہ شروع کر دیا۔ سرب فوجی چُن چُن کر نوجوان مسلمانوں کو گولیوں کا نشانہ بنا رہے تھے۔ نوجوان لڑکیوں اور عورتوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر گھروں سے نکالا جا رہا تھا۔ اس قصبے کے وہ کیمونسٹ اور عیسائی بھی لوٹ مار اور قتل و غارت گری میں سرب فوجیوں کا ساتھ دے رہے تھے جو کئی نسلوں سے یہاں کے مسلمانوں کے ساتھ رہ رہے تھے اور قصبے کے مسلمانوں نے مصیبت کے وقت میں انہیں تحفظ اور سلامتی کی ضمانت دی تھی لیکن اب وہی کیمونسٹ اور عیسائی' سرب فوجیوں کے ساتھ مل کر اپنے محسن مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار رہے تھے۔ سربوں کو ان مسلمانوں کے گھروں کی نشاندہی کر رہے تھے جہاں جوان لڑکیاں تھیں اور جو دولت مند تھے۔

عالی جاہ کی حویلی قصبے کے مسلمانوں کے لیے پناہ گاہ بن گئی تھی۔ آس پاس کے گھروں کی عورتوں اور بچوں کو حویلی میں پہنچا دیا گیا تھا۔ حویلی میں صرف آٹھ آٹومیٹک رائفلیں تھیں جو نصیر وغیرہ نے بٹونا کے قریب حملہ آور ہونے والے سربوں سے چھینی تھیں۔ ان کے علاوہ دو پستول اور ایک توڑے دار قسم کی قدیم بندوق تھی۔

عالی جاہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ جدید اسلحہ سے لیس سرب فوجیوں کا مقابلہ نہیں کرسکیں گے لیکن انہوں نے زندگی کے آخری لمحات تک مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ عالی جاہ نے حویلی کے دروازے بند کروادیے اور اہم جگہوں پر اپنے آدمی متعین کردیے۔ کچھ ہی دیر بعد سرب فوجی حویلی کے سامنے پہنچ گئے اور مقابلہ شروع ہوگیا۔ سرب فوجی ہلکی مشین گنوں سے فائرنگ کررہے تھے۔ نصیر کے پاس آٹومیٹک رائفل تھی اور اس کی جیب میں علی کا دیا ہوا پستول بھی تھا۔ سرب فوج حویلی کا گیٹ توڑ کر صحن میں گھس آئے تھے۔ نصیر نے سامنے آنے والے دو سربوں کو چھلنی کردیا تھا۔ اس کے اپنے بازو میں شدید تکلیف تھی۔ زخم سے ایک بار پھر خون رسنے لگا تھا۔ اس سے رائفل سنبھالنا بھی مشکل ہورہی تھی۔ ایک سرب فوجی کو آگے آتے دیکھ کر اس نے رائفل کا ٹریگر دبا دیا۔ رائفل کھڑکھڑا کر رہ گئی۔ میگزین خالی ہوچکا تھا۔ سرب فوجی خونخوار درندے کی طرح آگے بڑھ رہا تھا۔ نصیر نے رائفل پھینک دی اور جیب سے پستول نکال کر فائر کردیا۔ گولی سرب فوجی کے حلق میں پیوست ہوگئی اور وہ چیختا ہوا ڈھیر ہوگیا۔

لیکن مرنے والے ایک فوجی کی جگہ دو فوجی اور آگئے تھے۔ حویلی کے صحن میں اب سرب فوجیوں کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی تھی اور وہ مکان کی ان کھڑکیوں پر فائرنگ کررہے تھے جہاں سے ان پر فائرنگ کی جارہی تھی۔

عالی جاہ اور اس کے ساتھیوں کی رائفلیں خالی ہوچکی تھیں۔ سرب فوجی دروازے توڑ کر اندر گھس آئے اور اندھادھند فائرنگ شروع کردی۔ باسیونی اپنی رائفل کو لٹھ کی طرح پکڑے ایک سرب فوجی کی طرف لپکا لیکن فوجی کی آٹومیٹک رائفل سے نکلنے والی گولیوں نے اسے چھلنی کردیا اور وہ چیختا ہوا ڈھیر ہوگیا۔

سرب فوجی اندھادھند فائرنگ کررہے تھے۔ عالی جاہ کے تین اور ساتھی ڈھیر ہوگئے۔ عالی جاہ، نصیر، شجر علی اور ان کے تین اور ساتھیوں کو ہاتھ اٹھا کر دیوار کے ساتھ کھڑے ہونے پر مجبور کردیا گیا۔

ایک کمرے سے عورتوں اور بچوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں سن کر ایک سرب فوجی نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر دروازہ اندر سے بند تھا۔ فوجی نے رائفل کی نال تالے پر رکھ کر ٹریگر دبا دیا۔ تالا ٹوٹ گیا اور ایک معمولی سے دھکے سے دروازہ کھل گیا۔ کمرے میں موجود عورتوں اور بچوں کی چیخیں بلند ہوگئیں۔

"ارے واہ! قصبے کی ساری دولت تو اس کمرے میں جمع کر رکھی ہے ان لوگوں نے۔" سرب فوجی نے ایک بھرپور قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

ان تمام عورتوں اور بچوں کو ہال کمرے میں لے آیا گیا جہاں عالی جاہ وغیرہ دیوار کے ساتھ ہاتھ اٹھائے کھڑے تھے۔ عورتیں اور بچے اب بھی چیخ رہے تھے۔ ایک سرب فوجی جو رینک میں اپنے ساتھیوں سے بڑا تھا، آگے بڑھ آیا۔ وہ ایک ایک عورت کے جسم کو ٹٹول کر دیکھتا رہا۔ حسین اور جوان لڑکیوں کو اس نے ایک طرف کردیا۔ عالی جاہ اور اس کے ساتھیوں کو رائفلوں کی زد پر حویلی سے نکال کر سڑک پر لے آیا گیا۔ وہ تین فوجی تھے جو انہیں رائفلوں کی زد پر لیے ہوئے تھے۔ فوجی انہیں دھکیلتے ہوئے ایک طرف لے جارہے تھے۔ چند سیکنڈ بعد جوان اور خوب صورت لڑکیوں کو بھی حویلی سے نکال کر گلی میں مخالف سمت میں لے جایا جارہا تھا۔

حویلی سے عورتوں اور بچوں کی چیخوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں پھر اچانک حویلی میں زبردست فائرنگ ہونے لگی۔ فائرنگ کی آواز بند ہوتے ہی عورتوں اور بچوں کی چیخیں بھی بند ہوگئیں۔ عالی جاہ وغیرہ کو رائفلوں کی زد پر لیے ہوئے فوجیوں نے مڑ کر حویلی کی طرف دیکھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عالی جاہ، نصیر اور اس کے ساتھیوں نے فوجیوں پر چھلانگیں لگا دیں۔ سرب فوجیوں کے لیے یہ صورت حال قطعی غیر متوقع تھی۔ ان کے سنبھلنے سے پہلے ہی رائفلیں ان کے ہاتھوں سے نکل کر عالی جاہ، شجر علی اور نصیر کے ہاتھوں میں پہنچ گئیں۔ ان تینوں رائفلوں نے شعلے اگلے اور تینوں سرب فوجیوں کے جسم چھلنی ہوگئے۔

"اس طرف۔ وہ لوگ لڑکیوں کو لے کر اس طرف گئے ہیں۔" نصیر چیخا۔

وہ لوگ اس طرف دوڑے۔ صرف ان تینوں کے پاس رائفلیں تھیں۔ ان کے چار ساتھی نہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ موت کے منہ میں جارہے ہیں لیکن وہ پیچھے نہیں ہٹے، آگے دوڑتے رہے۔

لڑکیوں کو ایک فوجی ٹرک پر سوار کرایا جارہا تھا۔ عالی جاہ نے فوجیوں کو للکارا اور دیواروں کی آڑ لے کر فائرنگ شروع کردی۔ تین چار لڑکیاں نیچے رہ گئی تھیں۔ ٹرک حرکت میں آگیا۔ ٹرک پر چھ فوجی تھے جو فائرنگ کررہے تھے۔ ٹرک پر نصب مشین گن کا رخ بھی موڑ دیا گیا اور نیچے کھڑی ہوئی جو تین چار لڑکیاں پناہ کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑ رہی تھیں، مشین گن کی فائرنگ کی زد میں آگئیں۔ ان سب کے جسم چھلنی ہوگئے اور وہ خاک و خون میں لوٹ گئیں۔

نصیر دوڑ کر اس جگہ پہنچ گیا۔ ان لڑکیوں میں شوانا بھی تھی۔ شجر علی کی بہن۔ اس کے جسم میں کئی گولیاں لگی تھیں اور خون بہہ کر خاک میں مل رہا تھا۔ عالی جاہ اور شجر علی بھی وہاں پہنچ گئے۔ بہن کی لاش دیکھ کر شجر علی کے منہ سے چیخ نکل گئی اور وہ جھک کر لاش سے لپٹ گیا۔

عالی جاہ نے اسے سہارا دے کر اٹھایا، اس کا کندھا تھپتھپایا اور اشارہ کرتا ہوا ایک طرف چل دیا۔ قصبے میں ہر طرف سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ بہت سی عمارتوں سے آگ کے شعلے اٹھ رہے تھے۔ ایک مکان سے عورتوں کی چیخوں کی

آواز سن کر وہ رک گئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ نہتے آدمیوں کو باہر ہی چھوڑ دیا گیا اور عالی جاہ، نصیر اور شجر علی کو اشارہ کرتا ہوا اندر گھس گیا۔ عورتوں کی چیخیں کونے والے ایک کمرے سے گونج رہی تھیں۔

کمرے کا دروازہ بند تھا۔ عالی جاہ نے زوردار ٹھوکر سے دروازہ کھولا اور وہ تینوں اندر داخل ہوگئے۔ کمرے میں چار مسلمان عورتیں اور پانچ سرب فوجی تھے۔ عورتوں کے لباس تار تار تھے اور سرب فوجی خونخوار بھیڑیوں کی طرح عورتوں کو بھنبھوڑ رہے تھے۔

"ان معصوم عورتوں کو چھوڑ دو کتو!" عالی جاہ رائفل تانتے ہوئے دہاڑا۔

سرب فوجی اچھل پڑے۔ انہوں نے بیک وقت دیوار کے قریب پڑی اپنی رائفلوں کی طرف چھلانگ لگا دی لیکن کسی کو بھی رائفل تک پہنچنے کا موقع نہ مل سکا۔ عالی جاہ وغیرہ کی رائفلوں سے نکلی ہوئی گولیوں نے انہیں چھلنی کر ڈالا۔

عورتیں ایک دیوار کے ساتھ کھڑی اپنی برہنگی چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ انہی عورتوں میں ایک اس گھر کی بہو خدیجہ بھی تھی۔ اس کے شوہر اور سسر کو گھر سے باہر لے جا کر قتل کر دیا گیا تھا۔ باقی لڑکیوں کو سرب پڑوس کے مکان سے پکڑ کر لائے تھے۔ عالی جاہ کے نہتے ساتھی بھی اندر آگئے تھے اور انہوں سربوں کی رائفلوں پر قبضہ کر لیا تھا۔

"خدیجہ!" عالی جاہ نے خدیجہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم ان لوگوں کو اپنے کمرے میں لے جاؤ۔ خود بھی لباس پہنو اور انہیں بھی کچھ پہننے کو دے دو۔ اس کام میں زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ لگنے چاہئیں۔ ہمیں جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا ہے۔"

وہ تمام عورتیں اس کمرے سے نکل گئیں۔ نصیر اور شجر علی مکان میں رہ گئے۔ عالی جاہ دوسرے آدمیوں کو لے کر گلی میں نکل گیا۔ نصیر مکان میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ ہر طرف خون ہی خون بکھرا ہوا نظر آرہا تھا۔

تین چار منٹ بعد خدیجہ دوسری عورتوں کو لے کر کمرے سے نکل آئی۔ نصیر ان سب کو لے کر باہر آگیا۔ عالی جاہ اور اس کے ساتھی منتظر کھڑے تھے۔ وہ ان عورتوں کو اپنے حصار میں لے کر تیزی سے ایک طرف چلنے لگے۔ قصبے کے شمال میں گلی کے آخری موڑ پر پہنچ کر وہ رک گئے۔

"احمد!" عالی جاہ اپنے ایک ساتھی کی طرف رخ کر کے بولا۔ "تم ان لڑکیوں کو لے کر پہاڑی چشمے پر پہنچ جاؤ۔ شجر علی اور صدیق، تم دونوں بھی ان دونوں کے ساتھ جاؤ۔ ہم بھی ایک ڈیڑھ گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔"

وہ تینوں ان عورتوں کو لے کر قصبے سے باہر جانے والے راستے پر پہاڑی کی طرف دوڑتے چلے گئے۔ عالی جاہ اور اس کے ساتھی کچھ دیر آڑ میں کھڑے انہیں دیکھتے رہے اور جب شجر علی اور اس کے ساتھی درختوں میں غائب ہوگئے تو اس نے نصیر اور دوسرے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور وہ سب تیزی سے ایک طرف دوڑتے چلے گئے۔

عالی جاہ ایک جگہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کی حویلی سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے اور چند لوگ حویلی کے گیٹ کے سامنے کھڑے وحشیانہ انداز میں قہقہے لگا رہے تھے۔ یہ اسی بستی کے رہنے والے تھے۔ ان میں عیسائی بھی تھے اور کمیونسٹ بھی۔ عالی جاہ کا خون کھول رہا تھا۔ وہ للکارتا ہوا ان کے سامنے آگیا اور اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ نصیر اور اس کے دوسرے ساتھیوں نے بھی فائر کھول دیا۔ شیطانی قہقہے لگانے والے گولیوں سے چھلنی ہو کر گرنے لگے۔ اس دوران کچھ فاصلے پر ایک زوردار دھماکا ہوا اور ایک مکان ہوا میں بکھر گیا۔

عالی جاہ اپنے ساتھیوں کو لے کر ایک طرف دوڑتا چلا گیا اور بالآخر سفید رنگ کی ایک خوب صورت عمارت کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ عمارت کی پیشانی پر جامع مسجد لکھا ہوا تھا۔ مسجد کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ عمارت کے صحن سے ملحق پیش امام کی رہائش تھی۔ دو کمروں کے اس مکان میں بوڑھا پیش امام اپنی بیوی اور دو جوان بیٹیوں کے ساتھ رہائش پذیر تھا اور عالی جاہ انہی کو لینے آیا تھا۔ مرکزی دروازے سے داخل ہو کر وہ رہائش والے حصے کی طرف دوڑتا چلا گیا لیکن مکان کے دروازے پر قدم رکھتے ہی وہ ٹھٹک گیا۔ مکان خالی تھا۔

وہ واپس دوڑا مگر مسجد کے ہال کی طرف سے ایک نسوانی چیخ کی آواز سن کر وہ ایک بار پھر ٹھٹک گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور ہال کی طرف دوڑنے لگا۔ مسجد کے ہال میں آمدورفت کے دو دروازے تھے۔ دونوں دروازے بند تھے۔ عالی جاہ نے ایک دروازے کو کندھے سے ٹکر ماری، دروازہ کھل گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ خود بھی لڑکھڑاتا ہوا اندر پہنچ گیا لیکن مسجد کے ہال کا اندرونی منظر دیکھتے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

ہال میں قالین پر جابجا خون بکھرا ہوا تھا۔ قریب ہی پیش امام اور تین آدمیوں کی خون میں لت پت لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ پیش امام کی داڑھی خون سے تر ہو رہی تھی۔ اس کے قریب ہی دو لڑکیوں کی بھی برہنہ لاشیں پڑی تھیں۔ ان کے جسم زخموں سے چور تھے۔ دیواروں پر خون کے چھینٹے نظر آرہے تھے۔

چھ سات مسلمان لڑکیاں اپنے آپ کو سرب فوجیوں کے چنگل سے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان کے لباس تار تار تھے اور جسم کے بعض حصوں پر زخم بھی نظر آرہے تھے۔ عالی جاہ یہ سب کچھ دیکھ کر کانپ اٹھا۔ اس کا خون کھول گیا۔ بدبختوں کے دلوں میں عبادت گاہوں کا احترام بھی نہیں رہا تھا۔

عالی جاہ سیدھا ہوا ہی تھا کہ ایک آٹومیٹک رائفل کی نال اپنی

طرف اٹھی ہوئی دیکھ کر چونک گیا۔ اپنے آپ کو رائفل کی زد میں دیکھنا اس کے لیے غیر متوقع نہیں تھا۔ حیرت اور چونکا دینے والی بات تو یہ تھی کہ جس شخص کے ہاتھوں میں وہ رائفل تھی' اس کا چہرہ عالی جاہ کے لیے اجنبی نہیں تھا۔

وہ اس کا لے پالک بیٹا پیٹرک تھا۔

○☆○

"تم.... آستین کے سانپ....." عالی جاہ کے حلق سے غراہٹ نکلی۔ "میں نے تمہیں گندی نالی سے اٹھا کر پالا پوسا' جوان کیا' تعلیم دلائی' زندگی کی ہر آسائش مہیا کی لیکن تم.... تمہاری فطرت نہیں بدلی۔ مجھے احساس نہیں رہا تھا کہ تمہارا تعلق اس قوم سے ہے جو....."

"خاموش رہو بڈھے۔" پیٹرک دہاڑا۔ "ہماری قوم نے ہمیشہ تم لوگوں پر حکومت کی ہے۔ تم لوگوں کو اپنا غلام بنائے رکھا لیکن جب بھی موقع ملا' تم لوگوں نے سر اٹھانے کی کوشش کی۔ تم لوگ آزادی چاہتے ہو' غلامی کا طوق اتار پھینکنا چاہتے ہو۔ بوسنیا کی آزادی کے اعلان کا یہ مطلب نہیں کہ یورپ میں واقعی ایک آزاد مسلمان ریاست کے قیام کی اجازت دے دی گئی ہے۔ یہ محض کاغذی کارروائی ہے۔ دنیا کو دکھانے کے لیے۔ ہم اپنے سینے میں یہ پھانس برداشت نہیں کر سکتے۔ رہا آزادی کا سوال تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تم لوگوں کو اس زندگی کی قید سے ہی آزاد کر دیا جائے گا۔ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب اس دنیا سے تم لوگوں کا نام ونشان تک مٹ جائے گا۔ تم بھی اس وقت زندگی کی قید سے آزاد ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

پیٹرک نے رائفل سیدھی کر لی لیکن اسے فائر کرنے کا موقع نہیں ملا کیونکہ ٹھیک اسی وقت نصیر اور اس کے دو ساتھی چھلانگ لگا کر اندر آ گئے تھے۔ نصیر نے اندر آتے ہی اپنی رائفل کا ٹریگر دبا دیا۔ کئی گولیاں پیٹرک کے سینے میں پیوست ہو گئیں اور وہ چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

مسلمان لڑکیوں کو بھنبھوڑنے والے سرب فوجیوں کے ساتھ دو اسی قصبے کے اور آدمی بھی تھے۔ فائرنگ کی آواز سن کر وہ سب بدحواس ہو گئے۔ کچھ فوجی باہر بھاگے' کچھ اپنی رائفلوں کی طرف لپکے۔ باہر بھاگنے والے تو اپنی جانیں بچانے میں کامیاب ہو گئے لیکن جو دیوار کے قریب پڑی ہوئی رائفلوں کی طرف دوڑے تھے' وہ نصیر' عالی جاہ اور اس کے ساتھیوں کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔

لڑکیاں بری طرح چیخ رہی تھیں۔ عالی جاہ اور اس کے ساتھیوں نے سربوں کی رائفلیں اٹھا کر کندھوں پر ٹانگ لیں اور لڑکیوں کو لے کر ہال سے باہر نکل آئے۔ ابھی وہ مسجد کے صحن میں پہنچے ہی تھے کہ سامنے سڑک پر ایک ٹرک آ کر رکا اور لاتعداد فوجی ٹرک سے کود کر مسجد میں داخل ہونے لگے۔ عالی جاہ اور اس کے ساتھیوں نے فوجیوں کو روکنے کے لیے فائرنگ شروع کر دی۔

"اندر جاؤ... سب اندر چلے جاؤ۔" عالی جاہ چیخا۔

سرب فوجی جواب میں زبردست فائرنگ کر رہے تھے۔ لڑکیاں چیختی ہوئی ہال کی طرف دوڑ رہی تھیں۔ دو لڑکیاں' سربوں کی گولیوں کا نشانہ بن کر گر گئیں۔ ان کے جسم چھلنی ہو گئے تھے۔ باقی لڑکیاں ہال میں پہنچنے میں کامیاب ہو گئیں۔ عالی جاہ اور اس کے ساتھی بھی ہال کے دروازے کی طرف دوڑے۔ ان کا ایک ساتھی گولی کھا کر گر پڑا۔ نصیر نے اسے اٹھانے کی کوشش کی مگر وہ شخص کراہتے ہوئے بولا۔

"مجھے چھوڑ دو... تت... تم... بھاگ جاؤ....."

اس کے ساتھ ہی اس شخص کی گردن ڈھلک گئی۔ نصیر اور عالی جاہ مسجد کے ہال میں پہنچ گئے اور دروازے کی آڑ سے فائرنگ کرنے لگے۔

"نصیر... تم شریف کے ساتھ ان لڑکیوں کو لے کر پچھلی کھڑکی سے کود جاؤ۔ میں ان شیطانوں کو روکتا ہوں۔" عالی جاہ چیخا۔

نصیر اور شریف پانچوں لڑکیوں کو لے کر پچھلی کھڑکی کی طرف دوڑے۔ پہلے شریف کھڑکی سے باہر کودا پھر لڑکیوں کو باہر نکالا گیا اور پھر نصیر کھڑکی کی چوکھٹ پر چڑھا ہی تھا کہ دو زبردست دھماکے ہوئے۔

سربوں نے دستی بم پھینکے تھے جو ہال کی دیوار کے قریب گر کر پھٹے اور دیوار میں شگاف پڑ گیا۔ اسی لمحے ایک اور دھماکا ہوا۔ نصیر نے مڑ کر دیکھا' عالی جاہ اور اس کے ساتھی کھڑکی کی طرف دوڑ رہے تھے۔ نصیر نے باہر چھلانگ لگا دی۔ اس کے فوراً بعد ہی عالی جاہ اور اس کے ساتھی بھی کھڑکی سے کود کر باہر آ گئے۔ عالی جاہ کے بائیں کندھے سے خون بہہ رہا تھا۔ مسجد کی عمارت میں مسلسل دھماکے ہو رہے تھے۔ وہ لوگ ان لڑکیوں کو حصار میں لے کر ایک طرف دوڑتے چلے گئے۔ ایک گلی کا موڑ گھومنے سے پہلے نصیر نے پیچھے مڑ کر دیکھا' مسجد کی خوب صورت عمارت کھنڈر بن چکی تھی اور اس سے شعلے اور دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے۔

تمام راستے اگرچہ مخدوش تھے لیکن وہ دوڑتے ہوئے کسی نہ کسی طرح قصبے سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کا رخ مشرقی پہاڑی کی طرف تھا۔ درختوں میں پہنچ کر ان کی رفتار کم ہو گئی۔ چیڑ کے فلک بوس درخت بہت دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ چیڑ کے جنگل کے دوسری طرف انگور کے باغات تھے۔ انگور کی بیلوں کو سہارا دینے کے لیے نیچے لکڑیاں لگا دی گئی تھیں۔ اس طرح بیلوں کی لاتعداد سرنگیں سی بن گئی تھیں۔ درمیان میں پگڈنڈیاں بنی ہوئی تھیں۔ وہ ان پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے انگوروں کے باغ سے نکل کر پہاڑی کے دامن میں پہنچ گئے۔

دو تین پگڈنڈیاں پہاڑی پر مختلف سمتوں میں چلی گئی تھیں۔ وہ دائیں طرف کی پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ لڑکیاں سب سے آگے تھیں۔ انہیں چلنے میں خاصی دشواری پیش آ رہی تھی اور وہ بار بار

لڑکھڑا رہی تھیں۔ تقریباً ایک گھنٹا بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی پر چلنے کے بعد وہ چیڑ کے فلک بوس درختوں کے ایک جھنڈ میں پہنچ گئے۔ یہاں چاروں طرف اونچی خاردار جھاڑیاں تھیں۔ وہ ان جھاڑیوں کے درمیان ایک تنگ سی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے ایک کھلی جگہ پر پہنچ گئے۔ یہاں ایک چٹان کی تنگ سی دراڑ سے پانی کا ایک چشمہ بہہ رہا تھا۔ دراڑ سے نکلنے والا پانی ایک چھوٹے سے تالاب کی صورت میں جمع تھا جس سے آگے ایک چھوٹی سی ندی بن گئی تھی اور صاف وشفاف پانی گنگناتا ہوا اس ندی میں بہہ رہا تھا۔

عالی جاہ چشمے کے قریب رک کر متجسس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد بائیں طرف تقریباً بیس گز کے فاصلے پر قدِ آدم جھاڑیوں میں سرسراہٹ سی ہوئی۔ عالی جاہ اور اس کے ساتھیوں نے رائفلیں تان لیں لیکن جھاڑیوں سے شجر علی اور اس کے ساتھیوں کو برآمد ہوتے دیکھ کر انہوں نے رائفلیں نیچے جھکا لیں۔ شجر علی کے پیچھے چار عورتیں اور ان کے پیچھے احمد اور صدیق بھی جھاڑیوں سے نکل آئے۔

عالی جاہ کے ساتھ آنے والی لڑکیوں کو دیکھ کر خدیجہ اور اس کی ساتھی عورتیں ان سے لپٹ کر رونے لگیں۔ وہ سب ایک دوسرے کی شناسا تھیں اور ایک ہی طرح کے ظلم کا شکار ہوئی تھیں۔

"تھوڑی دیر یہاں آرام کرلیں پھر ہم آگے چلیں گے کیونکہ یہ جگہ زیادہ محفوظ نہیں ہے۔" عالی جاہ نے کہا اور چشمے کے کنارے پر بیٹھ کر منہ پر پانی کے چھینٹے دینے لگا۔ اس کے بائیں کندھے سے اب بھی خون رِس رہا تھا۔ قمیص اور اس کے اوپر جیکٹ بھی خون سے سرخ ہو رہی تھی۔

"لائیے، میں آپ کا زخم دیکھوں۔ زیادہ گہرا تو نہیں ہے۔" نصیر اپنی رائفل زمین پر رکھ کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"معمولی زخم ہے۔" عالی جاہ نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "مسجد میں پہلا بم پھٹا تو پتھر کا ایک ٹکڑا لگا تھا۔ زیادہ تشویش کی بات نہیں ہے۔"

اس وقت دن کے گیارہ بجے تھے۔ سربوں نے قصبے پر تقریباً آٹھ بجے صبح حملہ کیا تھا۔ وہ مسلسل تین گھنٹوں تک مسلمانوں کا قتلِ عام کرتے رہے تھے اور شاید اب بھی اس شیطانی کھیل میں مصروف تھے۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ لوگ پہاڑی پر مزید اوپر چڑھنے لگے۔ آدھے گھنٹے بعد وہ ایک جگہ رک گئے۔ انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ قصبے میں کئی جگہوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ یہ یقیناً مسلمانوں کے مکانات تھے جنہیں سربوں اور عیسائیوں نے نذرِ آتش کردیا تھا۔

وہ پہاڑی کے دوسری طرف ڈھلان پر اترتے ہوئے ایک تنگ سی گھاٹی میں پہنچ گئے۔ دونوں طرف گنجان درختوں کی وجہ سے یہ گھاٹی عام نگاہوں سے پوشیدہ تھی۔ اس گھاٹی میں ایک چھوٹی سی ندی بھی بہہ رہی تھی۔ وہ لوگ ندی کے قریب درختوں کے نیچے بیٹھ گئے۔

"ہمیں آج کا دن اسی جگہ گزارنا ہے۔ اس پہاڑی کے دوسری طرف تقریباً بیس میل کے فاصلے پر جاذے نامی ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ میں اس بستی کے چند لوگوں کو جانتا ہوں۔ شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہم اس بستی کی طرف روانہ ہوجائیں گے۔" عالی جاہ نے کہا۔

اس پارٹی میں نو لڑکیاں اور آٹھ مرد تھے۔ لڑکیاں ایک طرف ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئیں۔ ان میں مسجد کے پیش امام کی بڑی بیٹی آرشا بھی شامل تھی۔ اس کی چھوٹی بہن کو سربوں نے مزاحمت کرنے پر مسجد ہی میں گولیوں سے چھلنی کرڈالا تھا۔

آرشا کی عمر بائیس تئیس سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ اس قصبے کی حسین ترین لڑکی سمجھی جاتی تھی۔ سرب درندوں نے مسجد میں اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہیں ہوسکے تھے۔ اگر عالی جاہ اور اس کے ساتھی بروقت نہ پہنچ جاتے تو یا تو وہ بھی اپنی جان کھو بیٹھتی یا اس کے دامنِ عصمت کو تار تار کردیا جاتا۔

نصیر، عالی جاہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ عالی جاہ کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس کی شادی کم عمری میں ہوگئی تھی لیکن خدا نے اسے اولاد جیسی نعمت سے محروم رکھا۔ اس کے باغات میں کام کرنے والا ایک عیسائی جوڑا دریا میں کشتی الٹ جانے سے ڈوب کر ہلاک ہوگیا تو ان کا کمسن بیٹا بے سہارا ہوگیا۔ عالی جاہ، پیٹرک کو اپنے گھر لے آیا اور اسے اولاد کی طرح پالا پوسا، اعلیٰ تعلیم دلائی لیکن وہ مارِ آستین نکلا۔

مسلمان اور عیسائی یہاں کئی نسلوں سے ایک ساتھ رہ رہے تھے۔ مسلم اکثریتی علاقوں میں مسلمانوں نے ہمیشہ عیسائیوں کی دلجوئی کی تھی، ہر آڑے وقت میں ان کے کام آئے تھے لیکن مسلمان یہ بھول گئے تھے کہ یورپ کے عیسائی، صلاح الدین ایوبی کے لگائے ہوئے زخموں کو ابھی تک نہیں بھولے تھے۔ انہیں جب بھی موقع ملتا، وہ بدلہ چکانے کی کوشش کرتے۔

عیسائیوں کے دلوں میں پھانس تو اسی وقت چبھ گئی تھی جب پہلا مسلمان یورپ کی سرزمین پر آباد ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف رہے اور جب یورپ میں پہلی آزاد مسلمان ریاست کے قیام کا اعلان کیا گیا تو ان کی قوتِ برداشت جواب دے گئی اور انہوں نے موقع ملتے ہی اپنے محسنوں کا قتلِ عام شروع کردیا۔

صرف بوسنیا پر ہی کیا منحصر، آج پوری دنیا میں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کیا جارہا ہے۔ عیسائیوں، یہودیوں اور ہندوؤں نے گویا طے کر رکھا ہے کہ دنیا سے مسلمانوں کی نسل ختم کرکے ہی دم لیں گے۔ پوری دنیا میں مسلمانوں کی نسل ختم کرنے کی بھرپور

کوشش کی جا رہی ہے۔

پچاس سال پہلے فلسطین کے معصوم اور بے گناہ مسلمانوں پر ظلم و تشدد کا آغاز ہوا۔ یہودیوں نے نہ صرف انہیں گھروں سے نکال باہر کیا بلکہ آج تک وہ ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں۔ دنیا بھر کے غیر مسلموں نے یہودیوں کی بھرپور حمایت کی اور انہیں ہر طرح کی امداد فراہم کی لیکن کوئی مسلمان ملک، فلسطینیوں کے حق میں کھوکھلے بیانات سے آگے نہ بڑھا۔ مصر، شام اور اُردن نے یہودیوں کے خلاف ہتھیار اٹھائے لیکن فلسطینی مسلمانوں کی ہمدردی میں نہیں، اپنی سرحدوں کی حفاظت کے لیے۔ الجزائر میں مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہا دی گئیں۔ افغانستان کے معصوم اور سادہ لوح مسلمانوں کو ایک گھناؤنی سازش کے تحت غلام بنانے کی کوشش کی گئی لیکن افغانی بہت جلد اس سازش کو سمجھ گئے۔ وہ ہشت پا کی طرح پھیلتے ہوئے کیمونزم کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئے اور گیارہ سال تک دنیا کی سب سے بڑی طاقت کے سامنے ڈٹے رہے۔ انہوں نے بیس لاکھ گردنیں کٹوا دیں مگر کفر والحاد کے سامنے ایک بھی گردن نہیں جھکی اور بالآخر سوویت یونین جیسی دنیا کی سب سے بڑی قوت، غیور افغانوں کے حوصلے کی دیوار سے ٹکرا کر اس طرح پاش پاش ہوئی کہ دنیا کے لیے عبرت کا سامان بن گئی۔

کشمیر کے مسلمان چھیالیس سال سے آزادی کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ یہ نہتے، معصوم اور سادہ لوح کشمیری اب تک بڑی بہادری سے بھارتی درندوں کے ہر جورو ستم کا مقابلہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ کشمیر میں چھیالیس سال سے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی ہے لیکن کسی مسلمان ملک نے آج تک ہمدردی کا ایک لفظ نہیں کہا۔

ایک طرف مسلمانوں کے آپس کے اختلافات تھے جو انہیں تباہی کے دہانے کی طرف لے جا رہے تھے اور دوسری طرف غیر مسلم قوتیں تھیں جو دنیا بھر میں مسلمانوں کی نسل کشی میں مصروف تھیں۔ بوسنیا کی مسلم ریاست کی آزادی کے اعلان کے ساتھ ہی اس خطے میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوگیا۔ اس خطے کے عیسائیوں اور کمیونسٹوں کے حمایتی تو کھل کر ان کی حمایت کا اعلان کر رہے تھے، انہیں اسلحہ بھی فراہم کیا جا رہا تھا مگر بوسنیا کے مسلمانوں کے حق میں ابھی تک دنیا کے کسی کونے سے کوئی آواز نہیں اٹھی تھی۔

نصیر، عالی جاہ کے پاس سر جھکائے بیٹھا یہ سب کچھ سوچ رہا تھا۔ وہ ایک کاروباری دورے پر یہاں آیا تھا لیکن حالات نے اچانک ہی پلٹا کھا کر یہ صورت اختیار کرلی تھی۔ نصیر کے خیال میں یہ صرف بوسنیا کی نہیں، ہر مسلمان کی جنگ تھی، حق و باطل کی جنگ تھی۔ اگر یورپ کے اس خطے پر باطل غالب آگیا تو دنیا کے کسی بھی کونے میں اسلام کا کوئی نام لیوا نہیں رہے گا۔ نصیر نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اب وہ پاکستان واپس نہیں جائے گا بلکہ بوسنیا کے مسلمانوں کے شانہ بہ شانہ اس جہاد میں حصہ لے گا۔

سورج مغرب کی طرف ڈھل رہا تھا۔ سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر خاموش بیٹھے تھے۔ کسی میں شاید بولنے کی بھی سکت نہیں رہی تھی یا شاید بولنے کو کچھ نہیں رہا تھا۔ وہ سب بھوکے پیاسے اور غموں سے نڈھال بیٹھے تھے۔ ان میں سے کسی نے صبح کا ناشتا بھی نہیں کیا تھا۔

پانچ بجے کے قریب عالی جاہ اٹھ گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کا جائزہ لیا۔ آٹھ آدمی اور بارہ رائفلیں تھیں۔ چار رائفلیں ان لڑکیوں کو دے دی گئیں جو انہیں استعمال کرسکتی تھیں۔ ان میں مسجد کے پیش امام کی بیٹی آرشا اور خدیجہ بھی شامل تھیں۔ میگزین نکال کر ان لڑکیوں کو رائفل استعمال کرنے کی تربیت بھی دے دی گئی تھی۔

چھ بجے کے لگ بھگ وہ لوگ پہاڑی کے دوسری طرف اترنے لگے۔ جب وہ پہاڑی کے دامن میں پہنچے تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ نشیب میں جاذے نامی اس بستی سے دُھواں اٹھتے دیکھ کر وہ ٹھٹک گئے۔

"جلدی چلو۔ شاید انہیں ہماری مدد کی ضرورت ہو۔" عالی جاہ نے کہا۔

وہ لوگ تیزی سے ڈھلان پر اترنے لگے۔ انہیں بستی تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ آوارہ کتوں کے بھونکنے کے سوا کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ مُردہ بستی میں آگئے ہوں۔

ایک گلی میں داخل ہوتے ہی وہ لوگ ٹھٹک کر رک گئے۔ ایک مکان کے سامنے ایک ادھیڑ عمر عورت گم صم بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے اور لباس پھٹا ہوا تھا۔ اس کے جسم میں کوئی حرکت اور کوئی حرارت نہیں تھی۔ اس کی نظریں خلا میں کسی ان دیکھے نقطے پر مرکوز تھیں۔

نصیر اس عورت کے سامنے جھک گیا۔ عورت کی بے حرکت پتلیوں میں بے شمار ان کہی کہانیاں اور جواب طلب سوالات جھانک رہے تھے۔ وہ خاموش اور گہری آنکھیں کچھ کہتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ پتھریلی نظریں اس سے... دریافت کر رہی تھیں کہ کوئی بتلائے ہمارا قصور کیا ہے؟ ہم سے کیا گناہ سرزد ہوا ہے؟ ہمیں کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے؟ کیا ہمارا جرم یہ ہے کہ ہم ایک خدا، ایک رسول اور قرآن کے ماننے والے ہیں؟ اگر یہ جرم ہے تو ہم یہ جرم بار بار کرتے رہیں گے۔

نصیر نے مڑ کر عالی جاہ کی طرف دیکھا، اس نے نظریں جھکا لیں پھر وہ بھی گم صم بیٹھی ہوئی اس عورت کے سامنے جھک گیا۔

"بستی کے لوگ کہاں ہیں؟ یہ سناٹا کیسا ہے؟" اس نے عورت کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

عورت جیسے ہوش میں آگئی۔ اس نے نظریں اٹھا کر عالی جاہ کی طرف دیکھا اور پھر اٹھ کر مکان میں داخل ہو گئی۔ عالی جاہ اور نصیر بھی اس کے پیچھے ہی اندر چلے آئے۔ وہ عورت ایک کمرے میں رک گئی۔ عالی جاہ اور نصیر نے جیسے ہی کمرے میں قدم رکھا' وہ ٹھٹک کر رک گئے۔ کمرے کے اندر کا منظر ان کے رونگٹے کھڑے کردینے کے لیے کافی تھا۔

کمرے میں فرش پر دو لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک مرد کی اور ایک عورت کی۔ دونوں جوان تھے۔ مرد کے جسم پر لباس موجود تھا مگر عورت کی لاش برہنہ تھی۔ مرد کے دونوں بازو کندھوں سے کٹے ہوئے تھے جو قریب ہی پڑے تھے۔ شاہ رگ اس طرح کٹی ہوئی تھی جیسے کند چھری سے ذبح کیا گیا ہو۔ عورت کی لاش اس سے تقریباً تین فٹ کے فاصلے پر پڑی تھی۔ اس کے پستان کٹے ہوئے تھے' پیٹ چاک تھا' رخساروں کا گوشت نچا ہوا تھا۔

عالی جاہ کے جسم پر لرزہ سا طاری تھا۔ وہ اس عورت کو بازو سے پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے آیا۔ یہاں سارا سامان اِدھر اُدھر بکھرا ہوا تھا۔ اس نے عورت کو ایک کرسی پر بٹھا دیا اور نصیر کو اشارہ کیا۔ نصیر باہر جا کر اپنے تمام ساتھیوں کو اندر لے آیا۔ اس دوران عالی جاہ نے لاشوں والے کمرے کا دروازہ بند کردیا تھا۔

تمام لڑکیوں اور دو آدمیوں کو اس مکان میں چھوڑ دیا گیا اور عالی جاہ اور نصیر دیگر ساتھیوں کو لے کر بستی میں گھومنے لگے۔ یہ چھوٹی سی بستی پندرہ سولہ گھروں پر مشتمل تھی۔ ہر گھر میں انہیں ایک دو لاشیں ضرور ملیں۔ بعض گھروں میں تین تین چار چار لاشیں بھی۔ مگر ان میں زیادہ لاشیں جوان مردوں کی تھیں۔ بچوں' بوڑھوں اور ادھیڑ عمر عورتوں کی لاشیں بھی تھیں۔

عالی جاہ اور اس کے تمام ساتھی بھوکے تھے۔ وہ کچھ کھانے پینے کی اُمید پر یہاں آئے تھے لیکن یہاں کی صورت حال بالکل مختلف تھی۔ وہ لاشوں کو گھروں سے نکال کر بستی کے باہر ایک جگہ پر جمع کرتے رہے۔ ان کے لیے الگ الگ قبروں اور تجہیز و تکفین کا بندوبست ممکن نہیں تھا۔ ایک بہت بڑی قبر کھود کر اجتماعی تدفین کردی گئی۔ بستی کے پہلے مکان میں ملنے والی دونوں لاشوں کو بھی انہی کے ساتھ دفن کردیا گیا تھا۔

جب وہ تدفین سے فارغ ہوئے تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ بعض گھروں میں کھانے پینے کی کچھ چیزیں مل گئیں جنہیں وہ پہلے مکان میں لے آئے۔ وہ لوگ پیٹ کی آگ بجھا رہے تھے کہ بیرونی دروازے کے قریب ہلکی سی آہٹ سُن کر چونک گئے۔ یوں لگا تھا جیسے کوئی بڑی احتیاط سے دروازہ کھولنے کی کوشش کررہا ہو۔ نصیر اور شجر علی نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور دونوں اپنی اپنی رائفلیں سنبھال کر دبے قدموں بیرونی دروازے کی طرف چلنے لگے۔

دروازے کے قریب پہنچ کر وہ دونوں رک گئے۔ شجر علی نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا اور نصیر اپنی رائفل سنبھالے چھلانگ لگا کر باہر آگیا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا جو دروازے کو دھکا لگنے سے پیچھے گر گیا تھا' اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے چیخ بھی نکل گئی تھی۔ نصیر نے اس پر رائفل تان لی۔ وہ شخص زمین پر چت پڑا تھا اور اپنی زبان میں کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کے لہجے میں خوف نمایاں تھا۔ وہ دونوں ہاتھ یوں ہلا رہا تھا جیسے اسے گولی چلانے سے منع کررہا ہو۔

"رک جاؤ۔ گولی مت چلانا نصیر!" شجر علی چیخا۔ "یہ اسی بستی کا رہنے والا ہے۔"

نصیر نے رائفل ہٹالی۔ شجر علی نے اس شخص سے کچھ کہا اور وہ اٹھ کر ان کے ساتھ مکان کے اندر آگیا۔ عالی جاہ اس شخص کو دیکھ کر ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔

"دانشمند! تم کہاں تھے؟ یہ سب کیسے ہوا؟" عالی جاہ اس سے بغل گیر ہوگیا۔ دانشمند ہچکیاں لے کر رونے لگا۔

"آج دوپہر کے تھوڑی دیر بعد سرب غنڈوں نے اس بستی پر حملہ کردیا۔ ان کے ساتھ ایک درجن فوجی بھی تھے۔ پہلے انہوں نے بستی کو گھیرے میں لیا پھر گھروں میں گھس کر قتلِ عام شروع کردیا۔ جس نے بھی مزاحمت کرنے کی کوشش کی' اسے بے دریغ گولی سے اُڑا دیا گیا۔ بستی کے تمام جوان آدمیوں' بچوں اور بوڑھوں کو قتل کرنے کے بعد انہوں نے گھروں کو لوٹا۔ قیمتی اشیا دو ٹرکوں میں لاد کر غنڈے لے گئے۔ جوان عورتوں اور لڑکیوں کو سرب فوجیوں نے ایک الگ ٹرک میں بھر لیا اور خوشی کے نعرے لگاتے ہوئے چلے گئے۔ میں کسی نہ کسی طرح بستی سے نکل کر شمالی پہاڑیوں میں پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ میں نے سرب فوجیوں کا ٹرک ان پہاڑیوں کے پچھلی طرف قدیم اور غیر آباد چرچ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔"

"تمہارے علاوہ بستی کا کوئی اور شخص زندہ بچا ہے یا نہیں؟" عالی جاہ نے پوچھا۔

"چند لوگ بھاگنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ وہ پتا نہیں کہاں ہوں گے۔ ایک آدمی تو میرے ساتھ ہی شمالی پہاڑیوں کی طرف گیا تھا لیکن پہاڑیوں میں پہنچ کر وہ نہ جانے کہاں غائب ہوگیا۔" دانشمند نے جواب دیا۔

"تم اب تک کہاں تھے؟" عالی جاہ نے پوچھا۔

"جنگل میں چھپا ہوا تھا۔ بستی میں روشنی دیکھی تو ڈرتے ڈرتے یہاں آگیا۔" دانشمند نے جواب دیا۔

ٹھیک اسی وقت دروازے پر دستک کی آواز سن کر وہ اچھل پڑے۔ وہ یقیناً اس بستی کا کوئی آدمی تھا۔ اگر حملہ آور سربوں میں سے کوئی ہوتا تو دستک دینے کے بجائے فائرنگ کرتا ہوا دروازہ توڑ کر اندر داخل ہونے کی کوشش کرتا۔

شجر علی نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا اور پھر دروازے پر کسی مرد

کے بجائے ایک عورت کو دیکھ کر وہ سب اچھل پڑے۔ وہ عورت لڑکھڑاتی ہوئی اندر آگئی۔ شجر علی اسے سہارا نہ دیتا تو وہ یقیناً گر پڑتی۔ آرشا وغیرہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے سنبھال لیا۔

اس عورت کی عمر چوبیس پچیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے اور لباس پھٹا ہوا تھا۔ دائیں ٹانگ اور دایاں بازو خون آلود تھا۔ وہ شائزہ تھی۔ اسی بستی کی رہنے والی۔

شائزہ نے ہچکیاں لیتے ہوئے بتایا کہ سرب فوجی بیس بائیس لڑکیوں کو ٹرک پر لاد کر شمالی پہاڑی کے دوسری طرف ایک چرچ میں لے گئے تھے۔ فوجیوں کی تعداد بارہ تھی۔ دو فوجی چرچ کے دروازے پر پہرہ دیتے رہے اور دس فوجی، لڑکیوں کے ساتھ تہ خانے میں آگئے۔ ایک فوجی تہ خانے میں رائفل تانے کھڑا رہا اور باقی فوجی اپنی اپنی پسند کی لڑکیوں کی آبرو ریزی کرتے رہے۔ لڑکیوں کی چیخ و پکار کا ان پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ مزاحمت کرنے پر تین لڑکیوں کو گولی مار کر ان کی برہنہ لاشیں تہ خانے میں ایک طرف پھینک دی گئیں۔

شائزہ ایک لمحے کو خاموش ہوئی اور پھر ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان بتانے لگی کہ اسے کسی نہ کسی طرح تہ خانے سے باہر نکلنے کا موقع مل گیا۔ وہ باہر پہرے پر کھڑے دونوں سرب فوجیوں کو بھی دھوکا دے کر وہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگئی۔ وہ جب چرچ سے نکلی تو اس وقت رات کے آٹھ بجے تھے۔ وہ پہاڑیوں میں ٹھوکریں کھاتی، بھٹکتی ہوئی کسی نہ کسی طرح بستی تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی۔ اُجڑی ہوئی بستی میں یہ واحد گھر تھا جہاں اسے روشنی دکھائی دی تھی۔

شمالی پہاڑی کے دوسری طرف ویرانے میں واقع اس قدیم چرچ کے بارے میں عالی جاہ نے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ تقریباً دو سو سال پہلے وہ علاقہ ایک کاؤنٹ کی شکار گاہ ہوا کرتا تھا۔ وہ ہر دو تین مہینے بعد شکار کھیلنے کے لیے اس طرف آتا تھا۔ اسے مذہب سے بھی کسی حد تک لگاؤ تھا۔ اس نے یہاں ایک چرچ بنوا دیا۔ وہ جتنے دن اس شکار گاہ میں رہتا، یہ چرچ بھی آباد رہتا۔ کاؤنٹ کی موت کے بعد جاگیر کا نظام اس کے بیٹے نے سنبھال لیا۔ اسے شکار سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے کبھی بھول کر بھی اس طرف کا رخ نہیں کیا۔ اس طرح ویرانے میں تعمیر ہونے والا یہ چرچ بھی ویران ہوگیا۔ ماضی میں کئی مرتبہ یہ چرچ ڈاکوؤں کی آماجگاہ بنا تھا لیکن مستقل طور پر یہاں کوئی بھی نہیں رہا۔

"وہ چرچ یہاں سے کتنے فاصلے پر ہے؟" عالی جاہ نے دانشمند کی طرف رخ کرکے پوچھا۔

"اس پہاڑی کے دوسری طرف، تقریباً تین میل کے فاصلے پر۔" دانشمند نے جواب دیا۔

"تیار ہو جاؤ میرے دوستو۔" عالی جاہ ایک جھٹکے سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "آج رات ان درندوں میں سے ایک کو بھی زندہ بچ کر نہیں جانا چاہیے۔"

اس کے تمام ساتھی اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔

"سب لوگ نہیں جا سکتے۔" عالی جاہ نے کہا۔ "میرے ساتھ صرف چھ آدمی جائیں گے، باقی یہیں رہیں گے۔ ان لڑکیوں کی حفاظت کے لیے۔"

"میں بھی ان چھ میں شامل ہوں جنہیں تم اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہو؟" پیش امام کی بیٹی آرشا نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"نہیں آرشا! ابھی تمہاری ضرورت نہیں۔ وقت آنے پر تمہیں دشمن سے انتقام لینے کا موقع ضرور دیا جائے گا لیکن ابھی نہیں۔ یہ ہمارا پہلا مشن ہے اور بے حد خطرناک۔ اس میں ہم سب کی جانیں جا سکتی ہیں۔ اور ہاں، تم سب لوگ سن لو اگر ہم صبح کی روشنی طلوع ہونے تک واپس نہ آئے تو تم لوگ کسی نہ کسی طرح سرائیوو پہنچنے کی کوشش کرنا۔ دارالحکومت میں کہیں نہ کہیں تم لوگوں کو پناہ مل جائے گی۔"

عالی جاہ نے جو چھ آدمی منتخب کیے ان میں نصیر، دانشمند، احمد صدیق، مکرّم اور حسن شامل تھے۔ ساتواں خود عالی جاہ تھا۔ انہوں نے اپنی اپنی رائفلیں چیک کیں اور مکان سے نکل گئے۔ ان کے دوسرے ساتھی لڑکیوں کی حفاظت کے لیے مکان ہی میں رہ گئے تھے۔ بستی سے نکلتے ہی دانشمند ان کی رہنمائی کرنے لگا۔ وہ بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی پر بلندی کی طرف چلنے لگے۔ تاریکی میں غیر ہموار راستے پر چلنا بے حد مشکل ہو رہا تھا۔ ٹھوکریں لگنے سے وہ بار بار لڑکھڑا رہے تھے۔

پہاڑی پر پہنچ کر وہ رک گئے۔ دانشمند متجسس نگاہوں سے تاریکی میں نیچے اترنے کا راستہ تلاش کر رہا تھا۔ بالآخر انہیں وہ پگڈنڈی مل گئی جو اس قدیم چرچ کی طرف چلی گئی تھی۔ تاریکی میں ڈھلان پر اترنا زیادہ خطرناک ثابت ہو رہا تھا۔ وہ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے بڑی احتیاط سے نیچے اتر رہے تھے۔

تقریباً ڈھائی میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک بار پھر رک گئے۔ دانشمند کچھ دیر تک ادھر اُدھر دیکھتا رہا پھر ایک ٹیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ چرچ اس ٹیلے کے دوسری طرف ہے۔ اب ہمیں بڑی احتیاط سے آگے بڑھنا ہوگا۔"

"چلو، تم ہمارے آگے آگے چلو۔ سب لوگ سن لیں، جب تک میں سگنل نہ دوں، کوئی بھی فائر نہیں کرے گا۔"

وہ رائفلیں سنبھالے بڑی احتیاط سے آگے بڑھنے لگے۔ ٹیلے کے گرد چکر کاٹ کر دوسری طرف پہنچتے ہی وہ رک گئے۔ تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر چرچ کی عمارت کا ہیولہ دکھائی دے رہا تھا۔ چرچ کی عمارت اگرچہ ایک مسطح جگہ پر بنی ہوئی تھی مگر اس کے آس پاس کی جگہ ناہموار تھی۔ بعض جگہوں پر بڑے بڑے چٹانی پتھر زمین کی سطح سے ابھرے ہوئے تھے۔ یہ پتھر اتنے بڑے تھے کہ ہر پتھر

کے پیچھے ایک دو آدمی آسانی سے چُھپ سکتے تھے۔

آسمان پر گہرے بادل تھے جن کی وجہ سے تاریکی میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ نصیر گہری نظروں سے چرچ کی عمارت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک کھڑکی میں مدھم روشنی دیکھ کر وہ چونک گیا۔ اس ویرانے میں بجلی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان سرب فوجیوں نے غالباً مشعل جلا رکھی تھی۔ نصیر نے عالی جاہ کو اس روشنی کی طرف متوجہ کیا اور اس ٹرک کی طرف دیکھنے لگا جو چرچ کے دروازے سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پر کھڑا تھا۔

وہ ایک بار پھر چرچ کی طرف دیکھنے لگا۔ اس مرتبہ انہیں چرچ کے دروازے پر ایک انسانی ہیولہ نظر آگیا۔ وہ سرب فوجی تھا جو چوکیداری کررہا تھا۔ شائزہ کے کہنے کے مطابق پہرہ دینے والے دو فوجی تھے لیکن دوسرا نظر نہیں آرہا تھا۔

"نصیر!" عالی جاہ نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ "تم ٹرک کی طرف سے چرچ کے دروازے کی طرف بڑھنے کی کوشش کرو' میں اس طرف سے جاتا ہوں اور تم لوگ کھڑکیوں کے راستے اندر داخل ہونے کی کوشش کرو۔" آخری جملہ اس نے مکرم وغیرہ سے مخاطب ہوکر کہا تھا۔

وہ لوگ پتھروں کی آڑ لے کر رینگتے ہوئے اپنے اپنے ٹارگٹ کی طرف بڑھنے لگے۔ نصیر کا رخ ٹرک کی طرف تھا۔ اسے ٹرک تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

وہ ٹرک کے ساتھ ساتھ محتاط انداز میں چلتا ہوا سامنے والے حصے کی طرف آنے کی کوشش کررہا تھا۔ وہ ڈرائیور سائیڈ والے دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ مدھم سی روشنی دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اس نے اوپر دیکھا۔ ڈرائیور کی سیٹ پر ایک فوجی بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ نصیر اُلٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگا لیکن اس کا پیر ایک پتھر سے ٹکرا گیا۔ پتھر کے لڑھکنے کی آواز سن کر ٹرک میں بیٹھا ہوا سرب فوجی چونک گیا۔ اس نے جلدی سے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ اس وقت نصیر مزید پیچھے ہٹنے کی کوشش کررہا تھا لیکن سرب فوجی نے اسے دیکھ لیا اور ٹرک سے چھلانگ لگادی۔

سرب فوجی کے قدم زمین پر ٹکنے سے پہلے ہی نصیر نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ فوجی بدحواس سا ہوگیا۔ وہ یہ سمجھ کر ٹرک سے کودا تھا کہ شاید اس کا اپنا ہی ساتھی ہوگا لیکن یہ غیر متوقع اُفتاد اس کے گلے آن پڑی تھی لیکن اس نے سنبھلنے میں بھی زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ نصیر سے زیادہ ہٹا کٹا اور طاقتور تھا۔ اس نے دھوبی پاٹ والا داؤ استعمال کرتے ہوئے نصیر کو پٹخ دیا۔ نصیر پُشت کے بل پتھروں پر گرا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکل گئی۔ فوجی نے اس کی پسلیوں پر زوردار ٹھوکر رسید کردی۔ نصیر تڑپ اٹھا مگر اس کے منہ سے آواز تک نہیں نکلی۔ سرب فوجی نے دوسری ٹھوکر ماری مگر اس مرتبہ نصیر نے اس کے پیر کو گرفت میں لے کر زوردار جھٹکا دیا۔ سرب فوجی پُشت کے بل گرا۔ نصیر نے بڑی پھرتی سے اٹھ کر فوجی کو چھاپ لیا۔ سرب فوجی کی گردن نصیر کی گرفت میں تھی۔ وہ اپنی گردن چھڑانے کے لیے بری طرح مچل رہا تھا مگر نصیر کی گرفت خاصی مضبوط تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سرب فوجی کی ٹھوڑی پر جما دیا اور اس کی گردن کو زور سے دائیں طرف جھٹکا دیا۔ فوجی بلبلا اٹھا۔ نصیر نے دوسرا جھٹکا دیا۔ اس مرتبہ اس نے پوری قوت استعمال کرڈالی تھی۔ کڑک کی ہلکی سی آواز ابھری۔ سرب فوجی کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس کے منہ سے بھیانک چیخ نکلی اور وہ بری طرح ہاتھ پیر پٹخنے لگا۔ نصیر نے اس کی گردن کو دو تین اور زوردار جھٹکے دیے اور اسے چھوڑ کر الگ ہوگیا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ شدید سردی کے باوجود اس کا پورا جسم پسینے سے تر ہوگیا۔

"الینڈر! کیا ہوا؟"

چرچ کے دروازے پر کھڑے ہوئے فوجی کی آواز سن کر نصیر جیسے ہوش میں آگیا۔ وہ اپنی رائفل اٹھا کر ٹرک کے پچھلے پہیوں کی آڑ میں بیٹھ گیا۔

عالی جاہ پتھروں کی آڑ میں چرچ کے دروازے کی طرف رینگتا ہوا بڑھ رہا تھا۔ وہ چرچ کے دروازے پر کھڑے ہوئے سرب فوجی سے تقریباً دس گز کے فاصلے پر تھا کہ ٹرک کی طرف سے دھینگا مشتی اور پھر چیخ کی آواز سن کر چونک گیا۔ تقریباً اسی وقت چرچ کے دروازے پر کھڑے ہوئے فوجی نے الینڈر کے نام سے اپنے ساتھی کو پکارا اور رائفل سنبھالے ٹرک کی طرف بڑھنے لگا۔

عالی جاہ کو صورت حال کی نزاکت کا احساس ہوچکا تھا۔ وہ پتھروں کی آڑ میں بڑی تیزی سے آگے رینگنے لگا۔ سرب فوجی سے تقریباً پانچ گز کے فاصلے پر پہنچ کر وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہوگیا۔ سرب فوجی آہٹ پر تیزی سے پیچھے مُڑا لیکن اسے بہت دیر ہوچکی تھی۔ عالی جاہ اس پر چھلانگ لگا چکا تھا۔

عالی جاہ' سرب فوجی کو ساتھ لیے زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ ان دونوں کی رائفلیں دور جاگری تھیں۔ عالی جاہ کے نیچے دبا ہوا سرب فوجی اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کررہا تھا لیکن عالی جاہ کی گرفت خاصی مضبوط تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ فوجی کی گردن پر تھے اور نرخرے پر اس کے انگوٹھے کا دباؤ بڑھتا جارہا تھا۔ فوجی کے منہ سے خرخراہٹ کی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی بھرپور کوشش کررہا تھا لیکن عالی جاہ کی گرفت آہنی شکنجے کی طرح سخت ہوتی چلی گئی۔ اس پر جنون سوار تھا اور چہرے پر درندگی کے اثرات نمایاں طور پر نظر آرہے تھے۔

سرب فوجی کے منہ سے ایک بار پھر خرخراہٹ نکلی۔ عالی جاہ نے ہاتھوں کا دباؤ کچھ اور بڑھا دیا۔ اس کے انگوٹھے نرخرے میں پیوست ہوتے جارہے تھے۔ فوجی بری طرح ہاتھ پیر پٹخ رہا تھا۔ اس کی زبان باہر نکل آئی اور آنکھیں حلقوں سے اُبلنے لگیں پھر بتدریج اس کی مزاحمت کم ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ وہ بالکل بے حس و حرکت ہوگیا۔ عالی جاہ نے اس کی گردن کو زوردار جھٹکا دے کر

چھوڑ دیا اور اٹھ کر ہاتھ جھاڑنے لگا۔ اسی وقت نصیر بھی ٹرک کی آڑ سے نکل کر وہاں پہنچ گیا۔ عالی جاہ نے جھک کر رائفل اٹھالی اور دونوں تیزی سے عمارت کی طرف دوڑے۔

مکرّم اور دانشمند محرابی کھڑکیوں سے چرچ میں داخل ہو چکے تھے لیکن اوپر کا کمرا خالی تھا۔ وہ چاروں تہ خانے کا راستہ تلاش کرتے ہوئے چبوترے کی پچھلی طرف ایک کمرے میں آگئے۔ اس کمرے کے دوسری طرف بھی ایک دروازہ تھا۔ دروازے کے دوسری طرف قدموں کی آہٹ سن کر وہ چاروں دیوار سے چپک گئے۔ قدموں کی آواز قریب آتی گئی پھر ایک فوجی دروازے میں داخل ہوا۔ وہ جیسے ہی دو قدم آگے بڑھا' عالی جاہ نے رائفل کو نال کی طرف سے پکڑتے ہوئے پوری قوت سے گھمایا۔ رائفل کا بٹ سرب فوجی کے سر پر لگا۔ اس کی کھوپڑی پاش پاش ہو گئی اور وہ منہ سے کوئی آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔

وہ چاروں ایک بار پھر دیوار کے ساتھ چپک گئے اور چند سیکنڈ خاموشی سے کھڑے رہے پھر دروازے کے دوسری طرف آگئے۔ یہ بھی ایک بڑا کمرا تھا جس میں دیوار کے ساتھ ٹنگی ہوئی ایک مشعل جل رہی تھی۔ دائیں طرف تہ خانے میں جانے کے لیے سیڑھیاں تھیں اور تہ خانے سے عورتوں کے رونے' چیخنے اور سرب فوجیوں کے قہقہوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

وہ سیڑھیوں کے قریب پہنچے ہی تھے کہ دو فوجی اوپر آتے ہوئے دکھائی دیے۔ عالی جاہ اور اس کے ساتھی تیزی سے ایک طرف ہٹ کر دیوار سے چپک کر کھڑے ہو گئے۔ وہ سرب فوجی جیسے ہی تہ خانے سے باہر آئے' ان چاروں نے ان پر چھلانگ لگادی۔ وہ فوجی اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان میں سے ایک تو مکرّم کی گرفت میں آیا تھا اور دوسرا عالی جاہ کی گرفت میں۔ عالی جاہ نے تو اپنے شکار کی گردن مروڑ دی لیکن مکرّم کا شکار اس کی گرفت سے نکل گیا اور قلابازی کھاتا ہوا تہ خانے کی سیڑھیوں پر گرا۔ سیڑھیوں پر لڑھکتے ہوئے اس کے منہ سے بڑی بھیانک چیخیں نکل رہی تھیں۔

"تہ خانے میں۔ جلدی....." عالی جاہ نے چیختے ہوئے سیڑھیوں پر چھلانگ لگادی۔

سیڑھیوں پر لڑھکنے والے سرب فوجی کی چیخوں سے تہ خانے میں بھگدڑ سی مچ گئی تھی۔ معصوم لڑکیوں کی عزت سے کھیلنے والے سرب فوجی دیواروں کے قریب پڑی ہوئی اپنی رائفلوں کی طرف دوڑے لیکن اس دوران عالی جاہ اور اس کے ساتھی تہ خانے میں پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے سرب فوجیوں پر اندھادھند فائرنگ شروع کردی۔

چیختی چلاتی ہوئی عورتیں دوڑتی ہوئی ایک دوسرے کے اوپر گر رہی تھیں۔ ان میں سے بیشتر برہنہ تھیں اور بعض کا لباس تار تار ہو چکا تھا۔ ایک سرب فوجی کو اپنی رائفل اٹھانے کا موقع مل گیا۔ اس نے ٹریگر کھینچ لیا۔ رائفل کا رُخ عورتوں کی طرف تھا۔ کئی عورتیں گولیاں کھا کر ڈھیر ہو گئیں۔ جو زخمی ہوئی تھیں' وہ بری طرح چیخ رہی تھیں۔

نصیر نے صورت حال کی نزاکت کا اندازہ لگاتے ہی فائرنگ کرنے والے سرب فوجی کی طرف چھلانگ لگادی۔ اس کا ایک پیر فوجی کے سر پر لگا۔ فوجی پہلو کے بل گر گیا۔ نصیر نے اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اس کی رائفل چھین لی اور اس کی نال کھوپڑی پر رکھ کر ٹریگر دبا دیا۔ سرب کی کھوپڑی کے پرخچے اُڑ گئے۔ باقی سربوں کو عالی جاہ اور اس کے ساتھی ٹھکانے لگا چکے تھے۔

اس تہ خانے میں بائیس عورتیں تھیں جن میں سے تین کو سرب درندے پہلے ہی قتل کر چکے تھے۔ چار ابھی سرب فوجی کی اندھادُھند فائرنگ سے ہلاک ہوئی تھیں اور پانچ زخمی ہوئی تھیں۔ دس عورتیں صحیح و سلامت تھیں لیکن ان کی حالت بھی مُردوں سے بدتر تھی۔

سرب فوجیوں کی لاشوں کو وہیں چھوڑ دیا گیا جبکہ عورتوں کی لاشوں کو چرچ کی عمارت سے باہر لا کر ایک اجتماعی قبر میں دفن کردیا گیا۔ سربوں کی وردیاں اتار لی گئی تھیں۔ عالی جاہ کے خیال میں یہ وردیاں ان کے کام آسکتی تھیں۔ جو عورتیں بالکل برہنہ تھیں' انہیں سرب فوجیوں کی وردیاں پہنا دی گئی تھیں۔ انہوں نے تہ خانے سے سربوں کی رائفلیں جمع کرلیں اور جب باہر آکر عالی جاہ ٹرک پر چڑھا تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ٹرک میں دستی بموں اور ایمونیشن کی کئی پیٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ چار پیٹیوں میں آٹو میٹک رائفلوں کے میگزین بھرے ہوئے تھے۔

اسلحے کی پیٹیوں کو ایک طرف لگا کر عورتوں کو ٹرک پر سوار کرا دیا گیا۔ انہیں اگرچہ سرب فوجیوں کے بھاری اوورکوٹ پہنا دیے گئے تھے لیکن اس کے باوجود وہ سردی سے ٹھٹھر رہی تھیں۔

عالی جاہ اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ گیا۔ نصیر نے اس کے ساتھ والی سیٹ سنبھال لی اور ان کے ساتھی ٹرک کے پچھلے حصے میں سوار ہو گئے۔ عالی جاہ نے انجن اسٹارٹ کیا اور ٹرک کو گھما کر اس پتھریلی سڑک پر لے آیا جو ایک جانب تو جاذے نامی... بستی کی طرف اور دوسری جانب ان پہاڑوں میں طویل فاصلہ طے کر کے جاہوریا سے ہوتی ہوئی سرائیوو کی طرف چلی گئی تھی۔ عالی جاہ نے ٹرک کا رخ جاذے کی طرف موڑ دیا۔

سرب درندوں کے خلاف یہ ان کی پہلی کارروائی تھی جس میں وہ کامیاب رہے تھے۔

○☆○

جب وہ جاذے پہنچے تو صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ دن کا ہلکا پُھلکا سا اُجالا ابھی پھیلنا شروع ہوا تھا۔ گہرے سیاہ بادلوں نے اب بھی آسمان کو ڈھک رکھا تھا۔

زخمی عورتوں کو ایک کمرے میں لٹا دیا گیا۔ بستی کے گھروں کی تلاشی لینے پر ایک گھر سے فرسٹ ایڈ باکس مل گیا۔ چرچ میں

فائرنگ سے پانچ لڑکیاں زخمی ہوئی تھیں۔ چار کے زخم تو ایسے تھے کہ گولیاں گوشت چیرتی ہوئی نکل گئی تھیں۔ ان کے زخم گرم پانی سے دھو کر ڈریسنگ کر دی گئی۔ البتہ پانچویں لڑکی کی ران میں گولی پیوست ہو کر رہ گئی تھی اور زخم سے گولی نکالنا ضروری تھا ورنہ اس کی حالت بگڑ سکتی تھی لیکن آپریشن کا سامان نہیں تھا۔ لڑکی کی تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔ بالآخر عالی جاہ نے اس کا آپریشن کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ایلیا نامی اس لڑکی کو ایک الگ کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ نصیر اور آرشا' عالی جاہ کے ساتھ تھے۔ لڑکی کو فرش پر لٹا کر اس کی زخمی ٹانگ برہنہ کر دی گئی اور عالی جاہ نے جیب سے چاقو نکال لیا۔ بے ہوش کئے بغیر چاقو کی نوک سے زخم سے گولی نکالنا لڑکی کو بے پناہ اذیت پہنچانے کے مترادف تھا لیکن اس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

آرشا نے ایلیا کے دونوں بازو پکڑ لیے اور نصیر نے اس کی ٹانگیں گرفت میں لے لیں تاکہ وہ مچل نہ سکے۔ عالی جاہ نے زخم کو ٹٹول کر پہلے گولی کو محسوس کیا پھر چاقو کی نوک سے زخم کریدنے لگا۔ ایلیا کے منہ سے ہلکی سی سسکاری نکلی پھر اس نے سختی سے دانت بھینچ لیے۔ عالی جاہ چاقو کی نوک سے زخم کریدتا رہا۔ گولی خاصی اندر تھی۔ بالآخر چاقو کی نوک گولی سے ٹکرائی تو عالی جاہ کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ وہ چاقو کی نوک سے گولی کو اوپر اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ بالآخر آدھے گھنٹے کی کوشش کے بعد وہ گولی کو زخم سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ ایلیا بلاشبہ ایک بہادر لڑکی تھی۔ وہ تمام وقت ہوش میں رہی تھی لیکن اس کے منہ سے ایک آواز تک نہیں نکلی تھی۔ زخم کو گرم پانی سے صاف کر کے پٹی باندھ دی گئی۔

یہ لڑکیاں اسی بستی کی تھیں۔ نصیر وغیرہ ان کے ساتھ جا کر ان کے گھروں سے ان کے کپڑے اور کھانے پینے کی چیزیں جمع کر لائے۔ ان سب نے اس مکان کو اپنا مرکز بنا لیا تھا۔ اس بستی کا صرف ایک آدمی دانشمند زندہ بچا تھا اور عالی جاہ کے خیال میں لڑکیوں اور دانشمند کو یہاں اکیلے نہیں چھوڑا جا سکتا تھا جبکہ وہ خود بھی زیادہ دیر یہاں نہیں رہ سکتے تھے۔ بالآخر انہوں نے یہ پروگرام بنایا کہ آج شام کا اندھیرا پھیلتے ہی وہ لوگ سرائیوو کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ عالی جاہ کا ایک چچا زاد بھائی سرائیوو میں تھا جبکہ دانشمند کا بھی ایک رشتے دار وہاں رہائش پذیر تھا۔ سرائیوو بڑا شہر تھا اور انہیں یقین تھا کہ وہاں انہیں پناہ مل جائے گی۔

سرائیوو جانے کے لیے دو راستے تھے۔ ایک راستہ تو یہ تھا کہ وہ کونجک سے ہوتے ہوئے ہائی وے کا راستہ اختیار کرتے لیکن ہائی وے پر سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ دوسرا راستہ جاہورینا سے ہو کر جاتا تھا۔ جاذے سے جاہورینا تک کوئی باقاعدہ سڑک نہیں تھی۔ پہاڑی راستہ تھا جو اگرچہ خاصا طویل تھا لیکن نسبتاً محفوظ تھا اس لیے انہوں نے یہی راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ ٹرک میں اسلحے کی پیٹیوں کے علاوہ پیٹرول کے پانچ چھ بڑے جیری کین بھی رکھے ہوئے تھے۔

اس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے۔ ضروری سامان ٹرک میں لاد دیا گیا تھا۔ ان کا پروگرام یہ تھا کہ سورج غروب ہوتے ہی یہاں سے نکل جائیں گے۔ ساڑھے پانچ بجے کے قریب فضا میں کسی گاڑی کے انجن کی گرر گرر کی آواز سن کر وہ چونک گئے۔ شجر علی نے چھت پر چڑھ کر دیکھا' وہ ایک کھلی جیپ تھی جو کونجک کی طرف سے تیز رفتاری سے بستی کی طرف آ رہی تھی۔ شجر علی نے چیخ کر اپنے ساتھیوں کو جیپ کی آمد سے آگاہ کر دیا۔ سب لوگ مکان سے نکل کر مورچے سنبھال کر کھڑے ہو گئے۔ تقریباً دس منٹ بعد جیپ سامنے آ گئی۔ اس میں صرف ایک ہی آدمی تھا۔

جیپ مکان سے چند گز کے فاصلے پر رک گئی۔ وہ شخص جیپ سے اُتر کر چیخ چیخ کر مختلف لوگوں کے نام پکارتا ہوا اِدھر اُدھر دوڑنے لگا۔ عالی جاہ نے اسے پہچان لیا۔ وہ اسی بستی کا رہنے والا تھا۔ عالی جاہ دیوار کی آڑ سے نکل کر سامنے آ گیا۔ وہ شخص ٹھٹک کر رک گیا۔

"اوہ عالی جاہ تم!" وہ شخص بولا "بستی کے سب لوگوں کو بتا دو کہ تین چار ٹرکوں پر سوار سرب فوجی اس طرف آ رہے ہیں۔ ان لوگوں نے قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ بستی والوں سے کہو کہ گھروں سے نکل کر پہاڑیوں میں چلے جائیں۔"

"بستی میں چند ستم رسیدہ لڑکیوں کے سوا کوئی بھی زندہ نہیں بچا معروف بیگ۔" عالی جاہ نے گلوگیر آواز میں جواب دیا "اس ٹرک میں بیٹھو' ہم لوگ بھی یہاں سے نکلنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ سرب فوجی کتنی دور ہیں یہاں سے؟"

"وہ لوگ کونجک سے روانہ ہو چکے ہیں۔" معروف بیگ نے جواب دیا۔

"چلو' سب لوگ ٹرک میں بیٹھو۔" عالی جاہ نے چیخ کر کہا۔

ٹرک کے فرش پر گدّے بچھا کر زخمی عورتوں کو لٹا دیا گیا اور باقی جس کو جہاں جگہ ملی' بیٹھ گیا۔ عورتوں نے جو سامان اپنے گھروں سے لا کر جمع کیا تھا وہ بھی ٹرک پر لاد دیا گیا اور تمام مرد اپنی اپنی رائفلیں سنبھال کر ٹرک پر سوار ہو گئے۔ عالی جاہ نے اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھتے ہی انجن اسٹارٹ کر دیا۔ نصیر دوڑتا ہوا اگلے پائیدان پر چڑھ گیا اور دروازہ کھول کر عالی جاہ کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

ٹرک بستی سے نکل کر تیز رفتاری سے شمالی پہاڑی کی طرف دوڑنے لگا۔ اسی پہاڑی کے دامن سے ایک پختہ سڑک کونجک کی طرف چلی گئی تھی اور دوسری غیر پختہ اور ناہموار پہاڑی کے کٹاؤ میں سے ہوتی ہوئی جاہورینا کی طرف چلی گئی تھی۔ عالی جاہ نے ٹرک کا رخ اس پتھریلی سڑک کی طرف موڑ دیا۔

بل کھاتی ہوئی سڑک اگرچہ نہایت خطرناک تھی لیکن عالی جاہ نہایت تیز رفتاری سے ٹرک کو دوڑاتا رہا۔ تقریباً ایک گھنٹے میں وہ

اسی ویران چرچ کے سامنے پہنچ گئے۔ عالی جاہ نے ٹرک روک لیا۔ چرچ کے سامنے دو سرب فوجیوں کی لاشیں پڑی تھیں اور چند بھیڑیے دن بھر دعوت اُڑانے کے بعد اس وقت بھی لاشوں کو نوچ رہے تھے۔ ٹرک کے ہیڈ لیمپس کی روشنی پڑتے ہی بھیڑیے اس طرف دیکھ کر غرائے اور پھر بھونکتے ہوئے پہاڑیوں کی طرف بھاگ گئے۔

"وہ وردیاں کہاں ہیں جو ہم نے سرب فوجیوں سے چھینی تھیں؟" عالی جاہ نے نصیر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ایک گٹھڑی میں باندھ دی گئی تھیں اور وہ گٹھڑی دوسرے سامان کے ساتھ ٹرک میں پڑی ہے۔" نصیر نے جواب دیا۔

"جاؤ، وہ گٹھڑی لے آؤ اور سب آدمیوں سے کہو، نیچے اُتر آئیں۔" عالی جاہ کہتا ہوا اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔

نصیر نے ٹرک کے پچھلے حصے میں لدے ہوئے سامان میں گٹھڑی تلاش کرکے نیچے اتارلی اور اپنے ساتھیوں کو عالی جاہ کی ہدایت سے آگاہ کردیا۔ سب لوگ ٹرک سے اتر کر عالی جاہ کے قریب جمع ہوگئے۔

"سب لوگ اپنے کپڑے اتار کر یہ سرب فوجی وردیاں پہن لیں۔ ممکن ہے راستے میں کسی مقام پر سرب درندوں کا سامنا ہوجائے۔ اس وقت یہ وردیاں ہمارے کام آئیں گی۔ وہ ہمیں بھی سرب ہی سمجھیں گے۔ اگر ان عورتوں کے بارے میں دریافت کریں تو ہم انہیں یہی بتائیں گے کہ ان عورتوں کو ہم مختلف بستیوں سے اٹھا کرلائے ہیں۔ چلو جاؤ، اپنی اپنی وردیاں لے کر ان پتھروں کے پیچھے جاکر تبدیل کرلو۔" عالی جاہ نے کہا اور ایک وردی خود اٹھالی۔

نصیر نے بھی ایک وردی اٹھالی اور اندھیرے میں پتھروں کے پیچھے چلا گیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ لوگ آگے روانہ ہوگئے۔ پہاڑی راستہ نہایت دشوار گزار تھا۔ بعض مقامات پر تو انہیں اصل راستہ چھوڑ کر کئی کئی میل تک چیڑ اور صنوبر کے درختوں میں سے گزرنا پڑا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سردی کی شدت میں اضافہ ہوتا جارہا تھا لیکن وہ برداشت کرنے پر مجبور تھے۔

صبح چار بجے کے قریب وہ ایک دوراہے پر پہنچ گئے۔ ٹریسکا ویکا سے آنے والی ایک اور غیر ہموار سڑک یہاں آن ملتی تھی۔ وہ سڑکوں کے سنگم سے ابھی تقریباً سو گز دور ہی تھے کہ انہیں چونک جانا پڑا۔ دوراہے پر ایک فوجی ٹرک کھڑا تھا اور چار سرب فوجی رائفلیں تانے سڑک پر کھڑے تھے۔ ایک انہیں رکنے کا اشارہ کررہا تھا۔ ہیڈ لیمپس کی روشنی میں نظر آنے والے اس فوجی ٹرک میں بھی چند سرب فوجی بیٹھے ہوئے تھے۔ عالی جاہ نے رفتار کم کردی۔ سامنے کھڑے ہوئے ٹرک سے فوجی اتر کر سڑک پر کھڑے ہوگئے۔ عالی جاہ نے قریب پہنچ کر ٹرک روک لیا۔

"کیا بات ہے، تم لوگ راستہ کیوں روکے کھڑے ہو؟" عالی جاہ نے کھڑکی سے باہر جھکتے ہوئے سخت لہجے میں پوچھا۔ اس کا لہجہ خالص سربوں جیسا تھا۔

"تم لوگ کون ہو اور کہاں سے آرہے ہو؟" نیچے کھڑے ہوئے ایک فوجی نے سوال کیا۔

"دیکھ نہیں رہے، ہم کون ہیں؟" عالی جاہ نیچے اتر آیا۔ اس کے دوسرے ساتھی بھی کود کر ٹرک سے نیچے آگئے۔ ان سب کے ہاتھوں میں آٹومیٹک رائفلیں تھیں۔

ایک سرب فوجی پچھلی طرف جاکر ٹرک میں جھانکنے لگا۔ اس نے واپس آکر اپنے سینئر کے کان میں سرگوشی کی۔ سینئر سرب فوجی، عالی جاہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "ٹرک میں عورتیں کون ہیں؟"

"مالِ غنیمت" عالی جاہ نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا "تمہیں کوئی اعتراض ہے؟"

"ان عورتوں کو یہاں اتار دو۔ ہمیں ان کی ضرورت ہے۔" سرب فوجی نے کہا۔

"دیکھو مسٹر! میں تم سے رینک میں بڑا ہوں اور سینئر بھی ہوں۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ۔ اگر تم لوگوں نے کسی قسم کی ضد کی تو ہم بھی نمٹنا جانتے ہیں اور اس کی تمام تر ذمے داری تم پر ہوگی۔" عالی جاہ کے لہجے میں غراہٹ تھی۔ اس کا اشارہ پاکر اس کے ساتھیوں نے سرب فوجیوں پر رائفلیں تان لی تھیں۔

سرب فوجی بھی رائفلیں تانے کھڑے تھے۔ ان کی تعداد دس تھی۔ صورت حال خاصی سنگین تھی، مقابلے کی صورت میں دونوں طرف کے کئی آدمی مارے جاتے لیکن عالی جاہ کے سینئر ہونے کی دھمکی کام آگئی۔ سرب فوجی شکست خوردہ سے لہجے میں بولا۔

"ہم ضد نہیں کررہے سر! ہمیں وائرلیس پر اطلاع ملی تھی کہ کونجک کی طرف سے کچھ مسلمان اس طرف آرہے ہیں، ان کے ساتھ چند حسین عورتیں بھی ہیں۔ ہمیں یہاں سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے دو گھنٹے ہوچکے ہیں۔ اگر آپ دو تین عورتوں کو یہاں چھوڑ جائیں تو......"

"ان عورتوں کو ہم نے اٹھایا ہے اور ان پر ہمارا حق ہے۔ تم یہاں کھڑے رہ کر ان مسلمان عورتوں کا انتظار کرو جن کے بارے میں تمہیں اطلاع دی گئی ہے۔ اپنے ماتحتوں کو راستے سے ہٹالو۔" عالی جاہ نے کہا اور اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوکر بولا "چلو ٹرک پر بیٹھو۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

ٹرک پر سوار ہونے سے پہلے عالی جاہ نے مکرم اور دانشمند سے سرگوشی میں کچھ کہا بھی تھا۔

سینئر سرب کے اشارے پر تمام سرب فوجی ٹرک سے ہٹ کر اپنے ٹرک میں سوار ہوگئے۔ عالی جاہ نے اپنا ٹرک اسٹارٹ

کر کے آگے بڑھا دیا۔ ان کا ٹرک سرب فوجیوں کے ٹرک سے تقریباً پندرہ گز آگے نکلا تھا کہ مُکرّم اور دانشمند نے دو ہینڈ گرینیڈ سرب فوجیوں کے ٹرک کی طرف اچھال دیے۔ دونوں بم ٹرک میں گرے۔ یکے بعد دو خوفناک دھماکے ہوئے اور سرب فوجیوں سمیت ٹرک کے پرخچے اُڑ گئے۔ عالی جاہ نے ٹرک کی رفتار یک دم تیز کردی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ پہاڑیوں سے نکل کر پختہ سڑک پر پہنچ گئے لیکن سرب فوج کے تین چار ٹرکوں نے شہر کی طرف جانے والے راستے کی ناکا بندی کررکھی تھی۔ سرب انہیں بھی اپنے ہی ساتھی سمجھے۔ عالی جاہ نے انہیں بتایا کہ وہ مسلمانوں کی کئی بستیاں اُجاڑ کر آرہے ہیں اور اب مالِ غنیمت لے کر سرائیوو کی طرف جارہے ہیں۔

اس وقت دن کی روشنی پھیل رہی تھی۔ ان کا سفر جاری رہا۔ راستے میں انہیں ایک دو فوجی ٹرک اور بھی ملے تھے مگر عالی جاہ نے اپنا ٹرک روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ اس ہائی وے پر پہنچ گئے جہاں دائیں طرف چند میل کے فاصلے پر بوسنیا کا دارالحکومت سرائیوو تھا اور بائیں سمت میں یہ ہائی وے موستار کی طرف چلی گئی تھی۔

ہائی وے پر فوجی ٹرکوں کی آمدورفت جاری تھی۔ پرائیویٹ گاڑیاں بھی موستار کی طرف جاتی ہوئی نظر آئیں۔ ان گاڑیوں میں عورتیں، بچے اور سامان اس طرح لدا ہوا تھا جیسے وہ افراتفری میں اپنا گھربار چھوڑ کر جارہے ہوں۔ ان پرائیویٹ گاڑیوں کو دیکھ کر عالی جاہ کو شہر کی صورت حال کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ بہرحال، انہیں شہر میں تو داخل ہونا ہی تھا۔ عالی جاہ نے ٹرک کا رخ سرائیوو کی طرف موڑ دیا۔

یوگوسلاویہ کا یہ خوبصورت ترین شہر تباہی و بربادی کی لپیٹ میں تھا۔ کشادہ سڑکوں کے کناروں پر سرو کے اونچے درختوں کی قطاریں تھیں۔ ان کے پیچھے گھاس اور پھولوں کے تختے اور ان کے ساتھ ساتھ خوبصورت عمارتیں تھیں۔ بیشتر عمارتیں کئی کئی منزلہ تھیں لیکن بہت سی عمارتوں میں سرب فوجیوں کی گولہ باری سے دراڑیں اور شگاف پڑے ہوئے تھے۔

کمیونسٹ سرب جن کی فوج میں اکثریت تھی، بوسینا کی آزادی کا اعلان ہوتے ہی شہروں میں امن وامان قائم رکھنے کی ذمے داری فوج کو سونپ دی گئی تھی لیکن سربوں کو تو نہ ہی مسلم ریاست بوسنیا کا قیام پسند آیا تھا اور نہ ہی عیسائی ریاست کروشیا کی آزادی ایک آنکھ بھائی تھی۔ وہ پورے علاقے پر اپنا اور صرف اپنا تسلط قائم رکھنا چاہتے تھے۔ مسلم ریاست کا وجود وہ کس طرح برداشت کرسکتے تھے۔ فوج کے اسلحے کے ذخائر پر بھی سربوں ہی کا قبضہ تھا۔ فوج نے اپنی ذمے داریاں سنبھالنے کے بجائے مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کردیا۔ ان کے گھروں کو لوٹ کر نذرِ آتش کیا جارہا تھا، جوانوں کو چُن چُن کر ہلاک کیا جارہا تھا، بوڑھوں، بچوں اور ضعیف عورتوں کو زندہ، جلتی ہوئی آگ میں پھینکا جارہا تھا۔ جوان لڑکیوں اور خوبصورت عورتوں کو سڑکوں پر بے آبرو کیا جارہا تھا لیکن مسلمانوں کی مدد کو آنے والا کوئی نہیں تھا۔ مسلمانوں کے پاس اسلحہ نہیں تھا جس سے وہ اپنا دفاع کرتے۔ کروشیا کے عیسائیوں کو فوراً ہی بیرونی دنیا سے ہر قسم کی امداد ملنا شروع ہوگئی تھی۔ انہیں اسلحہ بھی مل رہا تھا اور یہ اسلحہ بھی زیادہ تر مسلمانوں کے خلاف استعمال ہورہا تھا۔ سربوں کو مسلمانوں کے قتلِ عام کی کھلی چھٹی تھی۔ کسی فوجی کے لیے اپنے علاقے کی قید بھی نہیں تھی۔ وہ جہاں چاہتے، جاکر کارروائی کرتے اور مسلمانوں کی بستیوں کی بستیاں اُجاڑ دیتے۔

سرائیوو کے مسلمان کسمپرسی کی حالت میں تھے۔ وہ اپنے گھربار چھوڑ کر بھاگ رہے تھے لیکن ان کے فرار کے تمام راستے مسدود کیے جاچکے تھے۔ شہر سے باہر جانے والے ہر راستے پر سرب فوجی قابض ہوچکے تھے۔ گھربار چھوڑ کر بھاگنے والے مسلمانوں کو روک کر ان کی جوان عورتیں اور سامان چھین لیا جاتا اور مردوں کو گولی سے اُڑا دیا جاتا۔

عالی جاہ یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکا کہ اس نے سرائیوو آکر سخت غلطی کی تھی لیکن اس کا بھی کیا علاج کہ مسلمانوں کو سرائیوو تو کیا، پورے ملک میں کہیں بھی پناہ حاصل نہیں تھی۔

شہر میں کہیں کہیں مسلمانوں نے بھی مورچے قائم کررکھے تھے۔ مسلمان نوجوان چھوٹے موٹے ہتھیاروں سے سرب فوجیوں کے خلاف چھوٹی موٹی کارروائیاں بھی کررہے تھے۔ ایک مرتبہ تو عالی جاہ کا ٹرک بھی بیس بائیس مسلمان نوجوانوں کے گھیرے میں آگیا تھا۔ وہ انہیں سرب فوجی ہی سمجھے تھے۔ عالی جاہ نے ٹرک نہیں روکا۔ وہ انہیں کسی طرح بھی یقین نہیں دلا سکتے تھے کہ وہ سرب فوجی نہیں، مسلمان ہیں۔ وہ بڑی ہوشیاری سے ٹرک کو مسلمان نوجوانوں کے گھیرے سے نکال لے گیا۔

ٹرک مرکزی ہسپتال کی کئی منزلہ عمارت کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ پانچوں زخمی لڑکیوں کو اتار کر ہسپتال میں پہنچا دیا گیا۔ ان کا باقاعدہ علاج بہت ضروری تھا۔ مسلسل سفر میں ٹرک کے جھٹکوں اور بے آرامی سے ان کے زخم بگڑ گئے تھے اور انہیں فوری طبّی امداد کی ضرورت تھی۔

مُکرّم کے کزن کا مکان ہسپتال سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی پہاڑی کی ڈھلان پر واقع تھا۔ عبداللہ ایک سرکاری محکمے میں بہت بڑا آفیسر تھا۔ صنوبر کے درختوں میں گھرا ہوا یہ خوبصورت مکان اسے سرکار کی طرف سے ملا ہوا تھا۔ وسیع و عریض اس بنگلے کے پچھلی طرف درختوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑی ڈھلان تھی۔ بنگلے کے سامنے کے رخ پر کشادہ سڑک تھی۔

مُکرّم اس وقت عالی جاہ کے ساتھ بیٹھا اسے راستہ بتا رہا تھا۔ اس کے بتائے ہوئے بنگلے کے سامنے سڑک پر عالی جاہ نے ٹرک

روک لیا۔ تمام لوگ ٹرک سے اتر کر دوڑتے ہوئے بنگلے میں داخل ہو گئے۔ ٹرک میں لدا ہوا سامان اور اسلحے کی پیٹیاں بھی اندر پہنچادی گئیں۔ عالی جاہ ٹرک لے کر آگے نکل گیا۔ تقریباً ایک میل آگے جاکر اس نے ٹرک کی رفتار ہلکی کر کے چھلانگ لگادی اور خود پیچھے کی طرف دوڑ لگادی۔ ایک مرتبہ اس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا' ٹرک ڈھلوان سڑک پر تیزی سے جارہا تھا اور پھر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے لہراتا ہوا ٹرک سڑک سے اتر کر درختوں سے ٹکرا کر اُلٹ گیا۔

عالی جاہ عبداللہ کے بنگلے کی طرف دوڑنے لگا۔ اس علاقے میں بیشتر سرکاری بنگلے تھے اور ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر تھے۔ یہاں شہر کے دولت مندوں کے بھی بنگلے تھے لیکن ہر طرف سناٹا محسوس ہو رہا تھا۔ عالی جاہ' عبداللہ کے بنگلے کے سامنے صنوبر کے درختوں کی قطار کے قریب رک گیا۔ اس نے محتاط نگاہوں سے ادھراُدھر دیکھا اور پھر دوڑ کر درختوں کے دوسری طرف پہنچ گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی شخص ایک سرب فوجی کو ایک مسلمان کے بنگلے میں گھستا ہوا دیکھ لے۔

اس کے تمام ساتھی بنگلے میں موجود تھے۔ ٹرک سے اتارا جانے والا سامان اور اسلحے کی پیٹیاں بھی ایک کمرے میں پہنچادی گئی تھیں۔ مُکرّم کا کزن عبداللہ بھی گھر پر ہی موجود تھا۔ اس کے دونوں ملازم ان مہمانوں کے لیے ناشتے وغیرہ کی تیاری میں مصروف ہو گئے تھے۔ عبداللہ ہی کے کہنے پر عالی جاہ اور اس کے ساتھیوں نے سرب فوج کی وردیاں اتار کر اپنے لباس پہن لیے تھے۔ فوجی وردیاں سنبھال کر رکھ دی گئی تھیں کیونکہ عالی جاہ ان وردیوں سے ابھی مزید کام لینا چاہتا تھا۔

مُکرّم کے کزن عبداللہ کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی لیکن لگتا تھا' عمر اس پر اثر انداز نہیں ہوئی تھی۔ اس کی صحت قابلِ رشک تھی۔ وہ درمیانے قد کا خوبرو اور وجیہہ آدمی تھا۔ کالج میں تعلیم کے دوران ہی اس کی شادی کردی گئی تھی۔ اس کی بیوی کیمسٹری کی طالبہ تھی۔ وہ سائنس داں بننا چاہتی تھی لیکن ایک روز کالج کی لیبارٹری میں ایک تجربہ کرتے ہوئے اسپرٹ کا جلتا ہوا لیمپ اُلٹ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے لیبارٹری میں آگ بھڑک اٹھی۔ عبداللہ کی بیوی بھی شعلوں کی لپیٹ میں آگئی۔ اسے بڑی مشکل سے جلتی ہوئی لیبارٹری سے نکالا گیا مگر وہ بُری طرح جھلس گئی تھی۔ ڈاکٹروں نے اسے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن وہ بمشکل چار گھنٹے زندہ رہ سکی تھی۔ اس کی موت کے بعد عبداللہ نے آج تک شادی نہیں کی تھی۔ اس نے اس سرکاری ملازمت میں بہت دولت کمائی تھی لیکن وہ اپنی دولت ہمیشہ دوسروں پر لٹاتا رہا تھا۔ اس نے کئی غریب گھرانوں کے وظیفے مقرر کر رکھے تھے۔ وہ ان لوگوں کو ہر ہفتے رقم اس طرح پہنچاتا کہ کسی کو خبر تک نہ ہو پاتی اور اب بھی اس کے پاس بہت دولت تھی اور اب وہ اپنی یہ دولت ان مسلمانوں پر خرچ کر رہا تھا جو سرب درندوں کے ظلم و ستم کا شکار ہو رہے تھے۔

عالی جاہ وغیرہ کے آنے پر اس نے بے حد خوشی کا اظہار کیا تھا لیکن اسے اس بات کا بھی افسوس تھا کہ وہ لوگ یہاں آکر پھنس گئے تھے کیونکہ شہر سے کسی بھی طرف ان کی واپسی مشکل تھی۔

سرب فوجی گزشتہ ایک ہفتے سے شہر میں قتل و غارت کا بازار گرم کیے ہوئے تھے۔ سیکڑوں بے گناہ مسلمان ان کے ہاتھوں مارے جاچکے تھے اور کئی عمارتوں کو نذر آتش کر دیا گیا تھا۔ اس دوران مسلمان نوجوانوں نے ان سربوں کی دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک خفیہ تنظیم بھی بنالی تھی اور عبداللہ اس تنظیم کو پوری طرح سپورٹ کر رہا تھا۔ ان مسلم نوجوانوں کی تعداد بیس بائیس سے زیادہ نہیں تھی لیکن ان کے پاس بھی اسلحہ نہیں تھا۔ عبداللہ چاہتا تھا کہ کہیں سے بھی اسلحہ مل جائے تو نوجوانوں کو مسلح کر دیا جائے تاکہ سربوں کی دہشت گردی کا مقابلہ کر سکیں۔ وہ اسلحے کے حصول کے لیے بڑی سے بڑی رقم خرچ کرنے کو تیار تھا۔

اس شام عبداللہ کو جب یہ پتا چلا کہ نصیر کا تعلق پاکستان سے ہے اور وہ ایک کاروباری دورے پر آیا تھا لیکن دوسرے ہی روز جب مسلم بوسنیا کی آزادی کا اعلان ہوا اور عیسائیوں اور کمیونسٹوں نے بے گناہ مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑنا شروع کر دیے تو نصیر نے پاکستان واپس جانے سے انکار کردیا۔ وہ اس جنگ میں بوسنیائی مسلمانوں کے شانہ بشانہ لڑنا چاہتا تھا اور اب تک اس نے جس بہادری کا مظاہرہ کیا تھا وہ قابلِ تعریف تھا۔

"سربوں نے شہر سے باہر جانے والے تمام راستوں کی ناکا بندی کر رکھی ہے جس سے نہ صرف مسلمان شہر میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں بلکہ شہر میں اشیائے خورونوش کی بھی قلت ہو رہی ہے۔ ایک روٹی حاصل کرنے کے لیے لوگوں کو صبح سے شام تک بیکریوں کے سامنے قطاروں میں کھڑے رہنا پڑتا ہے۔ شہر کے پانی کے ذخیرے تباہ کیے جاچکے ہیں۔ کئی علاقوں کی بجلی منقطع ہے۔ بچے اور بوڑھے بھوک پیاس سے ایڑیاں رگڑ رہے ہیں۔ ہسپتال میں بیماروں اور زخمیوں کی تعداد اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ مریضوں کو کھلی فضا میں زمین پر لٹایا جارہا ہے۔ ان کے علاج کے لیے ادویات دستیاب نہیں۔ زخمی اور بیمار ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ رہے ہیں۔"
عبداللہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اگر مشرق کی طرف کی ناکا بندی ختم ہوجائے تو کلادنج اور تزلا سے ہمارا رابطہ قائم ہوسکتا ہے۔ اس سے نہ صرف شہریوں کی ضروریاتِ زندگی کے لیے سپلائی لائن بحال ہوسکتی ہے بلکہ مسلمانوں کے قافلوں کو محفوظ مقامات کی طرف جانے کا راستہ بھی مل جائے گا۔"

"کیا یہاں کوئی فوجی چوکی قائم ہے یا ویسے ہی ناکا بندی کی گئی ہے؟" عالی جاہ نے پوچھا۔

"باقاعدہ فوجی چوکی ہے۔ وہاں کم سے کم ساٹھ فوجی ہر وقت موجود رہتے ہیں اور باقاعدہ بھاری مشین گنیں نصب کی گئی ہیں۔" عبداللہ نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، کل صبح ہم اس علاقے کا جائزہ لیں گے اور پھر دیکھیں گے کہ کیا کیا جاسکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس موقع پر سربوں کی فوجی وردیاں ایک بار پھر ہمارے کام آسکتی ہیں۔" عالی جاہ نے کہا۔

وہ رات بڑی کٹھن تھی۔ رات بھر شہر کے مختلف علاقوں سے فائرنگ اور دھماکوں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔

صبح دس بجے کے قریب عالی جاہ، نصیر اور مکرّم بنگلے سے نکل گئے۔ ان کے پاس کسی قسم کا کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ وہ عام شہریوں کی طرح شہر کے مشرق میں باہر جانے والے راستے کے قریب پہنچ گئے۔ شہری حدود کے اختتام پر سڑک کے دونوں طرف ٹیلہ نما چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں۔ سڑک پر رکاوٹیں کھڑی کر کے راستہ بند کردیا گیا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف دو دو بھاری مشین گنیں نصب تھیں۔ اس کے علاوہ چند چھوٹی مشین گنیں بھی تھیں۔ ان سب کا رُخ شہر کی طرف تھا اور سرب فوجی گنوں پر ہاتھ رکھے تیار کھڑے تھے۔

اسی وقت دو گاڑیاں شہر کی طرف سے وہاں آکر رکیں۔ وہ مسلمان تھے جو اپنا گھربار چھوڑ کر کسی محفوظ مقام کی طرف جانا چاہتے تھے۔ آگے ایک کار تھی اور پیچھے پک اپ۔ دونوں میں کچھ سامان، عورتیں اور بچے بھرے ہوئے تھے۔ سرب فوجیوں نے انہیں روک لیا۔ کچھ دیر تک اگلی کار میں سوار دو ادھیڑ عمر مسلمانوں اور سرب فوجیوں میں بحث ہوتی رہی پھر فوجیوں نے ایک آدمی کو گھسیٹ کر کار سے باہر نکال لیا اور لاتوں، گھونسوں اور رائفل کے بٹوں سے اس کی پٹائی کرنے لگے۔ وہ شخص چیختا ہوا سڑک پر لوٹ رہا تھا۔ سرب درندے بیدردی سے اس کی پٹائی کرتے رہے۔ بالآخر اسے اٹھا کر کار میں ٹھونس دیا اور چیخ چیخ کر کچھ کہنے لگے۔

کار اور پک اپ واپس آگئی۔ عالی جاہ وغیرہ چوکی سے کافی دور درختوں کی آڑ میں کھڑے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ اس صورت حال .... پر ان کا خون کھول اٹھا تھا مگر وہ کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ عالی جاہ گہری نظروں سے چوکی کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہاں تقریباً چالیس سرب فوجی موجود تھے اور عالی جاہ کے خیال میں اگر صحیح حکمت عملی سے کام لیا جائے تو اس چوکی پر قبضہ کیا جاسکتا تھا۔

وہ تھوڑی دیر وہاں کھڑے رہے پھر واپسی کے لیے چل پڑے۔ راستے میں دو مرتبہ وہ ہنگاموں کی زد میں آتے آتے بچے تھے۔

وہ لوگ سارا دن گھر میں بیٹھے منصوبہ بندی کرتے رہے۔ بالآخر یہ طے پایا کہ شام کا اندھیرا پھیلنے کے فوراً بعد کارروائی شروع کردی جائے۔ ان کے پاس بارہ فوجی وردیاں تھیں جبکہ عالی جاہ اور اس کے ساتھیوں کی تعداد دس تھی۔ آرشا اور شائزہ نے بھی اپنی خدمات پیش کردی تھیں۔ عالی جاہ اس مشن پر لڑکیوں کو نہیں لے جانا چاہتا تھا مگر مجبوری تھی۔ پروگرام طے ہوجانے کے بعد بنگلے کے عقبی لان میں آرشا اور شائزہ کو آٹومیٹک رائفلوں اور دستی بموں کے استعمال کی تربیت دی گئی۔

سہ پہر کے وقت ایک آخری میٹنگ ہوئی۔ عالی جاہ اپنے ساتھیوں کو سمجھا رہا تھا کہ کسے کس وقت کیا کرنا ہے۔

"کس کو کیا کرنا ہے، اس کا انحصار وہاں کی صورت حال پر ہوگا لیکن......" وہ خاموش ہو کر باری باری سب کے چہرے دیکھنے لگا۔ "ایک بات ذہن میں رکھنا۔ وہ لوگ تعداد میں ہم سے تقریباً چار گنا زیادہ ہیں۔ ہم میں سے کسی ایک کی معمولی سی غلطی بھی ہم سب کی موت کا باعث بن سکتی ہے اس لیے ہر شخص کو بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا لیکن جب تک میری طرف سے سگنل نہ ملے کوئی بھی شخص اپنی طرف سے کارروائی شروع نہیں کرے گا۔ سمجھ گئے؟"

"سمجھ گئے۔" مکرّم نے سب کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا۔

"اور عبداللہ!" عالی جاہ، عبداللہ کی طرف متوجہ ہوگیا۔ "آپ کے آدمیوں کو سورج غروب ہوتے ہی چوکی سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر صنوبر کے درختوں کے جھنڈ میں پہنچ جانا چاہئے جہاں وہ میرے سگنل کا انتظار کریں گے۔ یہ سگنل سرخ فلیئر کی صورت میں ہوگا۔ سگنل ملتے ہی وہ آگے آجائیں گے لیکن سگنل نہ ملنے کی صورت میں انہیں واپس چلے جانا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔ انہیں سب کچھ سمجھا دیا گیا ہے۔ وہ تمہاری ہدایات پر عمل کریں گے۔" عبداللہ نے جواب دیا۔ چند اور باتوں کے تبادلے کے بعد میٹنگ برخواست ہوگئی۔ اب ہر شخص اپنی جگہ بیٹھا سوچ رہا تھا کہ آنے والا وقت اپنے دامن میں ان کے لیے کیا لے کر آئے گا۔ اذیت ناک موت یا فتح و کامرانی؟

نصیر پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ اس نے کالج کے زمانے میں این سی سی کی تربیت حاصل کی تھی۔ گزشتہ چند روز کے دوران جو کچھ بھی ہوا تھا وہ ایک الگ بات تھی۔ اب وہ اپنے سے تقریباً چار گنا زیادہ دشمن پر حملہ کرنے جارہے تھے۔ یہ دشمن جدید ترین اسلحے سے لیس تھا جبکہ ان کے پاس آٹومیٹک رائفلوں اور دستی بموں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ان میں سے کسی کی ذرا سی بھی غلطی ان کی اذیت ناک موت کا باعث بن سکتی تھی۔

سورج غروب ہونے کے آدھے گھنٹے بعد وہ لوگ عبداللہ کے بنگلے سے نکل کر تاریکی اور درختوں کی آڑ لیتے ہوئے اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگے۔ ان کے جسموں پر سرب فوج کی وردیاں تھیں۔ ہاتھوں میں آٹومیٹک رائفلیں اور بیلٹوں میں رائفلوں کے فاضل میگزین اور دستی بم اڑسے ہوئے تھے۔

چوکی سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر پہنچ کر وہ لائن اپ ہوگئے

اور فوجیوں کی طرح مارچ کرتے ہوئے چوکی کی طرف بڑھنے لگے۔
چند منٹ بعد ہی وہ چوکی پر پہنچ گئے۔ سڑک کے بیریئر پر کھڑے ہوئے دو سرب فوجیوں نے انہیں روک لیا۔

"چوکی کا کمانڈر کہاں ہے؟" عالی جاہ نے سرب فوجیوں کے کچھ بولنے سے پہلے ہی کہا۔

سرب فوجی نے بیریئر سے چند گز دور ایک ہٹ کی طرف اشارہ کردیا۔ عالی جاہ مارچ کرتا ہوا ہٹ میں داخل ہوگیا۔ نصیر وغیرہ بیریئر کے قریب کھڑے رہے۔ انہوں نے رائفلیں اب بھی کندھوں پر لٹکا رکھی تھیں۔ آرشا اور شائزہ نے سروں پر ٹوپیاں اس طرح جھکا رکھی تھیں کہ ان کے چہرے تقریباً چھپ کر رہ گئے تھے۔

عالی جاہ تقریباً پندرہ منٹ بعد ہٹ سے باہر نکلا۔ ٹھیک اسی وقت ایک سرب فوجی نے ہٹ میں داخل ہونا چاہا تو عالی جاہ نے اسے روک دیا۔

"پوسٹ کمانڈر وائرلیس پر ہیڈ کوارٹر سے اہم بات کررہا ہے۔ چند منٹ بعد آجانا۔"

سرب فوجی کچھ کہے بغیر واپس چلا گیا۔ اسے عالی جاہ پر ذرا بھی شبہ نہیں ہوا تھا۔ اس چوکی پر فوجیوں کی ڈیوٹیاں بدلتی رہتی تھیں اور کوئی ایک دوسرے کو نہیں پہچانتا تھا۔ عام فوجی شاید یہی سمجھے تھے کہ یہ لوگ بھی یونٹ سے آئے ہیں۔

تقریباً پانچ منٹ بعد عالی جاہ دوبارہ ہٹ میں داخل ہوا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ پوسٹ کمانڈر اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی گردن ایک طرف ڈھلکی ہوئی تھی۔ اس سرب درندے کی گردن کی ہڈی تو عالی جاہ اسی وقت توڑ چکا تھا جب وہ پہلی مرتبہ ہٹ میں داخل ہوا تھا۔ وہ صرف ایک منٹ ہٹ کے اندر رکا اور اپنے آدمیوں کو چیخ چیخ کر احکامات جاری کرنے لگا۔

نصیر اور مکرم وغیرہ مارچ کرتے ہوئے مختلف سمتوں میں پھیل گئے۔ اس چوکی پر چار ہیوی مشین گنیں نصب تھیں اور ہر گن پر دو دو سرب فوجی تھے۔ لائٹ مشین گنوں پر ایک ایک آدمی تھا۔ کچھ فوجی بیریئر کے پاس تعینات تھے اور کچھ سڑک کے دوسری طرف تھے جہاں ایک ٹرک اور دو جیپیں بھی کھڑی تھیں۔ عالی جاہ کے ساتھی گنوں پر تعینات سرب فوجیوں کے پیچھے جاکر کھڑے ہوگئے۔ سرب فوجیوں نے گردنیں گھما کر ان کی طرف دیکھا لیکن زیادہ توجہ نہیں دی۔

عالی جاہ ہٹ کے سامنے کھڑا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اس نے جب محسوس کیا کہ اس کے تمام ساتھی اپنی اپنی جگہوں پر پہنچ گئے ہیں تو اس نے اپنی رائفل کندھے سے اتار کر ہاتھ میں لے لی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ چونک گیا۔ ایک فوجی ٹرک بیریئر کے قریب آکر رکا تھا۔ اس میں پچیس تیس فوجی بھرے ہوئے تھے اور ان کا انچارج چیخ چیخ کر بیریئر کے محافظوں سے کچھ کہہ رہا تھا پھر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ہٹ کی طرف آنے لگا۔ دوسرے سرب فوجی بھی

ٹرک سے اُتر چکے تھے۔ ان کے انچارج کو پوسٹ کمانڈر کے ہٹ کی طرف آتے دیکھ کر عالی جاہ کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر رائفل سیدھی کرکے اپنی طرف آنے والے سرب فوجی پر فائرنگ شروع کر دی۔

یہ عالی جاہ کی طرف سے سگنل تھا۔ دوسرے ہی لمحے فضا فائرنگ کی زبردست آوازوں سے گونجنے لگی۔ عالی جاہ کے ساتھیوں نے سب سے پہلے مشین گنوں پر تعینات سرب فوجیوں کو چھلنی کرکے گنوں پر قبضہ کیا تھا اور اب وہ سرب فوجیوں کو گولیوں کا نشانہ بنا رہے تھے۔

مکرم نے ایک ہیوی مشین گن پر قبضہ کیا تھا۔ اس کے ساتھ آرشا تھی۔ آرشا تو اپنی رائفل سے فائرنگ کر رہی تھی اور مکرم نے گن کا رخ بیرئر کی طرف کرکے فائر کھول دیا تھا۔ بیرئر پر تعینات اور ٹرک سے اترنے والے فوجی فائرنگ کرتے ہوئے اپنی جانیں بچانے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے لیکن چاروں طرف سے آنے والی گولیاں ان کے لیے موت کا پیغام ثابت ہو رہی تھیں۔

نصیر نے ایک لائٹ مشین گن پر قبضہ کیا تھا اور وہ بھی سرب فوجیوں کو نشانہ بنا رہا تھا لیکن نجانے کہاں سے ایک سرب فوجی نے آکر اس پر چھلانگ لگا دی۔ نصیر کراہتا ہوا الٹ گیا۔ سرب فوجی نے اس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ نصیر کو سنبھلنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ سر پر لگنے والی ایک اور ٹھوکر نے اس کی آنکھوں کے سامنے تاریکی پھیلا دی۔ سرب فوجی نے بڑی پھرتی سے جھک کر نصیر کی رائفل اٹھالی۔ وہ نصیر کو زد میں لے کر ٹریگر دبانا ہی چاہتا تھا کہ دائیں طرف سے آنے والی ایک گولی نے سرب فوجی کی کھوپڑی اُڑا دی۔ نصیر جیسے ہوش میں آگیا۔ اس نے جلدی سے مُڑ کر دیکھا' وہ شائزہ تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر نصیر کو سہارا دے کر اٹھایا۔ نصیر کچھ دیر تک دونوں ہاتوں سے کنپٹیاں سہلاتا رہا پھر اس نے مشین گن سنبھال لی۔

صدیق کچھ زیادہ ہی جوش میں آگیا تھا۔ اس جوش میں وہ ہوش کھو بیٹھا اور رائفل سے فائرنگ کرتا ہوا اس طرف دوڑتا چلا گیا جہاں تین چار سرب فوجی جیپ کی آڑ میں کھڑے فائرنگ کر رہے تھے۔ وہ بالکل کھلی جگہ پر آگیا تھا جس کا نتیجہ اسے بھگتنا پڑا۔ ایک سرب فوجی کی آٹومیٹک رائفل سے نکلنے والی گولیوں نے اس کا جسم چھلنی کر دیا اور وہ خاک و خون میں لوٹ گیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے تک زبردست فائرنگ ہوتی رہی۔ بیشتر سرب فوجی یا تو مارے جاچکے تھے یا زخمی ہو چکے تھے۔ عالی جاہ نے جیب سے پستول نکال کر اس کا رخ آسمان کی طرف کرکے ٹریگر دبا دیا۔ فضا میں سرخ روشنی پھیل گئی۔ اس کے ساتھ ہی فضا اللہ اکبر کے نعرے سے گونج اٹھی اور بیس بائیس مسلمان نوجوان درختوں سے نکل کر دوڑتے ہوئے اس طرف آنے لگے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ مسلمان نوجوان' سربوں کے چھوڑے ہوئے مورچے سنبھال چکے تھے۔

یہ ساری کارروائی ایک گھنٹے میں مکمل ہو گئی تھی۔ صرف چند ایک سرب فوجی جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو سکے تھے جبکہ باقی سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ تین مسلمان شہید ہوئے تھے اور حیرت کی بات تھی کہ زخمی کوئی نہیں ہوا تھا۔ مردوں کے علاوہ دونوں لڑکیوں نے بھی بے مثال جرأت اور بہادری کا مظاہرہ کیا تھا۔ نصیر' شائزہ کا بیحد شکر گزار تھا۔ اگر وہ سرب فوجی کے خلاف بروقت کارروائی نہ کرتی تو نصیر اس سرب فوجی کے ہاتھوں مارا جاچکا تھا۔

عالی جاہ کا خیال تھا کہ سرب فوجی اس چوکی پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لیے جوابی کارروائی کریں گے اس لیے انہیں کم از کم اس رات کے لیے بے حد احتیاط کی ضرورت تھی۔ عالی جاہ اور نصیر گھوم پھر کر اس چوکی کا جائزہ لے رہے تھے۔ بھاری اور ہلکی مشین گنوں کے علاوہ مارٹر گنیں اور ہلکی توپیں بھی موجود تھیں اور ایمونیشن تو اتنا تھا کہ وہ کم از کم ایک ہفتے تک مقابلہ کر سکتے تھے۔ چوکی کے چاروں طرف بڑی بڑی سرچ لائٹیں نصب تھیں جن سے دور دور کا علاقہ روشن ہو رہا تھا۔

یہ خبر آن کی آن میں شہر میں پھیل گئی کہ مشرقی چوکی پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا ہے اور اب اس راستے سے آنے جانے میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ بہت سے لوگ جو پہلے ہی سے تیار بیٹھے تھے' شہر سے نکل کر دیگر محفوظ مقامات کی طرف روانہ ہو گئے۔

عالی جاہ کو اس تنظیم کے سربراہ کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی اور نصیر اس کا نائب تھا۔ تنظیم کے تمام لوگ بلاچون وچرا ان کے احکامات کی تعمیل کر رہے تھے۔ وہ رات بھر اپنے مورچوں میں ڈٹے رہے۔ صبح ہونے تک سرائیوو کی مشرقی چوکی پر مسلمانوں کے قبضے کی اطلاع کلادنج' تزلہ' ولا سے نیکا کوونج اور بی جے لینا تک پہنچ چکی تھی۔ صبح ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد ان شہروں سے خورونوش کا سامان بھی سرائیوو پہنچنے لگا۔

شہر کی آس پاس کی پہاڑیوں پر اب بھی سربوں کا قبضہ تھا۔ شمالی پہاڑی پر سربوں کی چوکی شہر کے مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ خطرناک ثابت ہو رہی تھی۔ وہاں سے پورا شہر سربوں کی نظروں میں تھا۔ یہاں تک کہ ہسپتال کا دروازہ بھی ان کی نگاہوں میں تھا۔ سرب انسانیت سے اس قدر گر گئے تھے کہ ہسپتال میں آنے جانے والے زخمیوں اور دیگر لوگوں پر بھاری مشین گنوں سے فائرنگ کی جارہی تھی۔ شمالی پہاڑی سے کی جانے والی فائرنگ کے نتیجے میں ہلاک یا زخمی ہونے والوں کو اٹھانے کے لیے کوئی آگے آتا تو اس پر بھی گولیوں کی بارش کر دی جاتی۔ یہاں تک کہ ایمبولینس گاڑیوں تک کو نشانہ بنایا جارہا تھا۔

مشرقی چوکی پر قبضے کے بعد عالی جاہ اور عبداللہ وغیرہ میں مسلسل میٹنگز ہو رہی تھیں۔ وہ اب شمالی چوکی کے بارے سوچ

رہے تھے لیکن ان کے پاس ابھی اتنی قوت نہیں تھی کہ شمالی چوکی پر حملہ کیا جاسکتا۔

مشرقی چوکی پر قابض ہوئے ایک ہفتہ ہوچکا تھا۔ پھر ایک روز اچانک سربوں نے چوکی پر حملہ کردیا۔ عالی جاہ اور اس کے ساتھی صرف ہلکی اور بھاری مشین گنیں استعمال کررہے تھے جبکہ سرب ان پر مارٹر گنوں اور ہلکی توپوں سے بھی گولہ باری کررہے تھے جس سے چوکی پر قابض مسلمانوں کا خاصا نقصان ہورہا تھا۔

یہ معرکہ تقریباً چھ گھنٹوں تک جاری رہا اور بالآخر عالی جاہ اور اس کے ساتھیوں کو وہ چوکی چھوڑنی پڑی۔ وہ جتنا اسلحہ لے جاسکتے تھے' انہوں نے اٹھالیا۔ توپوں اور دیگر اسلحہ کو اس طرح تباہ کردیا کہ وہ سربوں کے استعمال کے قابل بھی نہ رہے۔

چوکی چھوڑنے سے پہلے تنظیم کے مقامی نوجوانوں کو کچھ عرصے کے لیے زیرِ زمین چلے جانے کا حکم دے دیا گیا تھا جبکہ عالی جاہ اپنے ساتھیوں کو لے کر پہاڑیوں کی طرف نکل گیا۔ عبداللہ کے بنگلے پر جانا خطرے سے خالی نہیں تھا اسی لیے انہوں نے پہاڑیوں کا رخ کیا تھا۔ ان کے ساتھ صبح نور نامی ایک مقامی نوجوان بھی تھا۔

گنجان درختوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں میں آگے بڑھنا بے حد مشکل ہو رہا تھا لیکن وہ لوگ ان گنجان درختوں میں دشوار گزار راستوں پر آگے بڑھتے رہے اور بالآخر ایک جگہ رک گئے۔

"یہ جگہ اگرچہ محفوظ نہیں ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ہم کچھ دیر یہاں آرام کرسکتے ہیں۔" عالی جاہ نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہاں سے تقریباً ایک میل آگے ایک غار ہے جہاں ہمیں پناہ مل سکتی ہے۔" صبح نور نے کہا۔ "وہ غار بے حد محفوظ ہے۔ اگر آپ چاہیں تو اسے ہیڈ کوارٹر کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔"

"تو پھر چلو' وہیں چلتے ہیں۔" عالی جاہ کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

وہ پہاڑی کی بلندی کی طرف چلنے لگے۔ غار تک جانے والا راستہ بے حد خطرناک تھا۔ تقریباً تین فٹ چوڑی پگڈنڈی تھی جس کے ایک طرف عمودی چٹان تھی اور دوسری طرف گہرے کھڈ۔ پگڈنڈی کانٹے دار جھاڑیوں سے اٹی ہوئی تھی۔ وہ ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے خطرناک پگڈنڈی پر چلتے ہوئے غار کے سامنے پہنچ گئے۔

غار کے دہانے کے سامنے ایک بہت بڑا پتھر پڑا ہوا تھا۔ اس سے آگے تقریباً بیس فٹ چوڑی مسطح جگہ تھی جہاں درختوں کی بہتات تھی۔ عالی جاہ نے پتھر کے قریب رک کر چاروں طرف دیکھا۔ یہ واقعی محفوظ جگہ تھی۔ ایک تو غار کی طرف آنے والا راستہ ہی اتنا خطرناک تھا کہ کوئی اس طرف آنے کی ہمت نہیں کرسکتا تھا اور پھر پتھروں' قد آدم جھاڑیوں اور درختوں کی وجہ سے غار اس طرح چھپا ہوا تھا کہ اسے اوپر سے بھی نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔

غار اندر سے انگریزی کے حرف ایل کی طرح اور کافی کشادہ تھا اور یہاں بیک وقت ڈیڑھ سو آدمی بہ آسانی رہ سکتے تھے۔ وہ لوگ ٹارچوں کی روشنی میں غار صاف کرنے لگے۔

○☆○

وہ کیمپ شہر سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر تھا۔ یہ ان مسلمان مہاجرین کا کیمپ تھا جو پناہ کی تلاش میں سرائیوو آئے تھے اور انہیں سرائیوو میں بدترین حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ انہیں شہر سے نکال کر ایک کیمپ میں ڈال دیا گیا تھا۔ اس کیمپ کو اگرچہ مہاجرین کے کیمپ کا نام دیا گیا تھا مگر ان لوگوں کے ساتھ جنگی قیدیوں سے بھی بدتر سلوک کیا جارہا تھا۔ کھلے آسمان کے نیچے سخت سردی سے بچنے کے لیے ان کے پاس نہ تو گرم کپڑے تھے اور نہ ہی کچھ کھانے کو تھا۔ یہاں چوبیس گھنٹے میں صرف ایک مرتبہ کھانا فراہم کیا جاتا تھا اور وہ کھانا بھی ایسا ہوتا جسے کتے بھی کھانا پسند نہ کرتے مگر یہ مجبور و بے بس انسان یہی کھانا کھانے پر مجبور تھے۔ شیر خوار بچوں کے لیے دودھ یا نرم غذا کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ فاقوں سے ان کی ماؤں کی چھاتیاں سوکھ چکی تھیں اور یہ معصوم اور بے گناہ بچے بھوک سے بلبلاتے ہوئے ایڑیاں رگڑ رہے تھے۔ بیماروں کے لیے ادویات یا ان کی دیکھ بھال کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

کیمپ کے چاروں طرف خاردار تاروں کا اونچا جنگلا لگا دیا گیا تھا اور یہ مسلمان مہاجرین قیدیوں کی سی زندگی گزار رہے تھے۔ کسی کو کیمپ سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ ان کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ اس کیمپ کی نگرانی سرب فوجیوں کے سپرد تھی۔ بوسنیائی مسلمان مہاجرین کے اس کیمپ کو دیکھ کر دوسری جنگِ عظیم میں نازیوں کے جنگی کیمپوں کی یاد تازہ ہوتی تھی جہاں قیدیوں پر ہر طرح کا ظلم روا رکھا جاتا تھا۔

اس مہاجر کیمپ میں ڈھائی سو مسلمان خاندان محصور تھے جو جانوروں سے بدتر زندگی گزار رہے تھے۔ ان مہاجرین میں صادق نامی ایک شخص کا مختصر سا خاندان بھی شامل تھا۔ صادق سرائیوو سے تقریباً تیس پینتیس میل دور 'وسوکو' کا رہنے والا تھا۔ 'وسوکو' سرائیوو سے زینیکا کی طرف جانے والی سڑک پر دریا کے کنارے ایک خوبصورت قصبہ تھا جس کے چاروں طرف سیب اور انگوروں کے باغات پھیلے ہوئے تھے۔ اس قصبے کی آبادی تقریباً پانچ ہزار افراد پر مشتمل تھی جن میں سرب بھی تھے اور کروٹس بھی۔ وہ لوگ کئی نسلوں سے یہاں اکٹھے رہ رہے تھے۔

جب یوگوسلاویہ کا بحران شروع ہوا تو تمام ریاستوں میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی تھی لیکن وسوکو کے رہنے والوں نے آپس میں یہ عہد کرلیا تھا کہ ملک کے حالات خواہ کچھ بھی ہوں' وہ اپنے قصبے کا سکون برباد نہیں ہونے دیں گے۔

لیکن بعض سنجیدہ مسلمان محسوس کررہے تھے کہ سرب اور

کروٹس اب ان سے مخلص نہیں رہے۔ ملک کے حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ان کی نظریں بھی بدل رہی تھیں اور جب مسلم ریاست بوسنیا کی آزادی اور خود مختاری کا اعلان ہوا تو سربوں اور کروٹس کے رویّوں میں واضح تبدیلی آگئی۔

اس قصبے میں اکثریت اگرچہ مسلمانوں کی تھی لیکن ان کے پاس اپنی حفاظت کا کوئی سامان نہیں تھا۔ جبکہ سربوں اور کروٹس کے پاس جدید ترین اسلحہ موجود تھا اور وہ لوگ کھلے عام اس کی نمائش کرتے پھر رہے تھے اور پھر تیسرے دن شام کو اس بستی میں بھی ہنگامہ شروع ہوگیا۔ ہنگامہ دو نوجوانوں میں معمولی سی بات پر بحث و تکرار سے شروع ہوا تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے ایک بڑے فساد کی بنیاد بن گیا۔ رات تک پوری بستی اس فساد کی لپیٹ میں آچکی تھی۔ لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم ہوگیا۔ سرب اور کروٹس مسلح تھے۔ وہ مسلمانوں کے گھروں میں گھس کر انہیں لوٹ رہے تھے اور قتل کر رہے تھے۔

کئی مسلمان خاندان رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنا گھربار چھوڑ کر قصبے سے نکل گئے۔ صادق اور اس کے گھر والے رات بھر اپنے مکان کے دروازے اندر سے بند کر کے ایک کمرے میں دبکے رہے۔ ان کے پاس اپنی حفاظت کے لیے ایک لاٹھی تک نہیں تھی۔

اور پھر جیسے ہی آسمان پر سپیدۂ سحر نمودار ہوا' صادق اپنے گھر والوں کو لے کر بستی سے نکل گیا۔ اس کے خاندان میں ایک بوڑھی ماں اور دو جوان بہنیں شامل تھیں جنہیں وہ اس جہنم سے نکال لے جانا چاہتا تھا۔

بستی سے باہر اسے تین اور مسلمان خاندان مل گئے جو اسی کی طرح عزت و آبرو اور جان بچانے کے لیے بستی چھوڑ رہے تھے۔ ان میں سے ایک آدمی کے پاس شاٹ گن تھی جبکہ دوسروں کے پاس کسی قسم کا اسلحہ نہیں تھا۔ وہ لوگ بستی سے نکل کر جیسے ہی دریا کے پُل پر پہنچے' چار آدمیوں نے ان کا راستہ روک لیا۔ وہ چاروں اس بستی کے سرب نوجوان تھے۔ ان میں ایک نوجوان کا تعلق ایسے خاندان سے تھا جو تقریباً بیس سال پہلے سربیا سے بوسنیا آیا تھا اور روزگار کی تلاش میں تھا۔ صادق کے باپ نے نہ صرف انہیں رہائش کے لیے جگہ دی تھی بلکہ روزگار بھی فراہم کیا تھا اور آج اسی خاندان کا محسن کش نوجوان بیٹا ان کا راستہ روکے کھڑا تھا۔ ان چاروں کے پاس آٹومیٹک رائفلیں تھیں۔

"ہمیں یقین تھا کہ کچھ لوگ صبح ہوتے ہی یہاں سے بھاگنے کی کوشش کریں گے اس لیے ہم لوگ استقبال کے لیے یہاں کھڑے ہیں۔" اس احسان فراموش سرب نوجوان نے کہا۔

"دیکھو' ہم اپنا سب کچھ چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ ہمارا سارا قیمتی سامان مکان میں موجود ہے۔ تم چاہو تو جا کر اس پر قبضہ کر سکتے ہو لیکن ہمارا راستہ چھوڑ دو۔" صادق نے کہا۔

"قیمتی چیزیں تو تم لوگ اپنے ساتھ لے جا رہے ہو۔" سرب نوجوان نے کہتے ہوئے صادق کی بہنوں اور دوسری لڑکیوں کی طرف دیکھا۔ "یہ لڑکیاں ہمارے حوالے کردو' تم لوگوں کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔"

صادق اور قافلے میں شامل دوسرے مردوں کے خون کھول اٹھے۔ انہوں نے آٹومیٹک رائفلوں کی پروا کیے بغیر سربوں پر حملہ کر دیا۔ ایک سرب نے فائر کھول دیا۔ کئی گولیاں صادق کے ایک ساتھی کے پیٹ میں لگیں اور وہ چیختا ہوا ڈھیر ہوگیا۔

مسلمان کو ہلاک کرنے والا وہ سرب' لڑکیوں کی طرف لپکا جو پُل کی ریلنگ کے قریب کھڑی چیخ چلا رہی تھیں۔ وہ پانچ لڑکیاں تھیں۔ دو صادق کی بہنیں اور تین دوسرے خاندانوں کی۔ انہوں نے سرب غنڈے کو اپنی طرف آتے دیکھا پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے ان پانچوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر دریا میں چھلانگ لگادی۔

صادق اور اس کے ساتھی سناٹے میں رہ گئے۔ ان پر جنون سا طاری ہوگیا۔ سرب نوجوان بھی ایک لمحے کو خوفزدہ ہوگئے۔ صادق نے اپنے حریف سے رائفل چھین لی اور پھر ان چاروں سرب غنڈوں کو جہنم رسید کرنے میں انہیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔

وہ سب پُل کی ریلنگ پر جھکے دریا میں دیکھ رہے تھے۔ تقریباً پچاس فٹ نیچے تیز رفتار پانی ان پانچوں لڑکیوں کو اب تک نجانے کہاں لے جا چکا تھا۔ انہوں نے اپنی جان دیدی تھی لیکن شیطان کے چیلوں کے ہاتھ اپنے جسموں تک نہیں پہنچنے دیے تھے۔

یہاں زیادہ دیر تک کھڑے رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ وہ لوگ روتے دھوتے آگے چل دیے۔ وہ لوگ سڑک سے ہٹ کر درختوں اور پہاڑیوں میں چھپتے ہوئے چل رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انہیں سرائیوو میں پناہ مل جائے گی لیکن سرائیوو میں قیامت کا سا سماں تھا۔ یہاں بھی مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کیا جا چکا تھا اور بہت سے مسلمان خاندان اپنے گھربار چھوڑ کر محفوظ مقامات کی طرف ہجرت کر رہے تھے۔

صادق کا چچا زاد بھائی یہاں ایک کمپنی میں ملازم تھا لیکن صادق جب اس کے مکان پر پہنچا تو مکان کھنڈر میں تبدیل ہو چکا تھا اور اسے اپنے کزن یا اس کے گھر والوں کے بارے میں کچھ پتا نہیں چل سکا تھا۔ اس دوران صادق کو بتایا گیا کہ پناہ کی تلاش میں بیرونی علاقوں سے آنے والے مہاجرین کے لیے حکومت نے ایک کیمپ قائم کر دیا ہے' اگر اس کے پاس رہائش کی جگہ نہ ہو تو وہ کیمپ کے دفتر سے رابطہ قائم کرے۔ اسے دفتر کا پتا بھی بتا دیا گیا۔

صادق ان سب لوگوں کو لے کر ہسپتال کے قریب مہاجر کیمپ کے دفتر پہنچ گیا جہاں رجسٹر میں اندراج کرنے کے بعد انہیں کیمپ بھیج دیا گیا۔ کیمپ میں داخل ہوتے ہی صادق کو احساس ہوا کہ وہ زندگی کی سب سے بڑی غلطی کر چکا ہے۔ اس نے اندر قدم رکھتے

ہی اندازہ لگالیا تھا کہ یہ مہاجر کیمپ نہیں' ایک ایسا قید خانہ ہے جہاں محصور مسلمان مہاجرین سرب درندوں کے رحم و کرم پر ہیں۔

وہ لوگ جس روز کیمپ میں آئے تھے' اس کے تھوڑی ہی دیر بعد صادق کی بوڑھی ماں کی طبیعت خراب ہوگئی۔ اس کے سینے میں بڑی شدت کا درد اٹھا تھا۔ کیمپ میں نہ تو کوئی ڈاکٹر تھا اور نہ ہی بیماروں کے علاج کا کوئی بندوبست۔ صادق کی ماں طبی امداد نہ ملنے کے باعث اسی رات انتقال کرگئی۔ وہ رات بھر ماں کی لاش کے پاس بیٹھا روتا رہا۔ صبح کیمپ کے محافظ اس کی ماں کی لاش اٹھا کر لے گئے۔

وہ کیمپ میں صادق کی دوسری رات تھی۔ شاید گیارہ بجے تھے۔ کھلے آسمان کے نیچے سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے مسلمان مہاجرین ایک دوسرے کے ساتھ سمٹے ہوئے تھے۔ رات کے سناٹے میں کبھی کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دینے لگتی اور کبھی کسی بیمار کے کراہنے کی۔ صادق لکڑی کے ایک کھمبے سے ٹیک لگائے بیٹھا تاریکی میں گھور رہا تھا کہ کیمپ کے گیٹ کی طرف ٹارچوں کی روشنی میں کچھ ہلچل سی نظر آئی۔ وہ اس طرف دیکھنے لگا۔ وہ چار سرب محافظ تھے جو کیمپ کے گیٹ کے اندر آکر ٹارچوں کی روشنی میں اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی کیمپ کے اس حصے میں عورتوں کی چیخوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

صادق اپنی جگہ سے اٹھ کر راستے میں پڑے ہوئے لوگوں سے ٹھوکریں کھاتا ہوا اس طرف بڑھنے لگا۔ جب صادق وہاں پہنچا تو محافظ کیمپ سے باہر جاچکے تھے اور ایک عورت چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔

"وہ لے گئے... وہ درندے انہیں لے گئے۔"

"کیا ہوا' کسے لے گئے؟" صادق نے اس عورت کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ میری بیٹی اور ایک اور لڑکی کو لے گئے۔ کوئی ان معصوم لڑکیوں کو ان درندوں سے بچائے۔" عورت چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔

صادق کا خون کھول اٹھا۔ کچھ اور لوگ بھی اپنی جگہوں سے اٹھ کر وہاں آگئے لیکن وہ کچھ بھی نہیں کرسکے۔ سرب محافظ کیمپ سے دور بیٹھے تھے۔ ان کی چیخ و پکار کا ان پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

صادق کے لیے یہ نئی بات ضرور تھی لیکن کیمپ میں رہنے والے دوسرے مہاجرین کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ سرب غنڈے ہر رات اسلحے کے زور پر اس مہاجر کیمپ سے اپنی پسند کی لڑکیاں اٹھا کر لے جاتے اور وہ لڑکیاں ہمیشہ کے لیے غائب ہوجاتیں۔

صادق جب تک اس کیمپ میں رہا' ہر رات یہی سب کچھ ہوتا رہا اور وہ کچھ بھی نہیں کرسکا لیکن ایک رات اسے کسی نہ کسی طرح کیمپ سے بھاگنے کا موقع مل گیا۔

کیمپ سے نکلنے کے بعد صادق شہر کی طرف دوڑتا رہا۔ رات کے وقت شہر میں داخل ہونا خطرے سے خالی نہیں تھا لیکن صادق ہر خطرے کو نظرانداز کرتا ہوا دوڑتا رہا۔ پہاڑی کے دامن میں آبادی شروع ہوئی تو صادق ایک جگہ رک کر کچھ دیر سانس درست کرتا رہا پھر آگے بڑھنے لگا۔ کشادہ سڑک کے دونوں طرف وسیع و عریض بنگلے تھے لیکن ہر بنگلا تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور چاروں طرف سناٹا تھا۔ جب تک وہ دوڑتا رہا تھا' خون کی گردش تیز ہونے سے گرمی سی محسوس کرتا رہا تھا لیکن اب وہ سردی محسوس کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد تو وہ باقاعدہ ٹھٹھرنے لگا۔ وہ ایک بار پھر رک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ وہ جس بنگلے کے سامنے کھڑا تھا اس کے گیٹ کے ساتھ ہی چوکیدار یا محافظ کا کیبن تھا۔ لکڑی کا بنا ہوا یہ تنگ سا کیبن خالی تھا۔ صادق نے اِدھر اُدھر دیکھا اور کیبن میں گھس کر دیوار سے ٹیک لگا کر سمٹ کر بیٹھ گیا۔ وہ اب بھی سردی سے ٹھٹھر رہا تھا اور اس نے سر دونوں گھٹنوں میں چھپا رکھا تھا۔

صادق کو اندازہ نہیں تھا کہ اسے اس کیبن میں بیٹھے ہوئے کتنی دیر ہوئی ہوگی لیکن پھر اچانک قدموں کی ہلکی سی آہٹ سن کر وہ چونک گیا۔ اس نے گھٹنوں پر جھکا ہوا سر اٹھایا۔ ٹھیک اسی لمحے تیز روشنی سے اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

"کون ہو تم اور یہاں کیوں چھپے ہوئے ہو؟"

ایک بھاری آواز صادق کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس نے آنکھیں مچ مچا کر دیکھا' اس کے سامنے ایک دراز قامت آدمی کھڑا تھا جس کے ایک ہاتھ میں ٹارچ اور دوسرے میں پستول صاف نظر آرہا تھا۔

"اگر تم سرب ہو تو مزید کوئی سوال پوچھنے کی ضرورت نہیں' بے دریغ گولی چلا دو اور اگر مسلمان ہو تو...."

"اوہ...." اس شخص کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ اس نے صادق کو جملہ مکمل نہیں کرنے دیا۔ "الحمدللہ۔ میں صاحب

ایمان ہوں۔ میرے ساتھ آؤ۔ یہاں تو بہت سخت سردی ہے۔"

اس شخص نے صادق کو سہارا دے کر اٹھایا اور اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے اسے بنگلے میں لے آیا۔ ایک اندرونی کمرے میں پہنچ کر اس نے بتی جلادی اور صادق کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ عبداللہ تھا۔

"تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟" عبداللہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میرا نام صادق ہے اور میں وسوکو کا رہنے والا ہوں۔" صادق نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اسے اپنے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔ آخر میں وہ بولا۔ "مہاجر کیمپ پر سرب فوجیوں کا کنٹرول ہے۔ انہیں مسلمانوں سے کیا ہمدردی ہوسکتی ہے۔ کیمپ میں مہاجرین کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا ہے۔ چوبیس گھنٹے میں صرف ایک مرتبہ کھانا فراہم کیا جاتا ہے۔ کیمپ میں رہنے والے بھوک اور بیماری سے مر رہے ہیں۔ مزید ستم یہ کہ وہاں کسی کی عزت محفوظ نہیں ہے۔ سرب فوجی ہر رات اسلحے کے زور پر اپنی پسند کی لڑکیاں کیمپ سے اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ کیمپ سے اٹھائی جانے والی لڑکیاں یا تو ہمیشہ کے لیے غائب ہوجاتی ہیں یا ان میں سے کسی کو کیمپ میں واپس لایا جاتا ہے تو اس کی حالت لاش سے بھی بدتر ہوتی ہے۔"

عبداللہ بے اختیار گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ اسے مہاجر کیمپ میں ہونے والی بے قاعدگیوں کا پتا تھا۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ ان مہاجروں کو فراہم کی جانے والی خوراک سرب ہضم کرجاتے تھے اور مہاجروں کو چوبیس گھنٹے میں صرف ایک مرتبہ بدترین کھانا فراہم کیا جاتا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ان مہاجرین کو کسی قسم کی طبی سہولتیں حاصل نہیں تھیں لیکن یہ انکشاف پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ سرب فوجی کیمپ سے اپنی پسند کی لڑکیاں اٹھا کرلے جاتے تھے۔

عبداللہ ایک سرکاری محکمے کا سربراہ تھا۔ اس کے اختیارات کسی وزیر سے بھی زیادہ تھے لیکن اس انقلاب کے ساتھ ہی تمام مسلمان افسروں کو بے اختیار کردیا گیا تھا۔ ان کے احکامات کی تکمیل روک دی گئی تھی۔ وہ اپاہج و مفلوج ہو کر رہ گئے تھے۔ یہی سب کچھ دیکھتے ہوئے عبداللہ نے مسلمان نوجوانوں کی وہ چھوٹی سی تنظیم بنائی تھی جو سربوں کے خلاف چھوٹی موٹی کارروائیاں کررہی تھی اور اب اسے عالی جاہ اور نصیر جیسے لوگ مل گئے تھے۔ وہ لوگ اگرچہ تعداد میں بہت کم تھے لیکن ان کے حوصلے بلند تھے۔ یہ ان کے حوصلے اور بہادری کی اعلیٰ ترین مثال تھی کہ انہوں نے شہر کی مشرقی چوکی پر سرب فوجیوں کو موت کے گھاٹ اتار کر قبضہ کرلیا تھا۔ عام شہریوں کا خیال تھا کہ مسلمان ایک گھنٹے سے زیادہ یہ قبضہ برقرار نہیں رکھ سکیں گے لیکن عالی جاہ اور اس کے ساتھی ایک ہفتے تک اس چوکی پر قابض رہے تھے اور اس دوران نہ صرف ہجرت کرنے والوں کو محفوظ مقامات کی طرف جانے کا موقع مل گیا تھا بلکہ شہر میں سامان بھی پہنچنے لگا تھا۔

"تمہیں بھوک لگ رہی ہوگی۔" عبداللہ نے صادق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم یہیں بیٹھو' میں تمہارے لیے کچھ کھانے کو لے کر آتا ہوں۔" وہ کمرے سے نکل گیا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ ایک ٹرے میں کھانے پینے کی کچھ چیزیں لے آیا۔ دو فرائی انڈے' ڈبل روٹی اور گرم گرم کافی۔ صادق کو کئی روز بعد کوئی اچھی چیز کھانے کو ملی تھی۔ وہ مربھکوں کی طرح ان چیزوں پر ٹوٹ پڑا۔ اس کا پیٹ بھرگیا تھا۔ کمرے میں ہیٹر کی وجہ سے اب سردی بھی نہیں لگ رہی تھی۔ اس نے جیکٹ اتاردی تھی۔

"ابھی کچھ دیر میں میرے چند ساتھی یہاں پہنچنے والے ہیں۔ ان کا تعلق ایک چھاپا مار تنظیم سے ہے۔ اگر تم چاہو تو ان کے ساتھ اس تنظیم میں شامل ہوسکتے ہو۔" عبداللہ نے کہا۔

"ٹائم کیا ہوا ہے' صبح ہونے میں کتنی دیر ہے؟" صادق نے پوچھا۔

"صبح!" عبداللہ کے لہجے میں حیرت تھی۔ "ابھی تو رات نے اپنا نصف سفر بھی طے نہیں کیا۔ گیارہ بج کر چالیس منٹ ہوئے ہیں۔"

اب حیران ہونے کی باری صادق کی تھی۔ ویرانے میں اس کیمپ میں شام کا اندھیرا پھیلتے ہی یوں لگتا تھا جیسے آدھی رات بیت چکی ہو۔ کیمپ میں رات کو وقت کا احساس مٹ جاتا تھا۔

وہ دونوں باتیں کرتے رہے۔ عبداللہ اسے عالی جاہ اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں بتا رہا تھا جنہوں نے سرب درندوں کے خلاف جنگ شروع کررکھی تھی۔

اس وقت دو بجنے والے تھے۔ باہر قدموں کی ہلکی سی آہٹ سن کر وہ دونوں چونک گئے۔ عبداللہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر صادق کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر دبے قدموں چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

صادق خاموش اور بے حس و حرکت کرسی پر بیٹھا رہا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد دروازے کے باہر قدموں کی آواز سنائی دی پھر دروازہ کھلا اور صادق اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ اس کا چہرہ خوف سے ایک دم پیلا پڑ گیا تھا۔ اس کے سامنے چار سرب فوجی کھڑے تھے۔

○☆○

"ڈرنے کی ضرورت نہیں۔" سب سے آگے والے فوجی نے کہا "ہم سرب نہیں' مسلمان ہیں۔" وہ عالی جاہ تھا۔

اس کے فوراً ہی بعد عبداللہ کمرے میں داخل ہوا۔ اب اس نے ان سب کا تعارف کرایا۔ عالی جاہ کے ساتھ نصیر' مکرم اور شائزہ تھی۔ شائزہ نے جب ٹوپی اتاری تو اس کے لمبے بال کندھوں پر بکھر گئے۔ صادق کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"تمہارے دوسرے ساتھی کہاں ہیں؟" صادق نے عالی جاہ سے پوچھا۔

"وہ لوگ اپنے ہیڈ کوارٹر کی طرف جاچکے ہیں۔" عالی جاہ نے جواب دیا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "آج کے مشن میں ہم زیادہ کامیابی حاصل نہیں کرسکے۔ ہم اپنے دو ساتھیوں سے محروم ہوگئے ہیں جبکہ کم از کم چھ سرب درندوں کو جہنم واصل کیا گیا ہے۔"

"مشن کی ناکامی کی وجہ پر غور کیا؟" عبداللہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ "اپنے ساتھیوں کی کمزوری یا کچھ اور....."

"ہمارے ساتھی بزدل نہیں ہیں۔" عالی جاہ نے جواب دیا "لیکن سربوں کو شاید اس قسم کی کارروائی کی پہلے ہی سے توقع تھی۔ وہ لوگ تیار بیٹھے تھے۔ اس کے باوجود ہم نے ان پر کاری ضرب لگائی ہے۔"

"اب کیا پروگرام ہے؟" عالی جاہ نے پوچھا۔

"شمالی پہاڑی پر سربوں کا مورچہ شہر کے مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا رہا ہے۔ شہر کی ہر عمارت اور سڑکوں پر چلنے والا ہر فرد اُن کی زد میں ہے۔ سب سے پہلے ہمیں شمالی پہاڑی سے سربوں کا صفایا کرنا ہوگا۔ جب تک سربوں سے وہ مورچہ خالی نہیں کردیا جاتا' اس وقت تک شہر کی عمارتیں تباہ ہوتی رہیں گی اور مسلمان مرتے رہیں گے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اب سب سے پہلے اس مورچے کا بندوبست ہونا چاہیے۔ اس کے لیے ہمیں باقاعدہ پلاننگ کرنی پڑے گی۔" عالی جاہ نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" عبداللہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "صادق کو اپنے ساتھ ہیڈ کوارٹر لے جاؤ۔ تم صبح آجانا۔ میں شمالی پہاڑی اور اس کے آس پاس کے علاقوں کے نقشے منگوالوں گا۔ صبح نور کو بھی اپنے ساتھ لے آنا۔ وہ اسی علاقے کا رہنے والا ہے۔ علاقے کو سمجھنے میں تمہیں کافی مدد دے سکتا ہے۔ ایک دو آدمیوں کو میں بھی بُلوالوں گا۔"

"تو ٹھیک ہے۔ اب کل صبح دس بجے ملاقات ہوگی۔" عالی جاہ کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

عالی جاہ' صادق کو اپنے ساتھ لے کر بنگلے کے پچھلی طرف والی پہاڑی پر ایک تنگ سی پگڈنڈی پر ہولیا۔ شائزہ' نصیر اور مُکرم بھی ان کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ غار کا فاصلہ وہاں سے اگرچہ ایک میل سے زیادہ دور نہیں تھا لیکن تنگ اور دشوار گزار راستے اور تاریکی کی وجہ سے یہ فاصلہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوسکا تھا۔

صبح دس بجے عالی جاہ اور نصیر ایک بار پھر عبداللہ کے بنگلے پر موجود تھے۔ اسی وقت ان کے ساتھ صبح نور بھی موجود تھا۔ تھوڑی دیر بعد مقامی تنظیم کے تین آدمی اور بھی آگئے۔ عبداللہ نے صبح دفتر کھلتے ہی شمالی پہاڑی اور اس کے آس پاس کے علاقوں کے نقشے منگوالیے تھے۔ وہ سب لوگ نقشے سامنے پھیلائے پہاڑی سے سربوں کو بھگانے کا منصوبہ بنانے لگے۔

"سربوں نے پہاڑی پر جانے والے بڑے راستے پر قبضہ کررکھا ہے۔ صرف یہ تنگ سی پگڈنڈی ہے جس سے پہاڑی پر پہنچا جاسکتا ہے۔" رحمٰن نے نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس پگڈنڈی کے ذریعے بھی پہاڑی پر پہنچنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ پہاڑی کے اس حصے میں درخت زیادہ گنجان درخت نہیں ہیں۔ پہاڑی کی چوٹی پر پہنچتے ہی ہم سربوں کی نظروں میں آسکتے ہیں اس لیے ہمیں بہت زیادہ احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہوگی۔"

"پہاڑی پر پہنچنے کا یہ راستہ کیسا ہے؟" عالی جاہ نے ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہایت خطرناک۔" رحمٰن نے جواب دیا۔ "میں اس پہاڑی سے اچھی طرح واقف ہوں۔ بالکل ایسے جیسے اپنے ہاتھ کی لکیروں سے۔ میرے خیال میں یہی پگڈنڈی ہمارے لیے سب سے زیادہ محفوظ رہے گی۔"

وہ لوگ دیر تک بحث کرتے رہے۔ بالآخر یہی طے کیا گیا کہ اسی پگڈنڈی کے راستے پہاڑی پر پہنچنے کی کوشش کی جائے گی۔

"تمہارے پاس کتنے آدمی ہیں رحمٰن؟" عالی جاہ نے پوچھا۔

"میں لیکن چند رائفلوں کے سوا ہمارے پاس اور کچھ نہیں ہے۔" رحمٰن نے جواب دیا۔

"اسلحے کی فکر مت کرو۔ ہمارے پاس سب کچھ موجود ہے۔" عالی جاہ نے کہا "ہم نے سرب فوجیوں سے اب تک بہت کچھ چھین لیا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ یہ اسلحہ انہی کے خلاف استعمال کیا جائے۔ ہمارے پاس ہلکی مشین گنیں' راکٹ لانچر' ہینڈ گرینیڈز' سب مشین گنیں اور ایمونیشن وافر مقدار میں موجود ہے۔ ...ہمارے کسی آدمی کو اسلحے کی کمی محسوس نہیں ہوگی۔ اب صرف یہ طے ہونا باقی ہے کہ پہاڑی پر حملہ کس وقت کیا جائے گا۔"

"میرا خیال ہے کہ اس کے لیے رات کا آخری پہر مناسب رہے گا۔" عبداللہ نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا "یہ وہ وقت ہوتا ہے جب نیند ہر انسان پر پوری شدت سے حملہ آور ہوتی ہے۔ اس وقت ہم سربوں پر حملہ کرکے انہیں پہاڑی سے

بھاگنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔"

"آپ کی تجویز بے حد معقول ہے لیکن آپ...."

"ہاں، میں بھی تم لوگوں کے ساتھ جاؤں گا۔ آخر مجھے بھی تو عملی طور پر کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے، گھر بیٹھے بیٹھے تو مجھے زنگ لگ جائے گا۔" عبداللہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" عالی جاہ نے جواب دیا "تو پھر یہ طے رہا کہ رات دو بجے تک تمام آدمی یہاں جمع ہو جائیں گے۔ اس کے چند منٹ بعد ہی ریڈ کراس کے ٹرک یہاں پہنچ جائیں گے اور ہم لوگ اسی وقت یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ اب میٹنگ ختم۔" عبداللہ کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

دوپہر کا کھانا انہوں نے وہیں کھایا اور پھر ایک ایک کر کے بنگلے سے نکل گئے۔

شام کا اندھیرا پھیلنے کے تھوڑی ہی دیر بعد عالی جاہ اور اس کے ساتھی ایک ایک کر کے پہاڑی سے اترنے لگے۔ ان میں سے ہر شخص اسلحے سے لدا ہوا تھا۔ رات دس بجے تک رحمٰن اور اس کے ساتھی بھی ایک ایک کر کے پہنچ گئے۔ ان سب نے مل کر رات کی تاریکی میں غار کے دو اور چکر لگائے اور غار میں موجود تمام اسلحے اور ایمونیشن کی پیٹیاں عبداللہ کے مکان میں پہنچا دی گئیں۔

ٹھیک دو بجے دو فوجی قسم کے ٹرک بنگلے میں آ کر رک گئے۔ دونوں ٹرکوں پر ریڈ کراس بنے ہوئے تھے۔ ٹرک پورچ میں کھڑے تھے اور عالی جاہ کے آدمی ہلکی مشین گنیں، راکٹ لانچر، سب مشین گنیں اور گولہ بارود ٹرکوں میں بھر رہے تھے اور پھر ٹھیک ڈھائی بجے وہ لوگ ان ٹرکوں میں سوار ہو کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔

شہر کے مختلف علاقوں سے اِکّا دُکّا فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ دونوں ٹرک ویران اور سنسان سڑکوں سے گزرتے ہوئے تیز رفتاری سے شمالی پہاڑی کی طرف جا رہے تھے۔ انہیں وہاں پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ رحمٰن نے ٹرک اس جگہ رُکوا لیے تھے جہاں سے وہ پگڈنڈی پہاڑی پر چلی گئی تھی۔

ٹرک وہاں صرف چند منٹ کو رُکے تھے۔ اس دوران تمام آدمی اسلحہ لے کر ٹرکوں سے اتر چکے تھے۔ ٹرک آگے روانہ ہو گئے۔ پگڈنڈی پر سب سے آگے عالی جاہ اور اس کے آدمی تھے جنہوں نے سرب فوج کی وردیاں پہن رکھی تھیں۔ ان کے پیچھے عبدالرحمٰن، عبداللہ اور ان کے ساتھی تھے۔ چودہ آدمی ایسے تھے جن کے پاس ہلکی مشین گنیں تھیں جنہیں انہوں نے کندھوں پر لاد رکھا تھا۔ آرشا، شائزہ اور دیگر دو آدمیوں کے پاس راکٹ لانچر تھے۔ باقی سب آدمیوں کے پاس سب مشین گنیں تھیں اور ہینڈ گرینیڈ تو ہر ایک کے پاس تھے۔ ہر ایک نے اپنی استعداد کے مطابق فاضل میگزین بھی لے لیے تھے۔

یہ سب لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ سرب فوجیوں کی اس چوکی پر بھاری مشین گنوں کے علاوہ توپیں بھی تھیں جن سے وہ شہر پر گولہ باری کرتے رہتے تھے۔ ہلکی مشین گنیں اور راکٹ لانچر ان کے لیے زیادہ خطرناک ہو سکتے تھے۔ ہر قسم کے اسلحے سے لیس سربوں کی اس چوکی پر حملہ کرنا گویا خودکشی کرنے کے مترادف تھا لیکن یہ مسلمان سپاہی تھے جو اسلام کی سربلندی کے لیے سر پر کفن باندھ کر نکلے تھے۔ وہ سب لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر بوسنیا کے مسلمانوں کو ختم کر دیا گیا تو یورپ میں اسلام کا کوئی نام لیوا نہیں رہے گا، دینِ حق مٹ جائے گا اور کوئی کلمہ گو نہیں رہے گا۔ ان چند سرفروشوں نے اپنے خدا سے یہ عہد کیا تھا کہ وہ اس سرزمین پر اس کے دینِ حق کی بقا اور سربلندی کے لیے اپنی جانوں تک کی قربانی دینے سے دریغ نہیں کریں گے اور آج اسلام کے یہ سپاہی اپنا عہد نبھانے کے لیے بے خوف و خطر، خونخوار بھیڑیوں کے بھٹ کی طرف جا رہے تھے۔

پگڈنڈی تین فٹ سے زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ وہ ایک قطار میں بہت محتاط انداز میں آگے بڑھتے رہے۔ پہاڑی اگرچہ زیادہ اونچی نہیں تھی لیکن فولادی بوجھ کے ساتھ مسلسل چڑھائی پر چلنا خاصا مشکل تھا لیکن بالآخر وہ لوگ پہاڑی پر پہنچ گئے۔

عالی جاہ سینے کے بل لیٹا ہوا سامنے دیکھ رہا تھا۔ اس سے تقریباً دو سو گز آگے سرب فوج کے مورچے تھے۔ ریت کی بوریوں سے بنے ہوئے ان مورچوں میں بھاری مشین گنیں اور توپیں نصب تھیں۔ سرچ لائٹس کی روشنی میں مختلف جگہوں پر مارٹر گنیں بھی نصب نظر آ رہی تھیں۔ ان کے گرد بھی ریت کی بوریوں کی دیواریں بنی ہوئی تھیں۔ جگہ جگہ چھوٹی مشین گنیں فٹ تھیں۔

عالی جاہ نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ وہ سب ایک ایک کر کے سینے کے بل رینگتے ہوئے درختوں کے پیچھے آڑ لیتے رہے۔ یہاں درخت زیادہ گنجان نہیں تھے۔ مسلمان سپاہی دور دور تک پھیل گئے تھے اور عالی جاہ کے خیال میں یہ اچھا ہی تھا کیونکہ اس طرح سربوں کو یہ تاثر ملے گا کہ حملہ آوروں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

نصیر اور شائزہ ایک دوسرے کے قریب ہی تھے۔ شائزہ کے پاس راکٹ لانچر تھا اور نصیر کے پاس ہلکی مشین گن۔ ان سے چند قدم کے فاصلے پر ایک درخت کی آڑ میں عبداللہ سینے کے بل لیٹا ہوا تھا۔ اس کے پاس بھی ہلکی مشین گن تھی جسے اس نے اپنے سامنے چھوٹے سے فولادی اسٹینڈ پر فٹ کر لیا تھا۔ کچھ دیر بعد عالی جاہ بھی رینگتا ہوا ان کے قریب آ گیا اور وہ لوگ سرگوشیوں میں تبادلۂ خیال کرنے لگے۔

"مورچے بہت مضبوط ہیں۔ ہماری ہلکی مشین گنیں کام نہیں دے سکیں گی۔ ہینڈ گرینیڈ اس لیے نہیں پھینکے جا سکتے کہ فاصلہ بہت زیادہ ہے۔" عالی جاہ نے کہا۔

"اب مزید آگے بڑھنا ممکن نہیں۔ میرا خیال ہے حملے کی ابتدا راکٹوں سے کی جائے۔ ایک مرتبہ ان میں کھلبلی مچ جائے تو ہم ہلکی مشین گنوں سے فائرنگ کرتے ہوئے آگے بڑھ کر ہینڈ گرینڈ بھی استعمال کر سکتے ہیں۔" نصیر نے کہا۔

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں لیکن ذرا مزید غور کر لینے دو۔ شاید کوئی اور بات ذہن میں آجائے۔" عالی جاہ کہتے ہوئے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اس جگہ سے آگے کوئی آڑ نہیں تھی۔ یہ چھدرے درخت ہی ان کے لیے محفوظ ترین جگہ تھی۔ وہ بائیں طرف دیکھنے لگا جہاں نشیب میں پورا شہر نظر آرہا تھا۔ بجلی کا نظام درہم برہم ہوجانے سے شہر کے بیشتر حصے تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے اور جہاں جہاں روشنی تھی وہاں سڑکیں، عمارتیں اور یہاں تک کہ عمارتوں کے دروازے تک صاف نظر آرہے تھے۔ یہ پہاڑی اس لحاظ سے بے حد اہم تھی کہ یہاں سے مارٹر گنوں، ہیوی مشین گنوں اور توپ کے گولوں سے شہر کی کسی بھی عمارت کو نشانہ بنایا جاسکتا تھا۔

عالی جاہ یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ شائزہ نے اس کا کندھا پکڑ کر ہولے سے ہلایا اور پھر ایک طرف اشارہ کیا۔ عالی جاہ نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ ایک سرب فوجی پتلون کے بٹن کھولتا ہوا اسی طرف آرہا تھا۔ وہ فوجی ان سے تقریباً تیس گز کے فاصلے پر رک گیا اور کھڑے کھڑے اپنے مثانے کا بوجھ ہلکا کرنے لگا۔ شائزہ بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روک سکی تھی۔ اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر رخ پھیر لیا۔ عین اسی وقت عالی جاہ کے ایک ساتھی کے پیروں کے نیچے سے کچھ پتھر لڑھک گئے۔ وہ درخت کے پیچھے جس جگہ لیٹا ہوا تھا، وہ ڈھلوان تھی اس لیے پیر کو حرکت دینے سے چند پتھر لڑھک گئے تھے۔

سرب فوجی نے آواز کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے پتلون کے بٹن بند کیے بغیر مُڑ کر چیختا ہوا اپنے مورچوں کی طرف دوڑا۔ اس نے شاید درختوں کے پیچھے چھپے ہوئے آدمیوں کو دیکھ لیا تھا اور وہ اپنے ساتھیوں کو آگاہ کرنے کے لیے چیخ رہا تھا۔

"فائر!" عالی جاہ پوری قوت سے چیخا۔ اس کے ساتھ ہی سب سے پہلے اسی نے بھاگتے ہوئے سرب فوجی پر فائر کھول دیا۔ کئی گولیاں سرب فوجی کی پیٹھ میں پیوست ہوگئیں اور وہ لڑکھڑاتا ہوا منہ کے بل ڈھیر ہوگیا۔

پہاڑی فائرنگ اور دھماکوں سے گونج اٹھی۔ لانچروں سے بھی راکٹ فائر کیے جارہے تھے۔ شائزہ نے ایک بھاری مشین گن کے مورچے کی طرف لانچر کا رخ کرکے راکٹ داغ دیا۔ شائزہ نے اب تک صرف خالی لانچر سے چند گھنٹوں کی ٹریننگ لی تھی اور راکٹ فائر کرنے کا یہ اس کا پہلا موقع تھا۔ اس کا چلایا ہوا راکٹ ریت کی بوریوں کے بالکل اوپر، عین اس جگہ لگا جہاں بھاری مشین گن کی خوفناک نال حرکت کرتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ گن مین شاید ابھی گن کو ایڈجسٹ کررہا تھا لیکن شائزہ کے چلائے ہوئے راکٹ نے مشین گن کے ٹکڑے کردیے اور گن مین کے بھی پرخچے اڑ گئے۔

آرشا ان سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پر تھی۔ وہ ایک راکٹ فائر کرچکی تھی۔ اس کا رخ توپ والے مورچے کی طرف تھا لیکن اس کا راکٹ مورچے کے کئی فٹ اوپر سے گزر گیا۔ اس نے لانچر کو ایڈجسٹ کیا اور دوسرا راکٹ فائر کردیا۔ اس مرتبہ راکٹ نشانے پر لگا۔ توپ کی نال ہوا میں اُڑ گئی۔

دوسرے لانچروں سے بھی سربوں کے مورچوں پر فائر ہورہے تھے جبکہ مسلمان سپاہی ہلکی مشین گنوں سے بھی فائرنگ کررہے تھے۔

سربوں پر یہ حملہ بہت ہی اچانک ہوا تھا۔ شروع میں تو وہ بدحواس ہوگئے لیکن تقریباً پندرہ منٹ بعد سنبھل گئے۔ اس دوران ان کی چار ہیوی مشین گنیں اور دو توپیں ناکارہ ہوچکی تھیں۔ دو توپیں مورچوں میں سلامت کھڑی تھیں لیکن ان کے لیے بیکار تھیں۔ توپ سے ڈیڑھ دو سو گز کے فاصلے پر فائر کرنا ممکن نہیں تھا۔ مارٹر گنیں بھی تقریباً بیکار ہوچکی تھیں۔ یہ ہتھیار بڑی رینج پر فائر کرنے کے لیے تھے۔ آمنے سامنے کھڑے ہوکر ان سے کام نہیں لیا جاسکتا تھا۔ اب وہ صرف ہلکی مشین گنوں اور سب مشین گنوں سے فائرنگ کررہے تھے۔ سربوں نے چند ہینڈ گرینڈ بھی اس طرف اچھالے تھے مگر وہ مجاہدین سے بہت دور گرے تھے۔ پہاڑی پر بکھرے ہوئے سرب فوجی اب ریت کی بوریوں کے پیچھے پناہ لے رہے تھے۔

"اسلام کے فرزندو!" عالی جاہ اپنی جگہ سے اٹھ کر چیخا۔ "آگے بڑھ کر حملہ کرو۔ دشمن کے قدم اکھڑ رہے ہیں۔"

وہ سب اللہ اکبر کا فلک شگاف نعرہ لگاتے ہوئے سربوں کے

مورچوں کی طرف دوڑے۔ وہ بے تحاشہ فائرنگ کر رہے تھے۔ سربوں کی طرف سے بھی اندھا دھند فائرنگ ہو رہی تھی۔ چند مجاہد اس فائرنگ کی زد میں آگئے اور اپنے دین کی عظمت اور وطن کی آن پر قربان ہوگئے۔ شہید ہونے والوں کے ساتھیوں کا جوش بڑھ گیا۔ ان کے حملے میں شدت آ گئی۔

دستی بم سربوں کے مورچوں میں بارش کے اولوں کی طرح گر رہے تھے۔ مسلسل دھماکے ہو رہے تھے۔ سربوں نے بھی کئی دستی بم اُچھالے تھے جن سے کئی مجاہدین شہید اور کئی زخمی ہوئے تھے لیکن سرب شاید نہیں سمجھ سکے تھے کہ یہ اللہ کے سپاہی ہیں جو زمین کے ٹکڑے یا اقتدار کے لیے نہیں' اس خطے میں اللہ کے دین کی سربلندی' کلمۂ طیبّہ کے ناموس اور اپنی بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ زخمی ہونے والے اٹھ اٹھ کر بپھرے ہوئے شیروں کی طرح دھاڑتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

سربوں کے بھاری ہتھیار ناکارہ ہو چکے تھے۔ اب ان کے پاس بھی صرف چھوٹے ہتھیار تھے۔ ہلکی مشین گنیں اور سب مشین گنیں۔ لیکن مسلمان مجاہدین کے جوش و جذبے کے سامنے ان کے یہ ہتھیار بھی بے بیکار ثابت ہو رہے تھے۔

لڑائی اب مورچوں میں دست بہ دست ہو رہی تھی۔ سرب فوجی اب صرف اپنی جانیں بچانے کے لیے لڑ رہے تھے۔ اس دست بہ دست لڑائی میں نصیر کا پاکستان میں سیکھا ہوا مارشل آرٹس کام آرہا تھا۔ ایک سرب کی گردن کی ہڈے توڑنے کے بعد وہ اس سرب فوجی کی طرف متوجہ ہوگیا جو اپنی رائفل کو لٹھ کی طرح گھماتا ہوا عبداللہ پر حملہ آور ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ نصیر اپنی جگہ سے کسی طاقتور اسپرنگ کی طرح فضا میں اُچھلا۔ اس کی زوردار سائیڈ کِک سرب فوجی کی پسلیوں پر لگی اور وہ بلبلاتا ہوا ڈھیر ہوگیا۔ نصیر نے اسی کی رائفل چھین کر اس کا بٹ پوری قوت سے اس کی کھوپڑی پر رسید کردیا۔ سرب کی کھوپڑی کے پرخچے اڑ گئے۔

حق و باطل کا یہ معرکہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے سے جاری تھا۔ مٹھی بھر' غیر تربیت یافتہ اسلام کے نام لیواؤں نے جدید ترین اسلحے سے لیس' انتہائی اعلیٰ تربیت یافتہ کافروں کے چھکے چھڑا دیے تھے۔ سربوں کے پاس تربیت اور جدید ترین اسلحہ تھا۔ اسلام کے فرزندوں کے پاس قوتِ ایمانی' جذبہ اور ولولہ تھا۔ سرب ان کے سامنے نہیں ٹک سکے اور بالآخر پسپائی اختیار کرنے لگے۔

اب دن کا ہلکا سا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ شائزہ ریت کی بوریوں سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ راکٹ لانچر اس کے قریب رکھا ہوا تھا اور وہ آٹومیٹک رائفل سے کام لے رہی تھی۔ اچانک اس کی نظریں اسلحے کے ڈھیر کی طرف اٹھ گئیں۔ اس سے تقریباً ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر اسلحہ ڈپو تھا جہاں گولہ بارود کا انبار لگا ہوا تھا۔ شائزہ کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی۔ اس نے لانچر اٹھا کر اس میں راکٹ لوڈ کیا اور ٹارگٹ ایڈجسٹ کرنے لگی۔ لانچر کی میجک آئی میں گولہ بارود کا انبار نظر آرہا تھا۔ وہ راکٹ فائر کرنا ہی چاہتی تھی کہ ایک سرب فوجی کی آٹومیٹک رائفل سے نکلی ہوئی کئی گولیاں اس کے سینے میں پیوست ہوگئیں۔ اس کے جسم کو زوردار جھٹکا لگا۔ نصیر یہ دیکھ کر اس کی طرف دوڑا۔ شائزہ گولیاں کھانے کے باوجود تن گئی۔ اس کی آنکھ ابھی تک میجک آئی سے لگی ہوئی تھی اور انگلی ٹریگر پر تھی۔ اچانک اس کی انگلی کو جھٹکا لگا۔ راکٹ فولادی ٹیوب سے نکل کر شعلے کی طرح گولہ بارود کے ڈھیر کی طرف لپکا۔

شائزہ کے کندھے سے لانچر گر گیا۔ نصیر دوڑ کر شائزہ پر جھک گیا۔ شائزہ نے مسکراتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ٹھیک اسی وقت اس سرب فوجی کی رائفل سے نکلی ہوئی کئی گولیاں نصیر کے جسم میں پیوست ہوگئیں اور عین اسی وقت شائزہ کا فائر کیا ہوا راکٹ گولہ بارود کے انبار سے ٹکرا کر پھٹا۔ اس کے ساتھ ہی کان پھاڑ دینے والے دھماکوں سے پہاڑی لرز اٹھی۔ پے در پے دھماکے ہوتے رہے۔ سیاہ دُھویں اور گرد و غبار کے بادل آسمان کو چھونے کی کوشش کر رہے تھے اور جب یہ بادل چھٹے تو پہاڑی پر خاموشی تھی۔

عالی جاہ نے ریت کی بوریوں کے پیچھے سے سر اٹھایا پھر وہ اٹھ کر سامنے آگیا۔ چند سیکنڈ بعد آرشا' مکرّم اور صبح نور بھی ریت کی بوریوں کے پیچھے سے نکل کر اس کے قریب آگئے۔

عالی جاہ نے اپنے ان ساتھیوں کی طرف دیکھا پھر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ ہر طرف لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ یہ عبداللہ کی لاش تھی' وہ اس کا بھتیجا شجر علی تھا' یہ صدیق تھا' وہ احمد تھا اور وہ رحمٰن کی لاش تھی۔ عالی جاہ ایک جگہ رک گیا۔ ریت کی بوریوں کے پاس نصیر ٹیک لگائے ہوئے تھا۔ اس کی گود میں شائزہ کا سر رکھا ہوا تھا۔ وہ دونوں بھی اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح زندگی کی سرحد عبور کرچکے تھے۔ عالی جاہ نے جھک کر دونوں کی پیشانیوں پر بوسہ دیا اور سیدھا ہو کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

بادل چھٹ رہے تھے اور مشرقی افق پر سرخی پھیل رہی تھی۔ یہ ان شہیدوں کے لہو کی سرخی تھی جو اپنی جانوں کی قربانی دے کر دوسروں کو زندگی کا پیغام دے گئے تھے۔

عالی جاہ کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو اس کے رخساروں کو بھگو رہے تھے اور جب آرشا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک گیا۔ اس نے آنسو پونچھ ڈالے اور تن کر کھڑا ہوگیا۔ ابھی جنگ ختم نہیں ہوئی تھی۔ یہ خاموشی تو ایک چھوٹا سا وقفہ تھی اور اسے یقین تھا کہ یہ خاموشی ٹوٹنے سے پہلے اسے اتنی مہلت ضرور مل جائے گی کہ وہ اپنے ان پیاروں کو پورے اعزاز اور عزت و احترام کے ساتھ آخرت کے سفر پر روانہ کرسکے۔

جاسوسی ڈائجسٹ : اپریل 1994

ناول سکیننگ و کلکت

محمد سجاد بھٹی

03045503086

خصوصی تعاون: جاسوسی نشست ایڈمن

ڈاکٹر حامد حسن۔ساگر زمان۔عقیل قریشی۔ ممتاز علی کیانی۔سیف الملوک عباسی۔ یاسر حسنین۔ناصر محمود بلوچ۔محمد نعمان & صائم بھائی

اردو ادب کے سب رنگ۔ ادبی محفل۔ قدیمی جاسوسی دنیا۔ اولڈ سپائی ناول..... فینز گروپ

جاوید ایک متوسط طبقے کے گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے والد جمیل الرحمٰن صاحب ایک بینک میں ملازم تھے۔ جاوید کے علاوہ خدا نے انہیں دو بیٹیاں بھی دی تھیں مگر وہ جاوید سے بہت چھوٹی تھیں۔ ان میں سے بڑی' جاوید سے آٹھ سال چھوٹی تھی اور سب سے چھوٹی اپنی بہن سے چھ سال بعد پیدا ہوئی تھی۔ مکان ذاتی تھا اس لیے بڑھتی ہوئی گرانی کے باوجود ان کی گزر بسر کنبہ محدود ہونے کی وجہ سے خوش اسلوبی سے ہو جاتی تھی۔ سب بچے ذہین اور پڑھنے لکھنے میں ہوشیار تھے۔ جاوید نے میٹرک فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا تھا اور صرف دس نمبروں سے تیسری پوزیشن حاصل کرنے سے رہ گیا تھا۔ جمیل صاحب تو چاہتے تھے کہ وہ کالج میں میڈیکل یا انجینئرنگ کے مضامین لے لیکن سائنس یا حساب سے جاوید کو کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ جمیل صاحب نے اس پر اپنی مرضی مسلط کرنا مناسب نہیں سمجھا اس لیے جاوید نے کالج میں آرٹس کے مضامین کے ساتھ معاشیات کا انتخاب کیا جس سے اسے بہت دلچسپی تھی۔ جمیل صاحب نے اس سے پوچھا بھی کہ وہ معاشیات کیوں لے رہا ہے تو جاوید نے جواب دیا کہ وہ معاشیات

ایک سادہ دل اور نیک سیرت شخص کی زندگی کا اہم موڑ

کہتے ہیں نیت صاف ہو تو منزل آسان ہو جاتی ہے۔ اس کہاوت کا عملی نمونہ اس کہانی میں نظر آئے گا۔ اُس شخص کا قصہ جس نے اپنے لیے سیدھا اور صاف راستہ اختیار کیا تھا اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کی لیکن ایک بد نیت بھی اس کی راہ میں آ گیا۔

منزلِ مُراد

انجم نوید



میں ایم اے کرنے کے بعد پی ایچ ڈی کرنا چاہتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا رجحان ٹیچنگ لائن کی طرف زیادہ تھا۔

مگر آدمی جو کچھ سوچتا ہے، دنیا میں سب کچھ اسی طرح نہیں ہوجاتا۔ جاوید بی اے فائنل کے امتحان سے فارغ ہی ہوا تھا کہ اس مختصر خاندان کی زندگی جو اب تک ایک لگی بندھی ڈگر پہ چل رہی تھی، اچانک ایک انقلاب سے دوچار ہوگئی۔ جمیل صاحب جس بینک میں ملازم تھے اس میں ڈاکا پڑا۔ ایک روز تین نقاب پوش نوجوان ہاتھوں میں ریوالور اور کلاشنکوف لیے بینک میں داخل ہوئے۔ بینک کے تمام عملے اور اس وقت وہاں موجود لوگوں کو ہینڈز اپ کرایا۔ ان میں سے ایک نے گیٹ پر کھڑے گارڈ کو پہلے ہی غیر مسلح کردیا تھا مگر انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ تین مسلح کانسٹیبل بھی بظاہر بینک سے باہر مگر اس کے اندرونی کمرے کو اپنی رائفلوں کی زد میں لیے بیٹھے ہیں۔

ان میں سے ایک بائیں ہاتھ میں بڑا سا تھیلا اور داہنے ہاتھ میں ریوالور لیے تمام کیش تھیلے میں ڈالتے ہوئے جمیل صاحب کے پاس سے گزرا تو جمیل صاحب نے اپنی جان پر کھیل کر اس کے ریوالور والے ہاتھ پر زور سے گھونسا مارا اور جیسے ہی ریوالور اس کے ہاتھ سے گرا، اس سے لپٹ گئے۔ اسی وقت بینک کے باہر پوزیشن لیے ہوئے کانسٹیبلوں نے بھی فائرنگ شروع کردی۔ کلاشنکوف والے نے ایک برسٹ مارا۔ دوسرے کی اسے مہلت نہیں ملی اور ایک کانسٹیبل کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ جمیل صاحب ایک کرسی کی ٹھوکر کھا کر گر پڑے تھے مگر گرتے گرتے بھی انہوں نے ڈاکو کی ٹانگ نہیں چھوڑی۔ دوسرے ساتھی نے یہ دیکھ کر ایک فائر کیا۔ گولی جمیل صاحب کی پشت میں لگی، ان کے ہاتھوں سے ڈاکو کی ٹانگ چھوٹ گئی مگر تب تک دو اور گولیاں ڈاکوؤں کو زخمی کرچکی تھیں۔ گارڈ نے بھی اپنی رائفل اٹھالی تھی۔ پوزیشن لیے ہوئے کانسٹیبل بھی بینک کے گیٹ پر آگئے۔ ایک ڈاکو مرچکا تھا، دو بری طرح زخمی تھے۔ جمیل صاحب اپنے ہی خون میں نہائے ہوئے بے ہوش تھے مگر انہوں نے تقریباً پندرہ لاکھ کی ڈکیتی کو ناکام بنادیا تھا۔

انہیں فوراً ایمبولینس میں اسپتال پہنچایا گیا۔ گولی ریڑھ کی ہڈی کے نچلے سرے پر لگی تھی۔ فوری طور پر آپریشن کیا گیا۔ آپریشن کامیاب رہا، گولی نکال لی گئی مگر ڈاکٹروں نے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ گولی نے حرام مغز کو بری طرح مجروح کیا ہے۔ حرام مغز تمام زیریں اعصاب کا مرکز ہوتا ہے اس لیے یہ عین ممکن ہے کہ کامیاب آپریشن کے باوجود جمیل صاحب نچلے دھڑ سے کلی یا جزوی طور پر معذور ہوجائیں۔ قدرتی طور سے یہ اندوہ ناک خبر سن کر سب ہی کو تشویش لاحق ہوگئی تھی۔ دعائیں مانگی جانے لگیں کہ پروردگار جمیل صاحب کو مکمل صحت عطا کرے۔ بینک کی طرف سے انہیں علاج معالجے کی بہترین سہولتیں حاصل تھیں مگر ہوتا وہی ہے جو تقدیر میں لکھا ہوتا ہے۔ ایک دو دن میں ہی اندازہ ہوگیا کہ جمیل صاحب کے کولہوں سے نیچے کا جسم تقریباً مفلوج ہوگیا ہے۔ داہنے پیر میں تو کچھ حرکت تھی، تھوڑی کوشش سے ٹانگ کو چند انچ ادھر ادھر ہلا سکتے تھے، انگلیوں کو حرکت دے سکتے تھے مگر بایاں پیر کسی بھی قسم کی حرکت کرنے سے بالکل معذور تھا۔ وہ جب تک اسپتال میں رہے، ڈاکٹروں اور سرجنوں نے اپنی سی کوشش کردیکھی مگر داہنے پیر کی حرکت کچھ بڑھ جانے کے علاوہ کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ تسلی دینے کو وہ ضرور کہتے رہے کہ اگر بائیں پیر کا مساج اور سکائی کی جاتی رہے تو ایک نہ ایک دن اس میں بھی حرکت پیدا ہوسکتی ہے۔

دو ماہ تک اپنی سی کوشش کرنے کے بعد انہیں اسپتال سے رخصت کردیا گیا۔ ان کے لیے ایک وہیل چیئر خرید لی گئی۔ غنیمت تھا کہ وہ کرسی پر خود ہی بیٹھ اور اتر سکتے تھے ورنہ دوسری اور کئی پریشانیاں پیدا ہوسکتی تھیں۔ اب ظاہر تھا کہ وہ بینک کی ملازمت برقرار نہیں رکھ سکتے تھے اس لیے انہیں قبل از وقت ریٹائرمنٹ دے دی گئی۔ انہوں نے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر ڈاکے کی کوشش ناکام بنائی تھی اس لیے حکومت اور بینک کی طرف سے مناسب معاوضہ ملنے کے علاوہ پنشن اور فنڈز بھی دیے گئے۔ رقم کافی تھی۔ جمیل صاحب نے نصف رقم بینک میں جمع رکھی اور باقی نصف سے گھر کے ایک کمرے میں چھوٹا سا جنرل اسٹور کھول لیا جس سے ماہانہ اتنی آمدنی ہوجاتی تھی کہ پنشن کے ساتھ مل کر مناسب انداز میں گزر اوقات ہوتی رہے مگر اب ظاہر ہے کہ جاوید کو ایم اے کرنے کے بعد سے ہی گھر کی ذمے داری سنبھالنا ضروری ہوگیا تھا۔ جس شہر میں ان کی رہائش تھی وہاں اچھی ملازمت کے مواقع بہت کم تھے اس لیے جاوید نے ایم اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کرتے ہی قریبی شہر لاہور جانے کا فیصلہ کرلیا۔ اگرچہ ملازمت کے اعتبار سے کراچی زیادہ مناسب تھا مگر ایک تو وہ دور بہت تھا دوسرے وہاں کوئی جان پہچان والا بھی نہیں تھا۔ جبکہ لاہور صرف ایک گھنٹے کے فاصلے پر واقع تھا اور وہاں جاوید کا ایک قریبی دوست بھی رہتا تھا جو بی اے تک اس کا کلاس فیلو رہ چکا تھا۔

حالات نے گھر کے ہر فرد میں تھوڑی بہت خود اعتمادی پیدا کردی تھی۔ جنرل اسٹور کے لیے مختلف چیزوں کی خریداری پہلے جاوید کرتا تھا پھر اس کی والدہ نے بھی ساتھ جانا شروع کردیا۔ دونوں لڑکیاں بھی تعلیم اور گھر کے کام کاج کے بعد فارغ اوقات میں باری باری دکان پر بیٹھتی تھیں جس کی وجہ سے تقریباً سب ہی افراد اپنی مدد آپ کرنے کے قابل ہوگئے تھے۔ جاوید لاہور روانہ ہوا تو اسے اس بات کی کچھ ایسی زیادہ فکر نہیں تھی کہ اس کے بعد گھر اور دکان کا کام کیسے چلے گا۔ ظاہر بات تھی کہ لاہور جاتے ہی ملازمت مل جانے کا امکان بہت ہی کم تھا اس لیے جاوید نے اندازاً اتنی رقم آہستہ آہستہ جمع کرلی تھی جو اگر قیام کا مسئلہ حل ہوجائے تو ایک دو ماہ کے کھانے پینے کے لیے کافی تھی۔ رہائش کے لیے اس نے اپنے دوست کو کچھ نہیں لکھا البتہ اپنی آمد کی اطلاع

دے دی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ دوست اسٹیشن پر ریسیو کرنے تو آئے گا ہی' اگر اس کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ اس کے مکان میں قیام کا مسئلہ کچھ مشکل ہے تو وہ کسی سستے قسم کے ہوٹل میں ٹھہر جائے گا۔ اسی خیال سے اس نے جملہ رقم اپنے اندازے سے کچھ زیادہ ہی جمع کرلی تھی۔

○☆○

مگر آغاز ہی خلافِ توقع ہوا۔ ٹرین کے ڈبے میں بہت رش تھا' جاوید کو کہیں بیٹھنے کی جگہ نہیں ملی لیکن اس نے زیادہ پروا نہیں کی کہ ایک گھنٹے کا ہی تو سفر ہے' جیسے تیسے کٹ جائے گا۔ وہ اپنا چھوٹا اٹیچی کیس ایک ہاتھ میں اُٹھائے گیٹ کے قریب ہی کھڑا ہوگیا۔ جلد ہی اس نے محسوس کیا کہ ایک نوجوان جس نے چیک کی قمیص اور سیاہ رنگ کی پتلون پہن رکھی تھی' اس میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لے رہا ہے۔ جیسے جیسے لاہور قریب آتا جارہا تھا' وہ نوجوان غیر محسوس طور پر گیٹ کے نزدیک آتا جارہا تھا۔ ایک دو چھوٹے اسٹیشن درمیان میں باقی تھے کہ وہ جاوید سے ٹکرا کر معذرت طلب کرتے ہوئے ٹوائلٹ میں چلا گیا۔ جاوید نے تب محسوس کرلیا تھا کہ گزرتے ہوئے اس نوجوان نے اس کی پتلون کی ہپ پاکٹ پر ہاتھ مارا ہے مگر اس طرح جیسے ٹٹول کر دیکھا ہو۔ جاوید کا بٹوہ اسی جیب میں تھا۔ جاوید سمجھ گیا کہ اس نوجوان کی توجہ کی وجہ کیا تھی مگر اسے کچھ حیرت اور کچھ افسوس سا ہوا کیونکہ وہ نوجوان شکل و صورت سے کوئی جیب کترا نہیں معلوم ہورہا تھا۔

دس منٹ تک ٹوائلٹ میں رہنے کے بعد وہ نوجوان باہر نکل آیا اور جاوید کے برابر ہی کھڑا ہوگیا۔ چند منٹ کے بعد ٹرین لاہور پہنچ گئی۔ لاہور اُترنے والے مسافر گیٹ کے پاس جمع ہوچکے تھے۔ جیسے ہی ٹرین رُکی' وہ نوجوان دوبارہ جاوید سے ٹکراتے ہوئے پلیٹ فارم پر اُتر گیا۔ جاوید نے محسوس کرلیا کہ اس کا بٹوہ پار ہوچکا ہے مگر اس نے عجلت یا بدحواسی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اپنی باری پر وہ بھی نیچے اُترا۔ نظریں اس نوجوان پر لگی ہوئی تھیں جو ایک اوور ہیڈ پُل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے انداز میں بے پروائی تھی۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ اس کے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ دوسرے اُترنے والے مسافر بھی اسی پُل کی سیڑھیوں کی جانب بڑھ رہے تھے جس سے ظاہر تھا کہ جس پلیٹ فارم کے گیٹ سے انہیں باہر نکلنا ہے وہ پُل سے گزرنے کے بعد آئے گا۔ جاوید بھی اطمینان سے اسی طرف چلا۔ پُل کے قریب پہنچ کر نوجوان سیڑھیوں پر چڑھنے کے بجائے آگے بڑھ کر سیڑھیوں کی آڑ میں ہوگیا۔

ایک سرسری نظر سے اردگرد دیکھنے کے بعد اس نوجوان نے جاوید کا بٹوہ جو ابھی تک اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا' کھول کر دیکھنا شروع کیا مگر فوراً ہی اس کا کچھ منہ سا بن گیا۔ غالباً بٹوے میں اس کی توقع سے رقم کم تھی۔ جاوید اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے پھرتی سے ہاتھ بڑھا کر نوجوان کی کلائی پکڑ لی۔ نوجوان نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا اور ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ جاوید مسکرایا۔

"اتنی آسانی سے نہیں چھڑا سکو گے۔" وہ بولا۔

"کیا ' مطلب؟" نوجوان ہکلایا۔

"تم نے ایک غلط آدمی کو شکار کیا ہے۔" جاوید نے کہا۔ "کہو تو ابھی ایک آواز دے کر لوگوں اور پولیس کو بلا سکتا ہوں۔"

"معاف کیجئے۔ مجھ سے غلطی ہوگئی۔" نوجوان گھبرایا ہوا تھا۔

"غلطی تو ہو ہی گئی۔" جاوید نے کہا۔ "اوّل تو جیسا میں نے کہا' تم نے غلط آدمی پر ہاتھ ڈالا۔ میں پہلے ہی تمہاری نیت سے واقف ہوچکا تھا۔ دوسرے بٹوے میں پندرہ بیس سے زیادہ روپے بھی نہیں تھے۔ میں سفر کے دوران اپنی رقم بٹوے سے زیادہ محفوظ مقام پر رکھتا ہوں۔"

اس نے دوسرے ہاتھ سے بٹوا واپس لے لیا۔ "بولو اب تمہارا کیا خیال ہے۔ بُلاؤں پولیس کو؟"

"جی نہیں۔ میں...... میں معافی مانگتا ہوں۔ آئندہ پھر کبھی ایسی حرکت نہیں کروں گا۔"

"آئندہ کی بات تو آئندہ دیکھی جائے گی' سوال تو اب کا ہے۔ تم نے چوری کی کیوں؟ صورت سے تو پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو۔"

"آپ کا اندازہ درست ہے۔ میں کوئی عادی چور نہیں ہوں۔ میٹرک تک تعلیم یافتہ ہوں۔"

"پھر تم نے چوری کیوں کی؟"

"اس کے پیچھے ایک المیہ داستان ہے جس سے آپ کو کوئی دلچسپی نہیں ہوسکتی۔ خدا کے لیے آپ مجھے چھوڑ دیں' بڑی مہربانی ہوگی۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام انور ہے۔"

"تو مسٹر انور! تمہارا اندازہ غلط ہے۔ مجھے تمہاری کہانی سے واقعی دلچسپی پیدا ہوچکی ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ ایک میٹرک پاس' شریف نوجوان جیب کاٹنے پر کیوں مجبور ہوا۔ یہ بتاؤ مجھ سے ایک سودا کرو گے؟"

"کیسا سودا؟" انور نے حیرت سے پوچھا۔ اب وہ اپنی گھبراہٹ پر کافی حد تک قابو پاچکا تھا۔

"تم مجھے اپنی کہانی بالکل سچ سچ سناؤ گے۔" جاوید نے کہا۔ "اس کے جواب میں' میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں نہ صرف یہ کہ پولیس کے حوالے نہیں کروں گا بلکہ جہاں تک ممکن ہوا' تمہاری مدد کروں گا۔"

"آپ سچ کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں' بالکل سچ۔"

"پہلے میرا ہاتھ چھوڑیئے۔" انور نے کہا جو ابھی تک کوشش کے باوجود اپنی کلائی نہیں چھڑا سکا تھا۔

"بھاگو گے تو نہیں؟"
"نہیں۔"
"چلو اسی سے تم پر اعتماد کا آغاز کرتا ہوں۔" جاوید نے ہاتھ چھوڑ دیا۔
"آپ کی گرفت بڑی سخت ہے۔" انور نے کلائی مسلتے ہوئے کہا۔
"میں بھاگتا بھی بہت تیز ہوں۔" جاوید مسکرایا۔ "چاہو تو آزما کر دیکھ لو۔"
"میں بھاگوں گا نہیں۔" انور کے ہونٹوں پر پہلی مرتبہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "نامعلوم کیوں آپ پر اعتماد کرنے کو جی چاہتا ہے۔"
"ذرا ٹھہرو۔" جاوید بولا۔ "باتیں کرنے کے لیے یہ جگہ مناسب نہیں ہے۔ میں اپنے ایک دوست کو تلاش کرلوں۔ شاید وہ مجھے لینے آیا ہو۔ پھر اطمینان سے اسٹیشن سے باہر چل کر کسی کیفے یا ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر تمہاری کہانی سُنوں گا۔ جہاں تک میرے دوست کا تعلق ہے، تمہیں اس سے بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس کے سامنے تمہیں چور نہیں، اپنا ایک دوست ہی ظاہر کروں گا جو کہ اچانک اسٹیشن پر مل گیا ہے۔"
اس وقت تک پلیٹ فارم کافی حد تک خالی ہوچکا تھا۔ جاوید نے غور سے ہر طرف دیکھا مگر اسے اپنا دوست نظر نہیں آیا جس کا مطلب یہ ہی ہو سکتا تھا کہ یا تو اسے جاوید کا خط نہیں ملا تھا یا کسی اہم وجہ سے وہ اسٹیشن نہیں آسکا۔
"میرا دوست غالباً نہیں آیا۔" جاوید بولا۔ "آؤ باہر چلیں۔ مگر تم گیٹ سے باہر کیسے نکلو گے؟ کیا تمہارے پاس ٹکٹ ہے؟"
"جی ہاں۔ میں بغیر ٹکٹ سفر نہیں کرتا۔" انور نے قدرے مسکرا کر جواب دیا۔
"گویا حکومت کی نہیں، عوام کی جیب کاٹتے ہو۔"
"یہ بات نہیں۔" اب دونوں سیڑھیاں چڑھنے لگے تھے۔
"جیسا کہ میں نے بتایا، میں عادی چور نہیں ہوں۔ عام مقامات پر لوگوں کی جیب پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ میں نے محسوس کیا اور تجربے نے بھی بتایا ہے کہ آدمی سفر کے دوران اپنی جانب سے سب سے زیادہ بے پروا ہوتا ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب کہ وہ ٹرین پر چڑھ رہا ہو یا اپنی منزل قریب آنے پر ٹرین سے اُتر رہا ہو۔ اس وقت اُترنے یا چڑھنے کی کیفیت میں وہ نفسیاتی طور پر اپنے آپ سے تقریباً غافل ہوتا ہے اور اس کی جیب سے آسانی سے کوئی چیز نکالی جاسکتی ہے۔ اس لیے میں روزانہ رائے ونڈ سے لاہور اور لاہور سے رائے ونڈ کے دو تین چکر لگا لیتا ہوں اور ہمیشہ ٹکٹ خرید کر تاکہ کم سے کم بغیر ٹکٹ سفر کرتے ہوئے تو نہ پکڑا جاؤں۔"
"بہت خوب! تم ذہین بھی معلوم ہوتے ہو۔" جاوید نے مسکراتے ہوئے کہا۔
اسٹیشن سے باہر نکل کر جاوید اور انور ایک قریبی ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئے۔ جاوید نے چائے کا آرڈر دیا اور جب ویٹر چائے رکھ گیا تو جاوید نے کہا۔
"ہاں اب شروع ہو جاؤ مگر بات ذرا مختصر ہی رکھنا، مجھے ابھی اپنے دوست کا مکان بھی تلاش کرنا ہے۔"

○☆○

انور نے اپنی داستان شروع کرنے سے پہلے چائے کے دو تین گھونٹ بھرے، کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔
"جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا، میرا نام انور ہے۔ ماں باپ بچپن میں ہی مجھے اکیلا چھوڑ گئے۔ میری پرورش ایک چچا نے کی۔ ان کے گھر میں جیسی گزری اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مختصر طور پر اتنا کہنا کافی ہے کہ اگر آبائی مکان کا لالچ نہ ہوتا تو شاید ابو کے آنکھیں بند کرتے ہی وہ مجھے گھر سے نکال دیتے۔ بہرحال دنیا دکھاوے کے لیے انہوں نے مجھے پالا، میٹرک تک تعلیم دلائی اور پھر کہا کہ بھتیجے، بس میں یہیں تک تمہارا ساتھ دے سکتا تھا۔ اب خود کماؤ اور کھاؤ۔ مطلب صاف ظاہر تھا کہ تعلیم کا سلسلہ ختم اور تلاش روزگار کا مسئلہ شروع۔ کچھ دن کی بھاگ دوڑ کے بعد مجھے ایک ٹھیکیدار کے پاس اس کا حساب کتاب دیکھنے کی ملازمت مل گئی۔ ٹھیکیدار مختلف قسم کے تعمیراتی ٹھیکے لیتا تھا۔ مثلاً کسی مکان یا بنگلے کا یا کوئی چھوٹا موٹا گورنمنٹ کا تعمیراتی کام۔ جب تک میرا واسطہ حساب کتاب سے رہا، کام چلتا رہا۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی اور نہ ہی کچھ علم ہوتا تھا کہ عمارت کس کی بن رہی ہے، کس طرح بن رہی ہے۔ آیا اس میں وہی میٹریل لگایا جارہا ہے جو ٹھیکیدار نے اپنے ٹینڈر میں ظاہر کیا تھا یا نہیں۔ مجھے صرف اپنے کام سے کام تھا اور میرا کام ہر قسم کے اخراجات اور آمدنی کا حساب رکھنا تھا اور بس۔
دو تین برس بیت گئے۔ نوکری ملتے ہی میں نے چچا کا گھر چھوڑ دیا۔ جس پر غالباً انہوں نے سکھ کی سانس لی ہوگی کہ میں ان سے آبائی مکان میں اپنا حصہ طلب کیے بغیر ان کی جان چھوڑ گیا۔ اس دوران میری ایک دور کے رشتے سے بیوہ پھوپی نے اپنی اکلوتی بیٹی رقیہ کی شادی مجھ سے کردی۔ سچ بات یہ ہے کہ اگر وہ بیوہ اور غریب نہ ہوتیں تو رقیہ کے لیے ایک سے ایک اچھا رشتہ مل سکتا تھا مگر چونکہ وہ بیٹی کو حقیقتاً ایک جوڑے اور شربت کے پیالے پر نکاح پڑھوانے سے زیادہ کی پوزیشن میں نہیں تھیں اس لیے تقدیر نے وہ ہیرا میری جھولی میں ڈال دیا۔ رقیہ تعلیمی اعتبار سے بھی مجھ سے زیادہ نہ تھی بلکہ شکل و صورت میں بھی کہیں زیادہ بہتر تھی۔ اس نے بی اے کیا ہوا تھا۔ ہماری ازدواجی زندگی ہر اعتبار سے قابلِ رشک تھی۔ سال بھر کے بعد ہمارے یہاں ایک بیٹا پیدا ہوا اور ہماری زندگی اور زیادہ پُرمسرت بن گئی لیکن یہ خوشی زیادہ دیر پا ثابت نہیں ہوئی۔
کام سے میری لگن اور محنت کو دیکھتے ہوئے ٹھیکیدار نے اپنی غیر حاضری میں مجھے نگرانی کے کام پر بھی لگا دیا۔ یعنی جب وہ کسی

معروفیت کی وجہ سے کہیں جاتا تھا، کبھی پورے دن کے لیے اور کبھی دو تین دن کے لیے کیونکہ اس نے دو تین ٹھیکے اور بھی لے لیے تھے تو اپنی عدم موجودگی میں مجھے ساری ذمے داری سونپ جاتا تھا۔ تب پہلی مرتبہ مجھے معلوم ہوا کہ عمارت کی تعمیر اس طرح نہیں ہو رہی تھی جس طرح اصولاً ہونا چاہیے تھی۔ ناقص میٹریل استعمال کیا جا رہا تھا، سیمنٹ کی کم مقدار ڈالی جا رہی تھی۔ کم گیج کا سریا اور سستے قسم کے ٹائل لگائے جا رہے تھے۔ میں اپنی حماقت سے یہ سمجھا کہ یہ سب کچھ ٹھیکیدار اور بلدیہ کے نگراں انجینئر کی لاعلمی میں ہو رہا ہے اور ایک دن میں نے جوشِ وفاداری اور سچائی میں یہ تمام شکایتیں اس وقت ٹھیکیدار کے سامنے بیان کر دیں جبکہ بلدیہ کا انجینئر بھی معائنے کے لیے آیا ہوا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انجینئر کے جانے کے بعد مجھے ٹھیکیدار کی باتیں بلکہ گالیاں سُننا پڑیں اور یہ طعنہ بھی کہ اسے مجھ جیسے سادہ لوح، بے وقوف اور ایماندار آدمی کی ضرورت نہیں ہے۔

میں اپنی ایمانداری کی بدولت اسی دن ملازمت سے نکال دیا گیا۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ جو کچھ ہو رہا تھا، وہ ٹھیکیدار اور انجینئر کی ملی بھگت سے ہو رہا تھا۔ نیز یہ کہ آج کی دنیا میں ایمانداری اور سچائی کی کوئی قدر نہیں۔ میں ملازمت سے کیا برطرف ہوا، ہم پر آزمائشوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ مجھے کوئی دوسری ملازمت نہیں ملی۔ میرا تمام تجربہ تعمیراتی سامان کی ڈیلنگ اور حساب کتاب رکھنے پر مشتمل تھا۔ شہر میں اور بھی بہت سے ٹھیکیدار تھے مگر میرے سابقہ مالک نے تقریباً ہر ٹھیکیدار کو میری ایمانداری، دوسرے الفاظ میں میری خامی کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا۔ ان میں سے کوئی مجھے ملازمت دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

تنگ دستی کے باعث فاقہ کشی تک نوبت پہنچی تو میری بیوی رقیہ نے کہا کہ وہ بی اے ہے، اسے تھوڑی بہت تلاش کے بعد کسی پرائیوٹ اسکول میں پڑھانے کی نوکری مل سکتی ہے مگر میں ان لوگوں میں سے تھا جو ضرورت کے وقت بھی عورت کو گھر سے باہر نکلنے نہیں دیتے۔ میرا خیال ہی نہیں، ایمان تھا کہ گھر کی کفالت کرنے کی ذمے داری مرد پر ہے۔ عورت کی کمائی کھانے کے خیال سے ہی میری انا اور خودداری کو چوٹ لگتی تھی۔ حتیٰ کہ یہ نوبت آگئی کہ ہمارے گھر میں دو دن تک کچھ نہیں پکا۔ میرا بیٹا جس کی عمر اس وقت دو ڈھائی سال کی تھی، دودھ کے لیے بھوک سے بے قرار تھا۔ رقیہ کے سینے میں دودھ خشک ہو گیا تھا۔ ویسے بھی کئی مہینے سے ہم اسے اوپر کا دودھ دے رہے تھے۔ مجھ سے اپنے بیٹے کا بھوک سے بلکنا نہیں دیکھا گیا اور میں ایک جنرل اسٹور سے ایک دودھ کا ڈبا چرا کر گھر لے آیا۔

رقیہ نے ڈبے کے بارے میں پوچھا اور مجھے سچ بتانا پڑا کہ میں ڈبا چرا کر لایا ہوں۔ اس پر رقیہ غصے سے سرخ ہو گئی۔ اس نے کہا کہ حرام کی کمائی کھانے اور کھلانے سے تو ہزار درجے بہتر تھا کہ میں اسے ملازمت کی اجازت دے دیتا اور یہ کہ وہ نہ تو خود حرام کی کمائی کھانا چاہتی ہے اور نہ اپنے بیٹے کے پیٹ میں اس کا ایک لقمہ یا ایک گھونٹ بھی جانے دینے کی روادار ہوگی۔ اب تک اس نے بہت صبر کیا مگر میں چوری پر اُتر آؤں گا، یہ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اس لیے وہ اپنی ماں کے گھر جا رہی ہے اور جب تک میں حلال کی کمائی کھلانے کے قابل نہیں ہو جاتا واپس نہیں آئے گی۔ ظاہر ہے کہ میں غلطی پر تھا۔ مجھے اپنی کمزوری پر غصہ آگیا۔ ضد اور جھلاہٹ میں، میں نے کہہ دیا کہ اس دنیا میں ایماندار آدمی کی کوئی ضرورت نہیں اس لیے یہ میں نے طے کر لیا ہے کہ دنیا میرا حصہ جائز طریقے سے نہیں دے گی تو زبردستی اس سے چھین لوں گا، خواہ جس طرح بھی ممکن ہو۔ اس پر رقیہ بولی کہ اگر یہ بات ہے تو آج سے ہماری راہیں مختلف ہوتی ہیں۔ وہ مجھے اس وقت تک معاف نہیں کرے گی جب تک مجھے اپنی غلطی کا احساس نہ ہوگا اور میں کسی جائز طریقے سے بیوی بچّوں کی کفالت کے قابل نہیں ہو جاؤں گا۔

اس کے بعد وہ چلی گئی۔ میں نے بھی غصے میں اسے نہیں روکا۔ یہ غصہ مجھ پر اس طرح سوار ہو گیا کہ اس دن کے بعد سے میں نے جیب تراشی کو اپنی آمدنی کا ذریعہ بنالیا۔ یہ ضرور ہے کہ مجھے اپنی بنیادی ضرورتوں سے زیادہ کی ہوس نہیں اس لیے ہفتے میں ایک دو بار نکلتا ہوں۔ کبھی خالی ہاتھ لوٹنا پڑتا ہے اور کبھی مہینے بھر کی گزراوقات کے لائق رقم مل جاتی ہے۔"

جاوید بڑی توجہ اور ہمدردی سے انور کی داستان سُن رہا تھا۔

"اس بات کو کتنے دن ہو گئے؟" اس نے پوچھا۔

"تقریباً دو سال۔"

"دو سال!" جاوید نے حیرت سے دُہرایا۔ "اور اس مدت میں تم نے ایک بار بھی رقیہ سے مِلنے کی کوشش نہیں کی؟"

"ایک بار نہیں، متعدد مرتبہ میں پھوپی کے گھر گیا۔" انور نے جواب دیا۔ "مگر اس نے ملنے سے انکار کر دیا۔"

"بغیر یہ جانے کہ تم آج کل کیا کر رہے ہو؟"

"یہ بات نہیں۔" انور مسکرایا۔ "پھوپی اماں پہلا سوال یہ ہی کرتی تھیں جو ظاہر ہے کہ رقیہ کی طرف سے ہوتا تھا کہ مجھے کوئی ملازمت مل گئی یا نہیں۔"

"اور ظاہر ہے کہ تمہارا جواب نفی میں ہوتا ہوگا۔" جاوید نے خود ہی کہا پھر سنبھل کر بولا۔ "دیکھو بھائی، اس مقدمے میں میری تمام تر ہمدردی رقیہ کے ساتھ ہے اور اگر اس وقت تم نے یہ وعدہ نہیں کیا کہ آج سے چوری یا جیب تراشی کا پیشہ ترک کر کے کوئی ایمانداری کا کام کرو گے تو میں ابھی تمہیں پولیس کے حوالے کر سکتا ہوں۔"

"آپ کو اس دھمکی کی ضرورت نہیں۔" انور نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں خود کئی مرتبہ یہ ارادہ کر کے رقیہ سے ملنے جا چکا ہوں کہ وہ مجھے معاف کر دے تو میں آئندہ یہ کام نہیں کروں گا۔ اب آپ اسے میری اخلاقی یا جذباتی کمزوری سمجھ لیں کہ میں پہلے اس

کی معافی چاہتا ہوں پھر چاہے مزدوری اور قلی گیری ہی کرنا پڑے، کر گزروں گا۔"

"یہ ہمارے نفس کا ایک اور فریب ہے۔" جاوید نے جواب دیا۔ "اصول کہتا ہے کہ پہلے وہ کام کرکے دکھاؤ جس پر رقیہ تمہیں معاف کرسکے پھر اس کی معافی کی توقع رکھو۔"

"شاید آپ سچ کہہ رہے ہیں۔"

"اگر سنجیدگی سے پشیمان ہو تو میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں۔"

"وہ کس طرح؟"

"میرا مشورہ ہے کہ تم خود کوئی اپنا کام شروع کرو۔ مثلاً پھلوں کا ٹھیلا وغیرہ مگر شاید اس میں زیادہ سرمائے کی ضرورت ہوگی۔ میں خود بھی یہاں ملازمت کی تلاش میں آیا ہوں۔ کچھ پیسے میرے پاس ضرور ہیں مگر اتنے نہیں کہ میری ضرورت کے بعد تمہارے کام آسکیں۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ تم چاٹ بیچنا شروع کردو۔ اس میں بھی اگرچہ مختلف چیزوں کی خریداری کے لیے سو دو سو کی ضرورت ہوگی مگر شاید اتنی رقم میں تمہیں دے سکوں۔ پھر چاٹ ایسی چیز ہے کہ اچھی بنی ہو تو اس میں روپیہ ڈوبنے کا خطرہ نہیں اور اتفاق سے میری امی چنے کی چاٹ بہت عمدہ بناتی ہیں اس لیے اس کام میں، میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں۔"

"مگر آپ میری مدد کیوں کرنا چاہتے ہیں؟ ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔"

"اجنبی تھے مگر اب نہیں رہے۔" جاوید نے کہا۔ "میری داستان تم سے کچھ مختلف نہیں ہے لیکن بنیادی نکتہ دونوں کا غریبی، بے کاری اور تلاشِ معاش ہے۔"

اتنا کہہ کر جاوید نے مختصر الفاظ میں اپنی کہانی بھی کہہ سنائی۔

"اور چونکہ ہم دونوں ضرورت مند ہیں اس لیے ایک دوسرے کے دوست بھی بن سکتے ہیں۔ بولو، تمہیں یہ دوستی قبول ہے؟"

"دل و جان سے۔" انور نے جوش سے کہا۔

"تو پھر پہلے مجھے اپنا گھر دکھا دو۔" جاوید نے کہا۔ "پھر میں اپنے دوست کے گھر جاکر وہاں اپنا سامان وغیرہ رکھ دوں، اس کے بعد تمہاری چاٹ کے ٹھیلے کے لیے سامان خریدیں گے۔ میرا خیال ہے کہ یہاں ٹھیلے کرائے پر مل جاتے ہوں گے۔"

"معلوم نہیں مگر معلوم کرلیں گے۔"

"شاباش یہی جذبہ ہونا چاہیے۔"

"ایک بات میں بھی کہوں جاوید بھائی۔" انور کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"ہاں، ضرور کہو۔"

"آپ نے اپنے دوست کو اپنی آمد کی اطلاع دی تھی؟"

"ہاں خط لکھا تھا۔"

"اس کے باوجود وہ اسٹیشن پر نہیں آئے۔" انور نے کہا۔

"اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں لیکن میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی وجہ سے آپ کے دوست اگر اس پتے پر نہیں ملے جو آپ کے پاس ہے تب آپ میرے ساتھ میرے مکان پر ٹھہریں گے۔"

"یہ بھی کوئی کہنے کی بات تھی۔" جاوید مسکرایا۔ "اگر میرا دوست اس پتے پر نہیں ملا تو پھر میں دوستی میں تکلف کو جائز نہیں سمجھتا۔"

"آپ جس قدر مخلص، ہمدرد اور اچھے انسان ہیں۔ اتنے ہی صاف گو بھی ہیں۔"

"خلوص اور ہمدردی کا تقاضا ہی صاف گوئی ہے۔ مجھے ہر قسم کی بناوٹ اور دنیا دکھاوے سے نفرت ہے۔"

"تو پھر چلیں، پہلے آپ کے دوست کا گھر تلاش کریں۔" انور نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

○☆○

تقریباً ایک گھنٹے تک بھٹکنے کے بعد مطلوبہ مکان تو مل گیا مگر معلوم ہوا کہ اب جاوید کا دوست وہاں نہیں رہتا۔ وہ کرائے کا مکان تھا اور کوئی چھ ماہ قبل پرانے کرائے دار کہیں جاچکے تھے۔ کہاں؟ اس کا نئے کرائے داروں کو کچھ علم نہیں تھا۔ اس انکشاف کے بعد جیسا کہ جاوید اور انور میں طے ہوا تھا، انور جاوید کو اپنے مکان پر لے گیا جو کہ تین کمروں کا ایک خاصا آرام دہ اور ضرورت کی ہر چیز سے مزین تھا۔

شام تک دونوں دوستوں نے ضروری اشیا کی خریداری کی۔ پتا کرنے سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ٹھیلے کہاں سے اور کس کرائے پر ملتے ہیں۔ چنانچہ رات ہی کو دونوں نے ایک ٹھیلا بھی ماہانہ کی بنیاد پر کرائے پر لے لیا۔ جاوید نے انور کو چاٹ بنانا سکھائی کیا بلکہ عملاً اسی سے سب کچھ کرایا۔ اگلی صبح مکان میں قفل ڈال کر جاوید ملازمت کی تلاش میں اور انور اپنا چاٹ کا ٹھیلا لے کر نکل گیا۔ طے یہ ہوا تھا کہ ڈیڑھ دو بجے کے درمیان دونوں گھر واپس آجائیں گے۔ اس کے باوجود انور نے قفل کی ایک چابی جاوید کو دے دی تھی کہ اگر وہ پہلے آجائے تو اسے مکان کے باہر نہ ٹہلنا پڑے۔

تقدیر محنت کرنے والوں کو کبھی مایوس نہیں کرتی۔ حسب توقع نہیں تو بھی کچھ نہ کچھ پھل ضرور دیتی ہے اور جاوید اور انور کے معاملے میں تو جیسے قسمت ان کے ہاتھ پیر ہلانے ہی کی منتظر تھی۔ پہلے دن ہی انور کی تمام چاٹ دوپہر تک ختم ہوگئی اور اسے بیس روپے کا منافع ہوا۔ جاوید کو پہلے دن تو نہیں مگر ایک ہفتے کی تلاش کے بعد ایک دفتر میں کلرک کی جگہ مل گئی۔ جاوید کا مقصد تو کسی کالج یا اسکول میں پڑھانے کا تھا لیکن کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونے کو بہتر سمجھ کر اس نے کلرک کی ملازمت بھی قبول کرلی۔ خاص طور پر اس لیے کہ ایک پرائیوٹ کالج کے پرنسپل نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ نیا تعلیمی سال شروع ہونے پر جس میں صرف دو تین مہینے باقی تھے، وہ اسے لیکچرار کی جاب ضرور دے دے گا کیونکہ کالج کے ایک پرانے پروفیسر کوئی بہتر جگہ ملنے پر سروس چھوڑ کر جارہے تھے۔ اس طرح تقریباً ہفتے عشرے میں دونوں کی مشکل آسان ہوگئی۔ انور

روزانہ چالیس پچاس روپے کمانے لگا اور جاوید کو بھی ابتدائی طور پر بارہ سو روپے کی تنخواہ پر رکھ لیا گیا تھا۔

○☆○

دو تین مہینے گزر گئے، جاوید کو یقین ہو گیا کہ انور کی زندگی میں جو تبدیلی آئی ہے وہ کوئی وقتی جذبہ یا عارضی جوش نہیں بلکہ اس نے ذہنی اور قلبی طور پر اپنی پچھلی روش پر پچھتاوے کے ساتھ واقعی خود کو بدلنے کا عہد کرلیا ہے تو اس نے ایک شام انور سے پوچھا۔

"رقیہ بھابی کا مکان کہاں ہے؟"

"کیوں، آپ کو اس کی کیا ضرورت پڑ گئی؟"

"میں انہیں اور تمہارے بیٹے کو گھر واپس لانا چاہتا ہوں۔"

"ان پچھلے تین مہینوں میں کتنی بار میں نے خود سوچا کہ اسے منا کر لے آؤں مگر جاوید بھائی، جب وہ ایک فیصلہ کرلیتی ہے تو پھر اسے تبدیل نہیں کرتی۔"

"یہ کام تم مجھ پر چھوڑو۔ مجھے تو تم صرف دور سے ان کا مکان دکھا دو۔"

"خدا کرے آپ اپنی کوشش میں کامیاب ہوں۔" انور نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "میرے لیے تو اس سے زیادہ خوشی کی کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی کہ رقیہ مجھے معاف کردے اور ہم پھر سے پہلے کی طرح رہنے لگیں۔"

ایک صبح انور نے دور سے جاوید کو رقیہ کا گھر دکھا دیا۔ اس روز دفتر کی چھٹی تھی اس لیے جاوید کو اطمینان سے گفتگو کرنے کا موقع میسر تھا۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ خود رقیہ دروازے پر آئی۔ جاوید نے اندازے سے پہچان لیا۔

"السلام علیکم۔" اس نے کہا۔ "رقیہ بھابی! آپ مجھے نہیں پہچانتیں مگر میں آپ کا اتنا ذکر سُن چکا ہوں کہ اگر آپ خواتین کے ہجوم میں بھی نظر آتیں تو میں آپ کو پہچان لیتا۔"

"آپ نے مجھے رقیہ بھابی کہا، اس کا مطلب ہے کہ آپ کا کوئی نہ کوئی تعلق انور صاحب سے ضرور ہے۔ اور اگر آپ ان کے سلسلے میں کچھ کہنے سُننے آئے ہیں تو مجھے افسوس ہے کہ میں اس موضوع پر کوئی گفتگو کرنا نہیں چاہتی۔"

"میرا خیال ہے کہ ایک بھائی کا بہن پر اتنا حق ضرور ہوتا ہے کہ وہ اسے دروازے پر کھڑا رکھ کر بات نہ کرے۔"

رقیہ نے کسی قدر شرمندگی کے احساس کے ساتھ جاوید کو گھر میں آنے کی دعوت دی اور ایک کمرے میں جسے بطور ڈرائنگ روم بھی استعمال کیا جاتا تھا، بٹھایا۔ جاوید نے پہلے کچھ تھوڑا سا اپنا تعارف کرایا پھر انور سے ملاقات کا حال بتایا اور اس ملاقات کے بعد جو تبدیلی انور میں پیدا ہوئی تھی، اس سے آگاہ کیا۔ ساتھ ہی یقین دلایا کہ اب انور پہلے جیسا انور نہیں رہا ہے، اسے اپنی غلطی کی کافی سزا مل چکی ہے اس لیے اب اگر رقیہ اسے معاف کردے تو یہ سب کے لیے بہتر ہوگا۔ رقیہ نے بڑی توجہ سے جاوید کی باتیں سُنیں۔

"مجھے خوشی ہے کہ انہیں آپ جیسا دوست مل گیا۔" اس نے سب کچھ سُن کر کہا۔ "لیکن اپنے جانے کا فیصلہ تنہا میں نہیں کرسکتی، مجھے اپنی امی سے مشورہ کرنا پڑے گا۔ آپ انور صاحب کو کل شام اپنے ساتھ لے کر آئیں۔ اگر انہوں نے آپ کی باتوں کی تائید کی اور امی نے جانے کی اجازت دے دی تو مجھے چلنے میں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

دوسرے دن شام کو جاوید، انور کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ انور نے پھوپی سے اور رقیہ سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگی اور یوں رقیہ اور انور میں پھر ملاپ ہو گیا۔ رقیہ، انور کے ساتھ ہی اس کے گھر واپس آگئی اور چونکہ اب اسے اسکول کی ملازمت کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی اس لیے اس نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔

○☆○

چند مہینے بڑی خوش اسلوبی سے گزر گئے۔ جاوید اپنی ملازمت سے مطمئن نہیں تھا اس لیے اخبار میں اپنے لیے جس ملازمت کے اشتہار کو بھی مناسب سمجھتا، وہاں ضرور درخواست بھیج دیتا۔ دو تین مرتبہ انٹرویو کال بھی آئی مگر بات انٹرویو سے آگے نہ بڑھ سکی۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا تھا کہ جاوید دفتر سے گھر جانے کے بجائے انور کے چاٹ کے ٹھیلے کا چکر لگا لیا کرتا تھا۔ انور نے اپنے ٹھیلے کے لیے ایک مخصوص جگہ مقرر کرلی تھی اور اس کوشش میں تھا کہ کوئی کم کرائے کی دُکان مل جائے تو ٹھیلے کے بجائے دُکان پر کام کرے۔ اس طرح گاہکوں کو بیٹھ کر اطمینان سے چاٹ کھانے کی سہولت بھی مل سکتی تھی۔

ایک سہ پہر وہ اسی طرح انور کے پاس پہنچا تو انور نے اسے ایک قیمتی پرس دکھایا۔

"یہ کیا ہے؟" جاوید نے پوچھا۔

"کچھ لڑکیاں چاٹ کھانے آئی تھیں، میرا خیال ہے کہ ان میں سے کوئی اپنا پرس بھول گئی ہے۔"

"تم نے اسے کھول کر نہیں دیکھا؟"

"بالکل نہیں۔ میں اپنی حد تک یہ خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔"

"مگر اسے کھولنا تو پڑے گا ہی۔" جاوید نے کہا۔ "اوّل اس لیے کہ شاید اس میں اس لڑکی کا نام پتا موجود ہو، دوسرے اس لیے کہ اگر کوئی لڑکی آکر یہ کہے کہ یہ پرس اس کا ہے تو ہم کیسے چیک کرسکیں گے کہ وہ درست کہہ رہی ہے یا غلط۔"

پرس کافی بڑا تھا۔ اس میں زنانہ استعمال کی کئی چیزوں کے علاوہ دس ہزار روپے اور گلے کا ایک ٹوٹا ہوا نیکلس تھا جو غالباً مرمت کے لیے پرس میں رکھ لیا گیا تھا۔ ایک کارڈ بھی تھا جس پر کسی سیٹھ ہاشم بھائی کا پتا درج تھا۔ کارڈ سے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ کارڈ اسی لڑکی کا تھا جس کا پرس تھا یا اس کی کسی سہیلی کا لیکن

بہرحال اس سے لڑکی کا پتا معلوم ہونے کا ایک ذریعہ ضرور سامنے آگیا تھا۔ جاوید نے اس خیال سے کہ کہیں لڑکی نے پولیس میں پرس کی گمشدگی کی رپورٹ درج نہ کرا دی ہو' اسی وقت جانے کا فیصلہ کرلیا۔ نصف گھنٹے بعد وہ کارڈ پر لکھے ہوئے ایڈریس کے مطابق ایک بنگلے کے سامنے کھڑا تھا۔ ابھی وہ کال بیل بجانے کا ارادہ ہی کررہا تھا کہ گیٹ کھلا اور ایک خوبصورت لڑکی باہر نکلی۔

"آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

"میں ہاشم بھائی سے ملنے آیا ہوں۔"

"ڈیڈی تو اس وقت گھر پر نہیں ہیں لیکن اگر کوئی خاص بات ہے تو آپ مجھ سے کرسکتے ہیں۔ میں ان کی اکلوتی بیٹی شہناز ہوں۔"

"آپ کی کوئی چیز تو گم نہیں ہوئی ہے۔"

"جی ہاں۔ میرا پرس گم ہوگیا ہے۔" شہناز نے جلدی سے کہا۔ "کیا آپ کو ملا ہے؟"

"پہلے آپ یہ بتائیں کہ آپ نے اسے کہاں گم کیا ہے؟"

"اگر یہی یاد آجاتا تو اب تک وہاں پہنچ نہ جاتی۔" شہناز نے جواب دیا۔ "دراصل میں اپنی چار پانچ سہیلیوں کے ساتھ شاپنگ کے لیے نکلی تھی۔ کئی دکانوں پر جانا ہوا اور اب قطعی یاد نہیں آرہا ہے کہ پرس کس دکان پر رہ گیا ہے۔"

"اس کے اندر کیا کچھ تھا' آپ بتا سکتی ہیں؟"

"کیوں نہیں۔ دس ہزار کے قریب کیش تھا' ایک ٹوٹا ہوا نیکلس تھا جسے میں مرمت کرانے لے گئی تھی اور کچھ دوسرا متفرق سامان جو عام طور سے لڑکیوں کے بیگ میں ہوتا ہے۔"

"تب تو یہ آپ ہی کا بیگ ہے۔" جاوید نے پرس واپس کرتے ہوئے کہا۔ "دراصل میرے ایک دوست کی چاٹ کی دکان ہے' آپ یہ وہاں بھول آئی تھیں۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اس سے قبل کہ کوئی الجھن پیدا ہو' آپ کو پرس واپس کر آؤں۔"

"شکریہ۔ کیا آپ اندر تشریف نہیں لائیں گے؟"

"کوئی خاص ضرورت تو نہیں لیکن آپ نے دعوت دی ہے تو مجھے کوئی اعتراض بھی نہیں۔"

شہناز اسے ڈرائنگ روم میں لے گئی جسے بہترین انداز میں آراستہ کیا گیا تھا۔ ملازمہ سے کہہ کر چائے منگوائی اور خود اپنے ہاتھ سے بنا کر جاوید کو پیش کی۔

"آپ نے ابھی تک اپنا تعارف نہیں کرایا۔"

"جی۔ میرا نام جاوید ہے۔ ایک چھوٹی سی فرم میں کلرکی کرتا ہوں اور اپنے اسی دوست کے ساتھ رہتا ہوں۔ میرے والد وغیرہ دوسرے شہر میں رہتے ہیں۔ ملازمت کی تلاش کے لیے لاہور آیا تھا۔ پیٹ پالنے کو کلرکی ملی تو وہی کرلی۔"

"ویسے آپ کی تعلیم کہاں تک ہے؟"

"میں نے معاشیات میں ایم اے کیا ہے۔"

"ایم اے!" شہناز نے حیرت سے کہا۔ "اور آپ کلرکی کررہے ہیں؟"

"میں نے عرض کیا نا کہ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔ اسی خیال سے یہ ملازمت کرلی تھی' اب کسی بہتر ملازمت کی تلاش میں ہوں۔"

"اگر آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں آپ کے احسان کا کوئی جواب دینا چاہتی ہوں تو کچھ عرض کروں؟"

"فرمایئے۔"

"عجیب اتفاق ہے کہ آج صبح ہی ڈیڈی مجھ سے کہہ رہے تھے کہ انہوں نے کسی بدانتظامی اور گڑبڑ کی وجہ سے اپنے گودام انچارج کو نکال دیا ہے۔" شہناز نے جواب دیا۔ "شاید گودام انچارج کے الفاظ سے آپ کو کچھ غلط فہمی ہو' تو عرض ہے کہ ہماری مل میں کاٹن جننگ سے لے کر کپڑا' ہوزری اور بہت کچھ تیار ہوتا ہے۔ ہر چیز کا ایک الگ گودام ہے۔ جس کے لیے اسٹور کیپر ہوتا ہے اور تمام گوداموں کے لیے ایک انچارج ہوتا ہے جو نہ صرف ہر چیز کا حساب رکھتا ہے بلکہ اسٹور کیپروں کی مدد سے وہ اس بات کا بھی نگراں ہوتا ہے کہ کتنا خام مال مل میں آیا' کہاں کہاں کتنا مال دیا گیا اور اس سے کتنی پروڈکشن حاصل ہوئی۔"

"یہ تو بہت ذمّے داری کا کام ہے۔"

"ہاں کام تو بڑی ذمّے داری کا ہے مگر مجھے یقین ہے کہ تھوڑی سی تربیت سے آپ سب کچھ جان جائیں گے۔"

"دیکھئے' مجھے اس لائن کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ کہیں سیٹھ صاحب کو میری کارکردگی سے مایوسی نہ ہو۔"

"اوّل تو مجھے یقین ہے کہ ایسا نہیں ہوگا اور بالفرض ہوا تو وہ مل ہی میں آپ کو کوئی ایسی جگہ دے دیں گے جو آپ کے لیے آسان ہو۔"

"مطلب یہ کہ آپ نے مجھے ہر صورت میں جاب دینے کا فیصلہ کرلیا ہے؟"

"جی ہاں۔ اور صاف بات یہ ہے کہ اس زمانے میں دس ہزار نقد اور پچاس ہزار کا نیکلس واپس کرنے والے افراد کم ہی ہوں گے جو مفت مال ہاتھ آنے کا ایسا سنہری موقع پائیں اور اس سے یوں دست کش ہوجائیں جیسے ان کی نگاہ میں اس کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔"

شہناز نے جاوید کو اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک اس کے والد سیٹھ ہاشم بھائی گھر نہیں آگئے۔ اس نے سیٹھ جی سے بڑے شاندار انداز میں جاوید کا تعارف کرایا' حالات بتائے اور ان سے وعدہ لیا کہ وہ کل ہی گودام انچارج کی تقرری کا پروانہ جاوید کے سپرد کردیں گے۔ ابتدائی تنخواہ چار ہزار مقرر ہوئی تھی اور یہ طے پایا تھا کہ عارضی تقرری کا وقت مکمل ہوتے ہی جاوید کو مل کی طرف سے رہائش گاہ اور سواری بھی فراہم کردی جائے گی۔

جاوید کو بالکل یقین نہیں تھا کہ ایک معمولی سا واقعہ اس کی زندگی میں اتنی بڑی تبدیلی لانے کا باعث بن جائے گا مگر انور اور رقیہ کو اس مبارک خبر سے بے حد اور بے انتہا خوشی ہوئی تھی۔ ان

کے مشترکہ موقف کے سامنے جاوید کی کوئی دلیل کام نہ آئی اور اسے مٹھائی منگوانا..... بلکہ خود ہی جاکر لانا پڑی۔

○☆○

سیٹھ ہاشم بھائی اپنی ذات سے بڑے ہی نیک' شریف' مخلص اور ہمدرد انسان تھے۔ کپڑے کی مل انہیں اپنے والد سے ورثے میں ملی تھی۔ اب ان کی مل میں نہ صرف کپڑا بنایا جاتا تھا بلکہ بہترین معیار کا ہر قسم کا دھاگا اور ہوزری کے جملہ آئٹم بھی تیار ہوتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کپاس کی گانٹھوں کا سودا کرلیا کرتے تھے۔ کپاس کا گودام الگ تھا۔ اس سے بنائے ہوئے دھاگے کا گودام الگ تھا اور اسی طرح ہوزری کا اسٹور روم اور کپڑے کے مختلف اقسام کے اسٹور روم الگ تھے۔ گودام انچارج کو ان سب گوداموں کی خبرگیری کرنا پڑتی تھی۔ اگرچہ اس کام کے لیے گوداموں کے اپنے اپنے اسٹور کیپر بھی تھے لیکن وہ سب لوگ اپنا کام ٹھیک کررہے ہیں یا نہیں' آمدورفت کا حساب مناسب طور پر رکھا جارہا ہے یا نہیں' یہ دیکھنا گودام انچارج کی ڈیوٹی میں شامل تھا۔

سیٹھ صاحب کے والد کی وفات تک مل کی ملکیت میں کوئی اور شامل نہیں تھا لیکن چند برس کے بعد جب ہاشم صاحب مل میں نئی مشینیں لگا رہے تھے۔ ایک ایسا نازک وقت آیا کہ پچاس ہزار کی معمولی رقم کے لیے مل کا وجود خطرے میں پڑ گیا۔ تمام روپیہ اور لگا ہوا سرمایہ مختلف صورتوں میں جگہ جگہ پھنسا ہوا تھا۔ ہاشم صاحب بینک سے لون پہلے ہی لے چکے تھے۔ ایک بڑی پارٹی کو رقم کی بروقت ادائیگی کے لیے صرف پچاس ہزار کی ضرورت تھی اور ادائیگی میں صرف دو دن رہ گئے تھے۔ ایسے میں سیٹھ صاحب کے ایک دوست نادر خان نے بظاہر اپنا ذاتی مکان رہن رکھ کر انہیں پچاس ہزار روپے فراہم کیے تھے۔ برا وقت ٹل گیا' سیٹھ صاحب تباہی سے بچ گئے مگر وہ اپنے دوست کے احسان کو نہیں بھولے۔ انہوں نے حالات درست ہوتے ہی نادر خان کو اپنی مل میں دس فیصدی کا حصے دار بنالیا۔ یہ نادر خان کی پہلی کامیابی تھی۔ وہ سیٹھ صاحب کا قریبی دوست تھا۔ اس سے ان کے گھر یا کاروبار کے راز چھپے ہوئے نہیں تھے۔ اسے معلوم تھا کہ پچاس ہزار تو بہت ہی معمولی رقم ہے' ایک وقت آئے گا جب سیٹھ صاحب لاکھوں کروڑوں کے مالک بن جائیں گے۔ پچاس ہزار سے زیادہ رقم اس کے بینک بیلنس میں موجود تھی مگر اس نے اپنا گھر رہن رکھنے کا ڈراما کھیلا اور یوں مل میں ہاشم صاحب کا پارٹنر بن گیا۔

وہ جانتا تھا کہ سیٹھ ہاشم بھائی کی ایک ہی لڑکی ہے۔ دوسری اولادیں بھی ہوسکتی تھیں مگر بچی کی پیدائش کے سال بھر کے اندر ہی ہاشم صاحب کی بیوی تیسری منزل کی بالکنی میں کھڑی ہوئی تھیں کہ انہیں چکر سا آیا۔ انہوں نے دیوار کا سہارا لینے کی کوشش کی مگر بالکنی سے نیچے آگریں اور یوں ان کا انتقال ہوگیا۔ ہاشم صاحب چاہتے تو ایک سے ایک اچھی لڑکی سے شادی کرسکتے تھے لیکن اپنی بیوی کی محبت اور شہناز کے ساتھ پیار سے بھی بڑھی ہوئی شفقت میں انہوں نے ساری زندگی یوں ہی گزار دی۔ اس طرح گویا اب شہناز ان کی تمام دولت' مل اور جائیداد کی واحد وارث تھی۔

دوسری طرف نادر خان چار بچوں کا باپ تھا جن میں تین لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ اپنے بڑے بیٹے پرویز کو اس نے اسی خیال سے تعلیم و تربیت دینا شروع کی کہ وہ ایک نہ ایک دن شہناز کا شوہر گویا ہاشم صاحب کی تمام املاک کا مالک بنے گا مگر پرویز نے اپنی بے پروائی' آوارگی اور بدمعاش دوستوں کے ساتھ وقت کا بیشتر حصہ گزار کر اس کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا پھر بھی نادر خان نے کسی نہ کسی طرح مار پیٹ' رشوت اور سفارش سے اسے بی اے پاس کرا ہی لیا۔ اس کے بعد وہ پرویز کو ہاشم صاحب کے پاس لے گیا کہ اب اسے کسی قابل بنانا آپ کا کام ہے۔ سیٹھ صاحب نے اسے فی الحال اسسٹنٹ منیجر کی ملازمت دے دی جہاں پرویز دو سال تک کام کرتا رہا۔ اتفاق سے مل کے منیجر پر فالج کا دورہ پڑا اور وہ مل سے ریٹائرمنٹ لینے پر مجبور ہوگئے۔ نادر خان کی نگاہ میں یہ موقع خود قدرت نے فراہم کیا تھا۔ اسے کچھ کہنے سُننے کی ضرورت نہیں پڑی اور سیٹھ ہاشم نے پرویز کو مل کا جنرل منیجر بنا دیا۔ اب ظاہر ہے کہ انہیں کیا پتا تھا کہ اسسٹنٹ منیجری کے سلسلے میں بھی نادر خان' پرویز پر نگاہ نہ رکھتا اور اس کی رہنمائی نہ کرتا رہتا تو دو سال تو کجا' پرویز منیجری کی حیثیت سے دو ہفتے بھی نہیں گزار سکتا تھا۔

پرویز کو مل کا منیجر بنے چند ماہ گزرے تو نادر خان نے پہلی مرتبہ پرویز سے اپنے دل کی بات کہی کہ وہ اسے مل کا مالک دیکھنا چاہتا ہے مگر تب تک پرویز نے اپنے لیے ایک ایسی راہ کا انتخاب کرلیا تھا کہ اسے مل کی منیجری یا ملکیت سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ یہ دوسری بات تھی کہ اگر مل اس کے ہاتھ آجاتی تو وہ زیادہ اطمینان سے اور زیادہ وسیع پیمانے پر اپنا کام کرسکتا تھا۔ چنانچہ اس نے والد کے مشورے کو بظاہر قبول کرلیا اور شہناز سے میل ملاقات بڑھانے اور اسے بقول نادر خان کے شیشے میں اُتارنے کی کوشش کرنے لگا مگر شہناز کچھ دوسرے ہی مزاج کی لڑکی تھی' اس نے شروع میں تو پرویز کی چھچھوری حرکتیں برداشت کرلیں مگر ایک دن اسے اچھی طرح ڈانٹ دیا کہ اگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا تو وہ اس سے ملنا تو کیا' بات کرنا بھی پسند نہیں کرے گی۔ چنانچہ پرویز نے نادر خان سے کہہ دیا کہ اگر وہ اپنے طور پر کچھ کرسکتے ہیں تو ضرور کریں کیونکہ وہ شہناز کو نہیں جیت سکتا۔

اتفاق سے یہ وہی دور تھا جب شہناز کی سفارش پر سیٹھ صاحب نے جاوید کو گوداموں کا انچارج بنایا تھا۔ جاوید نے یونہی شک کی بنا پر روئی کی ایک گانٹھ کا وزن کرایا اور اسے گانٹھ کے مقررہ وزن سے پانچ کلو کم پایا۔ اس نے کچھ دوسری گانٹھیں تلوائیں اور وہ بھی سب کی سب وزن میں پانچ کلو کم تھیں۔ گودام کیپر کا چہرہ سفید پڑ گیا مگر جاوید نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔

اگلے ہفتے پھر نیا مال آیا تو جاوید نے خود اپنی موجودگی میں گانٹھیں وزن کرائیں اور وہ سب وزن میں پوری تھیں۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ گانٹھیں وزن سے پوری روانہ کی جاتی تھیں مگر مِل میں آنے کے بعد ان کے ساتھ کوئی ایسی کارروائی کی جاتی تھی کہ وزن پانچ کلو کم ہوجاتا تھا۔

جاوید نے تب بھی گودام کیپر سے کچھ نہیں کہا اور نہ ہی کسی اور سے تذکرہ کیا مگر اتنا وہ سمجھ چکا تھا کہ مِل کے گودام میں گانٹھوں کو کھول کر اس میں سے کوئی ایسی چیز نکال لی جاتی ہے جس کا وزن پانچ کلو کے لگ بھگ ہوتا ہے۔ جس دن مال آیا تھا اس شام جاوید اپنے گھر نہیں گیا اور اپنے آفس کے باتھ روم میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ رات کے تقریباً بارہ بجے روئی کے گودام میں نقل و حرکت کی آوازیں سُنائی دیں۔ جاوید خاموشی سے اپنے کمرے سے باہر آیا' گودام تک گیا اور تب وہاں اس نے ایک ایسا منظر دیکھا جس کی اسے بالکل توقع نہیں تھی۔ روئی کی ہر گانٹھ کھول کر اس میں چھپی ہوئی چرس نکالنے کے بعد گانٹھوں کو دوبارہ پہلے کی طرح بند کیا جارہا تھا۔ اور یہ کام پرویز' گودام کیپر اور رات کے دو چوکیداروں کی مدد سے کیا جارہا تھا۔

جاوید کو تصویریں اُتارنے اور آوازیں ٹیپ کرنے کا خیال بھی آیا تھا مگر رات میں بغیر فلیش کے فوٹو اُتارنا ممکن نہیں تھا اور وقت کی کمی کی وجہ سے وہ کسی اچھے' طاقتور کیسٹ ریکارڈر کا انتظام نہیں کرسکا۔ پھر فلیش بلب کی موجودگی کا مطلب دشمن کو اپنی موجودگی سے آگاہ کرنا تھا لیکن گودام میں جس تیز روشنی میں کام کیا جارہا تھا اس میں جاوید کو یقین تھا کہ بغیر فلیش کے بھی فوٹو صاف اور روشن آسکتے تھے۔ اسے کیمرا ساتھ نہ لانے کا افسوس ہوا مگر اندازہ یہ تھا کہ تمام ثبوت کم سے کم دو مرتبہ کی کوشش میں ہاتھ آئیں گے اس لیے کیمرا ساتھ لانے کا ارادہ جاوید نے آئندہ پر چھوڑ دیا۔

کچھ دیر کے بعد دو اجنبی بھی آگئے جنہیں جاوید بالکل نہیں جانتا تھا اور نہ انہیں پہلے کبھی دیکھا تھا۔ پرویز کی اور ان اجنبیوں کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ چرس کے گاہک تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ آئندہ ہفتے روئی کی گانٹھوں کی ایک بڑی تعداد اور آرہی تھی اور اس رات تقریباً سو کلو چرس ان اجنبیوں کے سپرد کی جائے گی اور اس کے بعد کچھ اگلا پچھلا حساب ملا کر ایک کروڑ روپے پرویز کو دیے جائیں گے۔ یہ گویا جاوید کے لیے دشمن کو گرفتار کرانے کا بہترین موقع تھا۔

○☆○

عنقریب ایک کروڑ ملنے کی خوشی نے پرویز اور نادر کو خوشی کے مارے جامے سے باہر کردیا تھا۔ یہ غالباً پہلا موقع تھا کہ ان کے قبضے میں اتنی بڑی رقم آرہی تھی۔ نادر خان تو پھر بھی اپنے حواس میں تھا مگر پرویز بالکل ہی مدہوش ہوگیا۔ اس نے اپنے باپ پر زور دیا کہ وہ سیٹھ صاحب سے اس کی اور شہناز کی شادی کی بات کرے اور

ایک دن مناسب موقع دیکھ کر نادر خان نے بات چھیڑ دی۔ پرویز نے مِل کی حد تک خود کو بہت سنبھالے رکھا تھا اس لیے سیٹھ صاحب اس کے بارے میں صرف اتنا ہی جانتے تھے جتنا اور جیسا وہ مِل میں نظر آتا تھا۔ انہوں نے اس رشتے کی بات کو بہت سنجیدگی سے لیا۔ ان کے خیال میں یہ دوستی کے رشتے کو مزید مستحکم کرنے کی بات ہی نہیں تھی بلکہ گھر کی دولت گھر میں رہنے کا مسئلہ بھی تھا۔ وہ نادر کے احسان کو بھولے نہیں تھے۔ نادر نے بھی اپنی چکنی چپڑی باتوں سے انہیں ضرورت سے زیادہ متاثر کر رکھا تھا۔

"میرے خیال سے اس رشتے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔" انہوں نے نادر خان کو جواب دیا۔ بلکہ یہ کئی اعتبار سے بہتر ہی ثابت ہوگا مگر تم جانتے ہو کہ میں نے بچپن سے آج تک کوئی بات شہناز کی مرضی کے خلاف نہیں کی۔ میں اس سے پوچھوں گا' اگر اسے کوئی اعتراض نہیں ہوا تو مجھے یہ رشتہ بڑی خوشی سے منظور ہوگا۔"

"آپ بھی کیا باتیں کرتے ہیں بھائی صاحب۔" نادر خان نے کہا۔ "شادی بیاہ کے معاملات بڑے ہی طے کرتے چلے آئے ہیں۔ شہناز کو آپ کی پسند سے انکار کیسے ہوسکتا ہے۔"

"پھر بھی اس سے پوچھ لینے میں کیا مضائقہ ہے۔" سیٹھ صاحب نے جواب دیا۔ نادر خان کو خاموش ہونا پڑا۔

دوسرے دن موقع پاکر سیٹھ صاحب نے بات چھیڑی تو شہناز نے چند لمحے کی خاموشی کے بعد جواب دیا۔

"یہ آپ کا حکم ہے یا میں اسے آپ کا مشورہ سمجھوں؟"

"یہ میرا حکم نہیں ہے' میں تم سے اس رشتے کے بارے میں مشورہ کررہا ہوں۔"

"تب مجھے اس رشتے سے انکار ہے۔" شہناز نے کہا۔ "اب آپ مجھ سے اس کی وجہ نہ پوچھئے گا۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کی وجہ بیان کرنا مشکل ہوتا ہے۔ میں صرف اتنا کہہ سکتی ہوں کہ مجھے پرویز سے شدید نفرت ہے۔ میں مرجانا پسند کروں گی مگر اس سے شادی کا تصور بھی میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔"

"بس زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے' میں تمہارا مقصد سمجھ گیا۔ مجھے خوشی ہے کہ تمہاری مرضی جانے بغیر میں نے اس رشتے کا فیصلہ نہیں کیا۔"

نادر خان نتیجہ جاننے کے لیے بے تاب تھا۔ اس نے دو چار دن کا وقفہ دے کر پھر بات چھیڑی۔

"مجھے افسوس ہے نادر بھائی' یہ رشتہ نہیں ہوسکتا۔" سیٹھ صاحب نے جواب دیا۔

"کیوں' کیا شہناز نے انکار کردیا؟"

"ہاں۔"

"آپ نے اسے سمجھانے کی کوشش نہیں کی؟"

"صاف بات یہ ہے نادر بھائی کہ جو لڑکی جواب میں یہ کہے کہ

وہ یہ رشتہ کرنے سے مرجانا پسند کرے گی' اسے کوئی کیا سمجھا سکتا ہے۔ تم اس خیال کو دل سے نکال دو۔ یہ ہی بہتر ہے۔"

یہ بات پرویز تک پہنچی تو وہ تلملا کر رہ گیا۔

"آپ نے اپنی سی کوشش کرلی' اب آپ مجھے اپنی کوشش کرنے دیں۔ شہناز کو اس رشتے پر آمادہ ہونا ہی پڑے گا۔" اس نے کہا۔

نادر خان نے بہت کوشش کی مگر پرویز نے کھل کر بات نہیں کی۔ بس اتنا کہا کہ جو کچھ ہوگا آپ کے سامنے آجائے گا۔ اس بات کو تین دن گزر گئے۔ ایک سہ پہر سیٹھ صاحب مل سے واپس گھر جارہے تھے کہ راستے میں ایک کار ان کی کار کے سامنے آگئی۔ ڈرائیور کو مجبوراً گاڑی روکنا پڑی۔ گاڑی رکتے ہی سامنے والی کار سے تین آدمی اُترے جنہوں نے اپنے چہرے رومالوں سے چھپا رکھے تھے۔ انہوں نے زبردستی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور سیٹھ کو ریوالور کے زور پر اپنی کار سے اتر کر دوسری گاڑی میں بیٹھنے پر مجبور کردیا۔ سیٹھ صاحب کے اندر بیٹھتے ہی وہ کار تیزی سے واپس مڑی اور علاقے کے مل ایریا کی جانب تیزی سے غائب ہوگئی۔

○☆○

سیٹھ صاحب رات کے آٹھ بجے تک نہیں پہنچے تو شہناز پریشان ہوگئی۔ وہ کبھی اتنی دیر تک گھر سے باہر نہیں رہے تھے۔ اس نے ان کے تمام دوستوں اور جاننے والوں کو فون کیا مگر ہر جگہ سے یہ ہی جواب ملا کہ سیٹھ صاحب وہاں نہیں ہیں۔ ابھی وہ فون کر ہی رہی تھی کہ ایک فون کال آئی۔ اس نے ریسیور اُٹھایا۔

"ہیلو۔ یہ سیٹھ ہاشم بھائی کا گھر ہے؟"

"ہاں۔ کیوں' کیا بات ہے؟"

"سیٹھ صاحب خیریت سے ہمارے پاس ہیں اور انہیں ٹھیک دس بجے رہا کردیا جائے گا۔"

"کون ہو تم اور اس کارروائی سے تمہارا کیا مقصد ہے؟"

"صرف یہ ثابت کرنا کہ ہم جو کہتے ہیں اس پر عمل کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔" دوسری طرف سے جواب ملا۔ "سیٹھ صاحب کو اغوا کیا جاسکتا ہے تو انہیں قتل بھی کیا جاسکتا ہے۔"

"مگر کیوں؟" شہناز نے پوچھا۔

"کیا آپ سیٹھ صاحب کی صاحبزادی شہناز بات کررہی ہیں؟"

"ہاں۔"

"تب سب کچھ آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔" جواب میں کہا گیا۔ "اگر آپ نے پرویز سے شادی نہیں کی تو سیٹھ صاحب کو موت کی نیند سُلا دیا جائے گا۔"

اور اس کے ساتھ ہی ریسیور خاموش ہوگیا۔

○☆○

سیٹھ صاحب وعدے کے مطابق رات کے دس بجے بنگلے پر پہنچ گئے مگر وہ کچھ بتانے سے قاصر تھے کیونکہ اغوا کرنے کے بعد سے رہائی تک ان کے منہ اور آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی۔ شہناز نے اتنی عقلمندی کی کہ اس پُراسرار فون کال کا کوئی ذکر نہیں کیا اور سیٹھ صاحب کے لیے یہ مسئلہ ایک اُلجھن ہی بنا رہا کہ انہیں کیوں اغوا کیا گیا تھا اور پھر بعد میں چھوڑ کیوں دیا گیا۔

شہناز کبھی کبھی مل بھی چلی جاتی تھی اور اس کا وہاں جانا محض تفریحاً نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ مل کے تمام شعبوں میں تازہ ترین معلومات جاننے کی کوشش کرتی تھی۔ وہ سیٹھ صاحب سے مل کر گئی باتوں پر گفتگو بھی کرتی رہتی تھی۔ اپنے اس طرح کے دوروں میں وہ مختلف شعبوں کے ذمے داروں سے مل کر ان سے بھی بحث کرتی تھی۔ چنانچہ اگلے دن شہناز مل میں دو چار شعبوں کا جائزہ لینے کے بعد جاوید کے آفس گئی تو اس میں کسی کو کوئی انوکھی بات نظر نہیں آئی اور یہی اس کا مقصد بھی تھا۔

وہ جاوید کے دفتر میں داخل ہوئی تو جاوید نے پہلی نظر میں ہی اندازہ کرلیا کہ کوئی اُلجھن شہناز کو پریشان کررہی ہے اور وہ اس سے کوئی خاص بات کرنے آئی ہے۔

"میں آج آپ سے ایک اہم مسئلے کے بارے میں مشورہ کرنا چاہتی ہوں۔" شہناز نے بغیر کوئی تمہید اُٹھائے کہا۔

"میرا بھی یہ ہی اندازہ تھا۔" جاوید نے جواب دیا۔ "فرمایئے' میں پوری توجہ سے سُن رہا ہوں۔"

"یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ یہ گفتگو صرف میرے اور آپ کے درمیان رہے گی۔"

"بلاشبہ۔ آپ مجھ پر پورا اعتماد کرسکتی ہیں۔"

"ہمارے منیجر پرویز کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

"یہ آپ مجھ سے نہ پوچھیں تو بہتر ہے۔" جاوید نے جواب دیا۔ "جھوٹ بولنے کی مجھے عادت نہیں اور سچ سننا شاید آپ کو پسند نہ آئے۔"

"مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔" شہناز نے کہا "اب میں زیادہ اطمینان سے بات کرسکوں گی۔"

اس کے بعد شہناز نے ذرا تفصیل سے اپنے والد اور نادر خان کے تعلقات کا پس منظر اور حال بیان کیا اور بالآخر شادی کے پیام پر بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ نادر صاحب اور پرویز ڈیڈی کو اپنا شکار بنا کر مل اور جائیداد پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ میں ان کے خلاف محض شکوک و شبہات کے علاوہ کوئی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کرسکتی۔"

"میں شاید اس سلسلے میں آپ کی کچھ مدد کرسکتا ہوں مگر سردست خاموش رہنا بہتر سمجھتا ہوں۔ آپ مجھے دو تین دن کی مہلت دیں پھر بہت کچھ آپ کو معلوم ہوجائے گا۔"

"یہ کہہ کر تو آپ نے مجھے تجسس میں مبتلا کردیا۔" شہناز نے

دلچسپی سے کہا۔ "کیا اشارتاً بھی نہیں بتا سکتے۔"

"آپ اصرار نہ کریں۔ آپ کو تین دن سے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔"

"چلئے میں اصرار نہیں کرتی۔" شہناز نے ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا۔ "لیکن کیا آپ کے خیال میں اپنے شکوک و شبہات کی رپورٹ پولیس میں دینا بھی مناسب نہ ہوگا؟"

"میرے ایک دوست پولیس میں انسپکٹر ہیں۔" جاوید نے بتایا۔ "میں ان سے پہلے ہی یہ ذکر کر چکا ہوں اور انہوں نے ہر طرح سے مدد کرنے کا وعدہ کیا ہے۔"

"خدا کرے آپ لوگوں کا منصوبہ کامیاب ہو اور ان باپ بیٹوں سے ہمارا پیچھا چھوٹ جائے۔"

"اُمید رکھیں' خدا نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا۔" جاوید نے جواب دیا۔

○☆○

جمعرات کی رات وہ رات تھی جبکہ پرویز نے نیا مال آنے' خریداروں کی آمد اور مال کی فروخت کا ذکر کیا تھا۔ انسپکٹر رشید' جاوید کا دوست تھا اور دونوں دوستوں نے ایسی پلاننگ کی تھی کہ پرویز اور اس کے ساتھیوں کو ایک ساتھ گرفتار کیا جاسکے۔ رشید نے کانسٹیبلوں کی ایک بڑی تعداد ورکرز کے بھیس میں روئی کے گودام اور آس پاس کے مقامات پر پوشیدہ کردی تھی۔

پرویز کے پروگرام کے مطابق ٹھیک دس بجے رات کو دو ٹرک مِل میں داخل ہوئے۔ اسی دن روئی کا تازہ اسٹاک بھی آیا تھا جس میں حسبِ معمول روئی کی ہر گانٹھ سے چرس نکال کر گانٹھوں کو دوبارہ بند کیا جارہا تھا۔ اسی کے ساتھ چرس کا تازہ اور پرانا اسٹاک گانٹھوں کی صورت میں پیک کیا جارہا تھا۔ ساڑھے گیارہ بجے تک سارا کام مکمل ہوگیا۔ پرویز کے جن دو ساتھیوں کو جاوید نہیں پہچان سکا تھا' انہیں انسپکٹر رشید نے ایک ہی نظر میں پہچان لیا۔ وہ مشہور اسمگلر مختار اور اس کا ساتھی اختر تھا۔

"لو' تمام مال لوڈ ہوگیا۔" پرویز نے مختار سے کہا۔ "اب رقم دا کرو اور مال لے جاؤ۔"

اس دوران انسپکٹر رشید موقع کے فوٹو لینے کے ساتھ ساتھ ضروری گفتگو بھی ریکارڈ کرتا رہا تھا۔

"ہاں کیوں نہیں۔" مختار نے جواب دیا اور ایک بڑا سا سوٹ کیس پرویز کی طرف بڑھا دیا۔ ٹھیک اسی لمحے انسپکٹر رشید کی آواز گونجی۔

"اپنے آپ کو پولیس کے سپرد کردو مختار۔ تم سب لوگ گزشتہ ڈیڑھ گھنٹے سے پولیس کی نظروں میں ہو اور تمہاری ایک ایک حرکت کے فوٹو اور تمام اہم گفتگو ریکارڈ کرلی گئی ہے۔ تم لوگ ہر طرف سے محاصرے میں ہو اور یہاں ہی نہیں بلکہ مِل کے باہر تک پولیس موجود ہے۔"

مختار نے اس کا جواب فائرنگ سے دیا۔ تقریباً پندرہ منٹ تک دونوں طرف سے فائرنگ ہوتی رہی مگر مختار اور اس کے ساتھی ہر طرف سے پولیس کی زد میں تھے۔ چار پانچ لاشیں گرتے ہی مختار نے سمجھ لیا کہ وہ بازی ہار چکا ہے۔ اس نے پرویز سمیت خود کو پولیس کے حوالے کردیا۔

جاوید نے فون کرکے سیٹھ صاحب کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ فوراً موقع پر پہنچ گئے۔ ساتھ ہی پولیس نے نادر خان کو بھی اس کے گھر سے حراست میں لے لیا۔ مِل کے اندر سیٹھ صاحب اور نادر خان کا آمنا سامنا ہوا تو نادر نے کہا۔

"تم بہت خوش قسمت ہو سیٹھ ہاشم ورنہ آج تک میں نے جس شکار پر ہاتھ ڈالا' اسے قبضے میں لاکر ہی چھوڑا۔"

"سردست تو تم اپنے انجام کی فکر کرو۔" سیٹھ ہاشم نے جواب دیا۔ "پھر یہ بھی غور کرلینا کہ مارنے والے سے بچانے والا بہت بڑا ہوتا ہے۔ شاید اب تمہارے گناہوں کا پیمانہ اتنا بھر چکا تھا کہ چھلک ہی پڑا۔"

"کوئی بات نہیں سیٹھ ہاشم! تمہاری تباہی ایک نہ ایک دن میرے ہی ہاتھوں سے آئے گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

"اور میں پھر یہی قول دُہراؤں گا کہ مارنے والے سے بچانے والا بڑا قوی اور طاقت ور ہے۔" سیٹھ ہاشم نے جواب دیا۔

○☆○

دوسرے دن مِل کے اندر ہی نہیں بلکہ باہر پورے شہر میں اس واقعے کا چرچا خاص طور پر اس لیے تھا کہ پولیس ایک مدت سے مختار پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش میں تھی مگر اسے کوئی ثبوت نہیں مل رہا تھا جبکہ اس مرتبہ نہ صرف تصاویر بلکہ گفتگو کے کیسٹ بھی پولیس کے پاس موجود تھے۔ پولیس کو یقین تھا کہ مختار' نادر' پرویز اور اس کے ساتھیوں کو عمر قید سے کم کی سزا ہو ہی نہیں سکتی۔

دوسری طرف سیٹھ ہاشم اور شہناز بہت خوش تھے' نہ صرف اس لیے کہ ان کے مِل کی آڑ میں کی جانے والی اسمگلنگ کا راز فاش ہوگیا تھا' ان کے مِل کو لاکھوں روپے کے نقصان سے بھی بچا لیا گیا تھا بلکہ آستین میں چھپے دو سانپ بھی پکڑ لیے گئے تھے جو کسی بھی لمحے انہیں ذلت و بدنامی کے علاوہ فقر و فاقہ کشی سے دوچار کرسکتے تھے۔ سیٹھ ہاشم' جاوید سے بہت خوش تھے۔ اسے دوسرے ہی دن مِل کا جنرل منیجر بنا دیا گیا تھا۔

اور جب معاملہ کچھ ٹھنڈا پڑا تو جاوید کی والدہ اپنے بیٹے کے لیے شہناز کا رشتہ لے کر سیٹھ ہاشم کے گھر پہنچیں۔ دونوں طرف کے بزرگوں کو یہ علم ہوگیا تھا کہ شہناز اور جاوید ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ رشتہ منظور کرلیا گیا اور صرف ایک ماہ کے بعد جاوید اور شہناز دائمی رفاقت کے رشتے میں منسلک ہوگئے۔

**

جاسوسی ڈائجسٹ : اپریل 1994

ناول سکینیگ و کلیت

محمد سجاد بھٹی

03045503086

خصوصی تعاون: جاسوسی نشت ایڈمن

ڈاکٹر حامد حسن۔ساگرزمان۔عقیل قریشی۔ ممتاز علی کیانی۔سیف الملوک عباسی۔ یاسر حسنین۔ناصر محمود بلوچ۔محمد نعمان&صائم بھائی

اردو ادب کے سب رنگ۔ادبی محفل۔قدیمی جاسوسی دنیا۔اولڈ سپاہی ناول..... فینز گروپ



زہرِ مکر

نجمہ مودی

ایک شخص کو ہلاک کرنے والے دو دعوے داروں کا ماجرا۔ وہ دونوں اپنے جُرم کا اقرار کر رہے تھے۔ ساتھ ہی دوسرے کو بچانے کی کوشش بھی۔ ایک پولیس آفیسر اس صورتِ حال سے بہت پریشان تھا لیکن اس کا مددگار لیبارٹری انچارج محظوظ ہو رہا تھا۔

دلچسپ اور حیران کن انجام کی کہانی، ایک مسکراتی ہوئی تحریر

پولیس کے سراغ رساں کیپٹن ایلسن کے ڈربا نما آفس میں داخل ہونے والے بیشتر لوگ مضطرب اور بدحواس ہی نظر آتے تھے۔ ان میں ٹھگ، لٹیرے، قاتل وغیرہ بھی ہوتے تھے اور مختلف جرائم یا زیادتیوں کا شکار ہونے والے فریادی بھی۔

مجرم تو غالباً اپنے انجام کے تصور سے مضطرب اور بدحواس ہوتے تھے اور شرفا شاید اس تصور سے پریشان ہوتے تھے کہ ان کے ساتھ جو زیادتی ہو چکی تھی، پولیس اس کی تلافی بھی کرے گی یا محض بال کی کھال ہی اتارتی رہے گی اور سوالات کی بوچھار سے انہیں مزید پریشان کرے گی؟

اس وقت دُبلا پتلا سا جو نوجوان کیپٹن ایلسن کے مقابل بیٹھا تھا، اس کی پریشانی اور اضطراب کچھ زیادہ ہی نمایاں نظر آ رہا تھا۔ اس نے سگریٹ سلگانے کی کوشش کی تو اس کی لمبی مخروطی انگلیاں

یوں کانپ رہی تھیں جیسے وہ کسی گاڑی میں بیٹھا ہو جس کا انجن زبردست تھرتھراہٹ پیدا کررہا ہو۔

اس کی جلائی ہوئی دیا سلائی بجھ چکی تو وہ مرتعش آواز میں بولا۔ ”کیپٹن! مجھے معلوم ہے، کسی بھی کیس کو ہاتھ میں لیتے وقت تم جو طرزِ عمل اختیار کرو اس سے بڑا فرق پڑ سکتا ہے۔ تم چاہو تو کسی کیس کو زیادہ شہرت نہ ملے اور اس میں ملوث لوگ بھی رسوائی سے بچ جائیں۔ اس طرح کسی کی زندگی تباہ ہونے سے بچ سکتی ہے۔“

اس کے الفاظ بُردبارانہ لیکن اس کا انداز کچھ عجیب اور مشکوک سا تھا۔ وہ کرسی پر اکڑا ہوا سا بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور ہونٹ خاموشی کے عالم میں یوں بھنچ جاتے تھے کہ ان کی جگہ محض ایک لکیر سی نظر آنے لگتی تھی۔ ہر مرتبہ بات کرنے کے بعد وہ اسی طرح ہونٹ بھینچ لیتا تھا۔ کیپٹن ایلسن کو شبہ تھا کہ شاید اس طرح وہ اپنے ہونٹوں کی کپکپاہٹ چھپانے کی کوشش کررہا تھا۔

”شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو برخوردار!“ کیپٹن ایلسن بولا۔ ”لیکن پہلے پتا تو چلے کہ تم چاہتے کیا ہو؟ معاملہ کیا ہے؟“

”میں... میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اس معاملے کی زیادہ شہرت نہ ہو۔ میں اس سلسلے میں کوئی یقین دہانی حاصل کرنا چاہتا تھا۔“ نوجوان التجائیہ سے لہجے میں بولا۔

”جب تک مجھے اصل بات ہی معلوم نہ ہو، میں کوئی وعدہ کیسے کرسکتا ہوں۔“ کیپٹن ایلسن قدرے بیزاری سے بولا ”مسئلہ کیا ہے؟“

نوجوان نے گہری سانس لے کر گویا اپنی جرأت مجتمع کی اور سر جھکاتے ہوئے بولا۔ ”میں نے ایک شخص کو ہلاک کردیا ہے۔“

ایلسن نے ہنکارا بھرا۔ اس کے چہرے پر حیرت یا تشویش کے آثار نمودار نہیں ہوئے تھے۔ وہ کچھ اسی طرح اطمینان و سکون سے بیٹھا رہا۔ گویا یہ اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی اور لوگ صبح شام کثیر تعداد میں اس کے سامنے آکر اپنے قاتل ہونے کا اعتراف کرتے رہتے تھے۔

”اچھا... تو تم نے ایک شخص کو ہلاک کردیا... کیا واقعی؟“ کیپٹن غرایا۔ ”اور تمہارا خیال ہے کہ میں تمہیں اس مصیبت سے نکال سکتا ہوں؟ سزا سے بچا سکتا ہوں؟“

”نہیں... نہیں... میرا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے۔“ نوجوان جلدی سے بولا ”میں یہ ساری تمہید سزا سے بچنے کے لیے نہیں باندھ رہا۔ میں سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ مجھے جو بھی سزا ملنی ہو، جلد از جلد اور خاموشی سے مل جائے...“ وہ اب بری طرح ہانپنے لگا تھا۔ شاید اس کے اعصاب جواب دے رہے تھے یا وہ گھبراہٹ کی اداکاری کررہا تھا۔

کیپٹن ایلسن نے اس موقع پر تھوڑے سے غصے کا اظہار مناسب سمجھا۔ وہ ذرا سخت لہجے میں بولا۔ ”نوجوان! اگر تم مجھ سے مذاق کرنے کی کوشش کررہے ہو تو کان کھول کر سن لو...“

نوجوان کو گویا جھٹکا لگا۔ وہ یکدم آگے کو جھکتے ہوئے اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا ”تم اسے مذاق سمجھ رہے ہو؟ میں نے واقعی ایک شخص کو قتل کردیا ہے۔ قتل بھی اچانک نہیں کیا۔ میں نے ہفتوں اس قتل کی منصوبہ بندی کی تھی۔ یہ ایک انوکھا قتل تھا۔ میں نے ایک خاص قسم کے زہر سے اس شخص کو ہلاک کیا ہے اور میں اس لیے خود ہی اعترافِ جرم کرنے آگیا ہوں کہ میں نے سنا ہے جو شخص اس طرح اپنے جرم کا اقرار کرلیتا ہے اور قانون کے لیے پریشانیاں کھڑی نہیں کرتا اس کے ساتھ نرمی برتی جاتی ہے۔ میں مرنا نہیں چاہتا اور نہ ہی اپنی باقی عمر جیل میں گزارنا چاہتا ہوں کیونکہ میں نے جس شخص کو ہلاک کیا ہے وہ انسان نہیں، سانپ تھا... سانپ...“

تیزی سے یہ سب کچھ کہہ ڈالنے کے بعد نوجوان ایک بار پھر ہانپنے لگا۔ اس نے تھکے تھکے سے انداز میں کرسی کے پشتے سے ٹیک لگالیا اور بے بسی سے ایلسن کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہوچکے تھے۔ کیپٹن ایلسن روزانہ ایسے لوگوں کو دیکھنے کا عادی تھا جو جذباتی دباؤ اور اعصابی کشیدگی کا شکار ہوتے تھے لیکن اس نوجوان کی کیفیت سے کسی اور بات کا بھی اظہار ہورہا تھا جو ایلسن کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

”مجھے شروع سے سب کچھ بتاؤ...“ بالآخر ایلسن نے گہری سانس لے کر کہا ”یہ انسان نما سانپ یا سانپ نما انسان کون تھا جسے تم نے ہلاک کیا ہے؟“

”ڈاکٹر سائرس۔“ نوجوان نے جواب دیا۔

کیپٹن ایلسن نے بے اختیار تیز سیٹی بجائی جو کمرے میں گونج کر رہ گئی۔ ”ڈاکٹر سائرس...؟“ اس نے دُہرایا ”وہی ڈاکٹر سائرس جو ہمارے محکمے کے پینل پر بھی ہے؟ جس کی خدمات سے کبھی کبھار ہم بھی استفادہ کرتے رہے ہیں؟ وہی جو زہروں کا ماہر تھا؟“

”ہاں وہی ڈاکٹر سائرس۔“ نوجوان نے اثبات میں سرہلایا۔ ”وہ غالباً ملک کا بہترین ریسرچ کیمسٹ تھا۔ ایک بے مثل ماہرِ کیمیا... زہروں کا خصوصی ماہر... میں اس کا اسسٹنٹ ہوں۔ ڈاکٹر رائے۔“

اپنا تعارف کراتے وقت اس کے لہجے میں فخر سا جھلک آیا۔ ایلسن کو اس کی بات کا یقین نہیں آیا تھا کہ اس نے زہروں کے بارے میں ملک بھر میں سب سے زیادہ قابلیت رکھنے والے ماہر کیمیا دان کو زہر دے کر ہلاک کردیا تھا۔ تاہم اسے امید تھی کہ نوجوان جلد ہی حقیقت اُگل دے گا۔

”تم اپنی بات جاری رکھو۔“ ایلسن بہ آواز بلند بولا۔

”بات بس اتنی ہی ہے۔“ ڈاکٹر رائے سادگی سے بولا ”میں نے اسے ہلاک کردیا۔“

”کس لیے؟“ ایلسن نے دریافت کیا۔

”کیا یہ بتانا بھی ضروری ہے؟“

ایلسن نے غصے سے میز پر زوردار گھونسا رسید کیا اور چلایا۔ ”نہیں .... نہیں۔ ہرگز ضروری نہیں۔ تم مرضی کے مالک ہو۔ جو تمہارا جی چاہے بتاؤ‘ جو نہ جی چاہے وہ نہ بتاؤ۔ ہمارے لیے تو یہی اعزاز کافی ہے کہ تم نے یہاں تشریف لاکر فخریہ انداز میں اعلان کر دیا ہے کہ تم نے شہر کے ایک معروف ڈاکٹر کو ہلاک کر دیا ہے لیکن بدقسمتی سے ہماری معلومات کے مطابق ڈاکٹر سائرس زندہ ہے۔ ابھی ایک گھنٹا پہلے ایک سرکاری کام کے سلسلے میں وہ یہیں موجود تھا اور مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔ تم کیا سوچ کر یہ بکواس کر رہے ہو کہ تم نے اسے ہلاک کر دیا ہے؟“

”میں سچ کہہ رہا ہوں وہ مر چکا ہے۔“ رائے احتجاجی سے لہجے میں بولا۔ ”میں جھوٹ نہیں بول رہا۔“

”اچھا .... ٹھیک ہے۔“ ایلسن غصیلے لہجے میں بولا۔ ”تمہیں اصرار ہے کہ تم نے ڈاکٹر سائرس کو زہر دے کر ہلاک کر دیا ہے اور تم بے قرار ہو کہ ہم تمہیں اس جرم میں جیل میں ڈال دیں۔ کوئی بات نہیں۔ ہم ابھی حقیقت معلوم کر لیتے ہیں۔“

وہ اچھل کر اپنی کرسی سے اٹھا اور میز کے گرد گھوم کر دروازے تک پہنچا۔ ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر اس نے باہر جھانکا اور بہ آوازِ بلند کسی کو مخاطب کیا۔ ”لیبارٹری فون کرو اور نیلسن سے کہو جلدی یہاں آجائے۔ اس سے کہنا اپنا بیگ بھی لیتا آئے۔“ وہ جس سے بات کر رہا تھا‘ رائے اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

دروازہ بند کر کے وہ اسی سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور استہزائیہ سی نظروں سے رائے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”اچھا.... تو تم نے زہروں کے ماہر کو زہر دے کر ہلاک کر دیا؟“

اچانک دروازہ زور سے کھلا اور دھکا لگنے کے باعث ایلسن اپنی میز تک پہنچ گیا۔ اس نے دروازہ کھولنے والے کو زیرِلب کوسا اور پلٹ کر دیکھا۔ دروازے پر سنہرے بالوں والا دیوقامت نیلسن کھڑا تھا۔ ایک سیاہ مستطیل چرمی بیگ اس کے ہاتھ میں تھا۔

”معاف کرنا کیپٹن! مجھے معلوم نہیں تھا تم دروازے سے لگے کھڑے ہو۔“ نیلسن مسکراتے ہوئے بولا۔

اس کی صورت دیکھ کر ایلسن گویا اپنی برہمی بھول گیا اور جلدی سے بولا۔ ”اچھا ہوا تم خود ہی آگئے۔ میں ابھی تمہیں ہی فون کرا رہا تھا۔“

رائے بھی یقیناً نیلسن کو پہچانتا تھا۔ اسے دیکھ کر رائے کا چہرہ کھل اٹھا۔ ”نیلسن! اچھا ہوا یہاں تم سے ملاقات ہو گئی۔ تمہیں میری مدد کرنا ہو گی۔“

”ضرور۔ ضرور۔“ دیوقامت نیلسن خوش خلقی سے مسکرایا۔ ”میں جو بھی کر سکا ضرور کروں گا لیکن یاد رہے‘ میں یہاں صرف لیبارٹری ٹیکنیشن ہوں۔ میں اسی شعبے میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں لیکن اگر تم نے تیز رفتاری کے باعث اپنا چالان کروا لیا ہے یا ایسا ہی کوئی اور چکر ہے تو.....“

جیل کے قیدیوں کو تفریح بہم پہنچانے اور ان کو انسان ہونے کا یقین دلانے کے لئے انگلستان کے جیل حکام نے تجربہ کیا کہ وہ تقریباً سو قیدیوں کو ایک کرکٹ میچ دکھانے کے لئے لے گئے۔ شام کو جب قیدیوں سے ان کے تاثرات معلوم کئے گئے تو سب نے یک زبان ہو کر فیصلہ دیا۔

”اچھا... تو یہ تفریح تھی۔ ہم تو اسے اپنی سزا کا حصہ سمجھ کر دیکھتے رہے۔“

امجد اسلام امجد کے مضمون
”کرکٹ کی باتیں“ سے ایک اقتباس

”میں نے ڈاکٹر سائرس کو قتل کر دیا ہے۔“ رائے تیزی سے بولا۔ ”نینا کی وجہ سے میں اسے ہلاک کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ یقین کرو میں سچ کہہ رہا ہوں۔“

نیلسن چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولا ”کیا اس کمرے پر پاگل خانے کے اثرات آگئے ہیں؟“

”تم ٹھیک سمجھے ہو۔“ ایلسن تیکھے لہجے میں بولا۔

”میری بات سنجیدگی سے سنو نیلسن!“ رائے التجائیہ لہجے میں بولا۔ ”تم ڈاکٹر سائرس کو بھی جانتے ہو اور نینا سے بھی واقف ہو۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ ڈاکٹر سائرس نے بے چاری نینا کی زندگی کس طرح جہنم بنا رکھی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ نینا اس سے شادی کر لے۔“

”وہ بڈھا‘ نینا سے شادی کرنا چاہتا تھا؟“ نیلسن بے یقینی سے بولا۔

”ہاں اسی لیے میں نے اسے ہلاک کر دیا۔“ رائے بولا۔

نیلسن نے رائے کی نظر بچا کر ایلسن کو آنکھ ماری۔ اس کی اس حرکت سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے بھی رائے کی بات کا یقین نہیں کیا تھا۔ نیلسن ویسے بھی کوئی بات سن کر فوراً جوش میں نہیں آتا تھا۔ اسے اپنا ہم خیال دیکھ کر ایلسن نے خاصا سکون محسوس کیا۔

”یہ نینا کون ہے؟“ ایلسن نے نیلسن سے دریافت کیا۔

”ایک خوبصورت لڑکی جو خود بھی زہروں کی ماہر ہے۔ ڈاکٹر سائرس نے ہی اس کی تربیت کی تھی۔ سائرس اس کا قانونی سرپرست.... یا اسی قسم کی کوئی اور چیز تھا.... میرا خیال تھا کہ وہ لڑکی رائے سے شادی کرے گی۔“ نیلسن نے جواب دیا۔

”سائرس کے ہوتے ہوئے بھلا ایسا کیونکر ہو سکتا تھا؟“ رائے تلخی سے بولا۔ ”اسی لیے تو مجھے اس کو زہر دے کر ہلاک کرنا پڑا۔“

نیلسن نیم استہزائیہ سے لہجے میں بولا۔ ”زہر کا ذکر کر کے تم نے میرے پیشہ ورانہ تجسس کو جگا دیا ہے۔ میں بھی زہروں کا ماہر ہوں

اور تم بھی۔ ہم پیشہ ہونے کے ناتے میں تم سے پوچھ رہا ہوں وہ کون سا زہر تھا جسے تم نے آلۂ قتل کے طور پر استعمال کیا؟"

"نکوٹین..." رائے نے جواب دیا۔ "میں نے اسے نکوٹین کھلا دیا۔"

کم از کم ایلسن کو یہ سن کر قدرے مایوسی ہوئی۔ اس کے خیال میں تو نکوٹین کچھ ایسی ضرر رساں چیز نہیں تھی۔ ان گنت لوگ روزانہ سگریٹ، سگار نوشی اور تمباکو خوری کے ذریعے نکوٹین کی نہ جانے کتنی مقدار جسم میں لے جا رہے تھے۔ ایلسن نے تو اچانک کسی کو مرتے نہیں دیکھا تھا۔ اسے زہر کے ذریعے قتل کی جن وارداتوں سے اب تک واسطہ پڑا تھا ان میں سائنائڈ، اسٹرکچن اور اسی قسم کے دوسرے زہروں کے نام سامنے آئے تھے۔ نکوٹین کا نام اس قسم کی واردات میں اس نے آج پہلی بار سنا تھا۔

رائے نے بھی اس کے تاثرات دیکھ کر اندازہ کر لیا کہ وہ کیا سوچ رہا تھا۔ وہ جلدی سے بولا۔ "نکوٹین کا استعمال مجھے اس لیے بھی مناسب محسوس ہوا کہ سائرس ان دنوں نکوٹین پر ہی تجربات کر رہا تھا۔ وہ نکوٹین سے ان کیڑوں کے لیے زہر تیار کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو جنوبی علاقوں میں مٹر کی فصل کو تباہ کر دیتے ہیں۔ میں اور نینا ان تجربات میں اس کی مدد کر رہے تھے۔"

"ایک اور وجہ سے بھی نکوٹین ڈاکٹر سائرس کے لیے مناسب تھا۔" نیلسن مسکراتے ہوئے بولا۔ "وہ ہر وقت وہ سگار پیتا رہتا تھا جو خاص طور پر اپنے لیے ہیٹی سے درآمد کرتا تھا۔ جس وقت وہ کش نہیں لگا رہا ہوتا تھا اس وقت وہ سگار کو دانتوں سے چباتا رہتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس کے معالج نے اسے تمباکو سے دور رہنے کی سختی سے ہدایت کی تھی۔"

"اور چائے سے بھی۔" رائے نے لقمہ دیا۔

"ہاں چائے سے بھی۔" نیلسن نے تائید کی۔ "جن دنوں سائرس جوش و خروش سے کسی نئے زہر کی تیاری میں مصروف ہوتا تھا ان دنوں تو اس کا گزارا ہی اپنے سیاہ سگاروں اور کالی چائے پر رہ جاتا تھا۔ وہ ایسی اسٹرانگ چائے پیتا تھا جسے کوئی بیل بھی پی لیتا تو ادھر چکرا جاتا۔"

"تم دونوں اپنی بکواس بند کرو گے یا نہیں؟" ایلسن چلایا پھر وہ رائے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نیلسن سے مخاطب ہوا۔ "یہ نوجوان اپنے آپ کو قتل کے جرم میں پولیس کے حوالے کرنے آیا ہے اور تم نے اس کے ساتھ اس طرح باتیں شروع کر دیں ہیں جیسے پارک میں دو شناسا بوڑھیاں ٹکرا گئی ہوں۔"

دفعتاً فون کی گھنٹی بجی۔ ایلسن نے جھپٹ کر ریسیور اٹھایا۔ "ہیلو!"

دوسری طرف سے ایک کھنکھناتی آواز ابھری۔ اس کا سرخ چہرہ کچھ اور سرخ ہو گیا۔ آنکھیں بالکل سکڑ گئیں۔ آواز معدوم ہو گئی اور سلسلہ منقطع ہو گیا تب بھی وہ ریسیور تھامے کھڑا رہا۔

پھر وہ رائے سے مخاطب ہوا۔ "ابھی تک میں تمہاری کہانی کو ہی آج کی عجیب ترین بات سمجھ رہا تھا لیکن......" اس نے ریسیور ایک جھٹکے سے رائے کی طرف بڑھایا۔ "میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ میرے خیال میں یہ کال آج کی عجیب ترین چیز تھی۔"

رائے اس کی طرف یوں دیکھتا رہا جیسے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا ہو۔ ایلسن خطرناک حد تک پُرسکون لہجے میں بولا۔ "تمہیں معلوم ہے کال کس کی تھی؟ کوئی لڑکی بول رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ ہم جلد از جلد ڈاکٹر سائرس کے گھر پہنچیں اور اسے سائرس کے قتل کے جرم میں گرفتار کر لیں۔"

رائے نے یوں سانس لی جیسے اس کا گلا بند ہونے لگا ہو پھر وہ تقریباً چیخ اٹھا۔ "ایک منٹ ٹھہرو۔ تم اس لڑکی کی بات پر دھیان مت دینا۔ وہ نینا ہوگی... وہ پاگل پن کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ اس نے اب سائرس کی لاش دیکھی ہوگی اور سمجھ گئی ہوگی کہ اسے میں نے ہلاک کیا ہے۔ وہ اپنے اوپر الزام لے کر اپنی دانست میں مجھے بچانے کی کوشش کر رہی ہے۔"

"خدا کی پناہ.... آخر یہ سب کیا...." ایلسن کراہا۔

"میں اور نینا شادی کرنے والے تھے...." رائے تیزی سے بولا۔ "لیکن سائرس نے بیچ میں ٹانگ اڑا دی۔ نینا بھی چونکہ زہروں کی ماہر ہے۔ وہ سائرس کی لاش دیکھ کر سمجھ گئی ہوگی کہ اسے کس طرح ہلاک کیا گیا ہے۔ اب وہ خود اپنے خلاف بیان دینے اور شہادتیں تیار کرنے کی کوشش کرے گی۔ وہ مجھے بچانے کے لیے ایسا کرے گی..... لیکن تمہیں میری بات سننا پڑے گی۔ اصل قاتل میں ہوں۔ میں نے سائرس کو قتل کیا ہے۔ میں یہ ثابت بھی کر سکتا ہوں۔"

"تم ثابت کرو گے؟" ایلسن غرایا۔ "تمہیں ثابت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ قاتل کو قاتل ثابت کرنا ہماری ذمے داری ہے۔ تم دونوں میرے ساتھ آؤ۔" اس نے رائے اور نیلسن دونوں کو اشارہ کیا۔

وہ ان دونوں کو اپنے ساتھ باہر فٹ پاتھ کے قریب کھڑی ہوئی پولیس کار تک لایا۔ رائے کو اس نے پچھلی سیٹ پر دھکیلا اور نیلسن کو آگے اپنے ساتھ بٹھایا۔ لحیم شحیم نیلسن ہر وقت بے فکر اور مطمئن نظر آنے والا شخص تھا۔ اس وقت بھی وہ بالکل مطمئن و مسرور نظر آ رہا تھا۔ صورت حال خواہ کچھ بھی تھی لیکن اسے گویا اس کے بارے میں قطعاً تشویش نہیں تھی۔ اس کا تعلق پولیس لیبارٹری سے تھا اور وہ بھی زہروں کا ماہر تھا۔ ایلسن نے راستے میں اس سے زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔

نیلسن نے بتایا کہ ڈاکٹر سائرس کی اہلیت اور قابلیت اپنی جگہ تھی لیکن اس کی عادات و اطوار کی وجہ سے خود اس کے ہم پیشہ بھی اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ اس کے زیادہ تر جاننے والے اس سے نفرت ہی کرتے تھے۔ اسے محض اس کی سائنسی قابلیت کی وجہ سے

برداشت کیا جاتا تھا لیکن اس کے کردار، نجی زندگی اور عادات کے بارے میں بڑی عجیب عجیب باتیں مشہور تھیں۔

نیلسن نے مزید بتایا کہ بینا کا باپ ڈاکٹر برجز بھی ایک کیمیا دان تھا۔ اس نے ایک نہایت اہم کیمیائی فارمولا تیار کیا تھا لیکن اس کی حماقت یا بدقسمتی تھی کہ وہ اس فارمولے کو لے کر ڈاکٹر سائرس کے پاس چلا گیا۔ ڈاکٹر سائرس نے چپکے سے اس فارمولے کو اپنی دریافت قرار دے کر ایک بڑی کمپنی کو فروخت کر دیا اور اس کے عوض خطیر رقم کھری کرلی۔ وہ رقم ڈاکٹر برجز کو مل جاتی تو اس کی کایا پلٹ جاتی۔

سننے میں آیا تھا کہ اسی صدمے اور دل شکستگی کے باعث ڈاکٹر برجز کی موت واقع ہوگئی تھی۔ بعد میں ڈاکٹر سائرس نے یہی کہا کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا تھا اور اسی کی تلافی کے لیے اس نے آنجہانی ڈاکٹر کی بیٹی بینا کو اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا اور اسے اپنی اسسٹنٹ بنالیا تھا۔

"اب سننے میں آرہا ہے کہ وہ بڈھا اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔" نیلسن غرایا۔

"مجھے اس پر یقین نہیں آرہا۔ یہ کوئی غلط فہمی بھی ہوسکتی ہے۔" ایلسن بولا۔ عقبی سیٹ پر موجود رائے نے اس کے خیال کی تردید نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس وقت کسی اور ہی خیال میں الجھا ہوا تھا۔ اس کا ذہن یقیناً کہیں اور تھا۔ وہ گویا ان کی باتیں سن ہی نہیں رہا تھا۔ ایلسن نے دل ہی دل میں ڈاکٹر سائرس کے لیے ناپسندیدگی محسوس کرنا شروع کردی تھی۔

"یہ نکوٹین کا کیا قصہ ہے؟" ایلسن نے جاننا چاہا۔ "کیا اس کے ذریعے کسی کو ہلاک کیا جاسکتا ہے؟"

"یقیناً۔" نیلسن نے سر ہلایا۔ "اگر خالص نکوٹین کا جوہر تیار کیا جاسکے تو اس سے یقیناً انسان کو ہلاک کیا جاسکتا ہے۔ وہ بہرحال ایک زہر تو ہے۔ رائے کے لیے اس کا جوہر تیار کرنا مشکل بھی نہیں تھا۔ سائرس چونکہ ہر وقت سیاہ سگار اور چائے پیتا تھا اس لیے یہ ثابت کرنا بھی مشکل ہوتا کہ اسے نکوٹین کے ذریعے ہلاک کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس کے جسم میں نکوٹین پہلے ہی کافی مقدار میں موجود رہا ہوگا۔ اگر رائے خود ہی بک بک کرتا ہوا پولیس ہیڈ کوارٹر نہ پہنچتا تو یہ نکوٹین کے ذریعے سائرس کو ہلاک کرکے صاف بچ سکتا تھا۔"

اس دوران وہ ڈاکٹر سائرس کے مکان تک پہنچ چکے تھے۔ ایلسن نے گاڑی روکی اور خود اتر کر رائے کے لیے دروازہ کھولا۔ سائرس کا مکان تین منزلہ تھا اور دو اپارٹمنٹ بلڈنگوں کے درمیان

پھنسا ہوا تھا۔

"لاش کہاں ہے؟" ایلسن نے دریافت کیا۔

"دوسری منزل پر... اس کے اپنے بیڈروم میں۔" رائے نے جواب دیا۔

انہوں نے بیرونی سیڑھیاں چڑھنا شروع کیں۔ ابھی وہ اوپر نہیں پہنچے تھے کہ دروازہ خودبخود کھل گیا۔ ایلسن کو سامنے ایک لڑکی نظر آئی۔ وہ خوبصورت تھی لیکن اس وقت اس کا چہرہ زرد تھا، آنکھوں سے وحشت عیاں تھی اور اس کے تانبے جیسے رنگ کے بال منتشر تھے۔ اس نے متوحش سی نظروں سے ایلسن اور نیلسن کے چہروں کا جائزہ لیا اور لڑکھڑاتی سی آواز میں رائے سے مخاطب ہوئی۔ "رائے! کیا یہ لوگ..."

رائے نے اسے جملہ مکمل کرنے کا موقع نہیں دیا اور اچھل کر اس کے قریب جا پہنچا۔ اس نے یوں اسے ایک بازو کے حلقے میں لے لیا جیسے اسے دنیا کی ہر مصیبت سے بچانا چاہتا ہو۔

"تمہیں اس معاملے میں اُلجھنے کی ضرورت نہیں نینا!" وہ تیزی سے بولا "تم اپنے کمرے میں جاؤ۔"

ایلسن جلدی سے ان کے قریب پہنچتے ہوئے بولا۔ "ہمارا تعلق محکمۂ پولیس سے ہے مس نینا! میں کیپٹن ایلسن ہوں۔ فون پر آپ کی مجھ سے ہی بات ہوئی تھی۔ آپ مجھے ایک قتل کے بارے میں بتا رہی تھیں۔"

رائے غصے کے عالم میں اس کی طرف گھوما اور تُند لہجے میں بولا۔ "دیکھو... تم..."

لڑکی کی آواز سن کر اسے خاموش ہونا پڑا۔ وہ خوفزدہ لیکن واضح انداز میں ایلسن سے کہہ رہی تھی۔ "میں نے ڈاکٹر سائرس کو ہلاک کر دیا ہے کیپٹن ایلسن! میں کسی اُلجھاؤ کے بغیر یہ بات سیدھے اور صاف طریقے سے تمہیں بتا رہی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے اس جرم کا الزام کوئی اور اپنے سر لے۔"

رائے چلایا۔ "لیکن سائرس کو تو میں نے قتل کیا ہے۔"

"میرا خیال ہے، پہلے ہمیں گھر کے اندر چلنا چاہیے" ایلسن خشک لہجے میں بولا "ورنہ پڑوسی جمع ہو جائیں گے۔"

وہ سب مکان میں داخل ہوئے۔ اندر کی فضا میں المیے کے اثرات محسوس کیے جا سکتے تھے۔ درودیوار سے افسردگی ٹپک رہی تھی۔ افسردگی نوجوان جوڑے کی آنکھوں میں بھی نمایاں تھی مگر سردست وہ گویا سب کچھ بھول کر پھانسی کے پھندے تک پہنچنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی فکر میں تھے۔

اس وقت لڑکی دم بخود سی رہ گئی جب ایلسن نے خاصی ملائمت سے اسے بتایا۔ "تم نے اعتراف میں ذرا دیر کر دی نینا! رائے ہمیں پہلے ہی ساری کہانی سنا چکا ہے۔" پھر وہ پلٹ کر نیلسن سے مخاطب ہوا۔ "آؤ نیلسن! اوپر چلیں۔"

"تم لوگوں کو رائے کی کہانی پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔" نینا بولی۔ "وہ الزام اپنے سر لے کر مجھے بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"اس کی بات پر توجہ مت دیں۔" رائے ایک بار پھر تقریباً چلّا اٹھا۔ اس نے آگے بڑھ کر شاید لڑکی کو خاموش رکھنے کے لیے کوئی طریقہ اختیار کرنا چاہا لیکن ایلسن ان دونوں کے بیچ میں آ گیا۔ اس نے رائے کو ایک طرف دھکیلتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

"تم خاموش رہو۔" پھر وہ لڑکی سے مخاطب ہوا "ہاں نینا! کہو... تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

لڑکی شدتِ جذبات سے بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولی۔ "لوگوں کا دل دُکھانا اور ہر ایک کے جذبات سے کھیلنا سائرس کا من پسند مشغلہ تھا۔ اس کی بددیانتی اور دھوکے بازی نے میرے والد کو قبر میں پہنچایا۔ جن دنوں رائے ایک زیرِ تربیت ڈاکٹر تھا، اس کے زیرِ علاج ایک مریض کا انتقال ہو گیا۔ حالانکہ اس میں رائے کا کوئی قصور نہیں تھا لیکن مکّار اور عیّار سائرس نے اس میں بلیک میلنگ کا ایک پہلو ڈھونڈ لیا۔ رائے اپنی سادگی اور اَناڑی پن کی وجہ سے اس سے خوفزدہ ہو گیا۔ سائرس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ رائے آگے چل کر ایک زبردست کیمیادان بن سکتا ہے۔ وہ اسے بلیک میل کر کے، اپنے شکنجے میں جکڑ کر اپنے پاس لے آیا اور ایک اسسٹنٹ کے طور پر اس سے کام لینے لگا۔ اس نے رائے کو گویا اپنا غلام بنا لیا۔ سارا کام رائے کرتا تھا اور ڈاکٹر سائرس کے جتنے بھی کارنامے سامنے آتے تھے ان کے پیچھے زیادہ تر رائے کی محنت اور ذہانت کارفرما ہوتی تھی لیکن اس کا پھل سائرس کھاتا تھا...."

نینا اپنی سانس درست کرنے کے لیے ایک لمحے کو خاموش ہوئی۔ رائے نے ایک بار پھر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن ایلسن نے شعلہ بار نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور وہ خاموش ہی رہا۔

نینا نے ہانپتے ہوئے سلسلۂ کلام جوڑا۔ "جب مجھے اور رائے کو احساس ہوا کہ ہم ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے ہیں تو یہ بات سائرس سے بھی چھپی نہ رہ سکی۔ وہ تو گویا غصے سے پاگل ہو گیا۔ اس پر جنون سا طاری رہنے لگا۔ اس نے دھمکی دی کہ وہ رائے کو قتل کر دے گا...."

اب رائے بولے بغیر نہ رہ سکا۔ فرطِ جذبات سے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ "کیپٹن ایلسن! میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ نینا الزام اپنے سر لینے کی کوشش کر رہی ہے لیکن میں ثابت کر سکتا ہوں، یہ غلط کہہ رہی ہے۔ نیلسن بھی ثبوت دیکھنے کے بعد میری تائید کر سکتا ہے کیونکہ یہ بھی زہروں کا ماہر ہے۔ سائرس کی موت نکوٹین سے واقع ہوئی ہے۔ میں نے اس کے ایک سگار میں نکوٹین کے جوہر کی اتنی مقدار داخل کر دی تھی جو دس آدمیوں کو ہلاک کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس نے جب اس سگار کا کش لگایا اور اس کا سرا چبایا...."

اس لمحے کیپٹن ایلسن یہ دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ نینا مسکرا رہی تھی۔ وہ رائے کی بات کاٹتے ہوئے قدرے پُرجوش لہجے میں بولی۔ "لیکن سائرس کی موت نکوٹین زہر سے واقع نہیں ہوئی' میں یہ ثابت کرسکتی ہوں۔"

ایلسن کو اس کے تاثرات سے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی بے بنیاد دعویٰ نہیں کررہی تھی اور نہ ہی وہ محض جذبات میں آکر الزام اپنے سر لینے کی کوشش کررہی تھی۔ وہ تمامتر صدقِ دل سے خود کو سائرس کی قاتل ثابت کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ رائے بے شک یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ اس کے لیے قربانی دے رہی ہے لیکن ایلسن محسوس کررہا تھا کہ لڑکی واقعی اپنے آپ کو سائرس کی موت کا ذمے دار سمجھ رہی تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ رائے بھی محض جذبات میں آکر اپنے آپ کو قاتل قرار نہیں دے رہا تھا۔ وہ بھی حقیقتاً خود کو سائرس کی موت کا ذمے دار سمجھ رہا تھا۔

ایلسن کو اپنے سر میں دھمک سی محسوس ہونے لگی۔ وہ کبھی رائے کی طرف اور کبھی نینا کی طرف دیکھ رہا تھا پھر اس نے مدد طلب سی نظروں سے نیلسن کی طرف دیکھا۔ نیلسن لڑکی کی طرف مُڑتے ہوئے بولا۔ "تمہارے خیال میں سائرس کی موت کس طرح واقع ہوئی ہے؟"

نینا بولی۔ "ایک اور قسم کے زہر کے ذریعے اس کی موت واقع ہوئی ہے۔ وہ زہر میں نے اسے دیا تھا اور یہ خیال میرے ذہن میں اس لیے آیا کہ میں اکثر اسے تلخ' سیاہ اور اسٹرانگ چائے پیتے دیکھتی تھی۔ اس کا معالج اسے خبردار کرچکا تھا کہ وہ اپنی تباہی کا سامان کررہا ہے۔ چنانچہ میں نے......"

"تم نے اس کی چائے میں ٹینک ایسڈ ملایا ہوگا۔" رائے اچانک بول اٹھا پھر اس نے مجنونانہ سے انداز میں قہقہہ لگایا لیکن اس قہقہے میں بے پناہ طمانیت بھی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے گویا نینا کی بات سن کر اطمینان ہوا تھا۔

نینا نے بے وقوفوں کی طرح اثبات میں سرہلایا۔ دفعتاً اس کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ایلسن کو شبہ ہوا کہ وہ کسی پاگل خانے میں تو نہیں آگیا تھا تاہم اسے امید تھی کہ کم از کم نیلسن تو صحیح الدماغ تھا۔ وہ بھی زہروں کا ماہر تھا۔ اس نے مدد طلب سی نظروں سے نیلسن کی طرف دیکھا لیکن اسے دھچکا سا لگا۔ نیلسن بھی ہنس رہا تھا۔

ایلسن چلّا اٹھا۔ "کیا یہاں سب پاگل ہوگئے ہیں؟ یہ قتل کا معاملہ ہے' مذاق نہیں ہے۔ نیلسن! کم از کم تم تو دانت نکالنا بند کرو۔"

ایلسن یکدم خاموش ہوگیا۔ اوپر سے قدموں کی کھٹ کھٹ سنائی دی تھی جو لحہ بہ لحہ قریب آتی گئی۔ اس آواز کا تاثر عجیب سا تھا۔ ایلسن کے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سیڑھیوں کے اختتام پر جنگلے کے عقب میں ڈاکٹر سائرس نمودار ہوا۔

اس نے جھانک کر نیچے دیکھا اور ناگواری اور برہمی سے بولا "یہاں کیا ہو رہا ہے؟ کیوں اتنا شور برپا ہے؟ کیا انسان اب اپنے گھر میں بھی دو گھڑی آرام سے نہیں سو سکتا؟"

نیچے کھڑے چاروں افراد سر اٹھائے دم بخود اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر سائرس جنگلے کا سہارا لے کر دھیرے دھیرے سیڑھیاں اترنے لگا۔ وہ بھاری بھرکم تھا مگر اس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے۔ چہرے پر شکنیں تھیں۔ وہ ایک بدصورت اور عمر رسیدہ شخص تھا۔ نینا جیسی خوبصورت اور نوجوان لڑکی کے ساتھ اس کے جوڑ کا تصور کرتے ہوئے ہی ایلسن کو کراہیت محسوس ہو رہی تھی۔

ڈاکٹر سائرس یوں ان کے قریب سے گزرتا چلا گیا جیسے وہ محض پرچھائیاں ہوں۔ اس نے محض رسماً بھی کسی سے ملنے کی زحمت نہیں کی۔ دروازے پر پہنچ کر گویا اسے کچھ یاد آیا۔ اس نے مُڑ کر نینا کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹ بھنچ گئے اور اس کا چہرہ کچھ اور بدنما ہوگیا۔ دراصل اس نے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔

"میں ذرا ایک کام سے لیبارٹری میں جارہا ہوں۔" وہ نینا سے مخاطب ہوا۔ "مجھے بلانے یا میرے کام میں مخل ہونے کی کوشش نہ کرنا۔" دوسرے ہی لمحے وہ ایک دروازے کے عقب میں غائب ہوگیا۔

ایلسن تیزی سے رائے اور نینا کی طرف گھوما۔ اس کے چہرے پر غصے کی سرخی تھی "اگر تم دونوں یہ سمجھ رہے ہو کہ پولیس سے اس قسم کا مذاق کرنے میں کوئی حرج نہیں.... تو تم غلطی پر ہو۔"

نیلسن گویا رائے اور نینا کا دفاع کرتے ہوئے بولا "مذاق تو یہ واقعی ہے لیکن ان دونوں کا نہیں.... بلکہ یہ قسمت کا مذاق ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رائے نے ڈاکٹر سائرس کو ہلاک کرنے کے لیے اس کے سگار میں نکوٹین کا جوہر داخل کیا تھا۔ چائے میں ٹینک ایسڈ شامل ہوتا ہے لیکن نینا نے سائرس کو ہلاک کرنے کے لیے اس کی چائے میں طاقتور حالت میں ٹینک ایسڈ کی کچھ مقدار ملا دی تھی۔"

ایلسن استہزائیہ لہجے میں بولا۔ "لیکن چند لمحے پہلے ہم نے جس شخص کو زندہ سلامت یہاں سے گزر کر جاتے دیکھا ہے وہ کیا ڈاکٹر سائرس کی روح تھی؟"

"تم سمجھے نہیں۔" نیلسن تحمل سے بولا۔ "دراصل نکوٹین اور ٹینک ایسڈ دونوں ایک دوسرے کے تریاق ہیں۔ اگر ایک وقت میں ان میں سے ایک زہر استعمال کیا جاتا تو وہ واقعی بے حد مہلک ہوتا لیکن تقریباً ایک ساتھ جسم میں داخل ہو کر دونوں نے ایک دوسرے کا اثر زائل کردیا اور دونوں ہی بے ضرر ہوگئے۔"

OVER DOSE OF DEATH

BERT COLLIER

جاسوسی ڈائجسٹ : اپریل 1994

ناول سکیننگ وکمپوزنگ

محمد سجاد بھٹی

03045503086

خصوصی تعاون: جاسوسی نشست ایڈمن

ڈاکٹر حامد حسن۔ساگر زمان۔عقیل قریشی۔ ممتاز علی کیانی۔سیف الملوک عباسی۔ یاسر حسنین۔ناصر محمود بلوچ۔محمد نعمان & صائم بھائی

ہمارے اپنے گلی کوچوں میں ہونے والا تماشائے آہن و سنگ
ہمارے آپ کے گرد بکھرے ہوئے کرداروں کی داستان ہزار رنگ



سرکش

محمود احمد مودی

زندگی کٹھن بھی ہے اور آسان بھی۔ پُرپیچ بھی ہے اور سادہ بھی۔ اس میں رنگِ وفا بھی ہے اور زہرِ جفا بھی۔ کہیں لوگ غیروں کو اپنا لہو دے کر زندہ رکھتے ہیں تو کہیں اپنوں کا خون چوستے ہوئے بھی نہیں ہچکچاتے۔ یہ پل پل رنگ بدلتی زندگی کے ایسے ہی اونچے نیچے راستوں اور رنگین و سنگین لمحوں کی داستان ہے، ایک سادہ و معصوم نوجوان کا فسانۂ حیات ہے جس کے لہو میں محبت کی خوشبو اور آنکھوں میں مستقبل کے حسین مگر دھندلے خواب تھے۔ اسے شاہراہِ حیات پر طویل سفر درپیش تھا لیکن گردشِ ایام اور شورشِ حالات نے اس کے راستے ہی بدل دیے۔ نت نئی منزلیں اس کے سامنے آگئیں۔

باذوق قارئین کی پسند۔ ایک ہنگامہ خیز سلسلہ



شکر گڑھ کے ایک غریب خاندان میں میری پیدائش ہوئی۔ پیدائش کے کچھ عرصے بعد ہی میری والدہ وفات پاگئیں۔ والد نے زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے مجھے اسکول میں داخل کروادیا۔ ابھی میں نے ایف اے ہی کیا تھا کہ میرے والد دو چوہدریوں کے ایک تنازعے میں اپنے آقا پر قربان ہوگئے۔ مجھ پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ عرصۂ حیات تنگ ہونے پر میں نے ایک جعلی پیر مشعل شاہ کا سہارا ڈھونڈ لیا۔ بھانڈا پھوٹ جانے پر مشعل شاہ نے مجھے اپنے ایک ٹھیکے دار دوست کے پاس بھیج دیا جہاں لالی نامی ایک لڑکی مجھ سے ٹکرائی اور میں اس کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہوگیا۔ اسی دوران میں نے اشرف خان نامی ایک اسمگلر کے ساتھ مل کر اسمگلنگ کا مال اِدھر اُدھر کرنا شروع کردیا۔ ہمارا دھندا کامیابی سے جاری تھا کہ ایک روز میں خرکاروں کے ہتھے چڑھ گیا۔ انہوں نے مجھ پر بہت تشدد کیا۔ ایک روز موقع پاکر میں ایک نوعمر لڑکے راشد کے ہمراہ کیمپ سے بھاگ نکلا۔ میں نے راشد کو اس کے گھر چھوڑا اور اشرف خان کے پاس پہنچ گیا۔ ہم نے دوبارہ اپنے دھندے کا آغاز کردیا۔ ایک کامیاب مہم سے لوٹنے کے بعد ہم گھر میں آرام کررہے تھے کہ ہمارے حریف استاد لبھو کی مخبری پر ایکسائز والوں نے چھاپا مارا۔ افراتفری کے عالم میں فرار ہوتے ہوئے اشرف خان گولی لگنے سے ہلاک ہوگیا۔ میں نے لاہور پہنچ کر اشرف خان کے کزن قاسم خان کے ساتھ کام شروع کردیا جو زیادہ بڑا اسمگلر تھا۔ فرصت ملنے پر ایک روز میں راشد کے گھر جا پہنچا جہاں میری ملاقات اس کی بہن راحیلہ سے ہوئی جو محبت میں بدل گئی۔ قاسم خان منشیات کی ایک بڑی کھیپ امریکا اسمگل کرتے ہوئے گرفتار ہوگیا۔ اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں گروہ سے الگ ہوگیا اور اپنا کام شروع کردیا۔ اس دوران راحیلہ نے اچانک ہی شادی کرلی۔ یہ میری زندگی کی بدترین شکست تھی۔ میرا کام کامیابی سے چل نکلا تھا۔ اپنی بلیک منی کو وہائٹ کرنے کے لیے میں نے کراچی میں ایک فائیو اسٹار ہوٹل بنانے کے ساتھ ساتھ ایک فلم کمپنی بھی خریدلی۔ فلم میکنگ کے دوران مجھے خانہ بدوشی کے عرصے میں ٹھیکے دار کے ہاں ٹکرانے والی لڑکی لالی ملی جو آج کی مشہور فلم اسٹار ستارہ تھی۔ ایک موقعے پر ایک ایکسٹرا لڑکی ہنی نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر میری مدد کی۔ ایک روز استاد لبھو کو سامنے دیکھ کر میرے وجود میں دبی ہوئی نفرت کی آگ پوری شدت سے بھڑک اٹھی اور میں نے ایک سخت 'خونریز معرکے کے بعد استاد لبھو کو گردن توڑ کر ہلاک کردیا۔ اس کے بعد میں نے ایک جعلی فلمی مصنف نصیر نواز کو اس کی دوسروں کے ساتھ زیادتیوں اور ظلم پر اس خوب صورتی سے پھانسی پر لٹکایا کہ اس کی موت خودکشی معلوم ہو۔ کراچی میں ایک اسمگلر سیٹھ عالم شیر کے آدمیوں نے میری ایک لانچ کو گرنیڈ مار کر تباہ کردیا۔ اس کے جواب میں اچھی خاصی مرمت کے بعد عالم شیر نے ایک بھاری رقم زرِ تلافی کی مد میں دینا منظور کرلی۔ ایک روز مجھ پر گھات لگا کر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ حملہ آوروں میں سے تین میرے آدمیوں کے ہاتھوں مارے گئے جبکہ چوتھا میرے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچا۔ زندگی کے انہی ہنگامہ خیز روز و شب میں کراچی میں میرے فائیو اسٹار ہوٹل کے افتتاح کا خوب صورت لمحہ بھی آگیا۔ میں کراچی پہنچا تو میری ملاقات اچانک ہی راشد سے ہوگئی۔ اس کے ممی 'ڈیڈی فوت ہوچکے تھے اور راحیلہ کو طلاق ہوگئی تھی۔ میں نے راشد اور راحیلہ کو لاہور شفٹ ہونے پر آمادہ کرلیا۔ میں واپس لاہور پہنچا تو کوئی ریڈ ڈاٹ نامی پُراسرار تنظیم میرے پیچھے پڑگئی اور عجیب و غریب واقعات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ریڈ ڈاٹ کے ایک بندر نما انسان اے ٹن نے مجھے زچ کرکے رکھ دیا۔ انہوں نے ہنی کو اغوا کرالیا اور اس کی والدہ کو قتل کردیا۔ میں ہنی کو ان کی تحویل سے آزاد کرانے پہنچا تو ریڈ ڈاٹ کے تین آدمی ہمارے ہاتھوں مارے گئے۔ اس کے چند روز بعد ایک انتہائی ہولناک سازش میرے علم میں آئی جس کے تحت ملک کے وزیرِ خارجہ حفیظ صاحب کو میرے کراچی کے ہوٹل میں قتل کردیا جاتا مگر میں نے اس سازش کو اتنی کامیابی سے ناکام بنایا کہ حفیظ صاحب بھی حیران رہ گئے۔ میں نے اپنے دو دشمنوں ملک اسلم اور ملک قیصر کو نہایت عمدگی سے ٹھکانے لگادیا۔ اس کے بعد میں نے ملک ریاض کی بھی اچھی طرح خبر لی جو ملک اسلم اور ملک قیصر کی دولت و جائداد کا وارث تھا اور مجھ سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ اس کے پروردہ ایک مشہور اور بڑے ڈاکو نورو ماچھی کی میں نے خوب جی بھر کے ٹھکائی کرنے کے بعد چھت سے نیچے پھینک دیا جبکہ دیگر ڈاکوؤں کو میرے جاں نثاروں نے ختم کردیا۔ عالم شیر بھی گولی لگنے سے زخمی ہوا جو میری دشمنی میں ملک ریاض سے گٹھ جوڑ کیے بیٹھا تھا۔ ایک روز نورو ماچھی کا بھائی 'دینو ماچھی اپنے بھائی کا انتقام لینے کے لئے شیشے کا دروازہ توڑ کر اندر آگیا مگر میرے گارڈ نے سیون ایم ایم کا برسٹ مار کر اسے ہلاک کردیا اور اس کے دو ساتھیوں کو میرے اہم جاں نثار ٹونی نے گولی ماردی جبکہ ایک فرار ہوگیا۔ ملک ریاض اور عالم شیر اچھا خاصا سبق ملنے کے باوجود مسلسل میرے راستے کا پتھر بنے ہوئے تھے لہٰذا میں نے انہیں بھی اپنے راستے سے ہٹادیا۔ ایک روز رات کے وقت ایک شخص اچانک میری گاڑی کے سامنے آگیا۔ وہ میرے بچپن کا دوست ریاض عرف راجو تھا۔ میں اس طرح اچانک اس کے ملنے پر حیران تھا کہ دوسری حیرت مجھ پر اس وقت ٹوٹی جب میں اس کے گھر پہنچ کر اس کی بیوی سے ملا۔ وہ میرے بچپن کی پہلی محبت شمیم تھی۔ ایک روز میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ایک جدید اور سائنٹیفک عمارت میں پایا جو ریڈ ڈاٹ کی ملکیت تھی۔ کچھ دیر کے بعد ایک دراز قد اور پُراسرار شخص نے مجھ سے ملاقات کی۔ اس شخص کا کوئی چہرہ نہیں تھا بلکہ اس کے نہایت چوڑے کندھوں کے درمیان سر کی جگہ ایک بہت بڑا انڈا رکھا ہوا تھا۔ اس نے میرے پوچھنے پر یہ حیرت انگیز انکشاف کیا کہ ریڈ ڈاٹ والے مجھے پاکستان کا سربراہِ مملکت بنانا چاہتے ہیں۔ مجھے دو ماہ کے لئے سوچنے کی مہلت دی گئی اور بے ہوش کرکے واپس میرے بیڈ روم میں پہنچادیا گیا۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے اس سلسلے میں حفیظ صاحب سے بات کرنے کا فیصلہ کیا لیکن پہلے چند پریشانیوں سے جان چھڑالینا بہتر سمجھا۔ پہلے میں نے مختار رفیق نامی ایک بدمعاش کو جو ریاض اور شمیم کو تنگ کررہا تھا اور دوسری بہت سی بُرائیوں کا ذمّے دار تھا' اس کے کچھ گرگوں سمیت جہنم رسید کیا' پھر حفیظ صاحب کو ریڈ ڈاٹ کی پیشکش کے بارے میں آگاہ کیا۔ وہ یہ بات سُن کر سناٹے میں آگئے۔ رات گئے میں گھر میں پہنچا تو وہاں ہر چیز جل کر راکھ ہوچکی تھی۔ یہ کام ریڈ ڈاٹ والوں کا تھا۔ انہیں پتا چل گیا تھا کہ میں نے ان کی ہدایات کے برعکس حکومت کی خفیہ ایجنسیوں سے ملاقات کی ہے۔ اب ریڈ ڈاٹ والے پوری طرح مجھے نیست و نابود کردینے پر تُل گئے تھے۔ انہوں نے ستارہ کو شوٹنگ کے دوران زہر دے کر ہلاک کردیا۔ پھر شمیم کے بیٹے عمار کو جو درحقیقت میرا بیٹا تھا' اغوا کرلیا مگر میں نے اپنے ایک ساتھی کی مدد سے عمار کو بڑی جدوجہد کے بعد رہا کروالیا۔ اس کے بعد انہوں نے راحیلہ کے گھر حملہ کرکے ہر چیز تباہ و برباد کردی۔ راشد بھی گولی لگنے سے جاں بحق ہوگیا۔ ان سانحات سے ابھی میں سنبھلا بھی نہیں تھا کہ مجھے ریڈ ڈاٹ والوں نے دوبارہ اغوا کرلیا۔ اس مرتبہ انہوں نے یہ پیش کش کی کہ اگر میں وزیرِ خارجہ حفیظ صاحب کو ان کے راستے سے ہٹادوں تو وہ مجھے میرے حال پر چھوڑدیں گے۔ اس وقت تو میں نے مصلحتاً اس کام کی ہامی بھرلی مگر بعد میں تمام تر خطرات کے باوجود حفیظ صاحب کو اس منصوبے سے آگاہ کردیا۔ حفیظ صاحب نے فوراً سیکیورٹی والوں کو طلب کرلیا مگر تمام حفاظتی تدبیریں دھری رہ گئیں۔ ریڈ ڈاٹ والوں نے اس قدر شدید حملہ کیا۔۔۔ کہ کوٹھی ملبے کا ڈھیر بن گئی۔ حفیظ صاحب کے تمام گارڈ ہلاک ہوگئے اور خود حفیظ صاحب بے ہوش پڑے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد ریڈ ڈاٹ کا ایک نیا شعبدہ میرے سامنے آیا جب میں نے دو آدمیوں کو فضا میں پرواز کرکے تیزی سے اپنی طرف آتے دیکھا۔ انہوں نے مجھے اور راحیلہ کو پکڑنے یا ہلاک کرنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکے۔ اب ریڈ ڈاٹ کیونکہ ہر قدم اور ہر سطح پر مجھے ختم کردینے پر تُل گئی تھی لہٰذا میں نے کچھ عرصے کے لئے منظر سے ہٹنے کا فیصلہ کرلیا اور بھیس بدل کر نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہوگیا لیکن میری تمام تر چالاکی اس وقت دھری رہ گئی جب میں نے ریڈ ڈاٹ کی فضائی مخلوق کو بدستور اپنے تعاقب میں سرگرداں پایا۔ غور کرنے پر ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔ ریڈ ڈاٹ والوں نے میری قیمتی گھڑی میں کوئی ڈیوائس چھپادیا تھا جس کے ذریعے وہ ہر جگہ مجھ تک پہنچ جاتے تھے۔ جان چھڑانے کے لئے میں نے وہ گھڑی ایک ٹرک ڈرائیور کو دے دی۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد ایک فضائی

شیطان نے کوئی سفید اور چمکتی ہوئی چیز ٹرک پر پھینکی اور ٹرک کے ساتھ ڈرائیور شیر خان کے بھی پرخچے اُڑ گئے۔ فضائی شیطان اپنی دانست میں مجھے ہلاک کر کے واپس جاچکا تھا مگر میں خدا کے فضل سے صحیح سلامت تھا۔ اس جگہ سے بہت دور نکل آنے کے بعد میں بس کے ذریعے پہلے ملتان پہنچا اور وہاں سے کراچی ایکسپریس کے ذریعے سکھر پہنچ گیا۔ یہاں ایک اُچکے نے لفٹ کے بہانے مجھے لوٹنے کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ چھینا جھپٹی میں میرا تھیلا دریا میں گر گیا جس میں پندرہ لاکھ روپے تھے۔ میں نے غصے اور جھنجلاہٹ میں اس اُچکے کو بھی اٹھا کر دریا میں پھینک دیا۔ سکھر سے کندھ کوٹ کی طرف سفر کرتے ہوئے مجھے چند خونخوار اور وحشی افراد نے کسی ایسے شخص کے شبہے میں پکڑ لیا جس نے ان کے سردار نواب سرور کے بیٹے کو قتل کردیا تھا۔ ایک طویل سفر کے بعد وہ مجھے ساتھ لے کر پہاڑی علاقے میں موجود ایک قلعہ نما حویلی میں پہنچ گئے۔ ہمیں اس جگہ پہنچے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ نواب سرور کی بھانجی 'نواب زادی نگینہ' بھی وہاں پہنچ گئی۔ اس کا شوہر شدید زخمی حالت میں اس کے ساتھ تھا۔ ڈاکوؤں نے ان پر حملہ کیا تھا۔ تقریباً ڈھائی کروڑ روپے کا سونا بھی نواب زادی کے ساتھ تھا جس کے چکر میں ڈاکوؤں نے ان پر حملہ کیا تھا۔ کچھ دیر بعد نواب زادی کا شوہر نواب زادہ حشام زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے چل بسا۔ ڈاکو بھی نوابزادی کا تعاقب کرتے ہوئے وہاں پہنچ گئے اور اندھادھند فائرنگ کرکے ڈیرے کے بیشتر لوگوں کو ہلاک کردیا۔ میں ایک قیدی کی مدد سے وہاں سے بھاگ نکلا۔ دو ڈاکوؤں کو بھی میں نے ہلاک کردیا۔ ایک طویل سفر کے بعد میں گر کر بے ہوش ہوگیا۔ آنکھ کھلنے پر میں خود کو ایک غریب مگر مہمان نواز دیہاتی کے گھر میں پایا۔ ایک رات میں اس کے ہاں رہا اور صبح سویرے وہاں سے روانہ ہوگیا۔ میں اسی گاؤں میں ایک چھپر ہوٹل کے مالک دینو کے پاس راج مزدوری کا کام کررہا تھا کہ میں نے دو آدمیوں کو بھتے کے سلسلے میں دینو کے ساتھ اُلجھتے دیکھا۔ پھر جب انہوں نے اسے مارنا شروع کیا تو مجھ سے برداشت نہ ہوسکا۔ میں نے ان دونوں کی خوب ٹھکائی کی اور انہیں وہاں سے بھگادیا مگر کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں اپنے کچھ اور ساتھیوں اور سردار' دلبر خان کے ساتھ دینو کے ہوٹل پر پہنچ گئے۔ پہلے تو انہوں نے دینو کی خوب ٹھکائی کی' پھر اس کے ہوٹل کو آگ لگادی۔ ایک آدمی کو بھی انہوں نے قتل کردیا۔ پہلے تو میں نے اس ہنگامے میں کوئی مداخلت نہیں کی مگر پھر ایک موقعے پر دلبر خان کو اپنے قابو میں کرکے سب کو بے بس کردیا لیکن جلد ہی دلبر خان کے ایک لمبے چوڑے' جن نما آدمی ہوشو خان نے دلبر کو میری گرفت سے آزاد کرالیا۔ میرا خیال تھا کہ اب وہ سب مل کر مجھے گھیرنے کی کوشش کریں گے لیکن دلبر خان نے اپنے آدمیوں کو کسی بھی کارروائی سے روک دیا اور دینو کو میری رہائش کے سلسلے میں ہدایات دے کر چلا گیا۔ دلبر خان اپنے جن نما قوی ہوشو خان سے میرا مقابلہ کرانا چاہتا تھا۔ تب تک کے لئے اس نے مجھے دینو کے گھر میں نظربند کردیا۔ آخر کار مقابلے کا دن بھی آہی گیا۔ دلبر خان نے مجھے بتایا تھا کہ یہ حقیقت سے قریب تر ایک نورا کشتی ہوگی لیکن مقابلہ شروع ہونے کے بعد جب ہوشو خان نے سفاکی کی حد تک جارحانہ انداز میں مجھ پر جان لیوا' خونی حملے شروع کیے تب دلبر خان کا پورا منصوبہ میری سمجھ میں آگیا۔ وہ کھیل ہی کھیل میں ہوشو خان کے ہاتھوں مجھے مروا دینا چاہتا تھا لیکن دلبر خان کے ارادے اور ہوشو کی نیت کو بھانپتے ہی میرے اندر سویا ہوا درندہ بیدار ہوگیا۔ ایک سخت' خونی مقابلے کے دوران میں نے ہوشو خان کو اٹھا کر پھینکا تو اس کی گردن ٹوٹ گئی اور وہ ہلاک ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی دلبر خان کے کئی کلاشنکوف بردار میری طرف بڑھے لیکن اس سے قبل کہ وہ مجھے کوئی نقصان پہنچاتے' گاؤں کے لوگوں نے انہیں اپنے گھیرے میں لے کر پیچھے ہٹا دیا۔ اسی اثنا میں موتی رنگ میں گھس آئی اور اپنے پیٹ پر چھری رکھ کر مجھے دھمکی دی کہ میں فوراً وہاں سے بھاگ جاؤں ورنہ وہ اپنے آپ کو ہلاک کرلے گی۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن اس کی دھمکی نے مجھے وہاں سے فرار ہونے پر مجبور کردیا۔ میں دلبر خان کی جیپ میں وہاں سے نکل آیا۔ راستے میں جیپ کا انجن بند ہوگیا۔ اسی کے ساتھ ایک اور پریشانی نازل ہوگئی۔ وہ گھڑسوار جو یقیناً میرے تعاقب میں تھے' وہاں پہنچ گئے۔ میں نے موقع پاکر انہیں بے ہوش کردیا اور ایک گھوڑے پر وہاں سے آگے روانہ ہوگیا۔ ایک جگہ گھوڑا ٹھوکر کھا کر گرا تو اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ میں ایک گھنے جنگل میں گھس گیا اور پیدل ہی اپنا سفر جاری رکھا۔ جنگل سے باہر ایک سڑک سے مجھے بس مل گئی مگر راستے میں دو پولیس والوں نے مجھے بس سے اتار لیا اور تھانے لے جاکر بند کردیا لیکن جلد ہی مجھے موقع مل گیا اور میں تھانے سے نکل بھاگا۔ ایک بڑھیا نے مجھے اپنے گھر میں پناہ دی لیکن جب میں سو رہا تھا تو اس بڑھیا نے اپنے بیٹے کا قاتل سمجھتے ہوئے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی۔ میں اس کے گھر سے نکل آیا۔ اسی گاؤں کا ایک دوسرا نیک انسان مجھے اپنے گھر لے گیا۔ ابھی میں نے وہاں سکون کے چند لمحے ہی گزارے تھے کہ دلبر خان کے آدمیوں نے اس گھر کو گھیر لیا۔ میں نے دلبر خان کے چار آدمیوں کو ہلاک کردیا اور ایک آدمی کی موٹر سائیکل چھین کر اس گاؤں سے نکل بھاگا۔ انہوں نے تعاقب کرکے مجھے پکڑنے کی کوشش کی لیکن کافی دیر کی جدوجہد کے بعد بالآخر میں انہیں ڈاج دینے میں کامیاب ہوگیا۔ موٹر سائیکل کا پیٹرول ختم ہوگیا تو میں نے پیدل ہی اپنا سفر جاری رکھا۔ پھر ایک چھپر ہوٹل کے باہر کھڑے ٹرک کے پچھلے حصے میں چھپ گیا جہاں فروٹ کی پیٹیاں لدی ہوئی تھیں۔ کافی دیر تک سفر بخیر و عافیت جاری رہا مگر پھر اچانک ہی ٹرک کی رفتار کم ہوئی اور وہ کچے میں اُتر کر رک گیا۔ میں نے احتیاط سے جھانک کر دیکھا' ٹرک کے قریب ہی ایک سیاہ رنگ کی مرسیڈیز کھڑی تھی۔ ٹرک اور مرسیڈیز والوں کی گفتگو سُن کر پتا چلا کہ ٹرک میں فروٹ کی پیٹیوں کے درمیان اسلحہ چھپا ہوا تھا جو شاید کہیں اسمگل کیا جارہا تھا۔ وہ لوگ اس اسلحے کو اب دوسرے ٹرک میں منتقل کرنا چاہتے تھے کیونکہ آگے رینجرز نے راستہ بند کررکھا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ اسلحہ دوسرے ٹرک میں منتقل کرتے اور میں ان کی نظروں میں آتا' میں نے ٹرک سے چھلانگ لگادی۔ تمام تر احتیاط کے باوجود ایک پتھر میرے پیر کے نیچے آکر لڑھکا تو وہ لوگ ہوشیار ہوگئے اور اسلحہ اور ٹارچیں لے کر مجھے تلاش کرنے لگے۔ میں تیزی سے سامنے موجود جنگل میں گھس کر ایک درخت پر چڑھ گیا۔ جب وہ لوگ میری تلاش میں ناکام ہوکر واپس چلے گئے تو درخت سے نیچے اُترنے کی کوشش میں ایک شاخ ٹوٹ جانے کی وجہ سے میں نیچے گر پڑا اور میرے پاؤں میں موچ آگئی لیکن زیادہ خطرناک بات یہ ہوئی کہ جو شاخ ٹوٹی تھی' اس پر شہد کی مکھیوں کا چھتا تھا۔ اس سے قبل کہ مکھیاں مجھ پر حملہ آور ہوتیں' میں پاؤں کی موچ کو بھول کر تیزی سے دوڑا اور ایک نہر میں چھلانگ لگادی۔ اس جدوجہد کے باوجود گردن پر دو تین جگہ وہ ڈنک مار چکی تھیں۔ کافی دیر بعد میں پانی سے باہر نکلا اور ایک درخت کے نیچے لیٹ گیا۔ میرے پاؤں کی تکلیف بڑھ گئی تھی اور وہ سُوج گیا تھا۔ گردن بھی سُوج کر کُپّا ہوگئی تھی۔ مجھے بخار ہوگیا تھا اور بھوک بھی شدت کی لگ رہی تھی مگر میں اس ویرانے میں ایک درخت کے نیچے بے یار و مددگار پڑا تھا اور ہلنے سے بھی قاصر تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں وہیں پڑے پڑے بے بسی کی عبرت ناک موت مرجاؤں گا مگر اللہ تعالیٰ نے میری مدد کی اور اس ویرانے میں ایک اجنبی گھڑسوار کو مجھ تک پہنچادیا جو مجھے اپنے گھوڑے پر بٹھا کر اپنے گھر لے گیا۔ اس نے میرے پاؤں کی موچ ٹھیک کی' مجھے درد کش دوائیں دیں اور ہر طرح میرے آرام کا خیال رکھا۔ اس علاقے میں وہ اکیلا ہی رہتا تھا۔ میں نے اس کے متعلق کئی مرتبہ کچھ جاننے کی کوشش کی مگر اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ ایک روز وہ مجھے اپنے گھر چھوڑ کر دوسرے گاؤں چلا گیا لیکن رات کے پچھلے پہر اس حالت میں واپس آیا کہ اس کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹی ہوئی تھی۔ وہ گھر سے گیا تو شلوار قمیص میں تھا مگر اب اس کے جسم پر کچھ اس طرح کا لباس تھا کہ وہ پرانی میکسیکن اور ویسٹرن فلموں کا ڈاکو معلوم ہوتا تھا۔ وہ بہت خوف زدہ اور پریشان بھی تھا۔ میرے اصرار پر آخر کار اس نے اپنی حقیقت بتا ہی دی۔ وہ ایک ڈاکو تھا۔ اس کے اس انکشاف پر میں حیرت سے گنگ ہوکر رہ گیا۔ اس کا اصل نام روحیل خان تھا۔ وہ دوسروں کی اپنے ساتھ زیادتیوں کے ردِعمل کے طور پر اس راستے پر چل پڑا تھا اور اب مجھ سے یہ چاہتا تھا کہ میں اس کا بھیس بدل کر اس کے

گھوڑے پر اس کے گھر سے نکلوں تاکہ وہ پولیس افسر جو اس کا تعاقب کر رہا تھا، میرے پیچھے لگ جائے اور اس کی جان بچ جائے۔ اس نے کیونکہ میری جان بچائی تھی لہٰذا میں نے بھی اس کی یہ بات مان لی لیکن اس شرط پر کہ آئندہ وہ ڈاکے نہیں ڈالے گا اور اس نے وعدہ کرلیا۔ میں اس کے گھر سے نکلا تو وہ فرض شناس پولیس افسر واقعی میرے پیچھے لگ گیا۔ میں نے اسے چکر دینے کی بہت کوشش کی لیکن ایک جگہ اس نے اپنے ایک ماتحت کانسٹیبل کے ساتھ مجھے گھیر ہی لیا۔ کانسٹیبل نے مجھے گولی مارنے کے لیے اپنی رائفل سیدھی کی لیکن اس سے پہلے میں نے اسے گولی ماردی اور وہاں سے نکل بھاگا۔ روحیل خان نے کہا تھا کہ اگر مجھے مدد کی ضرورت پڑے یا کوئی پریشانی درپیش ہو تو میں جانو کے اڈے پر پہنچ کر اس کا حوالہ دوں گا تو جانو ہر طرح سے میری مدد کرے گا۔ مجھ سے کیونکہ ایک پولیس والے کا خون ہوگیا تھا، اس لیے میں نے جانو کی مدد لینے کا فیصلہ کیا اور کافی جتن کے بعد بالآخر اس کے پاس پہنچ گیا۔ تعارف وغیرہ کے بعد جانو نے بتایا کہ روحیل خان ان کا خاص آدمی اور کروڑپتی شخص تھا۔ جانو کا خیال تھا کہ روحیل ان کے ساتھ غداری کر رہا تھا۔ ڈاکے کی جس واردات میں روحیل زخمی ہوا تھا، اس میں بہت بڑی رقم ان کے ہاتھ لگی تھی مگر وہ سب روحیل نے غائب کردی تھی۔ یہ سب کچھ بتانے کے بعد جانو نے مجھ سے لوٹ کے اس مال کا مطالبہ کردیا۔ میں نے ایسے کسی مال کے بارے میں لاعلمی ظاہر کی تو جانو کے آدمی ایک ساتھ مجھ پر پل پڑے مگر میں کسی کے قابو میں نہیں آیا اور سب کو دھنک کر رکھ دیا۔ آخر کار جانو کو یقین آہی گیا کہ مجھے لوٹی گئی رقم اور مال کے متعلق واقعی کچھ معلوم نہیں ہے۔ تب اس کے آدمیوں نے اس کے حکم پر مجھے ایک ویرانے میں لے جاکر چھوڑ دیا۔ میں کسی آبادی کی تلاش میں ہرے بھرے کھیتوں میں جانکلا جہاں ایک انتہائی حسین و جمیل عورت اور کچھ مرد کھڑے تھے۔ عورت کا نام زرتاج تھا اور وہ اس علاقے زرتاج نگر کی خاصی بڑی زمیندارنی تھی۔ وہ کافی پڑھی لکھی، انتہائی ذہین اور بہت خوبصورت خاتون تھی۔ تعارف وغیرہ کے بعد اس نے مجھے اپنے گھوڑوں کے فارم پر ملازمت کی پیشکش کی جسے میں نے قبول کرلیا۔ زرتاج نے ایک معقول قسم کا مکان بھی رہائش کے لیے مجھے فراہم کردیا۔ ایک روز جانو اور اس کا دست راست غیسو خان خلاف توقع زرتاج کے پاس پہنچ گئے اور اسے میرا حلیہ بتا کر میری بابت دریافت کیا مگر زرتاج نے لاعلمی کا اظہار کرکے مجھے بچالیا۔ جانو کے جانے کے بعد زرتاج اپنے ملازموں کے ہمراہ شکار پر چلی گئی جبکہ میں نے اپنے حلیے میں تھوڑی سی تبدیلی کے بعد ایک منصوبے کے تحت جانو کے دست راست غیسو خان سے ملاقات کی اور کافی دیر کی خوشامد اور چرب زبانی کے بعد اسے اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ مجھے بھی اپنے گروہ میں شامل کرلے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر گھنے جنگلات میں موجود ایک کھنڈر نما حویلی میں پہنچ گیا۔ یہ حویلی بس باہر ہی سے کھنڈر تھی، اندر سے بہت شاندار اور ضروریاتِ زندگی کی ہر چیز سے آراستہ تھی۔ اندر اسلحے اور دولت کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ وہاں دولت مند زمینداروں کے لیے عیش و عشرت کے تمام لوازمات بھی موجود تھے۔ میں نے کچھ وقت اس اڈے پر گزارا اور بہت سی حیرت انگیز چیزیں دیکھیں پھر میں غیسو خان کے ہمراہ واپس آگیا۔ راستے میں اس نے بہت سی کار آمد باتوں کے علاوہ یہ انکشاف بھی کیا کہ وہ لوگ زرتاج کو لوٹنے کا پروگرام بنا چکے ہیں بلکہ اس نے اس واردات کے لیے میرا بھی تقرر کردیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ مجھ پر اعتماد کرچکا ہے مگر ایک جگہ رک کر اس نے یہ انکشاف کیا کہ وہ مجھ سے یعنی افضل خان سے واقف ہے۔ اب وہ مجھے قتل کرنے کے ارادے سے اس ویرانے میں لایا تھا مگر قدرت نے مجھے محفوظ رکھا اور وہ خود میرے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ اس کی لاش کو ایک گڑھے میں ڈال کر میں واپس زرتاج کی حویلی میں پہنچ کر سو گیا۔ دوسرے روز ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں اس بینک کے سامنے پہنچ گیا جہاں زرتاج کو نقصان پہنچانے کے لیے جانو کے لوگوں کو ڈاکا ڈالنا تھا۔ میرا ارادہ اس واردات کو روکنے کا تھا۔ اچانک میں نے ایک شخص کو بینک سے نکلتے دیکھا اور مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا کیونکہ وہ انسپکٹر رحیم گل تھا۔ اسے وہاں دیکھ کر میں پریشان ہوگیا تھا لیکن جلد ہی وہ وہاں سے چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد واردات کی غرض سے ڈاکو ایک جیپ میں بینک کے سامنے پہنچ گئے۔ بوڑھے گن مین کو ہلاک کرکے وہ بینک کے دروازے کی طرف لپکے مگر میں نے انہیں اندر گھسنے کا موقع نہیں دیا اور کلاشنکوف کا برسٹ مار کے سب کو ہلاک کردیا جبکہ ایک ڈاکو جیپ لے کر فرار ہوگیا۔ ڈاکے کی واردات کو ناکام بنانے کے بعد میں اپنے حلیے میں تبدیلی کرکے رقم کا وہ تھیلا ساتھ لے کر جو میں نے غیسو خان سے چھینا تھا، جامی نگر روانہ ہوگیا۔ ابھی میں نے کچھ فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ ایک جوہڑ میں انسپکٹر رحیم گل مجھے بے ہوش پڑا نظر آیا۔ میں نے اسے ایک بیل گاڑی میں ڈال کر قصبے کے پولیس اسٹیشن روانہ کردیا اور خود اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔ جامی نگر پہنچ کر میں نے رقم کا تھیلا بس کنڈیکٹر عبدالرشید جسے ڈاکوؤں نے قتل کردیا تھا، کے اہلِ خانہ کو پہنچایا اور واپس زرتاج نگر پہنچ گیا۔ زرتاج شکار سے واپس آچکی تھی۔ ایک روز اس نے مجھے بلا کر بتایا کہ جانو نے اس سے پچاس لاکھ روپے کا مطالبہ کیا ہے اور عدم ادائیگی کی صورت میں خطرناک نتائج کی دھمکیاں دی ہیں۔ ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ اچانک جانو اپنے آدمیوں کے ساتھ انتہائی غیظ و غضب کے عالم میں زرتاج کے پاس پہنچ گیا۔ میں اس کی آمد سے قبل ہی بھاری پردوں کے پیچھے روپوش ہوچکا تھا۔ زرتاج نے جانو کی کوئی بات ماننے یا اس سے دبنے کے بجائے اسے خوب ذلیل کیا۔ اچانک زرتاج نے اپنے لباس میں چھپا ہوا پستول نکالا اور اپنے خاص آدمی عبدل کو شوٹ کردیا کیونکہ وہ جانو سے ملا ہوا تھا۔ اس موقعے پر جانو کے ساتھیوں کی توجہ ایک لمحے کے لیے زرتاج کی طرف مبذول ہوگئی۔ میں نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور عبدل کی کلاشنکوف اٹھا کر جانو کے ساتھیوں کو ٹھکانے لگا دیا مگر ایک بُری بات یہ ہوئی کہ جانو نے زرتاج کو یرغمال بنا لیا۔ وہ زرتاج کو ڈھال بنا کر فرار ہونا چاہتا تھا مگر میں نے اسے بھی ہلاک کردیا۔ اس اثنا میں گاؤں کی طرف سے بھی فائرنگ کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ شاید جانو کے گروہ نے گاؤں پر دھاوا بول دیا تھا۔ میں اور زرتاج اسلحہ ساتھ لے کر ایک جیپ میں گاؤں والوں کی مدد کے لیے روانہ ہوگئے۔ اچانک ایک جگہ زوردار چھناکا ہوا اور زرتاج یک دم مجھ پر آگری۔

قسط نمبر: ۴۶

میں نے بوکھلا کر اندھیرے میں زرتاج کو ٹٹولا لیکن وہ میرا ہاتھ ہٹاتے ہوئے جلدی سے بولی۔ "بس..... بس۔ میں ٹھیک ہوں۔"

میں نے اطمینان کی طویل سانس لی۔ گولی اسے نہیں لگی تھی۔ اس نے چند سیکنڈ مزید انتظار کیا اور جب دوسری گولی نہیں آئی تو وہ پیچھے ہٹ کر بیٹھ گئی۔ میں اس وقت ٹارچ روشن کرنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا کیونکہ پہلی گولی تو شاید "آوارہ" تھی۔ یونہی بھٹک کر ادھر آنکلی تھی لیکن روشنی دیکھ کر دوسری گولی کوئی نشانہ باندھ کر بھی چلا سکتا تھا۔

میں نے اندھیرے میں اتنا ضرور دیکھ لیا کہ ونڈ اسکرین کے ایک کونے میں سوراخ ہوچکا تھا اور کافی بڑے حصے میں مکڑی کا جالا سا پھیل گیا تھا تاہم پوری ونڈ اسکرین نہیں ٹوٹی تھی۔ گولی شاید زرتاج کے کندھے پر سے ہوتی ہوئی گزر گئی تھی۔ وہ اپنی گود میں ہاتھ مار کر کچھ جھاڑنے لگی۔ شاید کچھ

کرچیاں اس کی گود میں آن گری تھیں۔

چند لمحے ہم دونوں ساکت رہے لیکن ہماری سمت میں مزید کوئی فائر نہیں ہوا۔ گاؤں کی طرف سے البتہ دو طرفہ فائرنگ کی آوازیں اسی طرح سنائی دے رہی تھیں۔ میں اور زرتاج دور مار رائفلیں ہاتھ میں لیے اور ایک ایک بیگ کندھے سے لٹکائے پجیرو سے اتر آئے۔ خاصا فاصلہ ہم نے کمانڈوز کی طرح رکوع کی سی حالت میں طے کیا اور ایک کچی دیوار تک جا پہنچے۔

وہ درحقیقت ایک بہت بڑے باغ کی چار دیواری تھی۔ ہمیں اندازہ ہو چکا تھا کہ ڈاکو اس باغ میں مورچہ بند تھے۔ وہ یقیناً بڑے اچھے اور طے شدہ منصوبے کے تحت آئے تھے اور ”جنگی“ حکمتِ عملی کے اعتبار سے انہوں نے بہت اچھی جگہ منتخب کی تھی۔ باغ میں وہ یقیناً چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ شاید درختوں پر بھی چڑھے ہوئے تھے۔ یوں گاؤں کا بیشتر حصہ ان کی فائرنگ کی زد پر تھا جبکہ وہ خود گویا بنے بنائے مورچوں میں تھے۔

میں نے چند لمحے فائرنگ کی آوازیں سن کر کچھ اندازے قائم کیے اور نیچی آواز میں زرتاج سے کہا۔ ”میں زمین پر بیٹھتا ہوں، تم میرے کندھوں پر چڑھ کر اس دیوار سے اندر کود جاؤ۔“

”اس دیوار پر چڑھنے کے لیے مجھے تمہارے کندھوں پر چڑھنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ اطمینان سے بولی۔ اس نے اپنی گن اور بیگ مجھے تھمایا اور بازو اونچے کرکے ہاتھ دیوار پر جمائے۔ دوسرے ہی لمحے اس کے جسم نے ناگن کی طرح بل کھایا اور ایک بندریا کی سی پھرتی سے وہ دیوار پر چڑھ گئی۔ گو کہ اس کے لیے میرے ذہن میں آنے والی یہ دونوں تشبیہات مجھے قطعاً اچھی نہیں لگی تھیں۔ وہ نہ تو ناگن کی طرح زہریلی تھی اور نہ ہی بندریا کی طرح مضحکہ خیز لیکن صرف لچک اور پھرتی اس میں ان دونوں جیسی نظر آئی تھی۔

دیوار پر بیٹھ کر اس نے جھک کر مجھ سے گنیں اور بیگ لیے۔ دوسرے ہی لمحے میں بھی دیوار پر چڑھ گیا۔ ہم بہ خیرو عافیت باغ میں کودنے میں کامیاب ہوگئے۔ کسی گولی نے ہمارا استقبال نہیں کیا۔ گو کہ گاؤں کی سمت میں فائرنگ بدستور جاری تھی۔

ہم عقب سے باغ میں داخل ہوئے تھے اور دیوار سے لگ کر بیٹھ گئے تھے۔ زرتاج نیچی آواز میں بولی۔ ”میں اس طرف جاتی ہوں..... تم اس طرف جاؤ..... قسمت میں ہوا تو دروازے کی طرف ہم پھر آن ملیں گے.....“

اس کا مقصد تھا کہ ہم دونوں دائیں بائیں طرف سے باغ کے گرد ہوتے ہوئے جتنے بھی ڈاکوؤں کو تلاش کرکے

گورا کالا

افریقہ کے ایک شہر میں بار کونسل کے ارکان کا انتخاب ہو رہا تھا۔ مختلف جماعتوں کے امیدوار الیکشن لڑ رہے تھے۔ انہی میں ایک گورا وکیل بھی تھا۔ اس نے شہر کے باشندوں کو اپنے حق میں ہموار کرنے کے لئے ایک اشتہار شائع کروایا جس میں اس نے اپنے حق میں دلیلیں دیتے ہوئے یہ بھی لکھا تھا۔

”ہرچند کہ میری جلد کا رنگ سفید ہے لیکن میں اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ میرا دل آپ لوگوں کی طرح بالکل کالا ہے۔“

ہلاک کرسکیں، کردیں اور بتدریج آگے بڑھتے رہیں حتیٰ کہ باغ کے گیٹ کی طرف ہم ایک دوسرے کے سامنے آجائیں لیکن فی الحال اسے محض ایک خواب یا تمنا بھی کہا جاسکتا تھا کیونکہ راستے میں خود ہمارے مارے جانے کا بہت زیادہ امکان تھا۔ ہم کسی درخت کو مورچہ نہیں بنا سکتے تھے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کس درخت پر ڈاکو موجود ہیں یا کہاں درختوں کے درمیان کوئی مورچہ بند ہو۔

اس تجویز کا ایک اچھا پہلو یہ تھا کہ اگر ہم دونوں کمانڈوز کے مخصوص انداز میں تیزی سے فائرنگ کرتے اور گرینیڈ پھینکتے ہوئے ساتھ ہی نہایت پھرتی سے پوزیشن بدلتے ہوئے اپنے آپ کو بچا کر آگے بڑھ سکتے تو ڈاکوؤں کو یہ تاثر مل سکتا تھا کہ انہیں گھیرے میں لینے کے لیے کچھ لوگ یا پولیس فورس وغیرہ باغ میں گھس گئی ہے۔ ادھر انہیں جانو کی طرف سے کوئی سگنل نہیں ملا تھا۔ وہ بوکھلاہٹ کا شکار ہوسکتے تھے۔

اس روشن پہلو کے باوجود میں نے اس تجویز کو قبول نہیں کیا اور کہا۔ ”ہم اکٹھے ہی رہیں گے..... خواہ زندہ رہیں یا مر جائیں۔“

اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا۔ باغ میں تاریکی ذرا گہری محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے بھی دور تک کی چیزیں دیکھنے میں دقت پیش آنے لگی تھی لیکن میں کم از کم اس کا چہرہ..... اس کی آنکھیں تو اچھی طرح دیکھ ہی سکتا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے روشنی سی آئی اور معدوم ہوگئی۔

میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”آپ کا میرے ساتھ رہنا اس لیے ضروری ہے کہ اس باغ کے راستوں سے آپ زیادہ

اچھی طرح واقف ہیں اور میرا خیال ہے لڑائی کی ٹیکنک میں آپ سے بہتر جانتا ہوں۔"

"ممکن ہے یہ محض تمہارا خیال ہی ہو۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔" وہ مسکرائی۔ ان حالات میں بھی وہ وحشت زدہ نہیں تھی۔ انسان کو آدھی فتح تو اسی طرح حاصل ہو جاتی ہے کہ اس کے اعصاب شکست نہ کھائیں۔

"بعض اوقات خیال' حقیقت سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔" میں نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اس نے دوسری طرف جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور ہم دونوں دیوار سے لگ کر کھسکنے لگے۔

فائروں کی آوازوں سے مجھے اب کافی حد تک اندازہ ہونے لگا تھا کہ ڈاکو کہاں کہاں موجود تھے لیکن درختوں کے جھنڈ میں سے انہیں نکالنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس کوشش میں خود ہماری موجودگی ظاہر ہو سکتی تھی اور ہم فی الحال کسی محفوظ پوزیشن پر نہیں تھے۔

اچانک ایک زوردار دھماکا ہوا اور میں نے باغ کے ایک حصے میں ایک ثانیے کے لیے روشنی کا جھماکا دیکھا۔ ہم کچھ اور نیچے ہو کر دیوار کی جڑ میں دبک گئے۔ پے در پے دو تین اور ایسے ہی دھماکے ہوئے۔ فائرنگ کی آواز ان میں دب کر رہ گئی۔

"یہ تو گرینڈ استعمال ہو رہے ہیں!" میں نے قدرے حیرت سے کہا۔

"ہاں۔ میرے گاؤں کے لوگ استعمال کر رہے ہیں۔" زرتاج اطمینان سے بولی۔ "ڈاکوؤں کی دہشت گردیوں نے انہیں بھی پورا پورا کمانڈو بنا دیا ہے۔ حالانکہ ہمارا گاؤں آج تک محفوظ ہی چلا آ رہا تھا لیکن دہشت گردیوں کے قصے بہرحال سنتے آ رہے تھے۔ اچھا ہی ہوا کہ میں نے ان لوگوں کو اس قسم کی صورت حال کے لیے تیار رکھا تھا۔ تم دیکھ رہے ہو ؟ حملہ بالکل اسی طرح ہوا ہے جیسے دشمن ملک کی فوج چڑھائی کرنے کے لیے آئی ہو۔"

اسی دوران گاؤں کی طرف سے فائرنگ کی آوازیں مجھے قریب آتی محسوس ہونے لگیں تھیں۔ زرتاج بولی۔ "گاؤں والے پیش قدمی کر رہے ہیں۔" تب مجھے معلوم ہوا کہ اندازے لگانے میں زرتاج بھی کچھ ایسی اناڑی نہیں تھی۔ ہم خاصا آگے پہنچ چکے تھے لیکن ابھی تک ہم نے ایک بھی فائر نہیں کیا تھا۔

ہم ایک لمحے کے لیے رکے تو زرتاج سرگوشی میں بولی۔ "ذرا آگے مالی کا کمرا ہے۔ اس کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ وہ بہت اچھا مورچہ ثابت ہو سکتا ہے۔ دعا کرو کہ ہم خیریت سے اس تک پہنچ جائیں۔" اس بار میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ کے درمیان اس کی سرگوشی بہ مشکل سن پایا۔ جب سے باغ میں گرینڈ آ کر گرے تھے' مجھے باغ میں کچھ ہلچل کا سا احساس ہو رہا تھا۔ میں درختوں کے درمیان کچھ دیکھ تو نہیں پا رہا تھا لیکن محسوس کر رہا تھا کہ وہاں کچھ بھاگ دوڑ سی شروع ہو چکی تھی۔

اچانک زرتاج کا گرم و گداز ہاتھ مضطربانہ انداز میں میرے ہاتھ پر آ ٹکا اور وہ مجھے ایک طرف متوجہ کرتے ہوئے بولی۔ "وہ دیکھ رہے ہو؟"

میں نے اس کے اشارے کی سمت میں دیکھا۔ ادھر ایک کمرے کا ہیولا نظر آ رہا تھا جس کے آس پاس شاید کوئی باڑھ وغیرہ بھی تھی۔ وہ بولی۔ "یہی مالی کا وہ کمرا ہے جسے میں مورچہ بنانے کی بات کر رہی تھی۔"

لیکن اب یقیناً اس کا اشارہ کمرے کی طرف نہیں' اس کی چھت کی طرف تھا جس پر چند ہیولے متحرک نظر آ رہے تھے۔ ان ہیولوں کے درمیان ایک غیر متحرک چیز بھی دکھائی دے رہی تھی۔ انسانی ہیولے تین ٹانگوں والی اس چیز کو سیٹ کر رہے تھے۔

"تمہیں اندازہ ہوا وہ کیا ہے؟" زرتاج نے پوچھا۔

"ہاں۔ راکٹ لانچر ہے۔ آخر وہ گاؤں والوں کے گرینڈز کا جواب تو دیں گے۔" میں نے کہا۔ میں اندھیرے میں ان ہیولوں کی طرف دیکھ رہا تھا اور مجھے کچھ عرصہ پہلے ایک دور دراز مقام پر دیکھا ہوا تقریباً ایسا ہی ایک منظر یاد آ رہا تھا جب بلوچستان کے قریب سندھ کے ایک دور افتادہ مقام پر ڈاکوؤں نے اسی طرح ایک مکان کے گرد محاصرہ ڈالا ہوا تھا۔ تب بھی میں نے اسی طرح ایک پہاڑی پر راکٹ لانچر کا ہیولا نمودار ہوتے دیکھا تھا۔ بعض ڈاکو تو لانچر کے لیے ٹرائی پوڈ بھی فٹ کرنے کی زحمت نہیں کرتے تھے۔ وہ لانچر کندھے پر رکھ کر ہی راکٹ فائر کر دیتے تھے۔

"یہ تو بہت دور دور تک تباہی پھیلائیں گے۔" زرتاج مضطربانہ انداز میں بولی۔

"قدرت نے ہمیں بروقت ہی یہاں بھیجا ہے۔" میں نے کہنیوں کے بل لیٹتے ہوئے کہا۔ "اور ہم یہاں ان کی کارروائیوں کا صرف معائنہ کرنے نہیں آئے۔"

اس نے بھی میری تقلید کی۔ کمرے کی چھت زیادہ اونچی نہیں تھی۔ سینے کے بل لیٹنے کے باوجود ہیولے ہماری نظر میں رہے۔ اس سے پہلے کہ وہ راکٹ فائر کرتے' ہماری رائفلوں نے ٹولیاں اگلیں اور وہ چاروں کے چاروں کمرے کی چھت سے لڑھک پڑے۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے بھی تیزی سے لڑھک کر اپنی پوزیشن بدل لی اور کمرے کے کچھ قریب ہو گئے۔ جہاں ہم ایک لمحہ پہلے موجود تھے وہاں بھی کوئی گولی

نہیں آئی۔ کمرے کی چھت پر موجود ڈاکوؤں کو تو یقیناً پتا نہیں چلا ہوگا کہ موت نے کس سمت سے انہیں آن دبوچا تھا لیکن باغ میں موجود ڈاکوؤں کو بھی شاید کچھ اندازہ نہیں ہوا تھا۔ انہیں غالباً یہی اطمینان تھا کہ اس وقت باغ پر ان کا قبضہ تھا۔ کوئی اور باغ میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا تاہم انہیں یہ ضرور معلوم ہوگیا تھا کہ کمرے کی چھت پر کوئی گڑبڑ ہوئی تھی کیونکہ میں نے کچھ ہی دور درختوں کے درمیان دھب سے کسی کے کودنے کی آواز سنی پھر اچانک ہی دو سیاہ پوش، درختوں کے درمیان سے بھاگتے ہوئے باہر آئے۔

ان کی یہ حرکت قطعی اضطراری اور بے وقوفانہ تھی۔ ان کے ہاتھوں میں گنیں تھیں۔ وہ اس طرح اندھادھند دوڑتے ہوئے نکلے تھے کہ ہم بھی فوری ردعمل پر مجبور ہوگئے ورنہ شاید وہ انجانے میں ہمارے سروں پر ہی آن پہنچتے۔ میں نے اور زرتاج نے بیک وقت فائر کیا، وہ دونوں بھی ڈھیر ہوگئے۔

ہم نے تیزی سے پھر پوزیشن بدلی اور کمرے کے مزید قریب ہوگئے۔ وہیں باغبانی میں کام آنے والی بہت سی چیزیں زمین پر پڑی تھیں۔ ہم نے ان کی آڑ لینے کی کوشش کی۔ ہمیں اپنے تھیلے ساتھ رکھنے میں بڑی دقت پیش آرہی تھی لیکن ہم انہیں چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ ان میں فاضل میگزین اور گرینیڈ تھے جن کی ضرورت پڑسکتی تھی۔ مقابلہ طول کھینچ سکتا تھا۔ ڈاکو تو اس بے دردی سے ایمونیشن ضائع کررہے تھے گویا ان کے پاس ٹرکوں کے حساب سے موجود تھا۔

میں یکدم کمرے کے قریب جانا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ شاید کوئی ڈاکو کمرے کے اندر بھی موجود ہو۔ اس دوران ہم چند بوریوں کے قریب پہنچ چکے تھے جن سے بدبو آرہی تھی۔ شاید وہ کھاد کی بوریاں تھیں۔ میں نے انہیں مورچہ بنانے کے ارادے سے ان کی آڑ میں ہونا چاہا تو اچانک مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میری ٹانگ پکڑنے کی کوشش کی ہو۔

میں اچھل کر ایک طرف ہٹا اور زمین کی طرف فائر کرتے کرتے رہ گیا۔ بوریوں کی آڑ میں ایک شخص آڑا ترچھا پڑا نظر آیا لیکن فوراً ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ زندہ نہیں تھا۔ اس کا بازو ایک طرف کو پھیلا ہوا تھا اور میرا پاؤں اس میں الجھ گیا تھا۔

پھر مجھے اپنے پیروں تلے خون کی چپچپاہٹ محسوس ہوئی۔ اس دوران زرتاج بھی لاش کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اس نے اندھیرے میں جھک کر اس کا جائزہ لیا اور بے اختیار اس کے ہونٹوں سے دبی دبی سی سسکی نکلی۔

"یہ ہمارا مالی تھا۔۔۔" اس نے سرگوشی میں بتایا۔ اس کی نیچی آواز میں بھی مجھے غیظ و غضب کی لہر مچلتی محسوس ہوئی۔ "ان کتوں نے اس بے چارے بے ضرر سے آدمی کو بھی مار ڈالا۔۔۔ اتنا شریف۔۔۔ نمازی اور پرہیزگار شخص تھا۔۔۔ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ یہاں رہتا تھا۔۔۔ معلوم نہیں ان بے چاروں کا کیا بنا ہوگا۔۔۔"

اس سوال کا جواب بھی ہمیں چند سیکنڈ بعد ہی مل گیا۔ دیوار کے ساتھ تین لاشیں اور پڑی تھیں۔ ایک عورت تھی اور دو نوعمر لڑکے۔ میرے دل میں بھی تاسف کی ایک لہر ابھری۔ کسی شریف اور بے ضرر انسان کا بے جواز اور ظالمانہ قتل ہمیشہ میرے دل میں ایک چبھن اور اضطراب سا پیدا کردیتا تھا۔

زرتاج بھی اب گویا بپھر چکی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ گن لیے درختوں کے درمیان جا گھستی اور چاروں طرف گولیوں کی بوچھاڑ کردیتی لیکن ظاہر تھا کہ اس موقعے پر یہ محض ایک حماقت ہوتی۔

اس دوران درختوں میں چھپے ہوئے ڈاکوؤں کو معلوم ہوچکا تھا کہ مالی کی کوٹھڑی کی سمت میں گڑبڑ ہوچکی تھی۔ اس طرف گولیوں کے برسٹ پڑنے لگے تھے۔ میں اور زرتاج جلدی سے کوٹھڑی کی آڑ میں ہوگئے۔ کوٹھڑی کیا تھی، اچھا خاصا پکا کمرا تھا اور اس وقت ایک بہت عمدہ مورچہ ثابت ہوسکتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ مورچے کی آڑ میں ہمارے دبکے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اور ڈاکو ہماری نظروں سے اوجھل تھے۔

اچانک مجھے درختوں کے درمیان کچھ سائے متحرک نظر آئے۔ میری نظر جو اندھیرے میں بھی کافی بہتر طور پر کام کرتی تھی، اس موقعے پر میرے بہت کام آرہی تھی۔ میں نے رائفل استعمال کرنے میں تاخیر نہیں کی۔ درختوں کے درمیان کہیں غراہٹ آمیز سی ایک چیخ ابھری۔ میری چلائی ہوئی گولیاں کسی نہ کسی حد تک کارآمد رہی تھیں۔

اس دوران دو تین گرینیڈ اور باغ میں پھٹے۔ باہر سے فائرنگ کی آواز بھی قریب آتی جارہی تھی۔ تڑتڑاہٹ کے درمیان جو بھی ذرا ذرا سا وقفہ آتا تھا اس میں مجھے زرتاج کی دھیمی سی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ وہ خوش ہوتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "گاؤں والے پیش قدمی کررہے ہیں۔ آج کی رات ڈاکوؤں پر بھاری ہوگی۔ زرتاج نگر کا رخ کرکے انہوں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی حماقت کی ہے۔۔۔"

ایک گرینیڈ ہم سے کچھ دور ہی درختوں کے درمیان گر کر پھٹا اور روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ اب میں نے پہلی بار ڈاکوؤں میں سے کسی کی آواز سنی۔ وہ چیخ کر کسی سے کچھ کہہ رہا تھا۔

اب تک ان کا سکوت قائم تھا۔ ان کا بول اٹھنا ان کی بوکھلاہٹ کی نشانی تھی۔ الفاظ پوری طرح تو میری سمجھ میں نہ آئے لیکن اندازہ ہوگیا کہ وہ راکٹ لانچر والوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا کہ انہوں نے ابھی تک راکٹ کیوں فائر نہیں کیا تھا۔ جواب میں کسی نے چیخ کر غالباً اسے یہ بتایا کہ ادھر گڑبڑ ہوچکی تھی۔ یہ آواز زیادہ دور سے نہیں آئی تھی۔ میں نے اندازاً آواز پر فائر کیے۔ ایک لمحے کے لیے ڈاکوؤں کی طرف سے فائرنگ گویا بالکل ہی تھم گئی۔ ان کا جانی نقصان بڑھتا جارہا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے مالی کے کمرے کی سمت میں برسٹ آیا۔ ہم سے کچھ دور ایک ٹوٹے ہوئے درخت کا تنا پڑا تھا۔ میں نے اس میں بھی گولیاں پیوست ہونے کی آواز سنی۔

اس کے فوراً بعد مجھے دائیں طرف کافی دور سے پے در پے کئی دھماکے سنائی دیے پھر دیوار کا ایک حصہ نیچے آن گرا۔ ایک لمحے کی تاخیر سے میری سمجھ میں آیا کہ باغ کا دروازہ گرینیڈ مار کر توڑا گیا تھا۔ گاؤں کے لوگ ڈاکوؤں کی فائرنگ کے باوجود محض اپنے دفاع کے لیے گھروں کی چھتوں تک محدود نہیں رہے تھے۔ نہ جانے کس طرح وہ باغ کے قریب آتے جارہے تھے۔ تاہم اگر وہ گیٹ کے راستے اندر داخل ہونے کی کوشش کرتے تو یہ ان کی حماقت ہوتی کیونکہ ملگجے اندھیرے میں وہ شگاف کسی حد تک نظر آرہا تھا جو لکڑی کا گیٹ گرنے سے پیدا ہوا تھا۔ غنیمت تھا کہ گیٹ نے آگ نہیں پکڑی تھی۔ اگر وہ لوگ اس شگاف سے داخل ہونے کی کوشش کرتے تو ان کے ہیولے ڈاکوؤں کی نظر میں آسکتے تھے۔

کسی نے گیٹ سے داخل ہونے کی کوشش نہیں کی لیکن فائرنگ کی آوازیں اس طرف سے بہرحال آتی رہیں۔ ایک گرینیڈ اور مالی کے کمرے سے ذرا ہی فاصلے پر آکر پھٹا۔ اس کے دھماکے سے تو کمرے کی دیوار سے کچھ مٹی جھڑ کر ہمارے اوپر گری۔

زرتاج خوش ہوتے ہوئے بولی۔ ”سلیم کی ٹریننگ کام آرہی ہے۔ مجھے امید ہے ہمارے آدمی ڈاکوؤں کو باغ میں گھیر لیں گے اور انہیں ماریں گے۔“

”یہ سلیم کون ہے؟“

”ایک ریٹائرڈ میجر۔“ زرتاج نے جواب دیا۔ ”میں نے گاؤں کو ڈاکوؤں سے بچانے کے لیے رات کی چوکیداری کی جو اسکیم شروع کرا رکھی تھی وہ اس کا انچارج ہے۔ آدمیوں کو ٹریننگ بھی اسی نے دی ہے۔ وہی ٹریننگ تو اس وقت کام آرہی ہے۔“

”اس ٹریننگ میں کہیں ہم ہی کام نہ آجائیں۔“ میں نے کہا۔ ”گرینیڈ اب ہمارے بھی قریب آکر گررہے ہیں۔ ایک آدھ گرینیڈ ذرا اور ادھر کو آن گرا تو اپنا کام تمام ہوجائے گا۔“

”ہاں۔۔۔۔“ اس نے بے آواز سی ہنسی کے ساتھ کہا۔ ”ان بے چاروں کو کیا معلوم کہ میں بھی باغ میں آن گھسی ہوں۔“

”واقعی۔ میرے ہونے نہ ہونے سے تو کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن آپ کے احترام میں شاید وہ کچھ محتاط ہوجاتے۔“ میں نے کہا۔

”لیکن میں نہیں چاہتی کہ وہ محتاط ہوں۔ یہ موقع محتاط ہونے کا نہیں ہے۔ اگر انہیں یہاں میری موجودگی کا علم ہوجائے اور وہ محتاط ہوجائیں تو ان کا اور ہمارا کام تمام ہی سمجھو۔“ وہ بولی۔

”میں تو اب بھی کم از کم اپنا کام تمام ہی سمجھ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ کے گاؤں والوں کے حوصلے اتنے بلند ہیں اور وہ دفاع کے بجائے ڈاکوؤں کو گھیر کر مارنے کے لیے نکل کھڑے ہوں گے تو ہم بھی یہاں آنے کے بجائے ان سے ملنے کی کوشش کرتے تاکہ انہیں سہارا ملتا۔ اب انہیں بھی ہم سے کوئی خاص مدد نہیں مل رہی اور ہم دونوں برسرپیکار فریقوں کے درمیان پھنس گئے ہیں۔“

”خیر اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔“ وہ بولی۔ ”ہمارے یہاں آنے کا فائدہ تو بہت ہوا ہے۔ ہم بہت بروقت یہاں پہنچے تھے۔ آتے ہی ہم نے راکٹ لانچر استعمال کرنے والوں کو ٹھکانے لگا دیا، یہی بہت اہم کام تھا۔ گاؤں والوں کے لیے باغ سے دور رہتے ہوئے یہ کام کرنا بہت مشکل تھا اور اگر ڈاکو چند راکٹ فائر کرنے میں کامیاب ہوجاتے تو گاؤں والوں کی پیش قدمی کی ہمت ہی نہ پڑتی۔ ان کے لیے اپنے گھروں کو بچانا ہی مشکل ہوجاتا۔ نہ جانے کتنے لوگ مرتے اور کتنے مکان تباہ ہوتے۔ اس کے علاوہ ہم نے دو تین دوسرے ڈاکوؤں کو بھی ہلاک کیا ہے۔ تھوڑی سی دیر میں گاؤں والوں کا اتنا ہاتھ تو بٹا دیا ہے۔ یہ کیا کم ہے؟“

”رپورٹ تو ہمت افزا ہے آپ کی۔“ میں نے بیگ سے ایک گرینیڈ نکالتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میں ذرا اس سے تیز ایکشن چاہتا تھا۔“

”جتنا کچھ ڈاکوؤں کے ساتھ ہوچکا ہے میرے لیے تو وہی بہت امید افزا ہے۔ آدمی تو انہی کے مارے جارہے ہیں۔ سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ وہ منحوس جانو مارا جاچکا ہے۔ اس کا گروہ اس علاقے میں سب سے بڑا تھا۔ آج کی رات ان کی طاقت ٹوٹ جائے تو اس علاقے سے ایک بہت بڑی نحوست ٹل جائے گی۔ یہاں کی ترقی آسان ہوجائے گی۔“

"آپ طاقت ٹوٹنے کی بات کر رہی ہیں..... میرا خیال ہے، آج کی رات یہ گروہ ختم ہوجائے گا۔" میں نے اعتماد سے کہا۔ اس اعتماد کی بنیاد کیا تھی، یہ فی الحال مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا۔

"خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔" وہ بولی۔

میں نے ایک گرینیڈ کی پن نکال کر اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ "جس وقت میں گرینیڈ پھینکوں، عین اسی وقت آپ کو یہ گرینیڈ پوری قوت سے اس سمت میں پھینکنا ہے۔" میں نے اشارے سے اسے سمجھایا۔

"گویا ہمیں ڈاکوؤں کو اپنی موجودگی کا پوری طرح یقین دلادینا چاہیے؟" اس نے نیم سوالیہ انداز میں کہا۔

"انہیں ہماری موجودگی کا علم تو ہوچکا ہے۔ وہ دوسری طرف اُلجھے ہوئے ہیں اس لیے ہماری طرف بھرپور حملہ نہیں کر رہے ہیں۔ اب ہمیں ان کو یہ تاثر دینا ہے کہ یہاں کئی افراد موجود ہیں۔ تابڑ توڑ ان پر گرینیڈ پھینکنے ہیں، خواہ چند سیکنڈ میں ہی ہمارے پاس گرینیڈ ختم ہوجائیں۔ اس کے ساتھ ہی فائرنگ بھی کرنی ہے۔ اس مورچے سے پورا پورا فائدہ اٹھانا ہے۔ اس طرح گاؤں سے جو لوگ باغ کو گھیرے میں لے رہے ہیں انہیں بھی اندازہ ہوجائے گا کہ اندر ان کا ساتھ دینے والے کچھ لوگ موجود ہیں۔ دوسرے ڈاکوؤں پر دو طرف سے دباؤ پڑے گا۔ ہمیں کسی طرح ان کو ان درختوں کے درمیان سے نکالنا ہے۔ درخت ان کے لیے بہت اچھی پناہ گاہ بن گئے ہیں۔"

وہ میرا منصوبہ سمجھ گئی۔ میری طرح اس نے بھی بیک وقت دونوں ہاتھوں میں، پن نکلے ہوئے دو گرینیڈ سنبھال لیے۔ رائفلیں ہم نے زمین پر رکھ دی تھیں۔ میرے اشارہ کرنے سے پہلے وہ بولی۔ "اگر جواباً انہوں نے بھی گرینیڈ استعمال کیے تو کیا ہوگا؟ ہم تو محدود سی جگہ میں پھنسے ہوئے ہیں۔ یہ کمرا بھی ٹوٹ کر ہم پر گر سکتا ہے۔"

"میں اتنی دیر سے یہی اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرا خیال ہے ان کے پاس گرینیڈ نہیں ہیں ورنہ وہ اب تک ضرور استعمال کرتے۔ جبکہ انہیں اندازہ ہوچکا ہے، گاؤں والے دیوار کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ ڈاکو شاید راکٹ لانچر پر ہی تکیہ کیے ہوئے تھے اور وہ ان کے لیے بیکار ہوگیا ہے۔"

زرتاج نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے فائرنگ کی آوازوں سے اندازے قائم کیے تھے کہ درختوں کے درمیان ڈاکو کہاں کہاں موجود تھے۔ گرینیڈ پھینکنے کے لیے میں نے ایسی ہی چند جگہیں منتخب کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے زرتاج کو بھی اشاروں کے ساتھ انہی جگہوں کے بارے میں بتایا تھا۔

وہ میرا مقصد یقیناً اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔

ہم نے نہایت تیزی سے یکے بعد دیگرے چار گرینیڈ پھینکے اور ان کے دھماکوں کا ارتعاش ختم ہونے سے پہلے مختلف سمتوں میں چند راؤنڈ فائر کیے۔ درختوں کے درمیان مجھے کچھ ہلچل کا احساس ہوا پھر ہماری طرف بھی فائرنگ ہونے لگی لیکن وہ نہایت معمولی تھی۔ پکے کمرے کی آڑ میسر ہونے کی وجہ سے ہمیں اس کی کوئی خاص پروا نہ تھی۔

اچانک مجھے باغ کی دوسری دیوار کی طرف سے بھی فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ گاؤں والوں نے کیا ہوشیاری دکھائی تھی۔ انہوں نے ڈاکوؤں کی توجہ گیٹ کی طرف مبذول رکھی تھی لیکن درحقیقت کچھ لوگ بغلی دیوار سے باغ میں آکودے تھے۔ اب ڈاکوؤں پر ایک طرف سے ہم حملہ کر رہے تھے اور دوسری طرف سے گاؤں والے۔

ڈاکوؤں کے خوابوں کی تعبیر بالکل اُلٹی نکلی تھی۔ انہوں نے یقیناً یہ سوچا ہوگا کہ وہ باغ میں مورچہ بند ہوکر پہلے گاؤں پر فائرنگ کرکے اور راکٹ برسا کر لوگوں کو خوفزدہ کرکے گھروں میں دبکنے پر مجبور کریں گے۔ اس طرح وہ خود بھی جوابی حملے سے محفوظ رہیں گے۔ اس کے بعد وہ گلی کوچوں میں گھس کر تباہی پھیلا دیں گے، مکانوں کو آگ لگا دیں گے۔ جو سامنے آئے گا اسے ہلاک کردیں گے اور جو ہاتھ لگے گا وہ لوٹ لیں گے۔ ان علاقوں میں ڈاکو عموماً اسی طرح تباہی پھیلاتے تھے۔ خصوصاً جس گاؤں میں وہ جذبۂ انتقام کے ساتھ داخل ہوتے تھے وہاں وہ چنگیزی اور تاتاری دور کی یاد تازہ کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن ان لوگوں کے گاؤں میں گھسنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ وہ خود مصیبت میں گھر گئے تھے۔ یہ وقت وقت کی بات تھی۔

ادھر ہم نے اپنی حکمتِ عملی کے مطابق اپنا اسلحہ استعمال کیا اور ادھر باغ کی پرلی دیوار کی طرف سے بھی دباؤ بڑھتا چلا گیا۔ مزید چند گرینیڈ استعمال ہوئے۔ حتیٰ کہ مجھے اندیشہ محسوس ہونے لگا کہ باغ میں آگ نہ لگ جائے۔ زیادہ ہریالی اور نمی کے باعث ابھی تک باغ میں آگ لگی تو نہیں تھی لیکن کئی بار ایسے آثار دکھائی ضرور دیے تھے۔

جلد ہی ڈاکوؤں نے اس احساس کو بھی شاید خیرباد کہہ دیا کہ درختوں کے درمیان وہ زیادہ محفوظ تھے۔ میں نے چند ہیولوں کو درختوں سے نکل کر رکوع کی سی حالت میں باغ کی عقبی دیوار کی طرف دوڑتے دیکھا۔ میری نظر اتفاقاً ہی اس طرف چلی گئی تھی ورنہ میں اس وقت دوسری طرف متوجہ تھا۔ زرتاج اس وقت کمرے کے دوسرے کونے پر تھی۔

میں لڑھک کر اس کے قریب پہنچا اور اسے اس گوشے

کی طرف متوجہ کیا جدھر بندوق بردار ہیولے تیزی سے دیوار پر چڑھنے لگے تھے۔ ہم ان سب کو گولیوں کا نشانہ بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے علاوہ بھی ہمیں دیوار کے آس پاس اندھیرے میں جہاں کہیں خفیف سی حرکت کا بھی شبہ ہوا وہاں ہم نے گولیاں برسائیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ جتنے ڈاکوؤں نے بھی بھاگنے کی کوشش کی تھی وہ سب کے سب مارے گئے تھے۔

ہم جس دیوار کی طرف تھے وہاں سے ہمیں گیٹ اور عقبی دیوار کا بیشتر حصہ سرمئی آسمان کے پس منظر میں کسی نہ کسی حد تک دکھائی دے رہا تھا۔ اگر باغ کی دوسری بغلی دیوار یا کسی اور راستے سے گاؤں کے کچھ لوگ باغ میں داخل ہونے میں کامیاب ہو چکے تھے تو باقی حصوں پر ان کی نظر رہ سکتی تھی۔ اس طرح ڈاکوؤں میں سے اگر کچھ باقی بچ گئے تھے تو باغ ان کے لیے محفوظ مورچے کے بجائے چوہے دان بن چکا تھا۔ گاؤں والوں کی اور ہماری جرائت ہمارے کام آگئی تھی۔ اگر سب لوگ سہم کر گھروں میں دبک جاتے تو اس وقت ان کی وہی حالت ہوتی جو ڈاکوؤں کی تھی۔

یک دم باغ کے دوسری طرف سے بھی فائرنگ بند ہو گئی۔ باغ میں ایک عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ اس خاموشی میں موت کی سرگوشیاں رچی ہوئی تھیں۔ گاؤں کے لوگوں نے غالباً ڈاکوؤں کے ردِعمل کا جائزہ لینے کے لیے اچانک فائرنگ بند کر دی تھی۔ شاید وہ بھی جاننے کی کوشش کر رہے تھے کہ باغ میں کچھ ڈاکو باقی ہیں یا سب کا ہی صفایا ہو چکا ہے۔ انہیں یہ اندازہ تو یقیناً ہو گیا تھا کہ باغ میں دوسری طرف ان کا ساتھ دینے والے کچھ لوگ موجود تھے جن کی وجہ سے ان کا کام آسان ہو گیا تھا۔

سکوت کئی لمحوں پر پھیل گیا۔ درختوں کے درمیان سے کوئی فائر نہ ہوا۔ ابھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ ڈاکو بھی کوئی چال چل رہے تھے یا واقعی کوئی ڈاکو زندہ نہیں بچا تھا۔ ادھر گاؤں والوں کے سکوت سے کچھ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ صبح تک انتظار کرنے پر کمربستہ تھے۔ صبح کا اجالا پھیلنے پر یہ مقابلہ واضح صورت اختیار کر سکتا تھا۔ دونوں فریقوں کو ایک دوسرے کے مورچوں کا صحیح اندازہ ہو سکتا تھا لیکن دن کی روشنی میں گاؤں والوں کا جانی نقصان بڑھ بھی سکتا تھا۔

آخرکار گاؤں والوں نے خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ میں نے بہت دور باغ کے ایک گوشے میں دو تین ٹارچیں روشن ہوتے دیکھیں۔ وہ یقیناً طاقتور ٹارچیں تھیں۔ میں نے ان کی روشنی درختوں کے درمیان بھی دور تک پہنچتے دیکھی لیکن ٹارچیں صرف ایک لمحے کے لیے روشن ہوئی تھیں۔ ٹارچیں روشن کرنے والوں نے یقیناً انہیں بجھا کر فوراً ہی پوزیشن تبدیل کر لی تھی۔ تاہم ڈاکوؤں کی طرف سے تب بھی کوئی گولی نہ چلی۔

اس وقت تک زرتاج بھی بیگ سے ٹارچ نکال چکی تھی۔ وہ میری طرف مڑتے ہوئے سرگوشی میں بولی۔ ”میرا خیال ہے میں بھی اپنے لوگوں کو یہاں اپنی موجودگی کا سگنل دے ہی دوں۔ انہیں اگلا قدم اٹھانے میں آسانی رہے گی۔“

”ابھی چند لمحے اور ٹھہر جاؤ۔“ میں نے مشورہ دیا۔

وہ چند لمحے ایک عجیب قسم کے تناؤ میں گزرے۔ ہم دونوں دیوار کے ساتھ چپکے نہایت آہستگی سے گردن گھماتے ہوئے جہاں تک نظر جا سکتی تھی، کسی متحرک ہیولے کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن کہیں کوئی چیز حرکت کرتی دکھائی نہ دی۔ اتنے زبردست ہنگامے اور گھن گرج کے بعد یک دم ہی ہر طرف موت کا سکوت پھیل گیا تھا۔ فضا میں خون اور بارود کی بو محسوس ہو رہی تھی۔

بالآخر زرتاج نے ایک لمحے کے لیے ٹارچ روشن کی اور فوراً ہی بجھا کر کمرے کی آڑ میں ہو گئی۔ درختوں کے درمیان تب بھی سکوت ہی رہا۔ کوئی ردِعمل ظاہر نہ ہوا۔

”میرا خیال ہے معرکہ ختم ہو چکا ہے۔ ڈاکوؤں کا صفایا ہو گیا ہے۔“ زرتاج سرگوشی میں بولی۔

”لگتا یہی ہے۔“ میں نے تائید کی۔ زرتاج نے ایک بار پھر روشنی کا سگنل دیا۔ اس بار باغ کے ایک حصے سے روشنی ہی کے سگنل کی صورت میں جواب ملا۔ مزید چند لمحوں کے انتظار کے بعد ان لوگوں کو بھی حوصلہ ہوا اور کسی نے چیخ کر پوچھا۔ ”ادھر کون ہے۔“

”میں ہوں..... زرتاج.....!“ زرتاج نے چیخ کر جواب دیا۔

دوسری طرف وہی پہلا سا سکوت چھا گیا۔ ان لوگوں کو شاید اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا کہ اس معرکے کے دوران زرتاج باغ میں گھسی ہوئی تھی۔ انہوں نے مزید چند لمحے انتظار کیا۔ بالآخر وہ جن گوشوں میں زمین یا دیوار سے چپکے ہوئے تھے، وہاں سے نکلنے لگے۔ میں نے ایک طرف سے چند ہیولوں کو اپنی طرف آتے دیکھا۔

ان میں سے ایک نے احتیاطاً اندھیرے میں آواز لگائی۔ ”گولی مت چلائیے گا.....“

پھر دھیرے دھیرے اِدھر اُدھر سے اندھیرے کی آغوش سے بہت سے لوگ نکل آئے۔ ان کے پاس مختلف گنیں تھیں۔ انہوں نے ٹارچیں روشن کیں اور کمرے کے عقب میں ہم دونوں کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ میری تو انہیں خیر کوئی خاص پروا نہیں تھی لیکن زرتاج کو بہ خیروعافیت دیکھ کر گویا ان کی جان میں جان آئی۔

بڑی عمر کا ایک قد آور اور صحت مند شخص آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ "آپ کو اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے کی کیا ضرورت تھی رئیسانی جی؟ ہم لوگ جو موجود تھے۔ خادموں کے ہوتے ہوئے مالکوں کو بندوق اٹھانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"صرف خادم ہی مالکوں کے محافظ نہیں ہوتے' مالک بھی خادموں کے محافظ ہوتے ہیں۔ جب تک دونوں میں شانہ بہ شانہ لڑنے کی اہلیت نہ ہو' دونوں ہی خطرے میں رہتے ہیں۔" زرتاج نے جواب دیا۔ "ویسے بھی اگر میں یہاں نہ آتی تب بھی خطرہ تو میرے گھر ہی پہنچ چکا تھا۔ تم لوگوں کو تو معلوم بھی نہیں ہوگا کہ جانو ہمارے ایک غدار ملازم کی مدد سے تمام محافظوں کو بے ہوش کرکے حویلی میں آن گھسا تھا۔ اس نے تو مجھے یرغمال بنالیا تھا....."

پھر اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ "اگر یہ صاحب ہمارے ساتھ نہ ہوتے تو شاید آج کے معرکے کا نتیجہ بہت مختلف ہوتا۔"

ان میں سے بیشتر نے حیرت سے میری طرف اور پھر رئیسانی کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے گھوڑے سدھانے والے کی حیثیت سے جانتے تھے۔ انہیں شاید اس بات پر حیرت تھی کہ زرتاج میرے لیے "صاحب" کا لفظ استعمال کر رہی تھی۔ زرتاج بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "جتنی بھی ٹارچیں تم لوگوں کے پاس ہیں وہ سب روشن کرکے ٹولیوں میں پورے باغ میں پھیل جاؤ اور جائزہ لو کہ کیا صورت حال ہے۔ محسوس تو یہی ہو رہا ہے کہ سب ڈاکو کُتّے کی موت مارے جاچکے ہیں۔ پولیس وغیرہ کے حصے کا کام ہم لوگوں نے انجام دے دیا ہے۔"

"ان علاقوں میں اگر دو چار جگہ بھی ڈاکوؤں کو اس قسم کے ردِ عمل کا سامنا کرنا پڑ جائے تو مجھے امید ہے کہ ان کا زور ٹوٹ جائے۔" ان میں سے ایک شخص بولا۔

بڑی عمر کا قد آور اور صحت مند شخص جس کے بارے میں مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ریٹائرڈ میجر سلیم تھا' ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "ایسا ہونا بہت مشکل ہے کیونکہ ہر گاؤں زرتاج نگر نہیں ہوتا۔"

ہم سب لوگ ٹارچیں لے کر ٹولیوں کی صورت میں باغ میں بکھر گئے۔ باغ میں واقعی میدانِ کارزار کا سا سماں تھا۔ ہینڈ گرینیڈز نے کافی تباہی پھیلائی تھی۔ میں ڈاکوؤں کی تعداد دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنے بہت سے ڈاکو ہم لوگوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ بعض لاشوں کے چہرے مسخ ہوگئے تھے اور بعض کے اعضا الگ ہوگئے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ اس پیمانے پر ڈاکوؤں کی ہلاکت

میں ہماری حکمتِ عملی کے علاوہ کسی غیبی امداد کو بھی دخل تھا۔

اپنے اس "سروے" کے دوران بھی ہم ذرا محتاط ہی رہے۔ اندیشہ تھا کہ کوئی ڈاکو زندہ نہ ہو اور کہیں چھپا ہوا نہ ہو۔ ہم پر اچانک ہی گولیوں کی بوچھاڑ بھی ہوسکتی تھی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ مجھے اس پر بھی حیرت ہوئی۔ ڈاکوؤں کا قطعی غیر متوقع طور پر صفایا ہو گیا تھا۔

لاشیں جہاں جہاں تھیں اور جس حالت میں تھیں، ہم نے انہیں اسی طرح وہیں رہنے دیا۔ بالآخر ایک جگہ رکتے ہوئے میں نے زرتاج سے کہا۔ "آج کی رات ہمارے لیے بہت مبارک رہی ہے۔ ہمارے دو تین آدمی کام ضرور آئے ہیں لیکن اس قربانی کے بعد ایک بہت بڑے فتنے کا بڑی حد تک خاتمہ ہو گیا لیکن میرے خیال میں ابھی کچھ کام باقی ہے۔ اس وقت ہمارا لہو گرم ہے اور ہمارے سر پر خون سوار ہے۔ لگے ہاتھوں وہ کام بھی نمٹا لیا جائے تو آپ کے حق میں بہت اچھا ہوگا۔"

"کیا مطلب؟" زرتاج چونکتے ہوئے بولی۔

"میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ان لوگوں نے ایک ویرانے میں زیرِ زمین "گولڈ کی کلب" بنایا ہوا ہے جہاں خاصی شرمناک اور خاصی خطرناک سرگرمیاں جاری ہیں۔ اگر کبھی وہ کلب کسی کی گرفت میں آیا تو اس کی مالک آپ ظاہر ہوں گی۔ ویسے بھی وہ جہاں واقع ہے وہ زمین بھی آپ کے والد کی ہی ملکیت ہوا کرتی تھی۔"

"ہاں۔۔۔" وہ پُرخیال انداز میں سرہلاتے ہوئے بولی۔ "یہ بات تو فی الحال اس ہنگامۂ اجل میں میرے ذہن سے نکلی ہوئی تھی۔"

"یہاں اگر خوش قسمتی سے دن چڑھے تک پولیس پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تو اس سے نمٹنے اور تمام حالات بتانے کا کام آپ کمدار وغیرہ کے سپرد کر دیں۔ ہم یہاں سے آٹھ دس منتخب آدمیوں کو لے کر چلتے ہیں اور "گولڈ کی کلب" والا قضیہ بھی نمٹا آتے ہیں ورنہ کل کلاں کو وہ بھی آپ کے لیے پریشانی کا باعث بن سکتا ہے۔"

"یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔۔۔" وہ نیم رضامندی سے بولی۔

"آج ہماری خوش قسمتی سے جانو اور اس کے گروہ کے بیشتر آدمیوں کا خاتمہ ہو گیا ہے تو اس کی باقیات کا بھی خاتمہ ہو جانا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "اگر ہم رات کی تاریکی میں ہی وہاں پہنچ جائیں تو شاید ان سے نمٹنے میں آسانی رہے کیونکہ وہ محفوظ جگہ میں ہوں گے اور ہمیں کھلے میدان سے ان کی طرف بڑھنا ہوگا۔ ہمارے لیے خطرات زیادہ ہوں گے۔"

"محفوظ مقامات پر تو یہ لوگ بھی تھے۔۔۔" زرتاج اردگرد بکھری ہوئی لاشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "انہیں دہشت گردی کا تجربہ بھی زیادہ تھا اس کے باوجود قدرت نے ہماری مدد کی۔"

"اسی امید کے سہارے تو میں آپ کو مزید قدم بڑھانے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ میرا یقین ہے کہ اوپر والا زیادتی سہنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ جہاں ہم جا رہے ہیں وہاں بھی قدرت ہماری مدد کرے گی۔ ان لوگوں کو جتنی ڈھیل ملنا تھی، مل چکی۔ کچھ لوگوں کے لیے یومِ حساب ذرا دیر سے آتا ہے مگر آتا ضرور ہے۔۔۔ بلکہ ان لوگوں کے لیے تو شبِ حساب آئی ہے۔"

اس دوران گویا پورا گاؤں باغ کی طرف اُمڈ آیا تھا۔ کمدار وغیرہ بھی آچکے تھے۔ لوگ مختلف ہتھیار، لالٹینیں، ٹارچیں، کلہاڑیاں، ڈنڈے اور نہ جانے کیا کچھ اٹھائے ہوئے تھے مگر اب ان کا سامنا کرنے کے لیے لاشوں کے سوا کوئی موجود نہیں تھا۔

زرتاج نے کمدار اور دوسرے دو تین لوگوں کو تمام صورتِ حال سمجھا کر مختلف کام ان کے ذمے لگائے۔ میجر سلیم کو بھی اس نے وہیں چھوڑ دیا۔ اس کے خیال میں وہاں اس کی زیادہ ضرورت تھی۔ البتہ جن لوگوں نے باغ میں چھپے ہوئے ڈاکوؤں کے خلاف کمانڈو ایکشن کی طرز پر کارروائی کی تھی، ان میں سے دس افراد کو زرتاج نے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے منتخب کر لیا۔ ہم نے تیزی سے کچھ تیاریاں کیں اور دو گاڑیوں میں روانہ ہو گئے۔

میں، زرتاج اور تین دوسرے افراد پجیرو میں تھے۔ باقی لوگ ایک چھوٹے ٹرک جیسی پک اپ میں تھے۔ گاڑی زرتاج ڈرائیو کر رہی تھی اور میں اپنی یادداشت کے سہارے اس کی رہنمائی کر رہا تھا۔ آسمان پر اِکا دُکا تاروں کی موجودگی کی وجہ سے اندھیرا اتنا گہرا نہیں تھا جتنا عموماً ویرانوں میں ہوتا ہے۔

میں صرف ایک بار گولڈ کی کلب تک گیا تھا لیکن یادداشت نے میرا ساتھ دیا اور آثار بتانے لگے کہ میں صحیح سمت میں جا رہا تھا۔ جنگل بیابان میں کوئی ایسی خاص چیزیں تو موجود نہیں تھیں جن کی نشانیاں مقرر کی جاسکتیں پھر بھی میں درختوں اور ٹیلوں وغیرہ کو دیکھ کر ایک غیر واضح سی مانوسیت کے سہارے زرتاج کی رہنمائی کرتا جا رہا تھا۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ زرتاج کو خود یاد نہیں تھا کہ اس کے مرحوم باپ کی وہ زمین کس طرف ہوا کرتی تھی۔

جب مجھے احساس ہوا کہ ہم مطلوبہ مقام کے بہت

قریب پہنچ چکے ہیں تو میں نے دونوں گاڑیوں کی ہیڈلائٹس آف کروا دیں۔ کلب کے گرد میں نے ایک چھوٹا سا جنگل دیکھا تھا۔ مجھے اندھیرے میں اس کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ انجن کی خفیف سی آواز ان مسلح محافظوں تک نہ پہنچ جائے جو درختوں کے درمیان گشت کرتے رہتے تھے۔

میری ہدایت پر گاڑیاں وہیں چھوڑ دی گئیں اور ہم خاصے بڑے دائرے میں بکھر کر پیدل آگے بڑھے۔ اس وقت تک صبح کاذب کے آثار بھی نمودار ہونے لگے تھے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ درختوں کے عقب میں موجود لوگ ہمارے ہیولے دیکھ سکتے ہیں لیکن خطرہ مول لیے بغیر چارہ نہیں تھا۔ ہم سینے کے بل رینگ کر اتنا فاصلہ طے نہیں کر سکتے تھے۔

فضا کا سکوت کسی بھی لمحے گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے مرتعش ہو سکتا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ وقت اور جگہ ایسی تھی کہ وہاں گہرا سکوت ہی ہونا چاہیے تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے احساس ہوا کہ سکوتِ شب کی چادر کچھ زیادہ ہی دبیز تھی۔ یہ سکوت غیر معمولی تھا۔

درختوں کے بالکل قریب پہنچ کر میں نے سوچا کہیں وہ لوگ گھات لگائے انتظار نہ کر رہے ہوں کہ ہم بالکل ہی قریب پہنچ جائیں تب وہ ہمیں گولیوں سے بھون ڈالیں۔ میں نے سب کو اشارہ کیا اور ہم سینے کے بل لیٹ کر اپنی گنیں سنبھالے رینگنے لگے۔

ہم نے بلاوجہ یہ مشقت اٹھائی۔ ہم درختوں کے دائرے میں داخل ہونے والے راستے سے بہ خیروعافیت اندر پہنچ گئے، ایک بھی گولی نہ چلی لیکن اس سے ہم بے فکر اور پُرسکون ہونے کے بجائے مزید مضطرب ہوگئے۔ بالآخر میرا اشارہ پا کر ایک ایک کر کے سب اٹھ کھڑے ہوئے اور رکوع کی سی حالت میں ہم لوگ اس مختصر سے جنگل کے وسط میں واقع کھنڈر کی طرف بڑھے۔

چند لمحے بعد میں نے محسوس کیا کہ ہم خواہ مخواہ ہی اس احتیاط پسندی میں پھنسے ہوئے تھے۔ وہاں تو کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ اگر درختوں میں بھی کچھ لوگ چھپے ہوتے تو اب تک وہ اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتے تھے۔ ہمارے کھنڈر تک پہنچنے کے دوران درختوں میں چھپا ہوا کوئی ایک شخص بھی کلاشنکوف وغیرہ سے نہایت آسانی سے ہمارا خاتمہ کر سکتا تھا لیکن ابھی تک کوئی فائر نہیں ہوا تھا۔ بلکہ سکوت گویا کچھ اور گہرا ہوگیا تھا۔

تاہم میرے اشارے پر سب لوگوں نے اپنا محتاط انداز برقرار رکھا۔ ہم چاروں طرف نظر رکھے ہوئے تھے اور کھنڈر کی دیواروں کے درمیان سے ہوتے ہوئے ملبے پر چڑھ کر اس مستطیل شگاف تک پہنچے جس کی گہرائی میں فولادی دروازہ موجود تھا۔ اس وقت وہاں کوئی محافظ نہیں تھا۔ تاہم میں نے پانچ افراد کو اس شگاف کے گرد کھڑا کیا۔ زرتاج، میں اور باقی افراد یکے بعد دیگرے شگاف میں اترے۔

میں جب پچھلی مرتبہ تمیسو خان کے ساتھ یہاں آیا تھا تو میں نے ایک خاص انداز میں لیور کے ذریعے محافظ کو یہ دروازہ کھولتے دیکھا تھا۔ اسی طریقے سے میں نے بھی وہ فولادی دروازہ کھول لیا۔ اس میں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی۔

اس سے آگے ایک اور بھاری بھرکم، مضبوط چوبی دروازہ ہمارا منتظر تھا۔ یہ دروازہ اس طلائی چابی سے کھلتا تھا جو تمبروں کے پاس ہوتی تھی۔ میں نے ایسے ہی کسی موقعے کے لیے وہ چابی خاص طور پر اپنے پاس محفوظ رکھی تھی جو تمیسو خان کو ہلاک کرنے کے بعد اس کی جیب سے نکالی تھی۔ اس چابی سے دروازہ کھول کر دبے قدموں مزید چند سیڑھیاں اتر کر ہم نیچے پہنچے۔

تہ خانے میں گہری تاریکی تھی۔ ہم سب چند لمحے اپنی اپنی کلاشنکوفوں اور رائفلوں کے رخ مختلف سمتوں میں کیے، دم سادھے کھڑے رہے لیکن کلب میں بدستور گہرا سکوت چھایا رہا۔ بالآخر ہم نے ٹارچیں روشن کرلیں۔ مجھے یقین ہوگیا کہ وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔

زرتاج حیرت سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے لیے واقعی یہ ایک دنیائے حیرت تھی۔ اسے شاید ابھی تک یقین نہیں آیا تھا کہ اس ویرانے میں زیرزمین ایک باقاعدہ کلب موجود تھا۔ ٹارچوں کی روشنی میں ہم سب کلب کا جائزہ لے رہے تھے۔

اچانک کہیں کھٹکا سا ہوا۔ ہم نے فوراً ٹارچیں بجھا دیں اور سینے کے بل فرش پر لیٹ گئے۔ دوسرے ہی لمحے رات کے سکوت میں درودیوار میں خفیف سا ارتعاش محسوس ہوا۔ کہیں دور شاید کوئی مشین اسٹارٹ ہوئی تھی۔ اس کے فوراً بعد ہی ہال میں تیز روشنی پھیل گئی۔ ہمارا سینے کے بل فرش پر لیٹے ہونا یک دم ہی کچھ مضحکہ خیز سا محسوس ہونے لگا۔ ہماری گنوں کی نالیں ادھر ادھر گھوم رہی تھیں لیکن ہمارے سامنے کوئی نہیں تھا جسے ہم نشانہ بناتے۔

پھر بلندی پر کہیں ایک آسیبی سا قہقہہ سنائی دیا۔ آواز نسوانی تھی۔ اس ہال کے تین اطراف میں بلندی پر سینما کی گیلری کی طرز پر کمرے ہی کمرے بنے ہوئے تھے۔ آواز انہی میں سے ایک کمرے سے ابھری تھی۔ ہم سب کی گنوں کا رخ اسی طرف ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے کھسکتے ہوئے پیچھے راہداری میں گھسنے کی کوشش کی لیکن ہم سب ایک ساتھ تو

اس میں نہیں گھس سکتے تھے۔

اس کا مطلب تھا کہ اگر اس وقت بلندی پر کوئی خود کسی محفوظ چیز کی آڑ میں رہتے ہوئے ہمیں نشانہ بنانا چاہتا تو آسانی سے بنا سکتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو میری دھڑکنیں بھی تیز ہو گئیں۔ باقی لوگوں کا نہ جانے کیا حال تھا۔

کلب کی ویرانی کا ایک جواز میری سمجھ میں آیا تھا جس کے بعد میں مطمئن ہو چکا تھا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس کلب کو چلانے والے تمام لوگ بھی حقیقت میں چونکہ ڈاکو ہی تھے اس لیے آج زرتاج نگر پر حملے میں شامل ہونے کے لیے گئے ہوئے تھے کیونکہ یہ ان کا ایک بہت ہی خاص مشن تھا۔ امکان یہی تھا کہ اس میں حصہ لینے کے لیے گروہ کا ہر رکن پہنچا ہوگا۔ زرتاج نگر میں جتنے ڈاکو مارے گئے تھے، شاید اس میں "گولڈن کلب" کو چلانے والے تمام ڈاکو بھی شامل تھے۔

اب میرا یہ خیال غلط ثابت ہوتا نظر آرہا تھا۔ شاید یہاں کچھ لوگ موجود تھے اور ہم غلط فہمی میں مبتلا ہو کر ایک قسم کے ٹریپ میں آن پھنسے تھے۔ بلندی پر ایک کمرے کا دروازہ جھٹکے سے کھلا اور ایک عورت بالکونی کے جنگلے پر آن کھڑی ہوئی۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار نظر نہیں آرہا تھا لیکن سردست یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ میں نے کوئی مشین سی اسٹارٹ ہونے کی جو دھیمی آواز سنی تھی وہ جنریٹر کی تھی۔ جنریٹر غالباً اسی عورت نے اسٹارٹ کیا تھا۔

وہ بڑی بے خوفی سے جنگلے پر آن کھڑی ہوئی تھی۔ ہمیں اوندھا لیٹے اور گنیں اونچی کیے دیکھ کر اس نے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے ایک بار پھر بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔ اس کا انداز اب بھی کچھ ہذیانی اور کچھ آسیبی سا تھا۔ شاید اسے ہماری حالت بہت مضحکہ خیز لگی تھی۔ وہ ہنس ہنس کر دہری ہوئی جارہی تھی۔

جب وہ ذرا سیدھی ہوئی اور اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹایا تو مجھے اس کی صورت شناسا سی لگی۔ دوسرے ہی لمحے مجھے یاد آگیا کہ جب میں تمیسو خان کے ساتھ یہاں آیا تھا تو اس نے مجھے اس عورت کی میز پر بٹھایا تھا اور بہ صد اصرار عیاشی کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسی نے مجھے بتایا تھا کہ اس عورت کا نام بھی نوری ہوا کرتا تھا لیکن اس نے کافی عرصہ شہر میں گزارا تھا جہاں وہ نوری سے نورین ہو گئی تھی۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اس وقت وہ نشے میں تھی۔

وہ جس کمرے سے برآمد ہوئی تھی اس میں اور کسی کی موجودگی تو ظاہر نہیں ہو رہی تھی لیکن کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ باقی کمروں کے بند دروازوں کے پیچھے کیا تھا یا کون چھپا ہوا تھا۔

میرے ساتھ آئے ہوئے افراد میں سے دو آدمی اچانک اٹھے اور میرے یا زرتاج کے حکم کا انتظار کیے بغیر ہی دوڑتے ہوئے سیڑھیوں تک پہنچے اور تین تین سیڑھیاں ایک ساتھ پھلانگتے ہوئے نہایت تیزی سے اوپر جا پہنچے۔ چند سیکنڈ بعد ہی وہ اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر قابو میں کیے کافی بے دردی سے کھینچتے ہوئے نیچے لے آئے۔ اس دوران کسی اور کمرے کا دروازہ نہیں کھلا۔ ان پر کسی نے فائر نہیں کیا۔ میری جان میں جان آئی۔ مجھے خود سے زیادہ ان کی فکر لاحق ہو گئی تھی کیونکہ وہ بے وقوفوں کی طرح منہ اٹھا کر دوڑ پڑے تھے۔

نوری عرف نورین گو کہ مزاحمت نہیں کر رہی تھی لیکن وہ لوگ اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے ہی لائے تھے۔ اس کے پیروں سے جوتیاں اتر گئی تھیں۔ زرتاج کے آدمیوں نے اس کے بازو بھی موڑے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھا۔ اس وقت تک ہم لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ کلب میں اس وقت اس عورت کے سوا کوئی نہیں تھا۔

"اسے چھوڑ دو۔" میں نے مضطربانہ لہجے میں کہا۔

زرتاج کے آدمیوں نے میرے حکم کی تعمیل کی۔

نوری عرف نورین بہ مشکل سیدھی کھڑی ہو کر اپنے بازوؤں کو جھٹکے دیتے ہوئے استہزائیہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "معلوم نہیں ہم جیسے لوگوں کو نیکی کا صلہ بھی کیوں ایسا ملتا ہے۔۔۔"

معلوم نہیں کیوں مجھے اس کے اس طرح بے رحمانہ انداز میں کھینچ کر لائے جانے پر افسوس ہوا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر معذرت خواہانہ انداز میں اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔ دراصل ہمارے آدمیوں سے صرف گھبراہٹ میں یہ حرکت سرزد ہوئی ہے۔ ہم تمہیں کوئی تکلیف پہنچانا نہیں چاہتے تھے۔۔۔"

اس نے گویا قدرے چونک کر میری طرف دیکھا اور آنکھیں سکیڑتے ہوئے بولی۔ "تم تو وہی ہو جسے اس شام تمیسو خان نے میری میز پر لا کر بٹھایا تھا۔۔۔"

اس سے آگے وہ نہ جانے کیا کہنا چاہتی تھی۔ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "ہاں۔۔۔ ہاں، میں وہی ہوں۔"

"مجھے اس وقت ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ تم ایک شریف آدمی ہو۔۔۔ اور اب تم نے مجھ سے معذرت چاہی ہے۔۔۔ یہ بھی تمہاری شرافت کی دلیل ہے۔" اس نے زرتاج سمیت باقی لوگوں کی طرف بازو لہراتے ہوئے اشارہ کیا۔ "ان لوگوں کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔۔۔ لیکن مجھے خوشی ہے

کہ تم میرے ہاتھوں مرنے سے بچ گئے۔ تم سب کی زندگی میرے ہاتھ میں تھی..... میرے ایک اشارے پر تم سب کے پرخچے اڑ سکتے تھے..... لیکن میں نے اپنے آپ کو ہاتھ ہلانے سے باز رکھا۔ اس کا صلہ مجھے یہ ملا.....“ اس نے ایک بار پھر اپنے بازوؤں کو جھٹکا دیا جنہیں کافی بری طرح موڑا گیا تھا۔

میں نے اس کا مطلب پوری طرح سمجھے بغیر کہا۔ ”میں ایک بار پھر ان لوگوں کی طرف سے تم سے معافی چاہتا ہوں۔ تم خود ہی کہہ چکی ہو کہ میں ایک شریف آدمی ہوں۔ امید ہے کہ تم ایک شریف آدمی کی معذرت قبول کرلوگی۔“

اس نے ایک بار پھر بغور میری طرف دیکھا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔ اچانک وہ میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”سگریٹ ہوگی تمہارے پاس؟“

”نہیں۔“ میں نے ملائمت سے کہا۔ ”میں اتنا شریف آدمی ہوں کہ سگریٹ بھی نہیں پیتا۔ ویسے بھی تمہارا سادہ سگریٹ سے کیا بھلا ہونا تھا۔ تم تو کچھ اور طرح کی سگریٹ پینے کی عادی ہو۔“

”اس وقت تو کسی بھی قسم کی سگریٹ کی طلب ہو رہی ہے..... میرا پیکٹ اوپر رہ گیا ہے۔“ وہ مڑ کر کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”میں ابھی منگوا دیتا ہوں.....“ میں نے ایک شخص کو اشارہ کیا۔ وہ چہرے پر قدرے ناگواری کے تاثرات لیے اوپر چلا گیا۔ شاید وہ دل میں سوچ رہا تھا کہ ہم ایک قیامت خیز ہنگامے سے گزر کر آرہے ہیں، یہاں بھی ہمیں نہ جانے کیا حالات پیش آنے والے تھے اور مجھے دشمن کے اڈے پر موجود ایک مشکوک قسم کی عورت کی سگریٹ کی فرمائش پوری کرنے کی فکر پڑی ہوئی ہے۔ مجھے احساس تھا کہ زرتاج بھی عجیب سی نظروں سے کبھی میری طرف اور کبھی نورین کی طرف دیکھ رہی تھی۔

میں نے ملائمت سے نورین سے پوچھا۔ ”تم یہاں اکیلی ہو؟“

”ہاں۔ کاش تم بھی اکیلے آئے ہوتے!“ وہ آنکھ مارتے ہوئے مسکرائی۔ مجھے کسی نیک پروین قسم کی لڑکی کی طرح اپنے کانوں کی لویں تپتی محسوس ہوئیں۔ میں نے کھسیانے سے انداز میں زرتاج کی طرف دیکھا۔ وہ ایک ٹک نورین کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اسی لمحے نورین بھی زرتاج کی طرف متوجہ ہوئی اور سرتاپا اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ ”یہ بیگم صاحبہ کون ہیں؟“

حالانکہ اس وقت ہم خاصے برے حال میں تھے۔ سر

سے پاؤں تک پسینے اور مٹی میں لتھڑے ہوئے تھے۔ پھر بھی زرتاج کی شخصیت سے ایک شان جھلک رہی تھی۔ شاید اسی لیے نورین نے اس کے لیے "بیگم صاحبہ" کے الفاظ استعمال کیے تھے۔

"تم اسے چھوڑو......" میں نے ملائمت سے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ تمہارے ایک اشارے پر ہمارے پرخچے کیسے اڑ سکتے تھے؟"

"یہ جاننے کے لیے تمہیں میرے ساتھ اس کلب سے باہر کچھ دور چلنا پڑے گا۔" وہ بے نیازی سے بولی۔ اس دوران ہمارا آدمی اوپر کے کمرے سے اس کی مخصوص سگریٹوں کا پیکٹ اور لائٹر لے آیا تھا۔ اس نے مُرتعش انگلیوں سے ایک سگریٹ سلگا کر گہرا کش لیا۔ اس کے چہرے پر کچھ طمانیت سی پھیل گئی۔ اس نے دُھوئیں کا ایک کثیف مرغولا ہوا میں چھوڑا تو زرتاج ایک قدم پیچھے ہٹ گئی تاہم اس نے اپنے چہرے سے ناگواری ظاہر نہیں ہونے دی۔ میں نے ہیروئن کے نشے کے عادی تو کئی افراد دیکھے تھے جن کا نشہ ٹوٹنے لگتا تھا تو ان کی حالت غیر ہو جاتی تھی لیکن نورین اس لحاظ سے کچھ عجیب نشے باز تھی کہ اسے چرس کا نشہ بھی کچھ اسی شدت سے ستاتا تھا اور معلوم یہی ہوتا تھا کہ وہ تقریباً ہر وقت ہی نشے میں رہنا چاہتی ہے۔

"ٹھیک ہے......" میں نے ایک لمحے کے توقف کے بعد کہا۔ "ہم تمہارے ساتھ چلیں گے۔ اس سے پہلے ہم ذرا یہاں کا جائزہ لے لیں۔"

"یہاں اب جائزہ لینے کو کیا رکھا ہے۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"کیا مطلب......؟ کیا اب یہاں کوئی خاص، قابلِ ذکر چیز نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہر شخص کا نقطۂ نظر مختلف ہوتا ہے۔ معلوم نہیں، اب تمہاری نظر میں کون سی چیز خاص اور قابلِ ذکر ہو۔" وہ بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ "ورنہ یہاں خاص اور قابلِ ذکر چیز تو میں بھی ہوں۔" وہ ایک بار پھر مخمور سے انداز میں مسکرائی۔ معلوم نہیں اس وقت اتنے لوگوں...... اور خصوصاً زرتاج کی موجودگی میں وہ بار بار کیوں اس طرح قربان جانے والے انداز میں مسکرائے جا رہی تھی ورنہ جب ممیسو خان نے مجھے اس کی میز پر بٹھایا تھا، اس وقت تو وہ ہر بات بڑے سپاٹ اور کاروباری انداز میں کر رہی تھی۔

"تم چیز نہیں...... تم ایک بہت اچھی عورت ہو۔" میں نے اسے بچوں کی طرح پچکارتے ہوئے کہا۔ "تم ادھر ایک میز پر بیٹھ جاؤ۔ ہم چند منٹ میں واپس آتے ہیں۔"

وہ ایک میز پر جا بیٹھی۔ میرے کہے بغیر ہی ہمارے ساتھیوں میں سے ایک کلاشنکوف بردار اس کے قریب کھڑا ہو گیا۔ میں زرتاج اور دوسرے لوگوں کو لے کر آگے بڑھا۔

پورے زیرِ زمین کلب میں بتیاں روشن ہو چکی تھیں۔ میں انہیں کلب کا ہر گوشہ دکھانے لگا۔ اب وقت گو کہ وہاں وہ رونق میلہ نہیں تھا جسے دیکھ کر شاید انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا۔ اس کے باوجود ان کی آنکھیں حیرت سے پھٹی جا رہی تھیں۔ انہوں نے شاید کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس ویرانے میں زیرِ زمین ایسی بھی کوئی عمارت موجود تھی جس میں عیاشی کے تمام لوازمات سجے ہوئے تھے۔ شراب کا ذخیرہ دیکھ کر ہی زرتاج کی رنگت متغیر ہو گئی۔

پھر اس کا ذہن شاید دوبارہ نورین کی طرف چلا گیا۔ وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولی۔ "یہ عورت کون ہے؟"

"انہی ان گنت بدنصیب عورتوں میں سے ایک...... جو ستاروں پر کمند ڈالنے نکلتی ہیں اور دلدلوں میں جا گرتی ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "آپ کو اندازہ ہو ہی گیا ہوگا۔"

"ہاں...... اندازہ تو ہو گیا ہے۔" اس نے سر ہلایا۔

"کچھ عورتیں تو خود بھٹکتی بھٹکاتی ان منزلوں پر پہنچی ہوں گی لیکن اس گروہ نے ایسے چکر بھی چلائے ہوئے تھے کہ مجبور، بے سہارا یا ضرورت مند عورتوں کو بھی گھیر گھار کر ان راستوں پر لایا جاتا تھا اور جو کسی نہ کسی طرح ان کے ہتھے چڑھ جاتی تھیں، ان کا حشر تو آپ سوچ ہی سکتی ہیں کیا ہوتا ہوگا۔" میں نے کہا۔ زرتاج نے متاسفانہ سے انداز میں سر ہلایا۔

بلندی پر جو کمرے واقع تھے وہ کسی معقول ہوٹل کے کمروں کی طرز پر آراستہ تھے۔ میں زرتاج کو ان کمروں میں بھی لے گیا جہاں میں نے اسلحے کی پیٹیاں دیکھی تھیں۔ پیٹیاں اب بھی وہاں موجود تھیں لیکن خالی تھیں۔ ہم نے بہت تیزی سے سب جگہوں کی تلاشی لی لیکن ہمیں وہاں کوئی فائل یا کاغذات وغیرہ نہیں ملے۔ معلوم نہیں کس مصلحت کے تحت اس جگہ کو بالکل خالی کر دیا گیا تھا۔

ہم واپس آئے تو نورین اسی میز پر بیٹھی مخمور انداز میں مسکرا رہی تھی۔ وہ میرے پوچھنے سے پہلے ہی بولی۔ "یہاں سے بہت سی چیزیں جانو نے منگوا لی تھیں۔ اگر تمہیں کسی خاص چیز کی تلاش تھی تو تمہیں مایوسی ہوگی۔"

"نہیں...... ہم تو ویسے ہی ذرا اس جگہ کا جائزہ لے رہے تھے۔ جانو کی کاوشوں کی داد دے رہے تھے۔ زندگی میں اتنی محنت کرنے والے اور ایسے ایسے "شاندار" پروجیکٹس تخلیق کرنے والے لوگ روز روز تھوڑا ہی پیدا ہوتے ہیں۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا۔ "تم ہمیں کیا بتانے اور دکھانے والی تھیں؟"

"میرے ساتھ آؤ۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔
ہم اس کے ساتھ ہولیے اور جس راستے سے آئے تھے اسی راستے سے باہر آگئے۔ کھنڈر کے گرد درختوں کا دائرہ خاصے بڑے حصے میں پھیلا ہوا تھا۔ نورین کی رہنمائی میں ہم اس مختصر جنگل سے نکل کر ایک طرف بڑھے۔ تب میں نے دیکھا' اس سمت میں ایک جھونپڑی سی نظر آرہی تھی۔ اس وقت تک صبح صادق کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ اندھیرے میں روشنی کی آمیزش بڑھ گئی تھی۔
ہم کچھ اور آگے بڑھے تو اندازہ ہوا کہ وہ جھونپڑی نہیں' ایک چوبی کیبن تھا جس کے اردگرد خودرو جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ نورین سب سے آگے چل رہی تھی۔ اس کے پیچھے ہمارے آدمی تھے۔ انہوں نے غیر محسوس سے انداز میں اسے اپنی گنوں کی زد پر لیا ہوا تھا۔ میں اور زرتاج سب سے پیچھے تھے۔
زرتاج سرگوشی میں بولی۔ "یہ ہمیں کسی جال میں پھنسانے کے لیے تو نہیں لے جارہی؟"
"جال میں پھنسانے کے لیے تو وہ تہ خانہ ہی سب سے اچھی جگہ تھی جہاں سے ہم آرہے ہیں۔ یہ کیبن تو ویران ہی معلوم ہو رہا ہے۔ بہر حال...... اگر کوئی جال بھی ہوا تو دیکھا جائے گا۔ ہم سب الرٹ تو ہیں۔" میں نے اسے تسلی دی۔
کیبن کے قریب پہنچ کر نورین نے فلمی بدمعاشوں والے اسٹائل میں لات مار کر اس کا دروازہ کھولا۔ میں گو کہ دور کھڑا تھا اور کیبن کے اندر تاریکی تھی لیکن مجھے اندازہ ہوگیا کہ کیبن میں کوئی موجود نہیں تھا۔ اس وقت شاید میرے ساتھ ساتھ زرتاج کو بھی حیرت ہوئی جب نورین نے کیبن میں داخل ہو کر کوئی سوئچ آن کیا اور وہاں بتی روشن ہوگئی۔ اندر لوہے کی ایک چارپائی اور ایک تپائی نظر آرہی تھی۔
میں اور زرتاج بھی آگے بڑھ کر کیبن میں داخل ہوگئے۔ وہ کچھ اسی قسم کا کیبن تھا جیسے بعض مقامات پر چوکیداروں یا گیٹ کیپروں کے کیبن ہوتے ہیں۔ اس میں بے سروسامانی کچھ زیادہ تھی۔ تپائی پر ریڈیو نما کوئی چیز رکھی ہوئی تھی۔ وہ وائرلیس بھی نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ وائر اس میں موجود تھی۔ پتلی سی ایک تار اس سے منسلک تھی جو کیبن کے ایک کونے میں جاکر غائب ہوگئی تھی۔
"واہ....! اس ویرانے میں تم لوگوں نے بجلی کا خوب بندوبست کر رکھا ہے۔" میں نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔
"اس کیبن سے بھی زیرِ زمین تار اس تہ خانے تک جارہی ہے۔ وہیں کے جنریٹرز سے سلسلہ جُڑا ہوا ہے۔" نورین نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "لیکن میں تمہیں ایک دوسرا سلسلہ دکھانے کے لیے لائی ہوں۔ یہ جو تم میز پر ریڈیو سا رکھا دیکھ رہے ہو...... مجھے اس کا صرف ایک بٹن دبانا تھا اور پورا تہ خانہ بھک سے اُڑ جاتا۔ مجھے بٹن اس وقت دبانا تھا جب تم سب لوگ اندر جا چکے تھے۔ تہ خانے کے ساتھ ہی تم لوگوں کے بھی پرخچے اُڑ جاتے۔"
"لیکن تم خود بھی تو وہیں موجود تھیں۔ ساتھ تمہارے بھی تو پرخچے اُڑ جاتے۔" میں نے کہا۔
"احمق! اگر مجھے اس پروگرام پر عمل کرنا ہوتا تو پھر میں وہاں کیوں موجود ہوتی۔ میں تو یہیں اس آلے کے پاس ہی موجود رہتی۔ تم لوگوں کے آنے سے پہلے میں یہیں موجود تھی۔ میں نے بہت دور سے تم لوگوں کی آمد کے آثار محسوس کر لیے تھے۔ مجھے تم لوگوں کی گاڑیوں کے ہیولے حرکت کرتے دکھائی دیے تھے۔ اسی وقت میں جلدی سے جاکر تہ خانے میں چھپ گئی تھی۔ کاش میرے پاس میک اپ وغیرہ کا سامان ہوتا تو میں چڑیل بن کر تم لوگوں کو ڈراتی۔ آج میرا کسی سے مذاق کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔ برسوں گزر گئے ہیں کہ میں نے کسی سے کوئی مذاق نہیں کیا۔"
"اس مذاق میں تمہاری جان بھی جاسکتی تھی۔" میں نے کہا۔
"جان....!" اس نے استہزائیہ سے انداز میں قہقہہ لگایا۔ "یہاں جان تو بغیر مذاق کے بھی جاسکتی ہے۔"
"تمہاری بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی ہے۔ پوری بات بتاؤ....." میں نے کہا۔
وہ میری بات کاٹتے ہوئے بیزاری سے بولی۔ "بات کچھ بھی نہیں ہے۔ بس جانو کی طرف سے کچھ احکامات آئے تھے۔ سب لوگ ہنگامی طور پر یہاں سے رخصت ہوئے تھے۔ بہت سا سامان بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ مجھے اس کیبن میں موجود رہنے کا حکم ملا تھا۔ اس کے علاوہ حکم یہ تھا کہ میں چاروں طرف نظر رکھوں۔ اس کیبن سے دور دور تک کا منظر نظر آتا ہے۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ اگر میں کچھ لوگوں کو کلب کی طرف آتے دیکھوں اور مجھے اندازہ ہو جائے کہ وہ کلب میں داخل ہوچکے ہوں گے تو میں اس بٹن کو دبا دوں۔" اس نے ریڈیو نما چیز کے ایک بٹن کی طرف اشارہ کیا۔ وہ یقیناً تہ خانے میں نصب کسی ڈائنامائٹ کو ڈیٹونیٹ کرنے کا آلہ تھا۔
میرے لیے جانو یا اس کے گروہ کا یہ اندیشہ باعثِ حیرت تھا کہ کچھ لوگ یہاں پہنچ بھی سکتے تھے۔ انہوں نے یقیناً اس بات کا امکان محسوس کرلیا تھا۔ جانو کو یہ اطلاع تو مل ہی گئی ہوگی کہ خمیسو خان یہاں سے ایک اجنبی کے ساتھ روانہ ہوا تھا جس کے بعد وہ راستے ہی میں رقم سمیت غائب ہوگیا تھا۔ اس سے ہی اسے کسی گڑبڑ کا احساس ہوگیا ہوگا۔
انہوں نے ایسے انتظامات کر رکھے تھے کہ اگر کبھی پولیس وغیرہ کی اس اڈے تک رسائی ہو تو زرتاج اس کی مالک ظاہر ہو لیکن آج انہوں نے اس عشرت کدے کو خالی کردیا تھا۔ اسلحہ وغیرہ بھی یہاں سے ہٹا دیا تھا اور یہ انتظام بھی کرگئے تھے کہ اگر کچھ لوگ اس ٹھکانے تک پہنچتے دکھائی دیں تو ان لوگوں سمیت اس اڈے کو

دھماکے سے اُڑا دیا جائے۔ اس میں یقیناً جانو کی کچھ اور مصلحت رہی ہوگی لیکن اب جانو اس دنیا میں نہیں تھا اور شاید اس کے بیشتر ساتھی بھی ٹھکانے لگ چکے تھے اس لیے اس مصلحت کے بارے میں کوئی کچھ نہیں بتا سکتا تھا' صرف اندازے قائم کیے جاسکتے تھے۔

میں نے نورین کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "تم نے احکامات پر عمل کیوں نہیں کیا؟ یہ بٹن دبانے کے لیے یہاں موجود کیوں نہیں رہیں؟"

"یہ تو مجھے خود بھی نہیں معلوم۔" وہ بے نیازی سے کندھے اُچکاتے ہوئے بولی۔ "بس...... میرا دل نہیں چاہا۔ حالانکہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم لوگ کون ہو۔ میرے لیے تم اندھیرے میں حرکت کرتے ہوئے محض چند سائے تھے۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ میں نے تمہیں زندہ چھوڑ دیا تو تم لوگ میرے ساتھ دشمنوں کا سا سلوک بھی کرسکتے ہو۔ اس کے باوجود میں نے بٹن دبانے کا ارادہ نہیں کیا اور خود کلب میں جاکر چھپ کر بیٹھ گئی۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ اس حکم عدولی پر جانو میرا نہ جانے کیا حشر کرے۔ اس کے باوجود میں اپنے آپ کو بٹن دبانے پر آمادہ نہ کرسکی۔"

"جانو کا تو اپنا حشر بہت خراب ہوچکا ہے۔" میں نے اسے بتا دینے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔

"کیا ہوا اسے؟" نورین نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ بس وہ مرچکا ہے۔" میں نے سادگی سے جواب دیا۔

"کتے کی موت مرچکا ہے۔" زرتاج نے گویا تصحیح کی۔

"اوہ......" نورین نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے سیٹی بجائی۔ "ان علاقوں میں دور دور تک رہنے والوں کے لیے یہ اس سال کی سب سے بڑی خبر ہے۔"

"میرا خیال ہے اس کا پورا گروہ بھی جہنم رسید ہوچکا ہے۔" میں نے کہا۔

"مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا۔" نورین کی مخمور آنکھیں پھیل گئیں لیکن دوسرے ہی لمحے وہ طمانیت کی گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ "چلو...... اب کم از کم میں اس کے عتاب سے تو بچی رہوں گی۔ میں نے تم لوگوں کو مرنے سے بچا تو لیا تھا لیکن اب دل ہی دل میں ڈر بھی رہی تھی کہ یہ نیکی مجھے مہنگی پڑے گی۔ زندگی میں پہلی بار اتنی بڑی نیکی کی تھی۔ میری زندگی میں تو چھوٹی موٹی نیکیوں کا گزر بھی کم ہی رہا ہے۔"

"تمہاری یہ نیکی رائیگاں نہیں جائے گی۔" میں نے کہا اور آگے بڑھ کر ریڈیو نما آلے کا وہ سرخ بٹن دبا دیا جس کی طرف چند لمحے پہلے نورین نے اشارہ کیا تھا۔ اس طرح اچانک کسی کو بھی مجھ سے اس حرکت کی توقع نہیں تھی۔ یک دم زوردار دھماکا ہوا اور زمین لرز کر رہ گئی۔ دھماکا چونکہ زیرِ زمین ہوا تھا اس لیے اس کی آواز تو ایسی نہیں تھی کہ کانوں کے پردے پھٹتے محسوس ہوتے لیکن اس کی دھمک اور گونج اتنی تھی کہ باہر کھڑے ہوئے دو افراد میں سے دو اوندھے منہ گر پڑے۔

"یہ تم نے کیا کیا؟" زرتاج سنبھلتے ہوئے بولی۔

"کیا اس جگہ کا کوئی اور مصرف تھا آپ کے ذہن میں؟" میں نے معصوم بنتے ہوئے پوچھا۔ وہ گویا لاجواب سی ہوگئی۔

میں نے کیبن سے نکل کر دیکھا' درختوں کے درمیان سے اس طرح دُھواں بلند ہوتا دکھائی دے رہا تھا جیسے کوئی چھوٹا موٹا آتش فشاں پھٹا ہو۔

میں نے رائفل کندھے پر لٹکا کر گویا کسی چھوٹے موٹے کام سے فارغ ہوکر ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ "چلیے اب واپس چلتے ہیں۔" میں نے نورین کو بھی چلنے کا اشارہ کیا۔

"مجھے ساتھ لے جاکر کیا کرو گے؟" وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

"تمہارا بھی کوئی نہ کوئی مصرف نکال ہی لیں گے۔ تم چلو تو سہی۔" میں نے جواب دیا۔ وہ گویا بادلِ نخواستہ ہمارے ساتھ ہولی۔

راستے میں وہ بولی۔ "تم لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

"زرتاج نگر۔" میں نے جواب دیا۔

اچانک وہ چونکی اور زرتاج کی طرف گویا ایک نئے زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہوئے بولی' "کہیں آپ رئیسانی زرتاج تو نہیں ہیں؟"

زرتاج تو کچھ نہ بولی۔ اس کی طرف سے میں نے جواب دیا۔

"ہاں۔ یہ رئیسانی زرتاج ہی ہیں۔ تمہیں یقین نہیں آرہا کیا؟"

"ہاں۔ مجھے واقعی یقین نہیں آرہا کہ اتنی بڑی زمیندارنی خود بھی بندوق اٹھا کر اس طرح مٹی اور پسینے میں لتھڑی اپنے دشمنوں اور ڈاکوؤں سے نمٹنے کے لیے نکل سکتی ہے۔" بے یقینی اس کے چہرے سے ظاہر تھی۔ "میں نے تو یہی دیکھا ہے کہ اس طرح کے لوگ صاف ستھرے' اُجلے اُجلے کپڑے پہن کر اپنے عالیشان ڈرائنگ رومز میں بیٹھ کر احکامات صادر کرنا جانتے ہیں اور ان کے احکامات پر لوگ ایک دوسرے کو جانوروں کی طرح بھنبھوڑتے اور ایک دوسرے کی بوٹیاں نوچتے مرجاتے ہیں۔"

زرتاج اب بھی خاموش تھی۔ میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "دنیا میں ہر طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں۔" پھر میں نے زرتاج کو مخاطب کرتے ہوئے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ "بعض کام کتنے مشکل نظر آتے ہیں لیکن کتنی آسانی سے ہوجاتے ہیں۔ آج کی رات گو کہ بہت بھاری گزری ہے لیکن کم از کم میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ سر سے اتنے بڑے بڑے بوجھ ہٹ جائیں گے۔ جانو کے گروہ کا خاتمہ بھی ہوجائے گا اور اس کا یہ خطرناک ٹھکانا بھی تباہ ہوجائے گا۔"

"امدادِ غیبی اسی کو کہتے ہیں۔" زرتاج مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

اس وقت تک ہم لوگ گھنے درختوں کی اس پٹی تک پہنچ چکے

تھے جو دائرے کی سی صورت میں پھیلی ہوئی تھی۔ ان کے درمیان سے بدستور دُھواں اٹھتا دکھائی دے رہا تھا۔ ہم اس طرف پہنچے جدھر اس دائرے میں داخل ہونے کا راستہ بنا ہوا تھا۔ اس راستے پر پہنچ کر ہم نے دیکھا' درختوں کے درمیان کھنڈر کا بیشتر حصہ اب بالکل ہی تباہ ہو چکا تھا۔ وہاں ایک بڑا سا گڑھا پڑ گیا تھا جس سے دُھواں اور پھڑپھڑاتے ہوئے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمین شق ہو گئی تھی اور زیر زمین کوئی آتش فشاں پھٹ گیا تھا۔ گو کہ اوپر سے زمین زیادہ نہیں پھٹی تھی اور شعلے بھی زیادہ بلند ہوتے نظر نہیں آ رہے تھے لیکن تپش ہم لوگوں تک پہنچ رہی تھی۔ زمین میں پیدا ہونے والے شگاف سے بار بار کثیف دُھوئیں کے مرغولے باہر آنے لگتے تھے اور کبھی کبھی ہلکی سی گڑگڑاہٹ بھی سنائی دے رہی تھی۔

چند لمحے تک خاموشی سے یہ نظارہ دیکھنے کے بعد ہم لوگ اس طرف واپس چل دیے جدھر ہم اپنی گاڑیاں چھوڑ کر آئے تھے۔ اس وقت تک صبح کا اجالا پھیل چکا تھا۔ اب ویرانہ بھی خوبصورت اور پُرسکون لگ رہا تھا۔ کہیں کہیں جھاڑ جھنکاڑ اور درخت نظر آ رہے تھے مگر اس وقت وہ بھی نکھرے نکھرے دکھائی دے رہے تھے۔ شاید ہمارے اندر کا موسم بدل چکا تھا۔ کم از کم میں اس وقت خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ رات بھر کی اعصابی کشیدگی کے بعد اب صبح کی تازہ ہوا میں سکون کی سانس لینے کا موقع ملا تھا۔ ہم سب نے رائفلیں وغیرہ کندھوں پر لٹکالی تھیں۔

دوسرے ہی لمحے مجھے معلوم ہوا کہ سکون میری قسمت میں زیادہ دیر کے لیے نہیں تھا۔ پرندہ جہاں ایک لمحے کے لیے غافل ہوتا ہے' عموماً صیاد وہیں چھپا ہوتا ہے۔ ہم گاڑیوں کے قریب پہنچے ہی تھے کہ ایک کھردری سی آواز سنائی دی۔ "ہینڈز اپ!"

میں نے رائفل کندھے سے اتارنے کے لیے تیزی سے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ فائر کی آواز گونجی اور گولی میرے بالوں کو چھوتی ہوئی گزری۔ دونوں گاڑیوں کے عقب سے گنوں کی نالیں جھانک رہی تھیں۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آہستگی سے ہاتھ اٹھا دیے۔ گاڑیوں کے عقب سے دو مرد اور ایک عورت نکل آئی۔ پہلی نظر میں تو عورت بھی مرد ہی دکھائی دی تھی۔

میں نے فوراً ہی اسے پہچان لیا۔ وہ جانو کی بیوی تھی..... بلکہ بیوہ سونیا تھی لیکن اس وقت وہ ویسٹرن فلموں کا کوئی کردار معلوم ہو رہی تھی۔ مجھے یاد پڑتا تھا کہ میں نے راکیل ویلچ کو کسی فلم میں اس حلیے میں دیکھا تھا۔ وہ کاؤبوائز جیسی جینز اور جیکٹ میں تھی۔ پیروں میں فل بوٹ تھے۔ سر پر صرف فلیٹ ہیٹ کی کمی تھی۔ اس کی جگہ وہ کھلاڑیوں جیسی پی کیپ پہنے ہوئے تھی۔ اس کی کمر کے گرد گولیوں کی پیٹی لپٹی ہوئی تھی اور ہاتھ میں لمبی نال اور لمبی ہی رینج کا ایک نہایت خطرناک بیریٹا پسٹل تھا۔

پی کیپ کے نیچے اس کے ریشمی تراشیدہ بال ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ہلکورے سے لے رہے تھے۔ اس وقت شاید وہ کافی خوبصورت اور پُرکشش نظر آتی لیکن غیظ و غضب سے اس کا چہرہ کچھ بگڑا ہوا سا تھا۔ دو مرد جو اس کے ساتھ تھے' ان پر نظر ڈالتے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ڈاکو تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ جانو کے گروہ کا مکمل خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ ابھی اس کی نہ جانے کتنی نشانیاں باقی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ سونیا کو دیکھتے ہی نورین کی رنگت زرد پڑ گئی تھی۔

سونیا بھی غضبناک نظروں سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ دانت پیس کر بولی۔ "غدار کہیں کی! تجھے جو آرڈر ملا تھا تو نے اس پر عمل نہیں کیا اور ان کے ساتھ چل دی۔ تیرا کیا خیال ہے' ان کے ساتھ جا کر تو ملکۂ عالیہ بن جائے گی؟؟"

"میڈم! میں نے تو حکم پر عمل کیا تھا..... لیکن یہ لوگ بچ گئے....." نورین نے ہکلاتے ہوئے جھوٹ بولنے کی کوشش کی۔

"بکواس مت کرو۔" سونیا گرجی۔ "میں اتنی بے وقوف بھی نہیں ہوں کہ تم لوگوں کے چہرے دیکھ کر جھوٹ سچ کا فرق بھی نہ سمجھ سکوں....." دوسرے ہی لمحے دھماکا ہوا اور نورین ڈھیر ہو گئی۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے یہی محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے دل پر گولی ماری ہو۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ سونیا گولی چلانے میں اتنی تیزی دکھائے گی۔ اس نے تو ویسٹرن فلموں کی ہیروئنوں کو بھی مات کر دیا تھا۔

نورین اوندھے منہ گری تھی اور گرتے ہی ساکت ہو گئی تھی۔ اس کی پشت پر کندھے کے نیچے سوراخ نظر آ رہا تھا جس سے خون اُبل رہا تھا۔ گولی یقیناً اس کے دل سے گزر گئی تھی۔ میں نے اس پر جھکنے کی کوشش کی لیکن سونیا خطرناک انداز میں پستول کو حرکت دیتے ہوئے بولی۔ "تم بالکل سیدھے اور ساکت کھڑے رہو ورنہ تمہارا بھی یہی انجام ہو گا حالانکہ تمہارے لیے میرے دل میں نرم گوشہ موجود ہے۔ گو مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ میرا شوہر اور گروہ کے زیادہ تر لوگ تمہاری وجہ سے مارے جا چکے ہیں لیکن شاید میں تمہیں معاف کر دوں۔ شرط صرف یہی ہے کہ میرے سامنے ہیرو بننے کی کوشش نہ کرنا۔"

میں ساکت ہو چکا تھا لیکن اسے یقیناً اندازہ نہیں تھا کہ میرے دل میں کیسا شعلہ سا بھڑک اٹھا تھا۔ نورین بلاشبہ ہماری محسنہ تھی۔ اس نے موقع حاصل ہوتے ہوئے بھی ہماری ہلاکت کا سامان نہیں کیا تھا۔ ہم جس وقت تہ خانے میں تھے' ہمیں گمان تک نہیں تھا کہ محض ایک بٹن دبانے سے ہمارے پرخچے بھی اڑ سکتے تھے۔ نہ جانے اس کی کس سوچ نے ہمیں دوسری زندگی دی تھی اور اسے ہمارے سامنے کسی حقیر جانور کی طرح مار دیا گیا تھا۔ یہ حقیقت میرے لیے ناقابلِ برداشت تھی لیکن میں اپنے سینے میں امنڈتے ہوئے غیظ و غضب کو دبائے بظاہر بالکل پُرسکون کھڑا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے زرتاج کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا اور

وہ ایک ٹک سونیا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سونیا کے دونوں ساتھی ڈاکوؤں نے ہمیں کور کیا ہوا تھا اور وہ پلک نہیں جھپک رہے تھے۔

سونیا حقارت آمیز نظروں سے زرتاج کا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ "تم یقیناً زرتاج ہو...... میں نے تمہیں دیکھا نہیں تھا لیکن جانو کی زبانی تمہاری باتیں سُن سُن کر اندازہ ہو چکا تھا کہ تم کیسی عورت ہوگی۔ تمہارے عشق میں پاگل تھا وہ...... تمہارے ہی ہاتھوں انجام کو پہنچ گیا......"

"میں ابھی تک سمجھ نہیں سکی کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو؟" زرتاج نہایت پُرسکون لہجے میں بولی۔

"میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ جانو کو مار کر تم یہ مت سمجھ لینا کہ تمہیں اس علاقے میں دشمنوں سے نجات مل گئی......" سونیا تند لہجے میں بولی۔ "اب میں تمہیں پاکستانی پھولن دیوی بن کر دکھاؤں گی...... لیکن نہیں...... تم بھلا یہ سب کیسے دیکھ سکو گی۔ سب سے پہلے تو میں تم ہی کو ہلاک کروں گی۔ ابھی اور اسی وقت۔"

زرتاج بے ساختہ ہنس دی لیکن فوراً ہی سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ "میں نے تو سنا تھا کہ تم خاصی پڑھی لکھی عورت ہو......"

"اس میں کیا شک ہے۔" سونیا اس کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے بولی۔

"اس کے باوجود تم نے اتنے گھٹیا آئیڈیل بنا رکھے ہیں۔" زرتاج حقارت سے بولی۔ "پھولن دیوی بننا چاہتی ہو تم۔ لعنت ہے تم پر۔"

میری توقع کے برعکس سونیا نے لعنت کا زیادہ برا نہیں منایا تاہم کشیدہ سے لہجے میں بولی۔ "تم جیسے لوگوں نے اور تمہاری اس سوسائٹی نے اس کے علاوہ میرے لیے راستہ ہی کون سا چھوڑا ہے۔"

زرتاج نے میری طرف دیکھا اور ایک طویل سانس لی۔ "وہی معاشرے کا رونا......! دنیا کے زیادہ تر بُرے لوگوں نے اپنی خباثتوں کا جواز گھڑنے کے لیے یہ اچھا افسانہ تراش رکھا ہے۔ بہت کم لوگوں کو بُرا بنانے میں معاشرے یا حالات کا ہاتھ ہوتا ہے لیکن الاپنے کے لیے سب کو یہی راگ مل جاتا ہے۔"

نظریہ تو میرا اپنا بھی یہی تھا تاہم میں خاموش رہا۔ سونیا پر زرتاج کی بات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ کھردرے لہجے میں بولی۔ "بکواس بند کرو...... اور تم سب اپنے ہتھیار سامنے پھینک دو۔"

زرتاج اس کا حکم ان سنا کرتے ہوئے بولی۔ "میں چاہتی ہوں، تمہیں مجھ جیسے لوگوں اور اس معاشرے سے شکایت نہ رہے۔ میں تمہیں موقع دیتی ہوں کہ تم اب بھی پھولن دیوی بننے کا خیال دل سے نکال دو۔ تم میرے ساتھ چلو۔ تمہیں باعزت زندگی گزارنے کے لیے جو بھی مدد درکار ہوگی وہ میں فراہم کروں گی۔ تم ذرا دبنگ قسم کی عورت معلوم ہوتی ہو۔ میں تمہیں اپنی زمینوں کی منیجر بنا دوں گی۔ میں چاہتی ہوں، عورتیں اس قسم کے کاموں میں بھی آگے آئیں۔ یہ پہلی مثال ہوگی کہ ایک بڑی زمیندارنی کی زمینوں کی منیجر بھی عورت ہوگی۔"

"مجھے چارہ مت ڈالو۔ مجھے معلوم ہے، تم اس قسم کے خواب دکھا کر مجھے لے جا کر پولیس کے حوالے کر دو گی۔ جانو کی بیوی اور اس کی شریکِ کار کی حیثیت سے میں بھی پولیس کو مطلوب ہوں۔" سونیا منہ بنا کر بولی۔

"میں اتنی چھوٹی عورت نہیں ہوں کہ جان بچانے کے خوف سے جھوٹ بولنے لگوں، جھوٹے وعدے کرنے لگوں۔ میں تو ان لوگوں میں سے ہوں جو وعدہ نبھانے کے لیے جان بھی دے دیتے ہیں۔ تمہیں پولیس سے بچانے کی ذمے داری بھی میں لیتی ہوں۔ اب تمہیں کیا اعتراض ہے؟ میں نے تو سنا تھا کہ تم اپنے شوہر کے ڈاکو ہونے سے بیزار ہو...... تم اس دلدل میں آ کر پھنس گئی تھیں...... یہ تمہارے آئیڈیلز نہیں تھے...... وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اب تم خود ڈاکو بننے نکل کھڑی ہوئی ہو۔"

"جانو ڈاکو تھا یا دہشت گرد، وہ بہرحال میرا شوہر تھا۔ میں اسے ہلاک کرنے والوں کو معاف نہیں کر سکتی۔ میرے ہاتھ اس سے پہلے بھی خون میں رنگے ہوئے ہیں۔ اب یہ غدار بھی میرے ہاتھوں ماری جا چکی ہے......" اس نے نورین کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔ "اب تم لوگوں کو بھی زندہ چھوڑنے کا میرا ارادہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے اس کے بعد میرے سامنے واپسی کا راستہ نہیں رہے گا۔"

"فی الحال تو راستہ موجود ہے لیکن اپنے لیے راستے تم خود بند کر رہی ہو۔" زرتاج بولی۔

"ان دو آدمیوں کے علاوہ بھی ابھی کچھ آدمی میرے ساتھ ہیں جو اپنی جان پر کھیل کر مجھے اپنی سردارنی سمجھ کر جانو کی چھوڑی ہوئی بادشاہت کی حفاظت کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں انہیں مرنے کے لیے چھوڑ کر تمہارے سائے میں پناہ نہیں لے سکتی۔ یہ میرے لیے جانیں دینے والے لوگ ہیں۔ میں بھی ان کی خاطر جان دے سکتی ہوں۔"

"دیکھا..... میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ اصل میں تم جیسے لوگوں کا خمیر ہی خراب ہوتا ہے۔ معاشرے اور حالات کے تو صرف بہانے ہوتے ہیں۔ صرف بُرے لوگ ہی بُرے لوگوں کے لیے جان دینے کو تیار رہتے ہیں۔" زرتاج بولی۔

سونیا کے ساتھی ڈاکوؤں میں سے ایک بے تابی سے کلاشنکوف کو حرکت دیتے ہوئے ہم پر سے نظر ہٹائے بغیر سونیا سے مخاطب ہوا۔ "میڈم! اس قصے کو جلدی ختم کریں۔ ابھی ہمیں اڈے پر واپس جا کر بہت سے کام نمٹانے ہیں۔"

سونیا اس کی طرف دیکھے بغیر ہاتھ کے اشارے سے اسے گویا تسلی دیتے ہوئے بولی۔ "غم نہ کرو۔ میں بات ان سے کر رہی ہوں لیکن میرا دماغ دوسری طرف بھی کام کر رہا ہے۔ ہمارا بڑا نقصان

ہوا ہے۔ سارا نقصان تو پورا نہیں ہو سکتا لیکن اگر ہم زرتاج کو زندہ لے چلیں تو کچھ نہ کچھ نقصان ضرور پورا ہو جائے گا۔"

شاید ایسے ہی موقعوں کے لیے کہا گیا ہے کہ لالچ بُری بلا ہے۔ ابتدا میں سونیا کے جو عزائم نظر آرہے تھے' اگر وہ ان پر قائم رہتی تو ہماری جانوں کو شدید خطرہ لاحق تھا۔ گنیں اب بھی ہمارے کندھوں پر تھیں لیکن جس طرح سونیا اور اس کے ساتھیوں نے ہمیں کور کیا ہوا تھا اور جس طرح ہم پر نظر رکھی ہوئی تھی' ہمارے لیے گنیں کندھوں سے اتارنا' سیدھی کرنا اور فائر کرنا تقریباً ناممکن نظر آرہا تھا۔ یہ معمولی سا کام ایک طویل اور پیچیدہ عمل نظر آرہا تھا لیکن اگر سونیا صرف زرتاج کو بھی زندہ لے جانے کے چکر میں پڑ گئی تھی تو ہمارے لیے امید کی کوئی کرن نظر آنے کا امکان پیدا ہو گیا تھا۔

سونیا کی نظر زرتاج پر ہی مرکوز رہی لیکن وہ پسٹل کی خفیف سی جنبش سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "اگر تم یہ آدمی مجھے دے دو تو میں واقعی تمہیں پاکستانی پھولن دیوی بن کر دکھا دوں گی۔"

زرتاج ناگواری سے بولی۔" یہ آدمی کوئی ٹھیلے پر رکھا ہوا امرود نہیں ہے کہ میں اٹھا کر تمہیں دے دوں۔ تم اس آدمی سے خود ہی کیوں نہیں پوچھ لیتیں کہ یہ تمہارے ساتھ جانا چاہتا ہے یا نہیں...... اور تمہیں پھولن دیوی بنانے کے "عظیم کارِ خیر" میں تمہارا ہاتھ بٹانا چاہتا ہے یا نہیں۔"

"مجھے لگتا ہے کہ یہ تمہارے جادو میں پھنسا ہوا ہے اس لیے تم سے ہی پوچھ رہی ہوں۔" سونیا بولی۔ "اسے جب میں نے پہلی بار اپنے اڈے پر جانو کے روبرو دیکھا تھا اور ہمارے آدمیوں نے اسے مارنے پیٹنے کی کوشش میں اس کے ہاتھوں مار کھائی تھی' اس وقت ہی نہ جانے کیوں میرے دل نے کہہ دیا تھا کہ یہ شخص جانو اور اس کے گروہ کی تباہی کا سبب بنے گا۔"

"اس کے باوجود تم اسے ساتھ لے جانا چاہتی ہو؟" زرتاج چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"ہاں۔ میرے خیال میں یہ من موجی ہے۔ اس کی کوئی منزل نہیں ہے۔ اسے اپنا فائدہ نظر آئے یا کسی طرف اس کا دل پلٹ جائے تو یہ کسی کا بھی ساتھی بن سکتا ہے....."

اس اُلو کی پٹھی نے میرے بارے میں بہت ہی غلط اندازہ قائم کیا تھا۔ تاہم میں خاموش ہی رہا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید میں اس کی باتوں سے لطف اندوز ہوتا۔ اچانک اس نے براہِ راست میری آنکھوں میں جھانکا اور دو ٹوک لہجے میں بولی۔ "میں تمہیں بچے کھچے گروہ کا سردار اور اپنا مالک و مختار تسلیم کر سکتی ہوں...... تم نے جو کچھ بھی کیا وہ سب معاف کر سکتی ہوں۔ ہماری طرف آجاؤ..... زرتاج بے شک ایک دولت مند زمیندارنی ہے لیکن ہمارے پاس بھی کافی دولت موجود ہے۔ تم میرے ساتھ مل جاؤ تو ہم اس گروہ کو شاید پہلے سے بھی بڑا کر لیں...... زیادہ مضبوط' زیادہ طاقتور بنالیں۔ زرتاج کے ساتھ رہ کر تمہیں کیا ملے گا؟ اگر اس نے تم سے شادی کر بھی لی ہوتی تو تمہاری عمر اس کی جوتیاں سیدھی کرتے ہی گزرتی...... اور اب تو اس کا بھی کوئی امکان نہیں..... کیونکہ تمہاری زندگیاں اب میرے ہاتھ میں ہیں....."

جب کوئی یہ کہتا ہے کہ فلاں کی زندگی اس کے ہاتھ میں ہے' تو مجھے بڑا عجیب لگتا ہے۔ نہ جانے کیوں اسی لمحے مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ اس کی اپنی زندگی انجام کے قریب پہنچ چکی ہے۔

میں نے زرتاج کی طرف دیکھے بغیر محسوس کیا کہ شاید اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ گھٹے گھٹے لیکن برہم سے لہجے میں بولی۔ "تم اب حد سے زیادہ ہی بکواس کر رہی ہو۔ افضل خان سے میرا کوئی معاشقہ نہیں چل رہا...... ہم شادی کی تیاریاں ہرگز نہیں کر رہے..... اور اگر ایسی کوئی بات ہوتی تب بھی میں اس طرح سرِراہ کھڑے ہو کر اسے ڈسکس کرنا ہرگز پسند نہیں کرتی۔ تمہیں افضل خان سے جو بھی پوچھنا ہے ویسے ہی پوچھ لو۔ اتنی بکواس اور دلیل بازی کی کیا ضرورت ہے؟"

سونیا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ وہ بھی نشے کی عادی تھی۔ اس وقت بھی مجھے پنک میں لگتی تھی لیکن اسے اپنے اوپر خوب قابو تھا۔ تاہم نشے نے اس کے ذہن کو متاثر ضرور کیا تھا۔ اس کی باتوں میں کچھ نہ کچھ سنکی پن کی جھلک ضرور تھی۔

میں نے اپنی آنکھوں میں دلچسپی کی چمک پیدا کرنے کی کوشش کی' گویا میں دل ہی دل میں اس کی تجویز پر غور کرنے لگا تھا۔ سونیا کی نظر اب مجھ پر تھی۔ وہ پسٹل کو خفیف سی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ "کیا کہتے ہو؟"

"کیا اس قسم کی باتوں کا جواب بندوق کی نوک پر لیا جاتا ہے؟" میں نے اتنی دیر میں پہلی بار زبان کھولی۔

"مجبوری ہے.... فی الحال تو تم پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔" سونیا نے کندھے اچکائے لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر وحشت و درندگی کافی حد تک کم ہو چکی تھی۔

"اگر اب بھروسا کرنا مشکل ہے تو پھر آگے چل کر بھی مشکل ہی ہو گا۔" میں نے گویا بات ختم کرنے کی کوشش کی لیکن اب وہ بات ختم کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے یقیناً میری آنکھوں میں دلچسپی کی چمک دیکھ لی تھی۔

"خیر..... ہم دیکھیں گے اس سلسلے میں کیا ہو سکتا ہے..... فی الحال تم سب اپنی اپنی گنیں اپنے سامنے ذرا دور پھینک دو۔" سونیا نے شاہانہ انداز میں حکم دیا۔

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب وہ کم از کم مجھے اور زرتاج کو زندہ ساتھ لے جانے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو چکی تھی۔ میں چاہتا تو اس کی پیشکش قبول کرنے کا ڈراما رچا سکتا تھا اور ان کے خفیہ اڈے تک پہنچ کر ان کے بچے کھچے گروہ کا بھی خاتمہ کرنے کی کوئی تدبیر کر سکتا تھا لیکن میں اب کسی لمبے چکر میں پڑنے کے لیے تیار

نہیں تھا۔ میں اس علاقے میں کچھ زیادہ ہی اُلجھتا جارہا تھا۔ میں تو شاید کئی دن پہلے یہاں سے نکل جاتا لیکن حالات عجیب سے عجیب تر رخ اختیار کیے جارہے تھے۔ اب میں ان حالات میں مزید اُلجھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا' فوری طور پر کرنا تھا۔

زرتاج سے گویا میرا کچھ ذہنی رابطہ سا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ میں جو کچھ سوچ رہا ہوں' جو کچھ کرنے لگا ہوں' زرتاج کو اس کا اندازہ ہے اور وہ اس میں میرا ساتھ دے گی۔

ہم نے اپنی اپنی گنیں اتارنے کے لیے ہاتھ کندھوں کی طرف بڑھائے۔ ہمارے آدمی ہم سے ذرا پیچھے تھے اور ایک دوسرے کے زیادہ قریب نہیں تھے۔ گو کہ میں مُڑ کر ان کی طرف دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن مجھے کسی حد تک ان کی پوزیشن کا اندازہ تھا۔ ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید وہ خاطر خواہ پُھرتی کا مظاہرہ کرسکیں۔ تعداد بہرحال ہماری زیادہ تھی۔ ہم سونیا اور اس کے ساتھیوں کو کنفیوژ کرسکتے تھے۔

جونہی ہمارے ہاتھ کندھوں کی طرف بڑھے' سونیا اور اس کے ساتھی کچھ اور مستعد ہوگئے۔ ٹریگرز پر ان کی انگلیوں کا دباؤ بڑھ گیا۔ سونیا نے تو پسٹل دونوں ہاتھوں سے تھام لیا تھا اور اس کا نشانہ میں تھا۔ زیادہ نشہ کرنے والوں کی آنکھیں عموماً دُھندلائی دُھندلائی سی رہتی ہیں لیکن اس کی آنکھوں میں اس وقت سانپ کی سی چمک تھی۔

"نہایت آہستگی سے گنیں کندھے سے اتارنا...... ذرا بھی ہوشیاری دکھانے کی کوشش نہ کرنا...... یہ تمہاری زندگی اور موت کا سوال ہے۔" سونیا نے خبردار کیا۔

کندھوں سے گنیں اتارنے تک ہم نے اس کی ہدایت پر عمل کیا یعنی ہاتھوں کو نہایت آہستگی سے حرکت دی۔ پھر بظاہر ہم گنیں اپنے سامنے پھینکنے لگے اور اسی لمحے ہمارے ہاتھوں نے تقریباً یکساں انداز میں حرکت کی۔ میں نے اپنی گن سونیا کے منہ پر دے ماری تھی اور زرتاج نے اس کے ساتھی کے منہ پر پھینکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے زمین پر گرتے ہوئے لوٹ لگائی تھی۔

گولیوں کی تڑتڑاہٹ فضا میں گونجی۔ ہمارا صرف ایک آدمی خاطر خواہ پھرتی کا مظاہرہ کرسکا۔ وہ کندھے سے گن اتارنے اور گر کر لوٹ لگاتے ہوئے برسٹ مارنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس برسٹ نے سونیا کے دونوں ہی آدمیوں کا بیک وقت کام تمام کردیا لیکن اس دوران ہمارا ایک آدمی بھی کام آگیا۔ باقی اتفاقاً ہی بچ گئے۔ قسمت ان پر مہربان تھی۔

سونیا نے مزید فائر کرنے کے بجائے پلٹ کر بھاگنے کی کوشش کی تاکہ ہماری رسائی سے نکل جائے۔ چند قدم ہٹ کر وہ ہمیں دوبارہ نشانہ بنانے کی کوشش کرسکتی تھی لیکن میں نے اسے اس کا موقع نہیں دیا۔ اس وقت تک اس کی ٹانگ میری رسائی میں آچکی تھی۔ میں نے ٹانگ پکڑ کر کھینچ لی۔

وہ گر پڑی لیکن گرتے گرتے بھی اس نے پلٹ کر فائر کیا۔ گولی میرے سر سے ذرا بلندی سے ہی گزر گئی۔ اس کے بعد میں نے اسے گولی چلانے کا موقع نہیں دیا۔ میں اچھل کر اس پر جا گرا تھا۔ اس کا پسٹل والا بازو میرے ہاتھ میں آگیا۔ میں نے اسے کسی درخت کی ٹہنی کی طرح مروڑ کر رکھ دیا۔ اس کے حلق سے ذبح کیے ہوئے بکرے کی سی آواز نکلی۔ شاید اس کا بازو جوڑ پر سے ہی اُکھڑ گیا تھا۔

پسٹل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں نے جھپٹ کر اسے اٹھا لیا۔ اس آخری لمحے میں' میں نے اس کے چہرے پر بے پناہ دہشت اور بے یقینی دیکھی لیکن میں نے وہ لمحہ سوچ بچار میں ضائع نہیں کیا۔ میں نے اسی کے پستول کی گولی اس کے سینے میں اتار دی۔ گولی بالکل اسی طرح عین اس کے دل سے گزر گئی جس طرح نورین کے دل سے گزری تھی۔ یہ میرا اندازہ تھا اور ان معاملات میں میرے اندازے شاذو نادر ہی غلط ہوتے تھے۔ وہ گولی بھی اس کے پسٹل کی آخری گولی تھی۔ میں نے دوبارہ ٹریگر دبایا تو صرف کلک کی آواز سنائی دی۔

میں آہستگی سے گھوما۔ وہ جگہ اب کچھ اچھا منظر پیش نہیں کر رہی تھی۔ ایک لمحے پہلے تک جہاں زمین بے داغ تھی اب وہاں خون پھیلا ہوا تھا اور دھیرے دھیرے جذب بھی ہو رہا تھا۔ اس زمین پر شاید بہت ہی منحوس قدموں کی آمدورفت رہی تھی جو خون کی پیاسی ہوگئی تھی ورنہ زمین ایسی ہوتی نہیں...... وہ تو اپنی کوکھ سے انسان کے لیے رزق اور دولت اُگلتی ہے۔

زرتاج میرے برابر آن کھڑی ہوئی تھی۔ وہ متاسفانہ سی نظروں سے سونیا کی لاش کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "یہ عورت تھی...... اور ذرا مختلف قسم کی عورت تھی...... لیکن تم نے اسے ہلاک کرنے میں ایک لمحہ بھی تامل نہیں کیا۔"

میں نے نورین کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ بھی عورت تھی...... اور ہماری محسنہ تھی۔ سونیا نے بھی اسے ہلاک کرنے میں ایک لمحہ بھی تامل نہیں کیا تھا۔"

"اوہ......" زرتاج نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے صرف اتنا ہی کہا۔

میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "اس کے علاوہ...... اگر میں ایک لمحہ تامل کرتا تو شاید سونیا کی جگہ میری لاش پڑی ہوتی۔"

"اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" زرتاج ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولی۔ "ہماری گاڑیوں میں ان سب لاشوں کو لے جانے کی گنجائش نہیں۔"

"گاڑی تو شاید ان لوگوں کی بھی کہیں آس پاس ہی موجود ہوگی۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہمیں لاشوں کو نہیں چھیڑنا چاہیے۔ کچھ کام پولیس کے لیے بھی چھوڑ دینا چاہیے۔"

ہم نے کچھ دور تک ادھر اُدھر گھوم پھر کر دیکھا۔ ہمیں ایک جگہ درختوں کے ایک جھنڈ کے عقب میں ایک جیپ کھڑی نظر آگئی۔ جس وقت ہم لوگ گولڈ کی کلب کی تباہی کے نظارے میں محو تھے‘ شاید اس وقت سونیا اور اس کے ساتھی اس جیپ میں یہاں پہنچے تھے۔ میں نے اس جیپ کی تلاشی لی لیکن اس میں کوئی خاص چیز نہیں تھی۔ ہم نے اسے وہیں چھوڑ دیا اور اپنی دو گاڑیوں میں بیٹھ کر واپس روانہ ہوگئے۔

ہم زرتاج نگر واپس پہنچے تو ایک پولیس پارٹی وہاں پہنچی ہوئی تھی۔ ایک ڈی ایس پی ان کی قیادت کر رہا تھا۔ پولیس گاؤں کے ان لوگوں میں سے چند کے بیانات قلمبند کر رہی تھی جنہوں نے ڈاکوؤں سے مقابلے میں حصہ لیا تھا۔ کمدار ان سے نمٹ رہا تھا۔ پولیس کا سامنا ہونے سے پہلے ہی زرتاج کو ان کے بارے میں تمام اطلاعات مل گئیں۔ وہ ابھی باغ میں ہی تھے۔

جو شخص ان کے بارے میں اطلاع لے کر آیا تھا‘ زرتاج نے اس سے کہا۔ ”ٹھیک ہے..... انہیں اپنا کام کرنے دو۔ میں اس وقت سخت تھکی ہوئی ہوں۔ حویلی میں جا رہی ہوں۔ پہلے میں ذرا ستا لوں اور اپنا حلیہ تھوڑا بہت ٹھیک کرلوں‘ اس کے بعد ڈی ایس پی صاحب کو میرے پاس لے کر آنا۔“

”ٹھیک ہے رئیسانی جی!“ وہ شخص ہاتھ باندھ کر بولا اور زرتاج نے پیجرو کا رخ حویلی کی طرف موڑ دیا۔

حویلی میں نچلی منزل پر کئی لاشیں اسی طرح پڑی تھیں۔ زرتاج نے اپنے آدمیوں کو مختلف کام سنبھالنے کے سلسلے میں ہدایات دیں اور میرے ساتھ اوپر کی منزل پر آگئی۔ مجھے اوپر کی منزل کے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر وہ چند ہی منٹ میں لباس تبدیل کرکے اور اپنا حلیہ کافی حد تک درست کرکے واپس آگئی۔ اس کام میں اتنی پھرتی دکھا کر اس نے گویا عورتوں کی روایت کو توڑ دیا تھا۔

میں اس وقت اسی بالکونی میں چق کے پیچھے کھڑا تھا جہاں سے میں نے کچھ دن پہلے جانو اور خمیسو خان وغیرہ کی آمد کا نظارہ کیا تھا۔ مجھے یقین کرنا مشکل محسوس ہو رہا تھا کہ اب ان لوگوں کا خاتمہ ہوچکا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب یہاں میرا کام بھی ختم ہوچکا تھا۔ قدرت مجھ سے جو کام لینا چاہتی تھی‘ لے چکی تھی۔ اب مجھے یہاں سے رخصت ہوجانا چاہیے تھا۔ مجھے پولیس کی نظر میں آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس سے میرے لیے اُلجھنیں کھڑی ہوسکتی تھیں اور میرے یہاں سے نکلنے کے پروگرام میں تاخیر ہوسکتی تھی۔

زرتاج تھکے تھکے سے انداز میں ایک صوفے پر ڈھیر ہوگئی۔ میں نے رائفل اس کے صوفے کے سہارے کھڑی کرتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے‘ میرے رخصت ہونے کے لیے یہی وقت مناسب ہے۔ میں پولیس کے چکروں میں پڑنا نہیں چاہتا۔ میں خاموشی سے رخصت ہوجاتا ہوں۔ آپ جس طرح مناسب سمجھیں پولیس کو کہانی سنا دیجیے گا۔“

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ”اب ایسی بھی کیا آفت آرہی ہے؟ یہ کون سا وقت ڈھونڈا ہے تم نے رخصت ہونے کا؟ ہم اتنی خطرناک صورت حال سے گزرے ہیں۔ تم کم از کم ایک آدھ دن تو ستا لو۔ پولیس کی تم فکر مت کرو۔ ان سے میں نمٹ لوں گی۔ اب میں اتنی بھی گئی گزری نہیں ہوں۔ شرافت اور امن سے رہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میرا یہاں کوئی دبدبہ نہیں ہے۔“

”نہیں..... یہ مسئلہ نہیں ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ویسے ہی..... نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا ہے کہ میں یہاں مزید ایک آدھ گھنٹا بھی رُکوں گا تو مزید اُلجھتا چلا جاؤں گا۔ اب میرا چلے جانا ہی بہتر ہے.....“

تھوڑی سی بحث و تمحیص کے بعد بالآخر اس نے مجھے جانے کی اجازت دے دی اور بولی۔ ”کم از کم اپنا حلیہ تو کچھ ٹھیک کرتے جاؤ..... میں تمہارے لیے کسی ڈھنگ کے لباس کا تو فوری طور پر بندوبست نہیں کرسکتی لیکن کم از کم صاف شلوار قمیص مہیا کرسکتی ہوں.....“

اس نے ملازمہ کو ذرا بڑے سائز کی ایک شلوار اور قمیص کا انتظام کرنے کے لیے کہا۔ میری حالت اس وقت واقعی خانہ بدوشوں سے بدتر تھی۔ میں جب لباس تبدیل کرکے اور زرتاج ہی کی طرح اپنے آپ کو تھوڑا بہت ”جھاڑ پونچھ“ کر دوبارہ اس کے سامنے آیا تو وہ کسی سوچ میں ڈوبی بیٹھی تھی۔

میری آہٹ سن کر سر اُٹھاتے ہوئے بولی۔ ”سفر کے لیے تمہیں کچھ رقم کی بھی تو ضرورت ہوگی؟“

”میں نے کچھ انتظام کر رکھا ہے۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔ ”آپ نے مجھے جو سرونٹ کوارٹر دے رکھا ہے‘ وہاں ایک الماری میں‘ میں نے کچھ رقم چھپائی ہوئی ہے۔“

”اسے تو بھول جاؤ۔“ زرتاج وثوق سے بولی۔ ”تمہیں یاد نہیں‘ عبدل جو وہاں تمہارا کھانا وغیرہ پکاتا تھا‘ غدار تھا..... جانو کا ایجنٹ تھا..... جب وہ اور جانو وغیرہ حویلی میں گھسے تھے تو وہ خود اپنے منہ سے کہہ رہا تھا کہ وہ تمہارے کمرے کی اچھی طرح تلاشی لے چکے تھے۔ جب ڈاکو بہت اچھی طرح تلاشی لے چکے ہوں تو تمہیں وہاں رقم محفوظ رہ جانے کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔“

اس کی بات معقول تھی۔ میں تذبذب کے سے عالم میں کھڑا رہ گیا۔ وہ اٹھی اور ملحقہ کمرے میں چلی گئی۔ چند لمحے بعد وہ واپس آئی اور نوٹوں کی ایک گڈی میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”یہ رکھ لو..... گھر میں اس وقت زیادہ کیش نہیں ہے۔ تم آج کا دن رُکتے تو جتنی رقم کا چاہتے‘ بندوبست ہوسکتا تھا۔“

وہ بڑے نوٹوں کی سربہ مہر گڈی تھی۔ ایک لاکھ روپیا تھا۔ میں نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ ”آپ اسے کم سمجھ رہی ہیں؟ میرے لیے تو یہ بہت زیادہ ہے۔ میں اتنی رقم کا کیا کروں گا؟ مجھے

کون سا جہاز سے سفر کرنا ہے اور فائیو اسٹار ہوٹلوں میں ٹھہرنا ہے۔ میں تو آج کل صحیح معنوں میں عوامی زندگی گزار رہا ہوں اور لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ مجھے تو پانچ دس ہزار روپیا دے دیجیے۔ میرے لیے بہت ہوگا۔ کافی دن عیش و عشرت سے گزر جائیں گے۔"

"مذاق مت کرو۔ مجھے معلوم ہے، یہ رقم تمہارے لیے نہایت معمولی ہے لیکن تم اسے بوجھ سمجھ کر قبول نہیں کر رہے۔ خدا کے لیے اسے بوجھ مت سمجھو۔ تمہیں معلوم نہیں کہ تم خود مجھ پر کتنے بڑے احسانات کا بوجھ چھوڑ کر جا رہے ہو۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"میں نے اگر کوئی اچھا کام کیا ہے تو اسے خود پر احسان مت سمجھیں۔ یہ سب کچھ بس خود بخود ہوتا چلا گیا۔ جہاں تک رقم کا تعلق ہے تو ان دنوں میرے لیے بڑی سے بڑی رقم بھی حقیر سی ہو کر رہ گئی ہے۔ میں جن حالات سے گزر رہا ہوں ان میں کئی بار مجھے احساس ہوا کہ بعض اوقات نوٹوں کی گڈیاں انسان کے لیے ردی کاغذ کے پرزوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں......" میں نے کہا تاہم اس کے اصرار پر مجھے وہ گڈی اپنی واسکٹ کی جیب میں رکھنا پڑی۔

"میں نے ملازمہ کی زبانی پیغام بھجوا دیا ہے....." زرتاج بولی۔ "حویلی کے باہر ڈرائیور آچکا ہوگا۔ وہ پجیرو میں تمہیں بس اڈے تک لے جائے گا۔ بس سے تم ڈہرکی چلے جانا اور وہاں سے کراچی جانے کے لیے کوئی بھی ٹرین پکڑ لینا۔"

"میں آپ کی عنایات کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔" میں نے کہا۔

"پھر کب ملاقات ہونے کی امید رکھی جائے؟" اس نے منہ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ مجھے اس کے لہجے میں افسردگی کی جھلک محسوس ہوئی۔

"زندگی رہے تو ملاقات کی امید رہتی ہی ہے۔" میں نے کہا۔ اس نے شکوہ نہیں کیا کہ میں نے اسے اپنا کوئی ایڈریس نہیں دیا تھا۔ اس نے مانگا بھی نہیں تھا۔ ادھر انا تھی اور ادھر ایک بے وجہ سی احتیاط۔

میں نیچے آگیا۔ ابھی تک گیٹ پر گارڈز اپنی ڈیوٹی پر واپس نہیں آسکے تھے اور گیٹ کھلا ہی تھا۔ میں حویلی کی بالکونی کے نیچے سے نکل کر برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر گیٹ کی طرف بڑھا۔ ابھی میں دو تین قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ ایک باوردی پولیس والا ہچکچاہٹ آمیز سے انداز میں اندر داخل ہوا۔ کسی طرف سے ایک ملازمہ اسے روکنے کے لیے آگے بڑھی لیکن اسی لمحے اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔

ایک لمحے کے لیے ہم دونوں ساکت رہ گئے۔ اس نے مجھے اور میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ انسپکٹر رحیم گل تھا اور حویلی کی طرف غالباً تنہا ہی آیا تھا۔ نہایت پھرتی سے اس نے ریوالور نکال کر مجھ پر تان لیا۔ میں اس وقت بالکل نہتا تھا۔ میں نے پلٹ کر بھاگنے یا ادھر ادھر ہونے کی کوشش نہیں کی۔

"تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا تمہید بولا۔ اس وقت تک وہ طویل و عریض احاطے کے وسط میں پہنچ چکا تھا۔

"میں اس وقت خود اپنے علاوہ کسی کے ساتھ نہیں چل سکتا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ درحقیقت میں ایسی ہی کسی صورت حال کے اندیشے کی وجہ سے یہاں مزید نہیں رک رہا تھا لیکن اس قسم کی صورت حال پھر بھی میرے سامنے آہی گئی تھی۔

"میں ہر حال میں تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔" وہ ضدی انسانوں کے سے انداز میں بولا۔ معلوم نہیں وہ اکیلا کس چکر میں حویلی کی طرف نکل آیا تھا۔ باقی پولیس والے شاید ابھی باغ اور گاؤں میں ہی اپنی کارروائیوں میں مصروف تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ رحیم گل ان کے ساتھ نہیں بلکہ الگ ہی اپنے طور پر آیا ہو۔ احاطے میں اس وقت بھی کئی لاشیں پڑی تھیں اور رحیم گل کے تیور کچھ ایسے تھے جیسے وہ ان میں ایک اور لاش کا اضافہ کرنا چاہتا ہو۔

"آخر تم کیوں مجھے ساتھ لے جانے پر تُلے ہوئے ہو؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"کیونکہ تم ایک خطرناک مجرم ہو۔ قتل اور ڈکیتی کی کئی وارداتوں میں مجھے مطلوب ہو۔" وہ سخت لہجے میں بولا۔

"تمہیں یا قانون کو؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"ایک ہی بات ہے۔" وہ بولا۔ حالانکہ اس بدبخت کو معلوم ہو چکا تھا کہ میں نے اس کی جان بچائی تھی۔ اس کے باوجود وہ نہ جانے کیوں اپنے خیال پر اڑا ہوا تھا۔

"میں مجرم نہیں ہوں..... نہ ہی میں نے کسی بے گناہ کو قتل کیا ہے اور نہ ہی میں نے کوئی ڈاکا ڈالا ہے۔" میں نے ملائمت سے کہا۔ "مجھے جانے دو۔"

"اگر یہ باتیں اتنی ہی آسانی اور سادگی سے طے ہو جایا کرتیں تو پھر پولیس اور عدالتوں وغیرہ کی کیا ضرورت تھی۔" وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔

"تمہیں یقین ہے کہ میں ایک خطرناک مجرم ہوں؟" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔ وہ کچھ گڑبڑا گیا۔

"میرے یقین کو چھوڑو۔ فیصلہ عدالت میں ہوگا۔ میرا کام تمہیں گرفتار کر کے عدالت میں پیش کرنا ہے۔ واقعاتی اور ظاہری شہادتیں تمہارے خلاف ہیں۔" وہ تیزی سے بولا۔

"بعض اوقات انسان کی آنکھیں اسے دھوکا دیتی ہیں اور تم بھی بہرحال ایک انسان ہو۔" میں نے کہا۔ "کچھ وقت ضرور لگے گا لیکن حقائق بہرحال تمہارے علم میں آجائیں گے۔ فی الحال مجھے جانے دو۔ میں یہاں اُلجھنا نہیں چاہتا......" میں نے چلنے کے لیے قدم بڑھایا۔ میری نظر اس کی اس انگلی پر جمی ہوئی تھی جو ٹریگر پر تھا۔ ٹریگر پر اس کی انگلی کا دباؤ خطرناک حد تک بڑھ گیا۔

اچانک ایک فائر ہوا۔ مجھے جھٹکا سا لگا لیکن پھر احساس ہوا کہ گولی مجھے نہیں لگی تھی۔ فائر رحیم گل نے نہیں کیا تھا بلکہ اس کے ہاتھ سے تو ریوالور نکل کر دور جا گرا تھا۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ بالکونی کی چق اٹھی ہوئی تھی۔ زرتاج رائفل لیے بالکونی میں کھڑی تھی۔ میں دل ہی دل میں اس کے نشانے کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ رحیم گل کبھی اپنے خالی ہاتھ کی طرف اور کبھی زرتاج کی طرف دیکھ رہا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ اس کا ہاتھ زخمی نہیں ہوا تھا۔

"اسے جانے دو رحیم گل!" زرتاج بلند لیکن پُرسکون آواز میں بولی۔ "یہ تمہارا مطلوبہ آدمی نہیں ہے۔ اس نے تو الٹا تمہاری جان بچائی تھی۔ یہ ایثار کا قیدی ہے۔ اس نے بڑے افسانوی انداز میں کسی کے لیے ایثار کرنے کی کوشش کی تھی اور تمہاری نظر میں مجرم بن گیا۔ میں تمہیں اس کی پوری کہانی سنا دوں گی لیکن فی الحال اسے جانے دو۔"

"کہانیاں بعد میں سُنی جاتی رہیں گی اور ان کی حقیقت کا بھی پتا چل جائے گا لیکن فی الحال میں اس کو گرفتار کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔" رحیم گل بلند آواز میں بولا۔ وہ اپنی ضد پر قائم تھا۔ اس سے جو کچھ کہا جا رہا تھا' اگر وہ کسی حد تک اس کی صداقت کا قائل تھا تب بھی کارروائی وہ اپنی مرضی کے مطابق ہی کرنا چاہتا تھا۔ معلوم نہیں وہ کسے مطمئن کرنا چاہتا تھا۔ قانون کو' اپنی انا کو یا اپنی شکی طبیعت کو؟

"اسے خواہ مخواہ اپنی انا کا مسئلہ مت بناؤ رحیم گل! میرا مہمان جانا چاہتا ہے تو اسے جانے دو۔ یہ تو تم پولیس والوں پر بھی بہت سے احسانات کرکے جا رہا ہے۔ تمہارے حصے کا بہت سا کام نمٹا کر جا رہا ہے جو شاید تم جیسے بہت سے آفیسر مل کر زندگی بھر میں بھی نہ نمٹا پاتے۔" زرتاج جذبات میں آکر ایسی بات کر گئی جو میرے خیال میں غیر ضروری ہی تھی۔

رحیم گل چونکا۔ اسے یقیناً یہ تو معلوم ہو ہی چکا ہوگا کہ گزشتہ رات زرتاج نگر میں کیسی خونریزی ہوئی تھی۔ یہ زرتاج نگر والوں کی خوش قسمتی تھی کہ خون ڈاکوؤں کا بہا تھا۔ اگر ڈاکو اپنی حکمت عملی میں کامیاب ہو جاتے تو صورت حال اس کے بالکل اُلٹ ہوتی۔ گاؤں والوں کا تو صرف جانی ہی نہیں' مالی نقصان بھی بے اندازہ ہوتا۔ نہ جانے کتنے گھروں کو آگ لگتی اور کیا کچھ اُجڑتا۔

رحیم گل سر کو خفیف سی حرکت دیتے ہوئے بولا۔ "اس صورت حال میں تو اس شخص کا یہاں رکنا اور بھی ضروری ہے۔ ہمیں اس سے بہت کچھ پوچھنا ہوگا۔"

"تمہیں جو کچھ پوچھنا ہوگا وہ مجھ سے پوچھ لینا۔ میں جواب دوں گی۔ اس کے بعد مجھے بھی پولیس کے محکمے سے بہت سے سوالات کرنے ہیں۔ ہوسکے تو تم بھی ان کے جواب دینے کی کوشش کرنا۔" زرتاج بولی۔

میں نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ رحیم گل نے بازو پھیلا کر میرا راستہ روک لیا۔ زرتاج نے دوسرا فائر کیا۔ اس کی ٹوپی دور جا گری۔ زرتاج سرد لہجے میں بولی۔ "میں اس ٹوپی کی توہین کرنا نہیں چاہتی تھی لیکن تم مجھے مجبور کر رہے ہو۔ دوسری گولی اس سے ایک انچ نیچے بھی آسکتی ہے۔"

رحیم گل اپنی جگہ ساکت ہو گیا لیکن اسی بے خوف لہجے میں بولا۔ "آپ سرکاری کام میں مداخلت اور ایک پولیس آفیسر پر قاتلانہ حملے کی مُرتکب ہو رہی ہیں رئیسانی! آپ کو اس کے نتائج کا سامنا کرنا ہوگا۔"

"میں اپنی نرم مزاجی کو بالائے طاق رکھنے پر مجبور ہو گئی ہوں انسپکٹر! اب میں بھی تیار ہوں اور تم بھی یہ دیکھنے کے لیے تیار رہنا کہ کس کو کن نتائج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔" زرتاج کے لہجے میں پہلی بار میں نے فولاد کی سی سختی محسوس کی۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "تم جاؤ افضل خان! میں اور رحیم گل ایک دوسرے سے نمٹتے رہیں گے۔"

رحیم گل قدم بڑھاتے ہوئے بولا۔ "رئیسانی! آپ چاہیں تو مجھے گولی مار دیں۔ میں خالی ہاتھ ہی اس شخص کو روکنے کی کوشش کروں گا۔"

"تم افضل خان کو روکو گے؟" زرتاج نے استہزائیہ سا قہقہہ لگایا۔ "یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے رحیم گل! یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی بچہ کسی بپھرے ہوئے ہاتھی کا راستہ روکنے کی بات کرے۔ اگر تمہیں راستہ روکنے کا اتنا ہی شوق ہے تو ان ڈاکوؤں اور دہشت گردوں کا راستہ روکا ہوتا جنہوں نے پچھلی رات زرتاج نگر پر دھاوا بولا تھا۔"

"اگر مجھے بروقت اطلاع مل جاتی تو میں ان کا راستہ روکنے کی کوشش بھی ضرور کرتا۔" رحیم گل نے پُروقار لہجے میں کہا پھر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "میں اس کو بھی ڈاکو ہی سمجھ کر اس کا راستہ روک رہا ہوں۔"

"اس وقت مجھے تم میں اور عام سے پولیس والوں میں کوئی فرق نظر نہیں آرہا۔" زرتاج نے متاسفانہ سے لہجے میں کہا۔

رحیم گل کو نہیں معلوم تھا کہ دو گرانڈیل افراد اس کے عقب میں پہنچ چکے تھے۔ وہ دبے قدموں آگے بڑھے اور غالباً زرتاج کا اشارہ پاکر انہوں نے اچانک رحیم گل کو دبوچ لیا۔ انہوں نے رحیم گل کے دونوں بازو اور گردن قابو میں کرلی۔ وہ گھٹی گھٹی سی آواز میں چیختا رہا اور اپنے مؤقف کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

میں نے پلٹ کر اشارے سے زرتاج کا شکریہ ادا کیا اور رحیم گل کو بڑے پیار سے خدا حافظ کہہ کر نکل آیا۔ مجھے امید تھی کہ زرتاج اس سے اچھی طرح نمٹ لے گی۔ وہ اپنی طاقت استعمال کرنے پر اُتر آئی تھی۔ اب اس کے لیے اس قسم کے مسائل کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔

حویلی کے باہر دیوار کی اوٹ میں ڈرائیور پیجو لیے کھڑا تھا۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا اور کچھ دیر کے سفر کے بعد ہم اس سڑک پر آن پہنچے جو آگے جا کر ہائی وے سے ملتی تھی۔ جب تک بس نہیں آگئی اور ڈرائیور نے اسے روک کر مجھے اس میں سیٹ نہیں دلا دی تب تک وہ وہیں کھڑا رہا۔

بس سے میں ڈہرکی پہنچا۔ ڈہرکی کے ریلوے اسٹیشن پر مجھے دو ڈھائی گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ بالآخر ایک ٹرین آئی جو کراچی جا رہی تھی لیکن اس کی وہی حالت تھی جو عموماً ہمارے ہاں ٹرینوں کی ہوتی ہے۔ کہیں مسافر ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے اور کہیں سامان سے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ چڑھنے والے کون تھے اور اترنے والے کون۔ جو لوگ ٹرین کے اندر تھے' ان میں سے بیشتر کی کوشش تھی کہ کوئی سوار نہ ہونے پائے۔ انہوں نے دروازے بند کر رکھے تھے کیونکہ اندر تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔

بالآخر میں نے ریلوے کے ایک "اعلا افسر" یعنی قلی کی خدمات حاصل کیں جس نے معقول "حق الخدمت" کے عوض مجھے ان مسائل سے نجات دلائی اور سلیپر میں ایک سیٹ مہیا کی۔ ٹرین چلنے تک میں چوکنا ہی رہا لیکن مجھے اسٹیشن پر کوئی بھی عام شخص یا پولیس والا ایسا دکھائی نہیں دیا جس کے بارے میں مجھے شبہ ہوتا کہ وہ میرے تعاقب میں وہاں آیا ہوگا۔ ٹرین چل پڑی تو میں ذرا بے فکر ہو کر اپنی سیٹ پر نیم دراز ہوگیا۔ گزشتہ شام سے میں مسلسل معرکہ آرائی میں اُلجھا ہوا تھا۔ اب حالتِ سفر میں آرام میسّر آیا تھا۔

کسی وجہ سے اس روز تمام ٹرینیں بہت تاخیر سے کراچی پہنچ رہی تھیں۔ میں جس ٹرین میں تھا' وہ بھی اپنے اصل وقت سے کہیں بعد میں' رات گئے کراچی پہنچی۔ اس وقت تک میرا حلیہ دوبارہ بہت خراب ہو چکا تھا۔ شیو تو پہلے ہی بڑھی ہوئی تھی جو تقریباً داڑھی کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ بال منتشر تھے اور مٹی میں اَٹے ہوئے تھے۔ سفر کے دوران شلوار قمیص میں بری طرح شکنیں پڑ چکی تھیں اور راستے میں اس قدر مٹی اور گرمی تھی کہ وہ کپڑے ایک ماہ پہلے کے پہنے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

میں نے پلیٹ فارم پر اترنے کے بعد سوچنا شروع کر دیا کہ مجھے کہاں جانا چاہیے۔ اس سے پہلے میں نے اس موضوع پر غور کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ میں نے چند ہی لمحوں میں فیصلہ کر لیا کہ مجھے ایک عام آدمی کی حیثیت سے اپنے ہی فائیو اسٹار ہوٹل میں چلے جانا چاہیے۔

باہر آکر ٹیکسی میں بیٹھ کر جب میں نے ڈرائیور کو مطلوبہ ہوٹل چلنے کے لیے کہا تو اس نے مُڑ کر ذرا غور سے میری طرف دیکھا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ حلیے سے ایک پریشان حال اور بے سرو سامان دیہاتی نظر آنے والا شخص فائیو اسٹار ہوٹل کا رخ کس لیے کر رہا ہے؟ پھر اس نے گویا دل ہی دل میں اپنے آپ کو کسی جواز سے مطمئن کرتے ہوئے ٹیکسی اسٹارٹ کی اور ہوٹل کی طرف روانہ ہوگیا۔

ہوٹل کے دروازے پر اتر کر میں نے اسے بھاری ٹپ دی تو اس کی باچھیں کھل گئیں اور اسے شاید اطمینان بھی ہوگیا کہ مسافر خواہ "پینڈو" اور بدحال تھا مگر اس کے پاس روپیا بہرحال موجود تھا۔

ہوٹل کا دربان جو ہر آتے جاتے کو دیکھ کر باچھیں پھیلا کر دروازہ کھولتا تھا' مجھے دروازے کی طرف بڑھتے دیکھ کر گویا شش و پنج میں پڑ گیا کہ دروازہ کھولے یا نہ کھولے۔ میں نے اس کی الجھن دور کر دی اور خود ہی دروازہ کھول کر اندر جا پہنچا۔

فائیو اسٹار ہوٹلوں میں عموماً رات کو دن سے زیادہ رونق ہوتی ہے لیکن اس رات وہاں خاص رونق نظر نہیں آرہی تھی۔ لابی اور لاؤنج خالی پڑا تھا۔ دائیں ہاتھ پر کافی بار میں بھی صرف دو تین نوجوان جوڑے سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ ریسپشن پر صرف ایک ہی کلرک موجود تھا اور وہ بھی اونگھ رہا تھا۔

میری آہٹ سن کر اس نے سر اٹھایا اور ذرا چونک کر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ شاید اس کی بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایک مفلوک الحال' میلا کچیلا' دیہاتی سا شخص منہ اٹھائے فائیو اسٹار ہوٹل میں کیوں گھسا چلا آرہا تھا۔ اس وقت اگر کوئی میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے یہ بتانے کی کوشش کرتا کہ یہ میلا کچیلا' دیہاتی سا شخص اس ہوٹل کا مالک ہے تو شاید وہ اسے ایک بچگانہ مذاق سمجھتا۔ ویسے بھی وہ مجھے کوئی نیا ہی ریسپشنسٹ معلوم ہوتا تھا۔ اس کے سامنے تو اگر میں "صحیح" حلیے میں بھی جاتا تو اس کے لیے اجنبی ہوتا۔ بلکہ ایک اسی پر کیا موقوف' ہوٹل کا بیشتر عملہ مجھے صورت سے نہیں پہچانتا تھا۔

کاؤنٹر پر پہنچ کر جب میں نے ہوٹل میں قیام کا ارادہ ظاہر کیا اور اپنے لیے ایک لگژری سوئٹ طلب کیا تو استقبالیہ کلرک کچھ پریشان ہوگیا۔ شاید وہ مجھے سوئٹ تو کیا' سنگل کمرا بھی دینے سے انکار کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس طرح ایسا کرے۔ محض ظاہری حلیے کی بنیاد پر کسی کو کمرا دینے سے انکار کرنا ہوٹلوں کی روایات کے خلاف تھا۔

اس نے بادل نخواستہ کارڈ میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے جان بوجھ کر نہایت کم پڑھے لکھے افراد کی طرح اس سے پوچھ پوچھ کر اسے اُردو میں پُر کرنا شروع کیا۔ خانہ پُری مکمل کر کے میں نے اس طرح گہری سانس لی گویا کوئی بہت کٹھن مرحلہ سر کر لیا ہو۔ پھر میں نے چاروں طرف سر گھما کر چمکتے دمکتے در و دیوار' جھلملاتے فرش اور جگمگاتے فانوسوں کا جائزہ لیا اور کچھ مرعوبیت' کچھ طمانیت سے سرہلایا' گویا میں اپنے خوابوں کی سرزمین پر پہنچ گیا تھا۔

استقبالیہ کلرک نے غالباً مجھے مزید مرعوب کرنے کے لیے انگریزی میں پوچھا۔ "آپ کے پاس کوئی سامان وغیرہ نہیں ہے؟"

اس کے لہجے میں بظاہر ملائمت تھی لیکن در حقیقت اس کا لہجہ چبھتا ہوا سا تھا۔

"جی، جی...... ؟ کیا فرمایا؟" میں نے ہونقوں کی طرح پوچھا۔ حالانکہ میرا اس قسم کی اداکاری کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن اس صورت حال سے میں خواہ مخواہ ہی کچھ لطف اندوز ہونے لگا تھا اور میں نے ان کی توقعات کے مطابق عمل کرنا شروع کر دیا تھا۔

"میں نے پوچھا تھا کہ آپ کے پاس کچھ سامان وغیرہ نہیں ہے؟" کلرک نے اپنے سوال کا ترجمہ کیا۔

"سامان...... ؟" میں نے اپنے اردگرد دیکھا گویا اس سے پہلے میں نے اس پہلو پر غور ہی نہیں کیا تھا کہ میرے پاس کچھ سامان بھی ہونا چاہیے تھا۔ "سامان فی الحال تو نہیں ہے جی...... لیکن یہ کون سا مسئلہ ہے...... سامان بھی آجائے گا۔"

میں نے لفٹ کی طرف سے ایک دراز قد سفید فام غیر ملکی کو کاؤنٹر کی طرف آتے دیکھا اور فیصلہ کیا کہ مجھے اپنے ڈرامے کو طول نہیں دینا چاہیے۔ کہیں خواہ مخواہ لوگوں کی توجہ میری طرف مبذول ہونے لگے۔ پہلے ہی ایک ویٹر ایک طرف دیوار کے سہارے کھڑا عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"آپ کب تک ٹھہریں گے؟" کلرک نے کارڈ کے اندراجات میں اس سوال کا جواب لکھا ہونے کے باوجود مجھ سے پوچھا۔ شاید دل ہی دل میں وہ دعاگو تھا کہ میرا قیام مختصر سے مختصر ہو۔ غیر ملکی اپنے کمرے کی چابی کلرک کو دے کر دروازے کی طرف بڑھ چکا تو میں نے کہا۔ "ہفتہ دس دن...... اس سے زیادہ بھی ہو سکتا ہے اور کم بھی...... " میں نے محسوس کیا کہ غیر ملکی نے بھی جاتے جاتے مڑ کر ایک نظر میری طرف دیکھا تھا۔

کلرک کچھ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "آپ کو کم از کم پچیس ہزار روپے ایڈوانس جمع کرانے ہوں گے۔"

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ فائیو اسٹار ہوٹلوں کی روایات سے انحراف کر رہا تھا اور ریلوے اسٹیشن یا لاری اڈے پر واقع ہوٹلوں کی طرح ایڈوانس مانگ رہا تھا حالانکہ فائیو اسٹار ہوٹلوں میں اپنے معزز گاہکوں پر اعتبار کرنے کا "رسک" لیا جاتا ہے۔ انہیں زیادہ تر مہمانوں کے ساتھ میزبانی کی اعلیٰ ترین روایات کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے لیکن کلرک یقیناً مجھے ذرا الگ ہی "کیس" سمجھ کر ڈیل کر رہا تھا۔

میں نے کوئی اعتراض نہ کیا اور جیب سے کچھ نوٹ نکال کر پچیس ہزار گن کر اس کے سامنے رکھ دیے۔ تب اس نے کچھ اطمینان کی سانس لی اور غالباً یقین کر لیا کہ میرا حلیہ خواہ کیسا ہی سہی لیکن میں کنگال نہیں ہوں۔

اس نے اشارے سے ویٹر کو بلایا اور چابی اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "صاحب کو اوپر پہنچاؤ۔"

ویٹر مجھے ادائیگی کرتے دیکھ چکا تھا۔ اس کے باوجود وہ نیم دلی سے میرے ساتھ روانہ ہوا۔ لفٹ میں بھی میں دیہاتیوں کی طرح حیران سا ہو کر ادھر ادھر دیکھتا رہا گویا پہلی بار لفٹ میں سوار ہوا تھا۔ حالانکہ میں مزید اداکاری کا ارادہ ترک کر چکا تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے ویٹر کو عجیب سی نظروں سے اپنی طرف دیکھتے پا کر کچھ لطف سا آ رہا تھا۔

پانچویں منزل پر مجھے لگژری سوئٹ میں پہنچا کر اس نے گویا میری آنے والی نسلوں پر احسان کرتے ہوئے مجھے سمجھانے کی کوشش کی کہ کسی چیز کو کس طرح استعمال کرنا ہو گا' فون پر روم سروس والوں سے کس طرح رابطہ کرنا ہو گا...... وغیرہ وغیرہ۔

میں آنکھیں پھیلائے' سر ہلاتے ہوئے گویا اس کی باتیں ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ رخصت ہونے لگا تو میں نے اسے نہایت مؤدبانہ انداز میں سو روپے ٹپ پیش کی تب اس کا رویہ خاصا بدل گیا۔ اس کی پیشانی سے شکنیں دور ہو گئیں اور اس کے لہجے میں جو ہلکی سی کاٹ تھی وہ معدوم ہو گئی۔ وہ کافی مؤدب نظر آنے لگا۔ پیسے میں واقعی بڑا جادو ہے۔

وہ رخصت ہو چکا تو میں نے چند سیکنڈ بعد دروازے کی میک آئی سے آنکھ لگا کر باہر دیکھا۔ میرا سوئٹ لفٹ کے قریب ہی تھا۔ ویٹر ابھی لفٹ کے انتظار میں کھڑا تھا۔ اسی اثنا میں دوسری طرف سے ایک اور ویٹر ٹرے ہاتھ پر اٹھائے آگیا۔ دونوں باتیں کرنے لگے۔ میرے کمرے سے نکلنے والا ویٹر نوجوان تھا' دوسرا ذرا بڑی عمر کا تھا۔ نوجوان ویٹر بار بار میرے ہی کمرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ میرے ہی بارے میں بات کر رہا تھا لیکن کمرا ساؤنڈ پروف ہونے کی وجہ سے آواز اندر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے بے آواز طریقے سے دروازہ نہایت ذرا سا کھول کر اس سے کان لگایا تو آوازیں سنائی دینے لگیں۔

نوجوان ویٹر کہہ رہا تھا۔ "...... اللہ کی شان ہے! کیسے کیسے لوگ فائیو اسٹار ہوٹلوں میں آنے لگے ہیں۔ بس اب میں تمہیں کیا بتاؤں کہ کیسا حلیہ تھا...... بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی گھسیارا کھیتوں میں کام کرتے کرتے یکدم منہ اٹھا کر ادھر بھاگ آیا ہو......"

پھر ذرا رازدارانہ انداز میں بولا۔ "لیکن یار! پیسے اس کے پاس ضرور ہیں۔ کھلے دل سے خرچ کر رہا ہے۔"

"کوئی نو دولتیا ہو گا۔" بڑی عمر کے ویٹر نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"لیکن نو دولتیے تو اپنا حلیہ وغیرہ اچھے سے اچھا بنا کر آنے کی کوشش کرتے ہیں۔" نوجوان ویٹر بولا۔ "یہ آدمی تو مٹی میں لتھڑا ہوا تھا...... کپڑے مڑے تڑے تھے...... سر پہ خاک پڑی ہوئی تھی...... شاید بے چارے کو منہ دھوئے بھی ہفتہ دس دن گزر چکے ہیں۔"

"تو پھر کہیں کوئی ڈاکو نہ ہو۔" بڑی عمر کا ویٹر دور کی کوڑی لایا۔

"لگتا تو نہیں ہے......" نوجوان ویٹر بولا۔ "لیکن بھئی آج کل

توکسی کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ خیر..... ڈاکو بھی ہو تو ہمیں کیا۔ ان معاملات کو ہوٹل والے جانیں۔ ہمیں تو ہماری ٹپ ملتی رہنی چاہیے۔ ہمارے لیے تو وہی اچھا آدمی ہے جو ہمیں ٹپ دے..... اور دل کھول کر دے۔"

اسی دوران لفٹ آگئی اور وہ دونوں اس میں گھس گئے۔ میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر واپس آیا اور بیڈ پر ڈھیر ہو گیا۔ میں ایک اچھا خاصا طویل عرصہ جنگلوں بیابانوں میں جس قسم کی صعوبتیں اٹھاتے گزار کر آیا تھا اس کے بعد فائیو اسٹار ہوٹل کے لگژری سوئٹ کی آرام دہ اور پرُتعیش چیزیں عجیب لگ رہی تھیں لیکن مجھے اس ماحول سے مانوس ہوتے بھی دیر نہ لگی اور چند لمحے بعد ہی میں سب کچھ بھول بھال کر گھوڑے بیچ کر سو گیا۔

دوسری صبح میں نے ڈٹ کر ناشتا کرنے کے بعد اپنی حالت ٹھیک کرنے کی مہم شروع کی۔ سب سے پہلے کلفٹن جا کر ایک فیشن ایبل شاپنگ سینٹر سے اپنے لیے کچھ ڈھنگ کے کپڑے خریدے پھر ہوٹل کی باربر شاپ میں شیو بنوائی، بال ترشوائے اور ایک نہایت طویل، پرُاہتمام غسل کے بعد نئے لباس میں آئینے کے سامنے کھڑا ہوا تو یوں محسوس ہوا جیسے میں نے ایک نیا جنم لیا ہو۔ مجھے کچھ یقین نہیں آرہا تھا کہ میں واقعی شہر واپس پہنچ گیا ہوں۔ میں اپنے لیے ایک سیاہ چشمہ اور خوبصورت سا فیلٹ ہیٹ بھی لے آیا تھا۔

میں نے اپنی شخصیت میں ان دونوں چیزوں کا اضافہ کر کے نئے سرے سے اپنا جائزہ لیا۔ بعض انگریزی فلموں میں ذرا بارعب قسم کے گروہ باز یا نائٹ کلبوں کے جوان مضبوط قسم کے مالک دکھائے جاتے ہیں، میں کچھ اسی قسم کی چیز دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے اس قسم کی ڈرامے بازی سے بدمزگی ہی محسوس ہوتی تھی لیکن فی الحال اس طرح کے چھوٹے موٹے سہارے لیے رکھنا بہتر تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہوٹل میں کوئی مجھے پہچانے۔ ہوٹل میں قیام کرنے والوں کو جس اسٹاف سے زیادہ تر واسطہ پڑتا ہے یا سامنا ہوتا رہتا ہے، وہ لوگ تو ویسے بھی مجھے نہیں پہچانتے تھے۔ میرے لیے بھی بیشتر شکلیں اجنبی ہی تھیں۔ خاص خاص عہدوں پر کام کرنے والے لوگ مجھے پہچانتے تھے۔ ان سے سامنا ہونے کا امکان کم ہی تھا۔ ہوٹل کے کارڈ میں، میں نے اپنا نام ایم۔ ایف خان درج کرایا تھا۔

دوبارہ باہر نکلنے سے پہلے میں نے ٹیلی فون پر رابطوں کی کوششیں شروع کیں۔ میں نے اپنے مقامی آفس فون کیا اور شفیع شاہ وغیرہ کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔ پتا چلا کہ وہ لاہور ہی میں تھے۔ ابھی تک واپس نہیں آئے تھے لیکن لاہور میں بھی ان کا کچھ پتا نہیں تھا۔ کسی کا ان سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔

کراچی آفس میں صرف چند ہی ساتھی "دی سرکل" میں شامل تھے۔ باقی، دفتر میں کام کرنے والے عام سے لوگ تھے۔ انہیں "دی سرکل" یا ہماری چند کاروباری مصروفیات کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ اس لئے میں نے انہیں مزید کریدنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی اپنا نام بتایا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ شہر میں کوئی بھی میری موجودگی سے آگاہ ہو۔ میرے لئے یہ اطلاع ذرا تشویشناک تھی کہ شفیع شاہ وغیرہ ابھی تک لاہور سے واپس نہیں آئے تھے اور نہ ہی وہاں ان کا کچھ پتا تھا۔

ہوٹل کے کمرے سے براہ راست لاہور فون بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے آپریٹر کے توسط سے لاہور کے چند نمبروں پر بات کرنے کی کوشش کی۔ یہ نمبر ٹونی، راحیلہ اور شبیر شیخ وغیرہ کے تھے۔ آپریٹر بے چارے نے اپنی سی بہت کوشش کی لیکن ہر نمبر پر ہر بار کوشش کے باوجود کامیابی نہ ہوئی اور وہ یہی جواب دیتا رہا۔ "نو رسپانس سر!"

میرے حواس میں کچھ ٹھنڈک سی آن بسی اور میں ریسیور رکھ کر چند لمحے کے لیے ساکت بیٹھا رہ گیا۔ میں فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھے لاہور جانا چاہیے یا نہیں؟ میں کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے اعصاب پر کچھ سستی سی چھا رہی تھی۔ جنگلوں اور دیہات میں مارا مارا پھرنے کے دوران میں شکار پر نکلے ہوئے درندے کی طرح چاق و چوبند اور مستعد رہا تھا لیکن شہر کی پرُتعیش رہائش نے مجھے فوراً ہی سُست کر دیا تھا۔

دوسرے ہی لمحے میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ یہ تعیشات، یہ طرزِ زندگی میرے لیے نیا تو نہیں تھا۔ میں تو برسوں سے ان کا عادی تھا اور میں نے کبھی اپنے آپ کو اس طرح سُست محسوس نہیں کیا تھا۔ کہیں یہ ساتھیوں سے رابطہ نہ ہو سکنے کا اثر تو نہیں تھا؟ شاید یہ میرے لیے ایک ایسی بری خبر تھی جس کی میں توقع نہیں کر رہا تھا لیکن اس سے پہلے تو میں نے ہمیشہ یہی محسوس کیا تھا کہ میں بحران کا آدمی تھا یعنی بحران کے دوران میں زیادہ مستعد رہتا تھا اور میری صلاحیتیں زیادہ ابھر کر سامنے آتی تھیں۔ میں اپنے آپ کو زیادہ پرُ اعتماد محسوس کرتا تھا لیکن اس وقت نہ جانے کیوں بدخبری کے آثار محسوس کرتے ہی میرے اعصاب پر تھکن سی سوار ہو گئی تھی۔

میں نے روم سروس کو فون پر بلیک کافی کا آرڈر دیا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ہمارے کچھ غیر کاروباری سے ٹھکانے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ بذات خود ان ٹھکانوں پر جا کر اپنے ساتھیوں کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں۔ میری اسی اُدھیڑ بُن کے دوران ویٹر کافی لے کر آگیا۔ یہ وہ ویٹر نہیں تھا جو گزشتہ رات مجھے کمرے میں چھوڑ گیا تھا لیکن یہ بھی صبح مجھے برے حال میں دیکھ چکا تھا اس لیے اس وقت دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا بلکہ پہلے تو وہ مجھے اس سوئٹ میں ٹھہرے ہوئے شخص کا کوئی ملاقاتی سمجھا۔

مجھے پہچان لینے کے بعد اس نے صرف خوشگوار سی حیرت کا اظہار کیا، کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اپنے انداز و اطوار کی وجہ سے میں ویٹروں کی نظر میں آرہا تھا۔ مجھے اس حد تک بھی کسی کی نظر میں آنے سے بچنا چاہیے

تھا۔

گرم گرم کافی حلق سے اُتری تو ذہن کی بے بستگی کچھ کم ہوئی۔ میں کسی فیصلے پر تو نہ پہنچ سکا لیکن اپنے سوئٹ سے ضرور نکل کھڑا ہوا۔ مجھے کمرے میں بیٹھے بیٹھے کچھ وحشت سی ہونے لگی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے ان خنک ہواؤں اور بند کمروں سے نکل کر سوچ بچار کرنا چاہیے۔

میں سوئٹ سے نکل کر لفٹ کے انتظار میں کھڑا تھا کہ ایک کونے سے داؤد چوہدری برآمد ہوا۔ وہ میرے ہوٹل کا سیکیورٹی انچارج تھا۔ اس وقت وہ غالباً غیر محسوس سے انداز میں گشت پر تھا۔ میں نے جلدی سے منہ پھیرنے کی کوشش کی لیکن اس نے مجھے پہلی نظر میں ہی پہچان لیا۔ وہ مجھے بہت اچھی طرح پہچانتا تھا۔

"سر! آپ یہاں....؟" وہ تیزی سے میری طرف لپکا۔

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور جب وہ قریب آگیا تو نہایت نیچی آواز میں کہا۔ "مجھے اصل نام سے مخاطب کرنے اور زیادہ مؤدب نظر آنے کی ضرورت نہیں۔ محض رسمی سا ملاقاتی نظر آنے کی کوشش کرو۔ مجھے صرف خان صاحب کے نام سے مخاطب کر سکتے ہو۔"

"کیوں سر.... ؟ خیریت تو ہے؟" وہ ذرا چونکا پھر اس نے غیر ارادی طور پر یوں ادھر ادھر دیکھا جیسے اسے توقع ہو کہ ہمارا کوئی دشمن آس پاس ہی کھڑا ہوگا۔

"ہاں.... بہ ظاہر خیریت ہی ہے...... لیکن شاید کچھ اتنی خیریت بھی نہیں ہے۔" میں نے مبہم لہجے میں کہا۔ "میں یہاں ایک عام مہمان کی حیثیت سے ٹھہرا ہوا ہوں۔"

"سر.... اپنے ہی ہوٹل میں....." وہ ہکلایا۔

میں نے سخت نظروں سے اسے گھورا۔ "میں نے تمہیں احتیاط برتنے کی ہدایت کی تھی لیکن تم اس ہدایت پر بالکل عمل نہیں کر رہے۔"

"آئی ایم سوری سر!" اس نے جلدی سے اپنے تاثرات بدلنے کی کوشش کی۔

"میں نے "سر" وغیرہ سے بھی پرہیز کرنے کے لیے کہا ہے۔" میں نے یاد دلایا۔

"جی.... جی.... خان صاحب" وہ ہکلایا۔ "پھر بھی..... آپ کچھ تو بتائیں..... کیا چکر ہے؟ میرے لائق کوئی خدمت؟" اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر اپنے ماؤزر کے دستے پر تھا۔

"نہیں.... خدمت وغیرہ تو کچھ نہیں ہے۔ بس تم یہاں میری موجودگی کو راز رکھنے کی کوشش کرنا۔ جوش میں آکر اسٹاف کو مت بتا دینا کہ چوہدری صاحب یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔" میں نے ہدایت کی۔

عین اسی لمحے لفٹ ہمارے سامنے آکر رکی۔ کسی طلسمی دروازے کی طرح خاموشی سے دونوں پٹ ایک دوسرے سے جدا ہوئے اور ایک تنہا لڑکی اس چوکور قفس میں کھڑی دکھائی دی۔ وہ ایک دبلی پتلی، لمبی سی سفید فام لڑکی تھی۔ مغربی لڑکیاں فاقے اور ورزشیں کر کے اپنے آپ کو دبلے پن کی اس سطح پر لے جاتی ہیں جہاں سے بدنمائی کی سرحد شروع ہوتی ہے۔

وہ لڑکی ابھی اس سطح پر نہیں پہنچی تھی۔ اسے خوبصورت بھی کہا جا سکتا تھا۔ وہ کسی نفیس مگر موٹے سے نیوی بلیو کپڑے کے لمبے سے اسکرٹ میں تھی جو اس پر نہ جانے کیوں بہت جچ رہا تھا۔ اس کے بال عجیب رنگ کے تھے۔ چاندی اور سونے کا ملا جلا سا رنگ تھا اور اس میں چمک آئینے جیسی تھی۔ ہونٹ بھرے بھرے اور رخساروں کی ہڈیاں کچھ زیادہ ہی ابھری ہوئی تھیں۔

سب سے عجیب اس کی آنکھیں تھیں۔ پہلی نظر میں تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی آنکھوں کا کوئی رنگ ہی نہیں تھا' بس شیشے کی دو شفاف مصنوعی آنکھیں اس کے چہرے پر جڑی تھیں لیکن ذرا توجہ سے دیکھنے پر پتا چلتا تھا کہ اس کی آنکھیں نہایت ہلکے اور شفاف نیلے رنگ کی تھیں۔ آسیبی اور خوفناک قسم کی انگریزی فلموں میں بعض کرداروں کو ڈراؤنا بنانے کے لیے ان کی آنکھیں کچھ اسی قسم کے رنگ کی دکھائی جاتی ہیں یا اچانک ان کی آنکھوں کا رنگ تبدیل ہوتے دکھایا جاتا ہے۔

تاہم اس لڑکی کی شخصیت کا تاثر آسیبی یا ایسا خطرناک نہیں تھا۔ اس میں بہرحال ایک خوش شکل لڑکی والی کشش موجود تھی اور وہ لفٹ کی عقبی دیوار سے چپکی بالکل سیدھی کھڑی تھی۔ لفٹ کا دروازہ کھلتے ہی میں نے اسے ایک ٹک اپنی طرف دیکھتے پایا۔ وہ لمحہ گویا بہت طویل ہوگیا۔ لڑکی پلک جھپکائے بغیر لفٹ سے باہر آئی اور چند قدم چل کر راہداری میں دائیں طرف مڑ گئی۔

"یہ لڑکی کون تھی؟" میں نے داؤد چوہدری سے پوچھا۔

"معلوم نہیں سر......! ہوٹل کی کوئی گیسٹ ہوگی......" وہ ذرا گڑبڑا کر بولا۔ "معلومات کروں اس کے بارے میں؟"

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے اسے خدا حافظ کہا اور لفٹ کے ذریعے نیچے آگیا۔ میں کچھ دیر ہوٹل کے آس پاس ہی فٹ پاتھ پر ٹہلتا رہا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ریڈ ڈاٹ کے مقابلے میں میرے ساتھیوں کی جدوجہد کس مرحلے میں تھی اور وہ خود کہاں تھے لیکن مجھے یہ اندیشہ ضرور تھا کہ شاید ریڈ ڈاٹ اب بھی کراچی اور لاہور میں ان تمام ٹھکانوں کی نگرانی کر رہی ہو جن سے میرا تعلق تھا۔ نگرانی کرنے کا بھی ان کا اپنا ہی انداز تھا۔ عجیب و غریب اور ناقابل یقین سے وسائل ان کے پاس موجود تھے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کہاں سے کوئی غیبی آنکھ مجھے دیکھ رہی ہو۔ میں ذرا یہی جائزہ لینے کے لیے ہوٹل سے نکلا تھا کہ گردوپیش کے بارے میں میرے محسوسات کیا کہتے ہیں۔

میں ٹہلتا ہوا خاصی دور تک چلا گیا اور چند منٹ بعد لوٹ آیا۔ مجھے کسی گڑبڑ کا احساس نہیں ہوا۔ میری حسیات میں کوئی ہلچل

برپا نہیں ہوئی تاہم ذہن کے کسی تاریک گوشے میں اضطراب کی کوئی نہایت خفیف سی لہر کروٹیں لے رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ ماحول کی اچانک تبدیلی تھی۔ میں اندرون ملک کے جن دور اُفتادہ گوشوں میں وقت گزار کر آرہا تھا وہاں کم اَز کم ریڈ ڈاٹ کی حد تک مجھے خطرے کا احساس نہیں رہا تھا۔ وہاں خطرات کی نوعیت بدل گئی تھی۔ وہاں مجھے جن خطرات کا سامنا کرنا پڑا تھا وہ مجھے زیادہ اہم محسوس نہیں ہوئے تھے لیکن ریڈ ڈاٹ کی بات کچھ اور تھی۔

کچھ دیر بعد میں ہوٹل واپس آگیا۔ گو کہ مجھے کسی گڑبڑ کا کوئی واضح احساس نہیں ہوا تھا' اس کے باوجود میں نے اپنے دو ایک خاص ٹھکانوں پر جانے کا ارادہ ملتوی کردیا۔ میں ہوٹل کے کافی بار میں جا بیٹھا۔ کافی میں پی چکا تھا۔ اب طبیعت میں سستی اور اضمحلال نہیں تھا۔ وقت گزاری کے لیے میں نے جوس کا آرڈر دیا اور تازہ اخبار کی اوٹ سے غیر محسوس طور پر اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔

اچانک اخبار کے اوپر سے میری نظر انہی شفاف آنکھوں پر پڑی۔ آسیبی سی آنکھوں والی وہ لڑکی ایک ٹک میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے یاد پڑتا تھا کہ ایک لمحہ پہلے وہ اس کرسی پر موجود نہیں تھی اور چند منٹ پہلے میں نے اسے پانچویں منزل پر جاتے دیکھا تھا۔ لیکن خیر..... یہ کوئی ایسی حیرت کی بات نہیں تھی۔ عین ممکن تھا' وہ ابھی آکر بیٹھی ہو۔

میرا اس سے سامنا چند لمحوں کے لیے ہوا تھا لیکن میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ شاید پلکیں بہت کم جھپکتی تھی۔ اب اس کی تصدیق کے لیے میں نے بھی ایک ٹک اس کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ میرے اس طرح دیکھنے پر عام طور پر مرد بھی نظر چُرا لیتے تھے لیکن اس نے نظر چُرانا تو درکنار' پلک تک نہیں جھپکی۔ اس کا انداز کچھ غیر فطری سا تھا۔ میری رگ و پے میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔ انتہائی بری شہرت رکھنے والے کسی خطرناک اور بدشکل بدمعاش کو دیکھ کر بھی میرے جسم میں کبھی اس طرح سرد لہر نہیں دوڑی تھی۔ وہ تو ایک اچھی خاصی خوبصورت لڑکی تھی لیکن لگتا یہی تھا کہ اس میں واقعی کوئی آسیبی سی خصوصیت موجود تھی۔ اچانک اس کے سامنے ایک ویٹر آگیا۔ تب میں نے اس کی طرف سے نظر ہٹا لینا ہی بہتر سمجھا اور اخبار کی اوٹ میں پناہ لے لی۔

اس قسم کے ہوٹلوں میں جس طبقے کی نشست و برخاست ہوتی ہے اس میں کسی لڑکی سے تعارف حاصل کرنا کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہوتا۔ مغربی تہذیب نے ہمارے ہاں بھی بہت سے خوبصورت اور مفید تکلفات یا حجابات ختم کردیے ہیں۔ دولت کی فراوانی نے ہمیں بہت سی رسوم اور حدود و قیود سے بے نیاز کردیا ہے۔ پھر وہ لڑکی تو ویسے ہی سفید فام تھی۔ اس کی تہذیب و معاشرت میں تو کوئی رکاوٹ ہی نہیں تھی۔ کوئی بھی اس کی میز پر جاکر اپنا تعارف کرا سکتا تھا اور اس کے تعارف کی فرمائش کرسکتا تھا۔ میں ایسا شرمیلا بھی نہیں تھا کہ مجھے اس سلسلے میں کوئی ہچکچاہٹ ہوتی۔ اس کے باوجود میں اٹھ کر اس کی میز پر نہیں جاسکا۔ حالانکہ میرا دل چاہ رہا تھا' مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم ہوجائے۔

چند لمحے بعد دوسرا ویٹر میرے لیے جوس لے کر آیا۔ میں نے اخبار چہرے کے سامنے سے ہٹایا تو وہ لڑکی اس نشست سے غائب تھی۔ میں نے نہایت آہستگی سے' غیر محسوس سے انداز میں سر گھماتے ہوئے پورے کافی بار کا جائزہ لیا۔ وہ مجھے کہیں دکھائی نہ دی اور نہ ہی لاؤنج وغیرہ کی طرف جاتی نظر آئی۔ میرے دل میں بے عنوان سی خلش اور اضطراب کچھ بڑھ گیا۔ تاہم بظاہر میں سکون سے بیٹھا جوس کی چسکیاں لیتا رہا۔

وہ دن میں نے جوں توں ہوٹل میں گزارا۔ وہ لڑکی مجھے کافی بار میں نظر آنے کے بعد کہیں نظر نہیں آئی اور نہ ہی کوئی خاص واقعہ پیش آیا۔ رات کو میں سونے کے لیے لیٹا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں اس لڑکی کو خواب میں دیکھوں گا۔

میں نے خواب میں دیکھا کہ وہ نوکیلی ایڑی والے سینڈل پہنے میرے سینے پر کھڑی تھی اور اس کا وزن شاید کسی پہاڑ کے برابر تھا۔ وہ گویا گوشت پوست کی لڑکی نہیں' کسی انتہائی وزنی دھات سے بنا ہوا کوئی ٹھوس مجسمہ تھا۔ میری سانس سینے میں رُکی جارہی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ اس کے سینڈلوں کی نوکیلی ایڑیاں میرے سینے میں کیوں نہیں اُتر گئی تھیں!

وہ سر ذرا جھکائے میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی اور مجھے یوں لگ رہا تھا' گویا وہ ہزاروں فٹ کی بلندی سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ اس کے باوجود اس کی شکل نہ جانے کیوں بہت خوفناک لگ رہی تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے چہرے کی طرف پھیلائے ہوئے تھے۔ مخروطی انگلیوں والے یہ ہاتھ اس وقت نہ جانے کیوں عقاب کے پنجوں کی طرح بدصورت دکھائی دے رہے تھے اور ناخنوں کے سروں سے دودھیا دُھواں بل کھاتا فضا میں بلند ہورہا تھا۔

اچانک لڑکی نے کرخت اور ڈراؤنی آواز میں ایک طویل قہقہہ لگایا جس سے مجھے اپنے کانوں کے پردے پھٹتے محسوس ہوئے۔ بالکل کسی ہارر فلم کا سا منظر تھا۔ اس قہقہے کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی۔ خواب میں بھی انسان کو یہ احساس تو نہیں ہوتا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے۔ مجھے بھی یہ احساس نہیں تھا لیکن آنکھ کھلنے کے بعد بھی میرا یہ احساس برقرار رہا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن سینے پر وہی لڑکی نظر آتی رہی جس کا وزن پہاڑ کے برابر محسوس ہورہا تھا۔ گویا خواب کا تسلسل ابھی قائم تھا۔

میں نے اپنی تمام تر توانائی مجتمع کرکے ہلنے کی کوشش کی۔ جونہی میں ذرا سا ہلنے میں کامیاب ہوا' خواب کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ لڑکی یک دم غائب ہوگئی اور میں ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ میں نے ملگجے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر اُدھر دیکھا۔ کمرے

میں میرے سوا کوئی نہیں تھا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے ایک عجیب سی بُو کا احساس ہوا۔ مجھے فوراً ہی اندازہ ہوگیا کہ کمرے میں کوئی گیس بھر رہی تھی اور اسی کی وجہ سے میرے حواس پر دُھندلاہٹ سی چھانے لگی تھی۔ اس اعتبار سے وہ ڈراؤنا خواب میرے حق میں بہت اچھا ثابت ہوا تھا کہ اس کی وجہ سے میں اٹھ کر بیٹھ گیا تھا ورنہ شاید میں سوتا ہی رہ جاتا اور میری عارضی نیند ابدی نیند میں تبدیل ہوجاتی۔

میں نے فوراً سانس روک لی۔ میں اسی روز بازار سے چھوٹا سا ایک نیا سفری بیگ لایا تھا۔ میں نے اسے بھی وہیں چھوڑ دیا۔ اپنی بچی ہوئی رقم البتہ اندرونی جیب میں ڈال لی۔ میں شب خوابی کا کوئی لباس اپنی شاپنگ کے دوران خرید کر نہیں لایا تھا اور خطرے کے لاشعوری سے احساس کے تحت پینٹ شرٹ میں ہی سویا تھا۔

سانس روکنے کے بارے میں مجھے کوئی تشویش نہیں تھی۔ یوگا کی مشقیں میرے بہت کام آتی تھیں۔ میں بہت دیر تک سانس روک سکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ مجھے دوبارہ اس کمرے میں آنے کا موقع نہ ملتا اس لیے میں ذرا اطمینان سے اس پر الوداعی نظر ڈال کر دروازے کی طرف بڑھا۔ اس وقت میرے ذہن پر نیند کا خمار اور گیس کے اثرات کافی حد تک کم ہوچکے تھے۔ میں اپنے آپ کو چوکنا محسوس کر رہا تھا۔

جب دروازے پر پہنچ کر میں نے ناب گھما کر دروازہ کھولنا چاہا تو میرا اطمینان رخصت ہوگیا۔ ناب بالکل جام تھی اور ذرا بھی نہیں گھوم رہی تھی۔ دروازہ نیچے سے تقریباً ائرٹائٹ تھا۔ شاید چابی کے سوراخ کے ذریعے ہی کمرے میں گیس بھری گئی تھی اور پھر اس میں کوئی خاص سیال انڈیل کر اسے جام کردیا گیا تھا۔ گویا میرے لیے ایک کشادہ، آراستہ و پیراستہ، آرام دہ قبر تیار کردی گئی تھی۔ اٹیچڈ باتھ اور وال ٹو وال کارپٹ والی قبر۔

اس قسم کی کسی کوشش کا مطلب یہی تھا کہ ریڈ ڈاٹ ابھی تک کراچی میں بھی میری تلاش کے سلسلے میں سرگرم تھی اور یہاں پہنچتے ہی مجھے ان کی نظر میں آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ لاہور میں شاید صورت حال اس سے زیادہ خراب ہو۔ میرے لیے یہی تشویش کچھ کم نہیں تھی کہ ریڈ ڈاٹ کا مسئلہ ابھی جوں کا توں برقرار تھا لیکن فی الحال کمرے سے نکلنے کا مسئلہ اس سے بھی زیادہ تشویش ناک تھا۔

میں نے کافی پیچھے ہٹ کر دوڑ کر دروازے پر کندھے سے ٹکر رسید کی۔ ہلکی سی دھمک کے ساتھ کمرے کی دیوار تک لرز گئی لیکن دروازہ جوں کا توں قائم رہا۔ دروازہ ٹھوس اور مضبوط تھا لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ وہ اندر کی طرف کھلتا تھا۔ اگر میں اس پر باہر سے ٹکر رسید کرتا تو صرف تالا ہی رکاوٹ ہوتا لیکن اب تالے کے ساتھ ساتھ پوری چوکھٹ بھی رکاوٹ تھی کیونکہ باہر کی طرف دروازہ اس میں پھنستا تھا۔

دوسری ٹکر کے بعد ہی میں نے محسوس کرلیا کہ یہ صرف اپنے آپ کو تھکانے والی بات تھی اور اس کوشش میں میرے لیے سانس روکنا بہت مشکل ہوا جارہا تھا۔ میں نے فون پر کسی سے رابطہ کرکے مدد حاصل کرنا چاہی لیکن فون ڈیڈ پڑا تھا۔ یہ میرے لیے مزید حیرت کی بات تھی کیونکہ ہوٹل کے کمروں میں استعمال ہونے والی فون کی تاریں باہر تو نظر نہیں آتیں جنہیں کاٹ دیا جائے۔

اب میرے جسم سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ پھوٹ پڑا۔ مجھے موت سے خوف نہیں آتا تھا۔ بے بسی میرے لیے موت سے زیادہ خوفناک تھی۔ میں نے کسی کارآمد چیز کی تلاش میں کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ میرے مطلب کی کوئی چیز کہیں نظر نہ آئی۔ میں ابھی تک اپنی سانس روکنے میں کامیاب تھا لیکن مشق آخر کب تک میرا ساتھ دے سکتی تھی۔

میں نے ایک موہوم سی امید کے سہارے باتھ روم کا دروازہ کھول کر وحشت زدہ انداز میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک کیبنٹ کے اوپر سے مجھے ایک نوکیلی سی چیز جھانکتی نظر آئی۔ میں نے جلدی سے اوپر ہاتھ مارا اور وہ چیز میرے ہاتھ میں آگئی۔ اگر میں نے سانس نہ روک رکھی ہوتی تو شاید اس وقت میں اطمینان کی گہری سانس لیے بغیر نہ رہ سکتا۔ وہ چیز گویا کسی دستِ غیبی نے خاص طور پر میری مدد کے لیے وہاں رکھی تھی۔

بظاہر وہ ایک حقیر سی چیز تھی۔ عام حالات میں ہمیں اس کی اہمیت کا قطعاً اندازہ نہیں ہوسکتا۔ اس کے بارے میں کسی کے محسوسات کم از کم ویسے نہیں ہوسکتے جیسے اس وقت میرے تھے۔

وہ ذرا بڑے سائز کا ایک پرانا سا اسکریو ڈرائیور تھا جس کا دستہ تھوڑا سا ٹوٹا ہوا تھا۔ باتھ روم کی فینسی لائٹس بالکل نئی نظر آرہی تھیں۔ شاید حال ہی میں تبدیل کی گئی تھیں اور کوئی الیکٹریشن وہ اسکریو ڈرائیور وہاں بھول گیا تھا یا بے کار سمجھ کر جان بوجھ کر چھوڑ گیا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہاں اس کی موجودگی کا پس منظر کچھ اور رہا ہو۔ بہرحال مجھے اس سے غرض نہیں تھی۔ میرے لیے تو اس کا میسر آجانا ہی کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔

میں لپک کر دروازے تک پہنچا۔ باہر کی طرف سے تالے کی ساخت میں مضبوطی کا زیادہ بندوبست کیا گیا ہوگا لیکن اندر کی طرف فولاد کی صرف ایک پلیٹ تھی۔ اس کے چاروں اسکریو کھولنے میں مجھے کچھ دقت پیش آئی لیکن پھر بھی شاید میں نے انہیں کم سے کم وقت میں کھولنے کا ایک ریکارڈ قائم کیا۔

اس کے نیچے لکڑی کا ایک مختصر سا ٹکڑا تھا جو تالے کی "زبان" یا لیچ (LATCH) کو روکے ہوئے تھا۔ میں نے اسکریو ڈرائیور ہی کے ذریعے اسے توڑ ڈالا۔ اسکریو ڈرائیور اس میں پھنسا کر ایک جھٹکا دینا ہی کافی ثابت ہوا۔ "کررڑ" کی ہلکی سی آواز کے ساتھ مسئلہ حل ہوگیا۔

اب میں دروازہ کھول سکتا تھا لیکن میں نے اسے کھولنے میں

عجلت نہیں کی۔ میں ابھی کچھ دیر اور سانس روک سکتا تھا۔ میں نے اتنی دیر مزید انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں چاہتا تھا کہ باہر کوئی موجود ہو تو اسے یہ تاثر ملے کہ بالآخر میری جدوجہد دم توڑ چکی تھی اور گیس مجھ پر اثر کر چکی تھی۔ میں یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ اس دوران کوئی کمرے میں داخل ہونے کی کوشش تو نہیں کرتا۔

میں دروازے کے عقب میں مزید دو ڈھائی منٹ دیوار سے چپکا کھڑا رہا لیکن کسی نے کمرے میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی باہر کوئی آواز سنائی دی۔ سکوت کے وہ لمحے اعصاب شکن تھے۔

آخر کار میں نے نہایت آہستگی سے دروازہ صرف اتنا کھولا کہ ناک باہر نکال سکوں۔ میرے پھیپھڑوں میں اب سانس کو مزید روکنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ میں نے نہایت آہستگی سے اپنے پھیپھڑوں میں مقید ہوا یا کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کی۔ اس وقت آہستگی سے اس ہوا کو خارج کرنا بھی ایک صبر آزما کام تھا۔ پھیپھڑے گویا پھٹ پڑنے کو تھے لیکن میں نے اپنی سانس کی آمد و رفت کی آواز پیدا نہ ہونے دی۔

جب تک میری ناک دروازے اور چوکھٹ کے درمیان رہی تب تک خیریت رہی، جونہی میں نے گردن باہر نکالی "شک" کی ایک ہلکی سی آواز سنائی دی۔ میں کچھ دیکھنے سے پہلے ہی اضطراری طور پر گردن نیچے کر چکا تھا۔ یہ حرکت میرے کام آگئی۔ کوئی چیز میرے بالوں کو چھوتی ہوئی گزری لیکن وہ گولی یقیناً نہیں تھی اور نہ ہی "شک" کی وہ آواز سائلنسر والے کسی پستل وغیرہ کی تھی۔

میں نے چھوٹے چاقو کے پھل جیسی کسی چیز کی جھلک دیکھی جو دروازے کی چوکھٹ میں پیوست ہو چکی تھی لیکن میں صحیح طور پر نہیں دیکھ سکا کہ وہ کیا چیز تھی کیونکہ اس وقت میں کمرے سے نکل چکا تھا۔ میں دیکھ چکا تھا کہ دروازے کے دائیں بائیں دونوں طرف دو افراد دیوار سے چپکے ہوئے تھے۔ اگر میں ان سے بچ کر لفٹ کی طرف بھاگنے کی کوشش کرتا تو ان دونوں کے پاس جو بھی ہتھیار موجود تھے، وہ انہیں استعمال کر سکتے تھے۔ ان سے الجھنے میں بھی جان کا خطرہ تھا لیکن اس طرح بھاگنے میں زیادہ خطرہ تھا۔ اس لیے دروازے سے نکلتے ہی میں لفٹ کی طرف بھاگنے کے بجائے دائیں طرف والے شخص کی طرف لپکا۔

میں اس وقت اتنی تیزی میں تھا کہ چیزیں مجھے بالکل اسی طرح دکھائی دے رہی تھیں جیسے چلتی ٹرین سے دکھائی دیتی ہیں۔ مجھے وہ شخص سیاہ پوش دکھائی دیا تھا۔ بعد میں اندازہ ہوا کہ وہ گہرے رنگ کے سوٹ میں تھا اور.... سیاہ فام تھا۔ اس کے ہاتھ میں ذرا بڑے پستل سے مشابہ کوئی چیز تھی جس کی نال عام پستل سے کہیں زیادہ موٹی تھی۔ اس نے یقیناً اسی چیز سے مجھ پر فائر کیا تھا اور اس سے جو کچھ بھی نکلا تھا وہ یقیناً میری کھوپڑی سے اسی طرح گزر جاتا جیسے مکھن سے بلیڈ.... کیونکہ میں نے اسے لکڑی کی چوکھٹ میں اسی طرح پیوست ہو کر غائب ہوتے دیکھا تھا۔ اس ہتھیار کی ایک بڑی خوبی تو یہی تھی کہ اس سے ہلکی سی "شک" کے علاوہ کوئی آواز پیدا نہیں ہوئی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ دوسرا فائر کرپاتا، میری ٹھوکر اس کے ہاتھ پر پڑی۔ وہ چیز اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کہیں جا گری۔ میں چونکہ اس کے بالکل پاس پہنچ چکا تھا اس لیے دوسرا شخص فائر کرنے سے باز رہا۔ ویسے مجھے اس وقت تک صحیح طور پر معلوم بھی نہیں تھا کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ موجود تھا یا نہیں۔

سیاہ فام نے پستل نما چیز ہاتھ سے نکل جانے کے فوراً بعد ایک طرف کو ہٹتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے اس کا موقع نہیں دیا۔ میں نے اس کی گردن پر کراٹے کا ہاتھ رسید کیا اور فوراً ہی اس کی اوٹ میں ہونے کی کوشش کی تاکہ اس کے ساتھی کے حملے کے سامنے اسے ہی ڈھال بنا سکوں لیکن جونہی میں اسے اپنے سامنے لاتے ہوئے تیزی سے گھوما تو میں حیرت سے گرتے گرتے بچا۔ اس کا دوسرا ساتھی غائب ہو چکا تھا۔

اس کا غائب ہونا اس کی موجودگی سے زیادہ خطرناک محسوس ہوا۔ میں نے سیاہ فام کا سر دیوار سے ٹکرا دیا۔ کچھ اسی قسم کی آواز پیدا ہوئی جیسے میں نے لوہے کا گولا دیوار سے ٹکرا دیا ہو۔ نہ جانے وہ کس کے کمرے کی دیوار تھی۔ اس سے پہلے میں اپنے کمرے میں دو مرتبہ کندھے سے دروازے پر ٹکر رسید کر چکا تھا، اس سے بھی اچھی خاصی دھمک پیدا ہوئی تھی۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ کوئی کسی کمرے کا دروازہ کھول کر نہ جھانکنے لگے اور خوفزدہ ہو کر چیخنے نہ لگے۔ اس طرح مدد میسر آنے کے بجائے میرے حق میں صورتِ حال خراب ہو سکتی تھی۔

سیاہ فام قالین پر ڈھیر ہو گیا اور میں نے لفٹ کی طرف چھلانگ لگائی۔ وہ لمحاتی سا سکوت مجھے بتا رہا تھا کہ کچھ ہونے والا تھا۔ مجھے جلد از جلد وہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔ خوش قسمتی سے لفٹ اسی فلور پر موجود تھی اور اس میں کوئی نہیں تھا۔ وہ ایک تیز رفتار لفٹ تھی لیکن اس وقت مجھے اس کی رفتار بہت کم محسوس ہوئی۔ تاہم میں خیریت سے نیچے پہنچ گیا۔

لاؤنج میں کوئی نہیں تھا۔ ریسپشن پر ایک کلرک سست انداز میں بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے سنبھلنے کی کوشش کی۔ شاید وہ سمجھا کہ میں اس کی طرف آرہا ہوں لیکن میں بیرونی دروازے کی طرف نکلتا چلا گیا۔ میرے اعصاب تاروں کی طرح تنے ہوئے تھے۔ ہر قدم پر مجھے دھڑکا سا محسوس ہو رہا تھا کہ کسی کونے کھدرے سے کوئی عجیب سی چیز میرے لیے موت کا پیامبر بن کر نہ نکل آئے۔

دربان نے میرے لیے دروازہ کھولتے ہوئے قدرے تجسس سے میری طرف دیکھا۔ وہ رات کا پچھلا پہر تھا۔ تاہم مجھے جاتے

دیکھ کر اس کے چہرے پر کچھ زیادہ حیرت نہیں تھی۔ ہوٹلوں میں تو دن رات لوگوں کا آنا جانا لگا ہی رہتا ہے لیکن ان آنے جانے والوں کے طور طریقے اور انداز ذرا مختلف ہوتا ہے۔ میرا رخصت ہونے کا انداز کچھ اور تھا۔

میں صحیح سلامت ہوٹل سے باہر بھی آگیا۔ شاید میرا تعاقب کرنے والے ابھی نیچے نہیں پہنچ سکے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ابھی مجھے اوپر ہی تلاش کیا جارہا ہو۔ شاید انہیں توقع نہ رہی ہو کہ میں اتنی جلدی ہوٹل چھوڑ بھاگوں گا۔ بہر حال میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہونے کے لیے تیار نہیں تھا کہ مجھے تلاش نہیں کیا جارہا ہوگا۔

ہوٹل کی حدود سے باہر سڑک کے کنارے ایک ٹیکسی کھڑی تھی مگر اس کا ڈرائیور سیٹ پر اس طرح لیٹا ہوا تھا کہ اس کی ٹانگیں کھڑکی سے نکلی ہوئی تھیں۔ سڑک پر ٹریفک برائے نام تھا۔ بعض سڑکوں سے ٹرکوں کو صرف رات میں گزرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ شاید اس لیے اِکّادُکّا ٹرک ہی گزرتے دکھائی دے رہے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ اگر میں ڈرائیور کو جھنجوڑ کر جگاؤں گا تو اس کے حواس صحیح طور پر بیدار ہونے اور اسے یہ سمجھنے میں کئی لمحے لگیں گے کہ میں مسافر تھا اور کہیں جانا چاہتا تھا۔ اس کے بعد بھی ممکن تھا کہ وہ غنودگی زدہ ذہن کے ساتھ ہی گاڑی چلاتا۔ چنانچہ میں نے اس چکر میں پڑنے کا تکلف ہی نہیں کیا۔ میں نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور دوسرے ہاتھ سے اس کا گریبان پکڑ کر اسے سیٹ سے ذرا اوپر اٹھاتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

مجھے امید تھی کہ چابیاں اس کی قمیص کی سامنے والی جیب میں ہوں گی۔ میں نے اس جیب میں ہاتھ مارا۔ میرا اندازہ درست ہی تھا۔ چابیاں فوراً ہی میرے ہاتھ میں آگئیں۔ میں نے خود ہی ٹیکسی اسٹارٹ کی اور اس طرح آگے بڑھائی کہ کار چیزنگ کے فلمی منظر کی طرح اس کے ٹائر بری طرح چرچرا اٹھے۔

جس وقت تک ڈرائیور پوری طرح ہوش میں آکر سیدھا ہو کر بیٹھا' اس وقت تک ہم ہوٹل سے کافی دور نکل آئے تھے۔ میری نظر عقب نما آئینے پر تھی۔ جب میں موڑ مُڑ رہا تھا تو مجھے عقب نما آئینے میں ایک گاڑی کی ہیڈلائٹس کی نہایت تیز چمک دکھائی دی۔ وہ گاڑی ہوٹل کے پارکنگ لاٹ سے نکل کر سڑک پر مُڑ رہی تھی۔ اسی دوران میں نے موڑ عبور کرلیا۔ میں اس کی صرف ایک جھلک ہی دیکھ پایا۔

اس دوران ڈرائیور سنبھل چکا تھا۔ وہ قدرے خوفزدہ لہجے میں بولا۔ "صاب! تم کو گاڑی چاہیے تو لے جاؤ..... مگر ہم کو تو ادھر چھوڑ دو۔"

اسے اتنا خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اس پوزیشن میں تھا کہ چاہتا تو کسی ہتھیار وغیرہ کا سہارا لیتے ہوئے مجھے دھمکانے کی کوشش کرسکتا تھا۔ لیکن شاید وہ اچانک افتاد سے خوفزدہ ہوگیا تھا۔

میں نے گاڑی کی رفتار کچھ اور بڑھاتے ہوئے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ "آرام سے بیٹھے رہو۔ مجھے نہ تمہاری ضرورت ہے نہ ہی تمہاری گاڑی کی..... بس تھوڑی دیر کی بات ہے..... میں تمہیں تمہاری گاڑی سمیت چھوڑ دوں گا۔"

اسے شاید کچھ اطمینان ہوا۔ مزید کچھ نہ بولا لیکن اس کی جگہ اس کی گاڑی نے بولنا شروع کردیا۔ وہ کچھ زیادہ اچھی حالت کی گاڑی نہیں تھی۔ میں نے رفتار بڑھائی تو اس کی نہ جانے کیا کیا چیزیں کھڑکھڑانے لگیں۔ سڑکیں خالی ہونے کا یہ فائدہ تو تھا کہ میں اس پرانی سی گاڑی کو بھی کافی رفتار سے بھگا سکتا تھا لیکن ساتھ ہی یہ مشکل بھی تھی کہ خالی سڑک پر کسی کو ڈاج دینا زیادہ مشکل تھا۔

میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے ابتدا ہی میں کافی دور نکل آنے کا موقع مل گیا تھا۔ جب تک مجھے دوبارہ وہی ہیڈلائٹس عقب نما آئینے میں دکھائی دیں تب تک میں ایک اور موڑ پر پہنچ چکا تھا۔ میری چونکہ کوئی خاص منزل نہیں تھی اس لیے میں نے تعاقب کرنے والوں کو کنفیوژ کرنے کے لیے یہی ٹیکنک اپنائی کہ میری سائڈ پر جو بھی موڑ آتا گیا میں اسی طرف گاڑی موڑتا چلا گیا۔

جس انداز میں میں موڑ کاٹ رہا تھا اس سے ڈرائیور بدحواس ہو رہا تھا اور اس کی گاڑی نہ جانے کس کس انداز سے صدائے احتجاج بلند کر رہی تھی۔ اس کھٹارا گاڑی کو اس طرح استعمال کرنا بھی اپنی قسمت کو کچھ زیادہ ہی آزمانے والی بات تھی تاہم گاڑی نے..... یا پھر شاید قسمت نے مجھے دھوکا نہیں دیا۔

مسلسل زگ زیگ کرتے کرتے بالآخر میں نے محسوس کیا کہ عقب نما آئینے میں وہ ہیڈلائٹس نظر آنا بند ہو چکی تھیں۔ میں اس دوران ایک تنگ مگر چوڑے سڑک پر پہنچ چکا تھا۔ پھر ایک چھوٹے سے راؤنڈ اباؤٹ کے قریب سے گزر کر اچانک ہی میں نے خود کو کینٹ اسٹیشن کے سامنے پایا۔

میں نے عین سیڑھیوں کے سامنے ٹیکسی لے جا روکی۔ رات کے اس پہر بھی ایک پولیس والا سیٹی بجاتا ٹیکسی کی طرف لپکا۔ ڈرائیور کو ایک مصیبت سے تو نجات ملتی نظر آئی لیکن ساتھ ہی دوسری مصیبت اپنی طرف لپکتی نظر آئی اور وہ کراہنے کے سے انداز میں بولا۔ "مروا دیا..... میرے پاس تو اس کو دینے کے لیے بھی کچھ نہیں ہے..... اب تو شاید چالان ہی ہو جائے....."

میرے پاس اس وقت کوئی چھوٹا نوٹ نہیں تھا۔ میں نے ہزار کا نوٹ جیب سے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔ "بے فکر رہو..... میں مفت کی سواری نہیں ہوں..... ایسا مسافر تمہیں روز روز نہیں ملے گا جو گاڑی خود ہی چلا کر بھی لائے اور یہاں تک ہزار روپیہ کرایہ بھی دے۔ اس پولیس والے سے اب خود ہی نمٹتے رہنا....."

یہ کہتے ہوئے میں ٹیکسی سے اتر چکا تھا۔ ڈرائیو کو دم بخود چھوڑ کر میں سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ اس وقت تک مجھے مزید کوئی گاڑی

اسٹیشن کی طرف آتی دکھائی نہیں دی تھی لیکن میں اسی طرح تقریباً دوڑتا ہوا پلیٹ فارم پر آگیا جیسے مجھے کوئی گاڑی پکڑنی تھی لیکن پلیٹ فارم پر دائیں طرف کچھ دور تک چلنے کے بعد میں یک دم ہی دائیں طرف بنے ہوئے سیکنڈ کلاس کے ایک نئے ویٹنگ روم کی طرف مُڑ گیا۔

اس ویٹنگ روم سے گزر کر میں دوبارہ باہر آگیا لیکن اب میں مرکزی دروازے سے کافی دور تھا اور یہاں اسٹیشن کی سیڑھیوں سے لے کر فٹ پاتھ تک خاصی بھیڑ بھاڑ تھی۔ سڑک پر مختلف سواریاں بھی موجود تھیں حتیٰ کہ دو بگھیاں بھی نظر آرہی تھیں۔ میں تیزی سے اس ساری بھیڑ بھاڑ سے گزرتا اور اپنے چاروں طرف غیر محسوس طور پر نظر رکھے آگے بڑھتا چلا گیا۔

عوامی قسم کے ریستورانوں پر ناشتے کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ برتن اور کڑاہیاں کھنک رہی تھیں۔ ویٹروں کی بھانت بھانت کی آوازیں گونجنے لگی تھیں۔ فٹ پاتھ پر پڑی میزوں پر بھی کافی لوگ نظر آنے لگے تھے۔ میں ان کے درمیان سے گزرتا اسٹیشن کی قریبی گلیوں میں جا گھسا جہاں نچلے درجے کے کئی ہوٹل موجود تھے۔ یہ ذرا بہتر قسم کے..... بلکہ شاید خاصے معززانہ مسافر خانے تھے۔

میں آنکھیں تقریباً بند کر کے اور قسمت پر تکیہ کر کے ایک ہوٹل میں گھس گیا۔ ریسپشن پر ایک نوجوان بیٹھا قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا۔ اس نے مجھے ذرا انتظار کرنے کا اشارہ کیا۔ میں ذرا ایک طرف کو ہو کر کھڑا ہو گیا تاکہ باہر سے مجھے نہ دیکھا جا سکے۔ ریسپشن پر چاروں طرف مقدس مقامات کی فریم شدہ تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ میں سانس درست کرتے ہوئے سوچنے لگا کہ شاید میں کچھ ٹھیک جگہ پر ہی پہنچ گیا تھا۔ شاید میرے لیے یہاں پناہ اور حفظ و امان ہو۔

کلرک باریش نوجوان تھا۔ اس نے رکوع ختم کر کے قرآن پاک کو بوسہ دے کر ایک شیلف میں رکھا اور مہذبانہ لہجے میں بولا۔ "فرمایئے؟"

میں نے اسے بتایا کہ مجھے کمرا چاہیے۔ اس نے مجھے اپنے ہوٹل کے آداب کے بارے میں ایک مختصر سا لیکچر دیا کہ کمرا تو مجھے مل جائے گا لیکن میں وہاں کوئی بدمعاشی، کوئی غلط سلط حرکت کرنے کی کوشش نہ کروں اور ہوٹل کے واجبات ادا کیے بغیر بھاگنے کا خیال دل میں نہ لاؤں ورنہ میرے ساتھ بہت بری ہوگی۔ میں نے نہایت سعادت مندی سے وعدہ کیا کہ میں اس قسم کی کوئی گھٹیا حرکت نہیں کروں گا۔ اس نے واضح کیا کہ زمانہ خواہ کہیں بھی پہنچ چکا تھا اور دنیا میں خواہ کچھ بھی ہو رہا تھا لیکن وہ کاروبار میں اعلیٰ روایات برقرار رکھنے کے لیے کوشاں تھا اور اپنے اصولوں پر قائم تھا۔ میں نے مختصر الفاظ میں اسے خراجِ تحسین پیش کیا۔ میں یہ جان کر حیران رہ گیا کہ وہ خود اس ہوٹل کا مالک تھا لیکن بوقتِ ضرورت اپنے ہوٹل میں ویٹر کے طور پر بھی خدمات انجام دیتا تھا۔

چند منٹ بعد میں اس ہوٹل کے نہایت چھوٹے سے بیڈ پر لیٹا حالات کے تغیر پر غور کر رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے میں اپنے فائیو اسٹار ہوٹل کے عالیشان لگژری سوئٹ میں لیٹا تھا اور اب اس ڈربا نما کمرے میں موجود تھا لیکن یہاں میں اپنے آپ کو زیادہ محفوظ محسوس کر رہا تھا۔ مجھے امید تھی کہ میرا تعاقب کرنے والے اگر اسٹیشن کے سامنے کھڑی ٹیکسی تک پہنچنے میں کامیاب ہو بھی گئے تو وہ یہی سمجھیں گے کہ میں نے اندر جا کر کسی ٹرین کے ذریعے فرار ہونے کی کوشش کی ہوگی۔ اگر انہوں نے ڈرائیور سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تب بھی انہیں یہی پتا چلے گا کہ میں اندر گیا تھا۔ اپنے آپ کو یہ اطمینان دلا کر میں سو گیا تاکہ میری نیند میں جو کمی رہ گئی تھی وہ پوری ہو سکے۔

دوپہر کے بعد اٹھ کر میں نے کمرے ہی میں کھانا منگوایا۔ اس ہوٹل کے کمروں میں فون نہیں تھا۔ ہر فلور پر صرف سننے کے لیے فون کی ایک ایکسٹینشن رکھی تھی۔ فون کرنے کے لیے مجھے نیچے استقبالیہ کاؤنٹر پر جانا پڑا۔ ڈائریکٹری دیکھ کر میں نے ایک ٹریول ایجنٹ سے رابطہ کیا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ لاہور پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ اگر کراچی میں میرے پہنچنے کے ایک رات بعد ہی ریڈ ڈاٹ کو میری موجودگی کا علم ہو گیا تھا تو پھر میرے لیے کراچی اور لاہور میں یکساں ہی خطرات تھے۔ لاہور میں کم از کم میں اپنے ساتھیوں کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر سکتا تھا۔

میری خوش قسمتی تھی کہ جس پہلے ٹریول ایجنٹ سے میرا رابطہ ہوا، اس نے مجھے رات کی ایک فلائٹ میں ٹکٹ دینے کا وعدہ کر لیا۔ وہ مجھے میرے پتے پر بھی ٹکٹ بھجوا سکتا تھا لیکن میں نے احتیاطاً اس سے یہی کہا کہ میں فلائٹ سے ڈیڑھ دو گھنٹا پہلے اس کے ہاں سے ٹکٹ لے کر ائرپورٹ چلا جاؤں گا۔

باقی وقت میں نے ایک قیدی کی طرح اس ہوٹل میں گزارا اور شام کا اندھیرا ہونے پر ہوٹل سے نکلا۔ ایک ٹیکسی پکڑ کر میں ٹریول ایجنسی پہنچا۔ دفتر میں بھورے بالوں والی ایک میک اپ زدہ لڑکی چند ٹکٹیں لیے مسافروں کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اس سے اپنا ٹکٹ لے کر ادائیگی کر کے میں اپنی روکی ہوئی ٹیکسی میں بیٹھ کر ائرپورٹ کی طرف روانہ ہوا۔

میں تمام راستے چوکنا رہا لیکن مجھے کسی گاڑی پر یہ شبہ نہیں ہوا کہ وہ میرا تعاقب کر رہی تھی۔ مجھے اطمینان ہونے لگا لیکن میری قسمت میں زیادہ دیر کے لیے اطمینان نہیں تھا۔ گاڑی ابھی ٹرمینل کے قریب نہیں پہنچی تھی کہ میری نظر انکوائری بوتھ کی طرف چلی گئی۔ حالانکہ وہاں روشنی زیادہ نہیں تھی اور فاصلہ بھی خاصا تھا، اس کے باوجود میں نے بوتھ کے قریب کھڑی شخصیت کو پہچان لیا۔ وہ وہی آسیبی آنکھوں والی لڑکی تھی۔ وہ شولڈر بیگ لٹکائے

بوتھ کے قریب ایک مجسمے کی طرح کھڑی تھی۔ ٹرمینل پر اگر کوئی مکمل تاریک گوشہ ہوتا تو شاید وہ وہاں کھڑی ہوتی۔ جہاں وہ کھڑی تھی وہاں سب سے کم روشنی تھی۔

"گاڑی روک دو اور ہیڈ لائٹس آف کردو۔" میں نے ڈرائیور کو ہدایت کی۔ اس نے گاڑی روک لی لیکن کچھ پریشان سا ہوگیا۔ ہیڈلائٹس مجھے خود ہاتھ بڑھا کر آف کرنا پڑیں۔

میں اسے محض اتفاق نہیں سمجھ سکتا تھا کہ وہ آسیبی آنکھوں والی لڑکی اس وقت ائرپورٹ پر موجود تھی۔ یقیناً ائرپورٹ کی نگرانی ہورہی تھی اور وہ لڑکی وہاں تنہا نہیں تھی۔ اس پُرہجوم مقام پر اس کے ساتھی نہ جانے کہاں کہاں بکھرے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کا طریقۂ واردات بھی کچھ انوکھا ہی ہوتا تھا۔

صرف ایک لمحہ سوچنے کے بعد میں نے واپس ہولینے کا فیصلہ کیا لیکن ڈرائیور اگر ون وے کی پابندی کرتے ہوئے واپس مُڑنا چاہتا تو اسے ٹرمینل کے قریب جاکر راؤنڈ اباؤٹ کے گرد چکر کاٹ کر دوسری سڑک پر آنا پڑتا۔ ٹرمینل کے سامنے تیز چمکیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں ٹیکسی کو وہاں تک لے جانے اور واپس گھمانے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔

"گاڑی واپس موڑلو۔" میں نے ڈرائیور سے کہا۔ "یہیں سے گھمالو۔"

"کیوں مروائیں گے صاحب! یہ ون وے ہے۔" ڈرائیور کراہا۔

"ادھر اندھیرا ہے اور ٹریفک سارجنٹ ٹرمینل کے پاس کھڑا ہے۔ اگر کوئی ادھر آیا تو میں خود اس سے نمٹ لوں گا۔ میں جس طرح کہہ رہا ہوں اسی طرح کرو۔ تمہیں بہت اچھی دہاڑی ملے گی۔" میں نے کہا۔ تب وہ خطرہ مول لینے پر آمادہ ہوا اور اندھیرے میں ہیڈ لائٹس آن کیے بغیر اس نے گاڑی واپس موڑی۔ کچھ دور پہنچ کر اسے درمیان میں راستہ میسر آگیا اور وہ دوسری طرف ہوگیا۔ میں گردن گھمائے پیچھے دیکھ رہا تھا۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد ڈرائیور بولا۔ "صاحب جی! اگر آپ برا محسوس نہ کریں تو ایک بات پوچھوں؟"

"ضرور پوچھو بھائی! میں آج کل کسی بھی بات کا برا ماننے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ کیا کوئی سیاسی شخصیت ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"اللہ نہ کرے۔ تمہیں یہ شبہ کیونکر ہوا؟" میں نے جلدی سے سیدھا ہوکر بیٹھتے ہوئے کہا۔ مجھے کافی حد تک یقین ہوچکا تھا کہ کوئی گاڑی میرا تعاقب نہیں کررہی تھی۔

"صاحب! میں نے دوسرے ڈرائیوروں سے سنا ہے...... اور مجھے خود بھی دو تین بار تجربہ ہوا ہے کہ بعض سیاسی شخصیتیں اسی طرح بھاگم بھاگ ائرپورٹ پہنچتی ہیں لیکن وہاں انہیں معلوم نہیں کیا نظر آتا ہے کہ ایک دم فلائٹ چھوڑ کر واپس بھاگ لیتے ہیں۔" ڈرائیور بولا۔ وہ کافی ہوشیار معلوم ہوتا تھا۔

"دراصل وہ سیاسی کم...... اور "سیاہ سی" شخصیات زیادہ ہوتی ہیں لیکن میں نہ سیاسی شخصیت ہوں اور نہ سیاہ سی۔ میں تو ایک شریف آدمی ہوں۔ کچھ مجبوریوں کی وجہ سے مجھے ائرپورٹ سے واپس آنا پڑا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

وہ کندھے اچکا کر رہ گیا۔ شارع فیصل پر کافی آگے آجانے کے بعد ایک بار پھر میرے سامنے یہ سوال آن کھڑا ہوا کہ مجھے کہاں جانا چاہیے۔ کسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے میں نے خواہ مخواہ ٹیکسی کو ادھر ادھر گھمانا شروع کردیا۔

اس وقت میں ڈیفنس کی ایک گلی سے گزر رہا تھا جب میری نظر ایک جانے پہچانے بنگلے پر پڑی۔ وہ ذرا مختلف اور منفرد ڈیزائن کا ایک خوبصورت بنگلا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی مجھے یاد آیا کہ وہ سیٹھ رمضان کا بنگلا تھا۔ سیٹھ رمضان کسی زمانے میں ہوٹل میں میرا پارٹنر تھا۔ بعد میں، میں نے اس کی خواہش پر اس کے حصے کے شیئرز خرید کر اسے الگ کردیا تھا لیکن اس سے دوستی برقرار تھی۔ یارباش آدمی تھا۔ ذرا الگ ہی قسم کی طبیعت پائی تھی۔ مُدت ہوئی اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت وہ کام بھی آسکتا تھا۔

کچھ آگے جاکر میں نے ٹیکسی رکوائی اور ڈرائیور کو فراخ دلی سے ادائیگی کرکے رخصت کیا اور ایک دوسری گلی میں گھس کر ذرا گھوم کر واپس سیٹھ رمضان کے بنگلے تک آیا۔ ٹیکسی جاچکی تھی۔ گلی سے اکا دُکا کاریں گزر رہی تھیں اور نہ جانے کیوں مجھے ہر کار کچھ پُراسراری سی لگ رہی تھی۔ اس گلی کا ماحول بھی کچھ پُراسرار سا ہی تھا۔ روشنی بہت کم تھی اور چاروں طرف عجیب سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بڑے بڑے محل نما مکانات اپنی تمام تر خوبصورتی کے باوجود ویران ویران سے لگ رہے تھے۔

میں نے کال بیل بجائی تو ایک شخص نے بلند و بالا گیٹ کی مخصوص جھری سے میرا جائزہ لیا، نام پوچھا، پھر گیٹ کھولا۔ وہ مسلح گارڈ تھا اور چھوٹے سے گیسٹ ہاؤس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے مجھے گیسٹ ہاؤس میں بٹھایا اور انٹرکام پر سیٹھ رمضان کو اطلاع دی کہ کوئی افضل چوہدری صاحب اس سے ملنا چاہتے ہیں۔

چند لمحے بعد سیٹھ رمضان اس عالم میں ماربل کے خوبصورت فرش پر دوڑتا ہوا آتا دکھائی دیا کہ اس کے جسم پر صرف ایک ڈھیلی ڈھالی سی بنیان اور دھوتی تھی۔ اس کے پیروں میں چپل تک نہیں تھی البتہ ہاتھ میں لوٹا ضرور تھا جس سے پانی کی دھار وقفے وقفے سے بہتی آرہی تھی۔ اس وقت کوئی اسے دیکھتا تو شاید یہی سمجھتا کہ وہ گھر کا کوئی بدحواس قسم کا نوکر ہوگا۔ کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ وہ اس محل نما بنگلے اور اس جیسی کئی دوسری املاک اور کاروبار وغیرہ کا مالک تھا۔ اس کی تعلیم بھی واجبی تھی اور انداز و اطوار ان پڑھوں والے ہی تھے۔ اس کے باوجود اس کے بہت سے کاموں میں بڑا سلیقہ نظر آتا تھا۔ بڑے بڑے پڑھے لکھے جغادری قسم کے لوگوں

حتیٰ کہ غیر ملکیوں تک سے اس کے مراسم تھے۔

مجھے دیکھ کر اس نے لوٹا لان پر پھینک دیا اور اچھل کر مجھ سے آن لپٹا۔ اپنے استخوانی بازوؤں سے وہ مجھے جھنجھوڑنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "چوہدری! میرے یار...... تم کہاں مر گئے تھے؟ اتنے عرصے سے تمہاری شکل نہیں دیکھی...... کبھی فون تک نہیں کیا تم نے...... میں نے کئی بار فون کیا تو تمہارا کچھ پتا نہیں چلا۔"

"میں تقریباً مر ہی گیا تھا رمضانی یار!" میں نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔ "بس یوں سمجھو کہ دوسری زندگی ملی ہے تو تم سے ملنے آگیا ہوں۔ بیٹھ کر آرام سے بات کرتے ہیں۔"

وہ رنڈوا تھا۔ اس کی شاید ایک شادی شدہ بیٹی اور بیٹا اس بنگلے میں اس کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ مجھے اپنے شاندار بیڈ روم میں لے گیا۔ نوکروں کو اس نے میری خاطر تواضع کے لیے دوڑانا شروع کردیا تھا۔ کمرا بند کرکے وہ ایک صوفے پر اکڑوں بیٹھ چکا تو اس کی فرمائش پر میں نے اپنی داستان غم شروع کی۔ میں نے اسے اختصار کے ساتھ لیکن تمام واقعات صحیح طور پر سنا دیے۔ میں نے اسے ریڈ ڈاٹ کے بارے میں بھی صحیح بتا دیا۔ اس کے ہوش اُڑ گئے۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ رنگت زرد پڑ گئی۔

بنیادی طور پر وہ ایک ڈرپوک آدمی تھا۔ جن دنوں اسمگلنگ کے دھندوں میں ملوث تھا ان دنوں بھی ایک طرف تو اچھے خاصے خطرناک معاملات میں ہاتھ ڈالتا رہتا تھا لیکن دوسری طرف اس کے ڈرپوک ہونے کا یہ عالم تھا کہ وقت بے وقت کال بیل بج اٹھتی تھی تو بیڈ کے نیچے گھس جاتا تھا۔ اس کی شخصیت میں یہ ایک عجیب تضاد تھا۔

بہت دیر تک ہم ان حالات کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ بالآخر وہ بولا۔ "چوہدری یار! میرا مشورہ تو یہی ہے کہ کچھ دنوں کے لیے تم ادھر ادھر ہوجاؤ۔ اپنے ہی کسی ٹرالر وغیرہ کے ذریعے مڈل ایسٹ کی طرف نکل جاؤ۔"

"ٹرالر یا لانچ کے ذریعے میں جانا نہیں چاہتا۔ انہیں اکثر کوسٹ گارڈ والے روک لیتے ہیں کیونکہ ان ریاستوں کی طرف انسانوں کی اسمگلنگ انہی کے ذریعے ہوتی ہے۔ میں خود بھی یہاں آنے سے ذرا دیر پہلے یہی سوچ رہا تھا کہ کچھ دنوں کے لیے باہر ہی نکل جاؤں لیکن کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اس وقت میرے پاس پاسپورٹ وغیرہ کچھ نہیں ہے۔ جعلی پاسپورٹ پر بھی میں سفر کرنا نہیں چاہتا...... بلکہ کسی سیدھے راستے سے تو سفر کرنا ہی نہیں چاہتا۔ میرا خیال ہے باہر جانے کے جتنے بھی ذرائع ہیں ان کی نگرانی ہورہی ہوگی۔"

وہ کچھ دیر کے لیے سوچ میں ڈوبا رہا پھر بولا۔ "ایک ترکیب ہے...... میں تمہارا ایک بندوبست کرسکتا ہوں...... بلکہ اس طرح تم میرے ایک جاننے والے انگریز کی بھی کچھ مدد کرسکو گے۔ وہ بے چارہ لندن میں بہت پریشان بیٹھا ہے۔ اس نے کل ہی مجھے فون کیا تھا اور مدد کی درخواست کی تھی۔ میں نے اس کی مدد کا وعدہ بھی کرلیا تھا لیکن ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اس کی کیا مدد کروں۔"

"تمہارا خیال ہے کہ میں...... یعنی ایک ایسا شخص جو خود جان بچانے کے لیے بھاگا پھر رہا ہے‘ وہ اس کی مدد کرسکے گا؟" میں نے سیٹھ رمضان کو گھورا۔

"چوہدری یار! تمہاری بات کچھ اور ہے۔" اس نے پیار سے میرا بازو تھپتھپایا۔ "تم تو ڈوبتے ڈوبتے بھی دو چار کو ڈوبنے سے بچا سکتے ہو۔"

"مکھن مت لگاؤ۔ یہ بتاؤ تمہارے ذہن میں کیا ہے؟" میں نے کہا۔

وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔ "میں جس انگریز دوست کا ذکر کررہا ہوں اس سے پرانی اور خاندانی دوستی چلی آرہی ہے۔ اس کا باپ میرے باپ کا دوست تھا۔ پارٹیشن سے پہلے اس کا باپ بمبئی میں ہائی کمشنر تھا۔ ظاہر ہے اس زمانے میں اس عہدے کا انگریز بڑی توپ چیز تھا۔ سچی بات ہے‘ ہمارے خاندان میں دولت داخل ہی اس وقت ہوئی تھی جب اس انگریز نے میرے باپ کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ اس سے پہلے میرا باپ پیتل کی تھالیوں پر نقش و نگار بنانے کا کام کرتا تھا۔ بس کسی طرح ہمارے ابا جان کی اس انگریز کے بنگلے میں رسائی ہوگئی تھی۔ اس کے بعد ہمارے دن پھرنے شروع ہوگئے تھے......"

"یہ پرانے قصے چھوڑو...... اب کا قصہ بتاؤ۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"وہی بتانے لگا تھا۔ اس کے بیٹے چارلس سے میرے بھی مراسم چلے آرہے ہیں۔ اس نے مجھے فون پر بتایا ہے کہ اس کی بیٹی کیتھرین ایک بحری جہاز پر سفر کررہی ہے جو اس وقت کراچی کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہے۔ جہاز گو کہ باربرداری کا ہے مگر اس قسم کے جہازوں میں سے ہے جو باربرداری کے ساتھ ساتھ کسی نہ کسی بہانے ہر بندرگاہ سے دو چار مسافر بھی اٹھا لیتے ہیں اور کم کرائے میں ایک سے دوسرے ملک پہنچا دیتے ہیں۔ چارلس کو پتا چلا ہے کہ اس کی بیٹی منشیات کے دھندے میں ملوث ہے اور اس کی جان کو خطرہ ہے۔ وہ شاید ترکی جارہی ہے۔ وہ ایک معزز خاندان کی لڑکی ہے۔ اس کا باپ اس لیے بھی کسی سے مدد طلب نہیں کرسکتا کہ کہیں اس کی بیٹی کے منشیات کے دھندے میں ملوث ہونے کا معاملہ سامنے نہ آجائے۔ اس صورت میں بیٹی بچ بھی گئی تو انہیں انگلینڈ میں سخت سزاؤں کا سامنا کرنا پڑے گا اور رسوائی الگ ہوگی۔ تمہیں معلوم ہی ہے‘ مغرب کے والدین اپنی اولاد کو دی ہوئی آزادیوں کی سزا کس کس طرح بھگت رہے ہیں۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "تم چاہتے ہو کہ ان کے حصے کی کچھ سزائیں بھگتوں؟"

"یار! تمہیں بھی تو فرار کا مسئلہ درپیش ہے۔ میں تمہیں اس جہاز پر سوار کرانے کا بندوبست کر دیتا ہوں۔ بس تم راستے میں ذرا دیکھ لینا کہ مسئلہ کیا ہے۔ البتہ اس لونڈیا سے عشق لڑانے مت بیٹھ جانا۔ میں نے اسے دیکھا تو نہیں کہ کیسی ہے لیکن اگر خوبصورت ہوئی تو تم پھسل مت جانا۔ مجھے معلوم ہے تم کفرانِ نعمت نہیں کرتے۔ حسن والے مہربان نظر آئیں تو فوراً دل کے دروازے، کھڑکیاں اور روشن دان وغیرہ کھول دیتے ہو۔"

"کیوں..... اس لڑکی کو عشق سے پرہیز ہے کیا؟ یا اس کی نظر میں منشیات کا دھندا عشق کے دھندے سے زیادہ بہتر اور معززانہ ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں یار! میں تو اس لیے منع کر رہا ہوں کہ تم کہیں کسی اور خطرناک چکر میں نہ پھنس جاؤ۔ تم تو پہلے ہی ریڈ ڈاٹ کے چکر میں پھنسے ہوئے ہو۔ تمہیں معلوم ہے ڈرگز کے دھندے میں بھی کچھ اسی قسم کی بڑی بڑی سینڈی کیٹس کام کر رہی ہیں۔ اب تو ایک نہیں، بیسیوں مافیائیں ہیں۔ تم بس شرافت سے صرف اپنی جان بچانے سے غرض رکھنا۔"

"ٹھیک ہے حاجی رمضان صاحب! میں آپ کے قیمتی مشوروں پر دل و جان سے عمل کروں گا۔" میں نے کہا۔ "ویسے یہ تمہیں محض غلط فہمی ہے کہ میں ہر اچھی صورت دیکھ کر عاشق ہو جاتا ہوں یا مہربان چہرے کے سامنے دیدہ و دل فرشِ راہ کر دیتا ہوں۔ ہم پیار اسی سے کرتے ہیں جو پیار کے قابل ہوتا ہے۔"

"اچھا..... مجھے یہ گاڑھی اردو کی مار مارنے کی کوشش مت کرو اور نہ ہی گاڑھی اردو میں پتلے فلمی گانے مکس کرو۔ یہ بتاؤ تم جانے کے لیے تیار ہو؟" سیٹھ رمضان نے پوچھا۔

"ہاں یار..... میں سوچ رہا ہوں چند دن کے لیے اِدھر اُدھر ہو جاؤں..... " میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "تم اس دوران میرے ساتھیوں کا پتا کرنے اور انہیں کسی ٹھکانے پر جمع کرنے کی کوشش کرنا..... "

میں اسے سمجھانے لگا کہ وہ کس طرح میرے ساتھیوں سے رابطہ کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔ وہ سر ہلاتا رہا۔ بظاہر وہ غبی نظر آتا تھا لیکن درحقیقت غبی نہیں تھا۔

یہ باتیں ختم ہو چکیں تو میں نے پوچھا۔ "اس جہاز پر سوار ہونے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"آج آدھی رات کو ہی یہ جہاز روانہ ہو جائے گا۔ تمہیں فوری طور پر کلفٹن جا کر ایک چھپر ہوٹل میں عاشق بھٹی نامی ایک شخص سے ملنا ہوگا۔ اس چھپر ہوٹل میں تلی ہوئی مچھلی وغیرہ فروخت ہوتی ہے۔ تم آرام سے جا کر ایک گاہک کی طرح بیٹھ جانا اور میرا لکھا ہوا ایک پرچا عاشق بھٹی کو دینا۔ وہاں کسی بھی ویٹر سے پوچھنا، وہ تمہیں عاشق بھٹی سے ملوا دے گا..... "

سیٹھ رمضان نے جلدی سے نوکر سے ایک رائٹنگ پیڈ اور قلم منگوایا لیکن جب اس نے پرچا میرے حوالے کیا تو میں اس کی صورت دیکھنے لگا۔ اس پر صرف چند آڑی ترچھی لکیریں سی کھنچی ہوئی تھیں۔

"تم اس چکر میں مت پڑو کہ یہ کیا ہے۔ یہ ایک مکمل پیغام ہے۔" سیٹھ رمضان بولا۔ "تم چاہو تو اسی جہاز سے گھومتے گھامتے واپس بھی آ سکتے ہو۔ آتے ہی مجھ سے فون پر رابطہ کرنا۔ مجھے خوشی ہے کہ اس طرح ایک تیر سے دو شکار ہو رہے ہیں۔ جب سے چارلس کا فون آیا تھا میں پریشان تھا کہ کیا کروں۔ خود جانے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی، کسی دوسرے پر مجھے بھروسا نہیں تھا کہ وہ مسئلے کو صحیح طور پر ہینڈل کر سکے گا۔"

پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا۔ "اچھا یہ بتاؤ تمہیں کتنی رقم کی ضرورت ہے؟"

میں نے اپنی ذرا پھولی ہوئی جیب کی طرف اشارہ کیا۔ "میرے پاس ابھی اچھی خاصی رقم موجود ہے۔"

اس نے مجھے تاریک شیشوں والی ایک گاڑی میں مسلح گارڈ کے ساتھ کلفٹن کی طرف روانہ کر دیا۔ ڈرائیور نے مجھے ساحل سے کافی دور ہی اتار دیا۔ ابھی کلفٹن پر تفریح کے لیے آنے والوں کا رش تھا۔ پلے لینڈ کے اس رش سے گزر کر میں اس طرف آیا جدھر مچھلی کی دکانیں تھیں۔ ہوا میں مچھلی اور تیل کی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔

میں نے مطلوبہ دُکان کا بورڈ دور سے دیکھ لیا اور اس کی طرف بڑھا۔ دُکان کے بڑے سے چھپر تلے بڑا ہجوم تھا۔ پہلے مجھے حیرت ہوئی کہ کیا مچھلی پر اس قدر رش لگا ہوا تھا؟ کیا یہاں بہت ہی اچھی مچھلی ملتی تھی جو لوگ اس طرح ٹوٹے پڑ رہے تھے؟

لیکن قریب جا کر اندازہ ہوا کہ وہ ہجوم مچھلی خریدنے والوں کا نہیں تھا۔ وہاں کچھ گڑبڑ معلوم ہوتی تھی۔ میں بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے پہنچا تو مجھے جھٹکا سا لگا۔ ہجوم کے درمیان ریتلی زمین پر ایک شخص اس طرح پڑا تھا کہ اس کی گردن تن سے بالکل ہی جُدا تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کسی جلاد نے چند لمحے پہلے ہی اس کا سر قلم کیا تھا۔ گاڑھا گاڑھا خون ریت میں جذب ہو چکا تھا۔

"کون ہے یہ بدنصیب؟" میں نے غیرارادی طور پر خود کلامی کے سے انداز میں پوچھا۔

ویٹر نما ایک شخصیت نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا اور گویا مجھ پر ترس کھاتے ہوئے میرے سوال کا جواب دے دیا۔ "اس کا نام عاشق بھٹی تھا۔"

جاسوسی ڈائجسٹ: اپریل 1994

ناول سکیننگ و کمپوزنگ

محمد سجاد بھٹی

03045503086

خصوصی تعاون: جاسوسی نشست اینڈ

ڈاکٹر حامد حسن۔ساگر زمان۔عقیل قریشی۔ممتاز علی کیانی۔سیف الملوک عباسی۔یاسر حسنین۔ناصر محمود بلوچ۔محمد نعمان & صائم بھائی

اردو ادب کے سب رنگ۔ادبی محفل۔قدیمی جاسوسی دنیا۔اولڈ سپاہی ناول..... فینز گروپ

■ سیم و زر کی پُر فریب چمک سے اندھا ہونے کا عبرت اثر واقعہ

ذراسی جلد بازی کبھی کبھی برسوں کی محنت پر پانی پھیر دیتی ہے۔ اُس نوجوان کی کتھا جو بڑی مستقل مزاجی سے اپنے بیمار انکل کی تیمارداری کر رہا تھا اور اُس کی موت کا منتظر تھا۔

خیرخواہ

عمیر شاہ

طویل علالت نے سڈ ملر کے انکل مورث کی حالت تباہ کر دی تھی۔ ان کی جلد بھی گویا چیچ سی گئی تھی۔ سہارے کے بغیر وہ اٹھ بیٹھ بھی نہیں سکتے تھے۔ سڈ ملر نے ان کی خدمت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔

اس شام بھی سڈ ملر نے انہیں دوا پلا کر لٹایا اور ان کا بستر درست کرتے ہوئے بولا "اب آپ آرام سے لیٹے رہیے گا۔ اٹھ کر چلنے پھرنے کی کوشش مت کیجئے گا۔ ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔"

اس طرح کے الفاظ روز مرّہ کی مشق کے تحت اس کے ہونٹوں پر آتے رہتے تھے لیکن اس کی حقیقی اور دلی کیفیت اس کے بالکل برعکس تھی۔ جب وہ محبت و ملائمت سے اپنے انکل کو آرام کی تاکید کر رہا ہوتا تھا تو اس کی روح چیخ رہی ہوتی تھی ’’منحوس بڈھے! آخر تم مر کیوں نہیں جاتے؟ جہنم تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ ہڈیوں کے ڈھانچے! آخر تم کب تک یونہی لیٹے رہو گے اور میری زندگی کو جہنم بنائے رکھو گے؟‘

سڈ محسوس کرتا تھا کہ اس کی قوت برداشت کسی بھی لمحے جواب دینے والی تھی۔ انکل مورث کو معذور ہوئے تقریباً تین برس ہو چکے تھے اور ڈاکٹروں کو کچھ اندازہ نہیں تھا کہ وہ سانس کی کمزور ڈوری سے کب تک بندھے رہیں گے۔ ان کی خدمت کرتے کرتے سڈ کے اعصاب جواب دینے لگے تھے۔

"شکریہ سڈ!" وہ خرخراتی سی آواز میں بولے "تم میرا بہت خیال رکھتے ہو۔ میں اکثر سوچتا ہوں، تم نہ ہوتے تو میرا کیا بنتا۔ ایک نوجوان کے لئے اس طرح ایک دائمی مریض کے ساتھ



بندھے رہنا بلاشبہ ایک کٹھن آزمائش ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں انکل!" سڈ متانت سے بولا "جب میں چھوٹا تھا اور میرے والدین انتقال کر گئے تھے تو آپ نے بھی اسی طرح میرا خیال رکھا تھا اور محبت سے میری پرورش کی تھی۔ آپ میرے لئے باپ کی طرح ہیں۔"

انکل مورٹ نے گویا سکون اور طمانیت محسوس کرتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔ سڈ کی نظر قریب ہی تپائی پر موجود بہت سی دواؤں کے درمیان رکھی ہوئی ایک سفید ڈبیا پر جم کر رہ گئی۔ اس ڈبیا میں خواب آور گولیاں تھیں۔ کئی راتوں سے یہ ہو رہا تھا کہ سڈ کو دیر تک نیند نہیں آتی تھی۔ وہ کروٹیں بدلتا رہتا تھا اور سنسنی وخوف کی ملی جلی سی کیفیت کے درمیان اس ڈبیا کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ اس میں گویا اس کا ذریعۂ نجات بند تھا۔ اسے صرف اتنی جرائت کی ضرورت تھی کہ اس سے استفادہ کر سکے۔

دو ہفتے قبل ڈاکٹر بلیک مین نے یہ گولیاں لکھ کر دیتے ہوئے کہا تھا "انہیں احتیاط سے استعمال کرنا مورٹ! ان کی ذرا سی بھی زیادہ خوراک تمہارے دل کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔"

اس کے بعد یہ ممکن ہی نہیں رہا تھا کہ انکل مورٹ کبھی ایک سے زیادہ گولی لیتے۔ ایک گولی بھی وہ اشد ضرورت کے تحت ہی لیتے تھے۔ ان کے ناتواں جسم میں زندگی کی ہوس پوری طرح بیدار تھی۔ وہ حتی الامکان مضبوطی کے ساتھ زندگی سے چمٹے ہوئے تھے۔

چنانچہ سڈ نے بہ صد دقت ایک کیمسٹ سے انہی گولیوں سے ملتی جلتی پانچ گولیاں حاصل کی تھیں۔ پانچ سے زیادہ گولیاں حاصل کرنا اس کے لئے ممکن نہیں ہو سکا تھا۔ بہرحال اس کے مقصد کی تکمیل کے لئے تو ایک ہی گولی کافی تھی...

انکل مورٹ کی نحیف آواز سن کر وہ اپنے خیالات سے چونکا۔ وہ کہہ رہے تھے "میرا خیال ہے مجھے اب نیند آجائے گی۔ تم جا کر پارک میں چہل قدمی کر آؤ۔ میرے ساتھ تم بھی اس اپارٹمنٹ میں قید ہو کر رہ گئے ہو۔"

وہ پُرتعیش اپارٹمنٹ ایک بیس منزلہ عمارت کی سب سے اوپر کی منزل پر واقع تھا۔ سڈ نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ نیچے کاریں اور راہ گیر کھلونوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ وہ اپنا کوٹ اور ہیٹ لینے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

چند منٹ بعد وہ واپس آیا تو اس نے دیکھا، انکل مورٹ آنکھیں بند کیے گہری گہری سانسیں لے رہے تھے۔ وہ گہری غنودگی میں تھے۔ سڈ نے ان کی طرف پشت کرکے سفید ڈبیا آہستگی سے کھولی، خواب آور گولیاں نکال کر جیب میں ڈالیں اور ان کی جگہ پانچ نہایت زہریلی گولیاں ڈال کر ڈبیا واپس اس کی جگہ پر رکھ دی۔

پھر اس نے آہستگی سے انکل مورٹ کا کندھا ہلایا۔ انہوں نے بوجھل انداز میں دُھندلائی ہوئی آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ سڈ ملائمت سے بولا "انکل! میرا خیال ہے، آپ ایک خواب آور گولی کھالیں تاکہ میری عدم موجودگی میں دیر تک اچھی طرح سو سکیں۔ آپ کو زیادہ سے زیادہ آرام کی ضرورت ہے۔"

"ہاں.... ٹھیک ہے" انکل مورٹ نے بلا تامل کہا۔ گولی وہ ڈبیا سے اپنے ہاتھ سے نکالتے تھے۔ سڈ نے ڈبیا کھول کر ان کی طرف بڑھا دی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا۔ کانپتی ہوئی استخوانی انگلیوں سے انکل مورٹ نے ڈبیا سے ایک گولی نکالی اور پانی سے نگل لی۔ یہ چھوٹا سا کام بھی ان کے لئے گویا ایک مشقت تھی۔ وہ ہانپنے لگے۔ سڈ نے انہیں آرام سے لٹایا اور اپنے کمرے میں واپس آگیا۔

چند لمحے بعد اس نے انکل مورٹ کے سانسوں کی پُرسکون سی خرخراہٹ سن کر اندازہ لگایا کہ وہ آرام سے سو چکے تھے۔ وہ دوبارہ انکل مورٹ کے کمرے میں آیا۔ دبے قدموں... تپائی کے قریب جا کر اس نے ڈبیا سے زہریلی گولیاں نکال کر کوٹ کی جیب میں ڈالیں اور دوسری جیب سے خواب آور گولیاں نکال کر واپس ڈبیا میں ڈال دیں۔

وہ اپارٹمنٹ سے نکلا تو اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور ہتھیلیوں سے پسینہ پھوٹنے لگا تھا۔ لفٹ کے ذریعے نیچے آکر وہ فٹ پاتھ پر پہنچا۔ تازہ ہوا میں چند گہری گہری سانسیں لے کر اس کے اعصاب معمول پر آگئے۔ اس نے جب فٹ پاتھ پر چلنا شروع کیا تو اس کے تصور میں ایک بینک کا سیف ڈیپازٹ باکس بسا ہوا تھا۔ سڈ کو معلوم تھا کہ اس باکس میں انکل مورٹ نے اپنی تمام نقد رقم، بانڈز، شیئر سرٹیفکیٹس اور دیگر اثاثے رکھے ہوئے تھے۔ یہ سب چیزیں گویا منتظر تھیں کہ انہیں خرچ کیا جائے۔

وہ سوچ رہا تھا کہ یہ سب کچھ ملنے کے بعد ان تین برسوں کی تلافی ہو جائے گی جو اس نے ایک بیمار شخص کے ساتھ اپارٹمنٹ میں قید رہ کر نہایت صبر و تحمل سے برباد کیے تھے۔ انکل مورٹ نے اپنی تمام نقدی و املاک کا وارث سڈ کو ہی بنایا ہوا تھا۔ سڈ نے اسی لئے اتنے صبر و تحمل سے تین برس انتظار کیا تھا کہ کہیں انکل مورٹ اپنی وصیت تبدیل نہ کردیں۔

اب مزید انتظار کا اس میں حوصلہ نہیں رہا تھا۔ جوانی کے قیمتی برس بے ثمر نکلے جا رہے تھے۔ اب وہ اپنے تمام ارمان پورے کرنا چاہتا تھا۔ اب اس معاملے کو ذرا جلدی نمٹا دینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ اس نے تمام پہلوؤں پر غور کرلیا تھا۔ ڈاکٹر بلیک مین بتا چکا تھا کہ انکل مورٹ کسی بھی وقت دنیا سے رخصت ہو سکتے ہیں۔ اب اگر وہ مُردہ پائے جاتے تو ڈاکٹر سمیت یہ کسی کے لئے بھی حیرت کی بات نہ ہوتی۔ ان کی موت کو بیماری کا ہی نتیجہ سمجھا جاتا۔ قطعاً کوئی تحقیقات یا پوسٹ مارٹم نہ ہوتا۔ انکل مورٹ کی موت کسی کے لئے بھی غیر متوقع ثابت نہیں ہو سکتی تھی۔

ایک مناسب جگہ دیکھ کر اس نے زہریلی گولیاں جیب سے نکال کر گٹر میں پھینک دیں۔ وہ بہت خوش اور مطمئن تھا۔ اس کے منصوبے کی کامیابی کا راز اس کی سادگی تھی۔ اس نے زیادہ لمبے چوڑے انتظامات کرنے اور حد سے زیادہ چالاکی دکھانے کی کوئی

کوشش نہیں کی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ جو لوگ اس طرح کی کوششیں کرتے تھے وہی پکڑے جاتے تھے۔

ٹہلتا ہوا وہ خاصی دور نکل گیا۔ شام کے سائے گہرے ہو چلے تھے۔ اس نے اپنے آپ کو ڈاکٹر بلیک مین کے کلینک کے قریب پایا۔ سڈ کچھ سوچ کر مسکرایا اور آگے بڑھ کر اس نے کال بیل بجادی۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ کلینک میں اس وقت کوئی مریض نہیں تھا۔

گھنٹی کے جواب میں دروازہ خود ڈاکٹر بلیک مین نے کھولا اور خوش خلقی سے بولا "ہیلو سڈ! کیسے ہو؟ مورٹ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"انکل مورٹ سو رہے ہیں" سڈ نے جواب دیا "میں ذرا چہل قدمی کے لیے نکلا تھا۔ گلے میں کچھ تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ آپ کے کلینک پر نظر پڑی تو سوچا' دکھاتا چلوں۔"

"ضرور۔ ضرور" ڈاکٹر بلیک مین نے اسے معائنے کے کمرے میں لا کر اس کا گلا دیکھا اور کہا "کوئی خاص خرابی تو نظر نہیں آ رہی' بہرحال میں احتیاطاً گلے میں دوا لگا دیتا ہوں۔"

دوا لگوانے کے بعد سڈ بولا "آپ کا مریضوں کو دیکھنے کا وقت تو ختم ہو چکا ہے۔ کیوں نہ آپ بھی میرے ساتھ چہل قدمی کرنے چلیں۔ راستے میں ایک نظر انکل مورٹ کو بھی دیکھتے چلئے گا۔ دو دن سے انہیں کھانسی کے شدید دورے پڑ رہے ہیں جو انہیں بالکل نڈھال کر دیتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے... میں چلتا ہوں۔ چہل قدمی بھی ہو جائے گی اور انہیں بھی دیکھ لوں گا" ڈاکٹر نے اثبات میں سر ہلایا اور کوٹ پہننے لگا۔ ہیٹ سر پر رکھ کر وہ سڈ کے ساتھ گلی میں نکل آیا۔

اپارٹمنٹ کے دروازے پر پہنچ کر سڈ نے تالا کھولا اور ڈاکٹر کو پہلے اندر جانے کا موقع دیا۔ دروازہ وغیرہ بند کرنے کے بہانے وہ ذرا پیچھے ہی رہ گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ڈاکٹر ہی بیڈ روم میں پہلے داخل ہو۔ ڈاکٹر اپنے مخصوص پُرسکون اور پیشہ ورانہ انداز میں بیڈ روم کی طرف جا رہا تھا۔ چوکھٹ پر پہنچ کر اسے گویا جھٹکا لگا اور وہ حیرت زدہ سی آواز کے ساتھ تیزی سے کمرے میں داخل ہوا۔ سڈ اس کے پیچھے تھا۔

اس نے دیکھا' انکل مورٹ کمرے کے وسط میں چت پڑے تھے۔ ان کی بے نور آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں اور ہونٹوں کے گوشے سے خون کی پتلی سی لکیر بہہ کر خشک ہو چکی تھی۔ ان کے بے جان ہاتھ پیٹ پر جڑے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر بلیک مین نے جھک کر ان کا منہ سونگھا اور مڑتے ہوئے کہا "خدا کی پناہ۔ سڈ! معلوم ہوتا ہے تمہارے انکل نے خودکشی کرلی ہے۔"

"آپ... آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" سڈ نے پھنسی پھنسی سی آواز میں پوچھا۔

"ان کے مُنہ کی بُو اور دیگر علامات سے" ڈاکٹر بولا "مجھے یقین ہے کہ میں غلطی پر نہیں ہوں۔"

وہ اٹھ کر تپائی کے قریب پہنچا اور خواب آور گولیوں کی ڈبیا اٹھانے لگا تھا کہ اس کی نظر فرش پر پڑے ہوئے کاغذ پر پڑی۔ اس نے کاغذ اٹھا کر تیزی سے اس پر نظر دوڑائی۔ پھر ایک لفظ بولے بغیر وہ فون تک پہنچا اور ایک نمبر ڈائل کرنے کے بعد بولا "پولیس ہیڈ کوارٹرز؟ براہِ کرم شعبۂ قتل والوں کو اس ایڈریس پر بھیج دیجئے۔ یہاں ایک شخص کو قتل کر دیا گیا ہے۔"

اس نے ایڈریس لکھوایا اور فون بند کر دیا۔ سڈ دم بخود کھڑا تھا۔ بالآخر اس نے تھوک نگلا اور کھرکھراتی آواز میں کہا "قتل؟ مگر آپ تو کہہ رہے تھے کہ انکل مورٹ نے خودکشی کی ہے۔"

"میرا خیال تو یہی تھا" ڈاکٹر رُکھائی سے بولا "لیکن تمہارے انکل نے یہ رقعہ چھوڑا ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ وہ خودکشی کر رہے ہیں۔ اسے پڑھنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا ہے کہ انہوں نے خودکشی نہیں کی۔"

سڈ چکرا کر رہ گیا۔ خودکشی کا وہ کیسا خط تھا جسے پڑھ کر ڈاکٹر کی رائے بدل گئی تھی؟ ڈاکٹر نے رقعہ اسے تھما دیا۔ سڈ دھندلائی ہوئی سی نظروں سے اسے پڑھنے لگا۔ انکل مورٹ نے لکھا تھا:

"میں اپنی بیماری اور تکلیف سے تنگ آ گیا ہوں۔ بظاہر میں بہادر بنا رہتا ہوں اور ظاہر کرتا ہوں کہ مجھے زندگی کی بڑی طلب ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں تھک چکا ہوں۔ جب کسی کو میرا یہ رقعہ ملے گا اس وقت میرا جسم بیس منزل نیچے سڑک پر گوشت اور خون کے ملغوبے کی صورت میں پڑا ہو گا۔

میں زیادہ تعداد میں خواب آور گولیاں کھا کر بھی خودکشی کر سکتا تھا لیکن شاید میرے مخلص اور محبت کرنے والے بھتیجے سڈ کو پہلے ہی اس بات کا اندیشہ ہے۔ کچھ دیر پہلے وہ میرے کمرے میں آیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میں سو رہا ہوں۔ اس نے غالباً خواب آور گولیاں نکال کر ان کی جگہ کوئی بے ضرر سی گولیاں رکھ دی ہیں۔ سڈ بے چارہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ میں خواب آور گولیاں کھا کر خودکشی کروں۔ میں ذرا سی آنکھ کھول کر اس کی کارروائی دیکھ رہا تھا لیکن میں نے اسے خوش کرنے کے لئے اس کے سامنے ایک گولی کھالی ہے۔ میری وجہ سے اس بے چارے کی زندگی بھی خراب ہو رہی ہے۔ میری خودکشی ہم دونوں ہی کے لئے نجات کا باعث ہو گی۔ اب میں کھڑکی سے چھلانگ لگانے جا رہا ہوں۔ میری دعا ہے کہ سڈ کو میری موت کا زیادہ صدمہ نہ ہو۔

خدا حافظ۔

مورٹ

سڈ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ رقعہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

INVITATION TO A HANGING
GUY FLEMING

جاسوسی ڈائجسٹ: اپریل 1994

ناول سکیننگ و کمپوزنگ

محمد سجاد بھٹی

03045503086

خصوصی تعاون: جاسوسی نشست ایڈمن

ڈاکٹر حامد حسن۔ساگر زمان۔عقیل قریشی۔
ممتاز علی کیانی۔سیف الملوک عباسی۔
یاسر حسنین۔ناصر محمود بلوچ۔محمد
نعمان& صائم بھائی



تفتیش

شگفتہ شام

اس کا مسئلہ صرف یہی نہیں تھا کہ اس کی حسین بیوی قتل ہوگئی تھی بلکہ وہ ایسی صورتِ حال سے دوچار تھا جس کے باعث اس جرم میں اس کی اپنی گردن بھی پھنس رہی تھی لیکن بالآخر اُسے وہ بات سوجھ گئی جو قاتل کی نشان دہی کرتی تھی۔

اُس شخص کی کہانی جسے اپنی بیوی کے قاتل کی تلاش تھی

صبح کے ملگجے اُجالے میں وہ بڑی بے بس، لاچار اور معصوم لگ رہی تھی۔ جان اس کے چہرے پر نظریں جمائے جمائے ایک قدم پیچھے ہٹ آیا۔ وہ سفید لباس میں تھی جس پر بڑے سُرخ دائرے تھے۔ اس کے پیروں میں سفید جوتے تھے جن کی ایڑیاں سُرخ تھیں۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔

وہ اس کے بڑے فارم ٹرک کے پہیوں کے عین سامنے پڑی تھی!

ایسا لگتا تھا جیسے وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہی ہے۔ جیسے اس کی آنکھوں میں نیند بھری ہو۔ جیسے وہ خواب دیکھتے دیکھتے اچانک جاگی ہو۔ کبھی کبھی صبح سویرے وہ اسے ایسے ہی تکتی تھی۔

اس وقت جب وہ باہر جاکر روز مرّہ کے کام نمٹانے کے لیے کپڑے بدل رہا ہوتا تھا۔ ایسے میں اس کی آنکھیں پوری طرح کھلی ہوتیں۔ حالانکہ وہ پوری طرح بیدار نہ ہوتی۔

لیکن اس وقت یہ بات نہیں تھی۔ اس کی نگاہیں ساکت تھیں۔ اس کے چہرے پر ٹھنڈی اوس چمک رہی تھی۔ وہ مرچکی تھی۔ ایک پہیہ اس کے حلق پر سے گزرا تھا اور دوسرا اس کے ٹخنے کو روند گیا تھا۔ جان نے سوچا، اس کی ٹانگیں بالکل صحیح سلامت ہیں۔ زمین نرم تھی اور وہاں گھاس بھی تھی۔ ٹانگیں نرم مٹی میں دھنس گئی تھیں لیکن اس کی گردن ٹوٹ چکی تھی۔ حلق میں وہ چیز جو جینے میں، سانس لینے میں مدد کرتی ہے، جانے کیا کہلاتی

ہے وہ... شاید شہ رگ، وہ تباہ ہو چکی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اسے دیکھ رہی ہے لیکن وہ یہ بتانے کے قابل نہیں تھی کہ یہ کس کی حرکت ہے۔

جان کو ایسا لگا جیسے اس کی اپنی گردن ٹوٹ گئی ہے۔ اس کے گھٹنے جواب دینے لگے۔ جیسے ٹرک کے بھاری پہیے ان پر سے گزر گئے ہوں۔ اس نے بڑی کوشش کر کے اپنی نظریں لاش پر سے ہٹائیں۔ اس نے آہستگی سے اطراف کا جائزہ لیا۔ اسے ہر چیز سرخ نظر آرہی تھی۔ اسے یہ احساس بھی تھا کہ نامعلوم نگاہیں اسے دیکھ رہی ہیں۔ حالانکہ وہ ایک سنسان مرغزار تھا۔ سڑک بھی سنسان تھی جس پر آمدورفت کم ہی ہوتی تھی۔ اس کے اطراف میں پائن کے جنگل تھے۔ کچی سڑک اس مقام سے دو تین سو گز دور تھی۔ سڑک کے ایک طرف خاردار تاروں کی باڑھ تھی۔

اس کے ٹرک کا انجن خاموش ہو چکا تھا۔ اسے اس کو اسٹارٹ کرنا اور پھر دوبارہ سڑک پر لے جانا تھا۔ یہ کام لوگوں کے جاگنے سے پہلے ہی کر لینا تھا۔ بہتری اسی میں تھی کہ لاش دریافت کرنے کا کام کوئی اور کرے۔ وہ الگ تھلگ سی جگہ تھی۔ لاش دریافت ہونے میں کئی گھنٹے بلکہ کئی دن بھی لگ سکتے تھے۔ یہ بڑے تحمل کا کام تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ لاش کہاں پڑی ہے اور اس کے باوجود اسے زبان بند رکھنا تھی۔ اس نے سوچا، شام تک لاش دریافت نہیں کی گئی تو وہ یہ تجویز پیش کرے گا کہ اس مرغزار کو بھی دیکھ لیا جائے۔ اس سے زیادہ تو برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ بہت بھاری بوجھ تھا۔ بارہ گھنٹے اسے برداشت کرنا بھی بے حد اعصاب شکن کام تھا۔

ہوا ہلکی ہو گئی تھی۔ روشنی میلی چاندی کا چولا اُتار کر موتی جیسی ہو گئی تھی۔ ابھی صبح کا اُجالا مکمل طور پر نمودار نہیں ہوا تھا۔ تاہم اب وہ رات بھی نہیں تھی۔ وہ حیران ہو رہا تھا کہ کسی وقت اتنا سکوت اور خاموشی بھی ممکن ہے۔ اس نے سر گھما کر دیکھا۔ گھاس پر اس کے ٹرک کے پہیوں کے نشان بے حد نمایاں تھے۔ وہ باڑھ کے ٹوٹے ہوئے تاروں کے خلاؤں سے ٹرک گزار کر لایا تھا۔ وہ دو متوازی نشان تھے جو اس کے ٹرک تک نمایاں نظر آرہے تھے۔ لکیر کی صورت کے نشان! سامنے کے ٹائروں کے نشان مٹے مٹے تھے مگر عقبی ٹائروں کے نشان صاف تھے۔ وہ عقبی ٹائر اس نے ڈاک سے منگوائے تھے اور وہ اسے خاصے مہنگے پڑے تھے۔ وہ ٹائر مولی اور بچوں کی دوسری چیزوں کے ساتھ وہ گزشتہ صبح ہی فریٹ آفس سے وصول کر کے لایا تھا۔ گھر پہنچتے ہی اس نے ٹرک میں نئے ٹائر لگائے تھے۔ بچے تماشہ دیکھتے رہے تھے۔

گزشتہ دوپہر کو مولی عقبی پورچ کے سامنے پمپ کے پاس بیٹھی کچھ کپڑے دھو رہی تھی۔ اس کی کلائیاں بیسن میں تھیں اور صابن ملا پانی پورچ سے نیچے بہہ رہا تھا۔ اس نے کپڑے کھنگال کر نکالتے ہوئے جان سے پوچھا تھا۔ "جان... تمہیں ان نئے ٹائروں پر بڑا فخر ہے۔ ہے نا؟"

"ہاں۔ کیوں نہ ہو۔" جان نے ٹرک پر جھکے جھکے جواب دیا۔ "اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ پورے ملک میں ایسے ٹائر کسی کے پاس بھی نہیں ہوں گے۔ یہ آٹھ پلائی کے ٹریکٹر ٹائر ہیں جن کی پچاس ہزار میل کی گارنٹی دی گئی ہے۔ میں ساڑھے چھ سو ڈالر فی ٹائر بچا سکتا تھا اس خریداری میں لیکن میں دیرپا چیز خریدنے کا قائل ہوں۔"

"تم واقعی اسمارٹ آدمی ہو جان۔"

"وہ تو میں ہوں ورنہ تم سے شادی کیسے کرتا۔"

"اور تمہارے خیال میں میری گارنٹی کتنی ہے؟" مولی نے شوخ لہجے میں پوچھا تھا۔

"بس موت ہی ہمیں جدا کر سکتی ہے۔" جان نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

مولی نے کپڑے ایک طرف رکھے اور بیسن میں سے کوئی سیاہ کپڑا نکالا۔ جان نے اندازہ لگایا کہ وہ اس کا گہرا نیلا بلاؤز ہے جو بھیگا ہوا ہونے کی وجہ سے سیاہ لگ رہا تھا۔ مولی کے پاس سیاہ رنگ کا کوئی لباس نہیں تھا۔

مولی بہت ناخوش نظر آرہی تھی۔ شاید اسے افسوس تھا کہ جان نے اتنے مہنگے ٹائر خریدے۔ اتنی رقم میں تو بے شمار اچھی اچھی چیزیں خریدی جا سکتی تھیں۔

"تم کیا دھو رہی ہو جان؟" جان نے اس سے پوچھا۔

"اپنے اسٹاکنگس اور کچھ پرانی چیزیں۔" مولی نے جواب دیا۔

"ممکن ہے، میں جلد ہی تمہیں نائلون کے اسٹاکنگس خرید دوں۔ پھر تمہیں ریان کے ان موزوں کی اتنی احتیاط نہیں کرنی پڑے گی۔ میں نے کل مارتھا کو نائلون کے اسٹاکنگس پہنے دیکھا تھا۔ مجھے تو نہیں معلوم تھا کہ وہ نائلون کے موزے ہیں۔ مارتھا نے خود بتایا تھا۔ میرا خیال ہے، عورتوں کو ایسی چیزوں کا بڑا شوق ہوتا ہے۔"

"کیا مارتھا نے زیر جامہ بھی نائلون کا پہنا تھا؟" مولی نے پوچھا۔ وہ اکثر جان کو مارتھا کا نام لے کر چھیڑتی تھی۔ وہ محض مذاق تھا۔ مولی نے مارتھا سے کبھی رقابت محسوس نہیں کی تھی۔ صحیح بات یہ تھی کہ رقابت کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔

"یہ تو اس نے نہیں بتایا تھا ہنی۔" جان نے سادگی سے جواب دیا۔

اس پر مولی نے اپنے بال پیچھے ہٹاتے ہوئے کچھ کہا تھا جو جان نہیں سن سکا تھا۔ وہ پھر ٹرک کے پچھلے ٹائر کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ بچے بہت زیادہ شور کر رہے تھے۔ ممکن ہے، وہ انہیں ڈانٹ رہی ہو۔

یہ سب یاد کرتے ہوئے جان کو یہ خیال ستا رہا تھا کہ اب بچوں کا کیا ہو گا۔ کون ان کی دیکھ بھال کرے گا۔

اس کے گھٹنے بے جان ہو رہے تھے۔ گھٹنوں کے بے جان

ہونے کے بارے میں اس نے سن رکھا تھا لیکن اسے یہ سب کچھ بہت غیر فطری لگ رہا تھا۔ اپنی ٹانگوں کی کپکپاہٹ پر قابو پانا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس نے انہیں اکڑایا لیکن اگلے ہی لمحے وہ یوں مڑ گئے جیسے ان میں پانی بھرا ہو۔ اس نے ایک ہاتھ ٹرک کے ڈگارڈ پر رکھا اور ٹانگ کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ کی طرف بڑھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے ٹرک اسٹارٹ کر کے جلد از جلد گھر پہنچنا چاہیے۔

ہر طرف خاموشی تھی۔ مرغوں کی بانگ کی آواز بھی نہیں سنائی دے رہی تھی۔ شاید قریب ترین گھر بھی کم از کم میل دو میل بلکہ ممکن ہے، پانچ میل کے فاصلے پر ہو۔ مرغزار کے قریب والے جنگل میں لومڑیاں اور ایسے ہی چھوٹے موٹے جانور ہوں گے لیکن وہ بھی شاید ابھی حرکت میں نہیں آئے تھے۔

اچانک سڑک کی جانب سے کسی کار کی آواز سنائی دی۔ کار کی رفتار اس مقام پر پہنچ کر کم ہوئی جہاں باڑھ ٹوٹی ہوئی تھی۔ بالآخر کار رک گئی۔ اس کے ڈرائیور نے مرغزار میں کھڑے ٹرک اور جان کو دیکھ لیا تھا۔ کم از کم جان نے یہی سوچا۔ وہ ساکت وصامت کھڑا ہوا تھا۔ اس نے سوچا، ممکن ہے کار کے ڈرائیور کو مولی کا سفید لباس بھی نظر آ رہا ہو۔

کار مڑی اور ٹوٹی ہوئی باڑھ سے گزر کر مرغزار میں داخل ہوئی۔ وہ اس کے ٹرک کے پہیوں کے نشانات پر گزر کر آ رہی تھی۔ شاید یہ ناگزیر تھا کہ کار اسی راستے پر چلے۔ کوئی زمین کتنی ہی ہموار ہو، اس میں خفتہ نرم مقامات ضرور ہوتے ہیں۔ یا پھر گھاس کے بڑے ابھرے ہوئے مٹی ملے سخت گچھے۔ اسی لیے عام طور پر کاروں کو ایسے راستے پر ڈالا جاتا ہے جس پر دوسری گاڑیوں کے پہیوں کے نشان ہوں۔

آنے والی کار سیڈان تھی۔ اس کے ڈرائیور کو یہ خیال نہیں تھا کہ وہ جان کے پہیوں کے نشان مٹا رہا ہے۔ یا یہ احساس تھا تو اس کے نزدیک ان کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

جان نے سوچا، واقعی اس کی اہمیت ہی کیا تھی۔ اس کا ٹرک یہاں موجود ہے۔ وہ خود بھی یہاں موجود ہے۔ اس نے اپنی بائیں ہتھیلی ڈگارڈ پر ٹکا دی۔ اس کی نیند سے محروم سرخ آنکھیں جل رہی تھیں۔ اس کا داہنا ہاتھ ڈھیلے ڈھالے انداز میں ایک طرف لٹکا ہوا تھا اور اس میں کوئی چیز دبی ہوئی تھی۔ اسے اچانک ہی احساس ہوا کہ وہ ٹائر تبدیل کرنے والی سلاخ تھی۔ اسے احساس بھی نہیں تھا اور اب اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اسے ٹرک کے عقبی حصے میں رکھ دیتا جہاں وہ عام طور پر رکھی رہتی تھی بلکہ اس سے تو اتنا بھی نہ ہو سکا کہ ہاتھ کھول کر سلاخ کو گھاس پر گرا دے۔

سیڈان کے ڈرائیور نے کار بالکل ٹرک سے ملا کر روک دی۔ پھر وہ دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ وہ بھاری بھرکم، جوان آدمی تھا۔ اس کے جبڑے بھاری تھے اور سیاہ آنکھوں سے چوکنا پن جھلک رہا تھا۔ وہ سیاہ سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ ملائم کپڑے کی سفید قمیص کے اوپری بٹن کھلے ہوئے تھے۔ کالر سے سیاہ نکٹائی جھول رہی تھی۔ اس کا قد جان سے کم از کم چار پانچ انچ زیادہ تھا۔ اس کی چال سے پھرتیلے پن کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ پچیس سال رہی ہوگی۔ یعنی وہ جان سے دس بارہ سال چھوٹا تھا۔ وہ بہت تازہ دم لگ رہا تھا۔ لگتا تھا، رات اچھی طرح سویا ہے۔

نو وارد نے اپنا ہیٹ پیچھے کی طرف دھکیلا۔ اس کی قمیص کی جیب پر ایک بیج لگا ہوا تھا۔ داہنی جانب ہولسٹر تھا جس میں سے سیاہ ریوالور جھانک رہا تھا۔ اس کی بیلٹ سے لٹکی ہوئی ہتھکڑیوں کی جوڑی جھول رہی تھی۔ اس نے جان کی طرف ایک مختصر سی نگاہ اچھالی پھر اس نے ٹرک کے سامنے پڑی ہوئی نسوانی لاش کو بہت غور سے دیکھا۔

"کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔ "کیا یہ ٹرک کے نیچے آ گئی ہے؟"
جان نے تھوک نگلتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں...."
"دیکھنے سے تو لگتا ہے کہ اسے دانستہ ٹرک سے کچلا گیا ہے۔"
نو وارد نے عام سے لہجے میں تبصرہ کیا۔ پھر وہ لاش کے پاس اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس نے چھوئے بغیر اس کا معائنہ کیا۔ اس کی نگاہوں میں چوکنا پن تھا۔ "میرا نام کلاڈ ہے۔ رائے کلاڈ۔" اس نے کہا "میں بومربرگ کا ڈپٹی ہوں۔ آج صبح کار چوری ہونے کے ایک کیس کی



سماعت ہے۔ میں اسی سلسلے میں عدالت جارہا ہوں۔ بس یونہی میں اس عقبی سڑک پر نکل آیا۔ ایک سال میں پہلا موقع ہے میرا اس سڑک پر سفر کرنے کا۔ یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہاں اس قسم کی صورتِ حال سے واسطہ پڑے گا۔"

"یہ تو کوئی بھی نہیں سوچ سکتا۔" جان نے بمشکل کہا۔

"ہاں بھئی۔ اسے تو قتل کیا گیا ہے" چند لمحوں کے توقف کے بعد ڈپٹی شیرف نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔ "اس میں تو شک و شبے کی گنجائش ہی نہیں۔ اس کی گدی سے خون نکلا ہے اور بال لتھڑ گئے ہیں۔ ٹائر بدلنے والی سلاخ سے یا ایسی ہی کسی چیز سے اسے مارا گیا ہے۔ موت کے بعد اس پر گاڑی چڑھائی گئی ہے۔" وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر اس نے جان سے پوچھا "تم جانتے ہو' یہ کون ہے؟"

"ہاں۔" جان بنٹریگ نے پھر تھوک نگلا۔ "اس کا..... اس کا نام مولی بنٹریگ تھا۔ یہ جیفرسن ول کے علاقے میں رہتی تھی۔ تمہیں یہ نام عجیب سا لگ رہا ہوگا..... بنٹریگ۔ سنا ہے کہ یہ اسکاٹ نام ہے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ بہرحال یہ میری بیوی ہے۔"

"تمہاری بیوی!" ڈپٹی شیرف نے بڑی بے یقینی سے کہا اور تیز نظروں سے اسے دیکھا۔ "یعنی... یعنی تم اس کے شوہر تھے؟"

"ہاں۔ یہ درست ہے۔" جان نے کہا۔ اس کے لیے اب اپنے پیروں پر کھڑا رہنا بہت مشکل ہوگیا تھا۔ اس کی ٹانگیں بری طرح کانپ رہی تھیں۔ اس کا گلا خشک ہو رہا تھا اور زبان پر کانٹے اُگ آئے تھے۔ اس نے اپنے گلے کے کنٹھے کو بائیں ہاتھ سے سہلایا۔

"بہت افسوس ناک صورتِ حال ہے۔" ڈپٹی کے لہجے میں صحیح معنوں میں ہمدردی تھی۔ "وہ تمہاری بیوی تھی۔ میں تو سمجھا تھا کہ تم اجنبی ہو اور اتفاقاً یہاں سے گزر رہے تھے۔ میں شادی شدہ تو نہیں ہوں لیکن تمہاری کیفیت سمجھ سکتا ہوں۔ تمہاری بیوی... تمہیں تو اس سے محبت ہوگی... اُف... تمہارے لیے تو یہ بہت خوف ناک شاک ہوگا۔"

"ہاں۔" جان بنٹریگ کو اپنا گلا رُندھتا محسوس ہوا۔ "ہم لڑتے جھگڑتے بھی تھے۔ جھگڑے تو میاں بیوی میں ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ہمارے پڑوسی بھی جانتے ہیں کہ ہم جھگڑتے تھے مگر یہ سچ ہے کہ وہ میرے لیے بہت اہمیت رکھتی تھی۔"

"ہاں بھئی' میاں بیوی جھگڑتے تو ہیں۔" ڈپٹی نے کچھ بے ڈھنگے پن سے کہا۔ "جھگڑے نہ ہوں تو عجیب نہیں لگے گا مگر میں ابھی تک حیران ہوں کہ یہ تمہاری بیوی تھی۔ سنو مسٹر' تمہارے بچے بھی ہوں گے؟"

"ہاں۔ تین بچے ہیں میرے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی۔"

"اور اب ان کی نگہداشت کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔" ڈپٹی نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "بھئی بہت افسوس ناک بات ہے۔ مسٹر بنٹریگ' مجھے افسوس ہے.... ہمدردی ہے تم سے۔ یہ بتاؤ' یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے؟"

"میں... میرا خیال ہے کہ...." جان بنٹریگ نے پھر تھوک نگلا.... "میں مارتھا کو کچھ عرصے کے لیے ان کی نگہداشت کے لیے آمادہ کرلوں گا۔ اسے بچے اچھے نہیں لگتے لیکن میرا خیال ہے' میری خاطر شاید وہ انہیں گوارا کرلے۔"

"یہ مارتھا کون ہے؟"

"مارتھا ٹرنر۔ اسی سڑک پر ہمارے مکان کے بعد اسی کا مکان ہے۔" جان نے اپنا گلا سہلاتے ہوئے کہا۔ "وہ خود بھی ابھی بچی ہی ہے۔ صرف ۱۹ سال کی ہے وہ اور دیکھنے میں اتنی بھی نہیں لگتی۔ سیاہ گھونگریالے بال اور خوبصورت نیلی آنکھیں۔ وہ بڑی خوش باش لڑکی ہے۔ مولی سے بہت محبت کرتی تھی وہ۔" اس نے لاش کی طرف اشارہ کیا "مولی اکثر یہ ظاہر کرتی تھی جیسے مارتھا سے رقابت محسوس کرتی ہے مگر بس مذاق ہوتا تھا وہ۔ مارتھا لاابالی سی مگر ہے تو عورت۔ میرا خیال ہے' میں اسے بچوں کا خیال رکھنے کے لیے راضی کرلوں گا۔ بشرطیکہ پڑوسی باتیں نہ بنائیں۔"

"ہر جگہ' کہیں نہ کہیں ایک اور عورت ضرور ہوتی ہے۔" ڈپٹی نے بے دھیانی سے کہا۔ "میرا مطلب ہے' بچوں کے سلسلے میں مدد کرنے والی۔ روئے زمین پر اگر ایک جوڑا بھی موجود ہو تو مجھے یقین ہے کہ بیوی کی موت کے بعد خاوند تنہا پھر بھی نہیں ہوگا۔ کہیں نہ کہیں سے ایک اور عورت ضرور نمودار ہوجائے گی۔"

لیکن انداز سے لگتا تھا کہ اپنی باتوں کے برعکس ڈپٹی شیرف اس مسئلے کو اتنی اہمیت نہیں دے رہا ہے۔ اس نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک پینسل اور نوٹ بک نکال لی تھی۔ نوٹ بک گھٹنے پر رکھ کر غالباً اس نے تفصیلات نوٹ کرنا شروع کردیں۔

جان بنٹریگ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

"مولی بنٹریگ... مسز بنٹریگ۔ سکونت جیفرسن ول کے قریب۔" ڈپٹی شیرف لکھتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔ "عقب سے سر پر ٹائر تبدیل کرنے والی سلاخ یا ایسی ہی کسی چیز سے وار کیا گیا۔ پھر کار کے اگلے پہیے اس پر چڑھا دیے گئے۔ لاش شوہر نے دریافت کی۔" اس نے اچانک سر اٹھا کر چوکنا نظروں سے جان بنٹریگ کو دیکھا۔ اس کی پینسل ساکت ہوگئی تھی۔

جان بنٹریگ اب نڈھال ہوچکا تھا۔ اس نے ٹرک سے ٹیک لگالی۔ سلاخ اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اب سوال داغا جانے والا ہے۔

"مسٹر بنٹریگ! آپ نے لاش کس وقت دریافت کی؟" ڈپٹی شیرف نے پوچھا۔

جان نے گہرا سانس لے کر اپنی ٹانگیں اکڑا لیں۔ کھڑے رہنے کے لیے یہ بہت ضروری تھا۔ اس نے سوچا' ابھی وہ مرحلہ

اگرچہ نہیں آیا لیکن آئے گا ضرور۔ آنے ہی والا ہے شاید۔
"میرے پاس گھڑی نہیں ہے۔" اس نے بے تاثر لہجے میں کہا۔ "بس اتنا جانتا ہوں کہ صبح کی سپیدی پھوٹ رہی تھی۔ ممکن ہے' دس منٹ پہلے یا آدھا گھنٹا پہلے۔۔۔ یا ایک گھنٹا ہوگیا ہو۔ میں یقین سے نہیں بتا سکتا۔ میرے ہوش و حواس جواب دے گئے تھے۔"

"میں پونے پانچ لکھ لیتا ہوں۔" ڈپٹی نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "میرا خیال ہے' اس سے کوئی فرق بھی نہیں پڑتا۔ شوہر نے پونے پانچ بجے لاش دریافت کی۔" وہ پھر لکھنے لگا۔ "ڈپٹی شیرف کلاڈ پانچ بج کر تین منٹ پر موقعے پر پہنچا اور جائے واردات کا معائنہ کیا۔ قدموں کے نشان ناموجود' ٹائروں کے نشان بھی ناموجود۔ نائلون کے اسٹاکنگس کے دھبوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ نشانات مٹا دیے گئے ہوں گے۔ گھاس پر ٹائروں کے نشان شاید رہے ہوں گے مگر شوہر کے ٹرک اور ڈپٹی کی کار کی وجہ سے مٹ گئے ہوں گے۔ آلۂ قتل جائے واردات پر موجود نہیں تھا۔ وہاں کوئی ایسی چیز موجود نہیں تھی جس سے قاتل کی شناخت میں مدد ملے۔" اس نے پینسل روکی اور سر اٹھایا۔ "یہ ہے صورتِ حال مسٹر بنٹریگ۔"

ڈپٹی نے نوٹ بک اور پینسل جیب میں رکھ لی۔ اس نے ہیٹ ٹھیک طور سے سر پر جمایا اور ایک لمحے لاش کی بے نور آنکھوں میں دیکھتا رہا۔

جان بنٹریگ نے پھر تھوک نگلا۔ "یہ نائلون کے ہیں؟" اس نے ڈپٹی سے پوچھا۔

"کس چیز کی بات کر رہے ہو؟"

"اسٹاکنگس کی۔"

"ہاں۔ یہ نائلون کے ہیں۔ تم کیا سمجھ رہے تھے؟"

"میں تو انھیں ریان کے سمجھتا تھا۔" جان نے کہا۔ "اسٹاکنگس کی جوڑی میں نے اسے پچھلے کرسمس پر خرید کر دی تھی۔ میں تو اب تک انھیں ریان ہی سمجھتا رہا ہوں لیکن آج رات مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ نائلون کے ہیں۔"

"تمام عورتیں نائلون کے اسٹاکنگس کی خواہش کرتی ہیں۔" ڈپٹی نے میکانیکی لہجے میں کہا۔ پھر اس نے ہیٹ پیچھے کی طرف دھکیلا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے نظریں لاش کے چہرے سے ہٹالی تھیں۔

"یہ کس کی حرکت ہوسکتی ہے؟" ڈپٹی بڑبڑایا۔ اس کے دونوں ہاتھ کمر پر تھے اور وہ جان بنٹریگ کے زرد چہرے اور سرخ آنکھوں کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا ہے۔ "مسٹر بنٹریگ' تمہارے خیال میں یہ کس کا کام ہوسکتا ہے؟ میرا مطلب ہے۔" ڈپٹی کہتے کہتے رکا اور اس نے وضاحت کی۔ "دیکھو نا' اسے کسی نے لوٹنے کی غرض سے قتل نہیں کیا ہوگا۔ کیونکہ میرے خیال میں نہ اس کے پاس قیمتی زیورات ہوں گے اور نہ ہی نقد رقم ہوگی۔ شادی کی انگوٹھی اس کی انگلی میں موجود ہے۔ پرس میں بس چند سکے ہوں گے۔ میرے خیال میں یہ کسی جنونی کا کام بھی نہیں ہوسکتا۔ وہ اسے قتل کرنے کے لیے بہلا پھسلا کر اتنی دور اس سنسان مقام پر کیسے لا سکتا تھا۔ یہ یقیناً مزاحمت کرتی۔۔۔ شور مچاتی۔۔۔ قاتل کوئی ایسا شخص رہا ہوگا جسے یہ جانتی تھی اور جو اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہوگا۔ شاید اس لیے کہ وہ کسی کم عمر لڑکی کی محبت میں گرفتار ہوگیا تھا اور ممکن ہے' یہ بھی یہ بات جان گئی ہو۔ اور اس کے راستے میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہوگئی ہو۔ امکان یہی ہے کہ وہ شخص گاڑی میں بٹھا کر اسے یہاں لے آیا ہوگا۔ ٹائر بدلنے والی سلاخ یا ایسی ہی کوئی چیز اس نے برابر والی سیٹ پر رکھی ہوگی تاکہ اس کا حصول مسئلہ نہ بنے۔ پھر اس نے اس کے ساتھ محبت کا کھیل کھیلا ہوگا اور اس کے بعد اس چیز سے اس کے سر پر وار کیا ہوگا۔ اس کے بعد اس نے اسے گاڑی کے سامنے ڈال کر سامنے والے پہیے اس کے اوپر سے گزار دیے ہوں گے پھر اس نے سوچا ہوگا کہ لاش کو اس کے گھر کے قریب کسی گڑھے میں ڈال دے گا۔ یہ تاثر دینے کے لیے کہ گھر آتے ہوئے یہ کسی گاڑی کی زد میں آگئی اور ڈرائیور اسے قریبی گڑھے میں ڈال کر چلتا بنا۔" نوجوان ڈپٹی نے چند لمحے توقف کیا اور اس دوران جان کو کڑی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ "لیکن سب کچھ کر چکنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ یہ بات نہیں بنے گی۔ پہیہ جس طرح سے اس کے حلق پر سے گزرا ہے اس سے یہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پہیہ گزرتے وقت یہ بے ہوش رہی ہوگی یا ممکن ہے مر چکی ہو۔ اور یہی حقیقت بھی ہے۔ قاتل کو یہ احساس بھی ہوگا کہ اس کے لباس پر مرغزار کی مٹی اور گھاس کے دھبے بھی ملیں گے۔ شاید اسے اور بھی سیکڑوں باتوں کا خیال آیا ہوگا جو قتل سے پہلے اسے نہیں سوجھی ہوں گی۔" اس نے پھر توقف کیا اور گہری سانس لے کر بولا۔ "یہ بات طے ہے کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ صورتِ حال کو سمجھنے کے بعد قاتل کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا ہوگا کہ وہ لاش یہیں چھوڑ دے اور خود گھر جا کر یوں سکون سے سو جائے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ یہاں تک کہ لاش کوئی اور دریافت کرے۔ اس کا اندازہ ہوگا کہ لاش دریافت کرنے میں خاصی دیر لگے گی۔ ممکن ہے' کئی دن لگ جائیں کیونکہ اس سڑک سے لوگ کم ہی گزرتے ہیں۔ اپنی کار میں واپس جاتے ہوئے اس نے سوچا ہوگا کہ چند گھنٹوں میں اس کے ٹائروں کے نشان مٹ جائیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی اور گاڑی اس طرف آئے تو اس کی گاڑی کے ٹائروں کے نشان مٹا دے۔" اس نے ہیٹ کو پھر پیچھے کی طرف دھکیلا۔ "اور اب مسٹر بنٹریگ' مجھے تم سے صرف ایک بات پوچھنی ہے۔"

جان بنٹریگ نے پھر اپنے گھٹنے اکڑائے جو اب بھی بے جان ہو رہے تھے۔ اس نے ٹرک کے بونٹ سے ٹیک لگاتے ہوئے پاؤں

مضبوطی سے جمالے۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے کی ہر چیز تیرتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے بائیں ہاتھ سے اپنے حلق کو سہلایا۔ اس کے سیدھے ہاتھ کی پشت پر ایک گہری خراش تھی۔ اسے ہرگز یاد نہیں تھا کہ یہ چوٹ اسے کب اور کیسے لگی۔ سلاخ اس نے اسی ہاتھ میں تھامی ہوئی تھی۔ اسے احساس ہوا کہ خراش سے خون اب بھی رس رہا ہے۔ رستا ہوا خون شاید ہتھیلی تک بھی پہنچا تھا اور سلاخ پر بھی لگا تھا۔ اس کا احساس اسے چپچپاہٹ سے ہوا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ سوال کس شکل میں نازل ہو گا لیکن ہو گا ہی۔

"بس ایک سوال مسٹر بٹریگ۔" ڈپٹی نے دہرایا۔ "اگرچہ اس موقعے پر وہ بہت بے رحمانہ معلوم ہو گا لیکن یہ سوال میں نے نہیں کیا تو کوئی اور کرے گا۔ یہ سوال اس وقت تک کیا جاتا رہے گا جب تک سب کچھ صاف نہیں ہو جاتا۔ دیکھو، تم قانون کے محافظوں کی ذمے داری تو سمجھتے ہو نا۔ ہمیں ذاتی جذبات اور احساسات سے ہٹ کر سوچنا پڑتا ہے۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں مسٹر بٹریگ کہ آپ نے کسی سے اپنی بیوی کی آوارگی کے... اس کے کسی شخص سے تعلقات کے بارے میں تو نہیں سنا؟ کوئی ایسا شخص جس کے لیے وہ تم سے بے وفائی کر رہی ہو۔" وہ کہتے کہتے رکا، چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا "یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بے وفائی کر رہی ہو اور یہ بات تمہارے علم میں نہ ہو۔ ایسا بھی ہوتا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ایسا کوئی شخص ضرور رہا ہو گا۔ اس لیے کہ صرف اسی کے پاس اس قتل کا محرک تھا۔ ایک بات بتاؤ مسٹر بٹریگ۔ بیوی سے کبھی تمہیں اس کے بارے میں کوئی اشارہ بھی نہیں ملا کہ وہ کون ہے؟ میں شرمندہ ہوں کہ میں نے اتنی بے رحمی سے ایسا سوال کیا۔"

"میں جانتا ہوں کہ تمہیں پوچھ گچھ کرنی ہے۔" جان بٹریگ نے اپنے حلق کو سہلاتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے سوال کا جواب اثبات میں دوں گا۔ میرا خیال ہے کہ وہ چھپ کر کسی سے ملتی تھی۔ وہ مجھ سے بے وفائی کر رہی تھی۔ وہ رات کے کھانے کے بعد گاؤں جاتی تھی۔ ہفتے میں دو تین بار ایسا ضرور ہوتا تھا۔ گاؤں ہمارے گھر سے دو تین میل کے فاصلے پر ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ لائبریری جاتی ہے۔ مطالعے کا اسے ہمیشہ سے شوق تھا۔ میں اسے ٹرک میں نہیں لے جا سکتا تھا کیونکہ بچوں کو اکیلے نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ وہ جاتی تھی تو میں ان کے پاس رہتا تھا۔ میں اس کی واپسی سے پہلے سو جاتا تھا۔ اب مجھے لگتا ہے کہ وہ لائبریری نہیں جاتی ہو گی۔ اس کا وہ بوائے فرینڈ راستے سے اسے اُچک لیتا ہو گا۔ اسے اپنی کار میں بٹھا کر لے جاتا ہو گا۔ بلکہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ مجھے اس بارے میں کل رات ہی پتا چلا تھا۔" اس نے پھر بائیں ہاتھ سے اپنے حلق کو سہلایا۔ کوئی چھوٹی سی بات تھی، وہ اسے یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن دشواری یہ تھی کہ بہت سی ایسی باتیں تھیں جنہیں وہ بھول جانا چاہتا تھا۔ اس نے بے تاثر لہجے میں سلسلۂ کلام جوڑا۔ "ایک بچے کے رونے کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی تھی۔ اس کے جسم سے کمبل اُتر گیا تھا اور وہ سردی کی وجہ سے رو رہا تھا۔ مولی ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتی تھی۔ وہ واپس آتی تو انہیں ٹھیک سے کمبل اُڑھاتی لیکن رات وہ واپس آئی ہی نہیں تھی۔ صحن میں چاندنی دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ بہت دیر ہو گئی ہے۔ میں نے کھڑکی کے پاس گھڑی لے جا کر وقت دیکھا۔ ایک بجا تھا۔ میں نے لیمپ جلایا، کپڑے بدلے، جوتے پہنے اور سڑک پر چلا آیا مگر وہ مجھے آتی نظر نہیں آئی۔ میں گاؤں کی طرف چلتا رہا۔ کوئی چوتھائی میل دور ٹرنر کا مکان ہے۔ اس کے سامنے والے پورچ میں مجھے کوئی سفید سی چیز نظر آئی۔ اس کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ میں واپس چلا آیا۔ میں نے بچوں کو ٹھیک طرح سے ڈھانپا۔ شب خوابی کے نئے لباس میں وہ بہت پیارے لگ رہے تھے۔ میں نے سوچا، وہ بھی ہوتی اور انہیں دیکھتی تو کتنا خوش ہوتی۔ یہ نئے لباس میں ٹرک کے ٹائروں کے ساتھ لایا تھا۔ لڑکوں کے لیے سفید دھاریوں والے گلابی کپڑے اور بیٹی کے لیے نیلا لباس جس پر سفید بٹنیں بنی تھیں۔ مولی کھانا کھاتے ہی چلی گئی تھی۔ اس نے بچوں کو ان کپڑوں میں نہیں دیکھا تھا۔ پھر اسی وقت مجھے نائلون کے اسٹاکنگس کا خیال آگیا۔ کل مولی کا برتھ ڈے ہے۔ میرا مطلب ہے، آج وہ زندہ ہوتی تو ۲۹ سال کی ہو جاتی۔ میں نے اس کے لیے نائلون کے اسٹاکنگس کا آرڈر دیا تھا۔ سوچا تھا، وہ دیکھے گی تو خوش ہو گی۔ نائلون کے اسٹاکنگس تو اسے کبھی ملے ہی نہیں تھے۔" جان کا گلا خشک ہو گیا تھا۔ اس نے پھر تھوک نگلا۔ "میں نے اسٹاکنگس کو ٹرک میں ہی چھوڑ دیا تھا۔ سوچا تھا، صبح اسے دوں گا پھر مجھے خیال آیا کہ انہیں لے جا کر مولی کی دراز میں رکھ دوں، اس دراز میں وہ اپنی چیزیں رکھتی ہے۔ پھر صبح کسی بہانے سے...... یہ کہہ کر اس سے دراز کھلواؤں کہ رات میں نے دراز میں چوہیا کی اچھل کود کی آواز سنی تھی۔ وہ جلدی سے دراز کھولے گی، چیزیں نکالے گی اور اسٹاکنگس دیکھ کر حیران رہ جائے گی۔

"سو میں موزوں کا لفافہ ٹرک سے نکال کر گھر میں لے آیا۔" جان بدستور بے تاثر لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "میں نے مولی کی دراز کھولی اور اوپر رکھی ہوئی کچھ چیزیں نکالیں۔ اس کے موزے، اس کے بلاؤز اور اسکرٹ جو اس نے خود سیے تھے۔ اس کے ریان کے اسٹاکنگس بھی اسی دراز میں ہوتے تھے لیکن میرا خیال تھا کہ وہ انہیں پہن کر گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے پاس اسٹاکنگس تھے ہی نہیں۔" اس نے پھر تھوک نگلا۔ "لیکن دراز میں درجنوں اسٹاکنگس موجود تھے۔ وہ دراز کے نچلے حصے میں چھپا کر رکھے گئے تھے۔ وہ سب ریان کے اسٹاکنگس کے رنگ کے تھے لیکن وہ زیادہ ہموار اور چکنے تھے۔ چھونے سے پتا چلا کہ وہ بالکل ویسے ہی تھے...... نائلون کے، جیسے میں اس کے لیے اب خرید کر لایا تھا۔

اسٹاکنگس کے علاوہ وہاں نائلون کے متعدد زیر جامے اور دوسری چیزیں بھی تھیں۔ جھالر والی سلک اور نائلون کی چیزیں۔

میں تو ہل کر رہ گیا۔ کچن کی الماری میں شراب کی بوتل رکھی تھی جو میرے ہم زلف نے گزشتہ موسم گرما میں مجھے لا کر دی تھی۔ مجھے پینے کا شوق نہیں اس لیے بوتل ویسی ہی رکھی تھی۔ اس پریشانی میں مجھے پینے کے علاوہ کچھ سوجھا ہی نہیں۔ میں پینے لگا۔ پھر میں نے سوچا، مجھے جا کر اسے تلاش کرنا چاہیے۔ میں نے شرٹ پہنی، کوٹ پہنا اور ماچس کچن میں ایسی جگہ رکھ دی جہاں بچوں کا ہاتھ نہیں جا سکتا تھا۔ اسی لمحے مجھے ایسا لگا جیسے عقبی پورچ میں وہ مجھے نظر آئی ہے لیکن وہ نہیں تھی۔ چاندنی حرکت کرتی ہے تو آدمی کو سائے حرکت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔" جان بٹریگ نے اپنے گلے کے کنٹھے کو سہلایا۔ "میں نے ٹرک اسٹارٹ کیا اور ٹرک میں بیٹھ کر گاؤں کی طرف چل دیا۔ ٹرنر کے پورچ کے قدمچوں پر مجھے کوئی بیٹھا نظر آیا۔ وہ مارتھا تھی جو شب خوابی کا لباس پہنے بیٹھی تھی۔ ہیلو مسٹر بٹریگ، اس نے نیچی آواز میں مجھے پکارا۔ اتنی رات کو تم کہاں جا رہے ہو؟ مسز بٹریگ کا کیا بنا؟

میں نے ٹرک روک دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ افواہیں پھیلیں اور باتیں بنیں۔ کیا مطلب ہے تمہارا؟' میں نے مارتھا سے پوچھا۔

"کچھ دیر پہلے میری آنکھ کھل گئی اور میں یہاں آبیٹھی،' مارتھا نے بتایا۔ چاندنی بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ میں نے سڑک کی طرف دیکھا۔ مجھے لگا کہ کوئی تمہارے گھر میں داخل ہوا ہے۔ میں نے سوچا، شاید مسز بٹریگ واپس آئی ہوں گی۔'

"نہیں، مارتھا۔ تم نے مجھے دیکھا ہوگا۔ مولی تو دس بجے سے گھر میں ہی ہے،' میں افواہوں سے بچنا چاہتا تھا۔

مجھے چاندنی سے عشق ہے،' مارتھا نے کہا۔ اس کی خاموشی کتنی پُراسرار ہوتی ہے۔ میں نے تمہارے گھر میں لیمپ جلتے.... اور پھر بجھتے دیکھا۔ میں نے عقبی دروازہ بند ہونے کی آواز سنی اور پھر شاید تم نے کچھ کہا۔ شاید یہ کہ.... مولی، یہ تم کیا کرتی پھر رہی ہو۔ تمہاری آواز میں غصہ تھا۔ پھر میں نے ٹرک اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ میں نے سوچا، شاید مسز بٹریگ کی طبیعت خراب ہے اور تم ڈاکٹر کو لینے جا رہے ہو۔

نہیں، میں نے کہا۔ وہ تو میں سمجھا تھا کہ وہ عقبی پورچ میں نکل آئی ہے مگر وہ انگور کی بیلیں تھیں جو چاندنی میں حرکت کر رہی تھیں۔ اور میں اپنے نئے ٹائروں کو رواں کرنے کے لیے نکلا ہوں، پھر جانے مجھے کیا ہوا۔" جان بٹریگ نے پھر تھوک نگلا۔ "اس چاندنی میں وہ اتنی پیاری لگ رہی تھی۔ میں نائلون کے وہ اسٹاکنگس اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ وہ سیٹ پر رکھے تھے۔ میں نے بے سوچے سمجھے اس سے کہا۔ 'مارتھا' میرے پاس نائلون کے

لیتے ہیں جو لڑکی کو ملنے سے پہلے اپنے بال درست کرنے لگے وہ جوان اور جو نہ کرے، سمجھ لیں وہ بوڑھا ہو گیا۔ حالانکہ جوانی میں بندہ بال درست تو کرتا ہے مگر ملنے کے بعد اور جہاں تک بڑھاپے کا تعلق ہے، اس میں بال درست کرنے کے لئے لڑکی کا ہونا اتنا ضروری نہیں جتنا بالوں کا۔"

ڈاکٹر یونس بٹ کی کتاب

"شیطانیاں" سے ایک اقتباس

اسٹاکنگس ہیں۔ لوگی؟" وہ اٹھی اور ٹرک کے پاس چلی آئی۔ اس نے لفافے میں سے اسٹاکنگس نکال کر ان کا جائزہ لیا اور بولی۔ "واہ مسٹر بٹریگ، تمہیں اپنا کام نکالنا خوب آتا ہے۔ یہ بتاؤ، مجھے یہ رشوت کس لیے دے رہے ہو؟ کیا تم نے مسز بٹریگ کو قتل کر دیا ہے اور اب چاہتے ہو کہ میں اپنی زبان بند رکھوں؟"" جان نے پھر تھوک نگلا۔ "وہ بس مذاق کر رہی تھی۔ اس کی عادت ہے مذاق کی۔ اس نے تصور بھی نہیں کیا ہوگا کہ مولی سچ مچ مر چکی ہے۔ اس نے ٹرک کے عقبی حصے کی طرف اشارہ کیا اور بولی۔ 'واقعی تم نے انہیں قتل کر دیا ہے اور اب ٹرک میں ڈال کر دفن کرنے کے لیے لے جا رہے ہو۔ یہی بات ہے نا مسٹر بٹریگ؟" میں نے کہا ہم ٹھیک کہہ رہی ہو مارتھا۔ اب تم سے جھوٹ بولنے کا کیا فائدہ۔ وہ تمہارا نام لے کر مجھے طعنے دیتی تھی۔ میں نے اس کے سر پر سلاخ رسید کر کے اس کا کام تمام کر دیا ہے۔ اب وہ مر چکی ہے۔ میرے تمہارے ملن کے راستے میں اب کوئی رکاوٹ نہیں۔ کہو۔ نیاگرا آبشار بھاگ چلیں، میں بھی اس سے مذاق کر رہا تھا۔"

ڈپٹی شیرف اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں چوکنا پن تھا۔ "بس مسٹر بٹریگ! اتنی سی بات۔ میں تو سمجھا تھا کہ تم مجھے اس شخص کے بارے میں بتاؤ گے جس سے تمہاری بیوی چھپ چھپ کر ملتی تھی لیکن تم تو یقین سے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ایسے کسی شخص کا وجود بھی ہے۔ ممکن ہے، تمہاری بیوی نے اسٹاکنگس اور وہ چیزیں خود خریدی ہوں۔ عورتیں گھر کے خرچ میں سے بچاتی بھی تو ہیں۔ اب یہاں اس کی لاش پڑی ہے۔ یہ یقینی طور پر قتل کا کیس ہے۔ تم نے اتنا کچھ بتایا مگر اس سے قاتل کے بارے میں تو بالکل اندازہ نہیں ہوتا۔ یہ بھی ثابت نہیں ہوتا کہ اس کا کوئی بوائے فرینڈ تھا اور وہ تم سے بے وفائی کر رہی تھی۔"

"یہ تو طے ہے کہ وہ بے وفائی کر رہی تھی۔" جان بٹریگ نے بے تاثر لہجے میں کہا۔ "اور یہ بھی طے ہے کہ مولی کو اسی نے

قتل کیا ہے۔ مارتھا سے بات کرنے کے بعد میں گاؤں گیا۔ وہاں اندھیرا تھا۔ ہر دکان بند ہو چکی تھی۔ بس لائبریری کے سامنے ایک آل نائٹ ریسٹورنٹ کھلا تھا۔ میں وہاں چلا گیا۔ وہاں ایک ٹرک ڈرائیور بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ میں نے کاؤنٹر مین سے پوچھا کہ آج لائبریری کس وقت بند ہوئی تھی۔ اس نے بتایا کہ شام پانچ بجے کے بعد لائبریری کبھی نہیں کھلتی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس نے بڑے سرخ دائروں والے سفید لباس میں کسی عورت کو دیکھا تھا؟ میں نے مولی کا حلیہ بھی بتایا۔ اس نے بتایا کہ اس حلیے کی ایک عورت عام طور پر رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان آتی ہے اور سینڈوچ وغیرہ پیک کرا کر لے جاتی ہے۔ باہر کار میں اس کا بوائے فرینڈ بیٹھا ہوتا ہے لیکن اس کا کہنا تھا کہ آج رات وہ نہیں آئی۔ اب تو دو بج رہے ہیں۔ اب اس کے آنے کا کوئی امکان نہیں۔

"اور اسی وقت وہاں بیٹھے ٹرک ڈرائیور نے زبان کھولی۔ کیا وہ عورت جے بڑ روڈ کے پاس رہتی ہے؟' اس نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے اثبات میں جواب دیا تو وہ بولا 'میں نے جے بڑ روڈ پر آتے ہوئے اکثر اسے کلورٹ برج کے پاس یوں بیٹھے دیکھا ہے جیسے وہ کسی کا انتظار کر رہی ہو۔ ایسی عورتوں کو میں اکثر سڑکوں پر دیکھتا رہتا ہوں۔ چاہوں تو دو منٹ میں پٹالوں۔ جس عورت کے متعلق تم پوچھ رہے ہو' اس نے ایک بار مجھے مسکرا کر دیکھا تھا۔ میں تو پاگل ہو گیا۔ میں نے ٹرک روکا اور اتر کر اس کی طرف لپکا مگر اسی لمحے میں نے ایک کار سڑک کی سائیڈ پر رکنے کی آواز سنی۔ کار درختوں کے جھنڈ میں روکی گئی تھی۔ اس میں صرف ایک آدمی بیٹھا تھا۔ وہ مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے عورت کو چھوڑا' اپنے ٹرک میں بیٹھا اور کھسک لیا۔ مگر بھائی' سنو' تم اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟ کیا اس کے چکر میں ہو؟ میرا مشورہ مانو تو اس کا خیال دل سے نکال دو۔ مجھے دیکھو۔ تگڑا جوان ہوں' کسی سے نہیں ڈرتا۔ مگر میں تمہیں بتا رہا ہوں' اس کار والے شخص میں کوئی عجیب سی بات تھی جس نے مجھے چپ چاپ کھسکنے پر مجبور کر دیا۔ میری مانو تو اس کے چکر میں نہ پڑو۔'"

جان بٹریگ نے ٹھنڈی سانس لی اور سلسلۂ کلام جوڑا۔ "میں نے اسے بتایا کہ وہ میری بیوی ہے۔ اس پر وہ بولا کہ اگر اس کی بیوی ایسی ہوتی تو وہ پہلی فرصت میں اسے قتل کر دیتا۔ میں اسے کیا بتاتا کہ اس کی دراز میں وہ چیزیں دیکھنے کے بعد میرا بھی یہی جی چاہا تھا۔ بہرکیف یوں مجھے یقینی طور پر معلوم ہو گیا کہ مولی مجھ سے بے وفائی کر رہی تھی۔ میں باہر نکلا اور ٹرک میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیو کرتے ہوئے میں اس کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑاتا رہا۔ میں اس عقبی سڑک پر پہنچا تو سپیدہ پھوٹ رہا تھا۔ گزرتے ہوئے میری نظر اس مرغزار میں کسی سفید چیز پر پڑی۔ جہاں سے باڑھ ٹوٹی ہوئی ہے' میں وہاں سے ٹرک اندر لے آیا۔ یہاں مجھے مولی کی لاش نظر آئی۔ میرا ذہن جیسے تاریک ہو گیا۔"

ڈپٹی شیرف دونوں ہاتھ کمر پر رکھے تن کر کھڑا تھا۔ جان بٹریگ کے گھٹنے اب بھی لرز رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ اس وقت دنیا میں ان دونوں کے سوا کوئی موجود نہیں ہے۔ اچانک جان کو احساس ہوا کہ اس کے گھٹنوں میں اب لرزش نہیں ہے لیکن لرزش کا احساس بدستور تھا۔

"وہ کون شخص تھا؟" ڈپٹی شیرف نے خود کلامی کے انداز میں پوچھا۔ "میرا خیال ہے' یہ بات وہ ریسٹورنٹ والا اور وہ ٹرک ڈرائیور بھی نہیں جانتے ہوں گے۔ پھر بھی انہوں نے کچھ تو بتایا ہو گا اس کے متعلق۔ اس کا حلیہ... دیکھنے میں کیسا لگتا تھا وہ؟"

"انہوں نے اسے دیکھا ہی نہیں تھا۔" جان بٹریگ نے تھکے تھکے لہجے میں کہا "مولی ریسٹورنٹ میں جاتی تھی تو وہ اپنی کار میں بیٹھا رہتا تھا۔ باہر تاریکی ہوتی تھی۔ ٹرک ڈرائیور نے بھی اسے نہیں دیکھا۔ وہ بس اس سے ڈر کر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔"

"عجیب پُراسرار معاملہ ہے۔" ڈپٹی کلاڈ نے تبصرہ کیا۔ "یعنی وہ اس بات کا خیال رکھتا تھا کہ کوئی اسے نہ دیکھے۔ شاید اسے اس بات کا تجربہ رہا ہو گا کہ شادی شدہ محبوباؤں سے پیچھا چھڑانا آسان کام نہیں ہوتا۔ ممکن ہے' اس نے سوچا ہو کہ کبھی اس عورت کو قتل کرنا پڑے گا۔ اسی لیے وہ اتنی احتیاط سے کام لیتا ہو گا۔ ارے ہاں... انہوں نے اس کی کار کے متعلق تو کچھ بتایا ہو گا۔"

"کار کے بارے میں انہوں نے بس اتنا بتایا کہ وہ سیاہ سیڈان تھی۔"

"یہاں تو دس میں سے نو کاریں سیاہ سیڈان ہوتی ہیں۔" ڈپٹی شیرف بولا۔ "خود میرے پاس سیاہ سیڈان ہے۔ ہاں' انہوں نے کار کا نمبر نوٹ کیا ہو تو بات بن سکتی ہے لیکن اگر وہ شخص اتنا محتاط تھا تو یہ ممکن نہیں۔ کچھ عجب نہیں کہ اس نے نمبر پلیٹ پر کیچڑ مل دیا ہو۔"

"نہیں۔ وہ لوگ کار کا نمبر نوٹ نہیں کر سکے تھے۔" جان نے بتایا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔ وہ بہت محتاط تھا۔"

ڈپٹی شیرف کلاڈ نفی میں سر ہلانے لگا۔ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "سب لاحاصل ہے مسٹر بٹریگ۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون ہے' کہاں رہتا ہے' کیا کرتا ہے' دیکھنے میں کیسا ہے۔ نہ ہی کسی کے پاس اس کی کار کا نمبر ہے۔ کاؤنٹر والا اور وہ ٹرک ڈرائیور بس اتنا بتا سکتے ہیں کہ تمہاری بیوی کسی سے چھپ کر ملتی تھی۔ اس نے سب کچھ بہت احتیاط سے کیا اور مجھے یقین ہے کہ وہ صاف بچ نکلے گا۔ مجھے افسوس ہے مسٹر بٹریگ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پولیس اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکے گی۔ کوئی سراغ بھی تو نہیں۔"

جان بٹریگ اپنی پیشانی مسل رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا' کتنی باتیں ہیں جنہیں میں بھول جانا چاہتا ہوں۔ کتنی باتیں ہیں جو مجھے بھلا دینی ہیں... جنہیں بچوں سے بھی چھپائے رکھنا ہو گا۔ اف...

کیا کچھ بھولنا ہوگا۔ وہ پیاری پیاری روشن یادیں جب وہ جوان تھا اور مولی کی عمر مارتھا جتنی تھی۔ وہ دن جب وہ ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ وہ دن جب دنیا خوشیوں سے بھرپور تھی، جب سب کچھ گلابی گلابی لگتا تھا۔ یہ وہ شروع ہی سے جانتا تھا کہ وہ مولی کو وہ سب کچھ نہیں دے سکتا جو مولی کو چاہیے۔ جو کچھ ہوا، اس میں مولی قصوروار نہیں تھی۔ قصور اس کا اپنا تھا۔ اگر وہ اسمارٹ آدمی ہوتا اور آمدنی بڑھاتا جاتا تو یہ سب نہ ہوتا لیکن اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ وقت کی تحریر کو کہاں بدلا جا سکتا ہے۔ بس شرم ناک باتوں کو، دکھوں کو اور اپنی ناکامیوں کو صرف بھلایا ہی جا سکتا ہے لیکن ایک چھوٹی سی بات یاد کرنا ضروری ہے۔

اور اسے وہ چھوٹی سی بات یاد آ گئی۔

"واقعی کوئی سراغ موجود نہیں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "سوائے اس کے جو مولی نے مجھے بتایا تھا۔"

"اس نے کیا بتایا تھا تمہیں؟" ڈپٹی شیرف نے پوچھا۔ "مجھے یاد پڑتا ہے کہ تم نے کہا تھا، اس نے تمہیں کبھی کچھ نہیں بتایا۔ تم نے کہا تھا کہ گزشتہ رات سے پہلے تمہیں کبھی شبہ بھی نہیں ہوا تھا۔"

جان اسٹریگ نے نظریں اٹھائیں اور ڈپٹی شیرف کی آنکھوں میں دیکھا۔ "اس نے مرنے سے پہلے مجھے کچھ بتایا تھا... یہیں... اسی جگہ۔"

"تمہارا مطلب ہے..." ڈپٹی شیرف کہتے کہتے رُک گیا۔ اس کے ہونٹوں کے گوشے پھڑک رہے تھے۔ "تمہارا مطلب ہے کہ تم پہنچے تو یہ زندہ تھی اور اس نے تمہیں کچھ بتایا بھی تھا؟ پاگل ہو گئے ہو شاید یا پھر پرلے درجے کے جھوٹے ہو تم۔ کیونکہ یہ ایک بجے مر چکی تھی۔" اس کا داہنا ہاتھ اپنے دفاع کے لیے اُٹھا۔ خوف نے اس کے چہرے کے نقوش کو مسخ کر ڈالا تھا۔

لیکن جان اسٹریگ کا سلاخ والا ہاتھ بہت تیزی سے حرکت میں آیا تھا۔ اب اس کی ٹانگوں میں نام کو بھی لرزش نہیں تھی۔ سلاخ ڈپٹی شرف کی کلائی سے ٹکرائی۔ ڈپٹی شیرف کے حلق سے خوف ناک چیخ نکلی۔ جان نے پھرتی سے اس کے ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا۔ پھر سلاخ نیچے گراتے ہوئے وہ دو قدم پیچھے ہٹا۔ ریوالور اس کے داہنے ہاتھ میں تھا۔

"اپنے ہاتھ کندھوں سے اوپر اٹھا لو۔" اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "اور مجھ پر چیخنے چلانے، مجھے گالیاں دینے سے کچھ نہیں ہوگا۔" اگلے ہی لمحے اس نے ڈپٹی شرف کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگا دیں۔ "ممکن ہے، مولی نے مجھے کچھ نہیں بتایا ہو لیکن تم نے ضرور بتایا ہے۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔ "میں یہاں اس کی لاش کے پاس موجود تھا۔ میرے ہاتھوں پر خون لگا تھا۔ ایک ہاتھ میں سلاخ موجود تھی۔ یہ آلۂ قتل بھی ہو سکتا تھا۔ میرے ٹرک کے پہیے عین لاش کی سیدھ میں تھے۔ یہاں زمین پر کسی اور گاڑی کے نشانات نہیں تھے اور میں اس کا شوہر تھا۔ دنیا بھر میں بیوی کی غیر فطری موت پر سب سے پہلے شوہر پر شک کیا جاتا ہے۔ مارتھا تو پہلے ہی مجھ پر شبہ کر رہی تھی کہ میں نے مولی کو قتل کر دیا ہے۔ کاؤنٹر والا اور ٹرک ڈرائیور بھی گواہی دیتے کہ ممکن ہے، ان کی گفتگو سے مشتعل ہو کر میں نے اپنی بے وفا بیوی کو قتل کیا ہو۔ سارے شواہد میرے خلاف تھے۔ میرے بہترین دوست بھی یہی کہتے کہ یہ میری حرکت ہو سکتی ہے۔ وجہ مارتھا ہو یا بچوں کی وجہ سے ہونے والا کوئی جھگڑا یا مولی کی بے وفائی لیکن اتنا مضبوط کیس ہونے کے باوجود تم نے تو مجھ سے پوچھا بھی نہیں کہ کہیں یہ میرا ہی کیا دھرا تو نہیں لیکن تم مجھ سے یہ بات کیسے پوچھتے۔ تم جانتے تھے کہ یہ قتل میں نے نہیں کیا ہے اور یہ بات صرف قاتل ہی یقینی طور پر جان سکتا تھا۔" جان اسٹریگ نے کچھ توقف کیا اور پھر تھکے تھکے لہجے میں سلسلۂ کلام جوڑا۔ "صدمے نے میرا دماغ چوپٹ کر دیا تھا اسی لیے مجھے یہ بات سمجھنے میں اتنی دیر لگی۔ میرا خیال ہے، آلۂ قتل... غالباً ٹائر چڑھانے والی سلاخ تمہاری کار میں ٹول کٹ میں موجود ہوگی۔ ورنہ گیراج میں تو ضرور مل جائے گی۔ اگر تم نے اسے دھو دیا ہوگا تب بھی خون کے دھبے اس پر ضرور مل جائیں گے۔ آج کل تو لیبارٹری میں جدید آلات ہوتے ہیں نا۔ میرا خیال ہے، خون کے دھبے تمہاری کار کی سیٹ پر بھی ہوں گے اور ان کپڑوں پر بھی جو تم رات کو پہنے ہوئے تھے۔" جان نے گہری سانس لی۔ "اور تم گھر جا کر سکون سے سو گئے۔ جبکہ میں رات بھر اس کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا۔ پھر تم اٹھے، شیو بنائی اور نہا دھو کر، تازہ دم ہو کر نکل آئے۔ تم یہاں اس لیے آئے کہ لاش دریافت ہو تو تم قریب ہی موجود ہو۔ مگر تم نے مجھے یہاں موجود پایا۔ تم ہمیشہ محتاط رہے مگر مجھے یقین ہے کہ پھر بھی کوئی ایسا گواہ ضرور مل جائے گا جس نے مولی کو تمہارے ساتھ دیکھا ہوگا۔ تفتیش ہوگی تو بہت ساری شہادتیں سامنے آئیں گی۔ چلو... اب اپنی کار میں بیٹھو۔ میں ٹرک سے رسی لا کر تمہارے پاؤں بھی باندھ دوں گا۔

"تمہاری حماقت نے مجھے بچا لیا ورنہ کسی کو تم پر شک نہیں ہو سکتا تھا۔ کوئی وجہ ہی نہیں تھی شک کی۔ یہ جرم مجھ پر تھوپ دیا جاتا۔ میں تو رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا اور مجھے اس جرم میں بیس سال کی سزا ہو جاتی۔ پھر بچوں کا کیا بنتا۔ یہی سوچ کر تو میری ٹانگیں جواب دے رہی تھیں۔ اس خوف نے میرے دماغ کو شل کر دیا تھا۔ اگر تم مجھ سے پوچھ لیتے کہ کیا یہ قتل میں نے کیا ہے تو شاید میں خوف سے مر جاتا۔ چلو... اب میں تمہیں شیرف کے پاس لے چلوں گا۔"

ڈپٹی شیرف رائے کلاڈ نے خاموشی سے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اس کی ٹوٹی ہوئی کلائی میں ناقابلِ بیان تکلیف ہو رہی تھی۔

THE MURDERER
JOEL TOWNSLEY ROGERS

جاسوسی ڈائجسٹ : اپریل 1994

ناول سکینگ و ایڈٹ
محمد سجاد بھٹی
03045503086

خصوصی تعاون: جاسوسی نشست ایڈمن
ڈاکٹر حامد حسن۔ ساگر زمان۔ عقیل قریشی۔ ممتاز علی کیانی۔ سیف الملوک عباسی۔ یاسر حسنین۔ ناصر محمود بلوچ۔ محمد نعمان & صائم بھائی

اردو ادب کے سب رنگ. ادبی محفل. قلمی جاسوسی دنیا. اولڈ سہانے ناول..... فینز گروپ

لہو کے تاجر

علیم الحق حقی

اس معصوم دوشیزہ کا احوال جو کھیل ہی کھیل میں دہشت گرد بن گئی تھی

بچے دُشمن ہی کے کیوں نہ ہوں، لائقِ شفقت و محبت ہوتے ہیں۔ وہ لوگ آج بھی زمانۂ جاہلیت میں ہیں جو اپنے جائز و ناجائز مقاصد کی تکمیل کے لیے معصوم بچوں کو اغوا کرتے ہیں اور اُنہیں یرغمال بناتے ہیں۔ اس ماہ ایسا ہی ایک واقعہ چند روز بیشتر پیش آچکا ہے جب پشاور کے ایک اسکول سے طلبہ کی خاصی بڑی تعداد کو اغوا کرکے اسلام آباد لے جایا گیا۔ یہ واقعہ ایسا نہیں تھا کہ کوئی ذی ہوش اس سے نظریں چُرائے یا اس کا اثر قبول کیے بِنا رہے۔ خصوصًا ایک ادیب تو ویسے بھی کچھ زیادہ ہی حسّاس طبع ہوتا ہے۔ وہ تو جو کچھ لکھتا ہے اپنے اِرد گرد وقوع پزیر ہونے والے حالات و واقعات سے متاثر ہوکر ہی لکھتا ہے۔ زیرِ نظر کہانی بھی ایسے ہی لمحوں کا شاخسانہ ہے۔ اس کہانی میں علیم الحق حقّی نے ایک ایسی ہی صورتِ حال کی عکاسی کی ہے جب چند دہشت گردوں نے ایک اسکول کے طلبہ کو یرغمال بنا لیا تھا۔ علیم کی یہ تحریر صرف اغوا برائے تاوان ہی کی داستان نہیں بلکہ اس کی دیگر جہتیں بھی خاصی چشم کُشا اور قابلِ غور ہیں۔ ہمارے معاشرے میں پھیلنے والی ایک بُرائی سے لے کر ملک و قوم کے دیگر داخلی اور خارجی معاملات پر محیط یہ کہانی یقینًا یادگار ثابت ہوگی۔

لہو کے تاجروں کی سفاکی اور سیاہ کاریوں کا لرزہ خیز ماجرا

شہناز ایک جھٹکے سے بیدار ہوئی۔ اس نے اندھیرے میں کلاک کی چمک دار سوئیوں کی طرف دیکھا۔ اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ تقریبًا ایک گھنٹا سوتی رہی ہے۔ اپارٹمنٹ میں اندھیرا تھا۔ روشنی کی بھی نہیں جاسکتی تھی۔ اس نے اِدھر اُدھر ٹٹولا۔ بالآخر اسے ریڈیو مل گیا۔ وہ بٹن دبانے ہی والی تھی کہ رک گئی۔ اب بابر کو کال کرتی تو اسے یہ اعتراف بھی کرنا پڑتا کہ اس کی آنکھ لگ گئی تھی اور بابر اس کوتاہی پر یقینًا ناراض ہوتا۔ کیوں خواہ مخواہ مصیبت مول لی جائے۔ بہتر یہ ہے کہ بابر کی کال کا انتظار کیا جائے اور اگر بابر نے کہا کہ اس نے پہلے بھی کال کیا تھا تو وہ کہہ دے گی کہ ٹرانسمیشن اس تک نہیں پہنچا تھا۔ ممکن ہے، بابر شک کرے کہ وہ سوگئی تھی لیکن وہ یہ ثابت تو نہیں کرسکتا۔

وہ کھڑکی کی طرف گئی اور تاریکی میں کرسی پر جابیٹھی۔ بابر نے ٹھیک کہا تھا۔ پولیس بلڈنگ میں آئی تھی اور پوری عمارت خالی کرالی گئی تھی۔ انہوں نے اپارٹمنٹ کے دروازے پر دستک دی تھی لیکن شہناز سانس روکے بیٹھی رہی تھی۔ کسی نے لٹو گھما کر دروازہ کھولنے کی بھی کوشش کی تھی اور شہناز کے اعصاب جواب دینے لگے تھے۔ اس نے دروازہ تو لاک کردیا تھا مگر اسے ڈر تھا کہ ممکن ہے، انہوں نے بلڈنگ کے منیجر سے ڈپلی کیٹ چابی لے لی ہو۔ بالآخر اسے جاتے ہوئے قدموں کی دور ہوتی ہوئی آہٹ سنائی دی اور اس نے سکون کی سانس لی تھی مگر وہ پوری طرح پرسکون ایک گھنٹے بعد ہوسکی تھی۔

پھر اسکول کی عمارت اندھیرے میں ڈوب گئی تھی۔ اس کے باوجود وہ کھڑکی سے دور ہی رہی تھی۔ اس کے بعد وہ کھڑکی کے پاس گئی تو تھی لیکن اسے لگتا تھا کہ نامعلوم نگاہیں اب بھی اس



اپارٹمنٹ بلڈنگ کا جائزہ لے رہی ہیں۔ جیسے پولیس نے اسے کھڑکی میں دیکھ لیا ہے اور اب اسے چیک کرنے کے لیے آرہے ہیں کہ وہ بلڈنگ خالی کرائے جانے کے باوجود اس اپارٹمنٹ میں کیوں موجود ہے۔ چنانچہ اس کے کان آہٹوں کے خوف سے دروازے پر لگے رہے لیکن ہوا کچھ بھی نہیں۔

اس نے کرسی پر بیٹھ کر سامنے دیکھا۔ نائٹ اسکوپ اس کی گود میں رکھا تھا۔ چند گھنٹے بعد سورج طلوع ہونا تھا۔ شام کو پہلی بار اسے احساس ہوا تھا کہ غروبِ آفتاب کا منظر کس قدر خوب صورت ہوتا ہے لیکن وہ منظر دیکھنے کے لیے کھڑکی کے قریب جانے کی اسے ہمت نہیں ہوئی تھی اور پھر سورج غروب ہونے کے بعد اندھیرا بھی بہت تیزی سے چھایا تھا۔ اس کے بعد سناٹا بھی ہوگیا تھا۔ تنہائی میں وہ سناٹا بہت خوفناک اور اعصاب شکن محسوس ہو رہا تھا۔

اب اس وقت وہ سناٹا اور مہیب ہوگیا تھا۔ وہ بابر کو کال کرنا چاہتی تھی۔ تنہائی کے احساس کو دور کرنے کی یہی ایک صورت تھی۔ کیونکہ یہاں تو تنہائی کے ڈراؤنے احساس سے نکالنے کے لیے کوئی آواز بھی نہیں تھی۔ دوسری طرف اسکول میں بھی سناٹا تھا۔ حد یہ کہ اسکول کے اسٹیڈیم میں بھی اندھیرا اور سناٹا تھا۔ بس اسکور بورڈ والے کیبن میں مدھم سی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔

اچانک اسے ایک شک نے گھیر لیا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کے سونے کے دوران کچھ ہوا ہے۔ کوئی بات ہوئی ہے لیکن وہ اسے سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ ہاں۔۔۔ کلاس روم میں اُس وقت روشنی ہو رہی تھی مگر اب وہاں اندھیرا تھا۔ اسٹیڈیم میں بھی ایک گھنٹا پہلے روشنی تھی مگر اب وہ بھی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

وہ بے چین ہوگئی۔ اس کی انگلیوں نے گود میں رکھے نائٹ اسکوپ کو سہلا لیا۔ وہ اسے استعمال کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اگرچہ نیچے کے گھپ اندھیرے میں اس کے لیے تسلی اور سکون کا کوئی سامان نہیں تھا لیکن وہ نائٹ اسکوپ میں نظر آنے والے سرخ وسیاہ لرزیدہ عکس کے مقابلے میں پھر بھی لائقِ ترجیح تھا۔ نائٹ اسکوپ سے دیکھنا تو اسے ڈراؤنا خواب سا لگتا تھا۔ جیسے وہ کسی اجنبی سیارے میں جھانک رہی ہو۔ وہ خوف زدہ ہو جاتی تھی اس لیے بھی کہ وہ تنہا تھی لیکن شاید اس وقت اس کے ذہن میں یہ اُمید تھی کہ وہ کوئی ایسی بات دیکھے گی، جو بابر کو کال کرنے کا جواز بن جائے گی۔ کوئی بہانہ۔۔۔ کوئی جواز!

پہلے اس نے نائٹ اسکوپ کی مدد سے اسٹیڈیم کا جائزہ لیا۔ پارکنگ لاٹ میں اسے ایک کار کے بونٹ سے حدت کی سرخ لہریں اٹھتی دکھائی دیں۔ کاریں تو وہاں تھیں لیکن کوئی آدمی اسے نظر نہیں آیا۔ نائٹ اسکوپ نے اسٹیڈیم سے اسکول کی عمارت کے علاقے کو ٹٹولا۔ اسے گھاس پر کم از کم ایک درجن سرخ شعلے لرزتے دکھائی دیے مگر وہ ان کے متعلق اندازہ نہ لگا سکی۔ بابر نے کہا تھا کہ نائٹ اسکوپ کسی بھی جسم یا کسی بھی شے سے اٹھنے والی حدت کی لہروں اور معمولی سی روشنی کو بھی پک کرلے گی۔ یہ درست تھا لیکن شہناز کے لیے کسی جسم یا کسی شے میں فرق کرنا مشکل تھا۔

اس نے اسکوپ کا رخ عمارت کی طرف کیا۔ وہ پارکنگ سے اسے عمارت کی چھت کی طرف گھماتی گئی۔

اچانک اس کے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ وہ آگے کی طرف جھک گئی۔ جو کچھ اسے نظر آرہا تھا، وہ اسے زیادہ غور سے دیکھنے کے لیے نگاہوں پر زور ڈالنے لگی۔ یہ اس کا وہم تو نہیں تھا۔ وہ مضطربانہ انداز میں کرسی سے اُٹھ گئی۔ اسکوپ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ بیڈ کی طرف جھپٹی اور ریڈیو کو ٹٹولا۔ ریڈیو لے کر وہ پھر کھڑکی کے پاس آئی۔ اس نے جھٹکے سے ریڈیو کو آن کیا "بابر! بابر!" اس نے پکارا "وہ لوگ چھت پر چڑھے ہوئے ہیں۔ بابر۔۔۔ بابر۔۔۔ سُن رہے ہو تم؟"

●

کمال رشید کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ چھت پر کچھ لوگ موجود تھے اور وہ دبے پاؤں چلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بایاں بازو بے جان ہونے کے باوجود وہ مضطربانہ انداز میں پھرتی سے اٹھا اور اس طرف جھپٹا جہاں طلبا جمع تھے۔ اس کا بے جان بازو ڈیسکوں سے ٹکراتا رہا مگر اس کے پاس اس طرف دھیان دینے کی فرصت نہیں تھی۔ "جاؤ۔۔۔ نکلو یہاں سے" اس نے تند لہجے میں سرگوشی کی اور کلاس کے سب سے اچھے ایتھلیٹ بشیر کو کھڑکی کی طرف دھکیلا۔ اس نے اپنے داہنے ہاتھ سے بشیر کو سہارا دے کر کھڑکی پر چڑھنے میں مدد دی۔ پردے کی کٹی ہوئی ڈوری لٹک رہی تھی۔ بشیر نے اسے تھاما اور نیچے اترتا چلا گیا۔

"اب تم جاؤ گے رئیس" اس نے کہا۔

"نہیں سر۔ میں آپ کو اس حال میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

"بے وقوف مت بنو" کمال نے اسے ڈانٹا "تم اپنی اہمیت نہیں سمجھ رہے تمہاری اہمیت تو اب مجرموں پر بھی واضح ہو چکی ہے۔"

"کچھ بھی ہو سر!"

"میں کہتا ہوں، بحث مت کرو" کمال کے لیے اپنی آواز نیچی رکھنا دشوار ہو رہا تھا۔ "تم میری حکم عدولی کر رہے ہو۔۔۔"

"آخری بار سر۔ وعدہ کرتا ہوں، اس کے بعد آپ کا ہر حکم مانوں گا۔"

"پاگل لڑکے، تمہاری یہاں موجودگی مجرموں کے لیے تقویت اور ہمارے لیے کمزوری کا سبب بنے گی۔ تمہیں میرا یہ حکم ماننا ہی ہوگا۔"

رئیس چند لمحے سوچتا رہا "ٹھیک ہے سر۔ میں مان لوں گا آپ کی بات لیکن آخر میں، کیونکہ یہاں ان لوگوں کو اُترنے میں مدد دینے کے لیے بھی کسی کی ضرورت ہے۔ آپ کی حالت ایسی نہیں کہ آپ زیادہ دیر یہ کام کر سکیں۔"

کمال کو اندازہ ہوگیا کہ بحث کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس وقت ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

کپڑے کی رسی کھینچی تو اندازہ ہوگیا کہ بشیر نیچے پہنچ چکا ہے "تو اب کون جائے گا؟" کمال نے پوچھا۔

"اب اشفاق جائے گا" رئیس نے کہا پھر وہ اشفاق کو سہارا دینے لگا۔

کلاس میں لڑکیوں کی تعداد آٹھ تھی۔ انہیں اُتارنا سب سے دشوار مرحلہ تھا پھر لڑکیوں میں ہمت بھی نہیں تھی۔ وہ رونے لگی تھیں۔ رئیس کی تجویز پر کپڑے کی ایک اور رسی لٹکا دی گئی۔ اس کے بعد ہر لڑکی کے ساتھ رئیس خود گیا۔ تاکہ بوقتِ ضرورت خوف زدہ لڑکی کو گرنے سے بچا سکے۔ ساتویں لڑکی کو نیچے پہنچا کر واپس آیا تو اس نے نازیہ کی طرف دیکھا۔

"یہ تو اس قابل نہیں کہ جا سکے" صوفیہ نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ نعمان اب تم جاؤ" رئیس نے کہا۔

کلاس آہستہ آہستہ خالی ہو رہی تھی۔

○☆○

بابر ہڑبڑا کر اُٹھا اور اس نے ریڈیو پر چلا کر پوچھا "کتنے ہیں وہ؟"

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتی" ریڈیو پر شہناز کا جواب ملا "چار ہیں یا پانچ ہیں۔ میں ٹھیک طرح سے دیکھ نہیں پا رہی ہوں۔"

"دیکھو... غور سے دیکھو۔ مجھے صحیح تعداد بتاؤ۔"

"پانچ... ہاں، مجھے پانچ افراد نظر آرہے ہیں۔"

"وہ ہیں کہاں؟"

"عمارت کے عقبی حصے میں... اس جگہ سے قریب، جہاں تم ہو۔"

"وہ کیا کر رہے ہیں؟"

"میرا خیال ہے، ان میں سے ایک اس طرف اُتر رہا ہے۔ بابر... عمارت کے گرد سرخ دھبے جابجا نظر آرہے ہیں۔ میں کیا کروں؟"

"بس تم دیکھتی رہو، اس طرف۔ ضرورت پڑی تو میں تمہیں پھر کال کروں گا۔"

پھر وہ نذیر کا ہاتھ تھام کر اسے کھینچتا ہوا باہر لایا۔ ساتھ ہی وہ چیخ چیخ کر شکور اور شہلا کو بھی پکار رہا تھا۔ وہ چاروں بدقسمت کلاس روم کے باہر اکٹھا ہوئے "سنو... وہ اندر گھسنے کی کوشش کر رہے ہیں" بابر نے ہذیانی لہجے میں کہا "وہ اس طرف عقبی حصے میں ہیں۔ وہ اسٹور روم کی طرف گھسنے کی حماقت نہیں کریں گے" اس کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ خوف زدہ ہے لیکن اس کے پاس خود پر قابو پانے کی مہلت نہیں تھی۔ پہلی بار اس کا موت سے سامنا ہوا تھا۔ اب اسے پتا چل رہا تھا کہ نہتے اور بے بس لوگوں پر ظلم کرنا اور قوت کا سامنا کرنا دو مختلف باتیں ہیں "وہ تین

کسی مغربی ملک میں ایک خاتون، بچے کو ساتھ لے کر ایک ڈیپارٹمنٹ اسٹور میں شاپنگ کرنے گئی۔ بچہ بہت شرارتی تھا اور ماں کو اس قدر تنگ کر رہا تھا کہ اس کے لئے خریداری کرنا مشکل ہوگیا۔ اس نے منیجر سے کہا کہ چونکہ یہ بہت شرارتیں کر رہا ہے اور میرے لئے شاپنگ کرنا ممکن نہیں اس لئے میں جا رہی ہوں۔ منیجر موٹی اسامی کو جاتا دیکھ کر پریشان ہوا، تاہم اس نے کہا "آپ واپس نہ جائیں، ہمارے پاس بچوں کی نفسیات کا ایک ماہر موجود ہے۔ ہم اس سے مسئلے کا حل دریافت کرتے ہیں۔"

ماہر نفسیات کو بلا کر ساری صورت حال بیان کی گئی۔ اس نے بچے کو قریب بلا کر اس کے کان میں کچھ کہا جس کے بعد بچہ چپ چاپ ایک جگہ پر بیٹھ گیا۔ خاتون نے اطمینان سے دو تین گھنٹے شاپنگ کی اور بچے کو ساتھ لے کر چلی گئی۔ دکان سے باہر آکر اس نے بچے سے پوچھا "اس آدمی نے تم سے کیا کہا تھا جسے سن کر تم یوں چپ چاپ بیٹھ گئے؟"

بچے نے کہا "اس نے کہا تھا کہ اگر اپنی جگہ سے ذرا بھی ہلے تو تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔"

عطاء الحق قاسمی کے سوانحی انٹرویو
"یہ نصف صدی کا قصہ ہے" سے ایک اقتباس

★ ★ ★

کلاس روم ٹا اور دو باتھ رومز کی عقبی کھڑکیوں سے اندر آ سکتے ہیں" اس نے مزید کہا "نذیر... تمہیں کونے والے زینے اور اس کے سامنے والے کلاس روم پر نظر رکھنی ہے۔ سیڑھیوں پر معمولی آہٹ سنتے ہی میں بم اُڑا دوں گا۔ میں درمیانی زینے پر نظر رکھوں گا اور ہاں... اپنے اپنے بم اس کلاس روم کے باہر ڈھیر کر دو۔ ہم ختم بھی ہوگئے تو کیا! بچوں کو مار کر ہی مریں گے۔" یہ کہہ کر وہ پلٹا اور درمیانی زینوں کی طرف بھاگا۔

نذیر نے برآمدے کی لائٹ آف کی اور باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے بڑی احتیاط اور آہستگی سے باتھ روم کا دروازہ کھولا اور شٹر لگا دیا پھر وہ پیچھے ہٹا اور گھٹنوں کے بل جھک کر پوزیشن سنبھال لی۔ یہاں سے وہ باتھ روم کی عقبی کھڑکی پر نظر رکھ سکتا تھا۔ شکور نے برابر والے کمرے کے سامنے پوزیشن سنبھال لی تھی۔ شہلا اور بابر نے راہداری کے تمام کمروں کے دروازے کھول دیے

تھے۔ عمارت میں خاموشی چھا گئی تھی۔ بس بد قسمت کلاس روم کی طرف سے عجیب سی آواز آرہی تھی۔ قدموں کے اِدھر اُدھر ہونے کی آواز...... اور جیسے کوئی چیز کسی دوسری چیز سے رگڑ کھا رہی ہو۔ نذیر سوچ میں پڑ گیا کہ کلاس میں نہ جانے کیا ہو رہا ہے۔ اس کا اب بھی یہی خیال تھا کہ کلاس روم میں کوئی گڑبڑ ہو رہی ہے۔ اسی وقت ایک اور آواز نے اسے چونکا دیا۔ راہداری کی مدھم روشنی میں اس نے گھٹنوں کے بل جھکے ہوئے مشکور کو شاٹ گن فائرنگ پوزیشن میں لاتے دیکھا۔ اگلے ہی لمحے شاٹ گن گرجی اور نذیر کے جسم میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ وہ اُچھل کر کھڑا ہوا اور مشکور کی طرف لپکا۔

مشکور نے شاٹ گن سے شیل نکالا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "کھڑکی سے اندر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اسے اُڑا دیا۔"

نذیر نے بھی رائفل تان لی۔ وہ اپنی جگہ واپس چلا آیا تھا۔ کلاس روم کی طرف سے پھر وہی تشویش میں مبتلا کرنے والی آواز آئی پھر ایک اور آواز سُنائی دی۔ وہ تیسرے کلاس روم کی طرف لپکا۔ اسی وقت اس نے کلاس روم کی کھڑکی سے کسی کو جسم اچکا کر اندر آنے کی کوشش کرتے دیکھا پھر کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا اور وہ انسانی جسم اندر آگرا۔ نذیر نے یکے بعد دیگرے دو فائر کیے۔ گولیاں اس شخص کے جسم سے ٹکرائیں تو عجیب سی آواز نکلی تھی اور وہ پیچھے کی طرف گرا تھا۔ اس آواز کو سُن کر نذیر کے ذہن میں ایک خیال آیا لیکن صورتِ حال کی سنگینی کی وجہ سے اس کا شعور اسے گرفت میں نہیں لے سکا۔ اسی وقت ایک اور جسم فرش پر گرا۔ نذیر نے اس پر بھی فائر کیا۔ وہ تیسرے پر فائر کرنے ہی والا تھا کہ شاٹ گن گرجی اور تیسرا شخص کھڑکی سے نیچے زمین کی طرف گرتا گیا۔ مشکور بھی اس کی طرف آ گیا تھا۔

مشکور نے شاٹ گن سے تین فائر کیے۔ پھر وہ کمرے میں گھس گیا۔ نذیر وہ منظر ہی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شاٹ گن کا فائر آدمی کا کتنا بُرا حشر کرتا ہے۔

اندر سے مشکور نے کہا "کم بخت بلٹ پروف پہنے ہوئے ہیں۔ یہ اب بھی زندہ ہیں۔ آؤ...... انہیں کھڑکی سے باہر پھینکنے میں میری مدد کرو۔"

"کھڑکی سے دور رہو۔ ممکن ہے اور بھی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں یہ کام خود ہی کرلوں گا۔"

نذیر دیکھتا رہا۔ مشکور نے زخمی پولیس والوں کو غیر مسلح کیا پھر اس نے ایک کو بازوؤں میں اٹھایا اور کھڑکی تک لے گیا۔ اس کی سانس پھول گئی تھی۔ زخمی پولیس والا کراہ رہا تھا۔ مدھم روشنی میں بھی نذیر دیکھ سکتا تھا کہ شاٹ گن کا بلاسٹ زیادہ تر اس کی بلٹ پروف سے ٹکرایا تھا مگر گولیوں کی بوچھار اس کی کھلی گردن اور اس کے ہیلمٹ سے بھی ٹکرائی تھی۔ وائزر کا شیشہ بھی ٹوٹا تھا۔ اس کا چہرہ اور گردن خون میں نہا گئی تھی۔ مشکور نے اسے اُٹھا کر ٹوٹے ہوئے شیشے کے خلا سے باہر دھکیلا اور چھوڑ دیا۔ دوسرے پولیس والے نے مزاحمت کی۔ بلکہ ایک مرحلے پر تو اس نے مشکور کو دھکیل کر گرا بھی دیا تھا لیکن بالآخر مشکور نے اسے بھی اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا تھا۔

اس لمحے جمنازیم کی چھت سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ نذیر اور مشکور نیچے جھک گئے۔ انہوں نے بھی فائرنگ شروع کر دی۔ اچھی خاصی جنگ ہو رہی تھی۔ مسلسل روشنی کرنے والے شیل چھوڑے جا رہے تھے۔ نذیر اور مشکور سینے کے بل گھسٹتے ہوئے کمرے سے نکل آئے۔ باہر وہ دونوں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔

"اب ہم کیا کریں؟" نذیر نے چیخ کر بابر سے پوچھا' جو راہداری کے درمیانی حصے میں زینے پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

"انتظار کرو۔"

"لیکن کس کا؟"

"ان کے آئندہ لائحہ عمل کا۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ کس نتیجے پر پہنچتے ہیں۔"

فائرنگ جاری رہی۔ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹتے رہے۔ کبھی کوئی بھٹکی ہوئی گولی کمرے یا باتھ روم سے ہو کر کھلے دروازے سے راہداری میں بھی آجاتی تھی۔ وہ لوگ دیوار سے ٹیک لگائے ساکت کھڑے تھے۔ اس ڈر سے کہ کوئی آوارہ گولی انہیں ہی نہ چاٹ جائے۔ نذیر کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ پولیس اس طرح فائرنگ کر کے یرغمالیوں کو کیوں خطرے میں ڈال رہی ہے۔

فائرنگ بتدریج کم ہونے لگی۔ بالآخر تھم گئی۔

"یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟" نذیر نے چیخ کر بابر سے پوچھا۔

"یہ جاننا اتنا ضروری ہے تو باہر جا کر ان سے خود پوچھ لو" بابر نے تپ کر کہا "لیکن' اس صورت میں تمہارا سر کندھوں پر نہیں رہے گا۔"

"غصہ کیوں کر رہے ہو؟"

"میں کیا بتا سکتا ہوں' کیا میں ان سے ملا ہوا ہوں...... اور اندازہ میں لگا سکتا ہوں تو تم بھی لگا سکتے ہو۔"

"تمہارا اندازہ کیا ہے؟"

"میرا خیال ہے' ایک پولیس والا چھت پر پھنسا رہ گیا تھا۔ وہ اسے عافیت سے اُتارنے کے لیے فائرنگ کر رہے تھے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے' وہ مزید کارروائی کریں گے؟" نذیر نے پوچھا۔

"وہ میری توقع سے زیادہ بے وقوف ثابت ہوئے ہیں لیکن میں نہیں سمجھتا کہ وہ دوبارہ حماقت کریں گے۔ اب وہ بیٹھ کر ہمارے ردِعمل کے متعلق اندازے لگائیں گے اور پسینے میں نہائیں گے۔"

"تم انہیں کال کر کے دھمکاتے کیوں نہیں؟"

"ابھی نہیں۔ ابھی تو میں فیکلٹی روم جا کر شہناز سے پوچھوں گا کہ کیا صورتِ حال ہے۔"

بابر راہداری میں جھک کر چل رہا تھا۔ فیکلٹی روم میں ریڈیو موجود نہ ہوتا تو اس وقت وہ ہرگز یہ رسک نہ لیتا۔ وہ بہت پریشان تھا۔ یہ حقیقت اسے خوف زدہ کر رہی تھی کہ پولیس نے ایک نہایت قابلِ عمل منصوبہ بنایا بھی تھا اور اس پر اس طرح عمل بھی کیا تھا کہ کامیاب ہو سکتے تھے۔ اگر ریڈیو پر شہناز سے رابطہ نہ ہوتا تو پولیس یقیناً کامیاب ہو جاتی...... اور اسے یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ وقت پڑنے پر وہ اتنا خوف زدہ بھی ہو سکتا ہے اور اس کے ساتھی عضوِ معطل بھی ہو سکتے ہیں۔ گولیوں کی برسات ہوئی تو ان میں سے کسی کو یرغمالی یاد بھی نہیں رہے۔ وہ سب کچھ بھول گئے۔ اگر پولیس اندر آنے میں کامیاب ہو جاتی تو نہ جانے کیا انجام ہوتا اور اسے شہناز سے بھی باز پرس کرنا تھی۔ اس کی نظروں میں آئے بغیر وہ لوگ چھت پر پہنچے کیسے۔ شہناز کو بالکل آخر میں علم کیوں ہوا۔ اس بار تو قسمت نے ان کا ساتھ دیا تھا لیکن قسمت ہمیشہ تو کسی کا بھی ساتھ نہیں دیتی۔

کمرے کے باہر سے ہی اسے سسکیاں سُنائی دیں۔ سسکیوں میں اس کا ہی نام پکارا جا رہا تھا۔ اس نے لپک کر ریڈیو اُٹھایا "خاموش ہو جاؤ شہناز۔ ہم سب خیریت سے ہیں" اس نے کہا۔

"میں دس منٹ سے چیخ چیخ کر تمہیں پکار رہی ہوں۔"

"فائرنگ کے شور میں یہاں کان پڑی آواز بھی نہیں سُنائی دے رہی تھی۔"

"بابر..... بچے..... میرا مطلب ہے تمہارے یرغمالی طلبا....."

"کیا ہوا طلبا کو؟"

"وہ..... وہ باہر نکل رہے ہیں۔"

بابر نے ریڈیو صوفے پر پٹخا اور تیر کی طرح کمرے سے نکلا۔ اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ یرغمالی ہی تو ان کے تحفظ کی ضمانت تھے۔ وہ ہاتھ سے نکل گئے تو ان کے لیے موت کے سوا کچھ بھی نہیں رہے گا۔ اس بار راہداری میں بھاگتے ہوئے اسے گولیوں کا بھی خوف نہیں تھا۔ اس نے پوری قوت سے کلاس روم کا دروازہ کھولا۔ لائٹ آن کرتے ہی اسے زبردست شاک لگا۔ جو کمرا کچھ دیر پہلے طلبا سے بھرا ہوا تھا، اب تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ وہ خاموش کھڑا کمال، صوفیہ اور رئیس کو دیکھتا رہا، جو اپنا کام کرتے کرتے اچانک جم کر رہ گئے تھے۔ روشنی نے انہیں حیران کر دیا تھا۔ نازیہ ایک گوشے میں سمٹی ہوئی بیٹھی تھی، جیسے اسے گرد و پیش سے نہ کوئی غرض ہو نہ ہوش۔ بابر خونخوار نظروں سے اس شخص کو دیکھتا رہا، جس کے بارے میں اس سے اندازے کی بدترین غلطی سرزد ہوئی تھی۔ وہ اس کے زخمی چہرے کو بغور دیکھتا رہا۔ کیوں..... آخر اس سے اندازے کی یہ غلطی کیوں سرزد ہوئی۔ وہ اسے یوں دیکھ رہا تھا، جیسے اس ٹوٹے پھوٹے چہرے پر اسے اپنے سوال کا جواب لکھا مل جائے گا لیکن وہاں تو ان روشن اور ضدی آنکھوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

کمال نے پلٹ کر کھڑکی سے جھانکا اور بولا "جلدی کرو لڑکو۔ تھوڑا سا وقت ہے تمہارے پاس۔"

بابر سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا "تم سمجھ رہے ہو کہ تم کامیاب ہو گئے ہو لیکن ایسا نہیں ہے۔ تم سب تو نہیں نکل سکے نا۔ ہمارا مقصد اب بھی پورا ہو جائے گا۔"

"ہار جیت کی فکر تمہیں ہو گی۔ میرے لیے یہ کوئی کھیل نہیں تھا" کمال نے کہا "مجھے رہ جانے والوں کے متعلق افسوس ہے لیکن میں نے تم سے چوبیس انسانی کھلونے تو چھین لیے۔ ان میں ایس پی جلیس کا بیٹا بھی تھا۔"

بابر تھرّا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اب کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اس نے شاٹ گن کا رخ کمال کے چہرے کی طرف کر دیا۔ وہ اس بیماری کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتا تھا، جو اس کے مکمل اور بے داغ منصوبے کو تقریباً موت سے ہم کنار کر چکی تھی۔ وہ ایک لمحے کو رُکا۔ اسے افسوس تھا کہ وہ اسے توڑ نہیں سکا۔ اس کا اسے پوری طرح موقع نہیں ملا تھا لیکن اس شخص کو سزا دینا ضروری تھا۔ وہ شاٹ گن کا رخ اس کی طرف کیے آگے بڑھا۔ وہ اس کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ کوئی ردِعمل... خوف کی کوئی علامت... کچھ بھی نہیں! وہ غصے اور بے بسی کی آگ میں جھلس رہا تھا۔

خیر... اب اسے بھی کوئی پروا نہیں۔ اس نے گن کو کندھے پر ٹکایا اور ٹریگر پر انگلی رکھ کر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ اس نے نذیر کو کمرے میں داخل ہوتے اور خود پر چھلانگ لگاتے نہیں دیکھا۔ بس اسے اتنا احساس تھا کہ فائر کے وقت کمال رشید کا چہرہ شاٹ گن کی نال کے سامنے نہیں تھا۔ وہ فرش پر گرا۔ اس وقت وہ غصے کا آتش فشاں بن چکا تھا۔

○☆○

ایس پی جلیس فون پر ہوم سیکریٹری سے جھاڑ سُن چکا تھا۔ یہ اسے اب پتا چلا تھا کہ وزیرِاعظم نے واردات کی خبر ملتے ہی ٹی وی پر اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ حکومت دہشت گردوں کے مطالبات تسلیم کر کے دہشت گردی کی حوصلہ افزائی نہیں کرے گی لیکن آٹھ گھنٹے بعد انہوں نے بیان دیا کہ انسانی جانوں کو خطرے سے بچانا زیادہ ضروری ہے۔ لہٰذا دہشت گردوں سے سمجھوتا کرنا پڑے گا۔ دوسری طرف وزیرِ داخلہ اپنا غیر ملکی دورہ مختصر کر کے واپس آ چکے تھے اور کسی بھی وقت مری پہنچنے والے تھے۔

اور اب تھکے ہارے مضمحل جلیس احمد کو روشنیوں، کیمروں اور صحافیوں کا سامنا کرنا تھا۔ وہ کیمرے سے نظریں چرا رہا تھا۔ پریس کانفرنس سے وہ ویسے بھی گھبراتا تھا اور پھر یہ پریس کانفرنس تو تھی بھی خوفناک۔ وہ تو صحافیوں کو ٹال دیتا مگر اوپر کے احکامات تھے کہ اسے صحافیوں کا سامنا کرنا ہے۔

اب یہ محض پولیس ایکشن نہیں رہا تھا۔ بلکہ ایک بڑے سیاسی کھیل میں تبدیل ہوچکا تھا۔ اس سطح پر وہ بہت چھوٹا آدمی تھا۔ اسے جو لائن دی گئی تھی۔ اسے اس کے مطابق بولنا تھا۔ دوسری طرف یہ بھی بعید از امکان نہیں تھا کہ گورنمنٹ کے حامی صحافیوں کو سوالات کے سلسلے میں بھی کوئی لائن دی گئی ہو۔

مائیکروفون اسٹینڈ یم کے ایک اسٹینڈ میں سیٹ کیا گیا تھا۔ اس نے پریس کانفرنس کا آغاز کیا "آپ لوگ جانتے ہیں کہ کل دوپہر ایک بجے چار دہشت گرد اسکول میں داخل ہوئے۔ انہوں نے فائر الارم بجاکر اسکول کو خالی کرالیا۔ اس سے پہلے وہ ٹاپ فلور کے ایک کلاس روم پر قابض ہوچکے تھے۔ اس کلاس میں موجود طلبا اور دو ٹیچرز کو انہوں نے یرغمال بنالیا۔ ابھی ہم یہ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ دہشت گردوں کے سیاسی مقاصد بھی ہیں یا نہیں۔ ہم اتنا جانتے ہیں کہ انہوں نے بھاری زرِ تاوان کا مطالبہ کیا ہے۔ ہمارا مفروضہ ہے کہ ان کا مقصد صرف زرِ تاوان کا حصول ہے۔ آج صبح دو بجے ہم نے ایک کارروائی کی' جس کا مقصد دہشت گردوں پر قابو پانا اور یرغمالیوں کو آزاد کرانا تھا۔ یہ کارروائی جزوی طور پر کامیاب رہی۔ تین طلبا اور دو ٹیچرز کے سوا تمام یرغمالی ہماری فائرنگ کے دوران عمارت سے بخیروعافیت نکل آئے۔ ہم تیسری منزل تک پہنچنے میں تو کامیاب ہوگئے تھے لیکن اس پر قبضہ نہ کرسکے۔ ہمیں پسپا ہونا پڑا۔ میں اس بات پر زور دوں گا کہ صورتِ حال اب بھی بے حد تشویش ناک ہے۔ دہشت گرد ہر طرح کے اسلحے سے لیس ہیں اور ان کے قبضے میں پانچ یرغمالی بھی ہیں۔ شکریہ۔"

اس کا بس چلتا تو اب اپنے آپریشن بوتھ کی پناہ گاہ کا رُخ کرتا لیکن ابھی اسے اس دشوار مرحلے سے بھی گزرنا تھا۔ اسے سوالوں کے جواب دینا تھے۔ وہ سرجھکائے سوال کا منتظر تھا۔

"اس کارروائی میں جانی نقصان کتنا ہوا؟"

"دو جوان جاں بحق اور دو زخمی ہوئے۔"

"اور ویسے اب تک کتنا نقصان ہوا ہے؟"

"تین افراد جاں بہ حق ہوئے اور دو زخمی..." پھر اس نے وضاحت کی۔ "صبح دہشت گردوں کے ہاتھوں ایک ٹیچر ہلاک ہوا تھا۔ باقی نقصان پولیس کے جوانوں کا ہوا ہے۔"

"بس؟"

"باہر آنے والے طلبا نے بتایا ہے کہ اندر بھی ایک ٹیچر زخمی ہے۔"

"زخمیوں کا کیا حال ہے؟"

"پولیس کے دونوں جوانوں کی حالت تشویش ناک ہے۔ البتہ اسکول میں جو ٹیچر زخمی ہے' اس کی حالت اتنی خراب نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ اس نے طلبا کو اسکول سے نکلنے میں مدد دی ہے۔ بہرحال زخمی وہ ہے۔ اس کے گولی لگی تھی۔"

"آپ نے عمارت پر قبضہ کرنے کی کارروائی کیوں کی۔ جبکہ آپ جانتے تھے کہ اس سے یرغمالیوں کی جانیں خطرے میں پڑسکتی ہیں؟" ایک صحافی نے سوال کیا۔

جلیس نے جان لیا کہ اب سخت مرحلہ شروع ہورہا ہے "یہ میرا انفرادی فیصلہ تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ کارروائی کا اچانک پن دہشت گردوں کو حیران کردے گا اور ہم کامیاب ہوجائیں گے۔"

"لیکن آپ کا منصوبہ ناکام ہوگیا۔"

"اس کا جواب ہاں بھی ہے اور نہیں بھی۔ ہم نے دہشت گردوں کی بے خبری میں پوزیشنیں سنبھال لی تھیں۔ انہیں بالکل آخری لمحوں میں پتا چلا۔ اس اندازے کی تصدیق بچ نکلنے والے طلبا نے کی ہے۔ انہیں چھت پر چڑھنے والے جوانوں کی آہٹیں سُنائی دے گئی تھیں۔ بس پھر انہوں نے اپنا دفاع منظم کرلیا۔"

"انہیں آپ کے آدمیوں کی بلڈنگ میں موجودگی کا شبہ کب ہوا؟"

"حملے سے چند لمحے پہلے۔ انہوں نے لائٹیں آف کردی تھیں۔ اس سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ انہیں شک ضرور ہوگیا ہے۔"

"تو پھر آپ نے کارروائی روکی کیوں نہیں۔"

"میں نے یہ حکم دیا تھا..."

"تو پھر کیا ہوا...؟"

"اسکول کی چھت پر پہنچنے والے گروپ کے لیڈر کا واکی ٹاکی جمنازیم کی چھت پر رہ گیا تھا۔ رابطہ ممکن نہیں رہا تھا۔"

"حملے میں کوئی دہشت گرد بھی زخمی ہوا؟"

"اس کا ہمیں علم نہیں۔"

"آپ لوگوں نے اتنی فائرنگ کی۔ آپ کو یہ خوف نہیں تھا کہ اس سے کوئی لڑکا بھی زخمی ہوسکتا ہے۔"

اس طرح کے ناقدانہ سوالات جلیس کے لیے پریشان کن تھے۔ اس نے کہا "ہم نے اسکول کی چھت پر پہنچتے ہوئے اپنے ایک آدمی کو کور دینے کے لیے فائرنگ کی تھی۔ ہمیں یہ بھی معلوم تھا کہ طلبا فرار ہورہے ہیں۔ انہیں بھی زیادہ سے زیادہ موقع فراہم کرنا تھا۔ دوسرے کلاس روم کی پوزیشن ایسی ہے کہ ہمیں یقین تھا کہ کوئی بھٹکی ہوئی گولی بھی اس طرف نہیں جائے گی۔"

"آپ کو معلوم ہے کہ دہشت گرد کون ہیں؟"

"بچ نکلنے والے طلبا سے ہمیں تین نام معلوم ہوئے ہیں لیکن اس سے زیادہ ابھی تک کچھ اور معلوم نہیں ہوسکا ہے۔"

"ان کے نام بتائیں گے؟"

"فی الوقت تو یہ ممکن نہیں۔"

"کیا وہ مجرمانہ ریکارڈ رکھنے والے ہیں؟"

"کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ بہرحال یہ طے ہے کہ وہ خطرناک لوگ ہیں۔ جو کچھ سُنا ہے' اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا لیڈر نہایت درجے کا اذیت رساں ہے۔ اس کے ایک ساتھی نے اسکول کے پی

ٹی انسٹرکٹرز کو شوٹ کر دیا یعنی ان کے نزدیک انسانی جانوں کی کوئی اہمیت نہیں" جلیس نے ایک لمحے توقف کیا پھر بولا "بس حضرات۔ فی الحال میں آپ کو اور کچھ نہیں بتا سکتا۔"

"چوتھے کے بارے میں آپ نے کچھ نہیں بتایا۔"

"اس کے بارے میں بس اتنا معلوم ہے کہ وہ عورت ہے۔"

"آپ کے خیال میں اس جرم کے سیاسی محرکات نہیں ہیں؟"

"میرے خیال میں اس کے لیے ایک ہی مناسب لفظ ہے... دہشت گردی" جلیس نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا "وہ یرغمالیوں کے ساتھ بے رحمانہ برتاؤ کر رہے ہیں۔ ہمیں یہ بھی پتا چلا ہے کہ انہوں نے ایک بچی کی آبروریزی کی ہے۔ میرے نزدیک وہ بدترین قسم کے مجرم ہیں، جو آسانی سے دولت مند بننا چاہتے ہیں۔ جن کے نزدیک انسان اور انسانیت کی کوئی وقعت نہیں۔ ان کا انداز بھی دہشت گردوں والا ہے اور رویّہ بھی۔ انہیں میں انسانی کیچڑ قرار دوں گا... غلیظ کیچڑ۔"

"ہمیں بچ نکلنے والے طلبا سے بات کرنے کا موقع کب ملے گا؟"

"ہم نے ان سے پوچھ گچھ کی ہے اور انہیں ان کے گھر بھیجا جا رہا ہے۔ یہ معاملہ نمٹنے کے بعد ہی آپ ان سے بات کر سکیں گے۔"

"اس وقت آپ کا دہشت گردوں سے رابطہ ہے؟"

"نہیں۔"

"گویا آپ کو نہیں معلوم کہ اس وقت عمارت میں کیا ہو رہا ہے؟"

"نہیں۔ میں نے کئی بار انٹر کام پر کال کیا لیکن وہ کال ریسیو نہیں کر رہے ہیں۔"

"اب آپ کیا کریں گے؟"

"انتظار" جلیس نے کہا۔ اب وہ سوالات سے بیزار ہو چکا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس سلسلے کو فوری طور پر نہ روکا گیا تو یہ ختم ہی نہیں ہوگا "حضرات.... باقی سوالوں کے جواب آپ کو شام کو ملیں گے۔"

"ایک اور سوال" ایک صحافی نے آگے آتے ہوئے کہا "کیا یہ سچ ہے کہ آپ کا اکلوتا بیٹا بھی یرغمالیوں میں شامل ہے؟"

اس کے فوراً بعد صحافیوں میں بڑبڑاہٹیں اُبھریں۔ جلیس کو اُمید ہو چلی تھی کہ فی الحال یہ بات دب گئی ہے مگر ایسا نہیں تھا۔

"وہ یرغمالیوں میں شامل تھا" اس نے کہا اور حصار توڑ کر نکلنے لگا۔

"کیا آپ کی کارروائی کا محرک یہی حقیقت تھی؟"

جلیس پلٹا۔ اس نے ہجوم میں سوال کرنے والے کو تلاش کیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "ہرگز نہیں۔"

سوالات کی بوچھار ہو گئی مگر وہ انہیں نظرانداز کر کے اپنے بوتھ کی طرف چل دیا۔ اسے غصہ آ رہا تھا۔ پولیس کو کتنا غلط سمجھا جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ اس کے دو جوان زندگی گنوا بیٹھے تھے لیکن ۲۴ انسانی جانیں بچا بھی تو لی گئی تھیں۔ ان میں اس کا بیٹا بھی تھا مگر اس نے اس کے لیے کوئی خصوصی کوشش نہیں کی تھی پھر اسے خیال آیا کہ وہ اس کریڈٹ کا مستحق نہیں۔ کریڈٹ تو اس ٹیچر کو جاتا ہے، جس نے بچّوں کو فرار کرایا۔ اگر وہ یہ قدم نہ اُٹھاتا تو کیا ہوتا؟ یہ وہ سوال تھا، جس کا وہ جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔

بوتھ میں داخل ہو کر وہ دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور گہری سانسیں لینے لگا۔

"سخت وقت گزار کر آئے ہو؟" پرنسپل جمیل الرحمان نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

جلیس نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ سگریٹ کے کش لے رہا تھا "اور سگریٹ ہوگی آپ کے پاس؟"

"ضرور۔ بلکہ کافی بھی لو۔ تھرموس میں موجود ہے۔"

"آپ گھر نہیں گئے؟"

"گیا تھا۔"

جلیس نے اس کی دی ہوئی سگریٹ سُلگائی "لیکن نیند نہیں آئی آپ کو؟"

"میں نے ریڈیو پر بچ نکلنے والے طلبا کے متعلق سُنا تھا۔"

"بیشتر نکل آئے۔ میرا خیال ہے، کمال صاحب نے جیسے ہی یہ بات سمجھی کہ ہم نے آپریشن شروع کر دیا ہے تو انہوں نے موقعے سے بھرپور فائدہ اُٹھاتے ہوئے طلبا کو باہر دھکیل دیا۔"

"میرے ٹیچرز کی کیا کیفیت ہے؟" جمیل الرحمان نے پوچھا۔

"وہ دہشت گردوں کی نفرت کا نشانہ بن رہے ہیں۔"

"اوہ...."

"اور طلبا نے جو کچھ بتایا ہے، اس کی روشنی میں لگتا ہے کہ کمال رشید اسٹیل کا بنا ہوا ہے۔ جو کچھ دہشت گرد اس کے ساتھ کر چکے ہیں۔ اس کے بعد اسے زندہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

"بہت زیادہ زخمی ہے وہ؟"

"جی ہاں اور اس کے باوجود اس نے کارنامہ انجام دیا ہے۔"

"وہ سابق فوجی ہے اور اسکول کے بہترین ٹیچروں میں سے ہے" جمیل الرحمان نے کہا "اور ان دنوں وہ بہت پریشان تھا۔"

"پریشانی میں تو وہ اب ہے" جلیس نے کہا "اور مجھے یقین نہیں ہے کہ ہم اسے بعافیت نکال سکیں گے۔ کل رات ہم نے مجرموں کو ڈرا دیا ہے۔ اب وہ عمارت میں زیادہ دیر نہیں رُکیں گے۔"

"تو پھر تم کیا کرو گے؟"

"سوچتے تو رہیں گے لیکن اب کچھ کر گزرنے کا امکان کم ہے۔ یرغمالی اب پوری طرح مجرموں کے رحم و کرم پر ہیں۔"

○☆○

بابر کھڑکی کے پاس کھڑا پردوں کی درزوں سے باہر اسٹیڈیم کو دیکھ رہا تھا۔ کمرے میں خاموشی تھی۔ نذیر دروازے کے پاس رائفل کو ریڈی پوزیشن میں لیے کھڑا تھا۔ وہ خوف زدہ تھا کہ کسی بھی وقت بابر گھومے گا، اس کی شاٹ گن گرجے گی اور اسے اس مداخلت کی سزا ملے گی۔ اس نے ماسٹر کی جان ایک بار بچائی تھی لیکن وہ دوبارہ یہ ہمت نہیں کرسکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آئندہ ایسا ہوا تو بابر اسے بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔

بدستور کھڑکی سے جھانکتے ہوئے بابر نے کہا "ان لوگوں کو فیکلٹی روم میں لے جاؤ۔ اب ہر لمحے انہیں نظروں کے سامنے رکھنا ہوگا۔"

وہ سب دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ اچانک بابر نے کہا "کمال رشید یہیں رُکے گا۔"

نذیر دروازے پر ٹھٹکا۔ اس نے پلٹ کر بابر کو سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر وہ دوسروں کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔ صوفیہ دروازے پر رُکی "اسے کوئی تکلیف نہ پہنچانا۔"

بابر نے سر گھما کر اسے دیکھا اور غرایا "مشکور.... لے جاؤ اسے یہاں سے۔"

مشکور نے صوفیہ کو باہر دھکا دیا اور باہر جاتے ہوئے دروازہ بند کردیا۔

بابر اور کمال کچھ دیر ایک دوسرے کو گھورتے رہے پھر بابر بڑی ڈیسک کی طرف بڑھا اور آرام سے بیٹھ گیا۔ اس نے شاٹ گن ڈیسک پر رکھ دی اور بولا "بیٹھو مسٹر کمال۔"

کمال بہت کمزوری محسوس کررہا تھا۔ یہ پیشکش ایک نعمت تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

بابر کی انگلیاں چند لمحے شاٹ گن کے ٹریگر سے کھیلتی رہیں پھر اس نے کہا "میں نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی۔"

کمال نے اسٹوڈنٹ ڈیسک سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کرلیں "میرا خیال ہے، اب تمہاری نظروں میں، میں بزدل نہیں رہا ہوں گا۔"

"میں تمہیں اس سے زیادہ کریڈٹ دوں گا۔ تم حیران کردینے والے آدمی ثابت ہوئے ہو۔ تم بیشتر عام لوگوں جیسے کمزور نہیں ہو لیکن کمزور، بہرحال ہو ضرور۔"

"سب سے بڑی کمزوری موت کا خوف ہے" کمال نے سکون سے کہا "جس کا یہ خوف نکل جائے، وہ کمزور نہیں رہتا۔"

بابر کی انگلیاں بدستور ٹریگر سے کھیل رہی تھیں "تو تم یہ فلسفہ پڑھاتے ہو اپنی کلاس میں۔"

"نہیں۔ یہ چیزیں کلاس میں نہیں پڑھائی جاسکتیں۔ یہ تو آدمی خود اپنے اندر دریافت کرتا ہے۔ میں کلاس میں طلبا کی ذہانت کو اُجاگر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ زندگی کی سچائیاں تو بعد کی چیز ہیں۔ ذہن کی صحیح تربیت کردی جائے، اسے صیقل کردیا جائے تو سچائیاں خود سمجھ میں آنے لگتی ہیں مگر مناسب وقت پر۔"

بابر کی انگلی ٹریگر پر جم گئی "میں تمہیں مارنے والا ہوں" اس نے سرد لہجے میں کہا۔

"ممکن ہے" کمال نے بے پروائی سے کہا۔

"اتنا کچھ ہوجانے کے بعد بھی تمہیں میری بات پر یقین نہیں آتا۔"

"توقع تو مجھے یہی ہے لیکن تمہاری بات پر یقین نہ کرنے میں ہی میری بہتری ہے اور پھر میں ایمان رکھتا ہوں کہ زندگی اور موت خدا کے اختیار میں ہے۔"

"میں اس معاملے کو ابھی، اسی وقت اور یہیں نمٹا دینا چاہتا ہوں لیکن میرے خیال میں ابھی تم پکے ہوئے پھل کی طرح نہیں ہو کہ تمہیں توڑ کر خوشی ہو۔ ابھی تو لگتا ہے کہ تم نے مجھ سے خوف زدہ ہونا بھی نہیں سیکھا۔"

"مجھے یاد ہے کہ تمہیں دوسروں کو ایذا پہنچا کر خوشی ہوتی ہے اور تمہیں ایذا دینے کے طریقے بھی آتے ہیں۔"

"میں جانتا تھا کہ تمہیں یہ بات یاد ہوگی۔"

کمال تھکے تھکے انداز میں ہنسنے لگا "یاد کیسے نہیں۔ یہ میرا بازو کا سوراخ بھولنے دے گا؟"

"مجھے خوشی ہے کہ ابھی تم میں زندہ دلی باقی ہے" بابر نے بے رحمی سے کہا "ویسے یہ تو بتاؤ کہ اس صورتِ حال میں تمہیں دلچسپی اور محظوظ ہونے کا کون سا پہلو نظر آتا ہے۔"

"میری ہنسی کا غلط مطلب نہ لو۔ مجھے یہ صورتِ حال دلچسپ نہیں لگتی۔ اگر یہ ساعت تمہاری حکمرانی کی ہے... اور اگر ایسی چند اور ساعتیں تمہیں ملتی ہیں تو انہیں اچھی طرح انجوائے کرلو کیونکہ وقت ایک سا کبھی نہیں رہتا۔ کبھی نہ کبھی وقت کی زد پر تم بھی آؤ گے.... میرے نہ سہی، کسی اور کے ہاتھوں..."

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔ گویا تم سمجھ سکتے ہو کہ میرا کام کتنا مشکل ہے۔"

"اس اسکول میں یہ جنگ جیت لینا کوئی بڑی بات تو نہیں" کمال نے طنز کیا۔

"یہ تو محض نکتۂ آغاز ہے۔"

"کمزور لڑکوں کو خوف زدہ کرکے تمہیں کیا حاصل ہوگا؟"

"تمہیں میرے عزائم کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ میں تو اس ملک کو تباہ و برباد کرنے کے ارادے سے نکلا ہوں۔"

"لیکن کیوں؟"

"اس لیے کہ مجھے ایک یہی کام آتا ہے۔ میری فطرت میں ہی تخریب ہے اور پھر اس ہنر کے ذریعے میں دولت بھی کما سکتا ہوں۔ پانچ کروڑ روپے کم تو نہیں ہوتے" بابر نے چند لمحے توقف کیا پھر بولا "ایک بات بتاؤ۔ تم مجھے روکنے کے لیے کیا کروگے؟"

"میں تمہیں کیا روکوں گا۔ یہ سوال تم باہر والوں سے پوچھو"

کمال نے اسٹڈیم کی جانب کھلنے والی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

"ان کے لیے میرے پاس حیرتیں ہی حیرتیں ہیں۔"

"ویسے مسٹر بابر' اپنے اور میرے معاملے میں یہ اُمید نہ رکھنا کہ میں خاموشی سے لڑھک کر مر جاؤں گا۔ کاش نوبت یہاں تک نہ پہنچے۔ ورنہ تم سے جنگ میں مجھے بھی تم جیسا بننا پڑے گا اور یہ بات سوچ کر ہی میرا جی متلانے لگتا ہے۔ میں اور تم جیسا۔۔۔"

بابر اٹھ کر اس کی طرف بڑھا۔ "یہی تو تمہاری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ دہشت گردی سے لڑنے کے لیے دہشت گردی ضروری ہے اور تم دہشت گرد نہیں بن سکتے" وہ اس کے سامنے رُک گیا "تمہارے درمیان خوش گوار گفتگو رہی مگر اب ہمیں دوسروں کی طرف چلنا چاہیے۔"

کمال ڈیسک پر ہاتھ ٹکا کر اٹھنے لگا۔

"لیکن اس سے پہلے میں ایک تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ عملی تبصرہ" بابر نے کہا اور کمال کے حلق پر شاٹ گن کی ہیل ماری۔

کمال نیچے گرا۔ اسی لمحے بابر کی لات اس کی ناف پر لگی۔ اس کے حلق سے بے ساختہ کراہ نکل گئی "اب سے مرنے تک تمہیں ایسی ہی اذیتیں سہنی پڑیں گی۔ آخر میں تم خواہش کرو گے کہ تمہیں موت آجائے۔ تم مجھے نہیں روک سکتے۔ تم پہلے ہی میرے سامنے سر اٹھانے کی مہلک غلطی کر چکے ہو۔ اس کی سزا تم بھگتتے رہو گے"

اس نے کمال کے پیٹ میں ایک اور ٹھوکر ماری "تم پچھتاتے رہو گے کہ نذیر نے تمہیں مرنے سے کیوں بچایا" اس بار ٹھوکر کمال کے منہ پر لگی۔ اس کا ایک دانت ٹوٹ گیا پھر اسے ہوش نہ رہا۔

○☆○

اس کا جسم مڑا تڑا پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ انہیں کھول نہیں سکتا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کا جسم جیسے مائع کا روپ اختیار کر گیا ہے اور اسے کسی جگ۔۔۔ کسی پیالے میں بھر دیا گیا ہے۔ دنیا جیسے ایک شٹر گرائے جانے سے کسی دُکان کی طرح اس پر بند ہو گئی تھی۔ ذہن کا جیسے جسم سے۔۔۔ اور یوں درد سے رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ اس نے اپنے جسم کو محسوس کرنے' تصور میں اسے کوئی شکل' کوئی ساخت دینے اور حرکت دینے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش اس کی حالت کے پیش نظر بہت بڑی تھی۔ خیال کے زور پر ایک بہت بڑا پہاڑ تخلیق کرنا اور پھر خیال کی قوت سے ہی اسے مٹا دینا اس کوشش کی نسبت بہت آسان تھا۔

اس کے اندر ہتھیار ڈالنے۔۔۔ مزاحمت ترک کرنے کی ترغیب بہت طاقت پکڑ گئی تھی۔ اب جو ہو سو ہو۔ زیادہ سے زیادہ موت آجائے گی اسے۔ تو ویسے بھی بابر اسے قتل کرنے کا عہد کر چکا تھا۔ تو جب موت یقینی ہے تو پھر کسی چیز کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔ شادی۔۔۔ آبائی زمین پر گھر بسانا اور نسل بڑھانا۔۔۔ اور بچوں کو پڑھانا۔ یہ سب کسی اور۔۔۔ بہت دور کی دنیا کی باتیں تھیں۔ اس وقت تو وہ جس صورتِ حال میں زندہ تھا' وہ جنگل کے قانون والی تھی۔ زیادہ طاقتور۔۔۔ زیادہ فٹ آدمی جی سکتا تھا اور قسمت کے اعتبار سے اس کی پوزیشن بہت ہی زیادہ کمزور تھی پھر بابر ایک بھیڑیا تھا۔ جبکہ وہ ایک شریف اور نفیس آدمی تھا۔ وہ اخلاقی ضابطوں کے تحت زندگی گزارنے کا عادی تھا۔ وہ بھیڑیے کے مقابلے میں بھیڑیا نہیں بن سکتا تھا۔ یعنی اس کا اور بابر کا کوئی جوڑ ہی نہیں تھا۔ اس لیے تو اس کا یہ حشر ہوا تھا۔ دوسری طرف تسکین کا سامان بھی تھا۔ بدترین صورتِ حال میں بھی وہ تہی دامن تو نہیں رہا تھا۔ وہ اپنے بیشتر شاگردوں کو بچانے میں کامیاب رہا تھا اور اس نے بدی کے سامنے سر بھی نہیں جھکایا تھا۔ جو کچھ بھی ایسی صورتِ حال میں کیا جا سکتا ہے' اس نے کیا تھا۔

اچانک اسے اپنے والد کا خیال آگیا۔ وہ کہتے تھے۔۔۔ زندگی جدوجہد کا نام ہے۔۔۔ ہتھیار ڈالنے کا نہیں۔ جدوجہد سے محروم زندگی موت سے بدتر ہوتی ہے۔

اس نے سوچا' جب تک اس کا دماغ اور جسم کمزور دھاگے سے بندھے ہوئے ہیں' وہ خود کو تھکن اور اذیت کا عادی بنانے کی کوشش کرے گا۔ ان دونوں کمزوریوں کو زندگی کے اس ڈرامے میں چھوٹے اور ثانوی کردار دے گا اور جدوجہد جاری رکھے گا۔ وہ زخمی اور درماندہ جسم کے ہر احتجاج کو نظر انداز کر دے گا۔ اسے چیلنج کا بہادری سے سامنا کرنا ہے۔

یہ سوچتے سوچتے وہ سو گیا۔

بابر ٹہلتے ٹہلتے رُکا اور اس نے سوئے ہوئے کمال رشید کو دیکھا۔ وہ ابھی تک دو متضاد خواہشوں کے درمیان لٹکا ہوا تھا۔ ایک خواہش کہتی تھی۔۔۔ اس مسلمان کو ابھی ختم کر دے۔ موت سے خوف زدہ نہ ہونا اس کی طاقت ہے۔۔۔ اور یہ طاقت کبھی ختم نہیں ہوگی۔ دوسری خواہش کہتی تھی۔۔۔ نہیں' ابھی نہیں۔ ابھی اسے اذیتیں پہنچا۔ اس کا دل پہلی خواہش کا اسیر تھا لیکن جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا' اس شخص کو قتل کرنا دشوار سے دشوار تر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ ان کی ضرورت بنتا جا رہا تھا۔ اب یرغمالیوں کی تعداد اتنی کم ہو چکی تھی کہ ان میں سے کسی کو ضائع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ ایک ضروری تالے کی چابی کی سی حیثیت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ دوسرے یرغمالی اس پر انحصار کرتے تھے۔ وہ نہ رہا تو شاید باقی لوگ دہشت ہی سے مر جائیں گے۔ وہ ان کے لیے اُمید کی علامت تھا اور یرغمالیوں کی زندگی بہت اہم تھی۔ اس لیے کہ وہ ان کی اپنی زندگی کی ضمانت تھے۔

یہ سوچ کر اس کا خون کھولنے لگا۔ جب وہ پہلی بار کلاس روم میں داخل ہوا تو یہ شخص کمال رشید کچھ بھی نہیں تھا مگر اب وہ بڑھتا۔۔۔ پھیلتا جا رہا تھا۔ ہر توہین اور ہر تشدّد کے بعد وہ پہلے سے زیادہ مضبوط اور طاقتور محسوس ہونے لگتا تھا۔ بابر کو اپنے اوور ہونے کا احساس ہونے لگا۔ شاید اس نے اپنے ہتھیار۔۔۔ غصہ'

دھمکیاں، تشدد اور موت کی دہشت..... ضرورت سے زیادہ استعمال کر لیے تھے۔ اس لیے اب اسے ان کے استعمال پر اپنا من پسند ردِعمل نہیں مل رہا تھا۔ اس نے موت کو اس سخت جان دشمن سے محض ایک سانس کے فاصلے پر لا کھڑا کیا تھا مگر وہ اپنی جگہ ڈٹا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کے شائبے کی پرچھائیں تک نہیں لرزی تھی۔ نذیر نے مداخلت کرکے اسے بچالیا تھا..... اور سچ یہ ہے کہ اچھا ہی کیا تھا۔ کیونکہ اس شخص کی اپنی ایک اہمیت تھی۔ تاہم بابر کو یہ اطمینان تھا کہ دیر سے سہی، اس کی خواہش پوری ضرور ہوگی۔ آخر میں وہ اس کے ہاتھوں بہرحال مارا جائے گا۔

فیکلٹی روم کے دروازے پر کھڑے ہوئے نذیر کو سوتے ہوئے اس شخص پر رشک آرہا تھا۔ وہ بابر کے بے داغ منصوبے کی واحد کمزوری بن گیا تھا اور وہ کیسا خوش نصیب تھا کہ بے فکری اور اطمینان سے سو رہا تھا جبکہ وہ چاروں، دن ہو یا رات، باری باری صرف چار گھنٹے سو سکتے تھے۔ خود اسے ابھی تک ایک گھنٹے سے زیادہ آرام کی مہلت نہیں مل سکی تھی۔ سو اب اس کے ہاتھ پاؤں ست پڑنے لگے تھے اور دماغ پر دھند سی چھا رہی تھی۔ اس وقت دوپہر کا ایک بجنے والا تھا اور وہ جانتا تھا کہ ڈیڈ لائن تک تو اسے آرام کی مہلت مل نہیں سکتی۔ بلکہ حفاظت سے نکل جانے تک وہ نہیں سو سکتا۔ اس نے حساب لگایا۔ ابھی کم از کم چودہ گھنٹے اسے نیند نہیں مل سکتی۔ اس خیال نے اس کی تھکن میں اور اضافہ کر دیا۔

وہ کمرے میں داخل ہوا اور کرسی پر جا بیٹھا۔ تینوں لڑکے صوفے پر گہری نیند سو رہے تھے۔ صوفیہ ایک کرسی پر بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ وہ بار بار جھٹکے سے بیدار ہوتی اور پھر دوبارہ اونگھنے لگتی۔ اس نے سوچا کہ وہ اس کی جگہ ہوتا تو وہ بھی اسی طرح سوتا۔ اس صورتِ حال میں کون سو سکتا ہے۔ سوائے لڑکوں کے... انہیں صورتِ حال کی سنگینی کا پوری طرح ادراک تو نہیں تھا اور پھر اس عمر کی نیند ایسی ہی ہوتی ہے کہ آدمی کانٹوں پر بھی بے خبر سو جائے۔ اس نے سوچا، کاش میں بھی ایسا ہی ہوتا۔ سب کچھ بھول بھال کر میٹھی نیند سو جاتا۔

اس نے سر گھما کر کمال رشید کو دیکھا۔ وہ زندگی اور موت کے درمیان لٹک رہا تھا۔ اب وہ، وہ آدمی نہیں تھا، جسے اس نے ابتدا میں دیکھا تھا۔ بلکہ اس میں اس شخص کی جھلک بھی نہیں تھی۔ اس کا کوٹ اور قمیص کندھے پر سے پھٹی ہوئی تھی اور جا بجا خون کے دھبے تھے۔ ناک متورم تھی اور ایک طرف جھک گئی تھی۔ نتھنوں کے گرد خون کی پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ بائیں رخسار پر نیل بھی پڑا ہوا تھا اور کٹ بھی تھا۔ پہلی نظر میں اس نے سوچا تھا کہ کاش وہ بھی اس شخص جیسا ہوتا۔ خوبرو، خوش لباس اور باوقار لیکن اب تو اسے دیکھ کر خوف آتا تھا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ کوٹ کے نیچے اب سوئٹر نہیں پہنے ہے۔ اس نے صوفیہ کی طرف دیکھا۔ ماسٹر کا سوئٹر اب وہ پہنے ہوئے تھی۔ سوئٹر کے بائیں کندھے پر گولی کا سوراخ بھی تھا اور خون بھی لگا تھا۔ نذیر کو حیرت ہوئی۔ اس حال میں ماسٹر نے یہ سوئٹر کیسے اُتارا ہوگا ماسٹرنی کے لیے! واقعی..... آدمی حوصلے والا ہے۔ اچانک نذیر کو اس کے حال پر افسوس ہونے لگا۔ ابھی چند گھنٹے پہلے اس نے اس شخص کی جان بچائی تھی۔ اس لیے نہیں کہ وہ اسے پسند کرتا تھا۔ بلکہ اس لیے کہ اس کے خیال میں یہ ضروری تھا۔ وہ ان کے لیے اہمیت رکھتا تھا۔ انہیں اس کی ضرورت تھی۔ اس نے بے حد سمجھ داری سے کام لیا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ شخص زیادہ دیر بچ نہیں سکے گا۔

بابر بلڈنگ کا جائزہ لے کر واپس آگیا۔ اس نے اپنے لیے ایک پیالی میں کافی انڈیلی اور نذیر کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں متورم ہو رہی تھیں۔ اس سے قطع نظر وہ ترو تازہ لگ رہا تھا۔ نذیر نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر اسے غیر معمولی تاثر نظر آیا "کیا بات ہے، کچھ پریشان لگ رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

بابر نے کافی کا گھونٹ لیا۔ اس کے چہرے پر سکون پھیل گیا "سب کچھ کنٹرول میں ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔"

"یہ بھی اچھا ہے کہ طلبا کم رہ گئے ہیں۔ ہم یہاں ان پر زیادہ بہتر طور پر نظر رکھ سکتے ہیں" نذیر بولا۔

"ہمیں وہاں ان پر بہتر طور پر نظر رکھنا چاہیے تھی۔ بڑی تعداد ہماری طاقت تھی۔"

"وہ صورتِ حال ایسی تھی کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔"

"نہیں۔ ہم نے انہیں بہت دیر تنہائی فراہم کرکے غلطی کی" بابر نے تلخ لہجے میں کہا "یوں کمال کو انہیں تیار کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ نہ ہوتا تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔"

"لیکن جو کچھ ہوا، وہ ہمارے لیے بہتر ہوا ہے" نذیر نے کہا "جانتے ہو، یہ جو لڑکا ہے رئیس، یہ وفاقی وزیرِ داخلہ کا بیٹا ہے۔"

بابر سنبھل کر بیٹھ گیا "اوہ..... تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"خود ہی ڈینگ مار بیٹھا تھا۔ ماسٹر نے اسے چپ کرانے کی کوشش کی تھی۔"

"بس تو پھر پریشان ہونے کی کوئی بات ہی نہیں۔ سمجھ لو، ہم یہ کھیل جیت گئے۔"

اسی وقت انٹر کام کا بزر چیخا۔ پولیس کی کارروائی کے بعد سے یہ پانچویں کال تھی۔ بابر چند لمحے انٹر کام کو گھورتا رہا پھر اس نے ریسیور اُٹھا لیا۔ "یس ڈیئل مٹلے!" اس نے کہا۔

"بہت تپے ہوئے لگ رہے ہو؟" دوسری طرف سے جلیس نے کہا "کیا صورتِ حال اچھی نہیں معلوم ہو رہی ہے؟"

"نروس تو تم معلوم ہو رہے ہو۔ میں تو ۲۴ جانوں کا بوجھ کم ہونے پر خوش ہوں۔ میرے لیے مُنار کی سو کے مقابلے میں لوہار کی ایک زیادہ تسلی بخش ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرے قبضے میں ایک وزیر زادہ بھی ہے۔ وہ تو ہزار یرغمالیوں سے بڑھ کر ہے۔"

جلیس پریشان ہوگیا۔ تاہم اس نے بے پروائی سے کہا "موت تو وزیروں کو بھی آتی ہے اور بادشاہوں کو بھی۔ اس معاملے میں امیر غریب برابر ہیں۔"

"درست لیکن ایک عام لڑکے کے مقابلے میں وزیر کے بیٹے کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ میں جانتا ہوں' اب ہمارے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوگی بلکہ ممکن ہے' رات کی کارروائی پر اب تک تم پر جھاڑ بھی پڑ چکی ہو۔ ایک بات بتاؤ' کیا تمہیں کارروائی سے پہلے یہ بات معلوم نہیں تھی؟"

بوتھ میں جلیس کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ وار بہت کاری تھا۔ اس نے لہجے کو مضبوط بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "وقت آنے پر تمہیں معلوم ہوجائے گا کہ ہمارے لیے ہر انسانی جان برابر کی اہمیت رکھتی ہے۔"

بابر استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ اس نے کرسی سے ٹیک لگا کر پاؤں پھیلاتے ہوئے کہا "دیکھیں گے۔ جانتے ہو' تمہاری رات کی حماقت کے بعد سے میں اپنا منصوبہ بدلنے کے بارے میں غور کررہا ہوں۔ سوچتا ہوں' تمام یرغمالیوں کو ٹھکانے لگادوں اور اسکول کو اُڑادوں۔"

"تمہیں اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔"

"یہ تو ہے۔ لیکن.... خیر چھوڑو۔ اب تم نے میری ہدایات پر عمل نہ کیا تو میں یہی کچھ کروں گا" بابر نے کہا۔ پھر اس نے کمال رشید کے فلسفے سے استفادہ کیا "تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمیں موت کی کوئی پروا نہیں۔ ہوتی تو ہم یہ کام نہ کرتے۔"

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی پھر جلیس نے پوچھا "تم کیا چاہتے ہو؟"

"ایک تو یہ کہ تم رات جیسی کوئی اور حماقت سوچنا بھی نہیں۔ میرے پاس تین طلبا اور دو ٹیچر ہیں اور ایک لڑکے کی اہمیت سے تم خوب واقف ہو۔ سمجھ رہے ہونا...." اسی وقت ریڈیو پر کھرکھراہٹ اُبھری اور پھر شہناز نے پوچھا "بابر... کیا ہورہا ہے؟" بابر نے انٹر کام کے ریسیور کو ہاتھ سے ڈھانپا اور نذیر کو ریڈیو کی طرف اشارہ کیا "اس سے کہو' ابھی چپ رہے۔ میں ذرا انٹرکام پر بات کرلوں پھر اس سے بات کروں گا" پھر وہ نذیر کے شہناز کو سمجھانے کا انتظار کرتا رہا۔ اس کے بعد اس نے ریسیور سے ہاتھ ہٹایا "اب غور سے سنو' ٹلے۔ میں چاہتا ہوں کہ پارکنگ ایریا میں ایک وین پہنچادی جائے۔ چابیاں اگنیشن میں موجود ہوں اور ٹنکی فل ہونی چاہیے۔ میں سولہ سیٹ والی ویگن کی بات کررہا ہوں۔ جس میں دونوں طرف چار چار شیشے ہوں اور اس ویگن میں سوٹ کیس میں بھرے پانچ کروڑ روپے بھی موجود ہوں۔ اس ویگن میں ہم چکلالہ ائرپورٹ تک جائیں گے۔ وہاں تمہیں ہمارے لیے ایک بوئنگ ۷۳۷ کا بندوبست کرکے رکھنا ہوگا۔ یہ سب لکھ رہے ہونا؟ جہاز کے اندر تین افراد پر مشتمل عملے کے سوا کوئی نہ ہو۔ کوئی چالاکی نہ کرنا اس لیے کہ ہم جہاز کو پوری طرح چیک کریں گے۔ ہمارے ساتھ دھماکا خیز مادہ بھی ہوگا۔ کوئی بھی گڑبڑ ہوئی تو میں عملے سمیت جہاز کو اُڑادوں گا۔ سمجھ گئے؟"

"ہاں۔"

"بس تو لکھتے رہو۔ میری بات ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔ جہاز میں چھ پیراشوٹ بھی موجود ہونے چاہئیں۔"

"یہ تو یک طرفہ معاملہ لگتا ہے۔ یہ بتاؤ' یہ سب کچھ کرکے ہمیں کیا حاصل ہوگا؟"

"تمہیں صحیح سلامت جہاز' عملہ اور یرغمالی ملیں گے۔"

"دیکھو... تمہیں یہ سب کچھ مل جائے گا لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم یرغمالیوں کو یہیں چھوڑ کر جاؤ۔ میرا وعدہ ہے کہ ہم تمہیں روکنے کی کوئی کوشش نہیں کریں گے۔"

"مسخرا پن مت کرو۔ تم مطالبات کی پوزیشن میں نہیں ہو ایس پی۔ ٹھیک چھ بجے تک یہ تمام کام ہوجانے چاہئیں۔ اب بہتر یہ ہے کہ تم مصروف ہوجاؤ" بابر نے یہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا پھر وہ نذیر کی طرف مڑا "کم بخت' چالاکی سے باز نہیں آتا لیکن اسے یہ نہیں معلوم کہ اس کا واسطہ کس سے پڑا ہے۔"

○☆○

ایس پی جلیس نے ریسیور رکھا اور سامنے رکھے پیڈ کو گھورنے لگا' جس پر اس نے شرائط لکھی تھیں لیکن وہ ایک اور بات سوچ رہا تھا۔ بیک گراؤنڈ میں جو اس نے نسوانی آواز سُنی تھی.... جو بابر کو پکار رہی تھی' اس میں کوئی عجیب سی بات تھی لیکن کیا؟ نسوانی آواز سُننا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ دہشت گردوں میں ایک عورت بھی شامل ہے۔ کاش... اس نے آواز ٹیپ کرنے کا کوئی بندوبست کررکھا ہوتا۔ تب وہ یہ گفتگو دوبارہ سُن سکتا تھا۔

لڑکی نے کیا کہا تھا.... بابر' کیا ہورہا ہے؟ ہاں یہی کہا تھا اس نے۔ اور آواز اسی کمرے سے آتی محسوس ہورہی تھی۔ تو پھر یہ پوچھنے کا کیا مطلب کہ کیا ہورہا ہے؟ ممکن ہے' لڑکی سوگئی ہو اور کال کے درمیان اس کی آنکھ کھلی ہو لیکن نہیں.... اس صورت میں تو وہ خود دیکھ سکتی تھی کہ کیا ہورہا ہے لیکن اور کوئی بات بھی تھی... جانی پہچانی سی مگر وہ اسے سمجھ نہیں پارہا تھا۔ چند لمحوں کی کوشش کے بعد اس نے اس خیال کو ذہن کے کسی دور کے گوشے میں دھکیل دیا۔ اس کے سامنے اور بھی مسئلے تھے۔ وزیرِ داخلہ مری آچکے تھے لیکن انہوں نے بہت رازداری سے کام لیا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اخبار نویسوں کو فی الوقت اس صورتِ حال کا علم ہو۔ انہوں نے اس سے بہت اچھی طرح بات کی تھی' اس کی حوصلہ افزائی کی تھی اور اس پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ انہوں نے اس سے

صورتِ حال پوچھی تھی۔ کارروائی کی تفصیل سُنی تھی اور مزید کارروائی کے امکان پر اس سے تبادلۂ خیال کیا تھا۔ وہ اس سے متفق تھے کہ اب مزید کارروائی یرغمالیوں کے لیے خطرناک ہوگی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ تاوان کی رقم شام تک پہنچ جائے گی اور انہوں نے خصوصی انسدادِ دہشت گردی اسکواڈ کا دستہ طلب کرلیا ہے لیکن جب تک مجرم اسکول میں ہیں، کیس کا انچارج وہی ہوگا۔ اس کے بعد اسکواڈ کا سربراہ کیس کا انچارج ہوگا۔ دونوں گروپ ایک دوسرے سے تعاون کریں گے۔ انہوں نے اسے فون نمبر بھی دیا، جس پر وہ ان سے رابطہ کرسکتا تھا۔

جلیس نے پہلا کام یہ کیا کہ وزیرِ داخلہ کو فون کرکے انہیں مجرموں کی شرائط سے آگاہ کیا "تو وہ یرغمالیوں کو یہاں رہا کرنے پر آمادہ نہیں؟" وزیر صاحب کے لہجے میں پریشانی تھی۔

"جی جناب۔"

"پیراشوٹ طلب کرنے کا مطلب ہے کہ وہ درمیان میں کہیں جمپ کریں گے۔"

"یہ بھی ممکن ہے کہ یہ فرمائش ہمیں دھوکا دینے کے لیے ہو" جلیس نے کہا۔

"ممکن ہے لیکن چھ پیراشوٹ کیوں۔ تمہارا کہنا ہے کہ دہشت گرد صرف چار ہیں۔ کہیں وہ بدعہدی تو نہیں کرنا چاہتے" وزیر کی آواز کسی اندیشے کے بوجھ سے لرزنے لگی۔

"کچھ نہیں کہا جاسکتا جناب۔"

"خیر۔ دیکھو، میری یہ بات گرہ میں باندھ لو۔ تمہیں ان کی ہر ہدایت کی تعمیل کرنی ہے۔ اب ضرورت پڑنے پر تم ہوم منسٹری سے رابطہ کروگے، سمجھ گئے؟"

"جی ہاں جناب۔"

"گڈ لک۔"

رابطہ منقطع ہوگیا۔ اس کے بعد اسپتال سے فون آیا۔ دو زخمی جوانوں میں سے ایک چل بسا تھا دوسرے کی حالت بدستور تشویش ناک تھی۔ جلیس کا وجود غصے سے پھنکنے لگا۔ کاش.... اسے موقع ملے۔ بابر اب اس کا ذاتی شکار بن گیا تھا۔ اس کے تین جوان زندگی سے محروم ہوچکے تھے۔

اگلے ایک گھنٹے وہ مواصلاتی ٹرک میں رابطوں میں مصروف رہا۔ یہ ٹرک دو گھنٹے پہلے آیا تھا اور میدان میں کھڑا تھا۔ اب اس کے لیے رابطہ کرنا زیادہ آسان ہوگیا تھا۔ اس نے ویگن کا بندوبست کیا اور راولپنڈی پولیس کو الرٹ رہنے کی ہدایت کی۔ فی الحال تو کیس اس کے ہی ہاتھ میں تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ آہستہ آہستہ معاملہ اس کے ہاتھ سے نکلتا جارہا ہے۔ انسدادِ دہشت گردی اسکواڈ کا انچارج میجر نصیر تھا۔ وہ اس سے خندہ پیشانی سے ملا لیکن انداز سے پتا چلتا تھا کہ وہ خوش نہیں ہے۔ مسئلہ وہی پیشہ ورانہ رقابت کا تھا۔

جلیس ٹرک سے نکلا تو خاصا بہتر محسوس کررہا تھا۔ اب اس کی ذمے داری میں اور لوگ بھی شریک ہوگئے تھے تو وہ خود کو نسبتاً ہلکا پھلکا محسوس کررہا تھا لیکن ساتھ ہی اس معاملے کو خود ہی کامیابی سے نمٹانے کی خواہش بھی زور پکڑ گئی تھی۔ اس کے پاس نظری کی کمی نہیں تھی۔ تو کیا وہ چار افراد کو.... صرف چار افراد کو ایک بھیانک جرم کامیابی سے کرنے سے نہیں روک سکتا تھا؟

وہ اپنے بوتھ کی طرف چل دیا۔ اس عزم کے ساتھ کہ مجرموں کو روکنے کی ایک کوشش اور کرنی ہے۔

وہ لسٹ ہاتھ میں لیے کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ میز پر رکھا واکی ٹاکی بڑبڑایا "سر.... پرنسپل جمیل الرحمان صاحب آپ سے ملنے آنا چاہتے ہیں۔"

اس نے ایک بٹن دبایا اور کہا "بھیج دو انہیں۔"

جمیل الرحمان جس وقت بوتھ میں داخل ہوا، جلیس بیٹھا واکی ٹاکی کو گھور رہا تھا۔ اس نے جمیل الرحمان کو آتے اور دو پیالیوں میں کافی انڈیلتے بھی نہیں دیکھا۔ جمیل الرحمان نے کافی کی پیالی اس کی طرف بڑھائی تو وہ چونکا۔

"کیا بات ہے۔ کسی گہری سوچ میں گم ہو؟" جمیل الرحمان نے پوچھا۔

"ایک بات مجھے مسلسل پریشان کررہی ہے۔ میں اسے ذہن سے جھٹک نہیں پارہا ہوں۔"

"کوئی اہم بات ہے؟"

"میں انٹر کام پر مجرموں کے سرغنے سے بات کررہا تھا کہ پس منظر میں مجھے ایک عجیب سی آواز سُنائی دی۔ میں اس کی نوعیت نہیں سمجھ پارہا ہوں" جلیس نے پُرخیال انداز میں کہا پھر چونک کر پوچھا "ایک بات بتائیں۔ فیکلٹی روم میں فون کی سہولت موجود ہے؟"

"نہیں۔ صرف انٹر کام ہے وہاں۔"

"مجھے یقین ہے کہ میں نے پس منظر میں گھٹی گھٹی سی۔ کھرکھراتی ہوئی نسوانی آواز سنی تھی۔ اب مجھے خیال آرہا ہے کہ اس کے فوراً بعد بابر نے ریسیور پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اس کے باوجود کچھ اس نے کہا، میں نے سُن لیا تھا۔ اس نے لڑکی کو خود خاموش رہنے کو نہیں کہا تھا۔ اس نے نذیر سے کہا تھا کہ اسے چپ کراؤ۔ میں بعد میں بات کروں گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بولنے والی کمرے میں موجود نہیں تھی۔ بات سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ آواز سے لگتا تھا کہ بولنے والی اسی کمرے میں موجود ہے۔"

"ممکن ہے، وہ ایک دوسرے سے واکی ٹاکی کے ذریعے رابطہ کررہے ہوں" جمیل الرحمان نے رائے زنی کی۔

"میں نے بھی یہی سوچا تھا لیکن بچ نکلنے والے طلبا میں سے کسی نے بھی دہشت گردوں کے پاس ریڈیو نہیں دیکھا۔ جبکہ وہ چاروں اکٹھے بھی کلاس روم میں موجود رہے۔"

پرنسپل نے پیکٹ میں سے دو سگریٹیں نکالیں اور ایک جلیس کی طرف بڑھائی "یہ بھی تو ممکن ہے کہ ان کا کوئی ساتھی باہر موجود ہو... کسی ایسی جگہ' جہاں سے اسکول پر نظر رکھی جا سکتی ہو۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا" جلیس نے کہا "میں یہ بات نہیں سمجھ سکا کہ آخر انہوں نے ہمہ وقت ایک آدمی کلاس روم میں کیوں نہیں رکھا' جو یرغمالیوں پر نظر رکھتا۔ اس صورت میں کوئی ایک یرغمالی بھی نہ نکل پاتا۔ اس صورت میں انہیں ہماری کارروائی کا ابتدا ہی میں علم ہو جاتا" وہ اُٹھ کھڑا ہوا "آپ پلیز یہیں موجود رہیں۔ میں اب اپنے اس آدمی سے بات کروں گا' جس نے علاقہ خالی کرایا تھا۔ میں اس سے کہوں گا کہ ہر اس دروازے کو دوبارہ چیک کرے' جہاں سے جواب نہیں ملا تھا اور اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ وہاں کوئی موجود نہیں" وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

اس وقت اس کے ذہن میں ایک ہی خیال تھا... کاش' اس کے بعد کچھ زیادہ مہلت ہوتی... زیادہ وقت ہوتا!

○☆○

نذیر کے لیے وقت گھسٹ گھسٹ کر گزر رہا تھا۔ اس نے سونے کی کوشش کی لیکن وہ نیند اور بیداری کے درمیان معلق ہونے کی بدترین کیفیت سے دوچار رہا۔ اس کا جسم نیند کے لیے فریادیں کر رہا تھا لیکن اس کے ذہن کو ہر آواز' ہر آہٹ سے جھٹکا لگ رہا تھا۔ مشکور اور شہلا کھانا کھانے کے لیے آئے تو انہوں نے حتی الامکان آہستگی سے کام لیا۔ تاکہ اس کی نیند میں خلل نہ پڑے مگر صوفیہ بے آرام نیند میں ہذیانی انداز میں بڑبڑائے جا رہی تھی۔

پانچ بجے کے قریب نذیر تنگ آ کر اُٹھ بیٹھا۔ بابر نے روانگی کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ وہ ہچکچاتے ہوئے اس کی مدد کرنے کے لیے اُٹھا۔

فیکلٹی روم میں زندگی اور اُمید کی لہر دوڑ گئی تھی۔ شاید اسیر اور صیاد دونوں ہی خوش تھے کہ جمود ٹوٹ گیا ہے اور اب وہ کچھ مختلف کام کر رہے ہیں۔ اسکول کی عمارت اب انہیں کاٹنے کو دوڑ رہی تھی۔ گزشتہ رات کے حملے اور اس کے بعد کی کشیدگی نے سب کو نڈھال کر دیا تھا۔ بابر کے سوا کوئی ایسا نہیں تھا' جو دوبارہ اس صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو اور اس کی ہمت رکھتا ہو۔ وہ سب چاہتے تھے کہ اب جلد از جلد یہ معاملہ ختم ہو اور انہیں سکون اور تحفظ کا احساس میسر آئے۔

نذیر اس اُمید پر بے یقینی کا کوئی سایہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ بابر سے یرغمالیوں کے مستقبل کے متعلق بات کرتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ ایک وقت ایسا تھا' جب وہ یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ محفوظ رہیں گے۔ بابر منصوبے کی کامیابی کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ لہٰذا خون خرابے کا کوئی امکان نہیں تھا' اس پر مستقبل کے منصوبوں کی کامیابی کا انحصار تھا۔ انہیں یہ تاثر چھوڑنا تھا کہ زرِ تاوان کی ادائیگی یرغمالیوں کے تحفظ کی ضمانت ہوتی ہے۔ ورنہ آئندہ کون سوچے گا کہ یرغمالیوں کی لاشوں کے لیے بھاری زرِ تاوان ادا کیا جائے۔ یوں تو مستقبل میں صرف کمانڈو کارروائیاں ہونا تھیں مگر اب وہ جانتا تھا کہ بابر کا رویہ بدل گیا ہے۔ اس نے منطق کو شاید اپنے نئے نکتۂ نظر کے حق میں اُلٹ دیا تھا۔ اب وہ یرغمالیوں کو ختم کرنے کے لیے یہ دلیل دے گا... اس طرح پولیس کو معلوم ہو جائے گا کہ ان کی حماقت کے جواب میں ہم کیا کر سکتے ہیں' وہ یرغمالیوں کی موت کی ذمّے داری پولیس پر ڈال دے گا۔ وہ کہے گا... اگر پولیس نے کارروائی نہ کی ہوتی تو یرغمالیوں کا بال بھی بیکا نہ ہوتا' اس نے مجبوراً پولیس کو اپنی ہٹ دھرمی اور بے عقلی کی سزا دی ہے۔ بابر میں یہ عجیب وصف تھا کہ وہ اپنے ہر نکتہ نظر کو درست ثابت کر دیتا تھا اور نذیر جانتا تھا کہ یرغمالیوں کو ختم کرنے کی بابر کی خواہش بے حد توانا ہے۔

اسے شہناز کی آواز نے چونکا دیا۔ اس نے ریڈیو اُٹھایا "کیا بات ہے؟"

شہناز نے کہا "وجہ مجھے نہیں معلوم لیکن اپارٹمنٹ بلڈنگ کو دوبارہ چیک کیا جا رہا ہے" اس کے لہجے میں پریشانی تھی "باہر خاصی تعداد میں پولیس والے نظر آ رہے ہیں۔"

"تم یقین سے کہہ سکتی ہو کہ پولیس اسکول کے پارکنگ ایریا کو نہیں گھیر رہی ہے... اور ہمیں روکا نہیں جائے گا؟" نذیر کو اپنی فکر پڑی تھی۔

بابر کمرے میں چلا آیا اور ان کی گفتگو سُننے لگا۔

"ممکن ہے' گھیر رہے ہوں' مگر میں کیا کروں' میں نروس ہو رہی ہوں۔"

"وہ دوبارہ دستک دیں' تب بھی دروازہ نہ کھولنا۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا" نذیر نے اسے تسلی دی "اب اسکول کی صورتِ حال بتاؤ۔"

"میدان میں ایک ٹویوٹا ہائی ایس ویگن کھڑی کر دی گئی ہے۔"

"رقم کا سوٹ کیس بھی دکھائی دیا؟"

"ابھی تک تو نہیں دیکھا۔ اتنی گاڑیاں آ جا رہی ہیں کہ سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

"رقم آ جائے تو ہم بیس منٹ کے اندر اندر نکل لیں گے۔" نذیر نے آہ بھر کے کہا۔

"نذیر... میں تم لوگوں کے ساتھ نہیں جا سکتی کیا؟ پلیز... مجھے بھی لے چلو تم لوگ۔"

"نہیں" بابر نے مداخلت کی "اس سے کہو کہ یہ بعد میں مقررہ مقام پر پہنچے گی... اکیلی۔ منصوبے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔"

نذیر نے وہ پیغام ریڈیو پر دُہرا دیا۔

"مجھے پولیس والوں کی موجودگی سے ڈر لگ رہا ہے۔ نذیر... پلیز۔ مجھے ساتھ ہی لے چلو۔"

"فکر نہ کرو۔ جلد ہی ہم ملیں گے شہناز۔"

"اچھا۔ اپنی طرف کی کوئی خاص خبر تو سناؤ۔"

نذیر نے کن انکھیوں سے بابر کو دیکھا' جو دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے سرگوشی میں کہا "رات بابر نے ایک طالبہ کے ساتھ زیادتی کی۔ نازیہ نام تھا اس کا... نازیہ توقیر۔"

ریڈیو پر چند لمحے خاموشی رہی "نازیہ توقیر" پھر شہناز نے عجیب سے لہجے میں دہرایا۔

"کیوں؟ تم جانتی ہو اسے؟"

"نہیں۔ نہیں تو۔ بس توقیر نام کا ایک شخص یاد آ گیا تھا... کاش... کاش..." ساتھ ہی ریڈیو آف ہو گیا۔

بابر کمرے میں واپس آیا اور عجیب سی نظروں سے انٹرکام کو دیکھتا رہا۔ نذیر نے جان لیا کہ اس وقت اس ذہن میں کوئی خوش گوار سوچ نہیں ہو سکتی۔ اچانک بابر تیزی سے ایڑیوں کے بل گھوما اور تند لہجے میں بولا "اگر انہوں نے کوئی حماقت کی تو اس بار عمر بھر پچھتائیں گے اور تم... تم اس بار مجھے روکنے کی غلطی نہ کرنا۔"

○☆○

شہناز نے ریڈیو آف کیا اور کرسی سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ اس کے تصور میں فلم سی چلنے لگی۔ اپنی بربادی کی فلم! توقیر کا نام سن کر اسے ویڈیو والا توقیر یاد آ گیا تھا۔ توقیر جس نے صرف اسے ہی نہیں' جانے اس جیسی کتنی معصوم لڑکیوں کو تباہ کیا ہوگا۔ اس کے گھرانے جیسے کتنے ہی گھرانوں کو برباد کیا ہوگا۔ کاش یہ نازیہ اسی توقیر کی بیٹی ہو۔ عملِ مکافات اسی کو تو کہتے ہیں لیکن نہیں' یہ کیسے ممکن ہے... کہاں ممکن ہے۔ خدا بھی ایسوں کو ڈھیل دیتا ہے۔ ان کی رسی کہاں کھینچی جاتی ہے اور پھر کہاں کراچی اور کہاں مری کا یہ اسکول!... پھر بھی... کاش... کاش۔

اچانک وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جس زخم کے متعلق وہ سمجھ رہی تھی کہ مندمل ہو چکا ہے' اب بھی ہرا تھا۔ ایک یاد کی ٹھیس لگی تھی تو ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔

وہ روتی رہی... کیا میرے قاتل کا احتساب کرنے والا کوئی نہیں... کوئی بھی نہیں؟ نہ زمین پر' نہ آسمان پر! کیا میری تباہی کا حساب کوئی نہیں لے گا؟ خدا بھی نہیں!

○☆○

جلیس نے اپنی گھڑی پر اور پھر انٹرکام پر نظر ڈالی۔ سب کچھ سیٹ تھا۔ تمام انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ نیچے ویگن تیار کھڑی تھی۔ چار سوٹ کیسوں میں پانچ کروڑ روپے کی رقم بھی پہنچ چکی تھی۔ رقم پولیس کی ایک گاڑی میں رکھی تھی۔ جلیس نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ اردگرد کی عمارتوں سے کوئی دیکھ بھی رہا ہو تو اسے رقم کے سوٹ کیسوں کی جھلک بھی دکھائی نہ دے اور اب اس کے سامنے ایک مشکل فیصلہ تھا۔ ایک طرف تو وہ بابر کو مشتعل کرنے سے خوف زدہ تھا۔ دوسری طرف وہ اسے کامیاب بھی نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ اس کے لیے اسے مہلت درکار تھی۔ اسکول کے قریب کی عمارتوں کی تلاش کا ابھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا۔ لیکن اسے یقین تھا کہ نتیجہ نکلے گا ضرور۔ اگر مجرموں کی باہر والی ساتھی پکڑی گئی تو اس سے کام کی معلومات حاصل کی جاسکیں گی۔ ویسے بھی اس قسم کی صورتِ حال میں دنیا بھر میں ایک ہی حکمتِ عملی آزمائی جاتی ہے۔ دہشت گردوں کو لٹکائے رکھنا اور انہیں تھکانا۔ جب وہ تھک جاتے ہیں تو ان کا ارتکاز اور ان کی قوت فیصلہ متاثر ہوتی ہے۔ ان کا دفاع کمزور ہو جاتا ہے۔ ایسے میں انہیں ہتھیار ڈالنے پر بھی مجبور کیا جاسکتا ہے اور دوسری صورت میں ان پر کاری وار کرنا نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔

لیکن ایک مسئلہ تھا۔ اوپر کے احکامات تھے کہ مجرموں کا ہر مطالبہ تسلیم کرلیا جائے۔ اس میں جلیس کو توہین محسوس ہو رہی تھی۔ گویا اوپر والے اس کی اہلیت پر یقین نہیں رکھتے۔ سب سے بڑا مسئلہ یرغمالیوں میں وزیرِ داخلہ کے بیٹے کی موجودگی کا تھا۔ اب اگر جلیس اپنے طور پر مجرموں کو روکنے کے لیے کوئی قدم اٹھاتا تو نہ جانے اس کا کیا حشر ہوتا اور لٹکائے جانے کی صورت میں بابر کچھ بھی کرسکتا تھا۔ اب تک جلیس اس کی فطرت کو بڑی حد تک سمجھ سکتا تھا۔

پھر اس نے سوچا' اس کا کیریئر تو ویسے ہی داؤ پر لگ چکا ہے۔ وزیرِ داخلہ نے اسے سراہا تھا لیکن سیاست دانوں کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ اس پر کئی الزام لگتے تھے آخر میں۔ اسے کارروائی کے سلسلے میں جواب دہی کرنی تھی۔ پھر اس کے بیٹے کی یرغمالیوں میں موجودگی بھی زیرِ غور آتی۔ ہر صورت میں پھندے کے لیے مناسب ترین گردن اسی کی ہوتی۔ لہٰذا اب ڈرنا کیا؟

وہ بابر کی بے رحمی سے خوف زدہ تھا۔ اس کے باوجود وہ ایک آخری کوشش ضرور کرنا چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ محض چند گھٹیا مجرموں کے سامنے اس کا محکمہ ذلیل ہو۔

اسی وقت واکی ٹاکی گنگنایا۔ اس نے بٹن دبایا "سر۔ توقیر نامی ایک صاحب آئے ہیں۔ ان کی بیٹی نازیہ یرغمالیوں میں شامل ہے۔"

جلیس سمجھ گیا۔ اس لڑکی کا باپ' جس کے ساتھ بابر نے زیادتی کی تھی "ان سے کہو۔ میں ابھی نیچے آتا ہوں۔"

واکی ٹاکی بند کرکے وہ انٹرکام کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور فیکلٹی روم کا نمبر دبایا۔

بابر نے فوراً ہی جواب دیا' لگتا تھا وہ انٹرکام کے پاس ہی منتظر بیٹھا تھا۔

○☆○

بابر کے چہرے کے تاثر سے نذیر نے اندازہ لگایا کہ وہ کسی اچھی خبر کی توقع نہیں کر رہا ہے۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کہا "یس؟"

دوسری طرف سے ایس پی جلیس نے کہا "مجھے افسوس ہے کہ رقم آنے میں تاخیر ہو رہی ہے۔"

"پانچ منٹ کے اندر اندر ویگن رقم سمیت نیچے پہنچ جانی چاہیے۔"

"دیکھو... ہم ناممکن کو تو ممکن نہیں بنا سکتے۔ تم جانتے ہو کہ آج جمعہ ہے۔"

"میرے منصوبے کے عین مطابق" بابر نے سرد لہجے میں کہا "یہ جس لیول کا معاملہ ہے۔ اس میں بینکوں کی چھٹی کی کوئی اہمیت نہیں۔"

"اس کے باوجود..."

بابر نے اس کی بات کاٹ دی "صرف اور صرف پانچ منٹ ہیں تمہارے پاس۔"

"سنو... کم از کم دو گھنٹے ضرور لگیں گے۔"

"تم بہت احمق آدمی ہو گٹلے.... بہت ہی بے وقوف" بابر پھنکارا "میں تمہیں ہر طرح کی وارننگ دے چکا ہوں۔ اب تمہیں پتا چل جائے گا" اس نے ریسیور پٹخا اور اٹھ کر کمرے کے وسط میں گیا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں اور ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ وہ کمال کو گھورتا رہا۔ اس کے اندر اس شخص کے لیے نفرت اُمڈ رہی تھی۔ وہ اس کی طرف ایک قدم بڑھا مگر رک گیا۔ ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں دھند سی اُتری لیکن فوراً ہی چھٹ گئی۔ اب اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ اس نے رخ بدلا اور نازیہ کی طرف بڑھنے لگا۔ رئیس اور مظفر سہم کر ایک طرف ہٹ گئے۔ نازیہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور ہذیانی انداز میں چلانے لگی۔ بابر نے اس کا ہاتھ تھاما اور جھٹکے سے اسے صوفے سے کھینچا۔ وہ اسے فرش پر گھسیٹتے ہوئے دروازے کی طرف لے چلا۔ نازیہ نے مزاحمت کی کوشش کی۔ پہلے اس نے ایک کرسی پکڑی.... پھر دروازے کا فریم لیکن بابر کو اس کا احساس بھی نہیں ہوا۔ وہ اسے راہداری میں گھسیٹ لے گیا۔

کمال بڑی جدوجہد کر کے کرسی سے اُٹھا اور اس نے پاس سے گزرتی ہوئی نازیہ کی ٹانگ پکڑنے کی کوشش کی لیکن رائفل کی نال نے اسے دوسری طرف اُلٹ دیا۔ پھر بھی وہ اٹھ کر دروازے کی طرف دو قدم بڑھا۔ اس بار رائفل کی نال اس کے پیٹ میں لگی۔ وہ نال کو دور ہٹاتے ہوئے پھر بھی بڑھنے کی کوشش کرتا رہا لیکن نذیر رائفل آگے بڑھائے اپنی جگہ مضبوطی سے کھڑا رہا۔ وہ نفی میں سر ہلائے جا رہا تھا "تم اسے روک نہیں سکتے ماسٹر۔ تم صرف مر سکتے ہو" اس کے لہجے میں دھمکی نہیں، التجا تھی اور نذیر سچ کہہ رہا تھا۔ جو کچھ ہونے والا تھا، اسے روکا نہیں جا سکتا تھا۔ بابر کو کوئی بھی نہیں روک سکتا تھا۔

لیکن کمال اسے دھکیلنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ بار بار سر جھٹک رہا تھا۔ اس کے اندر اس حقیقت کی قبولیت موجود تھی کہ کچھ نہیں کیا جا سکتا مگر وہ اس سے لڑ رہا تھا۔ وہ اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے رائفل کی نال پر جھپٹا مارا لیکن رائفل تیزی سے پیچھے ہٹالی گئی۔ وہ ایک قدم اور آگے بڑھا۔ اسی لمحے رائفل کا دستہ اس کے زخمی کندھے سے ٹکرایا۔ اس کے حلق سے چیخ نکلی اور اس کی ٹانگیں جواب دے گئیں۔ درد اس کے پورے جسم میں دوڑ گیا۔ متلی کا احساس جاگ اٹھا پھر بھی اس نے رینگ کر دروازے کی طرف بڑھنے کی کوشش کی لیکن آدھے راستے میں ہی بے ہوشی کے اندھیرے نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

نازیہ کی چیخیں پوری بلڈنگ میں گونج رہی تھیں... درودیوار سے پھوٹتی محسوس ہو رہی تھیں.... کلاس روم میں پہنچنے کے بعد بابر نے نازیہ کو چھوڑ دیا، جو مسلسل چیخ اور لاتیں چلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے نازیہ کے ٹھوکر ماری۔ یوں اس کی ٹانگ نازیہ کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ بابر نے جھک کر لڑکی کو بالوں سے پکڑا... اور اسے گھسیٹتے ہوئے اندر لے گیا۔ اس وقت اسے لڑکی سے شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس کے لیے اس پلیٹ کی طرح تھی، جس میں ایک بار کھانا کھا کر اسے پھینک دیا جاتا ہے۔ اس نے اس کے بالوں کو اپنی کلائی پر لپیٹا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے سر پر پوری قوت سے گھونسا مارا پھر اس نے شاٹ گن فرش پر پھینکی اور اپنے آزاد ہاتھ سے کھڑکی کا پردہ ہٹایا۔ باہر اس نے اسٹیڈیم کے اسکورنگ بوتھ کی طرف دیکھا۔ فاصلہ زیادہ تھا پھر بھی اسے ایک ہیولا سا شیشے کے بوتھ میں کھڑا نظر آ رہا تھا۔ وہ اسی کھڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

بابر نے بڑی تیزی سے لڑکی کو بالوں سے تھام کر کھڑا کیا اور اپنی بیلٹ سے ریوالور نکالا۔ ایک ہی وار میں کھڑکی کا بچا کھچا شیشہ بھی ٹوٹ گیا۔ اس وقت اس کے دل میں رحم کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ اس نے ریوالور نازیہ کی کنپٹی سے لگایا اور ٹریگر دبا دیا۔ اگلے ہی لمحے اس نے لڑکی کو اُٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

○☆○

ایس پی جلیس نے وہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ اسے سلو موشن میں ٹی وی پر چلنے والا کوئی غیر حقیقی منظر لگا تھا۔

کھڑکی سے پردے ہٹے۔ لڑکی کا معصوم چہرہ نظر آیا پھر لڑکی کو بالوں سے پکڑ کر اُٹھانے والا ہاتھ نگاہوں سے اوجھل ہوا.... صرف ایک ثانیے کے لیے پھر اس ہاتھ نے کھڑکی کا شیشہ توڑا۔ لڑکی کے ہاتھ بے نام مزاحمت کے لیے اوپر اُٹھے پھر براؤن بالوں کے ہالے میں وہ چاند سا حسین چہرہ.... وہ خوب صورت سر، اور پھر جیسے کیمرہ ٹرک کے ذریعے وہ سر اور چہرہ چٹختا بکھرتا نظر آیا.... سلو موشن میں۔ اسے فائر کی آواز نہیں سُنائی دی۔ اس کا دماغ جیسے سُن ہو گیا تھا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے بے سر کی اس گڑیا کو دھیرے دھیرے نیچے گرتے دیکھا۔ اب وہ چھوٹی سی گٹھری زمین پر کھلی پڑی تھی۔ وہ آگے کی طرف جھکا۔ اس نے ہاتھ پھیلائے، جیسے بچی کو زمین سے اٹھا کر اپنی حفاظت میں لینا چاہتا ہو مگر اس کے ہاتھ شیشے کی دیوار سے ٹکرا کر رہ گئے۔ وہ مڑی تڑی، ٹوٹی پھوٹی گڑیا زمین پر بکھری پڑی

تھی۔ وہ زندگی سے محروم ہو گئی تھی.... صرف اس لیے کہ اس نے ایک احمقانہ فیصلہ کرنے کی غلطی کی تھی۔

اسے احساس بھی نہیں تھا کہ اس کی انگلیاں شیشے کی دیوار میں گھُسنے کی کوشش کر رہی ہیں اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ اس نے واکی ٹاکی کی بڑبڑاہٹ بھی نہیں سُنی۔ اس کی توجہ صرف زمین پر پڑے اس بے جان وجود پر مرکوز تھی۔ وہ اس کی بیٹی تھی.... وہ بیٹی، جس کی اس نے عمر بھر آرزو کی تھی لیکن قدرت نے اسے اس کے گھر میں نہیں اُتارا تھا۔ بلکہ اس کے لیے دنیا کی ہر بچی.... ہر لڑکی کو اس کی بیٹی بنا دیا تھا اور اب اس کی وہ بیٹی مر گئی تھی.... اس سے ہمیشہ کے لیے چھن گئی تھی۔ صرف اس لیے کہ اس نے اپنی انا کے زیرِ اثر غلط فیصلہ کر کے اسے بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ شاید اس لیے خدا نے اسے بیٹی نہیں دی تھی۔ وہ بیٹی کا باپ بننے کا اہل ہی نہیں تھا۔ بیٹی کے باپ کہیں ایسے ہوتے ہیں!

وہ پہلا موقع تھا کہ اسے اپنے سینے میں دل کے مقام پر کند دھار کے ایک نامانوس درد کا چاقو اترتا محسوس ہوا۔ اس درد نے ہی اسے اس جہنم سے رہائی دلائی، جس میں وہ جل رہا تھا۔ اس درد نے ہی اسے گرد و پیش کا احساس دلایا۔ بوتھ میں کوئی موجود تھا۔ وہ اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کے بازو کو تھام کر جھنجوڑ رہا تھا اسے۔ وہ ایک ہی بات بار بار دُہرائے جا رہا تھا۔ بالآخر اس کی سماعت کا بند دروازہ کھل گیا۔

"کیا ہوا سر؟ آپ ٹھیک تو ہیں۔"

وہ جھٹکے سے شیشے کی دیوار سے پیچھے ہٹا۔ اس نے سر گھما کر اپنے انسپکٹر کو دیکھا اور یوں بولا جیسے میلوں دور سے بول رہا ہو "ان خبیثوں کو ویگن دے دو۔ انہیں اس لعنتی رقم کے وہ سوٹ کیس بھی دے دو اور عمارت کے پاس سے ہر جوان کو ہٹا لو۔ انسدادِ دہشت گردی والوں کو بھی ہٹا دو۔ انہیں جانے دو۔ روکنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔"

انسپکٹر چند لمحے اسے اُلجھن بھری نظروں سے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا "بہت بہتر سر۔"

ایس پی جلیس کی نظریں انٹرکام پر جم گئیں۔ اس کے درد سے نڈھال دل میں وحشت کی ایک تند لہر اٹھی۔ اس نے سینے پر رکھا دل کو تھامنے والا ہاتھ اٹھایا اور انٹرکام کو تار سمیت اکھاڑ پھینکا۔ اس پر بھی وحشت میں کمی نہیں ہوئی تو اس نے پلاسٹک کے اس بکس کو اٹھا کر بوتھ کے دروازے سے باہر پھینک دیا۔

○☆○

شہناز اپنے آنسوؤں سے لڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اپنی چیخ کو روکنے کے لیے اس نے اپنی سختی سے بھنچی ہوئی مٹھی منہ میں ٹھونس لی تھی۔ ہاتھ میں جہاں اس کے دانت گڑے تھے، خون نکل آیا تھا۔ اس نے اس بے رحمانہ قتل سے منہ موڑنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بہت سرعت سے انجام دیا گیا تھا اور اب اس کی نظریں زمین پر پڑے ٹوٹے پھوٹے وجود پر جمی تھیں۔ اس نے یہ نہیں دیکھا کہ لڑکی کو کس نے شوٹ کیا ہے لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ صرف بابر ہی اس سفاکی کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔

اب وہ سوچ رہی تھی۔ میں نے یہ کیا کیا؟ ایسے سفاک آدمی سے کیوں منسلک ہوئی میں! لیکن فوراً ہی اسے اپنے اندر سے جواب بھی مل گیا.... اندھا جواب۔ اب اس گروپ کے سوا دنیا میں اس کا ہے ہی کون۔؟ وہ پہلے ہی ذلت کی انتہائی پستیوں میں گر چکی تھی۔ "لیکن اب تو تم اس سے بھی نیچے چلی گئی ہو" ضمیر نے پکارا "کیا تم خود کو اس معصوم لڑکی کا قاتل تسلیم نہیں کرو گی؟ کیا بابر نے تمہاری کمزوریوں کو ایکسپلائٹ نہیں کیا؟ کیا تم اس کی نظروں میں سرخرو ہونے کے لیے پہلے ہی ایک معصوم آدمی کو قتل نہیں کر چکی ہو؟ اب تم مظلوم نہیں، ظالم ہو۔" اس کے پاس اس ہٹ دھرمی کے سوا کوئی دفاع نہیں تھا کہ اب یہی لوگ اس کی فیملی ہیں۔

اسے پتا بھی نہ چلا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ اس نے اسکول کی طرف دیکھا۔ اسکول کے افتادہ سرے والے داخلی دروازے پر ویگن کھڑی کر دی گئی تھی۔ پولیس والے باہر جا رہے تھے۔ سڑک پہ سے رکاوٹیں ہٹائی جا رہی تھیں۔ اسٹیڈیم بھی خالی ہو گیا تھا اور پارکنگ ایریا بھی۔ البتہ اسٹیڈیم کے اسکورنگ بوتھ میں ایک شخص موجود تھا۔ وہ بھی اب باہر نکل رہا تھا۔

شہناز نے دوربین کا رخ لڑکی کی لاش کی طرف کیا۔ اسے دھچکا لگا۔ اسے اپنی نگاہوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ جو شخص لڑکی کی لاش کو سینے سے لگائے زمین پر گھٹنے ٹیکے بیٹھا تھا، اس کا چہرہ اس طرف تھا...... اور وہ وہی توقیر تھا.... اس کا اپنا قاتل.... ویڈیو شاپ والا توقیر۔

شہناز کے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ تو دنیا میں بھی انصاف ملتا ہے! انسانوں سے نہیں ملتا تو خدا سے تو ملتا ہے لیکن ایسا کیوں ہے کہ اس کے کلیجے میں ٹھنڈ نہیں پڑی۔ وہ خوش کیوں نہیں ہے۔ وہ اب بھی دکھی ہے.... اس درندہ نما انسان کی بیٹی کے لیے، جو بہرحال معصوم اور بے گناہ تھی۔

پھر ایک پولیس والا آیا اور توقیر کو سہارا دے کر اپنے ساتھ اسکول سے باہر لے گیا۔ دوسری طرف اسٹیڈیم کے اسکورنگ بوتھ میں موجود شخص مضطربانہ انداز میں ٹہل رہا تھا۔

اسکول کی عمارت کا داخلی دروازہ تھوڑا سا کھلا اور شہلا اور نذیر نے محتاط انداز میں سر نکال کر جھانکا۔ وہ لوگ اس کی طرف سے مثبت اطلاع کے باوجود کوئی خطرہ مول نہیں لے رہے تھے پھر دروازہ پوری طرح کھلا اور نذیر نے بھاگتے ہوئے دروازے سے ویگن تک کا فاصلہ طے کیا اور ویگن کے پیچھے دبک کر گرد و پیش کا

جائزہ لیتا رہا پھر اس نے ڈرائیور سائیڈ کا دروازہ کھولا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ویگن میں داخل ہونے کے بعد اس نے سینے کے بل رینگتے ہوئے ویگن کی پوری طرح تلاشی لی۔ اس نے سیٹوں کے نیچے جھانکا‘ فلور میٹس کو ہٹا کر دیکھا اور ڈیش بورڈ کی تلاشی لی۔ مطمئن ہونے کے بعد وہ ڈرائیونگ سیٹ پر واپس چلا آیا۔ اس نے ویگن اسٹارٹ کی اور اس کا رخ تبدیل کردیا۔ اب ویگن کا رخ اسکول کے سامنے والے گیٹ کی طرف تھا اور وہ داخلی دروازے سے تقریباً ملی کھڑی تھی۔

چند لمحے بعد اسکول کے داخلی دروازے سے چار یرغمالی نکلے۔ ان کے پیچھے شہلا اور مشکور تھے۔ ان کے ہاتھوں میں موجود ریوالوروں کا رخ یرغمالیوں کی طرف تھا۔ یرغمالی ویگن میں بیٹھ گئے۔ ان کے پیچھے شہلا اور مشکور تھے۔

آخر میں بابر باہر آیا۔ وہ سیدھا ویگن میں نہیں گیا۔ بلکہ ٹہلتا ہوا کارنر کی طرف بڑھا۔ اس نے اسٹیڈیم کی طرف دیکھا پھر جو کچھ ہوا‘ وہ شہناز کے لیے قطعاً خلافِ توقع تھا۔ بابر نے رائفل بلند کی اور بہت تیزی سے اسکورنگ بوتھ کی طرف کئی فائر کیے پھر وہ پھرتی سے ویگن کی طرف آیا اور نذیر کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

ویگن گیٹ کی طرف چل دی۔

○☆○

بوتھ میں موجود جلیس نے پہلے دہشت گرد کو باہر آکر ویگن میں بیٹھتے دیکھا۔ اس کے سینے میں درد ابھی نہیں تھما تھا لیکن بے بسی اور غصے نے درد کے احساس کو دبادیا تھا۔ وہ منحوس بابر کو دیکھنا چاہتا تھا اور جب بابر سامنے آیا تو وہ حیران رہ گیا۔ وہ دبلا پتلا‘ پستہ قامت اور بدشکل آدمی تھا۔ جس پر عام حالات میں کوئی دوسری نظر ڈالنا پسند نہ کرے۔ جلیس اتنا حیرت زدہ تھا کہ کھلا منہ لیے اسے تکنے کے سوا کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔

منحنی دہشت گرد کارنر تک آیا اور بدمعاشی کے انداز میں دونوں ٹانگیں کھول کر کھڑا ہوگیا پھر اس نے رائفل بلند کی۔ رائفل کا رُخ جلیس کی طرف تھا۔

جلیس لڑکھڑا کر ایک قدم پیچھے ہٹا۔ اسی لمحے پہلی گولی بوتھ کی شیشے کی دیوار توڑ کر اندر آئی۔ وہ کرچیوں کی بوچھار کی لپیٹ میں آگیا تھا۔ پیچھے ہٹتے ہوئے وہ بوکھلایا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ پیچھے رکھی میز سے ٹکرایا تو فیصلہ خودبخود ہوگیا۔ وہ لڑکھڑا کر فرش پر گرا‘ جہاں اب کرچیاں ہی کرچیاں تھیں۔ وہ فرش پر دم سادھے پڑا تھا۔ سینے کا درد شدت بھی پکڑ گیا تھا اور پھیلتا ہوا بائیں کندھے کے عضلات تک بھی آپہنچا تھا۔ اس کی سانس اتھلی اور تیز ہوگئی تھی۔ ہر سانس اس کے بائیں پہلو میں چاقو کی طرح گھستی محسوس ہورہی تھی۔ اس نے اٹھ کر کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن اس کوشش نے اذیت کے ساتھ مل کر اسے مفلوج سا کردیا۔ اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے اور درد کو کم کرنے کے لیے سانس لینے میں کمی کردی۔ ذرا دیر بعد درد کم ہوگیا۔ البتہ وہ اس کے کندھے کی نسوں کو اب بھی دھیرے دھیرے تھپک رہا تھا۔

اس نے اپنے پورے جسم پر ہاتھ پھیرا... یہ دیکھنے کے لیے کہ گولی کہاں پیوست ہوئی ہے۔ کافی دیر ٹٹولنے کے بعد وہ حیران رہ گیا۔ کوئی گولی اسے نہیں لگی تھی۔ وہ آہستگی سے فرش سے اُٹھا اس کے ہاتھ میں شیشے کی کرچیاں چبھی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ بالکل زخمی نہیں تھا۔

اس نے جلدی سے واکی ٹاکی اٹھایا‘ جس پر کوئی اسے کم ازکم ایک منٹ سے پکار رہا تھا۔ ”میں خیریت سے ہوں“ اس نے کہا ”انہیں جانے دو“ پھر اس نے باہر دیکھا۔ ویگن اب گیٹ سے نکل رہی تھی۔ وہ دیکھتا رہا۔ اس کے جسم میں خفیف سی لرزش تھی۔ وہ متضاد جذبوں کے طوفان کی لپیٹ میں تھا۔ جسمانی طور پر خوف اور غصہ اسے لرزا رہے تھے اور ذہنی طور پر وہ نڈھال بھی ہورہا تھا اور اسے ہلکا پھلکا ہوجانے کا احساس بھی تھا۔ کاش.... اس وقت بابر اس کے قابو میں ہوتا مگر ساتھ ہی وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اب وہ بری الذمہ ہوچکا ہے۔

○☆○

شہناز نے ویگن کو عمارت کے سامنے سڑک سے گزرتے اور پہاڑی سڑک پر نظروں سے اوجھل ہوتے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ لوگ جارہے تھے۔ اس کا جی چاہا کہ اپارٹمنٹ سے نکلے۔ بھاگتی ہوئی سڑک پر پہنچے اور ویگن کو رکنے کا اشارہ دے.... کہے.... مجھے بھی لے چلو۔ مجھے اکیلا کیوں چھوڑ رہے ہو؟ بابر اس کی اس وقت کی کیفیت کو سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ بابر نے اسے استعمال کیا ہے لیکن پھر بھی اسے بابر کی ضرورت تھی‘ پورے گروپ کی ضرورت تھی۔ اب ان لوگوں کے سوا دنیا میں اس کا تھا ہی کون۔ ان کے سوا کسی کے نزدیک اس کی کوئی وقعت نہیں تھی اور اب.... اب تو وہ قاتلہ بھی تھی اور ملک کی تاریخ کے مکروہ ترین جرم میں شریک بھی۔ یہ زیادتی تھی کہ وہ اسے اکیلا چھوڑ کر جارہے تھے۔ اسے ان کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔ صرف ان کے درمیان ہونا ہی اسے تحفظ کا احساس دے سکتا تھا اور اب تو اسے نذیر کے ساتھ مل کر گھر بنانا.... گھر بسانا تھا.... معصوم اور بے گناہ لوگوں کے خون میں ڈوبی ہوئی دولت کی مدد سے! اور اس گھر کا نام رکھنا تھا.... خونی محل! کچھ بھی سہی‘ مجھے تو شاید گھر ایسے ہی مل سکتا تھا۔

ابھی ان کو گئے ہوئے صرف چند منٹ ہوئے تھے اور وہ انہیں مِس کررہی تھی۔ اس کے جسم میں تھرتھری سی دوڑ گئی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ جو کچھ ہوچکا تھا‘ وہ تو اب نہیں بدل سکتا تھا لیکن اب کامیابی کی اہمیت بڑھ گئی تھی۔ یہ ضروری ہوگیا تھا کہ بابر کو اس کے خواب کی تعبیر ملے۔ جو خون اب تک بہایا جاچکا

تھا‘ اسے اب صاف ستھری زندگی سے دھویا جاسکتا تھا۔ اب یہ خون کے رشتوں سے محروم فیملی اچھی زندگی گزارے۔ بس اب اس کی یہی آرزو تھی۔

لیکن اسکول میں.... سامنے پڑی معصوم لڑکی کی لاش کو دیکھ کر اسے کچھ ہورہا تھا۔ اس پر وحشت طاری ہورہی تھی۔ یہ جرم کبھی دُھل سکتا ہے۔ خون کے دھبے کبھی صاف ہوسکتے ہیں۔ سب بے کار ہے۔ اس زندگی کو تو اب صرف موت کے دامن میں پناہ مل سکتی ہے۔ اس کے اندر دو بالکل متضاد جذبے بہت شدت اور تندی سے اُبھر رہے تھے.... آپس میں لڑ رہے تھے۔ اسے لگتا تھا کہ وہ پاگل ہوجائے گی۔

اس نے دوربین کا رخ لاش کی طرف کردیا۔ ہوا کے ہلکے جھونکے مرنے والی کے براؤن بالوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کررہے تھے پھر اچانک ہر طرف سے پولیس والے اسکول میں آنے لگے۔ ان میں توقیر بھی تھا۔ اس نے پھر لاش کو اپنے سینے سے لگایا.... اور اب شاید وہ چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔

شہناز کا جی چاہا کہ وہ بھی چیخ چیخ کر رودے۔

بوتھ میں موجود شخص میدان سے گزرتا ہوا اسکول کی طرف آرہا تھا۔ لاش اور سوگوار باپ کو نظرانداز کرکے وہ اسکول میں چلا گیا۔ ذرا دیر بعد وہ بدقسمت کلاس روم میں نظر آیا۔ وہ شیشوں سے محروم کھڑکی میں جھکا نیچے دیکھ رہا تھا۔ شہناز آگے کو جھکی۔ وہ اس کے چہرے کے تاثرات قریب سے دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کی سوچیں پڑھنا چاہتی تھی۔

اب وہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے ماضی پھر رہا تھا۔ کبھی اس کے پاس سب کچھ تھا.... ماں‘ باپ‘ بھائی‘ گھر اور اچھے مستقبل کی اُمید اور اب.... اب اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا اور وہ وہی سب کچھ حاصل کرنا چاہ رہی تھی مگر قانون اور اخلاق والے یہ بات نہیں سمجھ سکتے تھے۔

وہ بُری طرح چونکی۔ کھڑکی میں کھڑا شخص اب براہِ راست اسے دیکھ رہا تھا.... اور نہ جانے کب سے دیکھ رہا تھا۔ وہ گڑبڑا کر کرسی سے اٹھی اور لڑکھڑاتے قدموں سے پیچھے ہٹی۔

○☆○

میدان سے گزر کر اسکول کی طرف جاتے ہوئے جلیس کو یقین ہوگیا کہ اس کے سینے میں کوئی مسل کھنچ گئی ہے۔ حرکت کے ساتھ تکلیف بڑھ رہی تھی۔ تکلیف اتنی بھی نہیں تھی کہ وہ اپنا فرض پورا نہ کرپاتا لیکن متلی کا احساس ٹھیک طرح سے کام کرنے بھی نہیں دے رہا تھا۔

وہ اسکول کی عمارت میں داخل ہوا۔ دوسری منزل تک اسے دہشت گردوں کی وحشتوں کی کوئی نشانی نظر نہیں آئی لیکن تیسری منزل کے زینوں سے جیسے وہ کسی اور ہی دنیا میں داخل ہوگیا۔ سیڑھیوں پر خون کے سوکھے ہوئے گاڑھے دھبے تھے۔ راہداری میں شیشے کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ بائیں جانب والی دیوار پر گولیوں کے کئی سوراخ تھے۔ جابجا پلاسٹر اُدھڑا ہوا تھا۔ ریسٹ روم میں سب سے زیادہ خون بہا تھا۔ یقینی طور پر کارروائی کے دوران میدانِ جنگ وہی بنا تھا۔ کھڑکیوں کی چوکھٹوں پر بھی خون کے دھبے تھے۔ باتھ روم کا حال بھی تباہ تھا۔ آئینے ٹوٹے ہوئے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ سو سے زیادہ گولیاں وہاں آئی ہوں گی۔ فیکلٹی لاؤنج مجرموں کا کمانڈ سینٹر تھا۔ وہاں جا بجا کافی کے پیپر کپ اور پیپر پلیٹس بکھری ہوئی تھیں۔ مڑے تڑے ٹشو پیپرز کا بھی ڈھیر تھا۔ ہر ایش ٹرے سگریٹ کے ٹوٹوں سے لبالب بھری ہوئی تھی لیکن اس کمرے میں فائرنگ کا کوئی نشان نہیں تھا۔ اسے بے انصافی کا احساس ہونے لگا۔

کلاس روم نمبر ۲۱ میں وہ سب سے آخر میں گیا۔ اس کمرے کو دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ کمرے میں ابتری ہوگی کیونکہ یہی وہ کمرا تھا‘ جہاں سے یرغمالی طلبہ افراتفری کے عالم میں بھاگے ہوں گے لیکن کمرے میں بس معمولی سی بے ترتیبی تھی۔ اس کا کریڈٹ یقینی طور پر ٹیچر کو جاتا تھا۔ بچ نکلنے والے طلبا نے بتایا تھا کہ کمال رشید بدترین صورتِ حال میں بھی پُرسکون رہا تھا۔ شدید زخمی ہونے کے باوجود اس نے ہر موقعے پر ہوش مندی کا مظاہرہ کیا تھا۔ کمرے کو دیکھ کر اسے طلبا کی بات پر یقین آگیا۔

وہ اس کھڑکی کے پاس رُکا‘ جہاں لڑکی کو شوٹ کرنے کے بعد نیچے پھینکا گیا تھا۔ وہ چند لمحے کھڑا رہا لیکن اس کی نیچے دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس نے سر داہنی طرف گھمایا اور ایک طرف نظریں جمادیں لیکن درحقیقت وہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہا تھا لیکن اچانک ایک تحرک نے اس کی نظروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔ اس نے تحرک کی سمت دیکھا۔ وہ ایک نوتعمیر شدہ اپارٹمنٹ ہاؤس کی کھڑکی تھی۔ شاید اس نے کوئی پردہ ہلتے دیکھا تھا۔ ہوا کی وجہ سے؟ لیکن نہیں‘ کھڑکی تو بند تھی۔ تو پھر؟

وہ کھڑکی سے پلٹا اور اس نے اپنے واکی ٹاکی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی تھی اور اس کے نتیجے میں سینے میں ہونے والا درد زور پکڑ گیا تھا۔ اس نے اپنی تکلیف کو نظرانداز کردیا۔ یہ امکان بہت اہم تھا کہ مجرموں کی باہر کی ساتھی کو پکڑا جاسکتا ہے۔

”انسپکٹر ارشاد.... یہ جو اس سڑک پر کشمیر ویو اپارٹمنٹس ہیں‘ انہیں دوبارہ چیک کیا گیا یا نہیں؟“ اس نے ریڈیو میں پوچھا۔

”ہم چیک کرنے ہی والے تھے سر کہ علاقہ خالی کرنے کا حکم مل گیا۔“

”اسے پہلے چیک کیا گیا تھا؟“

”جی ہاں سر۔“

”بلڈنگ سے کوئی نکلا بھی تھا؟“

”میں لسٹ چیک کرکے بتاتا ہوں سر“ دوسری طرف سے کہا

گیا پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد انسپکٹر ارشاد کی آواز اُبھری۔

"پانچ فلیٹوں کے علاوہ سب خالی تھے جناب۔ چار میں سے ہم نے لوگوں کو نکالا۔ پانچویں فلیٹ کے لوگ کہیں گئے ہوئے تھے۔ ہماری دستک کے جواب میں دروازہ نہیں کھلا۔"

"وہ کون سا فلیٹ تھا؟"

"فلیٹ نمبر تیرہ سر۔"

"تیسری منزل پر بائیں جانب والا تو نہیں.... جس کی کھڑکی یہاں سے نظر آتی ہے؟"

"میرا خیال ہے.... جی ہاں سر' یہ وہی فلیٹ ہے۔ کیوں سر....؟"

"اپنے آدمی لے کر فوراً جاؤ اور اس فلیٹ کو چیک کرو۔ مجھے یقین ہے کہ میں نے اس کی کھڑکی میں کسی کو حرکت کرتے دیکھا ہے اور ہاں محتاط رہنا.... اگر یہ وہی لڑکی ہے تو میں اسے زندہ سلامت اپنے روبرو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"بہت بہتر سر۔"

ایک لمحے سوچنے کے بعد جلیس نے کہا "ارشاد۔ میں پولیس کا مزید جانی نقصان نہیں چاہتا۔"

"ہم محتاط رہیں گے سر۔"

جلیس نے واکی ٹاکی کا بٹن دبایا اور مضطربانہ انداز میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ یہ وہی لڑکی ہوگی' جس کی آواز اس نے بابر سے بات چیت کے دوران سُنی تھی.... ریڈیو پر اور وہ ان تمام مجرموں کو گرفتار دیکھنا چاہتا تھا اور یہ لڑکی ان کی گرفتاری میں کلیدی کردار ادا کرسکتی تھی۔ اس خواہش کے پیچھے انتقامی جذبہ بھی کارفرما تھا۔ مجرموں نے خود کو بہتر دہشت گرد ثابت کیا تھا۔ جبکہ وہ خود کو بہتر پولیس آفیسر ثابت نہیں کرسکا تھا۔ انہوں نے اس بات سے فائدہ اُٹھایا تھا کہ پولیس دہشت گردی کا سامنا کرنے کے لیے کبھی پوری طرح تیار نہیں ہوتی جبکہ دہشت گردوں کو اپنی دھمکیوں پر عمل کرنے میں کبھی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی اور پولیس اپنی مرضی کے مطابق آزادانہ کارروائی نہیں کرسکتی۔ اس کا بس چلتا تو اس نے یرغمالیوں کی پروا کیے بغیر عمارت پر دھاوا بول دیا ہوتا۔ جبکہ یرغمالیوں میں اس کا اکلوتا بیٹا بھی تھا۔ پہلی بار اس کے ضمیر کا بوجھ کم ہوا۔ واقعی۔ اس نے اپنے بیٹے کو بچانے کے لیے مجرموں کے خلاف کارروائی کا منصوبہ نہیں بنایا تھا۔ بلکہ اس طرح تو اس نے اُلٹا اپنے بیٹے کی زندگی کو خطرے میں ڈالا تھا لیکن اوپر والوں کا فیصلہ کچھ اور تھا اور اب بھی اسے کئی معاملات میں جواب دہی کرنا تھی۔ اس نے مجرموں کے خلاف آپریشن کیوں کیا؟ اس نے تاوان کی رقم مجرموں کو بروقت کیوں نہیں دی؟ اس نے احکامات کی خلاف ورزی کیوں کی؟ وہ جانتا تھا کہ اس کے خلاف کارروائی ہوگی۔ مجرموں کے حصے کی سزا بھی وہ بھگتے گا۔ پبلک کے لیے بھی دہشت گردوں کے ہاتھوں معصوم لوگوں کے قتلِ عام کی اتنی اہمیت نہیں تھی جتنی پولیس کی کارروائی کے دوران خون بہنے پر پولیس کو مطعون سمجھنا تھا۔ یہی رویہ تو دہشت گردی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ یہ کوئی نہیں سوچے گا کہ دہشت گردوں کے ہاتھوں پانچ بے گناہ افراد مارے گئے ہیں اور پھر بھی وہ آزاد ہیں بلکہ انہیں پانچ کروڑ روپے انعام بھی ملا ہے اور جس شخص نے ۳۰ گھنٹے ہر لمحے عذاب بھگتا ہے اور انسانی جانوں کو بچانے کے لیے سرمارا ہے' اسے اپنے بے داغ کیریئر کے داغدار انجام کی سزا ملے گی۔ اس پر سب لعن طعن کریں گے.... اربابِ اقتدار بھی اور عوام بھی۔ اس کے ہر عمل کا.... ہر عذاب ناک لمحے کا ایک طرفہ احتساب کیا جائے گا۔ یہ سب کچھ اپنی جگہ۔ وہ اپنے ضمیر کی طمانیت کے لیے مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانا چاہتا تھا پھر چاہے اس کا کچھ بھی انجام ہو۔ اپنا آپ مطمئن ہوگا تو اسے کسی چیز کی پروا نہیں ہوگی۔ اس کے لیے لڑکی کا پکڑا جانا بہت ضروری تھا۔ اس سے دوسروں کے متعلق.... مجرموں کے منصوبے کے متعلق اہم معلومات حاصل ہوسکتی تھیں۔

○☆○

ویگن میں کمال' رئیس اور مظفر ڈرائیونگ سیٹ کے پیچھے والی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ ان کے پیچھے والی سیٹ پر مشکور شاٹ گن لیے بیٹھا تھا اور سب سے پچھلی سیٹ پر صوفیہ' شہلا کے ساتھ بیٹھی تھی۔ کمال' رئیس سے وہ چاقو طلب کرنا چاہتا تھا' جس سے پردے کاٹ کر ڈوریاں بنائی گئی تھیں۔ وہ چاقو رئیس نے اپنے پاس ہی رکھ لیا تھا لیکن مشکور آگے کی طرف جھکا بیٹھا تھا۔ کمال' رئیس سے کچھ کہتا تو وہ بھی سُن لیتا۔

کمال کو فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے بابر سے اس درجہ نفرت محسوس ہورہی تھی کہ اس کا وجود پھنکنے لگا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن پکڑے اور اس کے وجود میں سے زندگی کی آخری رمق بھی کھینچ لے لیکن اس میں اتنی طاقت نہیں تھی اور ایسی کوشش کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ بابر نے ہر طرح سے اسے توڑ پھوڑ دیا تھا اور آخر میں نازیہ کو قتل کرکے اس نے اس کی فیصلہ کُن توہین کردی تھی۔ اسے اپنی نظروں میں ذلیل ہونے پر مجبور کردیا تھا۔

کمال کے لیے یہ یقین کرنا دشوار تھا کہ نازیہ مرچکی ہے۔ وہ فائر کی آواز سُن کر ہوش میں آیا تھا اور جیسے تیسے گرتا پڑتا باہر نکلا تھا لیکن وہ کلاس روم تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ نذیر اس کے پیچھے چلا آیا تھا اور اسے پکڑلیا تھا۔ اس میں زیادہ مزاحمت کی طاقت بھی نہیں تھی۔ لہٰذا نذیر کو اس پر قابو پانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی پھر اس کی طبیعت بگڑگئی تھی اور وہ نیچے گرگیا تھا۔ اس وقت بابر کلاس روم سے نکلا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی بھیانک طمانیت نظر آرہی تھی۔ وہ اس کے سامنے آکر رکا اور مسکرایا۔ اس کا بالائی ہونٹ اوپر اُٹھا اور دانت جھانکنے لگے۔ اس وقت وہ بھیڑیا لگ رہا

تھا۔

کمال نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ اس کا گلا دبوچنا چاہتا تھا لیکن ایک تھپڑ نے اسے فرش چاٹنے پر مجبور کردیا۔ بابر اس کے سامنے تن کر کھڑا ہوگیا۔ نہ اُس نے کچھ کہا' نہ اِس نے کچھ کہا۔ بس وہ اسے ذلیل کرنے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کمال کچھ کرنا چاہتا تھا مگر اس میں ہاتھ ہلانے کی طاقت بھی نہیں تھی۔

یہ خیال بہت اذیت ناک تھا کہ صورتِ حال پوری طرح بابر کے کنٹرول میں ہے۔ شیطنت' نیکی پر غالب آرہی ہے۔ یہ شخص قدم قدم پر انسانیت کی توہین کررہا ہے۔ اسے پامال کررہا ہے۔ معصومیت کو داغ دار کررہا ہے اور اسے روکنے والا کوئی نہیں ہے۔ انسانیت اپنے اصولوں میں اتنی کمزور ہے کہ اس بھیانک شیطنت سے نہیں لڑسکتی۔

اس موقعے پر بابر نے اسے بخش دیا تھا۔ اس نے لاتوں سے... گھونسوں سے اس کی تواضع نہیں کی تھی۔ اس نے کہا تھا "اس کے بعد تمہاری باری ہے" اور پھر وہ چلا گیا تھا اور کمال جانتا تھا کہ اس نے سچ کہا ہے۔

اس کے بعد بے بسی کے احساس نے اس کے ذہن کو جکڑ لیا تھا۔ اس کی کمزوری میں اضافہ ہوگیا تھا۔

انہوں نے دونوں لڑکوں کے ایک ایک ہاتھ کو ملا کر رسی سے باندھ دیا تھا پھر انہوں نے ڈائنا مائٹ اسٹکس کا ایک پیکٹ رئیس کی کمر سے باندھ دیا تھا۔ رسی کی گرہیں ایسی باندھی گئی تھیں کہ طویل کوشش کے بغیر انہیں کھولا نہیں جاسکتا تھا۔ دوسرا پیکٹ انہوں نے اس کی پشت سے باندھ دیا تھا۔ صوفیہ کے بھی ہاتھ باندھ دیے گئے تھے۔ ٹریگر ڈیوائس فرنٹ سیٹ پر بیٹھے بابر کی گود میں رکھی تھی۔ اس نے ان لوگوں کو انسانی بم میں تبدیل کردیا تھا۔ اس نے واضح کردیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہوئی تو وہ صرف ایک بٹن دبائے گا اور ان کے چیتھڑے اُڑ جائیں گے۔

کمال کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ ایسی بے بسی تو اس نے جنگی قیدیوں کے بھارتی کیمپ میں بھی نہیں محسوس کی تھی۔ جسمانی اذیت بھی کچھ کم نہیں تھی۔

وہ راولپنڈی کی حدود میں داخل ہوگئے تھے۔ ذرا دیر بعد ائرپورٹ کی بلڈنگ نظر آنے لگی تھی۔ دور رن وے پر ایک اکیلا طیارہ کھڑا تھا۔ رن وے کی طرف جانے والا راستہ صاف تھا۔ گیٹ کھلا ہوا تھا۔

O☆O

شہناز نے سٹنگ روم میں پوزیشن سنبھال لی تھی۔ وہ خود کو یقین دلانے کی کوشش کررہی تھی کہ اسے نہیں دیکھا گیا ہے۔ اس نے ریڈیو کو ٹرائی کیا اور دیر تک بابر کو پکارتی رہی۔ اسے یقین تھا کہ وہ جواب دے گا۔ اسے دلاسہ دے گا اور سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا لیکن ریڈیائی لہروں کی سرسراہٹ کے سوا اسے کوئی آواز نہیں سنائی دی۔

پھر اسے خیال آیا کہ ویگن اب تک یقیناً دور نکل چکی ہوگی۔ اب ریڈیو پر رابطہ ممکن نہیں۔ اب وہ اکیلی ہے۔ وہ اٹھ کر بیڈ روم میں چلی گئی۔ بیڈ اور دیوار کے درمیان دبک کر اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ اس طرح کی صورتِ حال کے لیے بابر نے اسے کیا ہدایات دی تھیں۔

"ہم میں سے کسی کو بھی زندہ پولیس کے ہاتھ نہیں آنا چاہیے" اس کی سماعت میں بابر کے الفاظ گونجے۔

اس وقت شہناز نے یہ عہد کرلیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اب اس کا جینا مرنا اس گروپ کے ساتھ ہے۔ وہ سب ساتھ جئیں گے' ساتھ مریں گے لیکن اب معاملہ مختلف تھا۔ اگر سب مر رہے ہوتے تو زندگی اسے بے کار شے محسوس ہوتی لیکن اب وہ سب محفوظ تھے اور وہ خود اکیلی بھی تھی اور خطرے میں بھی۔ اس نے بیلٹ سے ریوالور کھینچا اور عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔ یہ وہی ریوالور تھا جس سے اس نے ایک معصوم شخص کو قتل کیا تھا۔ جو اپنی بیوی کے ساتھ فلم دیکھ کر سنیما سے باہر نکل رہا تھا۔ اس وقت وہ قتل ضروری معلوم ہوا تھا۔ اس کے بغیر وہ گروپ میں شامل نہیں ہوسکتی تھی لیکن اب... اب اسے یقین نہیں رہا تھا۔ اب وہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ کسی پر گولی چلا سکتی ہے۔ اب وہ سوچ رہی تھی' کاش ایسی نوبت ہی نہ آئے۔

فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کلاس روم نمبر ۲۱ کی کھڑکی میں کھڑے شخص نے اسے دیکھا ہے یا نہیں پھر وہ تو خاص طور پر اس طرف دیکھ رہی تھی... اس شخص کو لیکن وہ شخص تو خصوصیت سے اسے نہیں دیکھ رہا ہوگا۔ اس شخص کے سامنے تو ایک پھیلا ہوا منظر تھا اور وہ کھڑکی سے ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑی تھی... اور زیادہ روشنی بھی نہیں تھی۔ غروبِ آفتاب کا وقت تھا۔ آسمان پر گھٹا بھی تھی۔ اس کے باوجود یہ ناممکن نہیں کہ دوربین کے شیشوں سے ہلکی روشنی منعکس ہوگئی ہو۔

یہ سب کچھ سوچ کر وہ خاصی مطمئن ہوگئی۔ اس حد تک کہ وہ محتاط انداز میں ہی سہی' بیڈ روم سے باہر چلی آئی۔ وہ سٹنگ روم میں آئی لیکن فوراً ہی دہشت زدہ بھی ہوگئی۔ دروازے کا لٹو کھڑکھڑایا... پھر گھوما۔ اس نے ریوالور بلند کیا اور اس کا رخ دروازے کی طرف کردیا۔

اس کے بعد کیا ہوا' وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی۔ دروازہ دھماکے سے اس قدر اچانک کھلا کہ اس کے حلق سے بے ساختہ چیخ نکل گئی لیکن اس نے دروازہ کھلنے کی آواز نہیں سنی۔ کیونکہ اس سے پہلے ہی وہ ٹریگر دبا چکی تھی اور وہ ٹریگر دباتی چلی گئی۔ اسے اندازہ تھا کہ کئی افراد قلابازیاں کھاتے ہوئے اندر گھسے ہیں۔ سب کچھ دُھندلا گیا تھا۔ رنگین شعلے رقص کررہے تھے۔ فائرنگ کا شور سماعت معطل کردینے والا تھا۔ اس نے اپنی چیخ سنی۔ ایک گولی اس

کے جسم میں اُتر گئی تھی۔ وہ پیچھے کی طرف پہلو کے بل گری۔ دیوار جیسے خود اس کی طرف جھپٹی اور اس سے ٹکرائی تھی۔ اس کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ گیا۔ اس نے خود کو گرنے سے روکنے کی کوشش کی لیکن فرش کے جھپٹنے کی رفتار بہت تیز تھی اور جھٹکا بہت شدید تھا۔

○☆○

نذیر نے ویگن کو تیز رفتاری سے موڑ کر گیٹ سے گزارا۔ کمال کا زخمی کندھا برابر بیٹھے ہوئے مظفر سے ٹکرایا۔ درد کی ایک مہیب موج اسے ڈبوگئی۔ ویگن اب رن وے کی طرف دوڑ رہی تھی۔ کمال نے بڑی جدوجہد کے بعد اپنا زخمی کندھا ہٹایا اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے کھڑکی سے دیکھا۔ ویگن کی رفتار بہت تیز تھی اور اس کا رخ سیدھا جہاز کی طرف تھا۔ جبکہ رن وے کی طرف کوئی سڑک نہیں جاتی تھی' نذیر ویگن کو کچے میں تیز رفتاری سے دوڑا رہا تھا۔ جھٹکے بہت شدید تھے۔

ایک اور جھٹکا لگا۔ ویگن ایک لمحے فضا میں معلق رہی اور پھر رن وے پر دوڑنے لگی۔

بالآخر ویگن رک گئی۔ کمال نے سکون کی سانس لی۔ نذیر نے انجن بند کیا۔ وہ چند منٹ ویگن میں بیٹھے رہے۔ بابر جہاز کے اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا پھر اس نے مشکور کو حکم دیا کہ وہ جاکر جہاز کو چیک کرے پھر اس کی ہدایت پر شہلا صوفیہ کو آگے لے آئی اور اس نے صوفیہ اور کمال کے ایک ایک ہاتھ کو ویسے ہی باندھ دیا' جیسے مظفر اور رئیس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ کمال کا بایاں ہاتھ صوفیہ کے داہنے ہاتھ سے باندھا گیا تھا اور یہ بات تکلیف دہ تھی۔

"ذرا سا بائیں جانب ہٹ جاؤ" کمال نے کراہتے ہوئے صوفیہ سے کہا۔

وہ بائیں جانب ہٹ گئی "بہت تکلیف ہو رہی ہے؟"

کمال نے پہلو بدلا اور قدرے پُرسکون ہو گیا "پہلے کے مقابلے میں تو بہت کم ہے" اس نے جواب دیا۔

وہ اسے غور سے دیکھنے لگی "تم ٹھیک تو ہو نا؟"

وہ بہت خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔ کمال کو احساس ہوا کہ اس کا چہرہ کتنا زرد ہو گیا ہے۔ اس کے رخسار بھی اندر کو دھنس گئے تھے۔ لگتا تھا' اس کا وزن بھی کم ہوا ہے۔ تمام دن وہ خاموش رہی تھی اور وہ اب وجہ بھی سمجھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کا خالی پن اور ویرانی بتا رہی تھی کہ وہ شاک کی حالت کے بہت قریب پہنچ چکی ہے۔

"کمال... اس نے نازیہ کو مار ڈالا" صوفیہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے آنسوؤں سے بھر گئیں۔ کمال نے حیرت سے سوچا.... یہ تو اپنی عمر سے بڑی لگ رہی ہے۔ وہ پرانی صوفیہ تھی ہی نہیں۔ اس کے بالوں کی چمک ماند پڑ چکی تھی اور اب وہ چپکے ہوئے تھے۔ آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے تھے۔ اسے اس پر ترس آنے لگا۔ وہ اسے چھونے کے لیے ہاتھ بڑھاتے بڑھاتے رُک گیا۔ جو کچھ ہوا تھا' اس نے ان کے درمیان ایک دوری سی پیدا کر دی تھی.... ایک بے نام سی کشیدگی۔ وہ اس سے کچھ دور ہو گیا۔

"میرا خیال ہے صوفیہ' اب ہمیں اس امکان کو قبول کر لینا چاہیے" وہ بولا "....کہ یہ لوگ ہم سب کو قتل کر دیں گے۔" اس کے لہجے میں سفاکی تھی "مجھے یقین نہیں کہ ہم انہیں روک سکیں گے۔ مجھے بھی نازیہ کی موت کا دکھ ہے لیکن فی الحال میں اس دکھ میں ڈوبنا نہیں چاہتا۔ ابھی ہمیں اپنے تحفظ کے متعلق سوچنا ہے" اسے احساس تھا کہ یہ محض خالی خولی' کھوکھلے لفظ ہیں۔ اس کے پاس تحفظ کے متعلق سوچنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ کوئی امکاں' نہ کوئی خواب۔

صوفیہ نے اس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ وہ تو نازیہ کے خیال میں ہی گم تھی "ہمیں ہر حال میں اسے پہلے نکال دینا چاہیے تھا" وہ بڑبڑائی۔

"صوفیہ' تم بھول رہی ہو کہ اس کی حالت اچھی نہیں تھی۔ وہ اس مرحلے سے گزر ہی نہیں سکتی تھی۔ گر کر مر جاتی" کمال نے تحمل اختیار کرنے کی کوشش کی "یہ خواہ مخواہ ضمیر پر بوجھ لادنے کا وقت نہیں ہے۔"

اس وقت مشکور واپس آیا اور اس نے ان لوگوں کو ویگن سے اترنے کا اشارہ کیا۔

ویگن سے اُترتے ہوئے کمال نے پولیس کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ بابر نے جہاز کے لیے بہت محفوظ جگہ منتخب کی تھی۔ وہ رن وے کا دور دراز کا حصہ تھا۔ اردگرد کا کم از کم آدھا میل کا حصہ پوری طرح نظروں کے سامنے تھا اور وہاں کسی کے چھپنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے اتنے فاصلے سے فائر کرنے کا رسک نہیں لے سکتے تھے۔ سرپرائز اٹیک کا بھی کوئی امکان نہیں تھا۔ بابر کارروائی کے لیے پیش قدمی کرنے والوں کو دور سے ہی دیکھ سکتا تھا۔

"یعنی صورتِ حال اس قدر مایوس کُن ہے۔ کیا ان لوگوں کو روکنے کی کوئی کوشش تک نہیں کی جائے گی؟" کمال نے اداسی سے سوچا۔

○☆○

ایس پی جلیس جانتا تھا کہ وقت اس کے ہاتھوں سے پھسلا جا رہا ہے۔ وہ دوڑتا ہوا سیڑھیاں چڑھ رہا تھا لیکن یہ احساس بہت توانا تھا کہ کچھ بھی حاصل نہیں ہو گا۔ لینڈنگ پر وہ رکا اور اس نے دُکھتے ہوئے سینے کو ہاتھ سے دبایا لیکن وہ رک نہیں سکتا تھا۔ اس نے اتنے فائروں کی آواز سنی تھی کہ لڑکی کا زندہ ہاتھ لگنا ناممکن ہی نظر آ رہا تھا۔ کاش... کاش....!

وہ فلیٹ میں داخل ہوا تو اسے لڑکی سٹنگ روم میں دور کی دیوار کے پاس بکھری نظر آئی۔ اس کے دل کو جھٹکا لگا۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ اس نے کرسی کا سہارا لیا اور خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کی۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے دل کی حالت اچھی نہیں ہے۔

پھر اسے ایک امید افزا بات نظر آئی۔ لڑکی سانس لے رہی تھی!

انسپکٹر ارشاد اس کی طرف بڑھا۔ وہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ "آپ ٹھیک تو ہیں سر!" اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

جلیس نے کرسی سے ہاتھ ہٹایا اور تن کر کھڑا ہو گیا۔ "میں ٹھیک ہوں" اس نے کہا "یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

انسپکٹر نے لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس نے ہمیں موقع ہی نہیں دیا سر۔ اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ مجبوراً ہمیں گولی چلانی پڑی۔"

جلیس اب خود کو سنبھال چکا تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل شہناز کے پاس بیٹھ گیا۔ اسے حیرت ہوئی۔ لڑکی کم عمر بھی تھی اور خوب صورت بھی۔ عام طور پر ایسے کاموں میں ملوث ہونے والی لڑکیوں کے چہروں پر کرختگی نظر آتی ہے' نرمی اور خوب صورتی نہیں۔ "تم نے ایمبولینس منگوائی ہے؟" اس نے انسپکٹر سے پوچھا۔

"جی ہاں سر۔"

جلیس نے زخم کا جائزہ لیا۔ گولی پہلو میں لگی تھی اور باہر نہیں نکلی تھی۔ ورنہ دوسرا زخم بھی نظر آتا.... گولی کے باہر نکلنے کا اور اتنے کم فاصلے سے چلائی جانے والی گولی کو بہرحال باہر نکلنا چاہیے تھا۔ نہ نکلنے کا مطلب یہ تھا کہ گولی جسم کے اندر کسی ٹھوس چیز سے ٹکرائی ہے۔

"فائر کرتے وقت تم کہاں تھے؟" اس نے انسپکٹر ارشاد سے پوچھا۔

"وہاں... فرش پر گرا ہوا تھا" انسپکٹر نے اشارے سے بتایا۔

"اور لڑکی اس جگہ کھڑی تھی...؟"

"دیوار سے ذرا آگے..."

"تو گولی ترچھی اور اوپر کی سمت گئی ہوگی" جلیس نے کہا۔ وہ گولی سے پہنچنے والے نقصان کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ گولی جگر سے یا داہنی جانب کے گردے سے ٹکرائی ہوگی اور اوپر اُٹھتے ہوئے معدے سے گزر کر بائیں پھیپھڑے میں گھسی ہوگی۔ یعنی پسلیوں کے عقبی پنجر میں اُلجھ گئی ہوگی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس نے بہت زیادہ نقصان پہنچایا تھا۔ اس نے لڑکی کا ہاتھ تھام کر دیکھا۔ نبض بہت کمزور تھی۔ سانسیں بھی اتھلی تھیں۔

لڑکی کے بچنے کا امکان بہت ہی کم تھا۔

"میں اسکول واپس جا رہا ہوں" اس نے انسپکٹر سے کہا "تم اسے اسپتال لے کر جاؤ۔ ڈاکٹر سے کہنا کہ میرا اس سے بات کرنا ضروری ہے۔ وہ کچھ بھی کرے۔ مجھے اس سے جلد از جلد بات کرنی ہے۔"

"او کے سر۔"

وہ دروازے کی طرف بڑھا لیکن باہر نکلتے نکلتے رک گیا۔ صوفے پر اسے ریڈیو پڑا نظر آیا۔ اس نے ریڈیو اٹھایا اور کھڑکی کی طرف چل دیا۔ کھڑکی کے سامنے کرسی پڑی تھی۔ کرسی پر ایک دوربین اور ایک نائٹ اسکوپ رکھا تھا۔ اس نے کھڑکی میں کھڑے ہو کر اسکول کی طرف دیکھا۔ اس کی نظریں اسٹیڈیم سے ہوتی ہوئی اسکول کی عمارت کی طرف بڑھیں۔ بابر نے یقینی طور پر بہت اچھے فلیٹ کا انتخاب کیا تھا۔ یہ مسئلہ حل ہو گیا کہ اس کا منصوبہ عین موقعے پر کیوں ناکام ہوا۔ لڑکی نے نائٹ اسکوپ کی مدد سے اسکول کی چھت پر جوانوں کو دیکھا ہوگا اور ریڈیو کے ذریعے بابر کو خبردار کر دیا ہوگا۔

اس نے ریڈیو بھی کرسی پر رکھ دیا اور فلیٹ سے نکل آیا۔

وہ اسکول پہنچا' جہاں لڑکی کی لاش اٹھائی جا چکی تھی۔ بم ڈسپوزل اسکواڈ والوں نے ایک زینے سے بندھا ہوا ڈائنا مائٹ چارج کھول کر اسے بے کار بنا دیا تھا۔ یہ چارج مجرم چھوڑ گئے تھے۔ باقی دونوں چارجز وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ وہ دوبارہ تیسری منزل کی طرف چل دیا۔ اس اُمید پر کہ شاید وہاں اسے کوئی سراغ مل جائے۔ جس سے کچھ مدد مل سکے لیکن وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

نیچے آنے سے پہلے اس نے بم ڈسپوزل اسکواڈ والوں سے بات چیت کی۔ انہوں نے اسے چارج کے متعلق تفصیل سے بتایا۔ وہاں سے وہ نیچے پرنسپل کے کمرے میں آیا۔ اسے ایک فون کرنا تھا۔ وہاں... پرنسپل جمیل الرحمان کو بیٹھے دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ اس نے کرسی گھسیٹی اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

جمیل الرحمان چند لمحے اسے بغور دیکھتا رہا "تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔ کیا بات ہے؟"

"کوئی خاص بات نہیں۔ بس تھکن ہے۔"

"ہاں... آرام کی ضرورت تو ہم سبھی کو ہے اور سناؤ' وہ لڑکی پکڑی گئی؟"

جلیس نے سگریٹ سلگا کر ایک گہرا کش لیا "ہاں' لیکن میرا خیال ہے' وہ زیادہ دیر جی نہیں سکے گی۔"

"اوپر کوئی کام کی چیز ملی؟"

"نہیں' کچھ بھی نہیں۔"

جمیل الرحمان بھی تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر جھریاں اُبھر آئی تھیں لیکن وہ خوش تھا کہ اسکول کی عمارت سے وبال ٹل گیا ہے۔ جلیس کو وہ اچھا لگا تھا۔ وہ اس سے مرنے والی طالبہ کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے محسوس کر لیا کہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ پرنسپل سمجھ دار آدمی تھا۔ وہ ذمے داری سمجھتا تھا اور جانتا تھا کہ جلیس جو کچھ کر سکتا تھا' وہ اس نے

کیا ہے لیکن کامل تو کوئی انسان نہیں ہوتا۔

"جلیس... آپ کو آپ کا اسکول مل گیا" اس نے کہا۔

"لیکن ابھی کلاسیں نہیں ہو سکیں گی۔ اسکول کھلنے میں دو تین دن لگیں گے" جمیل الرحمان نے کہا "کھڑکیوں میں نئے شیشے لگوانے ہیں۔ دُھلائی اور صفائی کرانی ہے۔ بعض کمروں میں دوبارہ رنگ و روغن کرانا ہوگا۔ جن دیواروں میں گولیوں کے سوراخ ہوئے ہیں، وہاں پلاسٹر کرانا ہوگا۔ اس کے باوجود تین چار دن تک یہاں کی فضا نارمل نہیں ہو سکے گی۔ ایسے المیوں کا تاثر آسانی سے نہیں مٹتا۔ بد قسمت کلاس کے طلبا کو تو میں نے دو ہفتے کی چھٹی دے دی ہے۔ تمہارا بیٹا بھی دو ہفتے گھر پر ہی رہے گا۔"

جلیس نے سگریٹ سے سگریٹ سُلگائی "یہ ہے تو اس کی بہتری کے لیے" وہ بولا "لیکن نعمان مجھے یقین ہے کہ اسے پسند نہیں کرے گا۔ یہ تو اس کے لیے توجہ کا مرکز بننے کا موقع تھا۔"

جمیل الرحمان نے اسے دیکھا اور پھر نظریں جھکالیں اور میز پر رکھے کاغذات کی طرف متوجہ ہو گیا۔

چند لمحے خاموشی رہی پھر جلیس نے کہا "لڑکی کا باپ آگیا تھا۔ مجھے اس سے ملاقات بھی کرنی ہے۔"

"میں اس سے مل چکا ہوں۔ تمہارے لیے یہ ایک دشوار مرحلہ ہوگا۔ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیوں ہوا؟ ہوا تو ان کے بچوں کے ساتھ کیوں ہوا؟ اور مجرموں کو روکا کیوں نہیں جاسکا؟"

جلیس نے سگریٹ بُجھائی اور اٹھ کھڑا ہوا "مجھے معلوم ہے، اس کہانی کا وِلن تو میں ہی ہوں" اب وہ کمرے میں ٹہل رہا تھا "میں ان لوگوں سے یہیں نمٹ لینا چاہتا تھا۔ میں تمام بچوں کو زندہ سلامت نکال لینا چاہتا تھا۔ میرے پاس دو ہی راستے تھے۔ کچھ کروں یا کچھ بھی نہ کروں؟ اور کمال یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں میری کامیابی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں ہمیشہ تنقید کا نشانہ بنتا رہوں گا...." وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ خود ترسی میں مبتلا ہو رہا ہے۔

"میں جانتا ہوں کہ تم نے ہر ممکن کوشش کی اور بے حد خلوص سے کی" جمیل الرحمان نے پوری سچائی سے کہا "لیکن تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں نے اب تک متاثرہ طلبا کے جتنے والدین سے بات کی ہے، وہ سب پولیس کو ذمے دار ٹھہرا رہے ہیں۔ اس میں میڈیا کی کوریج کا بھی دخل ہے، جو پولیس پر اندھا دھند تنقید کو فرض سمجھتے ہیں۔"

جلیس پھر بیٹھ گیا اور سگریٹ سُلگالی "میں جانتا ہوں۔ میرے دونوں اقدامات کو تنقید کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ کہا جارہا ہے کہ عمارت پر دھاوا بولنا غیر ضروری رسک تھا اور تاوان کی ادائیگی کو ٹال کر مہلت حاصل کرنے کی کوشش حماقت بھی تھی اور حکم عدولی بھی لیکن میں جانتا ہوں کہ دونوں میں سے ایک کوشش بھی کامیاب ہو جاتی تو میں اس وقت ہیرو ہوتا، بہرحال میں حقیقت پسند آدمی ہوں۔ میں نے جوا کھیلا تھا اور ہار گیا۔ اب قربانی کا بکرا بھی میں ہی بنوں گا، حکومت بھی اپنی بے اصولی کی ذمے داری مجھ پر تھوپ دے گی۔"

جمیل الرحمان نے بے حد خلوص سے کہا "میں اگر کسی بھی طرح تمہارے کام آسکتا ہوں تو ضرور بتاؤ، مجھے خوشی ہوگی۔"

جلیس نے مسکرانے کی کوشش کی "پیش کش کا شکریہ۔ یہ زخمی لڑکی میری آخری اُمید ہے، دعا کریں کہ میں اس سے معلومات اُگلوا سکوں۔ ورنہ میں جانتا ہوں کہ مجھے فٹ بال بنادیا جائے گا۔ بہرحال میں اسے بھی جھیل جاؤں گا۔ ہم پولیس والے بڑی موٹی کھال کے ہوتے ہیں۔ ارے ہاں... مجھے یاد آیا۔ میں یہاں ایک فون کرنے آیا تھا۔ اجازت ہے؟"

"ضرور۔"

جلیس نے نمبر ڈائل کیا۔ اپنے پُراعتماد لہجے کے برعکس وہ بہت پریشان تھا۔ پہلی بار اسے احساس ہو رہا تھا کہ احتساب کا خوف کتنا خوف ناک ہوتا ہے۔ دوسری طرف سے سنائی دینے والی آواز نے اس کی سوچوں کو منتشر کردیا۔ "لیفٹیننٹ سعید اسپیکنگ۔"

"انسدادِ دہشت گردی اسکواڈ سے؟ سنو میں ایس پی جلیس احمد بول رہا ہوں۔ میجر نصیر سے بات کراؤ۔"

چند لمحے بعد ریسیور پر میجر نصیر کی آواز ابھری "یس مسٹر جلیس۔ کیا صورت حال ہے؟"

"اسکول کی عمارت سے کوئی کام کی چیز نہیں ملی ہے۔"

"مجھے ایکسپلوزیوز کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟"

جلیس نے پنسل اٹھائی اور میز پر رکھے سادہ کاغذ پر یونہی لکیریں کھینچنے لگا "ہر چارج میں ڈائنامیٹ کی پندرہ اسٹکس کو جوڑا گیا ہے اور وہ ریڈیو کنٹرول ڈیوائس سے منسلک ہیں" اس نے کاغذ پر بڑا سا ۱۵ لکھا "بم ڈسپوزل والوں کا خیال ہے کہ وہ ریموٹ کنٹرول ٹریگر استعمال کر رہے ہیں، جیسا ہم لوگ ٹی وی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بم پھٹنے میں ذرا دیر نہیں لگے گی۔ یہ بڑا ڈھیلا ڈھالا سیٹ اپ ہے۔"

"یہ تو کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ اور کچھ؟"

"ہم نے ان کی ساتھی لڑکی کو پکڑ لیا ہے، جو قریب کی ایک بلڈنگ سے اسکول پر نظر رکھے ہوئے تھی۔"

"کچھ معلوم ہوا اس سے؟"

"نہیں۔ گرفتاری کے عمل میں وہ زخمی ہوگئی تھی گولی لگی ہے اسے۔"

"یہ بھی بُری خبر ہے۔ تو ان لوگوں کے متعلق کوئی خاص بات نہیں بتا سکتے؟"

"جو کچھ مجھے معلوم ہے، تم بھی جانتے ہو۔ یہ لوگ چالاک اور خطرناک ہیں۔ اب تک پانچ افراد کو قتل کر چکے ہیں اور ہماری ہر

کوشش کو ناکام بنا چکے ہیں۔"

"ہم کوئی کارروائی نہیں کرسکتے؟"

جلیس نے کاغذ پر بڑے حروف میں "ناممکن" لکھا "سنو.... جس لڑکی کو ہم نے پکڑا ہے' اس نے بھی مزاحمت کی۔ اس لیے ہمیں گولی چلانی پڑی۔ میں سمجھتا ہوں کہ کارروائی کی گئی تو وہ جہاز کو اُڑا دیں گے۔ ان کا انداز غیر ملکی تخریب کاروں کا سا ہے۔ یہ زندہ گرفتار نہیں ہونا چاہتے۔"

"کیسی بے بسی ہے۔ تم اپنی بے بسی مجھے بھی منتقل کر رہے ہو۔"

"نہیں۔ اپنے تجربے کی روشنی میں تمہیں متنبہ کر رہا ہوں۔ تم سوچو گے کہ مناسب موقع مل جائے تو تم ان پر قابو پا سکتے ہو لیکن میں بتا رہا ہوں کہ یہ تباہ کن ہوگا اور ایک مشورہ اور.... اوپر کے احکامات کی خلاف ورزی نہ کرنا۔"

"یہ بھی اپنے تجربے کی روشنی میں کہہ رہے ہو؟"

"ہاں۔"

"یعنی انہیں عافیت سے نکل جانے دوں؟"

"سنو میجر۔ تمہاری طرح میں بھی یہ نہیں چاہتا کہ وہ صاف بچ نکلیں لیکن میں نہیں چاہتا کہ میرے ساتھ کوئی اور بھی قربانی کا بکرا بنے۔" جلیس نے بے حد خلوص سے کہا۔

"مشورے کا شکریہ" دوسری طرف سے میجر نصیر نے سرد لہجے میں کہا "یہاں کی صورتِ حال میرے سامنے ہے۔ میں دیکھ بھال کر اپنے طور پر فیصلہ کروں گا۔"

"گڈ لک۔ میں اب اسپتال جا رہا ہوں۔ معلومات حاصل ہوئیں تو تمہیں بریفنگ کردوں گا۔"

"سنو مسٹر جلیس.... میں جانتا ہوں کہ تم نے بہت کڑا وقت گزارا ہے لیکن موقع ملے تو یہاں چلے آؤ۔"

جلیس اس پیش کش پر حیران رہ گیا "شکریہ میجر۔ میں کوشش کروں گا۔"

ریسیور رکھ کر وہ جمیل الرحمان کی طرف پلٹا "مجھے لگتا ہے کہ ساری دنیا میری مخالف ہوگئی ہے" اس نے کہا "کچھ فیصلے.... ناگزیر فیصلے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے بعد آدمی مسلسل اس احساس سے دوچار رہتا ہے۔ مجھے آپ پر رشک آتا ہے سر۔ آپ کی پریشانیاں تو ختم ہو چکیں۔"

جمیل الرحمان نے سر اُٹھا کر اسے دیکھا "پریشانیاں اتنی آسانی سے ختم نہیں ہوتیں۔ ہاں' ان کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ دیکھو مجھے اس عمارت کو ٹھیک کرانا ہے پھر مجھے اسکول کی سیکیورٹی کے لیے کچھ سوچنا ہوگا۔ یہاں بڑے بڑے لوگوں کے بچے پڑھتے ہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ یہیں پڑھتے رہیں۔ کچھ لوگوں کے خیال میں یہ واقعہ اسکول کی بدنامی کا باعث بھی ہوا ہوگا۔ پریشانیاں میرے لیے بھی ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ جب تک باقی چاروں بھی رہا نہ ہو جائیں' میری پریشانیاں ختم نہیں ہوسکتیں۔ لہٰذا مجھ پر رشک نہ کرو۔"

جلیس کو شاک لگا۔ ان چاروں کا تو اسے دھیان بھی نہیں تھا۔ بھول گیا تھا انہیں۔ صرف اس لیے کہ اب وہ اس کی ذمے داری نہیں تھے!

○☆○

کیپٹن نوید حسن بوئنگ ۷۳۷ کے کنٹرول کے عقب میں بیٹھا تھا۔ وہ حیران تھا کہ دہشت گردوں نے اس جہاز کا ہی انتخاب کیوں کیا۔ اسے اس قسم کی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے امریکا میں خصوصی تربیت دی گئی تھی۔ وہ اس طرح کے کئی بین الاقوامی معاملات نمٹا چکا تھا لیکن پاکستان میں یہ اس کی آزمائش کا پہلا موقع تھا۔

ویسے نوید نے اس بات کو اتنی اہمیت نہیں دی۔ اس کا خیال تھا کہ بیشتر دہشت گردوں کو اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ اسے اس بات سے فائدہ اٹھانے کی تربیت دی گئی تھی۔ وہ کئی بار ایسے جہاز اُڑا چکا تھا اور جانتا تھا کہ آخر میں دہشت گرد بوکھلا جاتے ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ ایسے میں ان پر آسانی سے قابو پالیا جاتا ہے۔

اسے بس یہ فکر تھی کہ بوئنگ ۷۳۷ اس نے کم ہی اُڑایا تھا۔ عام طور پر وہ زیادہ بڑے یا پھر بہت چھوٹے جیٹ اُڑاتا رہا تھا۔ عام طور پر وہ بوئنگ ۷۴۷ اُڑاتا تھا۔ وہ اس کی مشینری سے پوری طرح واقف تھا اور اس پر اس کا کنٹرول ہوتا تھا۔ یہ اس کے لیے ایک اہم بات تھی۔

وہ ائرفورس سے ریٹائر ہو چکا تھا۔ وہاں اس نے کئی کارنامے انجام دیے تھے۔ وہ بہت مہم جو اور خطرپسند پائلٹ تھا اور بعد میں اپنے ایڈونچرز کے متعلق دوسروں کو بتانا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ ایسی کسی مہم کے دوران وہ مر بھی سکتا ہے' اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

جسیم اور تنومند مشکور شاٹ گن لیے جہاز میں آیا تو اس نے اس کی طرف توجہ بھی نہیں دی۔ اس نے انسدادِ دہشت گردی کے چیف کو پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ سیٹ کے نیچے ٹیپ کی مدد سے کوئی ریوالور نہیں چپکایا جائے گا۔ عملے میں کوئی جعلی فرد شامل نہیں ہوگا۔ جہاز میں کسی کو چھپایا بھی نہیں جائے گا۔

"آپ کو دہشت گردوں سے نمٹنے کے لیے جو کچھ کرنا ہے' باہر کرلیں۔" اس نے چیف سے کہا تھا "لیکن یہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ ان کے جہاز پر سوار ہونے کے بعد آپ کا کھیل ختم ہوجائے گا۔ میں جہاز کو اور اپنے عملے کو خطرے میں ڈالنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ میں جہاز اُڑاؤں گا اور اپنے عملے اور یرغمالیوں کے تحفظ کے لیے جو کرسکا' ضرور کروں گا مگر آپ جہاز کے اندر کوئی اسکیم نہیں بنائیں گے۔"

یہی وجہ تھی کہ وہ پُراعتماد تھا۔ پائلٹ تو وہ تھا ہی لیکن اسے یقین تھا کہ وہ دہشت گردوں سے نمٹ سکتا ہے۔ وہ صرف نفسیاتی دباؤ کا قائل تھا۔ اس نے سر گھما کر مشکور کو دیکھا اور اسے ویسے مخاطب کیا، جیسے اپنے عام مسافروں کو خراب موسم میں دلاسہ دیتا تھا "میرا خیال ہے، مسافروں کو بٹھاؤ اور چل دو۔ اس سے پہلے کہ قانون نافذ کرنے والوں کی نیت تم پر خراب ہو۔"

مشکور اس قسم کے معاملات میں تابعداری کا قائل تھا۔ اس نے سر کو تفہیمی جنبش دی اور کیبن سے نکل گیا۔

نوید نے اپنے کوپائلٹ کو دیکھا اور مسکرادیا "یہ تو بڑا پیارا بندہ معلوم ہوتا ہے" اس نے تبصرہ کیا "دیکھو نا، کوئی پھوں پھاں کیے بغیر چلا گیا۔"

لیکن بعد میں اندر آنے والے مخنی جسم کے پستہ قامت شخص نے اسے بہت زیادہ متاثر کیا۔ اس کے چہرے پر سختی اور بے رحمی تھی۔ جسم دُبلا لیکن گھٹا ہوا تھا۔ اپنی آنکھوں اور چہرے سے قطع نظر وہ غیر اہم اور عام سا آدمی تھا اور نوید کا تجربہ تھا کہ ایسے لوگ بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں ہر لمحے الرٹ رہنا پڑتا ہے۔ یہ شخص اسے اچھا نہیں لگا۔ اپنی ظاہری شخصیت کی وجہ سے نہیں، جو بلاشبہ بدنما تھی۔ بلکہ اس لیے کہ وہ اسے تنگ نظر اور آدم بیزار لگا تھا۔ یہ خرابی نوید کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ خود بھی ایسا ہی تھا۔

اس نے فیصلہ کیا کہ غیر جانبدار رویّے کا مظاہرہ کرے گا۔ شاید اس طرح صورتِ حال کچھ بہتر ہو جائے۔ چنانچہ اس نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا "ویلکم آن بورڈ۔ میں نوید حسین ہوں.... تمہارا پائلٹ۔"

بابر نے بے تاثر نظروں سے اسے دیکھا "میں بابر ہوں.... تمہارا دہشت گرد، تمہارا آقا۔"

نوید نے اسے غور سے دیکھا۔ ہونٹوں کی بناوٹ بتاتی تھی کہ وہ حسِ مزاح سے محروم ایک سفاک شخص ہے۔ "خیر.... مجھے کیا" اس نے سوچا "مجھے اس کے ساتھ عمر بھر تو نہیں رہنا ہے" لیکن یہ طے تھا کہ اس شخص کا تذکرہ اس کہانی میں جان ڈال دے گا، جو نوید کو مشن کی تکمیل کے بعد اپنے دوستوں کو سُنانا تھی۔ وہ بحران میں پُرسکون رہنے والا، اور دماغ کو ٹھنڈا رکھنے والا آدمی لگتا تھا اور یہ اچھا تھا، ذرا سی بات پر گھبرا کر فائر کھول دینے والے دہشت گرد جہاز کے لیے بہت خطرناک ہوتے تھے۔

"جہاز بالکل کلین ہے۔ تمہارے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ میں نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے۔" نوید نے اسے بتایا "ٹنکیاں فل ہیں اور میں پرواز کے لیے تیار ہوں۔ تم اپنے ساتھیوں سے کہو کر پُرسکون ہو کر بیٹھ جائیں۔ مجھے بھی اتنی دیر میں کچھ کام نمٹانے ہیں۔"

"مثلاً؟"

"مجھے ریمپ ہٹوانا ہے اور پھر کلیرنس لینی ہے۔"

"ریمپ کیسے ہٹواؤ گے؟"

"ائرپورٹ کا عملہ آکر ہٹائے گا۔"

بابر نے نفی میں سر ہلایا "یہ کام تو تم اپنے کریو سے لوگے، باہر کا کوئی آدمی جہاز کے قریب بھی نہیں آئے گا اور سُنو.... میں فلائٹ سے پہلے ہی تم پر چند باتیں واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ میں نے اس جہاز کے کنٹرولز کے بارے میں سب کچھ جاننے میں بہت وقت صرف کیا ہے۔ تم کوئی گڑبڑ نہیں کر سکو گے مجھے بے خبر رکھ کر۔"

نوید نے کندھے جھٹک دیے۔ جہاز کے عملے کے لیے ریمپ کو پرے دھکیل دینا کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ تاہم وہ دہشت گرد کی بات پر غور کر رہا تھا۔ کسی بڑے جیٹ کے انسٹرومینٹس کے متعلق جاننے کے لیے ضروری تھا کہ دعوے دار نے پہلے بھی اس میں سفر کیا ہو۔ نوید کو یقین نہیں تھا کہ یہ بات ہے لیکن اس پر شک کرنا ٹھیک نہیں تھا کہ بابر واقعی اس جہاز کے بارے میں جانتا ہوگا۔ جو شخص دہشت گردی کی اتنی بڑی واردات کر کے کامیابی سے اس مرحلے تک آپہنچا ہو، اس کے اہل ہونے میں شک نہیں کیا جا سکتا۔ نوید کا دہشت گردوں کے ساتھ کوئی چالبازی کرنے کا ارادہ نہیں تھا لیکن یہ خیال اس کے لیے تکلیف دہ تھا کہ وہ چاہے بھی تو چال بازی نہیں کر سکتا۔

لیکن نوید ایسا آدمی نہیں تھا کہ بابر جیسے کسی آدمی کو خود کو چیلنج کرنے کی آسانی سے اجازت دیتا۔ "جس دوران میرا اسٹاف ریمپ ہٹا رہا ہے، میں بھی تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں" اس نے کہا "میں جانتا ہوں کہ تم میرے جہاز پر دھماکا خیز مادہ لائے ہو۔ میں جانتا ہوں کہ تم اسے چھوڑ کر فلائی کرنے پر رضامند نہیں ہو گے لیکن میری درخواست ہے کہ ٹیک آف کے بعد انہیں غیر مؤثر بنا دینا۔ کبھی کبھی جہاز عجیب کرتب دکھاتے ہیں اور موسم کی شعبدہ بازیاں الگ ہیں۔ جہاز میں کسی بھی وقت الیکٹریکل چارج پیدا ہو سکتا ہے اور ایسا ہوتے ہی سب کچھ ختم...."

"تمہاری فکرمندی اور ذمّے داری مجھے پسند آئی کیپٹن لیکن میرا جواب نفی میں ہے۔ یہ خطرہ مول لینا ضروری ہے۔" نوید خالی خالی نظروں سے خلا میں گھورتا رہا۔ "اور ہاں.... تمہیں کنٹرول سے رابطہ کر کے میری آخری ہدایات ان تک پہنچانی ہیں" بابر نے کہا "ان سے کہو کہ تمام فلائٹس معطل کر دیں۔ مجھے کوئی جہاز اپنے تعاقب میں نظر نہیں آنا چاہیے۔ ورنہ اس جہاز کے تحفظ کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ چلو، اب یہ ہدایات ان تک پہنچادو۔"

نوید نے تعمیل کی۔ اس نے کنٹرول روم سے رابطہ کر کے یہ پیغام پہنچایا "ایک منٹ کیپٹن نوید۔" کنٹرول روم سے کہا گیا "ہدایات ہم نے نوٹ کر لی ہیں۔ اب اس کیس کے انچارج میجر نصیر آپ سے بات کریں گے۔" اگلے ہی لمحے ہیڈ فون پر میجر نصیر کی آواز اُبھری "کیپٹن... اگر اس وقت لائٹ چلی جائے اور میرے

جوان کارروائی کریں تو ہماری کامیابی کا امکان....."

"ایک فی لاکھ بھی نہیں ہے" کیپٹن نے کہا "میں آپ کو یہ مشورہ نہیں دے سکتا" اور اس کے ساتھ ہی اس نے رابطہ منقطع کردیا۔

ریمپ ہٹادیا گیا تھا!

"ایک بات اور کیپٹن" بابر نے کہا "تم ابتدا ہی سے پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرو گے۔ میں نہیں چاہتا کہ ہمارا یہ پرندہ کسی بھی ریڈار پر دیکھا جائے۔"

کیپٹن نوید کو حیرت ہوئی۔ تاہم اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

○☆○

کمال نے سیٹ سے پیٹھ لگائی اور جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وہ خوش تھا کہ پیٹھ پر سے ایکسپلوزیوز کا بوجھ ہٹادیا گیا ہے۔ ہاتھ بھی کھول دیا گیا تھا۔ اتنی سی دیر میں اس کی کلائی دُکھنے لگی تھی اور ہاتھ سوج گیا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ زیادہ ہی بے رحمی کا برتاؤ کیا گیا تھا۔ تاہم اس تکلیف سے ایک فائدہ ہوا تھا۔ اس کی توجہ اپنے کندھے کے زخم پر نہیں رہی تھی۔ صوفیہ دیکھ بھال کے باوجود کندھے کے زخم کو انفیکشن سے نہیں بچا سکی تھی۔ اسے اپنے بازو، کندھے اور وہاں سے پشت تک ایک دھڑکتی پھڑکتی آگ دہکتی محسوس ہورہی تھی۔ بایاں بازو بالکل بے کار ہوچکا تھا۔ بس وہ اب ایک دُکھتے ہوئے بہت بڑے پھوڑے کی طرح تھا جسے لٹکایا جاتا تو اذیت ہزار گنا بڑھ جاتی۔

لیکن بازو سے قطع نظر وہ جسمانی طور پر خود کو بہت بہتر محسوس کررہا تھا۔ چہرہ اور ناک اب نہیں دکھ رہے تھے۔ اب اسے یہ ڈر نہیں تھا کہ ہر بار جب بھی وہ کھڑا ہونے کی کوشش کرے گا، بے ہوش ہوجائے گا۔ دوسری طرف صوفیہ بھی اب بہتر لگ رہی تھی۔ اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

صوفیہ نے اپنی سیٹ پر پہلو بدلا "اب ہم کیا کریں گے؟" اس نے پوچھا۔

کمال نے فوراً جواب نہیں دیا۔ اپنی برہمی پر قابو پانے میں اسے کچھ دیر لگی۔ اس سوال نے اسے چڑادیا تھا۔ وہ تھکا ہوا اور مضمحل تھا پھر زخم میں بھی تکلیف تھی۔ صورتِ حال اتنی خراب تھی کہ اگر اس کا ہاتھ بیکار نہ ہوتا تب بھی وہ کچھ کر نہ پاتا۔ ایسے میں ایسا فعال جملہ..... اب ہم کیا کریں گے؟ وہ تو بس یہ اُمید ہی کرسکتا تھا کہ انہیں خود کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔ بالآخر اس نے جواب دیا "جہاز سے اُتریں گے، ٹیکسی روکیں گے اور گھر چلیں گے۔"

"پلیز.. مجھے یہ احساس دلاؤ، سب ٹھیک ہوجائے گا۔" صوفیہ نے گڑگڑا کر کہا۔

کمال کو اپنے فرسٹریشن سے احساس ہوگیا کہ اس وقت وہ کسی سے بات کرنے کے قابل نہیں ہے "سُنو صوفیہ۔ میں کوئی فلموں کا

ہیرو نہیں ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہم کیا کر سکتے ہیں اور کیا کر سکیں گے۔ وقت آنے پر میں کچھ نہ کچھ کروں گا لیکن ابھی میرے پیچھے نہ پڑو" وہ کوشش کے باوجود اپنے لہجے کو تلخی سے پاک نہ کر سکا۔ اسے گزرے ہوئے دو دن یاد آ گئے۔ یاد آ گیا کہ وہ تلخی بھیانک صورتِ حال سے دوچار ہے۔ اب وہ دہشت کا مطلب خوب سمجھتا تھا۔ انسانوں کے جیتے جاگتے جسموں میں خوف کے کیڑے کس طرح سرسراتے ہیں، روح کی کس کس طرح تذلیل کی جا سکتی ہے، اس نے جان لیا تھا۔ وہ جنگ بھی لڑ چکا تھا اور ہتھیار ڈالنے کی ذلت سے بھی واقف تھا۔ اس نے جنگ میں انسانوں کو خود بھی ختم کیا تھا لیکن وہ زمانۂ جنگ تھا۔ وہ ۷۱ء کی بات تھی۔ فوج سے ریٹائرمنٹ لینے کے بعد اس نے عہد کیا تھا کہ اب کبھی خون نہیں بہائے گا۔ خواہ حالات کچھ بھی ہوں۔ اس عہد کی خاطر اس نے اپنے ماں باپ اور معصوم بہن کے قاتلوں کو بھی معاف کر دیا تھا۔ اس نے ذہانت اور علم کو اپنا ہتھیار بنا لیا تھا۔ وہ اپنی قوم کے بچوں کو اسی ہتھیار سے مسلح کر رہا تھا۔ تو کیا اب.... اب وہ اپنا عہد توڑ سکے گا۔ اپنے مظلوم ماں، باپ اور بہن کی روحوں کو شرمندہ کرے گا۔

اس نے صوفیہ کی طرف سے منہ پھیرا اور سونے کی کوشش کی لیکن اس سے سویا نہیں گیا۔

○☆○

اسپتال میں جلیس ٹہل رہا تھا۔ ڈاکٹروں کے ساتھ اس کا چڑچڑاپن بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے ڈاکٹروں کو بتایا تھا کہ یہ کئی انسانی جانوں کا مسئلہ ہے لیکن ڈاکٹروں نے اسے لڑکی سے ملاقات کی اجازت نہیں دی تھی۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ لڑکی ہوش میں ہی نہیں ہے.... نہ اس کی بات سمجھ سکے گی، نہ بول سکے گی تو ملاقات کا فائدہ؟

پچھلے ایک گھنٹے سے ڈاکٹر لڑکی کے پاس تھے۔ جلیس پریشان تھا کہ وقت نکلا جا رہا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ کسی بھی وقت دہشت گردوں کا جہاز ٹیک آف کر جائے گا۔ اس نے پے درپے چار سگریٹیں پھونک ڈالیں۔ ہر کش اس کے سینے کے درد میں اضافہ کر رہا تھا۔ گزشتہ دو روز سے وہ جس صبر و تحمل کا مظاہرہ کر رہا تھا، وہ اب جواب دے چکا تھا۔ یہ خیال کہ لڑکی اسے معلومات فراہم کیے بغیر مر سکتی ہے اور یوں مجرم صاف بچ نکلیں گے، اس کے لیے سوہانِ روح بنا ہوا تھا۔

بالآخر دروازہ کھلا اور ایک ڈاکٹر باہر آیا۔ جلیس کو دیکھ کر اس کا منہ بن گیا "میں اس لڑکی کی اہمیت کو خوب سمجھتا ہوں جناب" ڈاکٹر نے کہا "لیکن آپ یہ بات نہیں سمجھ پا رہے ہیں کہ صرف ہماری اور آپ کی خواہش سے لڑکی کی حالت بہتر نہیں ہو سکتی۔ کیس ہمارے ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ اگر اس سے ملنا اتنا ہی اہم ہے تو آپ چند منٹ کے لیے اس سے مل سکتے ہیں لیکن زیادہ دیر نہ رکیے گا۔ ہم آپریشن کی تیاری کر رہے ہیں، اوکے؟"

جلیس نے سگریٹ نیچے گرا کر جوتے سے مسل دی۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھے بغیر پوچھا۔ "اس کے بچنے کا امکان کتنا ہے؟"

"نہ ہونے کے برابر۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

پھر جلیس نے خود ہی دیکھ لیا کہ لڑکی کی حالت کتنی خراب ہے۔ لڑکی کی جلد اس قدر پیلی ہو گئی تھی کہ اس سے سبزی جھلکنے لگی تھی۔ ایسی رنگت اس نے سیکڑوں بار دیکھی تھی۔ صرف لاشوں میں۔ اس نے اپنی بڑھتی ہوئی تشویش سے لڑتے ہوئے لڑکی کو پُرسکون لہجے میں مخاطب کرنے کی کوشش کی۔ "میں سپرنٹنڈنٹ آف پولیس ہوں۔ میرا نام جلیس احمد ہے۔ سن رہی ہو تم؟ مجھے تم سے کچھ ضروری سوالات کرنے ہیں۔"

لڑکی نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ اس کے ہونٹ خشکی سے تڑخ رہے تھے۔ آنکھوں میں دھندلاہٹ تھی۔

"وہ لوگ کہاں جائیں گے؟" جلیس نے پوچھا۔

ایسا لگا کہ لڑکی نے مسکرانے کی کوشش کی ہے پھر وہ بولی لیکن آواز اتنی دھیمی تھی کہ جلیس کو سننے کے لیے اس پر جھکنا پڑا۔ "تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ وہ کہاں جائیں گے۔"

"کہاں؟"

"یہ میں نہیں بتا سکتی۔" لڑکی نے ٹوٹتی آواز میں کہا۔

"سنو۔ ہمیں یرغمالیوں کو بچانے کی کوشش کرنی ہے۔ معصوم لوگ خطرے میں ہیں۔"

وہ مسکرائی۔ "اب انہیں مردہ ہی سمجھو۔ معصوم لوگ ہی مرتے ہیں۔ بعض کئی کئی بار۔ جیسے میں اب تک کئی بار مر چکی ہوں۔" وہ رکی پھر بولی۔ "بابرا نہیں نہیں چھوڑے گا۔ وہ شیطان ہے۔"

"اسی لیے تو کہتا ہوں، ہمارا ساتھ دو۔ ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"میں نہیں کر سکتی۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"کیوں نہیں؟"

اب لڑکی سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ لفظ اس کے ہونٹوں پر ٹوٹ رہے تھے۔ "تم.... تم.... نہیں.... سمجھ.... سکو.... گے.... میرے.... پاس.... ان.... کے.... سوا.... کچھ.... نہیں.... بچا ہے۔"

جلیس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ وہ کچھ بھی نہیں سمجھ سکا تھا۔ اتنی پیاری لڑکی.... اور اس کا ان ننگِ انسانیت وحشیوں کے سوا دنیا میں کوئی نہیں! اس کی شکست خوردگی اس لمحے حد سے گزر گئی تھی۔ "تم اپنا نام تو بتا دو۔" اس نے کہا۔

"سب سے.... پہلے.... میرا نام ہی تو مرا.... تھا۔" وہ بمشکل بولی۔ "ایک.... بات بتائیں.... گے؟"

"ہاں کیوں نہیں؟" جلیس نے گہری سانس لی۔

"کل بھی سورج.... غروب.... ہوگا نا؟"
"ہاں۔"
"مجھے.... بہت.... اچھا...."

اسی وقت ڈاکٹر اندر آگیا۔ "سوری آفیسر! اس سے زیادہ وقت نہیں مل سکتا۔ آپ کو.... ویسے بھی آپ کی کال ہے۔"

جلیس باہر نکل آیا۔ استقبالیہ کی طرف بڑھتے ہوئے وہ دعا کر رہا تھا کہ کاش اسے لڑکی سے بات کرنے کا ایک موقع اور مل جائے۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ "جلیس! اسپیکنگ۔"

"میجر نصیر بول رہا ہوں۔ کچھ معلومات حاصل ہوئیں؟"

"نہیں۔ اس وقت وہ آپریشن تھیٹر لے جائی جا رہی ہے۔"

"بُرا ہوا۔ جہاز نے ابھی ٹیک آف کیا ہے۔"

درد جلیس کے سینے سے بائیں کندھے تک دوڑ گیا۔ ایک لمحے کو ایسا لگا' جیسے کسی نے اس کے دل کو مٹھی میں پوری قوت سے بھینچ لیا ہو۔ وہ جھکا اور اس نے گہری سانسیں لے کر درد سے لڑنے کی کوشش کی پھر اس نے سیدھا ہوتے ہوئے کہا۔ "میں آرہا ہوں۔" ریسیور رکھتے ہوئے اس نے سوچا کہ صبح وہ پہلا کام یہ کرے گا کہ کسی ہارٹ اسپیشلسٹ سے رجوع کرے گا۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ لڑکی کو آپریشن تھیٹر لے جایا جا رہا تھا۔

○☆○

کمال جہاز کے ٹیک آف کا انتظار کرتے ہوئے عجیب کیفیت سے گزر رہا تھا۔ اس کا ذہن خیالات کے بھنور میں کسی پہیے کی طرح تیز رفتاری سے گھوم رہا تھا۔ جب بھی وہ اسے روکنے کی کوشش کرتا' اسے دور کی کسی یاد کی ایک جھلک دکھائی دیتی اور گردش پھر شروع ہو جاتی۔ زندگی کیا ہے؟ اس سوال کے نیچے تلے جوابات تھے۔ انتظار کا ایک پیہم' پریشان کن احساس' کسی مبہم وعدے کی وجہ سے حال کو نظرانداز کرنے کی حماقت۔ ایک ایسی مسلسل بوریت جو خلافِ توقع پیش آنے والے واقعات سے کبھی کبھی ٹوٹتی رہتی ہے۔ جو کبھی کبھی دلچسپ بھی ہو جاتی ہے اور اداسی! اور زندگی کا نہ ہونا؟ ہر مایوسی' ہر تباہی' پریشانی.... سب کچھ موت کے مقابلے میں بہتر ہے.... اور موت؟ وہ ہر چیز کی نفی ہے۔ بشمول زندگی۔ جو بے شمار گزرے ہوئے کل زمین تلے دفن کر دیتی ہے۔

وہ جانتا تھا کہ موت کیا ہوتی ہے.... کیسی ہوتی ہے.... وہ اس کا تصور کرتا رہا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کا جسم پسینے میں نہا رہا ہے۔ خوف کا ذائقہ اسے اپنی زبان پر محسوس ہو رہا تھا۔

جہاز کے ٹیک آف کرنے کے جھٹکے نے اسے چونکا دیا۔ اس نے کھڑکی سے دیکھا۔ شہر کی روشنیاں دور اور چھوٹی ہوتی جا رہی تھیں۔ فضائی سفر اسے ہمیشہ اُداس کر دیتا تھا۔ عام طور پر لوگوں کو سنسنی یا خوف کا احساس ہوتا ہے لیکن اسے لگتا تھا کہ وہ کوئی بہت قیمتی چیز پیچھے چھوڑ آیا ہے' جواب اسے کبھی نہیں ملے گی۔ شاید وقت۔ وہ سوچتا تھا کہ زندگی اس کی ناموجودگی کے باوجود اپنے انداز میں بے پروائی سے جاری رہے گی۔

لیکن اس پرواز میں احساسِ زیاں بے حد شدید تھا۔ کیونکہ زندگی کی ضمانت تو کجا' کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ واپسی کا امکان نہیں تھا۔ وہ زندگی سے دور جا رہا تھا اور زندگی کو جاری رہنا تھا۔ اسکول میں اس کی جگہ کوئی اور ٹیچر رکھ لیا جائے گا۔ جمیل الرحمان اس سے اسکول کی ملازمت جاری رکھنے پر کس قدر مصر تھے مگر اب انہیں جلد از جلد متبادل ٹیچر کے حصول کی فکر ہوگی۔ ابتدا میں طلبا اسے مِس کریں گے مگر جلد ہی اسکول کی چھٹیاں ہوں گی۔ چھٹیاں گزار کر واپس آئیں گے تو وہ اسے بھول چکے ہوں گے۔ وہ متبادل ٹیچر کو قبول کرلیں گے۔

بابر ٹہلتا ہوا آیا اور اس نے شملا اور نذیر سے سرگوشی میں کچھ کہا پھر وہ کیبن میں چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی نذیر کمال کے پیچھے والی سیٹ پر آبیٹھا اور شملا نے دونوں لڑکوں کے پیچھے والی سیٹ سنبھال لی۔ نذیر نے کہا "ابھی روشنیاں گل ہونے والی ہیں۔ تم میں سے کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔"

کیبن میں بابر نے پائلٹ اور کوپائلٹ کے درمیان پوزیشن لے لی۔ مشکور نیوی گیٹر کے سر پر کھڑا ہو گیا۔

"تمہارا رخ کابل ہی کی طرف ہے نا؟" بابر نے نوید سے پوچھا۔

"خود دیکھ لو۔" کیپٹن نوید نے انسٹرومنٹس کی طرف اشارہ کیا "تم تو اس جہاز کے بارے میں سب کچھ جانتے ہو۔"

"بہت اسمارٹ بن رہے ہو کیپٹن۔ ابھی ہم پارا چنار سے پیچھے ہی ہیں نا؟"

"میں نے کہا نا' خود دیکھ لو۔ میرے کہنے پر تو تمہیں یقین نہیں آئے گا۔"

بابر نے اس کی طرف کاغذ کا ایک ٹکڑا بڑھایا۔ "یہ ہیں تمہاری نئی ہیڈنگز۔"

نوید نے کاغذ کا جائزہ لیا۔ "جنوب مشرق کی سمت؟"

"ہاں۔"

"مجھے بتا دو کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ تاکہ میں اس کے لیے تیار رہوں۔"

بابر نے ہاتھ بڑھا کر ریڈیو آف کر دیا۔ "تم فکر نہ کرو۔ جہاز کے کسی چیز سے ٹکرانے کا کوئی امکان نہیں اور اب تم جہاز کی لائٹس بھی آف کر دو۔"

"یہ خطرناک ہوگا۔" کیپٹن نے احتجاج کیا۔

"جیسا میں کہتا ہوں' ویسا ہی کرنا ہے تمہیں۔"

نوید نے تعمیل کی پھر بولا "سنو.... تم جہاز سے چھلانگ لگانے کا ارادہ تو نہیں رکھتے؟" اس کے لہجے میں تجسس تھا۔

"میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔"

"ویری گڈ۔ اگر تم ملک میں کہیں بھی جہاز اُتارو گے تو پولیس تمہاری منتظر ہوگی۔"

"ٹھیک کہتے ہو لیکن تم نے ایک امکان پر غور ہی نہیں کیا ہے۔" بابر نے سرد لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟"

"تم نے یہ فرض کرلیا ہے کہ ہم کسی ائرپورٹ پر اُتریں گے۔"

کیپٹن نوید دہل کر رہ گیا۔ "سنو... اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں ائرپورٹ کے علاوہ کہیں یہ جہاز اُتاروں گا تو تم غلطی پر ہو۔" اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

بابر نے پستول نکالا اور اس کی گدی سے لگادیا۔ "میرے خیال میں تمہارا کوپائلٹ زیادہ تعاون کرے گا۔" وہ بولا۔ "اور اس صورت میں مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ ریوالور ہٹالو۔ تم نے مجھے تجسس میں مبتلا کردیا ہے۔ میں تمہاری حماقت مِس نہیں کرنا چاہوں گا۔" نوید نے جلدی سے کہا۔

"گڈ۔ اب میری ہدایات سُنو۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی اس نئی منزل کے لیے تم جہاز کو ہموار انداز میں گھماؤ۔ اب تمہیں ریڈیو کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہاری آنکھوں کا کام کروں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اندر سے بھی اور باہر سے بھی لائٹس آف کردی جائیں۔ گڈ۔ تم نے جہاز کو صحیح راہ پر ڈال دیا ہے۔ یہ بہت عمدہ ٹرن تھا۔ اپنی رفتار دو سو ناٹس رکھو۔ اب ۲۵ منٹ تک اس ہیڈنگ کی طرف چلتے رہو۔ بعد کی بات میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ اس دوران اپنے کوپائلٹ سے کہو کہ چوکنا رہے۔ جہاز کو کسی چیز سے ٹکرانا نہیں چاہیے۔" اس نے کوپائلٹ اور نیوی گیٹر کے سروں سے ہیڈفون اُتار لیے۔ اس نے چیک کیا کہ مائیکروفون بھی ہٹادیے گئے ہیں یا نہیں۔ "اب ہماری باہر کی دنیا سے بات نہیں ہوگی۔"

اس نے مزید کہا۔ "تم میں سے کسی نے سیٹ سے اٹھنے کی کوشش کی تو منشکور تمہیں ختم کردے گا۔" وہ لائٹس بجھنے کا انتظار کرتا رہا پھر کیبن سے نکل آیا۔

○☆○

کمال کے لیے وہ ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔ اسے جیٹ انجنوں کی دہاڑ سُنائی دے رہی تھی اور وہ خود کو آگے کی طرف کرتا محسوس کررہا تھا لیکن آنکھیں جیسے بینائی سے محروم ہوگئی تھیں۔ اسے کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ تاریکی جہاز کے اندر کس مقام پر ختم ہورہی ہے اور باہر کی بیکراں تاریکی کہاں سے شروع ہورہی ہے۔ اسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ وہ کس سیٹ پر بیٹھا ہے، درمیانی راستہ کتنا چوڑا ہے اور فرنٹ سے بیک تک نشستوں کی کتنی قطاریں ہیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ نذیر نے خواہ مخواہ ہی دھمکی دی ہے کہ کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ وہ سیٹ سے کیا اُٹھتا۔ جب کچھ سُجھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا بھی ہوتا تو اسے پتا نہیں چلتا کہ وہ کہاں ہے اور کہاں جارہا ہے۔ صوفیہ نے اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ اچھل پڑا۔ صوفیہ نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ کی لرزش سے اس کی اعصابی کشیدگی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ اس خاموشی میں صوفیہ کے دل کی دھڑکن اسے اس کے ہاتھوں میں محسوس ہو رہی تھی۔ وہ چند منٹ اس کے قرب کی حدت سے محفوظ ہوتا رہا پھر تحفظ کی وہ فضا اچانک ہی درہم برہم ہوگئی۔ اس کے جسم میں تھرتھری سی دوڑ گئی۔ اسے اپنے قریب کسی چیز کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ وہ کیا تھی' یہ وہ نہیں سمجھ سکتا تھا۔

پھر ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔ "ہیلو کمال رشید' کیا ہو رہا ہے؟" آواز اس کے کان سے بہت قریب تھی۔ "خاصی دیر ہوگئی۔ تم سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اس لیے کہ میں بہت زیادہ مصروف تھا۔" لہجے میں تمسخر تھا "مگر میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ مجھے اب بھی تم سے محبت ہے۔ تمہاری بہت فکر ہے مجھے۔"

کمال نے خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کی۔ "تمہاری حسِ مزاح ناقابلِ برداشت ہے بابر۔"

"مجھے خوشی ہے کہ میں تمہیں مزاحیہ کردار لگتا ہوں۔" بابر نے کہا "مجھے اُمید ہے کہ تم ہنستے ہوئے مروگے۔"

"اور میں تمہاری دھمکیوں سے تنگ آچکا ہوں۔"

"اوہ.... میرا خیال ہے' یہ بات اب واضح ہوجانی چاہیے۔ میں دھمکی نہیں دے رہا ہوں' وعدہ کررہا ہوں تم سے۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اب ایک گھنٹا گزرنے سے پہلے تم مرجاؤ گے۔"

کمال کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ "بابر..... میرا مشورہ ہے کہ یہ کام صفائی سے کرنا...... یقینی طور پر"

"کمال رشید.... کیا یہ دھمکی ہے؟"

"نہیں بابر۔ یہ بھی ایک وعدہ ہے۔ اگر مجھے موقع ملا تو میں تمہیں ضرور ختم کروں گا۔ سُنا گندی نالی کے کیڑے۔" کمال نے کہا اور اب وہ بابر کے ردِعمل کا منتظر تھا لیکن وہاں خاموشی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ شاید بابر اس اندھیرے میں کہیں کھسک گیا تھا۔ تاکہ وہ اس کے الفاظ پر غور کرتا اور پریشان ہوتا رہے۔ اپنی موت کا تصور کرے۔ سوچے کہ وہ کس انداز میں قتل کیا جائے گا اور تصور میں خود کو مردہ دیکھے۔

ذہنی طور پر کمال جانتا تھا کہ جہاز کے لینڈ کرتے ہی اس کی زندگی کا خاتمہ ہوجائے گا۔ وہ تصور میں بابر کو دیکھ سکتا تھا کہ وہ اس کے سر سے گن لگا کر ٹریگر دبا رہا ہے۔ اس کے باوجود موت اس کے تصور میں نہیں آئی تھی۔ وہ تصور میں اپنے سر کو اُڑتے.... ٹکڑوں میں تقسیم ہوتے دیکھتا۔ خود کو خون اور بھیجے میں نہایا ہوا دیکھتا۔ اس کے باوجود زندگی سے اس کا ناتا نہ ٹوٹتا۔ وہ دنیا سے رخصت نہ

ہوتا۔ اس لیے کہ اس نے دنیا میں ابھی کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ اسے ابھی بہت کچھ کرنا تھا۔ وہ سوچتا' ڈراما ختم ہونے سے مکمل ہونے سے پہلے صرف چھوٹے موٹے کردار ہی مرتے ہیں۔ ہیرو پر کچھ بھی گزرے' لیکن وہ اپنے عمل سے ارادے کو اس کے منطقی انجام تک پہنچا کر دم لیتا ہے۔ یہ اس کی ذمے داری ہوتی ہے۔ اس سے پہلے ڈائریکٹر اسے مرنے نہیں دیتا۔ وہ بدی کو ختم کرے یا بدی کے ہاتھوں ختم ہو جائے لیکن اس کے اور بدی کے درمیان فاعل ضرور ہوتا ہے۔ ہیرو بے بسی کی موت نہیں مر سکتا۔ ہاتھ پاؤں ہلائے' مقابلہ کیے بغیر وہ بدی کے ہاتھوں ختم نہیں ہو سکتا۔ یہ نیکی کی... ہیروشپ کی توہین ہے۔

اس نے خود کو کبھی ہیرو نہیں سمجھا تھا لیکن بزدل بھی کبھی نہیں سمجھا تھا۔ وہ ہاتھ پاؤں چھوڑ کر پوری سپردگی کے ساتھ اس طرح کی موت کو قبول کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا' جہاں اس کی موت بدی کی فتح کی علامت ہو۔ بابر شیطان تھا' اور وہ اس سے صرف اتنا مطالبہ کر رہا تھا کہ وہ اس کے ایک اشارے پر مر جائے لیکن یہ تو ٹھیک نہیں۔ ایسا ہونے سے روکنے کے لیے اسے کچھ کرنا ہوگا۔ کوئی جوابی منصوبہ بنانا اور بڑے محتاط انداز میں اس پر عمل کرنا ہوگا لیکن کیسا منصوبہ؟ جبکہ وہ وسائل سے پوری طرح محروم ہے۔ وہ کیا کر سکتا ہے؟ وہ سوچتا رہا...

○☆○

کنٹرول ٹاور میں بہت شور ہو رہا تھا۔ باہر نکل کر جلیس نے سکون کی سانس لی۔ میجر نصیر اس کے ساتھ تھا۔ دونوں کافی پینے کے لیے نکلے تھے۔ میجر نصیر کی شخصیت نے اسے اس بار بہت متاثر کیا تھا۔ وہ اپنے کام سے بہت مخلص تھا۔ اوپر کے احکامات اسے بھی برہم کرتے تھے۔ وہ بھی یہی چاہتا تھا کہ مجرموں کو کسی قیمت پر بھی کامیاب نہ ہونے دے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے مجرموں کو من مانی کی اجازت دینا اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ مجرموں کے کامیابی سے بچ کر نکل جانے کا تصور اس کے لیے سوہانِ روح تھا لیکن وہ حقیقت پسند بھی تھا۔ صورتِ حال مخالف ہو تو وہ پیچھے ہٹنے کی اہمیت بھی سمجھتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اربابِ اختیار کا حکم ماننے میں ہی بہتری ہے۔ بے سبب خود پر کیوں الزام لیا جائے۔ ذمے داری فیصلہ کرنے والوں پر ہی کیوں نہ چھوڑی جائے۔

جلیس سوچ رہا تھا کہ کاش وہ بھی اس جیسا ہوتا۔ تو اس وقت اتنا بے سکون نہ ہوتا۔ سینے میں درد کا پیوست نیزہ لیے یوں نہ پھر رہا ہوتا۔ یوں مطعون نہ ہوتا لیکن یہ کہاں ممکن تھا۔ پولیس آفیسر ہونے کا اپنا ایک پریشر ہے۔ پولیس کے محکمے کو اتنا خراب سمجھا جاتا ہے... اتنا غیر مستعد' غیر ذمے دار کہ اچھے آدمی... اچھے پولیس آفیسر پر اس تاثر کو زائل کرنے کا اضافی دباؤ بھی ہوتا ہے۔

ائرپورٹ کے ریسٹورنٹ میں بیٹھے وہ دونوں کافی کے گھونٹ لیتے ہوئے اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔

میجر نصیر نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "سنو... کچھ کھایا بھی ہے تم نے؟ سینڈوچ منگوالوں؟"

جلیس نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں میں کچھ نہیں کھا سکتا۔ میرا تو پیٹ ہی تپ رہا ہے۔"

میجر نے جیب سے ایک ٹیبلٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔ "یہ پانی سے لے لو۔ ویسے سب سے زیادہ تمہیں نیند کی ضرورت ہے۔"

"ہاں' نیند کی اور ڈھنگ سے کھانا کھانے کی۔" جلیس نے ٹیبلٹ حلق سے اتارنے کے بعد کہا۔ "اور شاید ڈاکٹر کی۔ میرے سینے میں شدید درد ہے۔ بابر نے مجھ پر گولیاں چلائی تھیں۔ میں نے بچنے کے لیے جو چھلانگ لگائی تو سینے کی کوئی مسل کھنچ گئی ہے۔"

"درد کس طرف ہے۔"

"بائیں جانب۔"

"یہ تشویش ناک بات ہے۔ خاص طور پر حتمی کے ساتھ۔ تمہیں فوراً ڈاکٹر کو دکھانا چاہیے۔"

جلیس نے اس کی بات نہیں سنی۔ وہ بابر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہ شخص کہاں جائے گا۔ کابل؟ یا کہیں اور۔ دنیا بہت بڑی ہے۔ خاص طور پر دہشت گردوں کے لیے۔ وہ کہیں بھی جا سکتا ہے۔ تمام ممکنہ ائرپورٹس کو خبردار کر دیا گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جو کچھ بھی ہوگا' اس کی ذمے داری ہوگی۔ اسے مری میں ہی ان پر قابو پالینا چاہیے تھا۔ وہ اچھا پولیس آفیسر ثابت نہیں ہوا۔ اسے بابر کا خیال ابتدا ہی میں کرنا چاہیے تھا۔ یہ غیر منطقی نہیں تھا کہ مجرموں نے اپنے کسی ساتھی کو کسی ایسی بلڈنگ میں چھوڑا ہو' جہاں سے اسکول پر نظر رکھی جاسکے۔ یہ بات اس نے ابتدا میں ہی سوچ لی ہوتی اور لڑکی کو گرفتار کر لیا ہوتا تو اس کی کارروائی کبھی ناکام نہ ہوتی اور مجرم ناکام ہو چکے ہوتے۔ اگر وہ لڑکی...

لڑکی کا خیال آتے ہی اس کے سینے میں درد کی ایک نئی لہر اٹھی۔ اس نے سوچا' اسے یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ وہیں رکنا چاہیے تھا۔ لڑکی سے معلومات حاصل ہو جاتیں تو مجرموں کی منزل کے متعلق معلوم ہو جاتا پھر انہیں بے خبری میں چھاپا جا سکتا تھا۔

جلیس میجر سے لڑکی کے متعلق گفتگو کرنا چاہتا تھا لیکن اسے ڈر لگ رہا تھا۔ اس کی باتوں میں کہیں اس کا احساسِ جرم نہ جھلک جائے۔ وہ یہ اعتراف کسی اور کے سامنے نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسی لیے لڑکی سے معلومات حاصل کرنا اس کے لیے اہم ہو گیا تھا۔

اسی وقت ایک جوان میجر نصیر کے پاس چلا آیا۔ "سر... آپ کنٹرول روم میں چلیں۔ گڑبڑ ہو گئی ہے۔"

میجر تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "ایکسکیوزمی۔" اس نے کہا۔

میجر نصیر کو پہلے ہی ڈر تھا کہ یہ کام آسان ثابت نہیں ہوگا۔ بابر بہت خبیث اور ذہین مجرم تھا۔ اس نے مکمل تیاریوں کے ساتھ مکمل ترین منصوبہ بنایا تھا اور شاید وہ ان تمام ٹیکنیکس سے واقف

تھا' جو دنیا بھر میں دہشت گردوں سے نمٹنے کے لیے آزمائی جاتی ہیں۔ اس نے تنبیہہ کر دی تھی کہ اس کے تعاقب میں کوئی طیارہ نہ آئے۔ میجر نے اس کا توڑ یہ کیا تھا کہ تعاقب کرنے والے ائرفورس کے جیٹ طیارے کو تاخیر سے پرواز کرنے کی ہدایت دی تھی۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ یہ اس کی غلطی تھی۔ اسے تعاقب کرنے والے طیارے کو پہلے ہی فضا میں پہنچا دینا چاہیے تھا۔

ریڈار اسکوپ پر ایک نظر ڈالتے ہی اسے احساس ہو گیا کہ اس کا خدشہ درست ہے۔

"انہوں نے سمت کب تبدیل کی؟" اس نے پوچھا۔

"ہمیں نہیں معلوم سر۔ وہ صرف دو منٹ ریڈار پر نظر آئے۔ ہم نے ہر جگہ رابطہ کر لیا ہے۔ وہ کہیں' کسی ریڈار پر نمودار نہیں ہوئے ہیں۔"

"پائلٹ سے تمہارا رابطہ نہیں ہے؟"

"ہم نے بہت کوشش کی ہے سر لیکن انہوں نے ریڈیو بند کر دیا ہے شاید۔"

"اور جیٹ طیارے کی کیا رپورٹ ہے؟"

"وہ 737 تک پہنچ ہی نہیں سکا جناب۔"

میجر نصیر نیچے چلا آیا۔ وہ بہت پریشان تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ مجرم ان کے ہاتھ سے نکل گئے ہیں۔ پیراشوٹ طلب کرنے کو اس نے بلف سمجھا تھا۔ اس کے خیال میں بوئنگ 737 ایسا جہاز نہیں تھا' جس میں سے آسانی سے چھلانگ لگائی جا سکے اور اس کا خیال تھا کہ بابر اتنا پاگل نہیں کہ ایسی کوئی کوشش کرے گا۔ پیراشوٹ صرف انہیں دھوکا دینے کے لیے تھے لیکن اب وہ سوچ رہا تھا کہ اس امکان کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ وہ کسی وقت بھی چھلانگ لگا دیں گے اور وہ ان کے متعلق جانتے کچھ بھی نہیں تھے۔ صرف نام انہیں معلوم تھے اور ناموں سے مجرموں کی شناخت ممکن نہیں تھی پھر بھی اس سلسلے میں تمام بڑے شہروں کی پولیس سے رابطہ کر لیا گیا تھا۔

میجر نصیر کو اس وقت خود پر زبردست غصہ آ رہا تھا۔

○☆○

بابر نے کیپٹن نوید کے پیچھے کھڑے ہو کر جھکتے ہوئے انسٹرومنٹس کو چیک کیا۔ مطمئن ہونے کے بعد اس نے کہا۔ "تم شاندار کام کر رہے ہو کیپٹن۔ اب تم جہاز کو گھماتے ہوئے بتدریج نیچے کی طرف لاؤ گے۔ میں چاہتا ہوں کہ اب تم دو ہزار فٹ کی بلندی پر ڈیڑھ سو ناٹ کی رفتار سے چلو۔" یہ کہہ کر اس نے کیپٹن کی طرف ایک اور کاغذ بڑھا دیا۔

کیپٹن نوید انسٹرومنٹس کی ہلکی روشنی میں کاغذ کو گھورتا رہا پھر بولا "دوبارہ رخ تبدیل کریں.....؟"

"ہاں۔"

"لیکن جہاز کو اتنی کم بلندی پر اُڑانا اور اتنی کم رفتار پر..... یہ مناسب نہیں۔ خاص طور پر اس لیے کہ مجھے نہیں معلوم میں کہاں ہوں اور باہر کیا کچھ ہے۔"

"میری ہدایات پر عمل کرتے رہو تو کسی چیز سے نہیں ٹکراؤ گے۔" بابر نے کہا "تمہیں مجھ پر اعتبار اور انحصار کرنا ہو گا۔"

"تم پر اعتبار! تم پر انحصار! میں تمہیں اس قابل نہیں سمجھتا۔" کیپٹن نوید کا پیمانۂ صبر لبریز ہونے لگا۔ اس شخص کے ساتھ تحمل ناممکن تھا' وہ تو اس کی تربیت کو بھی تباہ کیے دے رہا تھا۔

"میں اب تمہیں پسند کرنے لگا ہوں کیپٹن۔" بابر نے بڑے خلوص سے کہا۔

"لیکن یہ پسندیدگی دو طرفہ نہیں ہے۔"

"تم اچھے بچوں کی طرح کہنا مانتے رہو تو ایسی چھوٹی موٹی باتوں کو میں کوئی اہمیت نہیں دوں گا۔"

نوید نے جہاز کا رخ موڑا اور بلندی کم کرتے ہوئے نئی ہیڈنگ کی طرف بڑھنے لگا۔ رفتار کم کرنے کے بعد اس نے پوچھا۔ "کیا واقعی تم چھلانگ لگانے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

"تمہارے لہجے سے لگتا ہے کہ تمہارے خیال میں ہم ایسا نہیں کر سکتے!" بابر کے لہجے میں کھلنڈرا پن تھا۔

نوید سے اس کا لہجہ برداشت نہ ہو سکا۔ "کاش..... میں یہ منظر دیکھ سکوں۔ بعد کا حال تو مجھے معلوم ہے۔ تمہارے وجود کو زمین سے سمیٹنے میں ہفتوں لگیں گے۔"

"یقین سے کہہ رہے ہو یہ بات؟"

"میں جانتا ہوں کہ اس جہاز کی رفتار اتنی کم نہیں کر سکتا کہ تم محفوظ طریقے سے چھلانگ لگا سکو۔ اس کام کے لیے جہاز کی رفتار اتنی کم ہونی چاہیے کہ وہ جہاز کے فضا میں لٹک جانے کے برابر ہو اور یہ ناممکن ہے۔"

"یہ حساب میں بھی لگا چکا ہوں۔ اس لیے میرا جمپ لگانے کا کوئی ارادہ نہیں۔" بابر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

نوید نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ "تو پھر تمہارے ارادے کیا ہیں؟"

"لینڈنگ۔"

"لینڈنگ! یہاں؟"

"ہاں..... بالکل یہیں۔ اسی جگہ۔"

"اب مجھے یقین ہو گیا کہ تم پاگل ہو۔"

○☆○

میجر نصیر کنٹرول ٹاور میں ٹہل رہا تھا۔ وہ پریشان تھا۔ آدھا گھنٹا ہو چکا تھا۔ دہشت گردوں کے جہاز کے متعلق کوئی اطلاع نہیں مل رہی تھی۔ جہاز کو کہیں کسی ریڈار پر نہیں دیکھا گیا تھا۔ شاید اس کی وجہ موسم تھا۔ آسمان پر بادل بہت زیادہ تھے اور شاید جہاز کو بہت

بلندی پر اُڑایا جا رہا تھا۔ آخری پوزیشن کے مطابق جہاز کا رخ کابل کی طرف تھا مگر اس کے بعد سے اب تک کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکا تھا۔

اب میجر نصیر کو یہ ڈر تھا کہ کہیں جہاز کسی حادثے کا شکار نہ ہو گیا ہو۔ اس وقت فضائیہ کے کئی جہاز گمشدہ جہاز کی تلاش میں اردگرد کے علاقے کو کھنگال رہے تھے۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ بابر نے جہاز کسی صحرا میں اُتروالیا ہو۔ اس صورت میں صبح ہونے سے پہلے اس کا پتا چلنا ناممکن تھا۔ اس صورت میں بابر کو ان پر... کم ازکم آٹھ گھنٹے کی سبقت حاصل ہو جاتی اور آٹھ گھنٹے میں تو پورا گروپ یوں غائب ہو تا کہ سراغ بھی نہ ملتا۔

وہ ٹہلتے ٹہلتے جلیس کے پاس رک گیا۔ ”اب مجھے پریشانی ہو رہی ہے۔“ اس نے کہا ”تم اسپتال سے چیک تو کرو۔ اس لڑکی کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے۔ اب ہمارے پاس وہی ایک کلیو رہ گیا ہے۔“

جلیس کا درد ویسے کا ویسا ہی تھا۔ وہ کسی مریض کی مانند تھا‘ جسے نیند آتی ہو لیکن پوری طرح نہ سوپاتا ہو۔ کچی نیند میں ہی معمولی سی آہٹ پر بھی جاگ جاتا ہو۔ اس وقت میجر نصیر کے لفظوں اور مجرموں کی ساتھی لڑکی کی یاد نے اسے پھر جگا دیا۔ ”میں ابھی فون کر کے پوچھتا ہوں۔“ اس نے کہا اور برابر والے کمرے کی طرف بڑھ گیا‘ جس میں فون تھا۔

میجر نصیر پھر مضطربانہ انداز میں ٹہلنے لگا۔ لڑکی واقعی اب بہت زیادہ اہمیت اختیار کر گئی تھی۔ وہ بتا سکتی تھی کہ مجرموں کا منصوبہ کیا ہے۔ اگر وہ لینڈ کر چکے ہیں تو لڑکی سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں وہ تیزی سے جہاز تک پہنچنے کی کوشش کر سکتے تھے۔ وہ یرغمالیوں کو بچانے اور دہشت گردوں کو پکڑنے کی کوشش کر سکتے تھے۔

اس نے رُک کر ریڈیو کی طرف دیکھا۔ یہ ایک اور مصیبت تھی۔ وزیرِ داخلہ اب تک متعدد بار اسے مخاطب کر چکے تھے۔ ان کی پریشانی قومی بھی تھی اور ذاتی بھی لیکن ان کی کال ہر بار اس پر موجود دباؤ میں اضافہ کر دیتی تھی۔ وہ جہاز کے اوجھل ہو جانے کو اس کی غیر ذمے داری سمجھ رہے تھے۔ اگرچہ انہوں نے اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ انہیں بتا چکا تھا کہ ان کی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہوئی ہے۔ دہشت گردوں نے منصوبہ بناتے ہوئے آخر تک تمام جزئیات کا خیال رکھا تھا اور پھر قسمت بھی ان کا ساتھ دے رہی تھی۔

وہ فون روم کی طرف بڑھا تاکہ جلیس سے صورتِ حال معلوم کرے لیکن کمرے میں جو کچھ نظر آیا‘ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ جلیس دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر موت کی زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ نصیر کو دیکھ کر وہ لڑکھڑاتا ہوا اس کی طرف بڑھا مگر درمیان میں ہی اس کے جسم کو تشنج کا جھٹکا لگا اور وہ

ڈہرا ہوگیا۔ نصیر نے آگے بڑھ کر اسے سنبھالا۔ جلیس نے سر اٹھایا۔ اس کا چہرہ ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔ اسی لمحے اسے دوسرا جھٹکا لگا اور وہ نصیر کے ہاتھوں سے چھوٹ کر فرش پر گرتا چلا گیا۔ نصیر اس کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

لفظ جلیس کے ہونٹوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہوئے۔

"وہ... آپریشن... کے... دوران... مرگئی..." پھر وہ ایک طرف لڑھک گیا۔

میجر نصیر نے اسے سیدھا کیا' اس کے سینے پر ہاتھ رکھا' نبض ٹٹولی لیکن کہیں کچھ نہیں تھا۔ سانسوں کی ڈور ٹوٹ چکی تھی۔

میجر نصیر کئی لمحے ساکت وصامت بیٹھا رہا۔ اس کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ ایس پی جلیس احمد کی پوسٹ مارٹم رپورٹ یہی بتاتی کہ اس کی موت فطری ہے لیکن وہ جانتا تھا کہ بابر کے ہاتھوں مرنے والوں کی تعداد چھ ہوگئی ہے۔ جلیس اس دباؤ کے ہاتھوں ختم ہوا تھا' جو بابر کے بہیمانہ جرم کے نتیجے میں پیدا ہوا تھا۔

میجر کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ "بابر!" وہ غرایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

○☆○

کیپٹن نوید نے جہاز کی نوز کے پار زمین کو محسوس کرنے کی کوشش کی لیکن وہاں کچھ نہیں تھا۔ اس کے انسٹرومنٹس بھی اسے کچھ نہیں بتا رہے تھے۔ روشنی نہ ہونے سے اسے الجھن ہو رہی تھی۔ ونگ لائٹس کی کمی اسے شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ہوتی تو کم از کم اسے فلائنگ لیول کا اندازہ تو ہوتا۔ وہ بابر پر انحصار نہیں کرسکتا تھا۔ ممکن ہے' وہ کوئی جینئس ہو لیکن وہ ہواباز تو نہیں تھا۔ بلکہ وہ ایک خطرناک مجرم... وحشت گرد تھا۔ ایسے لوگوں کے ذہن پر اور ذہن کی کارکردگی پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ ایسے مجرم بہرحال کسی نہ کسی حد تک نفسیاتی مریض ہوتے ہیں اور بابر تو اسے اچھا خاصا پاگل لگ رہا تھا۔ مشکور اسے ٹھیک ٹھاک لگا تھا لیکن بابر کو اس نے پہلی ہی نظر میں ناپسند کیا تھا۔

اور اب... وہ ایک نامانوس جہاز خطرناک حد تک کم بلندی پر اُڑا رہا تھا اور اسے نہیں معلوم تھا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ اب اسے کہا جا رہا تھا کہ اس مہیب اندھیرے میں جہاز لینڈ کرے اور وہ اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ یہ نہ جانتا کہ جہاں اسے جہاز لینڈ کرنے کو کہا جا رہا ہے' وہ کوئی ایسی جگہ ہے' جو جہاز اُتارنے کے لیے نہیں بنائی گئی ہے۔ کیونکہ یہ شخص بابر کتنا ہی چالاک سہی لیکن یہ تو ممکن نہیں کہ اس نے کسی صحرا میں لینڈنگ کے لیے کوئی پٹی بنادی ہو۔ یہ ممکن نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ احمق اس سے کسی پرانی ٹوٹی پھوٹی سڑک پر جہاز اُتارنے کی فرمائش کرے گا۔ اس نے کوپائیلٹ سے کہا۔ "یہ بابر وہاں مظلوم لوگوں کو ذلیل اور خوف زدہ کرنے کے بجائے یہاں آکر ہمیں بتاتا کیوں نہیں کہ اب کیا کرنا ہے۔"

کوپائلٹ منیر نے کہا "مجھے جب بتایا گیا کہ اس فلائٹ کے پائلٹ آپ ہوں گے تو میں نے فوراً یہ ذمّے داری قبول کرلی مگر اب میں سوچ رہا ہوں کہ نیچے کیا ہے' یہ نہ آپ جانتے ہیں نہ میں جانتا ہوں۔ اس جہاز کو اتارنے کے لیے تو کسی سپرمین کی ضرورت ہے۔"

"سپرمین کو اتنی فرصت کہاں۔"

"ایک بات بتائیں۔ آپ کو اندازہ ہے کہ اس وقت ہم کہاں ہیں۔"

نوید چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔ "میرا خیال ہے بالائی پنجاب میں کہیں ہیں۔"

"یعنی ہمیں اترنے کے لیے کوئی انٹرنیشنل ائرپورٹ نہیں ملے گا۔"

"میری پریشانی اس سے کہیں سوا ہے۔"

دونوں آنکھیں پھاڑ کر اندھیرے میں کسی ممکنہ خطرے کو ٹٹولتے اور باتیں کرتے رہے۔ "ایک بات اور بتائیں کیپٹن۔" منیر نے کہا "اگر کسی ائرفیلڈ سے ہٹ کر کہیں جہاز لینڈ کرنا پڑا تو آپ کرسکیں گے؟"

نوید مسکرا دیا۔ "مجھ پر جو تم اعتماد کا اظہار کررہے تھے' وہ کیا ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ میں جہاز کو لینڈ کرسکوں گا لیکن پہلے ہم اس مقام تک پہنچیں تو۔ پھر اس کی فکر کریں گے۔ اگر زمین ناہموار ہوئی اور ایک آدھ وہیل ٹوٹ گیا تو بڑی خطرناک لینڈنگ ہوگی اور میرے بھائی' ٹنکیاں فل ہونے کی وجہ سے مسئلہ سنگین ہوجائے گا۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔"

"دعا کرو کہ وہ مردود بابر بھی اس سلسلے میں سوچ لے۔"

"کسی نے مجھے یاد کیا؟" وہ بابر کی آواز تھی۔ وہ اسی لمحے کیبن میں داخل ہوا تھا۔

"یہ جوتے تمہارے زبردست ہیں۔ ساؤنڈ پروف۔" نوید نے کہا۔ "انہیں پیٹنٹ کرالو۔"

"تم اچھے خاصے مسخرے ہو کیپٹن۔ جتنے زبان دراز ہو' اتنے ہی اچھے ہواباز بھی ہو تو بہتر ہے۔"

"ہواباز میں زیادہ اچھا ہوں۔"

"گڈ۔ اب آزمائش کا وقت بھی آپہنچا ہے۔ میری تجویز ہے کہ اب تم پہیے کھول دو اور جہاز کی رفتار کم سے کم کردو۔ رن وے بہت تنگ ہے۔"

"کیسا رن وے؟" نوید نے چڑچڑے پن سے پوچھا۔

"کھڑکی سے باہر دیکھو تو تمہیں اپنا رن وے نظر آجائے گا۔"

کیپٹن نوید نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ ہلکی روشنی میں اسے دو متوازی سیاہ لکیریں سی نظر آئیں۔ پٹی واقعی بہت تنگ تھی اور مختصر بھی۔ اس پر جہاز اتارنا بہت دشوار کام تھا۔ "اس سے تو اچھا تھا کہ تم مجھ سے ماچس کی ڈبیا پر لینڈنگ کی فرمائش کرتے۔"

"یہ ماچس کی ڈبیا نہیں ہے کیپٹن لیکن تمہارے پاس غلطی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔"

"اگر یہ ٹھوس رن وے نہیں ہے تو جہاز اسے کھود ڈالے گا اور دھنس جائے گا۔" نوید نے کہا۔ اس نے جہاز کے پہیے کھول دیے تھے اور اب رفتار کم کررہا تھا۔

"مجھے داد دینی پڑے گی تمہیں۔" بابر نے مربیانہ انداز میں کہا "میں نے بہت سوچ سمجھ کر اس جگہ کا انتخاب کیا ہے۔ کتنا خوبصورت رن وے ہے۔ یہ جانتے بھی ہو' یہ کیا ہے؟"

"تم ہی بتادو۔" کیپٹن نوید نے بے زاری سے کہا۔

"یہ تمہارا چھ لین کا موٹروے ہے جو اب سکڑ کر چار لین کا رہ گیا ہے۔" بابر نے انکشاف کیا۔ "ان چھوا..... کنوارا موٹروے' جو ابھی تک استعمال نہیں ہوا ہے۔ پچھلی بار جب میں یہاں آیا تھا' اس کے مقابلے میں اب یہ سو فٹ بڑھ گیا ہے۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ ہمارے ہاں سڑکیں کتنی سست رفتاری سے بنتی ہیں۔ اب تو غیر ملکی مستعد کمپنیوں کو بھی سست رفتاری پر مجبور کردیا گیا ہے۔"

"تم پاگل ہوگئے ہو۔" نوید کا دماغ گھوم گیا۔

"غور سے سنو۔ میں تمہیں تمہارے کام کے بارے میں لیکچر نہیں دینا چاہتا۔" بابر نے بے پروائی سے کہا "لیکن ایک مشورہ سن لو۔ یہ جو دو روشنیاں نظر آرہی ہیں' تمہیں جہاز کو ان کے عین درمیان لینڈ کرنا ہے۔ ذرا سی غلطی کروگے تو جہاز سڑک بنانے والے آلات سے ٹکرائے گا' جو اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں اور اگر نسبتاً آگے لینڈ کیا تو لینڈنگ کی پٹی چھوٹی پڑجائے گی۔ ٹھیک لینڈنگ کی صورت میں بھی انجن ریورس کرکے بریک پر کھڑے ہوجانے میں عافیت ہوگی۔ رن وے چھوٹا پڑ سکتا ہے۔"

"اس کی چوڑائی کتنی ہے؟"

"میں پورا حساب لگا چکا ہوں۔ پہیوں کے دونوں طرف دو فٹ فاضل سڑک ہوگی۔"

کیپٹن نوید کو غصہ آگیا۔ "خواہ مخواہ چار فٹ سڑک ضائع کردی تم نے۔ ارے..... دونوں طرف دو دو فٹ فاضل سڑک کی کیا ضرورت تھی۔ بڑے ایکسپرٹ بنتے ہو۔ نہیں جانتے کہ بریک لگانے سے پہلے جہاز تین چار فٹ اِدھر اُدھر ضرور ڈولتا ہے اور میرے لیے تو یہ جہاز بھی نیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کے بریک کیسے ہیں۔"

"یہ تمہارا دردِ سر ہے کیپٹن اور ہاں..... سڑک زمین کے مقابلے میں تین فٹ بلند ہے۔"

نوید زیرِ لب بڑبڑایا۔ پھر بولا "اب تو جہاز کو سڑک پر رکھنا اور ضروری ہوگیا ہے اور مسٹر بابر' اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ سڑک جہاز کو جھیل جائے گی۔ پھٹ نہیں جائے گی۔ مجھے تو یقین نہیں آسکتا....."

"یہ سڑک پاکستانی نہیں' کوریا والے بنا رہے ہیں۔" بابر نے کہا "میں نے اس کے انجینئر سے بات کی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ روڈ جہاز جتنے وزن کو جھیل سکتی ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں نے اس سے جہاز کا پوچھا تھا۔ میں نے بس وزن تجویز کرتے ہوئے پوچھا تھا کہ اتنے دباؤ پر روڈ کی کیا کیفیت ہوگی۔ اس نے کہا کہ سڑک بس کہیں کہیں سے معمولی سی چٹخ سکتی ہے ایسی کہ اس کی مرمت میں زیادہ دیر بھی نہیں لگے گی....."

"یہ غلط ثابت ہوا تو وہ ہم سب کو سڑک کے ساتھ دُھلوادیں گے اور کنارے پر بورڈ لگادیں گے۔ اُس سڑک کو کریش ٹیسٹ کرلیا گیا ہے۔" نوید نے چڑ کر کہا۔

"میرا خیال ہے' اب تم زبان کی تیزی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے لینڈنگ کی فکر کرو۔"

○☆○

کمال نے پہیے کھلنے کی آواز سنی تو چونک گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ جہاز کی رفتار کم ہو رہی ہے۔ اس کا جسم تن گیا۔ کاش..... جہاز اڑتا ہی رہے۔ اس نے سوچا۔ یہ خیال بہت آہستگی سے ابتدا میں اور پھر تیزی سے اس کے ذہن میں در آیا کہ اب زندگی کا آخری باب لکھا جانے والا ہے اور اس کی سانسیں بس گنی چنی رہ گئی ہیں۔ اس پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ کاش وہ یہاں سے اُڑ کر اپنے کلاس روم میں پہنچ جائے۔ مختلف موضوعات پر اپنے طلبا سے تبادلۂ خیال کرے۔ فیکلٹی روم میں بیٹھ کر پی ٹی آئی مظفر خان کے ساتھ کافی اور سگریٹ پیے۔ زندگی اتنی خوبصورت ہے۔ کون اسے چھوڑنا چاہے گا۔ وہ دھوپ کو اپنے جسم پر اور صبح کی شبنم کو اپنے پیروں تلے محسوس کرنا چاہتا تھا۔

اس کے اندر ہلچل مچی ہوئی تھی۔ وہ احساسات جنہیں اس نے اب تک دبائے رکھا تھا اس لیے کہ وہ ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ کر بے بسی سے موت کی آغوش میں نہیں اُترنا چاہتا تھا اور اس لیے کہ زندگی بڑی پیاری' بڑی خوبصورت چیز تھی لیکن اب موت کو بہت قریب جان کر وہ سب اُبھر آئے تھے۔

بابر نے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے کہا "کمال رشید..... بس تھوڑی دیر اور....."

کمال نے صرف ایک لفظ کہا اور بڑی شدت سے کہا۔ "نہیں۔"

بابر رکا' اس کی طرف واپس آیا اور حیرت سے کہا۔ "کیا!"

کمال اب پرسکون تھا۔ اس کے اندر بھی وہ اعتماد تھا جو اس کے لفظوں میں جھلک رہا تھا۔ "میں نے نہ مرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں تمہیں روکوں گا۔"

"اتنے کڑے وقت میں یہ حسِ مزاح حیرت انگیز ہے۔" بابر نے کہا پھر وہ پلٹ کر چل دیا۔

کمال نے اپنے اندر لاوے کی طرح کھولتے ہوئے غصے کو دبایا۔ غصے کو اور اس کے ساتھ ایک توانا لیکن غیر منطقی خوف کو

بھی۔ اس نے صورتِ حال کا حقیقت پسندانہ انداز میں تجزیہ کرنا شروع کیا۔ یہ بات طے تھی کہ وہ چاروں مرجائیں گے لیکن انصاف کا تقاضہ تھا کہ وہ زندہ رہیں اور بابر اور اس کے ساتھیوں کو قرارواقعی سزا ملے۔ ٹی وی کے ڈراموں میں تو یہی ہوتا ہے۔ آخری فتح حق کی ہوتی ہے۔ باطل کچلا جاتا ہے لیکن وہاں تو سب کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ کہیں سے کسی امداد کے ملنے کا امکان نہیں تھا۔ صوفیہ بہت دیر پہلے کوما سے ملتی جلتی کیفیت میں تھی۔ ایک اعتبار سے یہ بہتر ہی تھا۔ اگر وہ سب ایسی ہی بے حسی اور بے خبری کی محفوظ باہوں میں سما جائیں تو موت کا خطرہ بے معنی ہوجائے گا۔ سارا عذاب تو بس سوچنے کا ہے۔ موت کی اذیت تو موت کے خوف کی طوالت میں ہے‘ اس سے نجات پالی جائے تو کوئی مسئلہ نہیں رہتا۔ ابھی وہ موت کی حدود میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ موت بس ان کے ذہنوں میں ایک مبہم خطرے کی طرح تھی۔ اب جو اس سے بے نیاز تھا‘ وہ فائدے میں تھا اور جو تصور میں اس کی جزئیات سے بھرپور شبیہہ تخلیق کررہا تھا‘ وہ عذاب میں تھا۔

اسے ان لوگوں پر غصہ آنے لگا‘ جن کی ذمّے داری تھی کہ انہیں آزاد کرائیں اور مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچائیں۔ کہاں ہیں وہ لوگ؟ آتے کیوں نہیں غیرذمّے دار کہیں کے۔ کیا شیطنت کے پجاری بابر نے انہیں اس طرح انگلیوں پر نچایا ہے کہ ان کے دماغ بیکار ہوگئے ہیں۔ ذہانت جواب دے گئی ہے؟ کیا وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اس بگڑے ہوئے معاشرے میں اب بُرا آدمی نیکی پر غالب آنے لگا ہے‘ فتح یاب ہونے لگا ہے! جرم کا درخت پھولوں اور پھلوں سے لدجاتا ہے۔ دنیا اب ایک جنگل ہے‘ جہاں صرف طاقت کا قانون چلتا ہے۔ بابر کے رویّے سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے۔ وہ بدی کے کردار میں خوش ہے.... اور وہ اس کے.... کمال رشید کے کردار سے بھی خوش ہے کہ اسے کچل کر وہ اپنی برتری اپنی چالاکی‘ ثابت کرسکے گا۔ نیکی کے کردار کو کچل کر! درست...... کیونکہ اس ڈرامے میں دو ہی کردار ہیں۔ فعال کردار...... صوفیہ کو تو شاک نے اس حد تک بے حال کردیا ہے کہ وہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکتی۔ مشکور اور نذیر دولت کے پجاری اور دہشت گرد کے کھلونے ہیں۔ انہیں صورتِ حال کا شعوری ادراک نہیں ہے۔ ان دو معصوم لڑکوں کی طرح‘ جو بس یہ توقع کررہے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اس ابتلا سے ان کی جان چھوٹ جائے گی۔ باقی کون بچا؟ بس وہ دونوں.... کمال اور بابر۔ وہ ہی سمجھ سکتے تھے کہ یہ ذہن کی طاقت اور قوتِ ارادی کی سربلندی کا کھیل ہے۔ جب تک اس معاملے میں دوسرے کو شکست نہیں دی جائے گی۔ بازی نہیں جیتی جاسکتی۔ سو وہ دونوں شطرنج کی بساط پر انسانی جانوں کے مہرے رکھ کربازی کھیل رہے تھے۔

صوفیہ اور دونوں لڑکوں کو موت کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا لیکن کمال جانتا تھا۔ اسے بابر دھکیلتے دھکیلتے زندگی کے پہاڑ کی اس کگر تک لے گیا تھا‘ جس سے ایک پل کے فاصلے پر موت کی مہیب کھائی تھی۔ وہ دیر سے اس کگر پر کھڑا تھا اور بابر اسے اس کے پیروں اور کھائی کی طرف دیکھنے پر مجبور کرتا تھا۔ صوفیہ‘ مظفر اور رئیس نے موت کے بارے میں سوچا بھی ہوگا تو یوں جیسے کوئی فنتاسی۔ انہوں نے اس کے خدوخال تو نہیں دیکھے تھے۔

اس ڈرامے کا حاصل کیا تھا؟ کچھ بھی نہیں! یہی اس ہسٹریائی ڈرامے کا سب سے مضحکہ خیز پہلو تھا۔ بابر ان سب کے ساتھ ایک ایسا کھیل کھیل رہا تھا‘ جس سے آخر میں صرف اتنا ثابت ہوتا کہ وہ اس ڈرامے کے تمام کرداروں سے شیطنت کے معاملے میں بہت آگے تھا۔ سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ اس معاملے میں کسی نے اسے چیلنج بھی نہیں کیا تھا۔ یہ ٹائٹل تو وہ بلامقابلہ جیت سکتا تھا۔ یہ بات تو خود کمال بھی بروقت تسلیم کرنے کو تیار تھا لیکن بابر اسے عملی طور پر ثابت کرنا چاہتا تھا۔ وہ اذیتیں دے کر ثابت کرنا چاہتا تھا کہ شیطنت سب سے بڑی طاقت ہے۔ یہاں اسے چیلنج کیے بغیر نہیں رہا جاسکتا تھا۔ یہ تو اللہ کے سامنے غداری ہوتی۔ بابر اپنی فیصلہ کن فتح کے نشے میں سرشار تھا۔ یہ خیال اسے آیا بھی نہیں ہوگا کہ کہانیوں‘ داستانوں کی طرح ہیرو غیرمعمولی طاقت کا مظاہرہ کرکے بساط پلٹ بھی سکتا ہے۔ دشواری یہ تھی کہ حقیقت میں ایسا بہت بڑے لوگوں نے کرکے دکھایا تھا۔ ورنہ عام طور پر یہ قصے کہانی کی باتیں تھیں۔

کمال کو اپنی ہذیانی اور بے ترتیب سوچوں پر خود ہنسی آنے لگی لیکن یہ سچ تھا کہ وہ ایسا ہی کچھ کرنا چاہتا تھا۔ یوں مرجانا تو بہت آسان تھا مگر موت کو اٹل حقیقت جان کر بہت کچھ کیا جاسکتا تھا۔ کم ازکم کوشش تو کی ہی جاسکتی تھی مگر کچھ کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اس کی ایک سوچ تھی۔ وہ موت سے پہلے مرجانے کو اپنے ہاتھ دوسروں کے خون سے آلودہ کرکے زندہ رہنے سے بہتر سمجھتا تھا مگر اب اسے اس سوچ کو رد کرنا تھا۔ اس لیے نہیں کہ اسے زندگی زیادہ عزیز تھی بلکہ اس لیے کہ یہ سوچ تھی ہی غلط۔ بدی اور نیکی کی جنگ میں نیکی کو ہتھیار اُٹھانے ہوتے ہیں۔ بدی کا خاتمہ کرنا ہوتا ہے۔ یہ جہاد ہے۔ زندہ تو غازی‘ مرے تو شہید۔ انسانی خون بہانا بے شک بُری بات ہے لیکن انسان اگر شیطان کا آلۂ کار بن جائے تو اس کا خون بہانا ہر اچھے انسان پر فرض ہے۔

پہلی بار اسے تقویت کا احساس ہوا۔ روح کو توانائی مل جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ اس بدصورت اور مکروہ شخص کو‘ جو انسان کے روپ میں شیطان ہے‘ صفحۂ ہستی سے مٹانا ضروری ہے۔

○☆○

کیپٹن نوید نے ہاتھ کی پشت سے پیشانی کا پسینہ پونچھا پھر اس نے جلدی سے ہاتھ بڑھایا اور جہاز کے کنٹرول تھام لیے۔ اسے کنٹرولز میں ارتعاش محسوس ہوا۔ درحقیقت پورے جہاز میں جیسے

زلزلہ سا آیا ہوا تھا۔ اس نے جہاز کی ہوا میں اسپیڈ کی کمی کے سدّباب اور اسے زمین پر گرنے سے بچانے کے لیے مزید پاور دی۔ وہ بہت آہستگی سے اور بتدریج جہاز کو نیچے اتار رہا تھا۔ جہاز ایک ایک انچ کا فاصلہ طے کرنے کے لیے زور لگاتا محسوس ہو رہا تھا۔ ہوا میں رہنے کی جدوجہد میں جہاز کا ہر حصہ بج رہا تھا۔ اس کا اپنا جسم تنا ہوا تھا۔ جبڑے اس نے بھینچ لیے تھے۔ جیسے وہ جہاز کو دو روشنیوں کے عین درمیان اُتارنے کی جسمانی کوشش کر رہا ہے اور اُتارنا بھی بے حد آہستگی سے تھا۔

اس کی آنکھیں دونوں روشنیوں کی درمیانی پٹی پر زور دیتے دیتے تھک گئیں۔ وہ اس کے مرکز کے بارے میں درست ترین اندازہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تاکہ دونوں طرف کے پہیوں میں سے کسی کے بھی باہر جانے کا خطرہ نہ رہے۔

بہت نیچے پہنچ کر اس کی نظر سڑک تعمیر کرنے والے آلات کے انبار پر پڑی تو اس پر خوف طاری ہوگیا۔ جہاز ان کے بالکل برابر سے گزرا تھا۔ اس نے جہاز کو مزید پاور دی اور فلیپ اٹھاتے ہوئے جہاز کو بڑے ہموار انداز میں روشنیوں کے عین درمیان اُتار لیا پھر اس نے بڑی پھرتی اور قوت سے تھروٹل کو اپنی طرف کھینچا۔ اس کا جسم سیٹ کی پشت گاہ سے ٹکرایا۔ اس نے بریک لگائے۔ جہاز بائیں جانب جھکتا محسوس ہوا۔ اس نے سیٹ سے ٹیک لگاتے ہوئے، بریک پر جسم کا پورا دباؤ ڈالا اور ہاتھ سے لرزتے ہوئے کنٹرول کو سنبھالا۔ نامانوس دباؤ کے تحت جہاز بری طرح لرز رہا تھا اور عجیب عجیب آوازیں نکل رہی تھیں۔ جہاز تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا اور وہ بریک پر مزید دباؤ اس خوف سے نہیں ڈال رہا تھا کہ کوئی ٹائر نہ اڑ جائے۔

روشنیاں تیزی سے گزر رہی تھیں اور وہ خوفزدہ تھا۔ آخری دو روشنیاں رہ گئیں تو اسے احساس ہوا کہ جہاز رک رہا ہے۔ اب اس نے بریک پر دونوں پیروں سے دباؤ ڈالا۔ بریک لاک ہوئے۔ سڑک سے ربر کے ٹکرانے کی چیختی آواز سنائی دی اور جہاز رک گیا۔ اس نے جھٹکے سے بریک سے پاؤں ہٹائے۔ جہاز کئی فٹ آگے بڑھا۔ اس نے نوز وہیل کو سڑک سے سلپ ہوتا محسوس کیا پھر جہاز کی نوز نیچے جھک گئی۔

بابر نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی "شاندار لینڈنگ۔ میں تمہیں بتانا بھول گیا تھا کہ روشنیوں کے اختتام پر سڑک خم کھاتی ہے لیکن تم نے خود دیکھ لیا۔"

کیپٹن نوید اپنی سیٹ پر ساکت و صامت بیٹھا تھا۔ اس کا پورا جسم پسینے میں نہا رہا تھا۔ اس نے آنکھوں میں اُتر جانے والے پسینے کو صاف کرنے کی کوشش کی۔ اسے اپنے اعصاب کو پُرسکون کرنے میں ایک منٹ لگا۔ "مسٹر بابر۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔ "تم خوش قسمت ہو کہ میں غیر معمولی پائلٹ ہوں۔ ورنہ ہم سب مر چکے ہوتے۔ اب میں جہاز کو بند کر کے روشنی کر رہا ہوں۔ تمہیں بھلا لگے یا بُرا۔ مجھے کوئی پروا نہیں۔"

○☆○

روشنی ہوئی تو کمال کو لگا کہ وقتی طور پر وہ اندھا ہوگیا ہے۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ چند لمحوں بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور انہیں روشنی سے ہم آہنگ کرنے کے لیے بار بار پلکیں جھپکانے لگا۔ جہاز کے اندر کا ماحول اسے غیر حقیقی لگ رہا تھا۔ جیسے سب کچھ پلاسٹک کا بنا ہوا اور موجود لوگ مومی مجسمے ہوں۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ اس نے صوفیہ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر تناؤ تھا اور رنگت سپید پڑ گئی تھی۔ وہ واقعی ساکت بیٹھی کوئی مجسمہ ہی لگ رہی تھی۔ ساتھ والی سیٹ پر رئیس اور مظفر بھی ساکت بیٹھے تھے۔ حد یہ کہ نذیر کا بھی یہی حال تھا۔

اچانک جہاز کے باہر ایک دھماکا ہوا۔ جہاز میں موجود سب لوگ گھبرا گئے پھر عقبی دروازہ کھلا اور آوازوں سے لگا کہ کچھ لوگ اوپر چڑھ رہے ہیں۔ کمال نے اپنی تکلیف کو نظرانداز کر کے سیٹ پر پہلو بدلا اور لٹکے پردے پر نظریں جمادیں۔ ایسے پردے جہاز کو مختلف سیکشنوں میں تقسیم کرنے کے لیے تھے۔

پردہ ہٹا اور بابر سے ملتا جلتا ایک شخص اندر آیا۔ وہ عمر میں بابر سے بڑا لگ رہا تھا۔ اس کے پیچھے ایک دراز قد اور تنومند شخص تھا۔

مختصر الوجود شخص نے نذیر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ "اشوک کہاں ہے؟"

نذیر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "اشوک؟ کون اشوک؟"

پستہ قامت مخنی شخص کے چہرے کا تاثر ایک پل کو بدلا مگر اس نے فوراً ہی خود پر قابو پالیا۔ "میں بابر کو پیار سے اشوک کہتا ہوں۔"

نذیر اسے شک آمیز نظروں سے گھور رہا تھا۔ "وہ کیبن میں ہے۔"

"تم لوگوں نے کمال کردیا۔" مخنی شخص بولا "ایسا کام اس ملک میں پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ جب تم لوگوں نے پولیس والوں کو ختم کیا تو میں سمجھا کہ کھیل ختم ہو رہا ہے... لیکن... بابر انہیں انگلیوں پر نچاتا رہا۔ واہ بھئی واہ۔ تم لوگ واقعی داد کے مستحق ہو۔"

"یہاں کی صورتِ حال کیا ہے؟"

"سب کچھ تیار ہے۔ ہم راولپنڈی سے ملتان جانے والی ویگن لائے ہیں۔ روٹ کی گاڑی ہے۔ مسافر بھی پورے ہوں گے۔ کسی کو شک بھی نہیں ہوسکتا۔ تمام انتظامات مکمل ہیں۔"

اس گفتگو نے کمال کو دہلا دیا۔ وہ جانتا تھا کہ بابر اسے ختم کرنے کا تہیہ کرچکا ہے لیکن اب ثابت ہو رہا تھا کہ وہ تمام یرغمالیوں کو ختم کرنے کا تہیہ کرچکا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ یہ گفتگو

ان کے سامنے نہیں کرتے۔

اسی لیے بابر کیبن سے نکلا۔ اس کے ہونٹوں پر بے حد کشادہ مسکراہٹ تھی۔ وہ منحنی شخص کی طرف بڑھا اور اس سے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ "کہو گوپال..... کیسی رہی؟"

منحنی شخص نے آنکھوں سے نذیر کی طرف اشارہ کیا۔"

"ارے، اب ان سے کیا پردہ۔" بابر نے کہا۔ "یہ ہمارے ساتھی ہیں۔ اب یہ کہیں اور تو نہیں جا سکتے۔"

"پھر بھی....."

"تم اس کی فکر نہ کرو۔" بابر نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"ت..... تو.. تو تمہارا نام اشوک ہے۔" نذیر بوکھلایا ہوا نظر آرہا تھا۔

"ہاں۔ میں اشوک ہوں اور یہ بیلا۔" اشوک نے شہلا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم ہندو ہو؟" نذیر کو یقین ہی نہیں آرہا تھا۔

"ہندو ہی نہیں، میں بھارتی ہوں۔ بھارت ماتا کا ادنیٰ سیوک۔"

نذیر کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ کچھ دیر تو اس سے بولا ہی نہیں گیا پھر اس نے بمشکل پوچھا "اور شہناز؟"

"وہ شہناز ہی ہے۔"

"اور مشکور!"

"وہ بھی مشکور ہی ہے۔"

گوپال نذیر کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "اشوک..... تم نے غلطی کی ہے۔ اب اس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔"

"کوئی بات نہیں۔ رائفل اس سے لے لو۔ غیر مسلح کردو اسے۔ زیادہ گڑبڑ کرے گا تو اس کا شمار بھی یرغمالیوں میں کرلیں گے۔" اشوک نے کہا۔ پھر وہ نذیر کی طرف مڑا۔ "تمہارا کیا خیال ہے۔ پانچ کروڑ میں سے اپنا حصہ لینا چاہتے ہو یا موت۔"

نذیر کو فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگی۔ اس نے وہ سب کچھ دولت ہی کے لیے تو کیا تھا۔ اس نے کہا "اشوک..... میں تمہارے ساتھ ہو... ور رہوں گا۔"

"دیکھا تم نے۔ میں ٹھوک بجا کر ساتھی بناتا ہوں۔" بابر نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ "تمہیں رقم دکھاؤں گا تو حیران رہ جاؤ گے۔"

"یہ بتاؤ، اب ہمیں کارکردگی دکھانے کا موقع کب ملے گا؟" گوپال نے پوچھا۔

"بہت جلد۔ منصوبے میرے پاس کئی ہیں۔ میں نے شہر کا انتخاب بھی کرلیا ہے۔ ہم اس سفر کی گرد بیٹھنے کا انتظار بھی نہیں کریں گے۔ یوں ان کا دھیان ہماری طرف سے ہٹ جائے گا۔"

وہ کچھ دیر آپس میں باتیں کرتے رہے پھر نذیر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے گوپال سے پوچھا۔ "ہماری ساتھی شہناز کا کیا ہوا؟"

گوپال بے تاثر چہرہ لیے اسے دیکھتا رہا۔ "وہ نہیں آسکے گی۔"

"کیوں؟" نذیر نے پوچھا۔

"پولیس والے اس تک پہنچ گئے تھے۔ اسے گولی لگی تھی پھر خبر آئی کہ وہ اسپتال میں مرگئی۔ شناخت کے لیے اس کی تصویر مسلسل ٹی وی پر دکھائی جارہی ہے۔"

نذیر کو یہ سن کر جھٹکا لگا۔ اس نے سیٹ کی پشت گاہ کو تھام کر خود کو سنبھالا۔ "اس نے زبان کھولی.....؟"

"میرا خیال ہے نہیں۔ خبروں میں بتایا گیا تھا کہ پولیس آپریشن کے بعد اس سے پوچھ گچھ کرے گی لیکن وہ آپریشن کے دوران ہی مرگئی۔

نذیر کے اندر کچھ ٹوٹ گیا۔ اس نے نئی زندگی کے خواب شہناز کے ساتھ مل کر دیکھے تھے۔ وہ مشترکہ خواب تھے اور اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس منصوبے پر عمل درآمد کے دوران اتنی خون ریزی ہوگی۔ اس نے اکثر سوچا تھا کہ پولیس نے دھاوا بول دیا تو کیا ہوگا۔ مقابلہ ہوگا تو لوگ تو مارے جائیں گے۔ یہ اس کے لیے قابلِ قبول تھا مگر نازیہ کی موت نے اسے ہلا دیا تھا۔ اس کے نزدیک وہ غیر ضروری تھی۔ اس کو نہیں مارنا چاہیے تھا اور اب شہناز! وہ بدنصیب دکھی عورت، جو ہمیشہ لٹتی رہی اور آخر میں اس کے خوابوں کے ساتھ اس کی زندگی بھی لٹ گئی۔

پھر اس نے سوچا، اچھا ہی ہوا جو وہ مرگئی۔ اسے پتا چلتا کہ شہلا بیلا ہے اور بابر اشوک تو کیا ہوتا۔ وطن دشمنوں کا آلۂ کار بننے کا داغ اس نے تو دولت کی خاطر قبول کرلیا تھا لیکن شہناز شاید یہ برداشت نہ کرپاتی اور نتیجتاً اشوک کے ہاتھوں ماری جاتی۔ انجام شاید یہی ہونا تھا اس کا۔

اشوک کیبن کی طرف جارہا تھا۔ نذیر نے راستے میں اسے روک لیا۔ "سنو اشوک، ان لوگوں کو ختم کرنے کی ضرورت نہیں۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔ "ہم پہلے ہی کافی لوگوں کو ختم کرچکے ہیں۔ ان لوگوں کا قتل ہمارے مستقبل کے منصوبوں کے لیے تباہ کن ہوگا۔ اگر لوگوں کو یہ یقین ہو کہ یرغمالیوں کو ہر حال میں مارے جانا ہے تو ہمارے مطالبات وہ کیوں تسلیم کریں گے۔"

اشوک استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ "میری حقیقت جاننے کے باوجود تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میرا مقصد بھاری زرِتاوان وصول کرنا ہے۔ ارے بے وقوف، میں اس ملک میں انارکی پھیلانا چاہتا ہوں۔ میرا مقصد لوگوں کو عدم تحفظ کا احساس دلانا ہے۔ رقم تو بونس ہے میرے لیے۔"

"اس کے باوجود اگر تم نے یہ تاثر قائم کردیا کہ تم مطالبات پورے ہونے پر بھی یرغمالیوں کی جاں بخشی کے قائل نہیں ہو تو اگلا آپریشن ہمارا آخری آپریشن ہوگا۔ وہ ہمیں ختم کردیں گے۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو نذیر۔" اشوک نے سرد لہجے میں کہا "دراصل تم کمزور آدمی ہو..... بہت کمزور۔ جہاز کا عملہ اور چاروں یرغمالی... سب کو مرجانا ہے۔ تم چاہو تو انہیں بچانے کی کوشش

کر دیکھو۔ بس ایک لاش کا اور اضافہ ہو جائے گا۔ تمہاری لاش کا۔ کیا یہ تمہارے خیال میں مناسب سودا ہے؟"

نذیر کی نظریں جھک گئیں۔ وہ پہلے دن سے ہی خود کو اشوک کے سامنے بے بس محسوس کرتا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا "میں ایسی کوئی کوشش نہیں کروں گا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" اشوک نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "اب تم ایسا کرو کہ ایکسپلوزیوز کو لے کر نیچے اترو اور ویگن سے چار سوٹ کیس نکال کر یہاں لے آؤ پھر جا کر ویگن اسٹارٹ کرو۔ ہم رقم نئے سوٹ کیسوں میں منتقل کریں گے اور پھر چل دیں گے۔ اس کے بعد تم محفوظ ہو گے۔"

"ٹھیک ہے۔" نذیر نے کہا اور پلٹا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

"اور جلدی کرنا۔"

نذیر نے ایکسپلوزیوز اٹھائے اور عقبی حصے کی طرف چل دیا۔ وہ بدگمانیوں سے نظریں چرا رہا تھا۔ کمال کی نگاہوں میں اس کے لیے کھلی نفرت تھی۔

اسی لمحے اشوک کیبن کے دروازے پر نمودار ہوا۔ "نذیر... ویگن کو جہاز کے قریب ہی لے آنا۔ سوٹ کیس منتقل کرنے میں آسانی رہے گی۔"

نذیر نے سر کو تفہیمی جنبش دی اور چلتا چلا گیا۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ جہاز کے دروازے سے سیڑھی لگی ہوئی تھی۔ اُترنے سے پہلے اس نے ڈائنامیٹ کے دونوں پیکٹوں کو سیڑھی کی سائیڈ میں جہاز کے پاس گرا دیا۔ وہ ریڈیو کی مخصوص فریکوئنسی پر سیٹ ہونے کی وجہ سے عام حالات میں بے ضرر تھے۔

ویگن میں آٹھ افراد بیٹھے تھے۔ وہ واقعی مسافر ہی لگ رہے تھے لیکن نذیر جانتا تھا کہ وہ دوسرے اور تیسرے یونٹ کے اراکین ہیں۔ اب وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ یونٹ دہشت گردی کے یونٹ ہیں۔ را کے تربیت یافتہ ایجنٹوں کو تخریب کاری اور دہشت گردی کے لیے بھارت سے پاکستان بھیجا گیا ہے۔

اس نے دل ہی دل میں حساب لگایا۔ "وہ پورے مسافروں کی ویگن تھی۔ وہ پندرہ سیٹیں تھیں۔ آٹھ افراد ویگن میں موجود تھے۔ دو اوپر جہاز پر تھے اور چار وہ خود تھے۔ مشکور، وہ خود، بلا اور اشوک۔ بلا اور اشوک اب بھی اسے اجنبی اور نامانوس نام لگ رہے تھے۔

○☆○

چمکیلی روشنیوں میں جہاز کا ماحول مصنوعی اور سرد معلوم ہو رہا تھا۔ کمال کا عجیب حال تھا۔ لینڈنگ نے اس کے نڈھال جسم کے ساتھ اور ظلم کیا تھا۔ انجر پنجر ڈھیلے ہو گئے تھے۔ اب وہ آہستگی سے سنبھل رہا تھا لیکن اس انکشاف نے کہ یہ کارروائی درحقیقت را کے ایجنٹوں کی ہے، جس میں انہوں نے پاکستانیوں کو بھی استعمال کیا ہے، اس کے بدن میں بجلیاں سی بھر دی تھیں۔ اس سے پہلے اس خیال نے کہ اس کے ہم وطن بھی ایسے سفاک ہو سکتے ہیں، اس کے مورال کو تباہ کر دیا تھا مگر اب اس کے اندر ایک نیا عزم، نیا حوصلہ جاگ رہا تھا۔ وہ دہشت گردوں کو دیکھتا رہا، جو پُرسکون انداز میں اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ یوں وہ لینڈنگ کے نتیجے میں منتشر ہونے والے اعصاب کو تھپک رہے تھے۔

کمال کو معلوم ہو گیا تھا کہ جہاز پر موجود دہشت گردوں میں دو ہندوؤں کا اضافہ ہو گیا ہے۔ یقیناً شاید اور بھی کئی ایک موجود ہوں، لیکن اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ کسی طرح مظفر یا رئیس کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ ضروری تھا کہ اس بات کا دہشت گردوں میں سے کسی کو احساس نہ ہو۔ چنانچہ وہ کسی مناسب موقعے کا منتظر تھا۔ ان لوگوں کو روکنے کی کوئی کوشش اگر کرنی تھی تو اس کے لیے ضروری تھا کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار ہو اور چاقو کے سوا کچھ میسر نہیں تھا، جو رئیس کے پاس تھا۔

اب صورتِ حال یہ تھی کہ نذیر نیچے جا چکا تھا۔ اشوک دوسرے دو دہشت گردوں کے ساتھ جہاز کے عقبی حصے میں تھا، جہاں زرِ تاوان کے سوٹ کیس رکھے تھے۔ مشکور کیبن میں تھا اور یہاں صرف بلا تھی۔ (کمال کو حیرت ہونے لگی کہ اس نے دہشت گردوں کے اصل ناموں کو کتنی آسانی سے قبول کر لیا تھا۔)

یہ مناسب موقع تھا۔ جیسے ہی مظفر نے اس کی طرف رخ کیا، اس نے مظفر کو اشارے سے بتایا کہ وہ رئیس سے بات کرنا چاہتا ہے۔ مظفر نے رئیس کو بتایا اور رئیس اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اب وہ زبان سے بول نہیں سکتا تھا۔ سو وہ اشاروں میں رئیس کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ اسے چاقو کی ضرورت ہے۔ یہ مرحلہ خاصا دشوار تھا۔ بالآخر وہ اپنی بات سمجھانے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ رئیس اور مظفر درمیانی راستے کے دوسری طرف اس سے دو قطار آگے بیٹھے تھے۔ اگلا مرحلہ اور دشوار تھا۔ چاقو اِدھر سے اُدھر کیسے کیا جائے۔

ابھی کمال کوئی ترکیب سوچ ہی رہا تھا کہ رئیس نے بڑی سادگی سے مسئلہ حل کر دیا۔ وہ اٹھا اور پیچھے کی طرف چل دیا۔ کمال کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے چاقو کمال کی گود میں گرا دیا۔ کمال نے تیزی سے اسے ہاتھ سے چھپا لیا۔

بلا کا ردِعمل بہت تیز تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی اور رائفل کا رخ رئیس کی طرف کیے اس کی طرف بڑھی۔ "کیا بات ہے؟ مرنا چاہتے ہو؟" وہ غرائی۔

"نہیں۔ ہاتھ پاؤں کھول رہا ہوں۔ بالکل اکڑ کر رہ گئے ہیں۔" رئیس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"چلو اپنی جگہ بیٹھ جاؤ۔ تمہارے ہاتھ پیروں کو اب کھلنے کی ضرورت نہیں۔"

رئیس اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔ بلا کمال کو شک آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھی لیکن چاقو اسے نظر نہیں آیا تھا۔

کمال نے اپنی سیٹ سے ٹیک لگائی اور پاؤں پھیلا کر بیٹھتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کا ہاتھ اندر ہی اندر چاقو کو کھول رہا تھا۔ اب وہ ایک خاص آواز کا منتظر تھا۔ بلا کے پلٹنے کی آواز کا۔ جیسے ہی اسے وہ آواز آئی۔ اس نے چاقو نکالا اور اٹھ کر اس کی طرف جھپٹا۔ بلا کی پشت اس کے سامنے تھی۔ چاقو کے بلیڈ کو بلا کے گردے میں دھنس جانا تھا لیکن عین موقعے پر ایک رائفل کی نال نے مداخلت کی۔ نال اس کی کلائی سے ٹکرائی۔ چاقو ہاتھ سے چھوٹ کر اُڑا اور چند قطار دور کسی سیٹ کے نیچے جا گرا۔ خود کمال سیٹوں کے درمیان والی جگہ میں گر گیا۔ وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا تھا۔

وہ کوشش کرکے اُٹھا۔ تب اس نے دیکھا کہ کام بگاڑنے والا کون تھا۔

اشوک کے چہرے پر عجیب سا تاثر تھا۔ ”کمال رشید..... بس اتنا ہی کرسکتے ہو تم۔ اتنی ہی سوچ ہے تمہاری۔ اس طرح تم چھ مسلح افراد کو کیسے روک سکتے ہو۔ مجھے مایوسی ہوئی ہے۔“

کمال اپنی سیٹ پر ڈھیر ہوگیا۔ جسم میں پھر ٹیسیں اُٹھنے لگی تھیں۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں مایوس کیا۔“

”سب سے بڑی بات یہ کہ تم ایک کمزور لڑکی پر پیچھے سے وار کررہے تھے۔ مجھے تم سے کسی ہیرو کے سے طرزِ عمل کی توقع تھی۔“

”کمزور لڑکی۔“ کمال نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ”دہشت گردی کی کوئی جنس نہیں ہوتی۔ را کی تربیت یافتہ لڑکی کمزور کہلائے گی؟“

”خیر تم نے مجھے مایوس بھی نہیں کیا۔ اتنی نامساعد صورتِ حال میں تمہاری یہ کوشش ثابت کرتی ہے کہ تم مرنا نہیں چاہتے۔ اب تمہیں مارنے میں لطف آئے گا۔“

بدلے ہوئے لہجے کو محسوس کرکے کمال نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ جو کچھ وہاں دکھائی دیا‘ اس نے اس کے جسم میں سرد لہر دوڑادی۔ اشوک کا چہرہ سخت نقاب کی صورت اختیار کرگیا تھا۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ یہ وہی تاثر تھا جو اس وقت اس کے چہرے پر نظر آیا تھا‘ جب اس نے پچھلی بار اسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔

رائفل کی نال کمال کی ٹھوڑی کے نیچے نرم عضلات میں دھنس رہی تھی۔ اشوک نے اور دباؤ ڈالا۔ کمال کا سر پیچھے کی طرف گیا۔

”اب..... اب میں تمہیں قتل کررہا ہوں۔“ اشوک نے پھنکار کر کہا۔

کمال نے اپنے حلق پر موجود دباؤ کم کرنے کے لیے سر کو اور پیچھے ہٹایا لیکن رائفل بھی ساتھ ساتھ آئی تھی۔ اس کوشش کے نتیجے میں اس کے زخمی کندھے اور بازو میں اذیت کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے رائفل ہٹانے کی غرض سے اپنا سیدھا ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ رائفل کی نال کے وار نے سُن کردیا ہے وہ اسے اٹھا نہیں سکا۔ اس نے صوفیہ کو دیکھا۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ یقینی طور پر شاک کی حالت میں تھی۔

کمال نے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور پُرسکون ہوگیا۔ اب زندگی کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اسے خوشی تھی کہ اسے آخری لمحوں میں کلمہ پڑھنے کا‘ اللہ کو یاد کرنے کا اور توبہ کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ صرف اس کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔

ایک لمحے کو اس نے تصور کیا کہ گولی چلی ہے اور وہ مرگیا ہے لیکن درحقیقت کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ چند لمحے بعد اسے اشوک کی ہسٹریائی ہنسی سنائی دی پھر اس نے کہا۔ ”کمال رشید! ابھی تم پوری طرح نہیں پکے ہو اور مجھے کچا پھل توڑنا اچھا نہیں لگتا۔ ابھی میں تمہیں کچھ وقت اور دوں گا۔ تم پک جاؤ گے بالآخر۔“ رائفل جھٹکے سے ہٹائی گئی۔ کمال کی ٹھوڑی سینے سے جا لگی پھر قہقہے کی آواز دور جانے لگی۔

کمال نے آنکھیں کھول دیں۔ ”اسے مجھے مار دینا چاہیے تھا۔“ وہ بڑبڑایا۔ انداز خود کلامی کا سا تھا۔ ”اب یہ پچھتائے گا کہ اس نے یہ موقع کیوں ضائع کیا۔“ ساتھ ہی اسے احساس ہوا کہ جو کچھ ہوچکا ہے‘ اس کی روشنی میں اس کی یہ دھمکیاں بے معنی ہیں۔ خالی خولی۔ ساتھ ہی اسے یہ احساس بھی ہوا کہ اس نے جو کوشش کی تھی‘ وہ بھی بے معنی ہی تھی۔ اشوک نے درست کہا تھا کہ اس طرح وہ چھ مسلح دہشت گردوں پر قابو نہیں پاسکتا۔ واقعی..... اگر وہ بلا پر وار کر بھی دیتا تو کیا ہوتا۔ اس نے آگے کے بارے میں تو کچھ نہیں سوچا تھا۔ اس کے پاس آئندہ کے لیے بھی کوئی مکمل لائحۂ عمل ہونا چاہیے تھا۔

اس نے سر گھمایا اور سیٹوں کے درمیانی راستے میں کھڑی بلا کو گھورنے لگا۔ اس نے سوچا کہ فیصلہ میرا غلط بہرحال نہیں تھا۔ دہشت گردی کی زنجیر کی سب سے کمزور کڑی بلا ہی تھی اور اس کے پاس دو چیزیں تھیں‘ جو طاقت کا توازن تقریباً برابر کرسکتی تھیں۔ اس کی رائفل اور بیلٹ سے لٹکتے ہوئے دستی بم۔ وہ اپنے داہنے ہاتھ کو ہلانے لگا تاکہ وہ کارآمد ہوجائے۔ اس نے سوچا‘ اگر یہ چیزیں مجھے میسر ہوں تو..... یہ سوچ کر وہ مسکرایا۔ واقعی..... اشوک نے مجھے زندہ چھوڑ کر جو غلطی کی ہے‘ وہ مہلک ثابت ہوسکتی ہے۔

ذرا دیر بعد اشوک واپس آیا۔ وہ بہت اچھے موڈ میں تھا۔ اس نے چیخ کر مشکور کو حکم دیا کہ وہ عملے سے چھٹکارا پالے پھر وہ گوپال اور دوسرے ساتھی کے ساتھ جہاز کے عقبی حصے میں چلا گیا۔ وہ انہیں دولت دکھاتے ہوئے اسے دوسرے سوٹ کیسوں میں منتقل

کرنا چاہتا تھا۔

اب وہاں صرف بلا تھی۔ رائفل لیے وہ بار بار پہلو بدل رہی تھی۔ لگتا تھا' نروس ہے۔ کمال نے سوچا' یہ اس کے لیے قطعی طور پر آخری موقع ہے۔ اب اسے کچھ کرنا تھا۔ یہ اس کا فرض تھا۔ اسے ادا کر دیتا تو وہ سرخروئی سے مر سکتا تھا۔ اب اسے غم نہیں تھا کہ وہ خون بہانے کا اپنا عہد توڑ رہا ہے۔ اب وہ پھر سے پاک فوج کا جوان تھا اور یہ میدانِ جنگ تھا۔ ہمیشہ کی طرح دشمن کو عددی برتری بھی حاصل تھی اور وہ بہترین اسلحے سے لیس بھی تھا۔

اسی وقت کیبن کی طرف سے ایسی آواز سنائی دی' جیسے ہاتھاپائی ہو رہی ہے پھر کیپٹن نوید کی گونج دار آواز سُنائی دی۔ "کیا مطلب؟ کیا کرنا چاہتے ہو تم؟"

چند لمحے توقف رہا پھر مشکور نے جواب دیا۔ "باس نے مجھے حکم دیا ہے کہ تم لوگوں کو ختم کردوں۔"

شہلا مضطربانہ انداز میں انچ انچ کر کے کیبن کی طرف بڑھنے لگی پھر وہ رُک گئی۔ عین کمال کی سیٹ کے پاس!

پھر اچانک ایک ساعت شکن دھماکا ہوا۔ جہاز میں ہونے والی ہر سرگرمی رک گئی۔ جہاز میں موجود تمام لوگوں نے خود کو اوپر اٹھتا محسوس کیا۔ جہاز اپنے بائیں ونگ پر اٹھنے لگا تھا۔ پھر وہ دائیں جانب جھکنے لگا۔ اس کے بعد اس کے پہیے نکلے اور وہ پیٹ کے بل بیٹھتا چلا گیا۔ دھماکا ہوتے ہی جہاز میں اندھیرا ہوگیا تھا۔ بس کھڑکیوں کے باہر نارنجی رنگ کی بہت چمک دار روشنی ہو رہی تھی' جس سے جہاز میں بھی اندھیرا نہیں رہا تھا۔ کمال نے خود کو اوپر اُٹھتے اور پھر جھٹکے سے نیچے گرتا محسوس کیا۔ گونج دار آواز جتنی تیزی سے اُبھری تھی' اتنی ہی تیزی سے معدوم ہوگئی۔ جہاز میں بھگدڑ سی مچی ہوئی تھی۔ خاص طور پر عقبی حصے میں۔ لوگ چیخ رہے تھے۔ ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے تھے۔

پھر ایک اور دھماکا ہوا اور آواز سے اندازہ ہوا کہ آگ بھڑکی ہے۔ شاید کوئی فیول کی ٹنکی پھٹی تھی.....!

○☆○

نذیر نے ویگن اسٹارٹ کی اور اسے جہاز کے پاس سیڑھیوں کے برابر لاکر کھڑا کردیا۔ ویگن میں نسبتاً چھوٹے آٹھ سوٹ کیس تھے۔ عام سوٹ کیس جیسے مسافروں کے پاس ہوتے ہیں۔ اس نے وہ سوٹ کیس گوپال اور اس کے ساتھی کو دیے کہ جہاز پر پہنچادیں۔

وہ پھر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ وہ پریشان تھا۔ جہاز سے اب کسی بھی لمحے فائرنگ کی آوازیں آسکتی تھیں۔ وہ اشوک کا شکر گزار تھا کہ اس نے اسے نیچے بھیج دیا۔ اب اسے وہ قتلِ عام دیکھنا نہیں پڑے گا۔ دیکھنا تو کجا' وہ فائرنگ کی آواز بھی نہیں سننا چاہتا تھا۔ کاش وہ کسی طرح اس قتلِ عام کو روک سکتا لیکن وہ جان دے کر بھی نہیں روک سکتا تھا۔

اس نے ویگن میں نصب ریڈیو آن کردیا۔ فضا میں ہلکی سی کھرکھراہٹ اُبھری۔ وہ کسی اسٹیشن کی تلاش میں ٹیونر گھمانے لگا۔ ڈائل کی طرف دیکھ کر سوئی آگے لے جاتے ہوئے اس کے ذہن میں کوئی بھولی بسری یاد چٹکنے لگی۔ اس نے سرخ سوئی کو دو نمبروں کے درمیان ٹھہرایا۔ ہلکی سی آواز ابھر رہی تھی۔ وہ سوچتا رہا کہ ذہن میں یہ خلش کیسی ہے۔ اس نے سوئی کو معمولی سا اِدھر اُدھر گھمایا تاکہ اسٹیشن صاف لگ جائے۔ آواز قدرے صاف ہوئی۔ چند الفاظ سنائی دیے لیکن کھرکھراہٹ اب بھی ہو رہی تھی۔

اچانک وہ اپنی جگہ ٹھٹھر کر رہ گیا۔ وہ اہم بات اسے یاد آگئی تھی۔ اس نے ریڈیو کے روشن ڈائل کو جھک کر دیکھا۔ اس کے بدترین خدشات کی تصدیق ہوگئی۔ اس نے سوئی کو اس خاص فریکوئنسی پر ٹھہرادیا تھا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹیونر کو گھمانے کی کوشش کی لیکن بہت دیر ہوچکی تھی۔ ڈائنامیٹ کے پیک خوف ناک دھماکے سے پھٹ گئے۔

○☆○

کمال نے سانس تک روک لی تھی۔ وہ دم سادھے بیٹھا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ غیر متوقع طور پر کچھ ہوگیا ہے پھر اچانک اسے خیال آیا کہ جہاز کسی بھی لمحے پھٹ سکتا ہے۔ اس کے رگ و پے میں خوف دوڑ گیا۔ وہ اندھیرے میں دم سادھے ایک اور دھماکے کا منتظر تھا کہ اچانک روشنی واپس آگئی۔

جہاز کے اندر کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔ سوائے اس کے کہ بلا درمیانی راستے پر گرپڑی تھی اور اب اٹھنے کی کوشش کررہی تھی۔ کیبن کی طرف سے مشکور کے ہکلانے کی آواز آرہی تھی۔ وہ کچھ کہنے کی کوشش کررہا تھا۔ عقبی حصے میں اشوک جانے کس پر برس رہا تھا۔ "اب یہ سوٹ کیس تو دور اُچھال دو۔ جہاز کی ٹنکی پھٹ گئی تو سب تباہ ہوجائے گا۔"

کمال کو پھر متلی کا احساس ستانے لگا۔ اس کے نتیجے میں جسم میں کمزوری کی لہری دوڑ گئی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا وجود پگھل رہا ہے۔ ہاتھوں اور ٹانگوں میں جیسے جان نہیں رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ کوئی نرم گرم بستر میسر ہو اور وہ سوجائے۔ اسے سکون کی ضرورت تھی۔

وہ کمزوری کے ہر احساس سے لڑرہا تھا۔ ذہن سے باہر دھکیلنے کی کوشش کررہا تھا۔ یہ کمزوری کو قبول کرنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ خود کو یاد دلاتا رہا کہ اس پر کئی اعتبار سے ایک فرض عائد ہوتا ہے اور اسے وہ ادا کرنا ہے۔ بالآخر اس کے اندر ایک نامعلوم توانائی اور مضبوطی امنڈنے لگی۔

کیبن کی طرف سے کیپٹن کی آواز سنائی دی۔ "اب تم آرام سے بیٹھ جاؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری طرف سے کسی کو کوئی خطرہ لاحق ہو۔"

کمال کے ذہن سے دُھند چھٹنے لگی۔ اسے یاد آگیا کہ اسے کیا

کرتا ہے۔ اس نے سر گھما کر دیکھا۔ بلا اٹھ چکی تھی اور اب لڑکھڑاتے قدموں سے کیبن کی طرف جانے کے ارادے سے بڑھ رہی تھی۔ ایسی پھرتی سے جو خود اس کے لیے بھی حیران کن تھی، کمال نے اپنے زخمی بازو کو سیٹ سے لپٹا کر گرفت بناتے ہوئے خود کو سیٹ سے اٹھایا اور بلا کی رائفل تھام لی۔ بائیں کندھے اور بازو پر گزرنے والی قیامت کا اسے احساس بھی نہیں تھا۔

بلا اور کمال ایک لمحے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔ بلا کی آنکھوں میں چیلنج تھا۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ تم ایسا نہیں کرسکتے۔ تم عورت پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتے۔ عورت کا خون نہیں بہا سکتے۔

کمال بھی اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ اب صورتِ حال بدل چکی ہے۔ اخلاقی تقاضے بدل چکے ہیں۔ شہلا نامی عورت کی بات اور تھی اور بلا نامی بھارتی دہشت گرد کی بات اور ہے۔ ویسے بھی اب تک جو کچھ ہو چکا تھا، اس کے بعد اس کے دل میں رحم کا شائبہ بھی موجود نہیں تھا۔ اب اور ستم کی اجازت نہیں دی جاسکتی تھی۔ وہ دہشت گردوں سے ان کے انداز میں نمٹنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔

اس نے زور لگاتے ہوئے جھٹکا دیا۔ بلا لڑکھڑاتی ہوئی پیچھے ہٹی۔ اس کا پاؤں پھسلا اور وہ گر گئی۔ رائفل اب کمال کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے رائفل سنبھالتے ہوئے اپنا پاؤں بلا کے پیٹ پر رکھ دیا کہ وہ اٹھ نہ سکے۔ بلا کے چہرے پر خوف تھا۔ اس کا ہاتھ تیزی سے اپنی بیلٹ کی طرف لپکا، جہاں دستی بم لٹکے ہوئے تھے۔ بلا کی اس غلطی نے کمال کو فیصلے پر پہنچنے میں مدد فراہم کی۔ کمال نے اس وقت جو شدید نفرت محسوس کی، وہ خود اس کے لیے بھی حیران کن تھی۔ اس نے رائفل کی نال بلا کے حلق پر لگائی اور ٹریگر دبا دیا۔ یہ احساس اسے بعد میں ہوا کہ اس نے کیا کیا ہے۔ وہ جبلی ردِعمل تھا۔

بلا کی آنکھیں پھیلیں۔ اس نے رائفل کی نال کو دونوں ہاتھوں سے دبوچا۔ کمال نے دوبارہ ٹریگر دبا دیا۔ بلا کے حلق سے خون کا فوارہ ابلا۔ کمال کی پینٹ کے پائنچے خون میں تر ہوگئے۔ خون جہاز کے فرش پر بھی بہہ رہا تھا۔ بلا کی گردن تقریباً جسم سے علیحدہ ہوگئی تھی۔

کمال سحرزدہ سا کھڑا بہتے ہوئے خون کو دیکھتا رہا۔ اس کے ذہن پر دھند سی چھانے لگی پھر بلا کے جسم نے ایک جھٹکا لیا تو وہ چونکا۔ اسے خیال آیا کہ ابھی اس کا کام پورا نہیں ہوا ہے۔

جہاز کے عقبی حصے سے اشوک کی آواز سنائی دی۔ ”اب ہم ہر طرح سے پھنس چکے ہیں۔ ویگن بری طرح تباہ ہوگئی ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”پاگل ہوگئے ہو۔“ گوپال بولا۔ ”ویگن کا حشر دیکھ رہے ہو۔ اس میں تو کوئی بھی نہیں بچا ہوگا۔“

کمال نے فرش پر بہتے خون سے نظریں اٹھائیں۔ کیبن کے دروازے میں کیپٹن نوید ہاتھ میں شاٹ گن لیے کھڑا تھا۔

ادھر عقبی حصے میں اشوک کہہ رہا تھا۔ ”اندر چلو۔ مجھے کچھ خوں ریزی کرنی ہے۔ ادھر سے نمٹ کر پھر کچھ سوچیں گے۔“

کمال نے رائفل بائیں ہاتھ میں تھامتے ہوئے جھک کر بلا کی بیلٹ سے ایک بم نوچ لیا۔ بائیں بازو اور کندھے میں ہونے والی تکلیف کی اب اسے کوئی پروا نہیں تھی پھر وہ پلٹ کر چلّایا۔ ”اپنی سیٹوں میں دبک جاؤ اور دونوں ہاتھوں سے کان بند کرلو۔ جھک جاؤ....“

خود جھک کر رائفل کو بائیں پہلو سے لپٹاتے ہوئے اس نے بم کی پن کھینچی اور اسے پردے کی طرف اچھال دیا، جسے اسی لمحے ایک طرف ہٹایا گیا تھا۔ ساتھ ہی اس نے خالی سیٹوں کے درمیان چھلانگ لگادی۔ دھماکے نے جہاز کو ہلا ڈالا۔ دھات کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اس کے سر کے اوپر سے اڑتے ہوئے گئے۔

اس کی طبیعت پھر بگڑنے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ وہیں پڑا رہے اور کچھ دیر آرام کرلے لیکن اسے یاد تھا کہ اسے کام مکمل کرنا ہے۔ وہ کوشش کرکے سیٹوں کے درمیان سے نکلا اور پردے کی طرف جھپٹا۔ اس نے پردے پوری طرح ہٹائے۔ وہاں زہریلا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ اسے پھندا لگ گیا اور اس کی آنکھیں جلنے لگیں۔ وہ کسی نرم چیز سے ٹھوکر کھا کر لڑکھڑایا۔ وہ لاش تھی۔ اس نے غور سے دیکھا۔ وہ گوپال تھا۔ اس نے چیک کیا وہ واقعی مرچکا ہے پھر وہ لپکتے قدموں سے آگے بڑھا۔ وہ تمام سیٹوں کو چیک کررہا تھا۔ جہاز کے بالکل عقبی حصے میں دروازے کے قریب اسے دو سیٹوں کے درمیان گوپال کا دوسرا ساتھی نظر آیا۔ اس کے دونوں ہاتھ پیٹ پر تھے۔ وہ کھانسنے کے دوران کراہ رہا تھا۔

کمال نے ایک ہاتھ کی مدد سے رائفل بلند کی اور اس کے سینے کے درمیان گولی ماری۔ وہ ایک جھٹکے سے پیچھے کی طرف جا گرا۔

اب اسے اشوک کی تلاش تھی لیکن اشوک جہاز میں موجود نہیں تھا۔ یعنی وہ جہاز سے نکل چکا تھا۔

کمال دروازے کی طرف لپکا جو سیڑھی دروازے سے لگائی گئی تھی اس کے چیتھڑے اڑ چکے تھے۔ اب چھلانگ لگانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا اور اس کی جسمانی حالت ایسی نہیں تھی لیکن اس پر جنون طاری ہو رہا تھا۔ اس نے احتیاط سے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کہیں اشوک چھپا ہوا نہ ہو۔ مطمئن ہو کر اس نے پہلے رائفل پھینکی اور پھر خود چھلانگ لگادی۔ اس نے چھلانگ لگاتے ہوئے یہ خیال رکھا تھا کہ وہ دائیں ہاتھ کے بل گرے۔ اس کے باوجود اس کے جسم کے بائیں حصے میں اذیت کی لہر دوڑ گئی۔

چند لمحے وہ یونہی ساکت پڑا رہا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ وہ اٹھ سکے گا۔ رائفل اس سے ایک ہاتھ کے فاصلے پر پڑی تھی لیکن اسے اٹھانا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ اس کی نظر تباہ شدہ ویگن

پر پڑی پھر جا بجا بکھرے ہوئے انسانی اعضا نظر آئے لیکن وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ یہ سب کیسے ہوا ہوگا۔

بالآخر قوتِ ارادی اور کام مکمل کرنے کی ضرورت کے احساس نے اسے تقویت دی اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے رائفل اٹھائی اور جہاز کے عقب کی طرف بڑھنے لگا۔ اچانک اسے اشوک بھاگتا نظر آیا۔ اس نے رائفل سیدھی کی لیکن فوراً جھکالی۔ فاصلہ زیادہ تھا۔

وہ بھی اسی طرف بھاگنے لگا۔ اشوک نے بھاگتے بھاگتے پلٹ کر اسے دیکھا اور اپنی رفتار بڑھادی۔ کمال کو یقین نہیں تھا کہ وہ اشوک تک پہنچ سکے گا لیکن جب تک ٹانگوں میں جان تھی، وہ اس تعاقب سے دستبردار نہیں ہو سکتا تھا۔ اشوک کے ہاتھ میں بھی رائفل تھی۔

○☆○

اشوک نے پلٹ کر دیکھا تو اسے بس ایک ہیولا نظر آیا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ وہ کیپٹن نوید ہوگا۔ صرف وہی، اس کے منصوبوں کا بیڑہ غرق کرنے کی اہلیت رکھتا تھا۔ اسے خود پر غصہ آنے لگا۔ وہ کچھ زیادہ ہی ریلیکس کر گیا تھا۔ ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا مظاہرہ کیا تھا اس نے۔ اسے پہلی فرصت میں یرغمالیوں کو بھی ختم کر دینا چاہیے تھا اور جہاز کے کریو کو بھی۔

اور اب وہ خوف زدہ بھی تھا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ اب اسے جان بچانے کے لیے بھی جدوجہد کرنا ہوگی۔ یہ اس کے لیے نئی بات تھی۔ اب تک وہ ایسی کسی صورتِ حال سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ مقابلہ کرنے کے لیے وہ دوسروں کو استعمال کرنے کا عادی تھا۔ اب تک اس کا واسطہ نہتے لوگوں سے پڑا تھا۔ کمزور لوگوں سے یا ایسے لوگوں سے، جنہیں اس نے بے خبری میں مار لیا تھا۔ اب تک اسے زندہ رہنے کے لیے جدوجہد نہیں کرنی پڑی تھی۔ سو اب وہ متوحش تھا۔

اچانک وہ کسی چیز سے ٹکرا کر گرا۔ وہ سڑک کوٹنے والا انجن تھا۔ یہ وہ مقام تھا، جہاں سڑک کی تعمیر کرنے والے آلات اور سڑک کی تعمیر میں استعمال ہونے والے سامان کا ذخیرہ کر دیا گیا تھا۔ یہ اچھی جگہ ہے۔ اس نے اٹھتے ہوئے سوچا۔ اچھا خاصا قلعہ ہے یہ۔ یہاں سے وہ کیپٹن کو نشانہ بنا سکے گا۔

وہ اٹھ کر اندھا دھند آگے بڑھا اور پھر کسی چیز سے ٹکرایا۔ اچانک اس پر کوئی بھاری چیز گری۔ وہ نیچے گرا اور اس لمحے کوئی اور بھاری چیز اس کی ٹانگ پر گری۔ آواز سنتے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ تکلیف کا احساس اسے بعد میں ہوا تھا۔ چیخا بھی وہ بعد میں ہی تھا۔

وہ بہت بے ڈھنگا گرا تھا۔ بھاری چیز اب بھی اس کی ٹانگ پر گری ہوئی تھی اور ٹانگ کو وہ ہلا بھی نہیں سکتا تھا۔ تکلیف کے باوجود اس نے خود کو اٹھاتے ہوئے بھاری چیز کو ہاتھ سے دھکیل کر

ازدواجیات

شوہر نے اندر آکر بیوی کو بتایا "باہر ایک فلاحی انجمن کے نمائندے آئے ہیں۔ وہ غریبوں کی مدد کے لئے پرانے کپڑے مانگ رہے ہیں۔ کیا گھر میں کچھ پرانے کپڑے ہیں جو انہیں دیئے جاسکیں؟"

بیوی ایک لمحہ سوچنے کے بعد بولی "ہاں۔ ایک تو تم اپنی وہ نیلی شلوار قمیص دے دو جو تم پچھلے پانچ سال سے پہن رہے ہو۔ دوسری میری وہ پیلی ساری دے دو جو میں پچھلے ماہ لائی تھی۔"

○☆○

شادی کے بعد دو سہیلیاں آپس میں ملیں "میں کیا کرتی، میں بہت مجبور تھی" پہلی سہیلی نے کہا۔

"کیا مطلب؟" دوسری نے پوچھا "تم نے مجبوراً اس سے شادی کی مگر کیوں؟"

"اس شخص سے نمٹنے کا کوئی اور طریقہ میرے پاس نہیں تھا" پہلی سہیلی نے جواب دیا۔

گرانے کی کوشش کی لیکن وہ اسے نہ ہلا سکا۔ اس لمحے اسے احساس ہوا کہ وہ سیمنٹ کی بوری ہے۔

وہ سڑک کوٹنے والے انجن کی اوٹ میں تھا۔ انجن کے پیچھے وہ بوریوں کی دیوار سی تھی، جس سے وہ ٹکرایا تھا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ یہ اس کی خوش قسمتی ہے کہ گرنے والی پہلی بوری نے اس کی گردن نہیں توڑ ڈالی لیکن اب بھی وہ اچھے حال میں تو نہیں تھا۔ اس نے انجن کے نچلے حصے سے باہر دیکھا۔ اس کے تعاقب میں آنے والا اب کافی قریب آگیا تھا۔

○☆○

کمال نے اشوک کو رولر انجن سے ٹکرا کر گرتے دیکھا پھر وہ اٹھا اور آگے بڑھا۔ کمال کو انجن کے عقب میں بوریوں کی دیوار سی نظر آئی۔ درحقیقت وہ بوریوں کا کمرا سا تھا۔ اشوک اندھا دھند اسی طرف گیا تھا پھر اگلے ہی لمحے اسے دھما کا سنائی دیا تھا۔

کمال نہیں سمجھ سکا کہ کیا ہوا ہے لیکن اسے یقین ہو گیا کہ اشوک اب اس کے ہاتھ سے نہیں بچ سکے گا۔ وہ زیادہ دیر تو وہاں محصور نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے طمانیت سے سوچا کہ اب تمام حساب چکانے کا وقت آگیا ہے۔ ہر وہ تکلیف جو اس دہشت گرد نے اسے پہنچائی تھی، ہر وہ انسانی جان جو اس نے لی تھی.... ہر چیز کا حساب لینا ہے اس سے۔ اگر اشوک سیدھا بھاگتا جاتا تو اس کے لیے کوئی امکان نہ رہتا اس تک پہنچنے کا لیکن اب وہ پھنس چکا تھا۔

وہ بھاگتے بھاگتے رُک گیا۔ اب وہ پُراعتماد قدموں سے رولر

انجن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ انجن سے دس فٹ دور رہا ہوگا کہ فائر ہوا۔ گولی اس کی بائیں ران میں پیوست ہوئی تھی۔ وہ گرا۔ گرتے ہی اسے رولر انجن کے عقب میں گرا ہوا اشوک نظر آیا۔ وہ بے بسی کے عالم میں لیٹا ہوا تھا۔ اس کی ٹانگ پر سیمنٹ کی بوری گری ہوئی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے .... اذیت اٹھا کر فائر کرنے کے لیے پوزیشن بنائی ہوگی۔

کمال کی ذہنی کیفیت اب ایسی تھی کہ وہ تکلیف کے ہر احساس سے ماورا ہو چکا تھا۔

○☆○

اشوک یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ آنے والا کون ہے۔

اسے اس کی ٹانگیں تو نظر آرہی تھیں لیکن بالائی جسم اور چہرہ رولر انجن کے عقب میں تھا۔ اس نے اپنی پوزیشن بناتے ہوئے رائفل کو سیمنٹ کی اسی بوری پر ٹکایا، جو اس کی ٹانگ پر پڑی ہوئی تھی۔ درد اب اس کی برداشت سے باہر ہوا جارہا تھا۔

اس شخص پر فائر کرنے میں اسے کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہو رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ جہاز کے عقبی حصے میں موجود اس کے دو ساتھی بم پھٹنے کے نتیجے میں اگر ہلاک نہیں بھی ہوئے تھے تو شدید زخمی ضرور ہوئے ہوں گے۔ ان کے جہاز سے باہر آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ مشکور جہاز کے کیبن میں تھا اور وہ حکم کا بندہ بغیر ہدایت کے کچھ کرنے کا قائل نہیں تھا۔ اب یہی امکان رہ گیا تھا کہ آنے والا جہاز کے کریو میں سے کوئی ہے۔

اس نے بڑی احتیاط سے نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔

گولی آنے والی کی ران میں لگی۔ ٹانگ ایک جھٹکے سے ہٹی۔ پھر وہ شخص اُچھل کر گرا.....

اشوک کو اپنے دل کی دھڑکن رکتی محسوس ہوئی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اس کے سامنے کمال رشید تھا۔

اس سے پہلے کہ اشوک حیرت سے سنبھلتا، کمال اُچھل کر سامنے سے ہٹ گیا۔ اشوک کی چلائی ہوئی چھ گولیاں عین اس جگہ لگیں، جہاں چند لمحے پہلے زمین پر کمال گرا ہوا تھا۔ ادھر ٹانگ کی تکلیف بڑھ رہی تھی۔ وہ اس پوزیشن میں رہ کر زیادہ دیر مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے سیمنٹ کی بوری کو ہٹا کر پھنسی ہوئی ٹانگ کو نکالنے کی کوشش کی۔ ٹانگ کا حال خواہ کچھ بھی ہو، لیکن اب وہ اس قید سے آزاد ہونا چاہتا تھا۔ یوں تو کمال اسے باآسانی ختم کر دیتا۔

اس نے پورا زور لگایا۔ اس کے حلق سے چیخ نکل گئی لیکن وہ بوری کو نہ ہٹا سکا۔ البتہ بوری ذرا سی سرکی تھی اور اس کی ٹانگ پر قیامت گزر گئی تھی۔

داہنی سمت سے اسے آہٹ محسوس ہوئی۔

کمال زمین پر گرا ہوا سینے کے بل آگے بڑھ رہا تھا۔ اشوک نے رائفل تھامتے ہوئے اپنے جسم کو داہنی جانب موڑنے کی کوشش کی لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ اس نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ کمال کی رائفل کی نال، اس کی گردن سے بمشکل چھ انچ دور تھی۔

”کمال رشید.... تم مجھے زندہ بھی گرفتار کر سکتے ہو۔“ اس نے التجا کی۔

”تمہیں گرفتار کرنا میرا کام نہیں۔“ کمال نے سرد لہجے میں کہا ”تم میرا ذاتی معاملہ ہو۔“

”میں را کا ایجنٹ ہوں۔ بہت قیمتی معلومات فراہم کر سکتا ہوں۔“

کمال نے چند لمحے سوچا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس زیادہ مہلت نہیں ہے۔ اب وہ سانپ کی گردن پر ہاتھ ڈال چکا تھا۔ ایک لمحے کی کوتاہی بھی ہوتی تو وہ خود ڈسا جاتا۔ اس کی اپنی حالت اچھی نہیں تھی۔ ران سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ صرف قوتِ ارادی کے زور پر کوئی کتنا چل سکتا ہے۔ ”مجھے اس سے کوئی غرض نہیں اشوک۔ تم میرا نہیں، اور لوگوں کا دردِ سر تھے۔ وہ تمہیں دور نہ کر سکے تو وہ جانیں۔ تم پاکستان میں داخل ہوئے۔ تم نے اتنی بڑی کارروائی کی۔ یہ ہماری وزارتِ داخلہ کی اور ہماری سیکیورٹی ایجنسیوں کی نااہلی ہے۔ میں تو وہی کچھ کروں گا جو کر سکتا ہوں۔“

”پلیز، میری بات سنو۔“ اشوک گڑگڑایا۔

”سوری۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

”سنو کمال.....“ اشوک ہذیانی انداز میں چلایا۔

”جی تو چاہتا ہے کہ تمہیں اسی طرح ختم کروں، جس طرح تم مجھے ختم کرنا چاہتے تھے لیکن میں نہ بے رحم ہوں نہ دہشت گرد۔ ناؤ گوٹو ہیل....“ کمال نے ٹریگر دبا دیا۔ اس کے بعد چند منٹ اسے کسی بات کا ہوش نہیں رہا۔

آنکھ کھلی تو اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اب جسم کسی مشقت کے لیے آمادہ نہیں تھا۔ چلو چھوڑو۔ اس نے خود سے کہا۔ اب تمہیں کون سا کوئی اہم کام کرنا ہے۔ اب تو آرام کر لو کچھ دیر۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں اور جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

جانے کتنی دیر بعد اسے آتے ہوئے قدموں کی آہٹیں سنائی دیں لیکن اس سے آنکھیں نہیں کھولی گئیں پھر کسی نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ ”کیسے ہو کمال؟“ وہ صوفیہ کی آواز تھی۔

اس نے بولنے کی کوشش کی۔ اس کے ہونٹ ہلے لیکن کوئی آواز نہ نکلی۔

”سر.... آپ تو سچ مچ ہیرو ہیں.... مردِ میدان۔“ وہ رئیس کی آواز تھی۔ ”اب میں آپ سے سب کچھ سیکھوں گا سر۔“

وہ مسکرایا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں تک پہنچی یا نہیں۔ بس اس کے بعد اس کا ذہن اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔ اسے یقین تھا کہ اب اس کی آنکھ روشنیوں میں کھلے گی۔

جاسوسی ڈائجسٹ : اپریل 1994

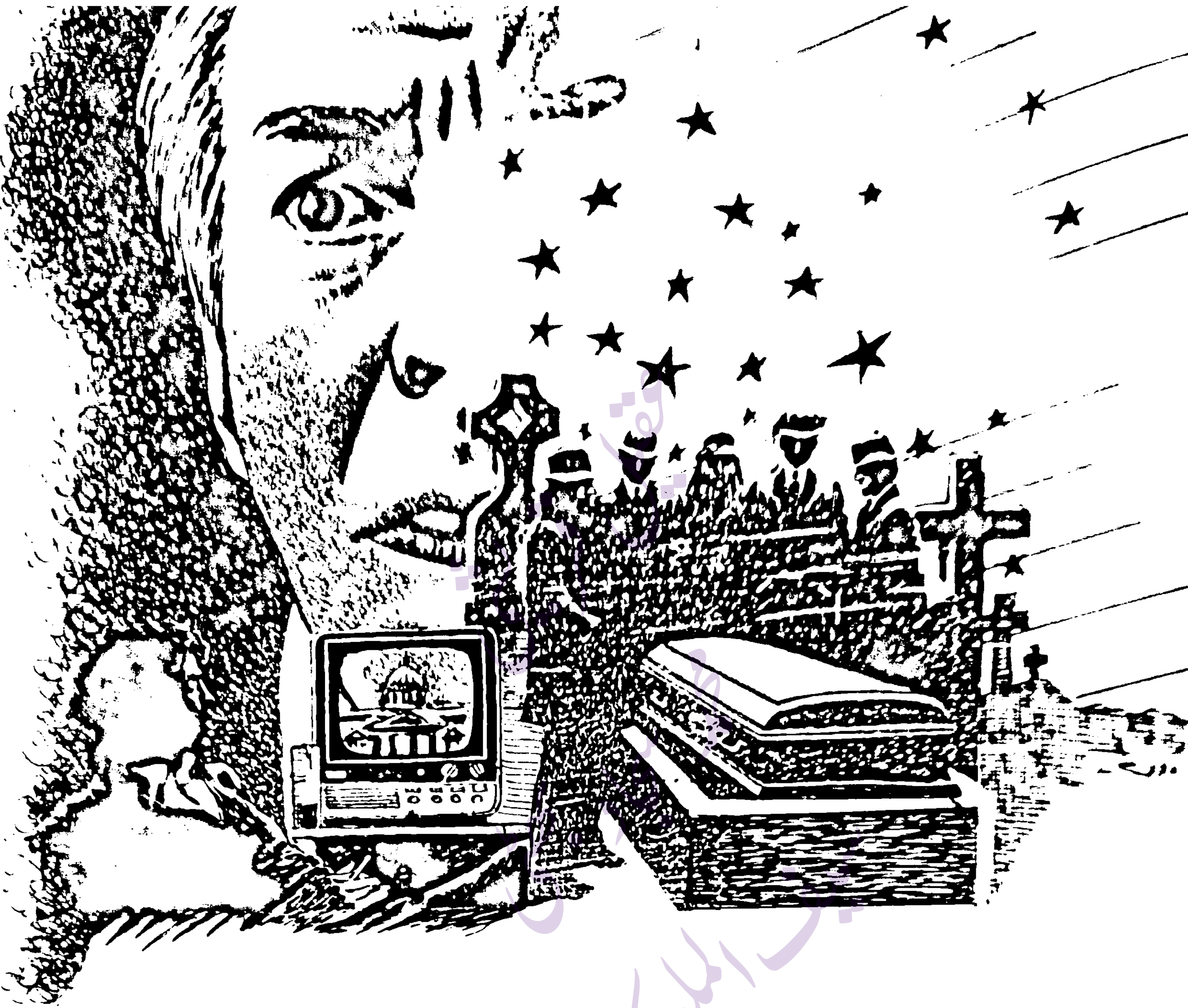
مکمل ٹیکنیک وکیٹ

محمد سجاد بھٹی

03045503086

خصوصی تعاون: جاسوسی نشست ایڈمن

ڈاکٹر حامد حسن۔ساگر زمان۔عقیل قریشی۔ ممتاز علی کیانی۔سیف الملوک عباسی۔ یاسر حسنین۔ناصر محمود بلوچ۔محمد نعمان & صائم بھائی



مریض

نسیم جاوید سید

اُسے ایک اہم ذمّے داری سونپی گئی تھی لیکن خرابی یہ ہوئی کہ وہ عین وقت پر بیمار پڑ گیا۔ بیماری سے زیادہ اُسے فرض کی ادائیگی کی فکر تھی۔ بظاہر کوئی پریشانی نہیں تھی مگر اُسے ایک بےچینی لاحق تھی اور وہ اس کی وجہ جاننے سے قاصر تھا۔

اُس نیکی کی رُوداد جس کا صِلہ درست وقت پر مل گیا

آرث ٹیلر کے لیے فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اس وقت اس کی اپنی حالت زیادہ خراب تھی یا اس کے اپارٹمنٹ کی؟ عام حالات میں بھی آرث ٹیلر کچھ زیادہ صفائی پسند یا سلیقہ شعار شخص نہیں تھا لیکن اب تو مسئلہ یہ تھا کہ وہ دس دن سے فلو میں مبتلا تھا اور صاحبِ فراش تھا۔ اس لیے اپارٹمنٹ میں نظر آنے والی معمولی بے ترتیبی اور بے سلیقگی اب سنگین صورت اختیار کر چکی تھی۔

غنیمت تھا کہ سنک میں سنے ہوئے برتنوں کا انبار نہیں تھا کیونکہ ٹیلر بیماری کے دوران کاغذی برتنوں میں کھاتا پیتا رہا تھا لیکن وہ کاغذی کپ پلیٹیں پورے اپارٹمنٹ میں بکھری ہوئی تھیں۔ ٹی وی

آن تھا اور اس کے اوپر ہی دس دن کے اخبارات کا انبار لگا ہوا تھا جو کسی کے ذرا سے اشارے پر گرنے کا منتظر نظر آرہا تھا۔

ٹیلر گرم پانی کی بوتل سینے پر رکھے صوفے پر دراز تھا اور ایک چھوٹے سے تولیے سے چہرے سے پسینہ پونچھ رہا تھا۔ چہرہ پونچھ کر اس نے اسپرین کی دو گولیاں منہ میں ڈالیں اور سوڈے کی ایک نیم گرم، ادھ بھری بوتل حلق میں انڈیل کر انہیں نگلا پھر اٹھ کر باتھ روم کی طرف چل دیا۔

ابھی وہ باتھ روم تک نہیں پہنچا تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے پلٹ کر ریسیور اٹھایا اور دوسری طرف سے کچھ سننے کے بعد بولا "... ہاں بھئی۔ ظاہر ہے میں ہی بول رہا ہوں۔ تمہیں یہاں اور کس کی آواز سننے کی توقع تھی؟"

بات کرتے کرتے اس نے فون کو باتھ روم میں ہی لے جانے کی کوشش کی لیکن تار چھوٹی تھی۔ چنانچہ وہ وہیں کھڑے کھڑے بات جاری رکھتے ہوئے بولا "تم اس وقت کہاں ہو راجر؟... ہماری بلڈنگ کی لابی میں ہی کھڑے ہو؟... ہاں.... میں بیمار تو ضرور ہوں لیکن مجھے ترس کھانے والے کسی تیماردار کی ضرورت نہیں.... اور پھر اس وقت اپارٹمنٹ کی حالت بھی تباہ ہے... اچھا خیر.... اگر تم آنے پر تلے ہی ہوئے ہو تو آجاؤ۔"

چند لمحے بعد اس نے کال بیل سن کر دروازہ کھولا اور مہمان کی شکل دیکھے بغیر ہی واپس آکر دھم سے صوفے پر ڈھیر ہوگیا۔ راجر اپنے مضبوط اور ورزشی بازوؤں پر سودے سلف کے چند بڑے بڑے لفافے اٹھائے اندر آیا اور ایک میز پر بہ مشکل جگہ تلاش کر کے انہیں رکھنے کے بعد کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ پھر اس نے ٹیلر کی طرف دیکھا جو ایک تکیے کے عقب سے جھانک رہا تھا۔ ٹیلر کا گنجا سر، بڑھی ہوئی شیو اور مسکین سی شکل دیکھ کر اسے بے اختیار ہنسی آگئی "تم تو واقعی بیمار ہو..... آج اتوار کے دن بھی بستر میں ہو۔"

"تمہارا خیال ہے میں مذاق کر رہا تھا؟" ٹیلر کراہ کر بولا۔

راجر کوئی جواب دینے کے بجائے کمرے سے کاٹھ کباڑ سمیٹنے لگا۔ ٹی وی کے قریب رک کر وہ بولا "اسے بند کردوں یا چلتا رہنے دوں؟"

اس سے پہلے کہ ٹیلر کوئی جواب دیتا، ٹی وی کی اسکرین پر اسپیشل رپورٹ کے الفاظ نمودار ہوئے اور پھر دارالحکومت واشنگٹن کی تصویر دکھائی جانے لگی۔ راجر ٹی وی آف کرتے کرتے رک گیا۔ ٹیلر بھی ٹی وی کی طرف متوجہ ہوچکا تھا۔ تصویر میں امریکی جھنڈا سرنگوں دکھایا جارہا تھا پھر ایک جانا پہچانا نیوز کاسٹر اسکرین پر نمودار ہوا۔ وہ اسپیشل رپورٹ پڑھنے لگا:

"تقریباً تین گھنٹے بعد جناب صدر اپنے وفد کے ہمراہ دارالحکومت پہنچیں گے جہاں وہ آنجہانی سینیٹر بائرن مورس کی آخری رسوم میں شرکت کریں گے۔ سینیٹر بائرن مورس کا انتقال گزشتہ رات ریاست اوریگن کے علاقے سیلم میں واقع ان کے آبائی گھر میں ہوا تھا۔ جناب صدر کے حکم پر ایک خصوصی فوجی طیارہ آنجہانی سینیٹر کی میت کو ان کے گاؤں سے دارالحکومت لانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ ان کی تدفین تمام تر سرکاری اعزاز کے ساتھ دارالحکومت میں عمل میں آئے گی۔

"سینیٹر بائرن مورس کی حالت نازک ہونے کی خبر چونکہ واشنگٹن پہنچ چکی تھی اس لیے انہیں تمام تر سرکاری اعزاز کے ساتھ سپردِ خاک کرنے کی تیاریاں پہلے ہی شروع کردی گئی تھیں۔ ان کے جنازے میں صدر، نائب صدر، کابینہ کے ارکان، سپریم کورٹ کے ارکان، کانگریس کے ارکان اور وہ تمام سینیٹر شریک ہوں گے جو ریاست اوریگن سے آنجہانی سینیٹر کے مقابلے پر انتخابات میں کھڑے ہوتے رہے ہیں یا ان کی حمایت و تائید کرتے رہے ہیں۔"

ٹیلر صوفے پر اٹھ کر بیٹھ گیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ اپنی کھڑکی سے وہ دارالحکومت واشنگٹن کی دھند میں لپٹی ہوئی عمارات کا نظارہ کرسکتا تھا۔ مینارِ واشنگٹن دھند میں تقریباً چھپ کر رہ گیا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے مڑ کر ایک نظر ٹی وی کی طرف اور پھر راجر کی طرف دیکھا "کمال ہے! اپنی بیماری میں مجھے یہ بھی پتا نہیں چلا کہ وہ بڈھا گدھ مرچکا ہے۔"

"اب تک تو یہ خبر شاید امریکا کے ہر شہری کو معلوم ہوچکی ہے لیکن تمہاری جو حالت ہے اس میں تمہیں اپنا نام ہی یاد رہ گیا ہو تو غنیمت ہے۔ یہ لو.... میں تمہارے لیے جوس لایا ہوں۔ یہ پی لو" اس نے جوس کا ڈبّا ٹیلر کی طرف بڑھایا۔ ٹیلر نے ڈبّا لے لیا۔ اس کے ہاتھ میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔

راجر نے بات جاری رکھی "کل رات سات بجے کے قریب سینیٹر کا بیٹا ٹی وی پر نمودار ہوا تھا اور اس نے اعلان کیا تھا کہ اس کے باپ نے بالآخر اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کردی تھی۔"

"اچھا....؟ میں نے یہ اعلان نہیں سنا۔ حالانکہ ٹی وی آن تھا لیکن شاید میں غنودگی میں تھا" ٹیلر بولا۔

"سینیٹر کی حالت تو گزشتہ دو ہفتے سے خراب تھی۔ ہمیں کسی بھی وقت اس خبر کی توقع تھی۔ اسی لیے سینیٹر کے اپنے آدمیوں نے ہی دارالحکومت میں اس کی تدفین کے پیشگی انتظامات شروع کرادیے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اس کے جنازے میں آنے والے زیادہ تر لوگ تو دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے ہی آئیں گے کہ آخر کار اس شخص نے دنیا کا پیچھا چھوڑا۔"

ٹیلر چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دوبارہ صوفے میں دھنس گیا اور آہستگی سے بولا "مجھے صدر کا اہم شخصیات کے قبرستان میں جانا کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔ یہ بتاؤ سیکیورٹی کے انتظامات کیسے ہیں؟"

"سیکیورٹی کے تو جتنے سخت انتظامات کیے جارہے ہیں، اس سے پہلے شاید کسی بھی موقعے پر ایسے سخت انتظامات نہیں کیے گئے" راجر نے بتایا۔ راجر اور ٹیلر دونوں کا تعلق سیکرٹ سروس

سے تھا۔

"اس کے باوجود مجھے صدر کا قبرستان اور اس عمارت میں جانا اچھا نہیں لگ رہا جہاں سرکاری اہم شخصیات کی آخری رسوم انجام دی جاتی ہیں۔ سینیٹر مورس کی تابوت میں موجودگی بھی مجھے کچھ کم خطرناک نہیں لگ رہی" ٹیلر یہ کہتے ہوئے ایک بار پھر اٹھ بیٹھا۔ ایک زوردار چھینک مار کر اس نے ٹشو پیپر سے ناک پونچھی پھر جوس کا ڈبا ایک ہی سانس میں آدھا خالی کیا اور پوچھا "تم خود اس وقت صدر کے ساتھ کیوں نہیں ہو؟"

اس سے پہلے کہ راجر کوئی جواب دیتا، ٹی وی کی ایک اناؤنسمنٹ .....نے دونوں کو ٹی وی کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کردیا۔

اناؤنسر کہہ رہا تھا "آیئے آپ کو کچھ دیر پہلے سینیٹر بائرن مورس کی میّت پہنچنے کا منظر دکھاتے ہیں.... سینیٹر کی میّت خصوصی فوجی طیارے میں ائرفورس بیس پر لائی گئی تھی جہاں فوجی دستے نے سلامی دی۔"

اناؤنسر کے الفاظ کے ساتھ ساتھ اس تمام کارروائی کی فلم دکھائی جارہی تھی۔ ائرفورس کے ہوائی اڈے پر اہم فوجی افسر موجود تھے۔ ان کی نگرانی میں تابوت کو ایک خصوصی میّت گاڑی میں رکھا جارہا تھا۔ وہاں سے میّت اس خصوصی عمارت میں لائی جانی تھی جہاں اہم سرکاری شخصیات کی آخری رسوم انجام دی جاتی تھیں۔

"مجھے آخری رسوم کے دوران صدر کے ساتھ موجود رہنا ہے" راجر نے بتایا "مجھے چیف نے صرف یہ بتانے کے لیے یہاں بھیجا ہے کہ ہم تمہارے بغیر ہی گزارا کرنے کی کوشش کریں گے۔ میرے پاس صرف بیس منٹ ہیں۔ بیس منٹ بعد مجھے اس آزمائش گاہ میں موجود ہونا چاہیے۔"

"سیکرٹ سروس والوں نے صدر کو اس عمارت میں جانے سے باز رکھنے کی کوشش نہیں کی جہاں آخری رسوم انجام دی جائیں گی؟" ٹیلر نے دریافت کیا۔ "سب کو معلوم ہے کہ سینیٹر مورس اور صدر کے ایک دوسرے کے بارے میں کیا خیالات تھے۔"

"بات دراصل یہ ہے کہ جناب صدر کا اگلی ٹرم کے لیے بھی الیکشن لڑنے کا ارادہ ہے" راجر ٹھنڈی سانس لے کر بولا "ان دنوں وہ اپنی رواداری، کشادہ دلی اور اعلیٰ ظرفی کے اظہار کے لیے کچھ بھی کرسکتے ہیں، کہیں بھی جاسکتے ہیں، کسی بھی زندہ یا مُردہ دشمن اور بدخواہ کو معاف کرسکتے ہیں۔ اس طرح وہ اگلے الیکشن کے لیے زیادہ سے زیادہ نیک نامی کمانا چاہتے ہیں۔"

"آخری رسوم میں شرکت کرنے والے مہمانوں کی فہرست کا تو اچھی طرح جائزہ لے لیا گیا ہوگا؟" ٹیلر نے پوچھا اور ساتھ ہی اسے زوردار کھانسی آگئی۔

"ان میں کوئی باہر کا آدمی نہیں ہے" راجر نے بتایا۔

"آخر جناب صدر کو قبرستان جانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

بہ یک وقت

ایک سہیلی نے دوسری سہیلی پر رعب ڈالتے ہوئے کہا "جب میں شادی کروں گی تو بہت سے نوجوان تباہ و برباد ہوجائیں گے۔"

دوسری سہیلی نے رعب کھائے بغیر کہا "تو کیا تم ایک ہی وقت میں بہت سے نوجوانوں سے شادی کرنے کے بارے میں سوچ رہی ہو؟"

ٹیلر ہلکی سی جھنجلاہٹ کے ساتھ بولا اور اسے مزید کھانسی آگئی۔

راجر اسے ڈبّے سے جوس کا ایک گھونٹ پلاتے ہوئے بولا "تمہیں اپنا خون جلانے کی کیا ضرورت ہے۔ جناب صدر یہ ثابت کرنے کی کوشش کررہے ہیں کہ اخلاقی معیار کے حساب سے وہ آنجہانی مورس سے بہتر آدمی ہیں کیونکہ بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بائرن مورس کو صدر ہونا چاہیے تھا۔"

"تو پھر انہوں نے گزشتہ انتخابات کے موقعے پر مورس کو صدر کیوں منتخب نہیں کیا تھا؟" ٹیلر بولا۔

"اس وقت بات کچھ اور تھی لیکن مورس اگر زندہ ہوتا اور آج انتخاب ہوتا تو لوگ یقیناً مورس کو صدر منتخب کرلیتے۔ مرنے سے کچھ عرصے پہلے سے اس نے جس طرح دُھواں دار بیانات کا سلسلہ جاری کررکھا تھا اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے صدارتی انتخابات میں چھلانگ لگانے کا تہیّہ کرلیا تھا۔ بلکہ معاملہ اتنا سنجیدہ نظر آرہا تھا کہ ہمارے چیف نے اس بات کی تصدیق کے لیے ایجنٹوں کی ایک ٹیم کو اس کے گاؤں روانہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔"

راجر بات کرتے کرتے رک گیا کیونکہ ٹی وی کی اسکرین پر آنجہانی سینیٹر کے بیٹے ڈگلس مورس کو ایک گاڑی سے اترتے ہوئے دکھایا جارہا تھا۔ گاڑی اس عمارت کے سامنے آکر رکی تھی جہاں آنجہانی سینیٹر کی آخری رسوم انجام دی جانی تھیں۔

ڈگلس مورس کے سر پر ہیٹ نہیں تھا۔ وہ جونہی گاڑی سے اُترا، اسے رپورٹرز نے گھیرلیا اور اس پر سوالات کی بارش کردی۔ پہلے تو کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے وہ ان کے سوالات کے جوابات دینے کے لیے نہیں رکے گا لیکن پھر اچانک ہی وہ رک گیا اور پلٹ کر بظاہر پُرسکون لہجے میں بولا "میں اس موقعے پر آپ کے سوالوں کے جواب تو نہیں دے سکتا لیکن امریکا کے ان کروڑوں باشندوں کے نام ایک پیغام ضرور دینا چاہوں گا جو اس ملک کو مضبوط تر بنانے کی جدوجہد میں میرے باپ کے ساتھ تھے۔ اس کے حامی تھے..."

اس نے ہوا سے منتشر ہوتے ہوئے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولا "میرے والد کو اس ملک

سے.... اور اس ملک میں رہنے والوں سے بے اندازہ محبت تھی۔ اس ملک کو جو بیماری گھن کی طرح چاٹ رہی ہے اس کے خلاف جنگ میں میرے والد بظاہر ہار گئے ہیں لیکن ان کی یہ شکست صرف ظاہری اور جسمانی ہے۔ ان کا مقصدِ حیات بہرحال زندہ ہے۔ جنگ بہرحال جاری ہے اور جاری رہے گی۔ آخری فتح ہماری ہوگی۔ صدر اور ان کے سفاک ساتھی شاید اس موقعے پر اپنی فتح کا جشن منا رہے ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ اس وقت بھی ان کے ذہنوں پر میرے والد کا خوف طاری ہوگا۔ میرے والد مُردہ حالت میں بھی ان کے مکروہ عزائم کو خاک میں ملانے کی طاقت رکھتے ہیں‘ وہ مکروہ عزائم جنہیں یہ لوگ دل میں چھپائے بیٹھے ہیں لیکن زبان سے آپ کو جھوٹی تسلیاں دیے جاتے ہیں۔ اس ملک کے مستقبل کے بارے میں جھوٹے خواب دکھائے جاتے ہیں‘ اس ملک سے.... اور آپ لوگوں سے صحیح معنوں میں محبت میرے والد کو تھی۔" رپورٹرز نے ایک بار پھر اس پر سوالات کی بوچھار کردی لیکن وہ کیمروں کی طرف سے منہ پھیر کر عمارت کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

راجر ایک کرسی پر ڈھیر ہوگیا۔ پاؤں اس نے کافی ٹیبل پر ٹکالیے اور متاسفانہ سے انداز میں سہلاتے ہوئے گہری سانس لے کر بولا۔ "ہمیں اب بھی مشکل صورت حال کا سامنا ہے ٹیلر! بیٹا بھی باپ سے کچھ کم خبیث نہیں ہے۔ سیکرٹ سروس کے جو ایجنٹ اس وقت ان معاملات کا جائزہ لے رہے ہیں ان کے سامنے کسی گڑبڑ کا کوئی ٹھوس ثبوت تو موجود نہیں ہے لیکن انہوں نے محسوس کیا ہے کہ آنجہانی سینیٹر مورس وہائٹ ہاؤس پر قبضے کے لیے کوشش کرنے والا تھا اور اس کے لیے وہ صدارتی انتخاب کا انتظار کرنے کے لیے بھی تیار نہیں تھا جس میں ابھی دو سال باقی ہیں۔"

ٹیلر کی آنکھیں بند ہوچکی تھیں اور وہ بڑے ہموار انداز میں سانس لے رہا تھا۔ راجر کو شبہ ہوا کہ شاید وہ سوچکا تھا۔ وہ ٹی وی بند کرنے کے لیے اٹھا لیکن عین اس وقت اس کے عقب میں ٹیلر کی آواز ابھری "یہ.... آنجہانی سینیٹر کا بیٹا ڈگلس غالباً کچھ عرصے کے لیے ذہنی امراض کے اسپتال میں بھی تو رہ چکا ہے؟"

"ہاں۔ اسے کچھ عرصے کے لیے مشاہدے کی غرض سے رکھا گیا تھا" راجر نے تائید کی "یہ تو یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا ذہنی توازن واقعی اُلٹ گیا تھا لیکن اس میں کچھ ایسی علامتیں دیکھنے میں آرہی تھیں جو تقریباً ایسی ہی ذہنی حالت کی نشاندہی کرتی تھیں.... اور یہ اس واقعے کے بعد کی بات ہے جب اس کے باپ نے ایک تقریب میں جنابِ صدر کے منہ پر گھونسا دے مارا تھا۔ سینیٹر کا بیٹا بھی پہلے ہی سے مزاج کا تیز تھا لیکن جب یہ واقعہ اخبارات کے صفحاتِ اول پر شہ سرخیوں کے ساتھ چھپا تب تو شاید اس کا ذہن کچھ عرصے کے لیے قلابازیاں کھا گیا۔ باپ نے بھری محفل میں جنابِ صدر کے منہ پر گھونسا مارا تھا۔ بیٹا شاید اس واقعے کی تفصیلات پڑھ کر خوشی سے پاگل ہوگیا تھا.... یا پھر شاید کوئی اور بات تھی۔"

"یہی چیز تو مجھے تشویش میں مبتلا کررہی ہے راجر!" ٹیلر مضطرب لہجے میں بولا "ان کے نظریات صحیح ہیں یا غلط.... یہ لوگ عوام کے جذبات سے کس طرح کھیلنا چاہتے ہیں‘ یہ ایک الگ بحث ہے اور اس میں اُلجھنا ہم لوگوں کا کام نہیں۔ ہم لوگوں کی اوّلین ذمے داری تو جنابِ صدر کی حفاظت ہے۔ تم ذرا تصور کرو کہ اس شخص کے جذبات میں کتنی شدت ہوگی جو ایک غیر ملک میں‘ اہم مذاکرات کے موقعے پر‘ اپنے ملک کی مذاکراتی ٹیم میں شامل ہوتے ہوئے.... اپنے ملک کا سینیٹر ہوتے ہوئے اپنے ملک کے صدر کے منہ پر گھونسا رسید کردے....؟ اور افسوس کی بات یہ کہ اسے اس کی حرکت کی کوئی سزا بھی نہ ملے...."

اس نے ایک بار پھر متاسفانہ سے انداز میں سہلایا "راجر! میں جتنی مرتبہ بھی آنجہانی سینیٹر کی تدفین میں جنابِ صدر کی شرکت کے بارے میں سوچ رہا ہوں‘ اتنی ہی میری تشویش بڑھتی جارہی ہے۔ تمہاری کیا رائے ہے؟"

"میں کیا رائے ظاہر کروں؟" راجر گھڑی دیکھ کر اپنا کوٹ اٹھاتے ہوئے بولا "ہم تو عجیب ہی زمانے میں زندگی گزار رہے ہیں۔ میرے لیے وہ واقعہ اتنا غیر متوقع نہیں تھا‘ اس لیے کہ آنجہانی سینیٹر ان مذاکرات کا سخت مخالف تھا۔ اس کے باوجود وہ مذاکراتی ٹیم میں شامل تھا۔ اسی لیے اس موقعے پر بھی جنابِ صدر کے لیے بہت زبردست حفاظتی انتظامات کیے گئے تھے لیکن ہمارے آدمیوں کو توقع نہیں تھی کہ ہمارا اپنا سینیٹر ہی صدر کے منہ پر گھونسا رسید کردے گا۔"

پھر وہ ایک طویل سانس لے کر بولا "صدر نے اس موقعے پر بھی اعلا ظرفی کے اظہار کے لیے اسے معاف کردیا تھا۔ اصل افسوس تو مجھے اس ردِّعمل کا ہے جو اس واقعے پر ہمارے ملک میں ظاہر کیا گیا تھا۔ تقریباً آدھے اخبارات نے تو مورس کی اس حرکت پر محض معذرت خواہانہ رویّہ اختیار کرنے کی کوشش کی۔ بعض نے اس کی اس حرکت کو درست ثابت کرنے کے لیے جواز تلاش کرنے کی کوشش کی اور چند نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ کوئی صدر امریکا کو اس کی اوقات یاد دلادے۔"

"تم یہ بتاؤ کہ تدفین کے موقعے پر صدر کی حفاظت کے لیے جو انتظامات کیے گئے ہیں‘ کیا تم ان سے مطمئن ہو؟ معلوم نہیں کیوں مجھے تشویش ہورہی ہے۔ شاید فلو نے مجھے ایک سیکرٹ ایجنٹ کے بجائے کوئی وہمی بڑھیا بنادیا ہے" ٹیلر بولا۔

"حفاظتی انتظامات کی بات کرنے سے پہلے ہمیں صورت حال کی بات بھی کرنی پڑے گی" راجر بولا "صورت حال یہ ہے کہ سروے وغیرہ کرنے والوں کے اعداد وشمار کے مطابق مقبولیت کے اعتبار سے صدر اس وقت فہرست میں سب سے نیچے ہیں اور اس کی سب سے بڑی وجہ بڑھتی ہوئی بے روزگاری اور مہنگائی ہے۔

بیروزگاری اس سے پہلے بھی رہی ہے لیکن یہ حال کبھی نہیں رہا جو اس وقت ہے۔ پٹرول کی قیمتوں میں اضافہ بھی ایک پریشان کن مسئلہ ہے جس کی وجہ سے مہنگائی کی نئی لہر آئی ہے' اوپر سے صدر موصوف میکسیکو جاکر تیل کی خریداری کے ایک معاہدے پر ابتدائی بات چیت کر آئے ہیں جبکہ اس معاہدے کی سینٹ سے منظوری ملنے کا ایک فیصد بھی امکان نہیں۔ لوگ یہی سوچ کر خوش ہو رہے ہیں کہ شاید یہ معاہدہ ہی آخرکار صدر کو وہائٹ ہاؤس سے نکلوانے کا ذریعہ بن جائے۔ اب تم خود ہی بتاؤ ٹیلر...! جس شخص کے پورے ملک میں اتنے دشمن ہوں' اس کی حفاظت کے سلسلے میں خواہ کتنے ہی انتظامات کرلے جائیں.... انہیں کس طرح تسلی بخش قرار دیا جاسکتا ہے؟"

ٹیلر گویا بہ دقت تمام صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا اور جاکر باتھ روم کے دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے تھکے تھکے سے انداز میں آنکھیں بند کرلیں اور دھیمے لہجے میں بولا "صدر الیکشن ہار جائیں' اس کا مجھے کوئی افسوس نہیں ہوگا لیکن اگر ہمارے حفاظتی انتظامات میں کوئی خامی رہ گئی اور اس کی وجہ سے صدر کی جان چلی گئی تو اس کے پچھتاوے کا بوجھ شاید مجھے زندگی بھر نہ سونے دے۔ جب میں سیکرٹ سروس میں آیا تو محکمے میں کچھ ایسے پرانے ایجنٹ بھی موجود تھے جنہیں ڈلاس میں صدر جان ایف کینیڈی کا قتل یاد تھا۔ وہ اس کی وجہ اپنے حفاظتی انتظامات کی خرابی کو قرار دیتے تھے۔ ان کے ضمیر کی خلش نے ان کو کبھی چین سے نہیں رہنے دیا۔ میں نہیں چاہتا کہ ایسی ہی کوئی خلش ہمارے حصے میں بھی آئے۔"

"یہ تو کوئی بھی نہیں چاہتا" راجر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا "ہر ممکن احتیاطی تدبیر اختیار کی جارہی ہے۔ جنازے میں شرکت کرنے والے ہر شخص کو دھات کی موجودگی کی نشاندہی کرنے والے آلے سے چیک کیا جائے گا۔ اس کے بعد بھی کوئی شخص اس وقت تک آخری رسوم میں شرکت کے لیے عمارت میں داخل نہیں ہوسکے گا جب تک دو سیکرٹ ایجنٹ اس کی شکل دیکھ کر اس کی شناخت کی تصدیق نہیں کردیں گے۔"

"جہازوں کے سلسلے میں کیا احتیاطی تدابیر اختیار کی گئی ہیں؟" ٹیلر نے پوچھا۔

"وہی جو عموماً کی جاتی ہیں" راجر نے جواب دیا "اس عمارت میں صدر کی آمد سے آدھا گھنٹہ پہلے اور آدھا گھنٹہ بعد تک کوئی طیارہ عمارت کے اوپر سے نہیں گزرے گا۔"

"بموں کے سلسلے میں کیا کیا گیا ہے؟"

"گزشتہ رات... اور پھر آج صبح پوری عمارت کو نہایت باریک بینی سے کھنگالا گیا ہے۔ اس کے بعد ٹی وی کیمروں کے سوا کوئی چیز عمارت میں نہیں لائی گئی اور انہیں ہمارے آدمیوں نے خوب "چھان پھٹک" لیا ہے۔ اب اس کے بعد انسانوں کے علاوہ کوئی چیز عمارت میں داخل نہیں ہوگی.... اور ان کی چیکنگ کے انتظامات کے بارے میں' میں بتا ہی چکا ہوں۔"

"ایسے موقعوں پر جو دھمکی آمیز کالز موصول ہوا کرتی ہیں ان کے بارے میں کیا کیا گیا ہے؟" ٹیلر نے دریافت کیا۔

"جو دھمکیاں سنگین محسوس ہوئیں اور جن کے بارے میں تحقیقات ممکن تھیں' ان کے بارے میں اطمینان کرلیا گیا ہے" راجر نے جواب دیا۔

"بہرحال میت وغیرہ رکھی جانے کی جگہ کے بارے میں تم خود ذاتی طور پر ایک بار پھر اطمینان کرلینا اور مجھے یہاں فون کرکے اطلاع دینا کہ تم انتظامات سے مطمئن ہو یا نہیں" ٹیلر بولا "صدر تقریباً دو گھنٹے بعد وہاں پہنچیں گے۔ اگر تم فون کرکے مجھے اطلاع دے دوگے کہ تم تمام انتظامات کے بارے میں مکمل طور پر مطمئن ہو تو میں بھی نیند کی دوا کھاکر کل تک کے لیے اطمینان سے سوجاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے جناب پریشان صاحب! آپ کی پریشانی دور کرنے کے لیے میں فون بھی کردوں گا" راجر دروازہ کھول کر رخصت ہوتے ہوئے بولا۔

دروازہ بند ہوچکا تو ٹیلر ایک بار پھر ٹی وی کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اب ٹی وی پر سینیٹر کی میت اس خاص عمارت کے سامنے پہنچ جانے کا منظر دکھایا جارہا تھا۔ چار نوجوان اور مضبوط افراد تابوت اٹھائے سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ چند شخصیات جنازے کے ساتھ تھیں۔

ٹی وی اناؤنسر بتارہا تھا کہ سخت حفاظتی انتظامات کو مؤثر بنانے کی غرض سے آخری رسوم میں عوام کی شرکت اور آنجہانی سینیٹر کا آخری دیدار کرنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ ٹیلر نے یہ سن کر قدرے اطمینان کی سانس لی۔ ایسے موقعوں پر ہجوم جتنا کم ہوتا تھا' خطرات بھی اتنے ہی کم ہوجاتے تھے۔

ٹیلر اس وقت جوس کے ایک اور ڈبے سے گھونٹ بھر رہا تھا جب فون کی گھنٹی بجی۔

"ٹیلر! میں ٹیری بول رہا ہوں" دوسری طرف سے آواز آئی۔ ٹیری سیکرٹ سروس آفس میں اس کا ساتھی تھا۔

"کیا راجر ابھی تک تمہارے ہاں ہے؟" ٹیری نے پوچھا۔

"نہیں۔ چند منٹ پہلے روانہ ہوگیا ہے" ٹیلر نے جواب دیا "کوئی خاص بات ہے؟"

"نہیں۔ بس میں اطمینان کرنا چاہتا تھا کہ وہ صحیح وقت پر وہاں پہنچ جائے" ٹیری نے جواب دیا۔

"تم آفس میں ہی ہو؟" ٹیلر نے پوچھا۔

"ہاں۔ بڑا سکون ہے یہاں" ٹیری نے بتایا۔

"میرے لائق کوئی خدمت؟"

"نہیں۔ تمہاری کمی پوری کرلی گئی ہے..." پھر جیسے ٹیری کو کچھ

یاد آیا "ہاں.... آج صبح ایک شخص تم سے رابطہ کرنا چاہ رہا تھا۔ میں نے جواب دیا تھا کہ میں تمہیں اس کے بارے میں پیغام دے دوں گا۔ میں نے یہ سوچ کر فوری اطلاع نہیں دی تھی کہ شاید ایسی کوئی فوری ضرورت نہیں تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ ذرا آج کی آزمائش سے گزرلیں تو پھر تمہیں یہ پیغام پہنچادوں گا۔"

"نام کیا تھا اس شخص کا؟" ٹیلر نے دریافت کیا۔

"ابھی بتاتا ہوں... میں نے کہیں نوٹ کیا تھا" ٹیری نے کہا اور ایک لمحے کے توقف سے بولا "ہاں.... یہ رہا... اس کا نام ٹیڈ بلم تھا۔ جانتے ہو اسے؟" ٹیری نے اسے وہ فون نمبر بھی بتادیا جو ٹیڈ بلم نے رابطے کے لیے دیا تھا۔

ٹیلر نے اس کے سوال کا جواب دیے بغیر نام اور نمبر نوٹ کرلیا پھر سلسلہ منقطع کردیا۔ اسے یاد نہیں آرہا تھا کہ اس نام کے کسی شخص کو وہ جانتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اس شخص کو جوابی فون بہرحال کرلینا چاہیے۔ نہ جانے وہ کس سلسلے میں بات کرنا چاہتا تھا۔

ٹیلر فون کرنے ہی لگا تھا کہ اس کے پیٹ میں شدید مروڑ اٹھی اور وہ سب کچھ بھول بھال کر باتھ روم کی طرف بھاگا۔ چند منٹ بعد وہ باتھ روم سے نکلا تو اس کا جسم پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ وہ نڈھال سا آکر صوفے پر گرگیا اور گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ اس کے جسم میں سرد سی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اس نے کمبل منہ تک کھینچا اور چند منٹ بعد نیم غشی کی سی نیند میں ڈوب گیا۔

دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو اسے اندازہ نہیں تھا کہ وقت کیا ہوا تھا لیکن اس کی نظر فوراً ٹی وی اسکرین کی طرف گئی اور وہ اپنے حواس پر زور دیتے ہوئے سننے اور سمجھنے کی کوشش کرنے لگا کہ ٹی وی پر کیا دکھایا جارہا تھا۔

وہ اس گرجا نما عمارت کا اندرونی منظر تھا جہاں آنجہانی سینیٹر موریس کی آخری رسوم انجام دی جانی تھیں۔ رسم گاہ کے اسٹیج نما حصے کے سامنے اب لوگ نشستوں پر براجمان نظر آرہے تھے۔

اناؤنسر کہہ رہا تھا "کابینہ کے ارکان چیف جسٹس گریزیلا کے ساتھ اور نائب صدر کے پیچھے بیٹھے ہوئے ہیں۔ جنابِ صدر بیس منٹ بعد پہنچیں گے جس کے بعد خصوصی سروس شروع ہوگی۔ آنجہانی سینیٹر کے صاحب زادے ڈگلس موریس اپنے والد کے بارے میں چند کلمات کہیں گے اور جنازے میں شریک ہونے والوں کا شکریہ ادا کریں گے۔ پھر وہ جنابِ صدر کے ساتھ اس چبوترے تک جائیں گے جس پر تابوت رکھا گیا ہے اور جنابِ صدر کو اپنے آنجہانی والد کا آخری دیدار کرائیں گے۔ اس چبوترے پر کتنی ہی اہم اور نامی گرامی سرکاری شخصیات کے تابوت رکھے جاچکے ہیں...."

'جنابِ صدر کی آمد میں بیس منٹ باقی ہیں....' ٹیلر نے سوچا "راجر نے میری ہدایت کے مطابق وہاں سے مجھے فون کیوں نہیں کیا؟ کہیں میں اس کے فون آنے پر سویا ہوا تو نہیں تھا....؟

نہ جانے کیوں اس کا دل کچھ مطمئن نہیں تھا۔ ایک عجیب سی خلش تھی جو اسے بے چین کررہی تھی۔ تاہم سونے سے اس کی توانائی کچھ بحال ہوئی تھی۔ وہ کھڑکی میں جاکھڑا ہوا۔ دھند کچھ صاف ہوچکی تھی لیکن آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے منڈلا رہے تھے۔ وہ یاد کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ جس روز ڈلاس میں صدر کینیڈی کا قتل ہوا' اس روز موسم کیسا تھا؟ اسے یاد نہ آسکا۔

اناؤنسر کہہ رہا تھا "ہم اپنے ناظرین کو نہایت افسوس کے ساتھ مطلع کریں گے کہ سینیٹر بائرن موریس کی موت کے تعاقب میں ہی گویا ایک اور المیہ بھی چلا آیا تھا۔ سینیٹر موریس کے آبائی گاؤں میں تکفین وتدفین کے انتظامات کرنے والی ایک پرانی فرم کی عمارت میں آگ لگ گئی۔ یہ فرم مسٹر لائن بلم اور ان کے صاحب زادے کی ملکیت تھی۔ آنجہانی سینیٹر کے جنازے کی تیاری اور تکفین وتدفین کے ابتدائی انتظامات انہی فرم نے کیے تھے جس کی درخواست سینیٹر کے صاحب زادے ڈگلس موریس نے کی تھی۔ آتش زدگی کا یہ افسوس ناک واقعہ آج صبح رونما ہوا۔ پوری عمارت اور اس میں موجود سازو سامان وغیرہ تو خاکستر ہوا ہی تھا لیکن اس حادثے کا المناک پہلو یہ ہے کہ فرم کے مالک اور ڈائریکٹر مسٹر لائن بلم بھی آگ کی بھینٹ چڑھ گئے اور انہیں بچایا نہ جاسکا...."

اناؤنسر آتش زدگی کی کچھ تفصیل بتانے لگا لیکن اسی لمحے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ٹیلر لپک کر فون تک پہنچا۔

"راجر بول رہا ہوں۔ کیسی طبیعت ہے؟" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ یہ بتاؤ تم نے پہلے تو فون نہیں کیا تھا؟" ٹیلر نے تیزی سے پوچھا۔

"نہیں۔ موقع ہی نہیں ملا" راجر نے جواب دیا "جنابِ صدر یہاں آنے کے لیے روانہ ہوچکے ہیں۔ انتظامات بہترین ہیں۔ ان میں کوئی نقص نہیں۔ تمہیں پریشان ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ ہر کام بالکل ٹھیک وقت پر ہورہا ہے۔ ایک سیکنڈ بھی ادھر اُدھر نہیں ہورہا۔ انتظامات کرنے والوں کو انعام ملنا چاہیے۔"

"انتظامات جب حد سے زیادہ تسلی بخش نظر آئیں تب بھی ذرا ہوشیار رہنا چاہیے" ٹیلر بولا' وہ اس وقت بے دھیانی کے سے عالم میں تپائی پر رکھے ہوئے اس کاغذ سے چھیڑ چھاڑ کررہا تھا جس پر اس نے ٹیری کا بتایا ہوا نام اور فون نمبر نوٹ کیا تھا۔ اس شخص کا نام اور نمبر.... جس کے بارے میں ٹیری نے کہا تھا کہ اس نے ٹیلر سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

"خدا کی پناہ....!" ٹیلر کے منہ سے بے اختیار نکلا اور وہ اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا ہوا ٹیلر؟" دوسری طرف سے راجر نے فوراً پوچھا۔

"مجھے یاد آگیا ہے کہ یہ نام کس کا ہے۔" ٹیلر خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔

"کون سا نام؟ کس کی بات کررہے ہو؟" فون پر دوسری طرف

سے راجر نے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔

"تمہیں دو سال پہلے کا وہ واقعہ یاد ہے جب کوسٹ گارڈ کے ایک آفیسر کو خلائی شٹل کے پروگرام میں شامل کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا لیکن عین وقت پر بعض نامعلوم مجبوریوں کی وجہ سے اس نوجوان آفیسر کو ڈراپ کردیا گیا تھا۔ اسے اتنا شدید غصہ آیا کہ اس نے چیختے چلاتے ہوئے، سیکریٹری دفاع کے دفتر میں گھسنے کی کوشش کی تھی؟" ٹیلر نے جاننا چاہا۔

"ہاں یاد ہے۔ اپنے موجودہ صدر ہی تو اس وقت سیکریٹری دفاع تھے۔ اس عہدے سے ریٹائر ہونے کے بعد ہی انہوں نے صدارتی انتخاب کی مہم میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا تھا" راجر نے جواب دیا۔

"کوسٹ گارڈ کے اس آفیسر کا نام ٹیڈ بلم تھا۔ اس نے جو حرکت کی تھی اس پر اسے عدالت میں پیش ہونا پڑا تھا۔ میں اس کے مقدمے کی سماعت کے دوران اس سے ملا تھا۔ وہ اپنی حرکت پر شرمندہ تھا اور اسے اعتراف تھا کہ غصے میں اسے اپنے آپ پر قابو نہیں رہا تھا۔ میرے مشورے پر اس نے سزا سے بچنے کے لیے یہ مؤقف اختیار کیا تھا کہ وقتی طور پر اس پر دیوانگی کا دورہ پڑا تھا اور وہ حد سے زیادہ مشتعل ہوگیا تھا۔ حالانکہ اس پر دیوانگی کا دورہ وغیرہ نہیں پڑا تھا۔ میں جب اس سے ملا تو وہ بالکل صحیح الدماغ تھا۔ بہرحال اپنے مؤقف کی وجہ سے وہ سزا سے بچ گیا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ ایک نہ ایک روز وہ اپنی غلطی کی تلافی کی کوشش ضرور کرے گا" ٹیلر نے بتایا۔

"یہ اس وقت اس کا ذکر کہاں سے نکل آیا؟" راجر نے جاننا چاہا۔

"اس وقت اس شخص کا نام اور فون نمبر میرے ہاتھ میں ہے۔ ٹیری نے بتایا ہے کہ اس شخص نے مجھے آفس فون کیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے سیلم سے فون کیا ہوگا جو صرف اس کا اپنا ہی نہیں، آنجہانی سینیٹر مورس کا بھی آبائی گاؤں ہے۔"

"شاید اس نے بھی فون کرکے کوئی اُلٹی سیدھی دھمکی آمیز اطلاع دینا چاہی ہوگی؟" راجر نے خیال ظاہر کیا۔

"نہیں۔ ایسا نہیں ہوسکتا" ٹیلر مضطربانہ لہجے میں بولا "تم یہ بتاؤ صدر کے وہاں پہنچنے میں کتنی دیر ہے؟"

"دس منٹ" راجر نے جواب دیا۔

"راجر! صدر کو وہاں آنے سے فوراً روک دو" ٹیلر بولا۔

"لیکن کیوں؟" راجر حیرت سے بولا۔

"خدا کے لیے.... تم بس صدر کو آنے سے روک دو۔ اس رسم گاہ میں کہیں نہ کہیں کوئی بم.... کوئی پستول.... کوئی مہلک چیز صدر کی منتظر ہے۔"

"ایسا نہیں ہوسکتا" راجر بے یقینی سے بولا "کوئی شخص بم یا پستول لے کر اندر آ ہی نہیں سکتا تھا۔"

"خدا کے لیے تم اپنے اس یقین پر قائم رہنے کے باوجود صدر کو وہاں آنے سے روک دو" ٹیلر تیزی سے بولا "یہ شخص ٹیڈ بلم جس نے مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی لائن بلم کا بیٹا ہے۔ سیلم میں انہی کی فرم نے سینیٹر مورس کا جنازہ تیار کیا تھا اور آج صبح ان کی عمارت جل کر خاک ہو چکی ہے۔ اس کا باپ بھی اس آگ میں جل کر مر چکا ہے۔ اس سے تم کیا نتیجہ اخذ کرتے ہو؟"

"یہ ایک اتفاق ہے۔ آتشزدگی کے واقعات تو ہوتے ہی رہتے ہیں" راجر بولا۔

ٹیلر میز پر گھونسا مارتے ہوئے بولا "تمہارے تمام تر حفاظتی انتظامات کے باوجود کوئی خطرناک چیز اندر آئی ہے۔ شاید تابوت اٹھانے والے فوجی افسران خود اسے کندھوں پر اٹھا کر لائے ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے، تابوت میں کوئی چیز چھپی ہوگی؟ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ائرفورس کے ہوائی اڈے پر میت کے پہنچتے ہی تابوت کھولا گیا تھا اور اس کی تلاشی لی گئی تھی" راجر بولا۔

"وہ چیز تابوت میں نہیں... خود سینیٹر میں ہوگی" ٹیلر وحشت زدہ لہجے میں بولا "مجھے یقین ہے، سینیٹر کی لاش میں کوئی بم چھپایا گیا ہے۔ تمہیں یاد نہیں، سینیٹر کا بیٹا ٹی وی پر کیا کہہ رہا تھا؟ 'میرے والد مُردہ حالت میں بھی ان کے عزائم کو خاک میں ملانے کی طاقت رکھتے ہیں' اس کے ان الفاظ کا حقیقی مطلب کچھ اور تھا۔ راجر! خدا کے لیے صدر کو وہاں آنے سے روکو اور اس عمارت کو فوراً خالی کرالو۔ سنا تم نے؟"

دوسری طرف سے کوئی جواب نہ آیا لیکن ٹیلر نے ٹی وی اسکرین پر یہ ضرور دیکھ لیا کہ صدر کی گاڑی عمارت کے سامنے پہنچ چکی تھی مگر دوسرے ہی لمحے ایک شخص کیمروں کی طرف پشت کیے صدر کی گاڑی کی طرف لپکا۔ وہ یقیناً سیکرٹ سروس کا آدمی تھا۔ پھر کیمروں کا رخ پھیر دیا گیا۔

راجر نے دوسری طرف سے سلسلہ منقطع نہیں کیا تھا۔ چند لمحے فون پر سکوت رہا۔ ٹیلر ریسیور کان سے لگائے کھڑا رہا۔ اس کی ہتھیلیوں سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ چند لمحے بعد فون پر دوبارہ راجر کی آواز ابھری "ٹیلر! ہم نے جناب صدر کو اندر آنے سے روک دیا ہے۔ باقی تفصیلات میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔"

ٹیلر ریسیور رکھ کر باتھ روم کی طرف دوڑا۔

بعد میں اس نے خبروں میں سُنا، ٹی وی والے معذرت کر رہے تھے کہ وہ بعض فنی خرابیوں کی وجہ سے سینیٹر مورس کی آخری رسوم نہیں دکھا سکے۔ خبروں میں یہ بھی بتایا گیا کہ عین آخری لمحے پر ایک اور انتہائی اہم مصروفیت آن پڑنے کی وجہ سے صدر آخری رسوم میں شرکت نہیں کر سکے تھے۔ آنجہانی سینیٹر کے صاحب زادے بھی "شدتِ غم" کی وجہ سے اس موقعے پر کوئی بیان نہیں دے سکے تھے اور نہ ہی تقریر کر سکے تھے۔ سینیٹر کی میت ذرا عجلت کے عالم میں ایک اور قبرستان میں تدفین کے لیے لے جائی گئی تھی۔

شام کو راجر جوس کے مزید چند ڈبے اٹھائے ٹیلر کے ہاں پہنچا تو ٹیلر کی طبیعت کافی بہتر تھی۔

راجر نے بتایا "فی الحال ہم نے پریس وغیرہ کو یہی بتایا ہے کہ ڈگلس مورس کو مزید علاج کے لیے ذہنی امراض کے اسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے کیونکہ صدمے نے اس کے ذہن کو متاثر کیا ہے۔ ویسے اس نے ساری بات ہمیں بتا دی ہے جسے سن کر تم بھی اچھل پڑو گے۔ یہ منصوبہ بنایا ہی اس لیے گیا تھا کہ اس موقعے پر ہر کام وقت کے عین مطابق ہونے کی توقع تھی۔ اور معلوم ہے منصوبہ کس نے بنایا تھا؟ خود سینیٹر نے۔"

"خدا کی پناہ....!" ٹیلر بولا۔

"جب سینیٹر کو معلوم ہو گیا کہ مہلک بیماری کے باعث اس کی موت یقینی ہو چکی ہے تو اس نے اپنے بیٹے کو بلایا اور اسے اپنی ہدایات پر عمل درآمد کے لیے آمادہ کر لیا۔ اس کا نظریہ تھا کہ اگر وہ زندگی میں وہائٹ ہاؤس تک نہیں پہنچ سکا تو اس کی موت کے بعد موجودہ صدر بھی وہاں نہ رہ سکے۔ اس نے اپنے بیٹے کو ہدایت کی کہ اس کی موت کے بعد اس کی نعش میں بم چھپا دیا جائے جسے عین اس وقت پھٹنا تھا جب صدر کو آخری دیدار کے لیے چبوترے پر جانا تھا۔ بم کے دھماکے سے صدر کی موت یقینی تھی۔ بم کو لاش میں چھپانے کے لیے تکفین و تدفین کے انتظامات کرنے والوں کا تعاون ضروری تھا جو حاصل کر لیا گیا لیکن بعد میں اس فرم کی عمارت میں آگ لگوا دینے کا منصوبہ بھی خود سینیٹر کا تھا تاکہ آگے چل کر کوئی اس سلسلے میں زبان نہ کھول سکے لیکن اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ فرم کے مالک کے بیٹے نے کسی سیکرٹ ایجنٹ سے کسی غلطی کی تلافی کا وعدہ کر رکھا تھا۔"

"ڈگلس مورس کا کیا بنے گا؟" ٹیلر نے کھانستے ہوئے پوچھا۔

"معلوم نہیں اسے اب کب رہائی مل سکے۔ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا" راجر بولا "تم اپنی سناؤ۔ تم کب تک آفس آنے کے قابل ہو سکو گے؟"

"تم مجھے کل ہی آفس میں پاؤ گے" ٹیلر بدستور کھانستے ہوئے بولا۔ اس کی کھانسی گونج دار تھی اور اس سے در و دیوار ہلتے محسوس ہو رہے تھے۔

"کیا بکواس کر رہے ہو! حالت تو تمہاری قریب المرگ مریضوں جیسی ہے" راجر بولا "کل آفس کیسے آؤ گے؟"

"مجبوری ہے" ٹیلر سینہ سہلاتے ہوئے بولا "آج میری بیماری کی چھٹی کا آخری دن ہے۔ اگر کل سے میں آفس نہ پہنچا تو میری تنخواہ کٹنا شروع ہو جائے گی.... اور تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ ہم لوگوں کا تو پوری تنخواہ میں ہی گزارا مشکل سے ہوتا ہے۔ اگر تنخواہ کٹ کٹا کر ملی تو کہیں میں تمہیں الٹا ہیٹ ہاتھ میں لیے کسی فٹ پاتھ پر کھڑا بھیک مانگتا نہ نظر آؤں۔"

SICK DAY
GREGORY . P . STEVENS

جاسوسی ڈائجسٹ: اپریل 1994

ناول سکیننگ و کمپوزنگ
محمد سجاد بھٹی
03045503086

خصوصی تعاون: جاسوسی نشست ایڈمن

ڈاکٹر حامد حسن۔ ساگر زمان۔ عقیل قریشی۔ ممتاز علی کیانی۔ سیف الملوک عباسی۔ یاسر حسنین۔ ناصر محمود بلوچ۔ محمد نعمان & صائم بھائی

اردو ادب کے سب رنگ۔ ادبی محفل۔ قلمی جاسوسی دنیا۔ اولڈ سہائی ناول..... فینز گروپ

میں اور میری بیوی بیرل جلد لوگوں میں گھل مل جاتے ہیں۔ محلے پڑوس میں یا کہیں اور اگر ہماری ملاقات ایسے لوگوں سے ہوتی ہے جو ہمیں اچھے لگتے ہیں، تو انہیں ہم فوراً کھانے پر مدعو کر لیتے ہیں۔ ہمیں انواع و اقسام کے کھانے میز پر سجا کر لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانے اور دنیا بھر کے موضوعات پر گفتگو کرنے میں لطف آتا ہے لیکن سب سے زیادہ ہم اس وقت لطف اندوز ہوتے ہیں جب ہمارے نئے دوستوں میں سے کوئی ہمارے ڈائننگ روم کی دیوار پر آویزاں پینٹنگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا ہے۔ "کیسی خوبصورت پینٹنگ ہے..... کینالیٹو کی تخلیق ہے نا؟"

مدھم روشنی میں آویزاں اس پینٹنگ کی طرف عموماً مہمانوں کا دھیان اس وقت جاتا ہے جب وہ کھانے اور مشروبات وغیرہ سے لطف اندوز ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس وقت سب ذرا سُرور میں ہوتے ہیں۔ تقریباً ہر مہمان اپنے وقت کے عظیم مصور کینالیٹو کو پہچان لیتا ہے لیکن وہ حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کی حیرت بجا ہوتی ہے۔

ہم آسٹریلیا کے شہر ملبورن کے ایک متوسط سے علاقے میں، متوسط سے مکان میں رہتے ہیں۔ ہم دونوں میاں بیوی ریٹائرڈ آرٹ ٹیچر ہیں۔ ظاہر ہے ہماری اوقات ایسی نظر نہیں آتی کہ ہمارے گھر میں اٹھارھویں صدی کے ماحول اور تہذیب کی عکاسی کرنے والے ایک عظیم مصور کا شہ پارہ نظر آئے۔ ہم صاحب ذوق ضرور ہیں لیکن صاحبِ حیثیت ہرگز نہیں ہیں اور اس قسم کی پینٹنگز بہت مہنگی ہوتی ہیں۔ ہم جیسے لوگ ایسی کوئی پینٹنگ رکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

چنانچہ ایک لمحے کے توقف کے بعد ہمارا مہمان ملائمت سے کہتا ہے "یہ یقیناً....." وہ ازراہِ اخلاق و مروت اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیتا ہے لیکن ہم سمجھ جاتے ہیں کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ یہی کہ

ایک بیش قیمت تصویر کا قصہ جس کی حفاظت کا معقول انتظام نہ تھا لیکن یہ بات بھی ایک راز تھی اور جب یہ راز ایک آرٹ کے شیدائی جوڑے کو معلوم ہوا تو اُن کی نیت خراب ہوگئی مگر اس تصویر کی چوری کے لیے انہیں طویل منصوبہ بندی کرنا پڑی۔

اُس چوری کا قصہ جو چوروں کے لیے باعثِ فخر تھی

پسِ تصویر

سبین طاہر



...."یہ یقیناً نقل مطابق اصل ہوگی۔"

ہم میاں بیوی چند لمحے اپنے مہمانوں کی ذہنی کشمکش سے لطف اندوز ہوتے ہیں پھر میں انہیں اس الجھن سے نکالنے کے لیے بتاتا ہوں۔ "یہ کینالیٹو کی اصل پینٹنگ ہے اور ہم نے اسے چرایا ہے۔ چند سال پہلے ہم گھومنے پھرنے انگلینڈ گئے تھے تب یہ پینٹنگ ہم بوسٹر کیسل سے چرا کر لائے تھے۔"

ہمارے اس دلیرانہ انکشاف یا اعتراف پر ہمارے مہمان دم بخود رہ جاتے ہیں۔ کوئی مہمان ایسا بھی ہوتا ہے جس کا منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا ہے۔ اس دوران ہم میاں بیوی سر جوڑ کر یوں مسکراتے ہیں گویا تصویر کھنچوا رہے ہوں۔ پھر بیرل کہتی ہے۔ "میں نے اس پینٹنگ کو چرانے میں ولیم کی مدد کی تھی لیکن مجھے یہ اعتراف ہے کہ زیادہ تر منصوبہ بندی ولیم ہی کی تھی۔"

اس کے فوراً بعد میں اپنا مکالمہ بولتا ہوں۔ "اس منصوبے پر عملدرآمد کے سلسلے میں مجھے چند گھنٹوں کے لیے ایک مشہورِ عالم شخصیت کا روپ دھارنا پڑا تھا۔ مجھے اس کا موی مجسمہ بننا پڑا تھا۔"

"مجھے خاموش فلموں کے دور کے ایک عظیم اداکار کا موی مجسمہ بننا پڑا تھا۔" بیرل لقمہ دیتی ہے۔

مہمان بدستور حیرت سے ہماری طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ ان کے لیے یقین کرنا مشکل ہوتا ہے کہ ہم کم از کم دس لاکھ ڈالر مالیت کی پینٹنگ کی چوری کا اس دیدہ دلیری سے اعتراف کرنے میں سنجیدہ ہیں۔

کئی لمحے کی پر تجسس خاموشی کے بعد میں پوچھتا ہوں۔ "کیا آپ اس پینٹنگ کی چوری کی کہانی سننا پسند کریں گے؟"

وہ اثبات میں سرہلاتے ہیں۔ بیرل خالی پیالیوں میں مزید کافی اُنڈیلتی ہے اور میں کہانی شروع کرتا ہوں:

"میں اور بیرل ۱۹۸۹ء میں آرٹ اسکول سے ریٹائر ہوتے ہی یورپ کے دورے پر نکل کھڑے ہوئے تھے۔ کینالیٹو ہمارا محبوب ترین مصور ہے۔ اس کی تصویروں میں اٹھارھویں صدی کی تہذیب کی جس خوبصورتی سے عکاسی کی گئی ہے اسے دیکھ کر نہ جانے کیوں ہمیں روحانی سی خوشی حاصل ہوتی ہے لیکن بدقسمتی سے ہم نے اس وقت تک اس کی کوئی اصل پینٹنگ نہیں دیکھی تھی۔ چنانچہ ہمارا ارادہ بعض ایسی جگہوں پر جانے کا تھا جہاں اس کی پینٹنگز موجود تھیں لیکن اس سے پہلے ہم اپنی بیٹی ایریکا سے ملنے کے لیے روانہ ہوئے جو انگلینڈ کے شہر بور سیسٹر میں رہ رہی تھی جسے غلط تلفظ کے ساتھ لوگ عموماً بوسٹر کہتے ہیں۔

ایریکا پڑھنے کے لیے آکسفورڈ گئی تھی جہاں تعلیم کے دوران ہی اس نے اپنے ایک کلاس فیلو نائی جل فورڈ سے شادی کرلی جو بوسٹر کا رہنے والا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ دونوں اپنے طور پر عملی زندگی کا آغاز کرتے' نائی جل کے والد کا انتقال ہوگیا۔ انہوں نے ورثے میں اپنے شہر کا ایک ہفت روزہ اخبار اور ایک چھوٹا سا پریس چھوڑا تھا۔ حالانکہ ان دونوں چیزوں کو مخلص کارکن عمدگی سے چلا رہے تھے لیکن ایریکا اور نائی جل نے خود جاکر اس کاروبار کو سنبھالنے اور بوسٹر میں ہی سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔

بوسٹر تقریباً تیس پینتیس ہزار کی آبادی پر مشتمل ایک چھوٹا اور نہایت پُرسکون شہر تھا جو کچھ تاریخی پس منظر بھی رکھتا تھا جس کی وجہ سے اردگرد کے بڑے شہروں سے سیاح بھی ۱۹۴۲ء تک تو کثرت سے اس کی عمارات وغیرہ دیکھنے آتے رہے لیکن پھر دوسری عالمگیر جنگ میں جرمنوں کی وحشیانہ بمباری میں بیشتر پُرشکوہ، عظیم اور تاریخی عمارات کھنڈر ہوگئیں۔ بچنے والی عمارات میں صرف بوسٹر کیسل ہی قابلِ ذکر تھا۔ اسی سے ملتا جلتا ایک اور قلعہ وارِوک کیسل' بھی موجود تھا۔ ایریکا ہمیں ان دونوں عمارتوں کے بارے میں بتاتے ہوئے بولی۔ "یوں تو دونوں عمارتیں ایک جیسی ہیں اور سیاح دونوں ہی کو دیکھنے جاتے ہیں لیکن ہمیں معلوم ہے' آپ کو بوسٹر کیسل زیادہ اہم اور اچھا لگے گا۔ اس کی وجہ میں نہیں بتاؤں گی۔ وہ آپ کو وہاں جاکر خود ہی معلوم ہوجائے گی۔"

چند دن بعد ہم نے ایریکا کی گاڑی مستعار لی اور ایک گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد وارِوک کیسل پہنچے۔ اس محل نما قلعے کے تاریخی پس منظر کے علاوہ بھی یہاں دلچسپی کی کئی چیزیں موجود تھیں۔ ۷۸ء کے بعد سے یہ عمارت انہی لوگوں کے زیرِ انتظام تھی جو لندن میں مادام تساؤ کا موی مجسموں کا عجائب گھر سنبھالے ہوئے تھے۔ انہوں نے ۱۸۹۸ء سے لے کر زمانہ حال تک کی بہت سی مشہور شخصیتوں کے موی مجسمے یہاں بھی سجائے ہوئے تھے جن میں ونسٹن چرچل کا مجسمہ بھی شامل تھا۔ چرچل کو ایک کرسی پر بیٹھ کر کتاب پڑھتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔

بیرل کو پہلی بار گویا ایک عجیب حقیقت کا احساس ہوا۔ وہ میری صورت دیکھ کر مجسمے سے اس کا موازنہ کرتے ہوئے بولی۔ "تم تو تقریباً چرچل ہی معلوم ہوتے ہو۔ حالانکہ اس مجسمے میں چرچل کی عمر تمہاری عمر سے صرف ایک تہائی نظر آرہی ہے۔"

اس کے چند دن بعد ہمارا بوسٹر کیسل جانا ہوا۔ وہ گویا وارِوک کیسل ہی کا عکس تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ بوسٹر کیسل کی حالت خاصی غریبانہ تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے بہت کم سیاح دیکھنے آتے تھے۔ آمدنی بہت کم تھی اس لیے اس کی دیکھ بھال وغیرہ پر زیادہ خرچ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس کے موی مجسموں کا معیار بھی وہ نہیں تھا جو وارِوک کیسل میں دیکھنے میں آیا تھا۔ ان کی ساخت سے تھوڑا سا بھدا پن جھلکتا تھا۔ شاید اسی لیے یہاں کے چرچل کو دیکھ کر بیرل بول اٹھی۔ "اس میں تمہاری مشابہت زیادہ ہے۔" آپ اس کا مطلب سمجھ ہی سکتے ہیں۔ یہ چرچل ذرا زیادہ گنجا اور زیادہ موٹا دکھایا گیا تھا۔

یہاں چرچل کو ایک کاؤچ پر بیٹھے دکھایا گیا تھا۔ اس کے ساتھ

خاموش فلموں کے زمانے کا اداکار روڈلف بیٹھا ہوا تھا۔ عقب سے دونوں کا صرف کندھوں تک نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ بجلی کا خرچ بچانے کے لیے اس میوزیم کے منتظم یہاں روشنیاں بھی مدھم رکھتے تھے۔

اس کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے اچانک میری نظر دیوار پر پڑی اور میں نے سرگوشی میں بیرل سے کہا۔ ”ذرا دیکھو تو.... ان دونوں مجسموں کے سامنے دیوار پر کیا لگا ہے۔“

”یہ تو کینالیٹو کی پینٹنگ ہے۔“ بیرل بھی سرگوشی میں بولی۔ ”شاید ایریکا نے اسی کی وجہ سے کہا تھا کہ ہمیں بوسٹر کیسل میں زیادہ کشش محسوس ہوگی۔“

اس پینٹنگ میں بوسٹر کیسل ہی کا منظر دکھایا گیا تھا۔ میں اور بیرل کئی لمحے تک عقیدت بھری خاموشی سے ایک ٹک اس پینٹنگ کی طرف دیکھتے رہے پھر میں نے کہا۔ ”میں ذرا قریب سے اس کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔“

اس حصے کے گرد ایک زنجیر کے ذریعے حفاظتی حصار سا بنایا گیا تھا۔ اس زنجیر میں ایک بورڈ آویزاں تھا جس پر لکھا تھا۔ ”اس سے آگے نہ بڑھیں۔“

میں اس تختی کی پروا نہ کرتے ہوئے اس رسی کو پھلانگ کر آگے بڑھا۔ تب مجھے مجسموں کو بھی سامنے سے دیکھنے کا موقع ملا اور میں نے متاسفانہ لہجے میں بیرل کو بتایا۔ ”اس میوزیم کی حالت تو واقعی بہت پتلی ہے۔ یہاں تو مجسمے بھی پورے بنوا کر نہیں رکھے گئے ہیں۔ ان دونوں مجسموں کے درحقیقت صرف بالائی دھڑ موجود ہیں۔ ٹانگیں وغیرہ غائب ہیں لیکن پیچھے سے یا سائڈ سے پتا نہیں چلتا۔“

پھر میں نے تقریباً آدھے منٹ تک نہایت قریب سے پینٹنگ کا معائنہ کیا اور واپس آگیا۔

اس رات کھانے کی میز پر ہم اپنی بیٹی اور داماد سے اپنے اس روز کے دورے کے بارے میں باتیں کررہے تھے تو کینالیٹو کی پینٹنگ کا ذکر آیا۔ ایریکا بولی ”اس میوزیم میں درحقیقت وہی ایک بیش قیمت چیز موجود ہے لیکن اس کی حفاظت کا بھی کوئی معقول انتظام نہیں ہے۔“

نائجل خبردار کرنے کے سے انداز میں بولا ”یہ ایک راز ہے۔ اجنبیوں کو نہیں بتانا چاہیے۔ ہمیں صرف صحافی ہونے کی حیثیت سے ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔“

”میرے والدین تمہارے خیال میں ہمارے لیے اجنبی ہیں؟“ ایریکا نے اس پر آنکھیں نکالیں۔

"سوری!" نائی جل شرارت سے مسکراتے ہوئے بولا "میں تو بھول ہی گیا تھا کہ یہ تمہارے ممّی ڈیڈی اور میرے ساس سسر ہیں۔"

پھر وہ گویا مذاق اور احتیاط دونوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے سنجیدگی سے ہمیں بتانے لگا "میرا ایک جاننے والا اس کیسل میں بنے ہوئے میوزیم کی نگران کمیٹی کا ممبر ہے۔ وہ بتا رہا تھا کہ کیسل کا الارم سسٹم اکثر ہی خراب رہتا ہے اور کمیٹی کے مالی حالات اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ آدھی رات کے بعد ڈیوٹی دینے کے لیے گارڈز کا بندوبست کیا جاسکے۔ لہٰذا میوزیم کی نگرانی کے لیے صرف آدھی رات تک گارڈز موجود ہوتے ہیں۔"

"آخر اس میوزیم کی حالت اتنی پتلی کیوں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جس آخری ڈیوک نے یہ کیسل شہری انتظامیہ کے نام چھوڑا تھا وہ زبردست شرابی اور عیاش تھا۔ قلعے کے علاوہ اس نے پھوٹی کوڑی بھی نہیں چھوڑی تھی۔ اس کیسل کو میوزیم کا روپ دینے کے لیے چونکہ شروع سے کوئی بنیادی فنڈ موجود نہیں تھا اس لیے آج تک اس کا نظام کھینچ تان کر ہی چلایا جارہا ہے۔ ضرورت پڑنے پر آرٹ کے چند کم قیمت نمونے بھی یکے بعد دیگرے فروخت کیے گئے ہیں۔"

"کینالیٹو کی پینٹنگ کیسے بچی ہوئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ تو یقیناً اسے بھی بیچ چکے ہوتے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ انگلینڈ میں اتنی مالیت کی پینٹنگ کا کوئی خریدار نہیں ہے اور اسے ملک سے باہر فروخت کرنا قومی ورثے کے قوانین کی خلاف ورزی کے زمرے میں آتا ہے۔"

"صحافی کی حیثیت سے تمہارا فرض بنتا ہے کہ اپنے اخبار میں میوزیم کے حفاظتی انتظامات بہتر بنانے کے سلسلے میں کوئی مہم چلاؤ۔" بیرل بولی۔

تب نائی جل ایک نہایت مدبر قسم کے ایڈیٹر کے سے انداز میں سہلاتے ہوئے بولا۔ "صحافی کی حیثیت سے تو میرا جی چاہتا ہے کہ خوب واویلا مچاؤں اور انتظامیہ پر زور ڈال کر میوزیم کے لیے کچھ اضافی فنڈ منظور کراؤں لیکن جب میں بوسٹر کے ایک شہری کی حیثیت سے سوچتا ہوں تو مجھے ایک اور پہلو پر بھی غور کرنا پڑتا ہے۔ میں اخبار میں میوزیم کے ناکافی حفاظتی انتظامات کا ذکر کروں گا تو لازماً یہ بات چوروں اور نقب زنوں کے بھی علم میں آجائے گی۔ لازماً ان کی رال ٹپک پڑے گی۔ کینالیٹو کی ایک ملین ڈالر مالیت کی پینٹنگ پر نہ جانے کتنے لوگ ہاتھ صاف کرنا چاہیں گے۔"

تین گھنٹے بعد جب کہ میں اور بیرل بستر پر کروٹیں بدل رہے تھے، میں نے اس سے پوچھا۔ "کیا تم بھی وہی سوچ رہی ہو جو میں سوچ رہا ہوں؟"

"ہاں۔" بیرل نے جواب دیا۔ "اور میرا خیال ہے یہ کام کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ اب سوجاتے ہیں۔" میں نے کہا اور ہم سکون سے سوگئے۔

ہماری اس مختصر اور مبہم گفتگو سے آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ ہماری ازدواجی زندگی کتنی خوشگوار گزری ہوگی۔ چھوٹے موٹے جھگڑے تو ہمارے درمیان بھی ہوتے آئے تھے لیکن اس میں شک نہیں تھا کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھتے خوب تھے۔ ہمارے دل میں جو بات ہوتی تھی وہ ہمیں ایک دوسرے کو لفظوں میں نہیں بتانی پڑتی تھی۔ زندگی بھر ہم نہایت قانون پسند شہری رہے تھے لیکن اس روز اپنے خوابوں میں بسنے والی چیزوں میں سے ایک کی خاطر ہم نے چوری جیسے جرم کی حدود میں قدم رکھنے کا فیصلہ کیا تھا تب بھی ہمیں ایک دوسرے سے متفق ہونے میں دیر نہیں لگی تھی۔ سوتے میں بھی گویا ہمارے درمیان ٹیلی پیتھی کے ذریعے رابطہ قائم رہتا تھا۔

صبح اٹھتے ہی میں نے بغور بیرل کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "گو کہ تم زندگی میں بہت کم ہی خاموش رہی ہو لیکن میرا خیال ہے کہ تم آسانی سے خاموش فلموں کے دور کے اداکار روڈلف کی ہم شکل نظر آسکتی ہو۔"

بیرل میرے بالوں کی بچی کھچی لٹوں کو منتشر کرتے ہوئے بولی "تمہیں گو کہ سیاسی.... بلکہ کسی بھی قسم کی سمجھ بوجھ چھو کر بھی نہیں گزری لیکن بظاہر تم آسانی سے چرچل نظر آسکتے ہو۔"

ناشتے کے دوران ہم نے اریکا اور نائی جل کو بتایا کہ ہم شاپنگ اور کچھ تھیٹر وغیرہ دیکھنے کی غرض سے چند دن کے لیے لندن جارہے ہیں لیکن درحقیقت ہم میاں بیوی ایک ہوٹل میں جاکر پناہ گزیں ہوگئے۔ ہم نے ایک کتاب خریدی جس میں کینالیٹو کے فن اور زندگی کا احاطہ کیا گیا تھا۔ اس میں اس کی بوسٹر کیسل کی اس پینٹنگ کی تصویر بھی شاملِ اشاعت تھی جو بوسٹر کیسل میں ہی آویزاں تھی اور جس پر ہم میاں بیوی نے آنکھ رکھی ہوئی تھی۔

کتاب میں بتایا گیا تھا کہ کینالیٹو نے یہ تصویر ۱۷۵۲ء میں بنائی تھی جن دنوں وہ انگلینڈ میں کام کررہا تھا۔ اس کی فرمائش بوسٹر کے ایک ڈیوک نے کی تھی اور وہ کینالیٹو کی پینٹنگز میں سب سے چھوٹی تھی یعنی بیس انچ لمبی اور پندرہ انچ چوڑی۔

ہم نے مصوری کا کچھ سامان خریدا۔ آئل پینٹنگ میں چونکہ مجھے اپنی صلاحیتوں پر ناز تھا اس لیے رنگین تصویر دیکھ کر پینٹنگ کی نقل تیار کرنے کی ذمّے داری میں نے اپنے سر لی۔ ہمارے منصوبے کی کامیابی کے لیے کینالیٹو کی مطلوبہ پینٹنگ کی ایک نہایت شاندار نقل تیار کرنا بے حد ضروری تھا۔ میں تو ہوٹل کے کمرے میں پینٹنگ میں لگ گیا جبکہ بیرل نے اس دوران دوسری تیاریاں شروع کردیں۔ وہ دو وِگیں، ایک نقلی مونچھ اور کچھ پرانے کپڑے خرید کر لائی۔

وہ خزاں کے دن تھے۔ سردی کافی تھی اور ہمیں سب سے

زیادہ تشویش اسی بات کی تھی کہ سردی کے دنوں میں بوسٹر کیسل میں آنے والوں کی تعداد اور بھی کم ہو جاتی تھی لیکن پھر ہمیں معلوم ہوا کہ ہر بدھ اور جمعرات کو میوزیم میں عمر رسیدہ لوگوں کا داخلہ مفت ہوتا تھا۔ منتظمین اپنی دانست میں یہ ہوشیاری دکھانے کی کوشش کرتے تھے کہ بوڑھوں کو مفت داخلے کی رعایت دے کر اس کی کسر میوزیم کے کیفے میں کھانے پینے کی چیزیں اور چھوٹی موٹی یادگاریں مہنگے داموں بیچ کر پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔ انہیں اپنی اس کوشش میں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوتی تھی بہرحال بدھ اور جمعرات کو ریٹائرمنٹ ہومز اور بوڑھوں کے کلبوں وغیرہ سے ان لوگوں کی بسیں بھر بھر کر بوسٹر کیسل آتی تھیں۔

ہم نے آزمائشی طور پر حلیہ تھوڑا تھوڑا بدل کر بدھ اور جمعرات کو انہی لوگوں میں گھل مل کر میوزیم کا دورہ کر کے بھی دیکھ لیا۔ اتوار کو بیرل نے مجھ سے پوچھا ”کیا یہ روڈلف اور چرچل والے آئیڈیے پر عملدر آمد ضروری ہے؟ ہم ویسے بھی تو کسی الماری میں یا بیڈ کے نیچے چھپ سکتے ہیں۔ وہاں ایسی چیزیں موجود ہیں۔“

”تم چوہوں سے ڈرتی ہو اور الماریوں یا کونے کھدروں میں چوہے ضرور ہوتے ہیں۔ اگر تم نے ایسی کسی جگہ چھپنے کے بعد چیخ ماردی تو کیا ہوگا؟ اس کے علاوہ میرا تنگ جگہوں پر دم گھٹتا ہے۔“ میں نے اس کی تجویز کو رد کرتے ہوئے دلیل دی۔

”دروازوں کے پیچھے چھپنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ بیرل نے پوچھا۔

”ہماری ٹانگیں اس قابل نہیں ہیں کہ ہم گھنٹوں کھڑے رہ سکیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ بیرل بولی۔ ”میں تو دراصل تمہیں موقع دے رہی تھی کہ اگر تمہاری اس منصوبے پر عمل کرنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تو اب بھی وقت ہے.... ارادہ ملتوی کر دو۔“

”تم مجھے اتنا بزدل سمجھتی ہو؟“ میں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

”بہت خوب!“ اس نے مجھے تھپکی دی ”تمہارے حوصلے جوان ہیں۔ ویسے بھی الماری میں یا بیڈ کے نیچے چھپنا اسے ایک عام کی چوری کی واردات بنا دیتا۔ ہماری اسکیم میں کچھ تو ذہانت اور انفرادیت نظر آنی چاہیے۔“

اگلے بدھ کو ہم مکمل تیاریوں کے ساتھ اپنے ہوٹل کے کمرے سے نکلے۔ میں نے جس کینوس پر پینٹنگ کی نقل تیار کی تھی‘ اسے اخبار میں رول کر کے ساتھ لے لیا تھا۔ میں اپنے اوورکوٹ کے نیچے چرچل کے مجسمے جیسا کوٹ پہنے ہوئے تھا اور ویسی ہی ٹائی لگائے ہوئے تھا۔ پرانے فیشن کے کالر کو میں نے اسکارف کے نیچے چھپا لیا تھا۔

بوسٹر کیسل پہنچ کر ہم ذرا دور ہی رک گئے۔ جب ہم نے بوڑھوں کی ایک بس آتی دیکھی تب آگے بڑھے اور انہی میں گھل مل کر کیسل میں داخل ہو گئے۔ جس طویل و عریض لائبریری میں

جوابِ محبت

چچا جان نے غصے میں آکر بھتیجے کی چھڑی سے خوب پٹائی کی۔ وہ رونے لگا تو چچا جان نرم لہجے میں بولے ”برخوردار! یہ مار نہیں ہے‘ تمہاری بھلائی اور محبت میں یہ سب کچھ کر رہا ہوں۔“

بھتیجا سسکتا ہوا بولا ”کاش میں بھی اتنا بڑا ہوتا کہ محبت کا جواب محبت سے دے سکتا۔“

روڈلف اور چرچل وغیرہ کے مجسمے موجود تھے اس میں ہم سب سے بعد میں گھومتے گھماتے پہنچے۔

ہمیں اپنے حلیے تبدیل کرنے میں صرف ایک منٹ لگا۔ روڈلف کو ایک عرب شیخ کے روپ میں دکھایا گیا تھا۔ اس نے ایک فلم میں یہ کردار ادا کیا تھا۔ اس کے سر پر عربوں والا مخصوص رومال بندھا ہوا تھا۔ بیرل اس مقصد کے لیے ایک چھوٹا میز پوش ساتھ لائی تھی۔ ڈھیلی ڈھالی عبا اس نے اپنے لباس کے اوپر ہی چڑھا لی۔

ہم نے اپنے فاضل کپڑے‘ روڈلف اور چرچل کے ادھورے مجسمے اٹھا کر جلدی سے قریبی اسٹور میں پہنچائے اور ان کی جگہ ساکت ہو کر بیٹھ گئے۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ ہم میں سے کسی کو اس گرد آلود ماحول میں چھینک نہ آجائے یا مجسموں کی طرح پلک جھپکائے بغیر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے ہماری ہنسی نہ نکل جائے۔ اس عمر میں اس طرح ساکت رہنا ایک بڑا کٹھن امتحان تھا۔ صبح سے اس ڈر سے ہم نے کچھ پیا بھی نہیں تھا کہ کہیں بے وقت پیشاب کی حاجت نہ ہونے لگے۔

لوگوں کی آمدورفت ابھی جاری تھی۔ غنیمت تھا کہ اس حصے کے گرد رسی کا حصار موجود تھا۔ لوگ ہمیں دور سے ہی دیکھتے ہوئے گزرتے تھے۔ تاہم آخری آدھا گھنٹا تو ہمارے لیے کڑی آزمائش کا تھا۔ مجھے اندیشہ محسوس ہونے لگا کہ میں اسی حالت میں اکڑ نہ جاؤں۔ بیرل کی بھی یقیناً یہی کیفیت تھی۔

آخر کار ساڑھے پانچ بجے مدھم بتیاں بھی بجھ گئیں اور ان میں ڈیوٹی دینے والا اسٹاف رخصت ہو گیا۔ ہمارا خیال تھا کہ ان کے بعد بھی‘ میوزیم کی تمام تر غربت کے باوجود کم از کم تین گارڈز تو رات بارہ بجے تک ڈیوٹی دیتے ہوں گے لیکن ہمیں پتا چلا کہ صرف ایک گارڈ ڈیوٹی پر تھا اور وہ بھی کم از کم ساٹھ سال کی عمر کا تھا۔ وقفے وقفے سے وہ کئی بار راؤنڈ پر آیا۔ اس نے ٹارچ سے کئی بار ہماری طرف بھی روشنی ڈالی۔ گو کہ وہ بھی ہمیں سیاحوں کی طرح ایسے زاویے سے ہی دیکھ سکتا تھا کہ اسے ہماری ٹانگیں نظر نہیں آسکتی تھیں اور ٹارچ کی روشنی براہِ راست ہماری آنکھوں میں

نہیں پڑ سکتی تھی۔ اس کے باوجود ہماری آنکھیں خیرہ ہو گئیں لیکن ہم بھی اس روز قوتِ برداشت کا ریکارڈ قائم کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ ہم نے روشنی میں آنکھ نہیں جھپکی۔

وہ گارڈ بھی یقیناً اپنی ڈیوٹی میں ڈنڈی مارتا تھا۔ وہ دس بجے کے بعد راؤنڈ پر نہیں آیا۔ غالباً گھر چلا گیا تھا لیکن ہم نے احتیاطاً ایک بجے تک اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔

ایک بجے کے بعد آخر کار ہم نے اپنے اکڑے ہوئے اعضا کو حرکت دی۔ بیرل نے وہ چھوٹی سی ٹارچ روشن کی جو وہ اپنے ہینڈ بیگ میں چھپا کر لائی تھی۔ میں نے اس کی روشنی میں پینٹنگ دیوار سے اُتار کر اس کا فریم کھولا اور اس میں سے کینوس نکال لیا۔ اس کی جگہ میں نے کینوس پر اپنی تیار کردہ نقل فٹ کی اور فریم کو دوبارہ بند کر دیا۔ یہ کام ہماری توقعات سے زیادہ آسان ثابت ہوا تھا۔

صبح اسٹاف کا پہلا آدمی سوا نو بجے پہنچتا تھا۔ ہم نے نو بجے تک ہی اگلے مرحلے کی تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ یعنی نقلی مونچھوں اور وگ وغیرہ کی مدد سے اپنا حلیہ کل سے مختلف بنا لیا تھا۔ مومی مجسموں کو ان کی جگہ واپس پہنچا دیا تھا اور خود دروازوں کے پیچھے چھپ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ دروازوں کے پیچھے جگہ اتنی تنگ تھی اور کونے کھدروں میں اتنی مٹی جمی ہوئی تھی کہ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ گزشتہ شام سے اب تک یہاں چھپنے کا منصوبہ نہیں بنایا تھا۔ پرانی طرز کے کاؤچ پر ہمارا وقت زیادہ آسانی سے گزر گیا تھا۔

اس روز بوڑھوں کی پہلی بس پونے گیارہ بجے آئی۔ اس وقت تک دروازوں کے پیچھے چھپے رہنا ہمارے لیے بڑا ہی صبر آزما مرحلہ ثابت ہوا۔ ہمیں مجسمہ بننا اتنا مشکل نہیں لگا تھا جتنا دروازوں کے پیچھے چھپ کر کھڑے ہونا۔ جونہی ایک ٹولی لائبریری میں گھومنے پھرنے کے بعد نکلی، ان کے پیچھے پیچھے ہم بھی نکل گئے۔

اس روز دوپہر کے کھانے سے پہلے ہم اریکا کے ہاں پہنچ گئے۔ کھانا ہم نے اریکا کے ساتھ ہی کھایا۔ شام کو نائی جل آیا تو باتوں باتوں میں اس نے بتایا۔ ”آپ لوگوں کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ بوسٹر کیسل میوزیم کے منتظمین اب کیسل میں نیا الارم سسٹم نصب کروانے اور چوبیس گھنٹے کے لیے کچھ گارڈز رکھنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ ایک آدھ دن میں ہی یہ انتظامات ہو جائیں گے۔“

”اس کا مطلب ہے، کینالیٹو کی پینٹنگ اب محفوظ رہے گی؟“ بیرل نے نہایت خوش دلی سے پوچھا۔

نائی جل نے کچھ عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور بولا ”ہاں اُمید تو ہے۔“

گویا یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم نے اپنے منصوبے پر عمل درآمد کا پروگرام آئندہ بدھ پر نہیں رکھا تھا ورنہ یہ حسرت ہی دل میں رہ جاتی کہ ہم بھی کینالیٹو کی ایک عدد پینٹنگ کے مالک بنیں۔

میں نے پوچھا ”میوزیم والوں کے پاس ان اخراجات کے لیے رقم کہاں سے آ گئی؟“

”شاید کسی گمنام مخیر نے عطیہ دے دیا ہو۔“ نائی جل مبہم لہجے میں بولا۔ غالباً اسے خود بھی صحیح طور پر اس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔

یہاں ہم اپنی کہانی ختم کر دیتے ہیں جس کے بعد بعض مہمان کچھ سوالات کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ہم اس پینٹنگ کو آسٹریلیا لانے میں کیسے کامیاب ہوئے؟

میں وضاحت کرتا ہوں۔ ”ہم نے سفر کے دوران اپنی چند اور پسندیدہ پینٹنگز کی بھی نقول تیار کی تھیں اور انہیں فریم کرائے بغیر صرف کینوس رول کر لیے تھے۔ انہی میں ہم نے کینالیٹو کی اصل پینٹنگ بھی شامل کر لی تھی۔ کسٹم والوں نے ہمارا وہ بیگ نہایت سرسری انداز میں دیکھا۔ ہم نے انہیں بتا دیا تھا کہ ہم نے چند پینٹنگز کو کاپی کیا ہے۔ شاید انہیں گمان بھی نہ گزرا ہو کہ ان میں ایک بیش قیمت اصل پینٹنگ بھی جا رہی ہے۔“

ایک اور سوال جو عام طور پر کیا جاتا ہے، وہ یہ ہے۔ ”کیا آپ کو کبھی اندیشہ محسوس نہیں ہوتا کہ جن لوگوں کو آپ اتنی بے خوفی سے یہ کہانی سناتے رہتے ہیں ان میں سے کوئی پولیس کو بھی اس کی اطلاع دے سکتا ہے؟“

اس موقعے پر بیرل انتہائی پُراعتماد نظر آتے ہوئے کہتی ہے۔ ”یہ تو ایک طرح سے کسی کے اعتماد کو دھوکا دینے والی بات ہوگی اور ہم اپنے دوستوں سے یہ توقع نہیں رکھتے کہ وہ ہمارے اعتماد کو دھوکا دیں گے۔“

ہماری یہ خوش فہمی بھلا کب تک ہمارا ساتھ دے سکتی تھی۔ آخر کسی نہ کسی نے پولیس کو اطلاع کر ہی دی۔

چند ماہ قبل کی بات ہے کہ ملبورن کے سینٹرل انٹیلیجنس بیورو سے انسپکٹر تھامسن ہم سے پوچھ گچھ کرنے آن پہنچا۔ اس کا رویہ معذرت خواہانہ تھا لیکن انداز سے یہ بھی ظاہر تھا کہ وہ صحیح طور پر چھان بین کر کے ہی جائے گا۔

”ہمیں کچھ عجیب سی اطلاع ملی ہے....“ اس نے تمہید باندھی۔ ”بات کچھ قرینِ قیاس تو نہیں لگتی لیکن مجھے بہرحال کچھ سوالات تو کرنا پڑیں گے....“

ہمیں چونکہ اس قسم کی صورتِ حال پیش آنے کا اندیشہ تو رہتا ہی تھا۔ بیرل نے اس موقع پر نہایت خوبصورتی سے بات سنبھالی اور استہزائیہ لہجے میں بولی۔ ”تم یقیناً ایک پینٹنگ کے بارے میں سوالات کرنا چاہتے ہوگے جو ہم بوسٹر کیسل سے چرا کر لائے ہیں؟“

اس نے گویا اپنے مذاق سے محظوظ ہوتے ہوئے قہقہہ لگایا اور بات جاری رکھی۔ ”ہم کھانے کے بعد محض تفریح اور وقت گزاری کے لیے اپنے مہمانوں کو اپنی گھڑی ہوئی ایک کہانی سُنایا کرتے ہیں اور وہ بے چارے نہ صرف آنکھیں بند کر کے اس پر یقین کر لیتے ہیں بلکہ ان میں سے کسی نے پولیس کو بھی جا کر خبر کر دی۔ تم میرے

ساتھ اوپر چلو۔ میں تمہیں وہ پینٹنگ دکھاتی ہوں۔"

اوپر لائبریری میں جا کر تھامسن نے اس پینٹنگ کا معائنہ کیا اور بولا۔ "اچھی ہے۔ کافی پرانی معلوم ہوتی ہے۔"

"صرف تین سال پرانی ہے۔" میں نے کہا۔

تین سال قبل انگلینڈ سے واپس آنے کے بعد احتیاطاً ہیل نے بھی کینالیٹو کی پینٹنگ کی ایک نقل تیار کر ڈالی تھی اور اسے لائبریری میں آویزاں کر دیا تھا۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں نے جو نقل تیار کر کے بوسٹر کیسل میں لٹکائی تھی وہ بہتر تھی، تو بے جا نہ ہوگا اور مجھے اُمید ہے، ہیل بھی اس کا بُرا نہیں منائے گی۔ یہ پینٹنگ ہم نے اسی لیے لائبریری میں لٹکائی تھی کہ اگر کبھی پولیس آن پہنچے تو اسے دکھائی جا سکے۔

ہیل بولی۔ "کینالیٹو ہمارا محبوب مصور ہے۔ ہم نے انگلینڈ میں اس کی پینٹنگ دیکھی تھی اور بے اختیار اس کی یہ نقل تیار کر ڈالی تھی۔ یہی نقل مہمانوں کو دکھا کر ہم اپنی گھڑی ہوئی کہانی سناتے ہیں اور وہ بے چارے یقین کر لیتے ہیں۔"

انسپکٹر تھامسن بولا۔ "میں خود کبھی کبھار لوگوں کی ٹانگ کھینچنا پسند کرتا ہوں لیکن آپ دونوں نے جو کہانی گھڑی ہے وہ بلاشبہ لاجواب ہے۔"

"تاہم یہ ایک بے ضرر مذاق ہے۔" ہیل بولی۔

"اس کے باوجود میرے افسرانِ بالا یقیناً کہیں گے کہ میں اسکاٹ لینڈ یارڈ والوں سے اس کے بارے میں تصدیق کر لوں۔" تھامسن بولا۔

ہمیں خود بھی کئی بار اندیشہ محسوس ہوا تھا کہ بات کہیں اس حد تک نہ چلی جائے۔ انسپکٹر تھامسن کے جانے کے بعد کئی دنوں تک ہم تشویش میں مبتلا رہے تاہم کئی ہفتے گزر گئے اور انسپکٹر کی طرف سے کوئی اطلاع نہ آئی۔ ہمیں اطمینان ہو گیا کہ شاید معاملہ داخلِ دفتر کر دیا گیا ہے لیکن پھر ایک روز انسپکٹر تھامسن کا فون آ گیا۔

"میں نے سوچا، آپ کو بھی بتا دوں کہ میں نے اس پینٹنگ کے سلسلے میں اسکاٹ لینڈ یارڈ والوں سے رابطہ کیا تھا..." وہ بولا۔

مجھے اپنے دل کی دھڑکن رکتی محسوس ہوئی۔ میں نے کمزور سے لہجے میں کہا۔ "ہاں.... ایک روز تو یہ ہونا ہی تھا انسپکٹر!"

وہ میرے الفاظ اور لہجے پر توجہ دیے بغیر اپنی دُھن میں بولا۔ "اسکاٹ لینڈ یارڈ والوں نے بوسٹر کیسل کے منتظمین سے تصدیق کرلی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کینالیٹو کی اصل پینٹنگ بدستور کیسل میں ہی لٹکی ہوئی ہے لیکن ظاہر ہے، آپ کے لیے تو یہ کوئی خبر نہیں ہوگی۔ آپ کو تو حقیقت معلوم ہی ہے کہ آپ نے کیسل سے پینٹنگ نہیں چرائی تھی۔ پھر بھی میں نے سوچا کہ آپ کو بتا دوں، ہم نے اپنا اطمینان کر لیا ہے۔"

اسے معلوم نہیں تھا کہ جو خبر وہ مجھے سُنا رہا تھا، وہ اچھی ہونے کے ساتھ ساتھ میرے لیے کتنی بُری تھی۔ میں نے اپنا لہجہ مجروح سا بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "چلو اچھا ہوا تم نے اپنا اطمینان کر لیا۔ فون کرنے کا شکریہ۔ خدا حافظ۔"

میں نے ریسیور رکھا اور چکرا کر گر پڑا۔ مجھے اس سوال نے چکرایا تھا کہ اگر اصل پینٹنگ بوسٹر کیسل میں ہی آویزاں تھی تو ہم کیا چرا کر لائے تھے؟

ہیل جو اس وقت لان میں تھی، میرے گرنے کی آواز سُن کر دوڑی آئی۔ اس نے مجھے فرش پر پڑے پایا تاہم مجھے کوئی چوٹ نہیں آئی تھی۔

تقریباً پندرہ دن بعد ہمیں اریکا کا خط ملا۔ خط کا بیشتر حصہ تو اس خوشخبری اور اس ضمن میں اریکا کے محسوسات سے بھرا ہوا تھا کہ وہ ماں بننے والی تھی تاہم آخر میں اس نے لکھا تھا!

بالآخر میں نے نائی جل سے یہ راز معلوم کر ہی لیا کہ بوسٹر کیسل والوں کے پاس اپنے حفاظتی انتظامات بہتر بنانے کے لیے رقم کہاں سے آ گئی تھی؟ نہیں کسی گمنام قدردان نے چندہ وغیرہ نہیں دیا تھا۔ دراصل انہوں نے نہایت رازداری سے کینالیٹو کی پینٹنگ کو فروخت کر دیا تھا۔ اسے اسی طرح کے کسی جاپانی قدردان نے خریدا تھا جو آرٹ کے شہ پاروں کو تجوریوں میں بند کر کے رکھتے ہیں اور صرف خود ہی دیکھ دیکھ کر محظوظ ہوتے رہتے ہیں۔ یہ کام غالباً آپ کی آمد سے ایک آدھ دن پہلے ہی ہو چکا تھا لیکن میوزیم والوں نے اس راز کو راز رکھنے کے لیے پینٹنگ کی جگہ اس کی نقل لٹکا رکھی تھی جو اصل سے کچھ کم نہیں تھی۔ چند ہفتے پہلے اچانک ہی افواہ پھیل گئی تھی کہ کینالیٹو کی پینٹنگ درحقیقت چوری ہو چکی ہے۔ شاید اسکاٹ لینڈ یارڈ والوں نے اس کے بارے میں کوئی استفسار کیا تھا جس کی وجہ سے یہ افواہ پھیلی۔ میوزیم والوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ انہیں اپنا بھرم بھی رکھنا تھا۔ انہوں نے پینٹنگ کو ماہرین کے معائنے کے لیے پیش کیے بغیر جلدی سے اسکاٹ لینڈ یارڈ والوں کو یقین دلا دیا کہ وہ بالکل مطمئن ہیں، ان کے ہاں اصل پینٹنگ ہی آویزاں ہے.... لیکن یہ سب راز کی باتیں ہیں۔ نائی جل کو ہرگز پتا نہیں چلنا چاہیے کہ میں نے آپ کو اس طرح کی کوئی بات بتائی ہے ورنہ وہ مجھے اس حالت میں بھی گولی مار دے گا...."

ہم اب بھی اپنے مہمانوں کو وہی کہانی سُناتے ہیں جو میں نے آپ کو سنائی تھی۔ آپ خود ہی بتائیے بھلا اب ہم کیسے اعتراف کر سکتے ہیں کہ ہم بوسٹر کیسل سے نقل چرا کر لائے تھے۔ لوگ کیا کہیں گے۔ ہم دونوں میاں بیوی آرٹ اسکول میں ٹیچر تھے، اس آرٹسٹ کینالیٹو کے زبردست عاشق تھے اور ہمیں یہ بھی پتا نہیں چلا کہ اپنا خون پسینہ ایک کر کے ہم جو پینٹنگ چرا کر لیے جا رہے ہیں وہ اصل نہیں بلکہ نقل ہے...!

OFF THE WALL
NEIL JILLETT

جاسوسی ڈائجسٹ : اپریل 1994

ناول سکینگ و کمپوزنگ

محمد سجاد بھٹی

03045503086

خصوصی تعاون: جاسوسی نشست ایڈمن

ڈاکٹر حامد حسن۔ ساگر زمان۔ عقیل قریشی۔ ممتاز علی کیانی۔ سیف الملوک عباسی۔ یاسر حسنین۔ ناصر محمود بلوچ۔ محمد نعمان & صائم بھائی

اردو ادب کے سب رنگ۔ ادبی محفل۔ قلمی جاسوسی دنیا۔ اولڈ سہانے ناول..... فینز گروپ

قسط نمبر: ۱۳۲

نئی سوچ نیا رنگ نیا لہجہ نیا آہنگ
احمد اقبال کے شرربار و شبنم فشاں قلم سے

پسِ پردہ شکارگاہوں کے اسرار، نقاب پوش آدم زادوں کے وحشیانہ کاروبار۔
اجڑے ورد ز کش چہروں کا مہیب نظارہ، ناکردہ گناہوں کا سنگین کفارہ۔
نا آسودہ جذبوں کا پیچ و تاب، لمحوں کی خوشیاں، صدیوں کا عذاب۔
من تہذیب پر رسوائیوں کے داغوں کا قصہ۔ اندھیرے تقسیم کرنے والے روشن چراغوں کا قصہ۔
معاشرے کے ان ناسوروں کی روداد جو گوشت پوست سے گزر کر ہڈیوں میں اتر رہے تھے۔
یک کفن بردوش نوجوان کی کہانی جس کے شب و روز موت کی بستی میں گزر رہے تھے۔
جلتے دن۔ سلگتی راتیں۔ آس و یاس، خوف و ہراس، شیریں خواب۔

زندہ کرداروں پر مشتمل جاسوسی ڈائجسٹ کا منفرد سلسلہ

سحدر بخت میرا نام ہے۔ بچپن میں مجھے کبیر خان بھی کہا جاتا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد جب مسلمانوں کا قتل عام ہوا تو میرے والد وزیر خان کے سوا تمام افرادِ خانہ شہید ہوگئے۔ والد نے لاہور میں معمولی کاروبار سے نئی زندگی کا آغاز کیا پھر ایک حصہ دار میر شرافت علی کے ساتھ وزیر اینڈ کمپنی قائم کی جو زرعی آلات بناتی تھی۔ مجھے اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن بھیجا گیا۔ چار سال بعد مجھے رسواکن حالات میں برطانیہ سے نکلنا پڑا۔ پاکستان پہنچ کر مجھے والد کی دردناک موت سے منسوب پُراسرار حالات کا علم ہوا۔ وہ بدستور صنعت کار تھے مگر انتہائی مفلسی کا شکار رہے اور انہوں نے مجھے پتہ نہیں بتایا تھا کہ میرے پیچھے ان پر کیا گزری۔ پھر ان کا پارٹنر میر شرافت علی قتل ہوا اور اس جرم میں مجھے ملوث کرلیا گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ میرے والد کی کمپنی کا میرا حصے دار چوہدری دلاور ایک وطن دشمن اسمگلر ہے جو مشرقی پاکستان کے علیٰحدگی پسندوں کو اسلحہ فراہم کرتا ہے۔ اس غدار کے دوسرے ساتھیوں میں ایک بدمعاش استاد پیڈرو' ایک بدعنوان ایس پی سراج' ایک بدکردار سابق نواب خسرو جمشید اور اس کا منیجر ڈی سلوا تھے۔ میری مدد میرے بچپن کے دوست محسن نے کی۔ پہلے عبدالودود منظر نام کے ایک ایڈووکیٹ نے میرے مقدمے کی پیروی کی لیکن پھر رابعہ قاری ایڈووکیٹ نے قانونی معاملات اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ رابعہ سے میرا تعلق ایک عشق بلاخیز میں بدل گیا اور اس نے میرا ساتھ نبھانے کی بھاری قیمت ادا کی۔ ہماری ذاتی دشمنی اب وطن دشمن عناصر کے خلاف ایک جدوجہد بن چکی تھی۔ حالات سخت سے سخت تر ہوتے گئے اور ہمارا ساتھ دینے والوں میں ایک صحافی مرزا غالب' ایک لڑکی شہلا جو بعد میں محسن کی شریکِ حیات بنی' فرض شناسی کے جرم میں نکالا جانے والا ایک انسپکٹر اکرام شیخ اور اس کی فتنہ ساماں بہن نازو بھی شامل ہوگئے۔ ہم نے اپنی تنظیم کا نام ایم آر ایس (مائٹ از رائٹ سوسائٹی) رکھا کیونکہ ہمارے نزدیک معاشرے کے ان مجرموں کا علاج قانون کے پاس نہیں تھا۔ وہ خود کو بہت بڑا شکاری سمجھتے تھے لیکن ہم ان کو انہی کے طریقوں سے شکار کرنے لگے تھے۔ اس جنگ میں ہمارا ایک ساتھی ٹیڈی اور دوسرے بہت سے بے گناہ' سچے اور محبِ وطن لوگ مارے گئے تو ہم نے بھی وطن فروشوں کے بہت سے ٹھکانے تباہ کئے۔ خسرو جمشید اور ڈی سلوا کے علاوہ بھی ہم نے بہت سے غداروں اور غیر ملکی ایجنٹوں کو ٹھکانے لگایا۔ اب ہماری زندگی کا مقصد ہی ان معاشرے کے ناسوروں سے برسرِ پیکار رہنا ٹھہرا۔ خواہ اس راستے میں ہماری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔



گزشتہ قسط کا خلاصہ

غزالہ کی طرف سے جو دلاور کی بہن ہونے کا دعویٰ کر رہی تھی، پہلے تو میں شکوک میں مُبتلا رہا اور میں نے اسے کافی ذلیل و شرمندہ بھی کیا مگر بالآخر اس نے مجھے قائل کرلیا کہ وہ درست کہہ رہی ہے۔ اس نے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر تفصیل کے ساتھ مجھے اپنے متعلق ہر بات بتائی۔ کچھ وقت اس کے ساتھ گزار کے میں واپس گھر پہنچا تو سب تشویش میں مبتلا تھے۔ مجھے دیکھتے ہی سب نے رابعہ کے ساتھ لڑائی اور غزالہ کے ساتھ میری ملاقات کے حوالے سے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کردی مگر میں صبح بات کرنے کا کہہ کر سو گیا۔ صبح میں غالب کے ساتھ اخبار کے سلسلے میں مشورہ کر رہا تھا کہ غزالہ یعنی شیلا خان کا فون آگیا۔ میں رفیق سے، جو دلاور کا خاص آدمی تھا اور شیلا خان بھی اسے اپنا خاص آدمی کہتی تھی، کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ میں نے شیلا سے کہا تو وہ مجھے رفیق سے ملوانے پر آمادہ ہوگئی۔ میں نے فون رکھا اور غالب کو ساتھ لے کر منظر کے گھر پہنچ گیا تاکہ رابعہ سے اس کے نامناسب رویے پر بات کرسکوں۔ سامنا ہونے پر رابعہ نے کسی لحاظ، کسی مُروّت کے بغیر نہایت جارحانہ انداز میں مجھ پر بے شمار الزامات عائد کیے۔ جواباً میں نے بھی کوئی رعایت نہیں کی۔ اچانک رابعہ پر ہسٹریا کا دورہ پڑا اور وہ بے ہوش ہوگئی۔ میں غصے اور اشتعال کی حالت میں گھر سے نکلا اور شیلا کے ہوٹل جا پہنچا۔ کچھ دیر بعد میں اور شیلا ہوٹل سے باہر آئے جہاں اس کی سیاہ مرسیڈیز کھڑی تھی۔ میں اس کے برابر بیٹھ گیا اور گاڑی روانہ ہوگئی۔ راستے میں مجھے ڈکی سے کچھ آوازیں سنائی دیں تو میں نے گاڑی رُکوائی اور ڈکی کو کھول کر دیکھا۔ اس میں ایک شخص پڑا تڑپ رہا تھا۔ اس کا جسم لہولہان تھا اور وہ چند سانسوں کا مہمان تھا۔

اب آپ مزید واقعات کا مطالعہ کیجیے

وہ رفیق تھا۔ اس کی دونوں کلائیاں کٹی ہوئی تھیں اور رگوں سے بہنے والا خون ڈِکّی میں بچھے ہوئے سرخ کارپٹ کے رنگ کو زیادہ گہرا کرنے کے بعد اِدھر اُدھر بہنے لگا تھا۔ اس خون کے چھینٹوں نے ڈکی کو اوپر سے اور سائڈ سے لہو رنگ کردیا تھا۔

رفیق کی آنکھیں بند ہورہی تھیں۔ میں نے اس کے منہ میں ٹھونسا ہوا کپڑا نکالا تو میرے ہاتھ خون میں بھر گئے۔ "رفیق....." میں نے چلّا کے کہا۔

آگے سے شیلی نے سر نکال کے مجھے دیکھا "سکندر! کیا ہوا؟"

"شیلی! کسی نے رفیق کو مار کے گاڑی میں ڈال دیا ہے۔ وہ مرنے والا ہے" میں نے چلّا کے کہا۔

شیلی دروازہ کھول کے باہر آئی۔ اس نے ڈکی میں جھانکا اور پھر میرے خون آلود ہاتھوں کو دیکھا "ہم اسے اسپتال لے چلتے ہیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "اتنا وقت نہیں ہے۔"

شیلی نے مجھے دھکیلا "یار! خدا کے لیے ایسے مت کھڑے رہو۔ بند کرو ڈکی۔"

میں نے کہا "شیلی! وہ مر رہا ہے۔"

"ہم اسے مرنے سے نہیں بچا سکتے۔" شیلی نے پُرخوف نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ "چلو بیٹھو' گاڑی میں چلاؤں گی۔ دیکھو' اپنے ہاتھوں کا خیال رکھنا۔ داغ کپڑوں پر نہ لگ جائیں۔"

"یہ تم کیا کر رہی ہو.....؟" میں نے احتجاج کیا۔

"یار' کچھ تو عقل سے کام لو۔ ابھی راہ چلتے کوئی رک گیا یا کسی نے دیکھ لیا تو تم پھنس جاؤ گے۔" شیلی نے گاڑی اسٹارٹ کی "کیا جواب دو گے تم کسی کو؟ اپنے ساتھ میرا بھی بیڑا غرق کراؤ گے۔"

"آخر تم جا کہاں رہی ہو؟"

"جہاں اس سے بات کی جاسکے اور کوئی دیکھنے والا نہ ہو" اس نے گاڑی کی رفتار بڑھا کے اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی۔

سڑک پر گاڑیاں مسلسل آجارہی تھیں۔ موٹر سائیکلیں گزر رہی تھیں۔ بسیں اور تانگے چل رہے تھے۔ یہ میری قسمت تھی کہ عین اس وقت جب میں ڈکی کھولے کھڑا تھا' میرے قریب سے کوئی بس نہیں گزری ورنہ نسبتاً بلند کھڑکی سے جھانکنے والا کوئی بھی مسافر ڈکی کے اندر رفیق کو اور اس خون کو دیکھ سکتا تھا جس میں میرے ہاتھ رنگے ہوئے تھے۔ قریب سے گزرنے والا کوئی راہ گیر بھی رک جاتا تو رفیق کے عالمِ نزع میں تڑپنے کا منظر دیکھ لیتا اور وہ آوازیں سن لیتا جو خراخراہٹ کی صورت میں اس کے حلق سے برآمد ہورہی تھیں۔

"شیلی' خدا کے لیے گاڑی روکو کہیں۔"

"مجھے نروس مت کرو۔ میں جگہ دیکھ رہی ہوں۔"

"جگہ کی فکر مت کرو۔ سڑک کے آخری کنارے پر اس دیوار کے ساتھ روک لو۔ وہ مر جائے گا شیلی تو ہمیں کچھ معلوم نہیں ہوگا۔"

"یار' تم جذباتی ہورہے ہو۔ کسی نے ہمیں پھنسانے کی کوشش کی ہے۔ پھانسی چڑھ جائیں گے ہم دونوں" اس کی حالت خوف سے غیر ہورہی تھی اور مجھے ڈر تھا کہ اتنی رفتار کے ساتھ وہ کسی کو ٹکر مار کے نئی مصیبت نہ کھڑی کردے۔

میں نے اپنے ہاتھوں کو جسم سے دور کرلیا تھا۔ ہوا سے خون میری ہتھیلیوں اور انگلیوں پر خشک ہونے لگا تھا۔

شیلی نے اچانک ایک جگہ گاڑی کو تھوڑا سا دائیں طرف گھمایا اور پھر بریک لگا کے ریورس گیئر میں ڈال دیا۔ گاڑی تیزی سے پیچھے گئی اور کسی اسکول کی چار دیواری سے جا لگی جہاں ضرورت مندوں نے مجبوری میں اخراجِ آب کرتے ہوئے اس عبارت کو بھی نظر انداز کردیا تھا جس میں رائے عامّہ کو متوجہ کرنے کے لیے لکھا گیا تھا "دیکھو کتا پیشاب کر رہا ہے" دوسری جگہ "یہاں پیشاب کرنا سخت منع ہے" کی عبارت پر فلمی پوسٹر آگئے تھے۔

شیلی تیزی سے اتری "جاؤ' اب دیکھو اسے۔" میں بونٹ کھول

کے انجن کو دیکھتی ہوں۔"

"انجن کو کیا ہوا؟"

"یار، بُدھو ہو تم بھی۔ کوئی دیکھے گا تو سمجھے گا کہ گاڑی میں خرابی ہو گئی ہے۔ متوجہ ہو گا تو میری طرف..."

میں اس وقت تک پیچھے پہنچ چکا تھا۔ میں نے ڈکی کھولی تو خود دیوار سے لگ گیا۔ رفیق اب ساکت تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں نے پہلے اس کی نبض دیکھنے کا ارادہ کیا تھا مگر میرے ہاتھ آگے بڑھ کر رک گئے۔ اس کی کلائیاں عین نبض کے مقام پر کسی تیز دھار خنجر یا بلیڈ سے کاٹ دی گئی تھیں اور ان میں سے باقی ماندہ خون اب بھی رِس رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ رفیق کے ساتھ یہ سفاک قاتلانہ واردات تقریباً اسی وقت ہوئی تھی جب وہ گاڑی لے کر آیا تھا۔ شاید قاتل اس کے پیچھے تھے یا اس کے ساتھ تھے کہ انہوں نے رفیق کو باندھ کے ڈکی میں ڈالا اور اس کی کلائیاں کاٹ کے چابی اندر بھجواتے ہی فرار ہو گئے۔

میں نے اسے آواز دی "رفیق... رفیق، میری طرف دیکھو۔"

مجھے لگتا تھا کہ میری یہ حرکت دیوانگی کے سوا کچھ نہیں۔ بھلا آواز دینے سے کہیں مُردے بھی آنکھیں کھولتے ہیں لیکن اچانک رفیق کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور اس نے مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں موت کے ویران سائے اتر چکے تھے اور بظاہر یہ زندگی کی آخری رمق تھی جس کو بروئے کار لاتے ہوئے اس نے میری آواز سُنی اور اس آواز کی طرف دیکھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ عالمِ نزع میں جب موت کا اندھیرا غالب آرہا ہو تو آدمی کے حواس کس حد تک اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ اگر عکس آنکھ کے پردے پر بنتا ہے تو بصری نظام کا پیغام دماغ کے اس حصے تک پہنچتا ہے یا نہیں جہاں عکس محفوظ رہتے ہیں۔ شعور، لاشعور اور تحت الشعور کے خانوں میں یادوں کا لامحدود ذخیرہ موجود ہوتا ہے۔ کیا اس وقت یہ ممکن ہوتا ہے کہ واقعات، مقامات اور صورتوں کے نقوش کی لائبریری سے آدمی ایک آواز کے مانوس حوالے سے رشتے کو شناخت کرسکے؟

میں نے رفیق کے اوپر جُھکنے کے لیے اپنا آدھا دھڑ ڈکی میں ڈال دیا۔ "میری آواز سن رہے ہو تم رفیق! میں سکندر بخت ہوں۔"

مجھے یوں لگا جیسے اس نے خفیف سی جنبش سے مجھے اثبات میں جواب دیا ہو۔ اس کے لب ہلے اور اس نے قوت ارادی سے کام لیتے ہوئے زندگی کے آخری لمحات میں کچھ کہنے کی کوشش کی جو اس کے نقطۂ نظر سے اہم تھا۔ اس کے ہونٹ بھی بالکل سفید ہو رہے تھے اور چہرہ بے جان ہو چکا تھا۔

"رفیق! یہ کس نے کیا، چوہدری دلاور نے؟... بولو۔"

"بھا...... جا......" اس کے حلق کی غراہٹ میں یہی دو لفظ میری سمجھ میں آئے۔

"بھائی جان... کون بھائی جان؟" میں نے کہا "دلاور کا بھائی؟"

"جا... جا... با... جا... کے" اس نے سر اٹھانے کی بے سود کوشش کی اور پھر ایک انگلی اٹھائی۔

اس کے ساتھ ہی سانسوں کا وہ کوٹا ختم ہو گیا جو قدرت کی طرف سے اسے دنیاوی زندگی گزارنے کے لیے عطا کیا گیا تھا۔ خالق کائنات یوں اپنے قادرِ مطلق ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ کسے صرف ماں کے پیٹ میں سانس عطا ہوں گے، کون اس عالمِ آب و گل میں چند سانس لینے کے بعد پھر اسی کی طرف لوٹ جائے گا جس نے اسے مٹی سے پیدا کیا اور پھر مٹی میں شامل کردیا۔ ہے کوئی اعجازِ مسیحائی کا دعوے دار جو گوشت کے ایک لوتھڑے کو دنیا میں جینے کے لیے سو سال دے سکے، یا جہاں مرگِ ناگہاں آئے، وہاں زیادہ نہیں صرف سو سانسوں کی مہلت بڑھا سکے؟

میرے دل میں ایک شیشہ سا ٹوٹ کے بکھر گیا تھا اور کرچیاں کانٹوں کی طرح میری روح میں اتر گئی تھیں۔ رفیق کی کھلی آنکھیں مجھے الزام دیتی محسوس ہوتی تھیں کہ... بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔ کاش ہم پہلے سے باہر موجود ہوتے اور کلب سینڈوچ کھانے اور کافی ختم کرنے میں چند منٹ بھی نہ گنواتے۔ شلی کی احتیاط بجا لیکن ایک منٹ پہلے شاید رفیق میرے سوال کا جواب دے سکتا تھا۔ وہ بات کہہ سکتا تھا جو مبہم الفاظ بن کے اس کے لبوں پر ادھوری رہ گئی۔

میں نے اس کی آنکھیں بند کرتے ہوئے ان بے معنی الفاظ پر غور کیا اور نامکمل لفظوں کے آگے پیچھے دوسرے حروف شامل کرکے کوئی مطلب اخذ کرنے کی کوشش کی مگر با... جا... بھا... یا با اور جا سے کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ آخر وہ کیا بتانا چاہتا تھا؟ اس کے اشارے کا مقصد کیا تھا جب اس نے ایک انگلی اوپر اٹھائی تھی۔

میں نے سر اٹھا کے اوپر دیکھا تو ڈکی کے اندر والے حصے پر خون کے چھینٹوں کے درمیان مجھے ایک خونی تحریر نظر آئی۔ یہ ٹیڑھے میڑھے الفاظ تھے جو کچھ پھیل گئے تھے اور صاف پڑھے بھی نہیں جاتے تھے لیکن اچانک میرا تجسس بیدار ہو گیا تھا۔ رفیق بے بس تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ مرنے والا ہے۔ اس کے لبوں پر دستِ قاتل نے مہر لگا دی تھی مگر اس نے ہار نہیں مانی کہ خون دل میں ڈبوئی ہیں انگلیاں ہم نے۔ اب یہ لہو سراغ دے گا قاتلوں کا۔ رفیق نے اپنی انگلیوں تک بہہ آنے والے خون کی سرخی کو استعمال کرتے ہوئے ڈکی کے اندر تین حروف لکھے۔ اس وقت شاید اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے پاس وقت ہوتا تو جگہ اتنی نہ تھی کہ وہ پورا نام لکھ سکتا۔ ڈکی کی اندرونی سیاہ سطح پر مشکل سے تین حروف لکھے جاسکتے تھے۔

ایک حرف کو آڑا پڑھا جاتا تو وہ این تھا۔ دوسری طرف سے وہ زیڈ بھی ہوسکتا تھا۔ دوسرا حرف جو ڈکی کے اندرونی حصے میں

دستیاب جگہ پر لکھا گیا تھا' وہ واضح طور پر انگریزی کا یو تھا لیکن تیسری جگہ رفیق نے پھر زیڈ یا این لکھا تھا۔ وہ اٹھ کے بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ اس کے ہاتھوں سے خون ابل رہا تھا اور گاڑی کی ڈکی میں اندھیرا تھا۔ اسے جھٹکے لگ رہے تھے اور اس کے لیے ہاتھ اوپر اٹھاکے تین حروف لکھنا بھی سخت ترین مرحلہ تھا مگر اس نے کوشش کی اور کامیاب رہا۔

میں نے ڈکی بند کی ہی تھی کہ صورت سے رشوت خور اور خبیث نظر آنے والے ایک ٹریفک سارجنٹ نے اپنی موٹر سائیکل عین کار کے سامنے روکی۔ شیلی کار کے انجن میں کچھ نہیں کر رہی تھی۔ وہ بار بار مجھ سے کچھ پوچھ رہی تھی مگر میں نے اس کی آواز سننے کے باوجود اسے جواب نہیں دیا تھا۔ میری ساری کوشش اور توجہ رفیق سے چند حروف اگلوانے کے لیے تھی جن سے اس قتل کے یا قاتل کے بارے میں کوئی مفید بات معلوم ہو سکے۔

پولیس کو دیکھ کر شیلی گھبرا گئی۔ اس نے ایک دم بونٹ بند کر دیا۔

"یہ گاڑی آپ کی ہے؟" سارجنٹ نے کہا۔

"نہیں.... ہاں.... میرا مطلب ہے نہیں۔"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا "اتنا گھبرا کیوں گئی ہو جناب؟ ایک ساتھ ہاں بھی اور نہیں بھی۔"

شیلی نے خود کو سنبھالا "وہ دراصل.... میں مالک نہیں ہوں اس گاڑی کی۔ یہ کرائے کی گاڑی ہے.... لیکن استعمال تو میں کر رہی ہوں۔"

"اچھاجی! کاغذات ہیں آپ کے پاس؟"

"کاغذات!... پتا نہیں" شیلی نے بے بسی سے مجھے دیکھا۔

"پتا نہیں کیا... معاملہ کچھ مشکوک ہے۔" اس نے یہ آخری بات اپنے آپ سے لیکن شیلی کو سنانے کے لیے کی تھی۔

میں اپنے ہاتھ صاف کرنا چاہتا تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ رومال سے خون کو صاف نہیں کیا جا سکتا۔ اتفاق سے ڈکی میں "ہنڈرڈ آکٹین" پیٹرول کا بند ڈبا رکھا ہوا تھا۔ میں نے اسے کھول کر پیٹرول سے ہاتھ صاف کیے۔ اگر میں گاڑی کے پچھلے حصے میں' دیوار کے ساتھ نہ ہوتا تو سارجنٹ یقیناً دیکھ لیتا کہ میرے ہاتھوں کو صاف کرنے والے پیٹرول میں سرخی شامل ہے۔ میں نے یہ ظاہر کیا کہ گاڑی میں کام کرتے ہوئے میرے ہاتھوں پر کالک یا تیل کے داغ لگ گئے تھے جن کو اسی طرح صاف کیا جا سکتا ہے۔ پیٹرول کی بو میں خون کی مہک بھی دب گئی تھی۔

اپنے ہاتھوں کو چھپاتے ہوئے میں دوسری طرف گیا اور اندر سے گاڑی صاف کرنے کا کپڑا لے کر اپنے ہاتھ کہنیوں تک صاف کیے۔ میرے انداز بے نیازی سے ظاہر ہوتا تھا کہ میں شیلی کی طرف سے مطمئن ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ وہ ٹریفک سارجنٹ سے نمٹ لے گی۔

شیلی نے کہا "دیکھو آفیسر! گاڑی لے کر آتا ہے ڈرائیور۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ کاغذات ہیں یا نہیں۔ ظاہر ہے جو کمپنی گاڑی بھیجتی ہے وہ ایسے ہی تو نہیں بھیج دیتی ہوگی۔ میں نے نہ کبھی ڈرائیور سے پوچھا' نہ کاغذات دیکھے۔"

"خیر' اب دیکھ لیں۔ کیا یہ ڈرائیور ہے گاڑی کا؟"

میرے جواب دینے سے پہلے شیلی نے کہا "یار' یہ میرے شوہر ہیں۔ کمال کرتے ہو۔"

سارجنٹ اس کے "یار" کہنے پر چونکا "گاڑی کون چلا رہا تھا؟"

"میں چلا رہی تھی اور کون چلا رہا تھا" شیلی اب جارحانہ موڈ میں تھی "تم بولو مسئلہ کیا ہے؟ کوئی جرم کیا ہے میں نے؟"

"جرم نہیں کیا تو کیا میں نے آپ کو گپ شپ کے لیے روکا ہے جی!"

"یار' میں یہاں پہلے سے رُکی ہوئی تھی۔ تم بعد میں آئے ہو۔"

"آخر تم کیا چیز ہو؟ تمہیں پتا ہے یار کیا ہوتا ہے؟" سارجنٹ چڑ گیا "ایسے یاریاں لگاتی پھرتی ہو۔"

شیلی چراغ پا ہوگئی۔ "زبان سنبھال کے بات کرو میرے ساتھ۔ میں ڈاکٹر شیلا خان ہوں اور میں برٹش نیشنل ہوں۔ ابھی برطانوی سفیر کو مطلع کردوں گی تو وزارت خارجہ تک بات پہنچ جائے گی۔"

اب سارجنٹ کی حالت دیکھ کے مجھے ہنسی آئی "سرجی' کیوں ہر ایک کے متھے لگتے ہو۔ یہ تو دیکھ لو کہ گاڑی مرسیڈیز ہے۔ تمہارے آئی جی صاحب کے پاس بھی ہوگی تو رشوت سے خریدی ہوگی۔"

"تم نے.... تمہاری وائف نے ون وے کی خلاف ورزی کی تھی۔"

"کب کی تھی... اور کہاں؟"

"پچھلے چوک سے پہلے۔"

"تم وہاں کھڑے تھے تو وہیں کیوں نہیں روکا تھا؟"

"مجھے رپورٹ ملی تھی۔ ڈیوٹی پر موجود کانسٹیبل سے۔ اس نے گاڑی کا نمبر نوٹ کرلیا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ انہوں نے رفتار کی حد سے زیادہ تیز ڈرائیونگ کی۔"

"چھوڑو یار۔ ایک کانسٹیبل کی بات پر اعتبار کرتے ہو" شیلی نے پھر اسے یار کہہ دیا "ہم تو اُدھر سے گزرے ہی نہیں۔ اِدھر سے آئے ہیں۔ کیا تم اسے جھوٹ ثابت کرسکتے ہو؟"

اچانک مجھے خیال آیا کہ جس لڑکی نے تمام عمر لندن میں گزاری ہو' وہ فرنچ بھی جانتی ہوگی۔ زیادہ نہ سہی تھوڑی بہت ضرور سمجھ لیتی ہوگی۔ میں نے اس سے پوچھا "تمہیں فرنچ آتی ہے؟"

"کیوں نہیں!" اس نے حیرت کے ردِعمل کو چھپالیا "میں تمہیں فرنچ سکھاسکتی ہوں۔"

"تو پھر اس سے مت اُلجھو۔ اسے صرف سو کا ایک نوٹ دے دو جس کے لیے یہ کھڑا ہے اور خواہ مخواہ کے قانونی مسائل پیدا کررہا ہے۔"

"میرے پاس ٹریولر چیک ہیں اتفاق سے۔ کیا میں اسے فلیٹیز کا پتا دے دوں؟ بعد میں آ کے لے جائے۔ جی چاہتا ہے اس کا پیٹ پھاڑ دوں۔"

میں نے ہنس کے کہا "سرکاری پیٹ ہے۔ عوام کے خرچے پر پلا بڑھا ہے۔ میں دے دیتا ہوں جرمانہ۔"

سارجنٹ کی حالت اب واقعی غیر ہوگئی تھی۔ اس نے فلیٹیز ہوٹل کا نام بھی سن لیا تھا اور ہماری فرنچ اس کے خاک پلّے نہیں پڑی تھی۔

میں نے اپنی جیب میں سے سو کا ایک نوٹ نکالا "لو جناب مال، اب تو کوئی جرم نہیں کیا نا ہم نے؟ اب جاؤ، اللہ حافظ۔"

اس نے ادھر اُدھر دیکھا اور نوٹ لے لیا "ڈاکٹر صاحب تو ایسے ہی ناراض ہورہی ہیں۔ آخر ہمارا بھی فرض بنتا ہے کوئی۔"

"فرض نہیں۔ ایک نقطہ بڑھادو۔ قرض... پبلک تمہاری مقروض رہتی ہے۔ ہر وقت اور ہر جگہ۔ اور قرض وصول کرنے کے لیے تمہیں وردی پہن کے خوار ہونا پڑتا ہے۔ بڑی سخت ڈیوٹی ہے تمہاری" میں نے کہا۔

اچانک اس نے کہا "یہ داغ کیسا ہے؟"

میں نے کہنی کے پاس خون کی سرخی کو دیکھا۔ اس وقت میں ذرا بھی گھبرا جاتا تو اس کے دل میں شکوک پیدا ہوتے "یہ خون ہے۔"

"خون... کس کا؟"

"ابھی کٹ لگ گیا تھا" میں نے جیب سے رومال نکال کے بڑے اعتماد کے ساتھ اس سرخی کو صاف کیا۔

"کٹ تو مجھے نظر نہیں آرہا ہے۔"

"پھر کیا نظر آرہا ہے؟" میں نے برہمی سے کہا "سو سے زیادہ کے چکر میں پڑو گے تو مشکل میں پڑو گے۔ میری بیوی پاکستان میں نہیں رہی لیکن میں یہیں کی پیداوار ہوں۔ یقین نہیں تو زمان خان سے پوچھ لینا۔ اور کچھ ضرورت ہو تو ان سے میرا نام لے کر مانگ لینا۔"

وہ فوراً روانہ ہونے کے لیے موٹر سائیکل کو کک مارنے لگا "ایک بات پوچھوں سرجی؟ ناراض مت ہونا۔"

"یار، پوچھو جلدی سے اور سامنے سے گاڑی ہٹاؤ" شیلی نے بے زاری سے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی کہ آپ اُدھر سے آئے ہی نہیں ہو؟" اس نے شیلی کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔

میں نے کہا "کیا تم ثابت کرسکتے ہو کہ ہم اُدھر سے آئے تھے؟"

اس نے روانہ ہوتے ہوئے کہا "ثابت تو آپ بھی نہیں کرسکتے سرجی کہ آپ کے بازو پر کوئی کٹ تھا اور خون آپ کا ہی ہے۔"

جب وہ چلا گیا تو مجھے یوں لگا جیسے فرشتۂ اجل میرے دروازے پر دستک دے کر لوٹ گیا ہو۔ معلوم نہیں کیوں اس نے اپنے شکوک کی تصدیق نہیں کی۔ عام حالات میں کسی وجہ کے بغیر ہی پولیس والے اپنے اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے جسے چاہتے ہیں "مشکوک" بنادیتے ہیں۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ رات گئے اخبارات کی آخری کاپی پریس میں بھیج کر گھر لوٹنے والے صحافی اور بعض اوقات سنیما کا آخری شو دیکھ کر آنے والے انہیں مشکوک حالت میں پھرتے نظر آجاتے ہیں یا محسوس ہوتے ہیں۔ بس اسٹاپ پر کھڑا ہوا کلرک، کام کے انتظار میں سرِراہ بیٹھا ہوا راج مزدور، نائٹ کالج میں پڑھانے والا پروفیسر۔ مشکوک کسی کو بھی قرار دیا جاسکتا ہے اور پھر اس الزام سے عزت و آبرو کے ساتھ بچنے کا جرمانہ ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق ادا کرتا ہے۔ میرا ذاتی تجربہ یہ تھا کہ ان کے چنگل سے بچ نکلنے کا ہُنر صرف صحافی جانتے ہیں جن کی رسائی افسرانِ بالا اور حکومت کے اعلیٰ حکام تک ہوتی ہے اور جو خبر چھاپ کے رائی کا پہاڑ بھی بنادیتے ہیں۔

ہم واضح طور پر انسپکٹر کے شک کی زد میں آچکے تھے لیکن وہ شیلی کی برطانوی شہریت سے ڈر گیا اور فرنچ نے ہمارے "غیر ملکی" ہونے کا ثبوت فراہم کردیا۔ بیک وقت پاکستانی اور برطانوی شہریت رکھنے والے عام لوگ نہیں ہوتے اور شیلی نے تو باقاعدہ دھمکی بھی دے دی تھی کہ وہ برطانوی ہائی کمشنر سے شکایت کردے گی۔ میں

بھولے بھالے بچوں کو جب یہ بتایا جاتا ہے کہ روم کی داغ بیل ۷۵۳ قبل مسیح میں پڑی تو ننھے بچے ہاتھ اٹھا کر سوال کرتے ہیں کہ اس زمانے کے لوگوں کو یہ کیسے پتا چل گیا تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کے پیدا ہونے میں ابھی ۷۵۳ سال باقی ہیں۔ آگے چل کر جب یہی بچے پڑھتے ہیں کہ سکندرِ اعظم ۳۵۶ قبل مسیح میں پیدا ہوا اور ۳۲۳ قبل مسیح میں فوت ہوا تو وہ اسے کتابت کی غلطی سمجھتے ہوئے استاد سے پوچھتے ہیں کہ یہ پیدا ہونے سے پہلے کس طرح مرگیا۔ استاد جواب دیتے ہیں کہ پیارے بچو! اگلے وقتوں میں ظالم بادشاہ اسی طرح مرا کرتے تھے۔

مشتاق احمد یوسفی کی کتاب "چراغ تلے" سے ایک اقتباس

نے برطانوی شہری ہونے کا کوئی دعویٰ نہیں کیا تھا مگر شیلی نے علی الاعلان مجھے اپنا شوہر تسلیم کرلیا تو پھر یہ از خود ثابت ہوگیا کہ میں بھی عام آدمی نہیں۔ مرسیڈیز، فلیچرز کا حوالہ، برطانوی شہریت اور ڈاکٹر شیلی کے نام کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ انسپکٹر نے ہم سے پنگا لے کر اپنی نوکری کو خطرے میں ڈالنے سے گریز کیا اور سو روپے غنیمت جان کے رخصت ہوگیا۔

لیکن وہ میرے لیے پریشانی کے بہت سے اسباب چھوڑ گیا تھا۔ گاڑی چلتے ہی میں نے کہا "شیلی! رفیق مرگیا۔"

"میں بہت نروس ہوں یار..."

"خدا کے لیے ہر ایک کو یار کہنا چھوڑ دو" میں نے کہا "یہ امریکا یا برطانیہ نہیں کہ جسے چاہا بڈی یا پال کہہ دیا۔ خصوصاً عورتیں..."

"آئی ڈیم کیئر۔ تمہارے اس منافق معاشرے پر سو بار لعنت بھیجتی ہوں میں" شیلی کا موڈ بے حد خراب تھا۔ مرد 'یار' کہے تو اس کا مطلب ہے دوست اور عورت کہے تو یاری کا مطلب ناجائز تعلقات۔ یہ مطلب نکالنے والے بھی تم مرد... میں پوچھتی ہوں..."

"اچھا بحث مت کرو۔" میں نے بگڑ کے کہا "یہ وقت ہے اس معاشرے کی اخلاقی اقدار پر نکتہ چینی کا۔ تمہاری کار کی ڈکی میں ایک لاش پڑی ہوئی ہے اور وہ لاش کسی اجنبی کی نہیں، اس شخص کی ہے جسے تم اپنا خاص آدمی کہتی تھیں۔ تمہیں افسوس نہیں ہے اس کی موت کا؟"

"افسوس ہے تو کیا میں جاہل عورتوں کی طرح چلّا چلّا کے رونے لگوں، سینہ کوبی کروں؟ یار، وہ میری وجہ سے مارا گیا۔ مجھ سے زیادہ رنج کسے ہوسکتا ہے" شیلی نے افسردگی سے کہا۔

"جس نے اسے قتل کیا وہ تمہیں بھی قتل کرسکتا ہے۔ یہ اس کی طرف سے پیغام ہے، دھمکی ہے" میں نے کہا۔

"اسی لیے تو میں نروس ہوں۔ کسی کو معلوم ہوگیا تھا کہ وہ مجھ سے ملتا ہے..."

"معلوم تو ہونا ہی تھا۔ تم کیا سمجھتی ہو، دنیا اندھی ہے یا بے وقوف ہے؟" میں نے کہا۔

"تم ملنا چاہتے تھے اس سے۔ میرے کمرے میں؟" وہ تلخی سے بولی۔

"وہ کچھ بتانے کی کوشش کرتا رہا۔" میں نے پیچھے مڑ کے دیکھا "کوئی ہمارا پیچھا تو نہیں کررہا ہے؟"

"یار، مجھے کیا معلوم؟" وہ بولی۔

"اچھا مجھے ڈرائیونگ کرنے دو" میں نے کہا "گاڑی روکو اور میری جگہ آجاؤ۔"

اس نے ایسا ہی کیا "فرض کرو، کوئی تعاقب میں ہوا تو تمہیں کیسے معلوم ہوگا؟"

میں نے کہا "تم دیکھتی رہو۔ اس مصیبت سے چھٹکارا تو حاصل کرنا ہی پڑے گا کسی نہ کسی طرح۔"

میں نے مرسیڈیز کو لاہور کی جانی پہچانی سڑکوں پر دوڑانا شروع کیا۔ اگلے آدھے گھنٹے میں ایرمال، آرائے بازار اور ائرپورٹ سے واپس آتے ہوئے میں نے اندازہ کرلیا کہ اب کوئی بھی ہمارے تعاقب میں نہیں ہوسکتا۔ میں نے رفیق کے آخری الفاظ بھی شیلی کو بتادیے تھے جو اس نے مجھ سے کہے تھے اور جو اپنے خون سے لکھے تھے۔ شیلی نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی مگر وہ ان الفاظ میں کوئی ربط تلاش نہ کرسکی۔

"این یو این۔ یا زیڈ یو این" شیلی نے ایک ڈائری میں لکھ کے ادھر اُدھر سے دیکھا "این یو زیڈ۔ زیڈ یو زیڈ۔"

ایک دم میرے ذہن میں حروف نیون سائن کی طرح جگمگائے اور پھر مسلسل جلنے بجھنے لگے۔ "زیڈ یو این۔ ویٹ از رائٹ۔ رفیق انہی کا تو پی اے تھا۔ زیڈ یو نقوی صاحب کا۔"

شیلی نے ماتھے پر ہاتھ مارا "حد ہوگئی یار۔ یہ تو سامنے کی بات ہے۔"

"یہی تو انسانی ذہن کا مسئلہ ہے۔ وہ الجھن اور پیچیدگی میں پڑجاتا ہے۔ چراغ تلے اندھیرا نظر نہیں آتا اور وہ ہر طرف روشنی ڈھونڈتا رہتا ہے۔"

"مگر اسے نقوی صاحب کا نام لکھنے سے کیا فائدہ ہوا؟"

میں نے کہا "اسے کیا فائدہ ہوتا۔ وہ تو مرتے مرتے کچھ بتا گیا ہے۔ اب سمجھنا ہمیں چاہیے۔"

"یار، مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ میں واپس کیسے جاؤں گی؟ وہاں تو میں بالکل اکیلی ہوں۔" شیلی نے کہا۔

"تم نے مزید عقلمندی یہ کی تھی کہ فلیچرز کا نام بھی لیا تھا۔ اس انسپکٹر کے سامنے۔"

"میں نے... مجھے یاد نہیں" وہ بے خیالی میں بولی۔

"تم نے کہا تھا کہ اسے فلیٹینز بلا کے پیسے دوں گی لیکن اس سے بھی فرق نہیں پڑتا۔ جنہوں نے رفیق کو عین فلیٹیز کے دروازے پر قتل کیا انہیں معلوم ہے کہ تم اسی ہوٹل میں ہو۔"

"ہوٹل کے دروازے پر... یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" وہ بولی۔

"ممکن ہے چند منٹ پہلے قتل کیا ہو۔"

"لیکن کس لیے؟ یار، یہ کوئی آسان کام تو نہیں تھا نا۔ میرا مطلب ہے، ایک آدمی کی کلائی کاٹنا... اسے باندھنا..."

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ کچھ لوگ اس کے ساتھ ہی آئے تھے۔ وہ کم سے کم دو ہوں گے۔ انہوں نے رفیق کو پہلے ہی باندھ کے اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کے ڈکی میں ڈال دیا ہوگا۔ ہوٹل کے باہر گاڑی پارک کرکے انہوں نے صرف یہ کیا کہ ڈکی کھولی اور کسی خنجر سے اس کی کلائیاں کاٹ دیں۔ شاید ایک نے یہ کام کیا اور دوسرے نے چابی اندر پہنچادی۔ راستے میں تو رفیق کو

باندھ کے ڈالنا مشکل تھا۔ وہ گھر سے ہی ساتھ روانہ ہوئے ہوں گے اور ظاہر ہے' وہ ایسے لوگ تھے جن پر اعتماد کیا جا سکتا تھا۔"

"وہ سکندر! اب میرا کیا ہو گا؟ میں وہاں کیسے واپس جاؤں گی؟ میرا تو سامان بھی ہوٹل میں پڑا ہوا ہے۔"

"یہ بعد میں سوچیں گے" میں نے کہا۔

اس نے تائید میں سر ہلایا "ہاں۔ پہلے اس سے تو جان چھڑالیں۔ کیا تم پولیس اسٹیشن جا رہے ہو؟"

"پولیس اسٹیشن! تمہارا دماغ خراب ہے کیا؟"

"پھر۔۔۔ لاش کو کہاں چھوڑو گے؟ رفیق کے گھر کا بھی پتا نہیں مجھے" شیلی نے کہا "اپنے بھائی کے ساتھ رہتا تھا۔ بھابی سے بالکل نہیں بنتی تھی۔"

"بیوی بچے تھے؟"

"نہیں یار۔ ابھی شادی نہیں کی تھی بے چارے نے" شیلی نے کہا۔

"اچھا ماں باپ' بھائی بہن۔۔۔؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "میرا خیال ہے کہ کوئی نہیں۔"

"چلو یہ بھی اچھا ہی ہے۔ مرنے والا تو مر جاتا ہے' دکھ جھیلنے کے لیے رہ جاتے ہیں لواحقین۔ بھائی کی بیوی تو خدا کا شکر ادا کرے گی کہ جان چھوٹی۔ پھر بھائی بھی صبر کر لے گا" میں نے کہا "میرا کام کچھ آسان ہو گیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب بھی معلوم ہو جائے گا۔ یہ بتاؤ' تم نے رفیق کو ٹیلی فون کر کے بلوایا تھا؟" میں نے کہا۔

"اور کیسے بلواتی یار۔ خود جاتی؟"

"کہاں فون کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"نقوی صاحب کے گھر" شیلی نے کہا "یہ تم کدھر جا رہے ہو؟"

"اپنے گھر۔ خاموش بیٹھی دیکھتی رہو۔ اب جو کچھ میں کروں گا اپنی ذمے داری پر کروں گا" میں نے کہا "تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ اس وقت تم کتنی بڑی مصیبت میں گرفتار ہو سکتی تھیں۔"

اس نے مجھے شکر گزار نظروں سے دیکھا "تھینک یو یار!"

"اب اپنے دماغ سے نکال دو یہ خیال کہ تمہارے بھیا کو تمہارے پاکستان میں موجود ہونے کا علم نہیں تھا۔ اسے تو تمہارے کمرے کا نمبر بھی معلوم ہو گا ڈاکٹر شیلا خان عرف غزالہ سہگل۔"

"تم کیوں مجھے دہشت زدہ کر رہے ہو؟"

"میں تمہیں حقائق سے باخبر کر رہا ہوں۔ دہشت زدہ ہونے سے کچھ نہیں ہو گا ڈیئر شیلی۔ جب جب جو جو ہوتا ہے تب تب سو سو ہوتا ہے۔ یہ بڑا عظیم مقولہ ہے۔"

"کس کا؟"

"کسی کا بھی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے اور خدا کو کیا منظور ہوتا ہے' یہ کوئی جان نہیں سکتا چنانچہ فکر مند یا پریشان ہونے کا کوئی فائدہ نہیں" میں نے کہا "جہاں میں تمہیں لے جا رہا ہوں وہ میرا آبائی گھر تھا۔ بلکہ ہے گھر میں وہاں نہیں رہتا۔"

"پھر اب کون رہتا ہے وہاں یار؟"

"یادیں" میں نے کہا "ممکن ہے تمہیں وہ گھر آسیب زدہ لگے۔ یادیں خوش گوار نہ ہوں تو آسیب بن جاتی ہیں۔"

"وہاں کیا کام ہے؟"

"آج میں اور تم وہیں رہیں گے۔ تمہیں ڈر تو نہیں لگے گا نا؟"

اس نے مجھے بے یقینی سے دیکھا "یار' ڈر کس سے۔۔۔ تم سے؟"

"اس لاش سے۔۔۔ رفیق کی لاش بھی تو ہو گی" میں نے کہا۔

"معلوم نہیں تم کیا کرنا چاہتے ہو۔ رات بھر ہم اس لاش کے ساتھ بیٹھ کے کیا کریں گے؟"

میں نے کہا "مجھے ذرا سوچنے دو۔ رنگے ہاتھوں پکڑے جانے سے تو بچ گئے ہیں لیکن اب اس لاش کا ڈسپوزل باقی ہے۔ کیا یہ کار واقعی کرائے کی ہے؟"

"ہاں۔ ابھی ایسے ہی کام چلا رہی تھی میں۔ سیٹل ہو جاتی تو شاید کوئی گاڑی خرید بھی لیتی۔"

"جس رینٹ اے کار سروس سے تم نے گاڑی منگوائی تھی' وہ تمہیں جانتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"نہیں یار۔ میں نے تو رفیق سے کہا تھا۔ رفیق سے انتظام کرایا تھا۔ نام پتا اس کا تھا' ضمانت اسی کی تھی۔"

"جو بھی گاڑی لے کر آتا تھا' وہ تمہیں جانتا تو ہو گا؟"

"نہیں۔ رفیق کہہ دیتا تھا کہ گاڑی ہوٹل پہنچا دو۔ کوئی ڈرائیور چابی ریسپشن پر چھوڑ جاتا تھا۔"

ایک عرصے بعد میں پھر ماڈل ٹاؤن میں تھا جہاں کے سب راستے میرے جانے پہچانے تھے۔ گھنے' پُرانے درختوں کے نیچے خستہ حال سڑکوں پر شام کے سائے اترنے لگے تھے۔ پرانی وضع کی کوٹھیوں کے سبزہ زاروں میں نئی بہاروں کا شوخ رنگ نمایاں ہو رہا تھا۔ جھاڑیوں اور پودوں نے پتوں کا لباس پہن لیا تھا لیکن مجموعی طور پر گردوپیش کے ماحول میں کوئی نمایاں تبدیلی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ کہیں کسی کوٹھی پر نیا رنگ ہوا تھا یا کسی نے سامنے کے حصے کو بدل کے جدید طرزِ تعمیر کا تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔

مرحوم نواب خسرو جمشید کا جلا ہوا محل اسی طرح ویران اور غیر آباد پڑا تھا۔ اس کے ایک گوشے میں ان کے جدِ امجد کی قبروں پر سنگِ مرمر کی بارہ دری کے سائے میں ایک ملنگ ٹائپ فقیر سویا پڑا تھا۔ کسی دن وہ اس قبر پر گوٹے والی لال ریشمی چادر ڈال دے گا۔ اس کے سرہانے اگربتیاں جلا دے گا اور چاروں طرف رنگین

جھالریں لٹکا کے چھت پر کوئی جھنڈا لگادے گا۔ زیادہ چالاک اور پروفیشنل ہوگا تو کتبہ بدل ڈالے گا اسی میں نام کے آگے پیچھے القاب و آداب کا اضافہ کرکے سابق نواب کی قبر کو کسی فرضی پیر کے آستانے میں بدل کے خود گدی نشین ہوجائے گا۔ دو چار سال بعد یہ جگہ مرجع خلائق بھی بن جائے گی۔

میرے اپنے گھر کا پھاٹک بند تھا۔ میں نے کار سے اتر کے اسے خاصی مشکل سے کھولا مگر اس بات کا خاص خیال رکھا کہ گاڑی کے گزر جانے کے بعد پھاٹک پھر پہلے کی طرح بند نظر آئے۔ نیم پختہ سڑک سے پھاٹک تک کچے راستے پر ٹائروں کے نشانات بن گئے تھے۔ میں نے گاڑی صاف کرنے والا کپڑا زمین پر مار کے ان نشانات کو مٹادیا۔ آگے پختہ فرش تھا جس پر باریک گرد جمع تھی۔ گاڑی اس پر سے گزرتی تو ٹائروں کے نقش دو متوازن لکیروں پر ضرور نظر آتے۔ یہ سراغ مٹانے کا ایک مشکل طریقہ یہ ہو سکتا تھا کہ میں بعد میں ڈنڈے والا برش لے کر پورے راستے کو صاف کر ڈالوں لیکن میں نے ایک آسان طریقہ سوچ لیا۔

میں نے گاڑی کی ڈکی میں سے کپڑے کا کور نکالا۔ رفیق کی لاش اس کور کے اوپر ہوتی تو کپڑا خون سے تر ہوتا مگر اسے لپیٹ کر بنڈل کی طرح ایک کونے میں ٹھونس دیا گیا تھا۔ میں نے کور کو پچھلے بمپر کے ساتھ ایسے باندھا کہ جب گاڑی چلے تو فرش پر پھیلا ہوا کور خود ہی مٹی صاف کرتا جائے۔

شیلی یہ سب دیکھ رہی تھی اور عادتاً اس نے مجھ سے بہت سے سوالات بھی کیے تھے مگر میں نے اسے ایک جواب دے کر خاموش کردیا تھا کہ "بعد میں بتاؤں گا۔ ابھی چپ چاپ دیکھتی رہو۔"

میری ترکیب کامیاب رہی۔ اب کوئی بھی سراغ دیکھ کر اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ گیٹ سے کوئی گاڑی اندر گئی ہوگی۔ پرانے خالی گیراج کا گیٹ کھول کے میں نے شیلی کو اشارہ کیا کہ وہ گاڑی اندر لے جائے۔ گیٹ کھولنے کے لیے مجھے اس کی کنڈی میں لگا ہوا زنگ خوردہ تالا توڑنا پڑا تھا اور اب اس تالے کو پھر بند کرنے کے لیے چابی میرے پاس نہیں تھی۔

گیراج میں اندھیرا ہوگیا تھا۔ میں نے سوئچ آن کیا تو لائٹ جل گئی۔ گیراج کا پچھلا راستہ اندر سے مقفل تھا اور اس کی چابیاں وہیں دیوار پر لٹکی ہوئی تھیں۔ میں نے اسے تائید ایزدی سمجھتے ہوئے قفل کھولا اور شیلی کے ساتھ اسٹور سے گزر کے کچن میں پہنچ گیا۔

"اب تم یہاں ٹھہرو" میں نے کہا۔

"کیوں؟ یار تم کہاں جارہے ہو مجھے چھوڑ کے؟"

میں نے اسے تسلی دی "کہیں نہیں جارہا ہوں۔ ذرا یہ تالا باہر سے گیراج میں لگادوں۔ ڈرو مت۔ یہاں بھوت نہیں رہتے۔"

"آج آگئے ہیں رہنے کے لیے" شیلی نے گرد سے اٹے ہوئے کچن کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

میں کچن کی کھڑکی سے باہر گیا اور گیراج کی کنڈی لگا کے پھر تالا ڈال دیا جو عرفِ عام میں علی گڑھ کا تالا کہلاتا تھا۔ اس پر بھی زنگ کی افراط تھی اور میں نے پوری کوشش کی کہ یہ زنگ اصل حالت میں موجود رہے۔ لان کے آخری حصے میں اور گیراج کے سامنے بہت سے تختے' ایک سیڑھی' ایک پرانا ڈرم اور زنگ سے سبز ہوجانے والے سریے کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں احتیاط سے اٹھایا اور گیراج کے سامنے ڈھیر کردیا۔ سیڑھی عین دروازے کے سامنے یوں کھڑی کردی جیسے پہلے کبھی گیراج کی چھت کی صفائی کے لیے رکھی جاتی تھی۔ تختوں کے بعد ڈرم رکھتے ہوئے میں نے اسے زور سے لڑھکادیا۔ ڈرم کے اندر سے خشک چونے کے ڈلے باہر گرے اور ڈرم کی چادر پر سے سیاہ پپڑیاں فرش پر پھیل گئیں۔ سریے کے ٹکڑوں کو میں نے تختوں پر آڑا ترچھا ڈال دیا۔ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ میں نے اپنی کارکردگی کا جائزہ لیا اور مطمئن ہوگیا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ سب کاٹھ کباڑ یہاں برسوں سے پڑا ہوا ہے۔ یہ خیال کسی کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا تھا کہ راستہ صاف کیے بغیر کوئی گاڑی اندر جاسکتی ہے۔

سامنے والے حصے میں پورچ کے نیچے برآمدے میں کھلنے والے دروازے سے نچلی منزل کی کھڑکیوں تک سب شیشوں پر گرد کی تہہ خود اپنی کس مپرسی کی داستان کہتی تھی۔ اوپر کی منزل کی حالت بھی مختلف نہ تھی۔ منڈیروں پر اور چھجوں پر خس وخاشاک جھول رہے تھے اور آشیاں بنانے والے پرندوں کو یقیناً یہ اطمینان حاصل ہوگا کہ وہ صفائی پسندی کے نام پر آشیانے اجاڑنے والوں کی چیرہ دستی سے محفوظ ہیں۔

لان میں گھاس سوکھ گئی تھی یا بے ہنگم طریقے پر بڑھ گئی تھی۔ پھولوں کے تختے ویران تھے اور اجڑے ہوئے چمن کے شجر سوال کرتے محسوس ہوتے تھے کہ نگری نگری پھرنے والے لوٹ کے کب گھر آؤ گے' کب لاؤ گے اپنی بہاریں' کب تک پھول کھلاؤ گے۔ اداس بام و در پوچھتے تھے کہ سنگ و خشت کی دیواروں میں مقید خوابوں کو تعبیر کب ملے گی۔ عہدِ رفتہ کی یادوں کے اس مدفن کو وزیر خاں کے وارث کب اپنائیں گے۔ تم نے اسے پھر خرید تو لیا ہے سکندر اور شاید اس سے تمہارے احساسِ ملکیت کی خلش مٹ گئی ہو لیکن جو مکان آباد نہ ہو وہ گھر نہیں ہوتا۔

میرے پاس نہ کوئی جواب تھا' نہ وعدہ اور نہ حرفِ تسلی۔ رابعہ کے رویے کی تبدیلی نے میرے لیے احساسِ جرم کی پشیمانی بڑھادی تھی اور امیدوں' حسرتوں اور خواہشوں کے گلاب بن کھلے مرجھانے لگے تھے۔ وہ وقت ابھی میرے تصور کی دسترس میں بھی نہ تھا جب میں بالآخر غمِ دو جہاں سے فراغت پاکے اس رنگوں سے دمکتے' روشنیوں سے جگمگاتے اور خوشیوں سے مہکتے گھر کے حجلۂ عروسی میں اپنی شریکِ زندگی سے پورے اعتماد' خلوص اور یقین کے ساتھ کہہ سکوں کہ میرا یہ گھر اب تمہارا ہے۔ مجھ سمیت اور ان

بے بہا یادوں کے خزینے سمیت جن سے میری زندگی عبارت تھی اور ان سب توقعات اور نیک خواہشات سمیت جن کے ساتھ میرے باپ وزیر خاں نے یہ امانت مجھے سونپی تھی۔

میں لوٹ کے اندر گیا تو شیلی کچن کا دروازہ تھوڑا سا کھول کے اندر جھانک رہی تھی۔ میں نے اپنے پیچھے دھڑ سے دروازہ بند کیا تو وہ چیخ مار کے اچھل پڑی۔

"یار، ابھی میرا ہارٹ فیل ہو جاتا" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔

"ایسے اندر کیا دیکھ رہی ہو۔ چلو تمہیں اندر سے دکھاؤں۔ یہ گھر میرے والد نے بنایا تھا" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "میرا بچپن اسی گھر میں گزرا۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ میں لندن چلا گیا اور میرے والد سے یہ گھر چھین لیا گیا۔ انہوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ معلوم نہیں کیوں۔ اپنا سب کچھ ہار دیا مگر مجھے خبر بھی نہ ہونے دی۔ پھر ان کو یہاں قتل کر دیا گیا اور مجھے ابھی تک ان کے قاتلوں کی تلاش ہے۔ بڑی مشکل سے میں نے یہ گھر بہت زیادہ قیمت ادا کر کے پھر حاصل کیا تھا۔ اس امید میں کہ ایک نہ ایک دن یہ پھر آباد ہو گا لیکن معلوم نہیں وہ دن میرے مستقبل میں کہاں ہے۔ کتنی دور ہے؟"

شیلی بڑی دلچسپی سے پرانے گھر کی ہر چیز کو دیکھتی جا رہی تھی "یہ فرنیچر اور پردے، قالین، یہ اتنے پرانے تو نہیں لگتے۔ مٹی بہت پڑی ہوئی ہے۔"

"ہاں۔ یہ سب رابعہ نے خریدے تھے۔ اس نے گھر کو پوری طرح فرنش کیا تھا۔ بڑے شوق سے۔"

"اس کا ذوق بھی برا نہیں۔"

"برا کچھ بھی نہیں۔ سوائے میرے نصیب کے" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

شیلی ہنس پڑی "نصیب کو کیوں الزام دیتے ہو یار۔"

"اس لیے کہ اور کسی کو الزام دیا نہیں جا سکتا۔ قصور شاید صرف میرا ہے۔ میرا دماغ خراب تھا۔"

"تھا... یعنی اب نہیں ہے؟" وہ مشکوک لہجے میں بولی۔

میں نے مسکرا کے کہا "شاید تم میرا دماغ درست کر دو گی۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "الٹا تم مجھے پاگل کر دو گے۔ ابھی سے میرے اعصاب جواب دینے لگے ہیں یار۔ خاک اعصابی امراض کی ماہر ہوں میں۔"

میں نے کہا "تمہیں کیسی لگی یہ جگہ؟"

اس نے فلسفیانہ موڈ میں کہا "جگہ نہ کوئی اچھی ہوتی ہے نہ بری۔ رہنے والے کھنڈر میں خوش رہتے ہیں ورنہ محل میں رہ کے بھی روتے ہیں۔ زندگی ایک رویہ ہے یار۔ ایک ATTITUDE۔ اس کے مثبت یا منفی ہونے پر ہی سب کچھ منحصر ہے۔ ویسے میں یہاں خوش رہ سکتی ہوں کیونکہ اس میں ایک CHARM ہے۔ بڑا رومانٹک قسم کا جس کا تعلق روایات سے اور گزرے ہوئے وقت کی اچھی یادوں سے ہوتا ہے۔ بس ضرورت ہے اس جگہ کو اوور ہال کرنے کی۔ اس کی ظاہری صورت نہ بدلی جائے لیکن کلر اسکیم ایک دم نئی ہو۔ اور یہ سامان۔ اس میں کوئی قباحت نہیں۔ ڈرائی کلیننگ اور نئی پالش وغیرہ کی ضرورت ہو گی۔ ڈیکوریشن بھی اس کی..."

میں نے کہا "ڈاکٹر شیلی! آپ سے انٹیریئر ڈیکوریشن پر مشورہ نہیں مانگا تھا میں نے۔ نہ یہ آپ کا کام ہے۔"

وہ کچھ شرمندہ ہوئی "سوری یار۔ میں بس ایسے ہی سوچنے لگی تھی۔ بہ آوازِ بلند سوچ رہی تھی۔ خیر یہ بتاؤ کہ یہاں کیوں آئے ہیں ہم؟"

"اس لیے کہ ہم اور کہیں نہیں جا سکتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ آج رات تم فلیٹیز میں واپس جاتیں تو صبح تک پتا نہیں کیا ہو جاتا۔"

"کیا ہو جاتا؟ ابھی تک تو کچھ ہوا نہیں تھا۔"

"ابھی تک تم مجھ سے نہیں ملی تھیں۔ اگر دلاور کو تمہارے بارے میں یہ معلوم تھا کہ تم پاکستان میں ہو تو وہ تم پر نظر رکھے یہ دیکھ رہا تھا کہ تم کیا کرتی ہو۔ مجھ پر تو اس کی نظر بہت پہلے سے ہے۔ اب اس نے اپنا پیغام بالکل لگی لپٹی رکھے بغیر پہنچا دیا ہے کہ مجھے چکر دینے کی کوشش کی تو تمہارا انجام بھی رفیق سے مختلف نہیں ہو گا۔"

"ہوٹل میں وہ کیا کر سکتا تھا آخر؟" وہ سوچنے لگی۔

"ڈاکٹر صاحب! یہ پاکستان ہے اور چوہدری دلاور کے ذہن کو تم کبھی سمجھنے کا دعویٰ نہیں کر سکو گی۔ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ویسے تو زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن اب تمہیں بہت محتاط رہنا ہو گا۔ تمہارا مجھ سے ملنا تمہارے بھائی کو سخت ناگوار گزرا ہے۔ میری مانو تو واپس لندن چلی جاؤ اور وہیں سکون سے رہو۔"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا "میں اپنے ارادے اتنی جلدی نہیں بدلتی یار۔ دلاور سے نہ میرا کوئی رشتہ ہے......"

"رشتہ تو ہے۔"

"میں نہیں تسلیم کرتی ایسے رشتوں کو۔ مجھے اس سے کوئی دشمنی بھی نہیں مگر وہ سمجھتا ہے کہ مجھ سے میری دولت ہتھیالے گا یا مجھے ختم کرا دے گا تو یہ اتنا آسان نہیں ہو گا اس کے لیے۔ میں اپنی حفاظت خود کرنا جانتی ہوں۔ اور اب تو یہ ذمے داری بھی تم نے قبول کر لی ہے۔"

"میں نے.... نہیں ڈاکٹر شیلی۔ یہ کہنا ابھی قبل از وقت ہے۔"

"پھر یہاں کیوں لائے ہو مجھے یار؟ جانے دیتے واپس اپنے ہوٹل" اس نے خفگی سے کہا۔

"تمہارے ساتھ مجھے اپنی بھی فکر تھی۔ روپوش رہنے کے

لیے مجھے اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں سوجھی" میں نے کہا۔

"لیکن یہاں ہم کب تک روپوش رہ سکتے ہیں؟"

"بس آج کی رات خیریت سے گزر جائے" میں نے کہا "ایک تو مجھے ان کا ردِ عمل دیکھنا تھا۔ پھر تم سے کچھ پوچھنا تھا اور اس لاش کا بندوبست کرنا تھا۔ میں کوئی رسک نہیں لے سکتا تھا۔"

"کیا میں پھر ہوٹل نہیں جا سکتی؟"

"کم سے کم آج نہیں۔ کیا ہے تمہارا ہوٹل میں؟ پاسپورٹ وغیرہ؟ نقد رقم...؟"

اس نے نفی میں سرہلایا "ایک سوٹ کیس ہے کپڑوں کا۔ نقد رقم تو میں رکھتی نہیں۔ ٹریولرز چیک ہیں امریکن ایکسپریس کے۔ پاسپورٹ بھی میں ساتھ ہی رکھتی ہوں۔"

میں نے کہا "یہاں سونے کا مسئلہ کوئی نہیں لیکن تھوڑی دیر میں رات ہو جائے گی۔ ہم کھانے کے لیے کچھ بھی نہیں لائے۔"

"کچن میں کچھ نہیں ہوگا؟"

میں نے نفی میں سرہلایا "اگر ہوا تو چائے یا کافی کا سامان ہوگا۔ میں پیچھے سے نکل جاتا ہوں۔"

"مجھے اکیلا چھوڑ کے جاؤ گے... نہیں یار۔"

میں نے کہا "تمہیں کچھ نہیں ہوگا دس منٹ میں۔ دروازے بند کر کے بیٹھ جاؤ۔ ویسے تو بہت بہادر بن رہی تھیں کہ مجھے اپنی حفاظت کرنا آتی ہے اور ریوالور بھی دکھایا تھا ایک۔ کہاں ہے وہ ریوالور؟"

اس نے بیگ میں ہاتھ ڈالا "یہ... لیکن آج تک میں نے کسی کو بھی قتل نہیں کیا۔"

"فوری طور پر کسی کو قتل کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" میں نے کہا "تم اتنی دیر میں کچن کا سروے کرو اور دیکھو کہ ہم چائے یا کافی بنا کے پی سکتے ہیں یا رات ایسے ہی گزرے گی۔ پانی پی پی کر۔"

میں کچن کے راستے باہر گیا اور دس منٹ بعد بسکٹ کے ڈبے، سموسے اور کیک لے کر لوٹا تو کچن کافی کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔

"یار، یہاں تو سب کچھ ہے۔ سوائے دودھ کے۔" شیلی نے بتایا "الیکٹرک کیٹل مل گئی۔ برتن تو سب نئے ہیں۔ پورے پورے سیٹ بھرے پڑے ہیں۔"

میں نے افسردگی سے کہا "رابعہ کے خریدے ہوئے ہوں گے۔"

"باتھ روم میں تولیہ اور صابن ہے۔ تم چاہو تو منہ دھولو یا نہالو۔"

میں نے کہا "نہیں۔ ابھی ضرورت نہیں۔ کافی مجھے بلیک ہی دے دو۔ تمہارے لیے میں یہ دودھ لے آیا تھا۔ کنڈنس ملک۔"

"اچھا کیا۔ مگر مجھے تو عادت ہے بلیک کافی پینے کی۔ چینی کے بغیر۔ تمہارے لیے چینی ہے۔"

میں نے کھانے پینے کا سامان شیلف میں رکھ دیا۔ "شیلی! تم کو اندھیرے میں ڈر تو نہیں لگے گا؟"

"لائٹ ہے نا یار۔"

"کچھ دیر بعد میں ہر لائٹ آف کر دوں گا۔" میں نے کہا "جو کھانا ہے کھالو۔ کیتلی میں ڈھیر ساری کافی بنالو۔ اندھیرے میں ہی پلک لگا کر گرم کرتے رہیں گے۔"

اس کی صورت ایک سوالیہ نشان بن گئی "لیکن کیوں؟"

میں نے کہا "مجھے یقین ہے کہ تمہیں اور مجھے تلاش کرنے والے بالآخر یہاں بھی آئیں گے۔ ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہم اندھیرے میں دم سادھے بیٹھے رہیں گے اور باقی کام بعد میں کریں گے۔ جب وہ مایوس ہو کے لوٹ جائیں گے۔"

"باقی کام...؟"

"ایک تو ہر بات تمہیں سمجھانی پڑتی ہے اور تم سوال بہت کرتی ہو۔ جو ہوگا تمہارے سامنے ہوگا۔" میں نے کہا "چلو یہ سب سامان اٹھاؤ۔ ہم اندر چلتے ہیں۔ بیڈ روم میں۔"

"بیڈ روم میں..." اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

"ڈرو نہیں۔ ہم صرف باتیں کریں گے۔ یہ پاکستان ہے میڈم اور یہاں ہم رشتوں کا لحاظ رکھنے کے عادی ہیں۔ ہم عورت کی عزت کی اہمیت کو سمجھتے ہیں اور جب کسی پر اس کی حفاظت کا فرض عائد ہو جائے تو وہ جان دے کر بھی اپنا فرض نبھا سکتا ہے لیکن نہ کسی کے اعتماد کو دھوکا دے سکتا ہے اور نہ اپنے آپ کو۔ خصوصاً وہ جس کا نام سکندر بخت ہو۔"

"یار، میرا خیال ہے کہ ہر لڑکی اپنی عزت کی حفاظت کر سکتی ہے۔ خصوصاً وہ جس کا نام شیلی ہو، رابعہ ہو یا کچھ اور لیکن وہ سکندر بخت کو جانتی ہو۔" اس نے کہا "چلو میں کافی کی الیکٹرک کیٹل اور مگ لاتی ہوں۔ تم اٹھاؤ یہ کھانے پینے کا سامان۔"

بیڈ روم اوپر تھا۔ پہلے یہ میرے والد کا کمرا تھا۔ بعد میں اسے میں نے پسند کر لیا۔ وہ کچھ ضعیفی کے باعث بھی اوپر کی منزل کے مقابلے میں نیچے رہنے کو ترجیح دینے لگے تھے۔ اوپر انہیں صبح چھت پر کھلی ہوا ملتی تھی مگر انہیں نماز باجماعت کے لیے بار بار نیچے اترنا پڑتا تھا۔ جب رابعہ نے اسے نئے سرے سے آراستہ کیا تو اسے بڑی نفاست سے بیڈ روم بنا دیا اور کچھ عرصہ وہ اس میں رہی۔

آج اس کمرے کو دیکھ کر ناصر کاظمی کا شعر یاد آتا تھا۔ ہمارے گھر کی دیواروں پر ناصر۔ اداسی بال کھولے سو رہی ہے۔ اس کمرے میں سبزے کے رنگ کا دبیز قالین تھا۔ دیواروں پر آف وائٹ پینٹ تھا اور گولڈن شیڈ دینے والے ہلکے گلابی رنگ کے پردے تھے۔ ایک مقابل کے کونے میں ٹی وی رکھا ہوا تھا اور اس سے کچھ فاصلے پر چار فولڈنگ ایزی چیئرز رکھی ہوئی تھیں۔ دوسری طرف بیڈ سیٹ کے ساتھ کی وکٹورین وارڈ روب اور ڈریسنگ ٹیبل تھی۔ پرانے اسٹائل کے مکانوں کی طرح اس کی وائرنگ بھی اوپن تھی لیکن

رابعہ نے اسے کینسل کرادیا تھا۔ اب چاروں دیواروں پر ڈبل وال لائٹس تھیں اور درمیان میں اسی ڈیزائن کے فانوس۔

بیڈ کی ایک سائیڈ ٹیبل پر لیمپ تھا اور دوسری جانب ٹیلی فون۔ مجھے اس آلے کو دیکھ کر حیرانی ہوئی۔ یہ حیرانی اور بڑھ گئی جب میں نے غیرارادی طور پر ریسیور اٹھا کے کان سے لگایا۔ اس میں ٹون آرہی تھی۔ نہ جانے کیسے اب تک فون بند نہیں کیا گیا تھا۔ میری عدم موجودگی میں بجلی اور ٹیلی فون کے سارے بل لیٹر بکس میں جمع ہوتے رہے ہوں گے۔ ادائیگی کرنے والا یہاں کون تھا۔ اس کے باوجود بجلی اور ٹیلی فون لائن منقطع ہونے سے بچ گئی تھی۔ شاید اس لیے کہ استعمال نہ ہونے کے باعث بل کی رقم بہت تھوڑی ہوگی۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ رابعہ نے بلوں کی ادائیگی کی ذمے داری بھی وقار یوسف کو سونپ دی تھی جو مہینے میں ایک بار کسی کو بھیج کے لیٹر باکس میں سے بل منگوالیتا تھا۔ فون کا تو صرف لائن رینٹ آرہا تھا مگر بجلی والے اوسط کی بنیاد پر رقم وصول کررہے تھے۔

شیلی کافی پیتے ہوئے کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس نے میرے والد کی اور میری تصویریں دیکھیں جو ٹی وی پر رکھی ہوئی تھیں اور انہیں اپنے دوپٹے کے پلو سے صاف کرکے پھر وہیں رکھ دیا۔

میں نے کافی کے ساتھ کھانے کا سلسلہ جاری رکھا "تمہیں میرے بارے میں کیا معلوم ہے اور کس نے بتایا؟"

"میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ اور معلوم کرنے والے وسائل تلاش کرلیتے ہیں۔ یہ ایک ریسرچ ورک تھا۔ سب سے زیادہ مدد شیخ صاحب نے کی۔ ان کے علاوہ اخبارات تھے۔ پھر بھی مجھے کوئی دعویٰ نہیں کہ میں سب کچھ جانتی ہوں۔"

"ابھی تک تم نے رفیق کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

"یار، میرا خیال ہے کہ پہلے میں یہ گرد جھاڑ دوں۔ ہم ان کرسیوں پر بیٹھ کے باتیں کرسکتے ہیں" اس نے کہا "بیڈ کی چادر اور تکیوں پر بھی اتنی ہی مٹی ہوگی"

"چھوڑو بیڈ کی چادر کو۔ ابھی اتنی مٹی اُڑے گی۔ سب کمرے میں بھر جائے گی۔ سانس لینا بھی مشکل ہوجائے گا" میں نے کہا۔

"میں باہر ٹیرس پر جاکے جھاڑ دیتی ہوں۔ تم لائٹس آف کردو۔" شیلی نے کہا "ویسے وارڈ روب میں کپڑے ہیں۔ زنانہ بھی اور مردانہ بھی۔"

میں نے لائٹ آف کرنے سے پہلے وارڈ روب میں دیکھا تو اس میں کپڑے استری کیے ہوئے اور ترتیب کے ساتھ ہینگر میں لٹکے ہوئے تھے۔ مجھے رابعہ کے خیال نے ملول کردیا۔ اس گھر میں اپنی تنہائی کے لمحوں کو اس نے اپنی حسرتوں اور خواہشوں سے سجاتے گزارا تھا۔ کسی بچی کی طرح جو اکیلے میں اپنی گڑیا سے کھیلتی ہو۔

نئے پرانے

نوبیاہتا جوڑا ہنی مون پر نکلا ہوا تھا۔ ایک ہوٹل کی طرف جاتے ہوئے دُلہن نے کہا "نئے شادی شدہ جوڑے کو ہوٹل والے عجیب سی نظروں سے گھورتے ہیں۔ اس ہوٹل میں ہمیں یہ ظاہر کرنا چاہئے جیسے ہماری شادی کو کافی عرصہ گزر چکا ہے۔"

"ٹھیک ہے" شوہر نے جواب دیا "تو پھر سوٹ کیس تم اٹھالو۔"

اس سے باتیں کرتی ہو۔ اس کے لیے کپڑے بناتی ہو اور گھر سجاتی ہو۔ اس گھر میں ضرورت کی چیزیں فراہم کرتی ہو اور اس کی شادی رچاتی ہو۔ رابعہ نے بھی اس گھر میں اپنے خوابوں کو حقیقت کا روپ دے کر آباد کرلیا تھا۔ گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی۔ یہ ویسا ہی گھر تھا جیسا وہ میرے ساتھ مل کے بناتی۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ میں نے اسے مایوس کیا۔ مرد اس وقت بھی بے رحم ہوتے ہیں جب لڑکے ہوتے ہیں۔ وہ گڑیوں کے گھر اُجاڑ دیتے ہیں اور معصوم بچیوں کے جذبات کی پروا کئے بغیر ان کی گڑیوں کو خراب کردیتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ ہر گڑیا درحقیقت اسی معصوم لڑکی میں چھپی ہوئی عورت ہوتی ہے۔

کیا میں نے رابعہ پر ظلم کیا تھا؟ یا اس نے مجھے یہ فریب دیا تھا کہ وہ بڑی حقیقت پسند ہے۔ جب کہ وہ خواب پرست تھی۔ ہر لڑکی ویسے تو خواب پرست ہوتی ہے مگر وہ ساری عمر تو خوابوں کے پیچھے دوڑتے نہیں گزار سکتی۔ رابعہ کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد سرے سے مرد ہی نہیں تھا اور یہ دھوکا اسے تقدیر نے دیا تھا۔ پھر اچانک دل شکستگی اور مایوسی کے اس گرداب سے میں نے اسے زندگی کے پُرامید ساحل کی جانب کھینچ لیا۔ اس نے میرے عزائم کی شدت کا ساتھ اپنے جذبات کی بھرپور توانائی کے ساتھ دیا مگر آہستہ آہستہ اس پر یہ حقیقت عیاں ہونے لگی کہ وہ میرے پیچھے بھاگ رہی ہے اور میں اپنے مقاصد کے پیچھے سرگرداں ہوں۔ وہ مقاصد جو اس کے نزدیک لاحاصل اور مبہم تھے۔ غیریقینی مستقبل کے لامحدود افق تک۔ حدِامکاں سے آگے۔ اس کے خیال کی اور تصور کی انتہا سے بھی دور میری کوئی منزل تھی۔ اور رابعہ نے محسوس کیا کہ زندگی نے دوسری بار اسے فریب دیا ہے۔ اسے اس صدمے نے توڑ پھوڑ دیا کہ وہ میری منزل نہیں تھی اور یہ اس کے اختیار میں بھی نہ تھا کہ وہ میری منزل بن جائے۔ میرے مقاصد کی انتہا سے آگے پہنچ جائے یا میرے عزائم کے سفر کو اپنی ذات تک محدود کردے۔

شیلی میرے قریب آکے بیٹھ گئی "رابعہ کے بارے میں سوچ رہے تھے؟"

میں چونکا "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"یار، تمہاری جگہ میں ہوتی نا، تو میرے خیالات بھی مختلف نہ ہوتے۔ اس ماحول میں تم اور کسے یاد کرسکتے ہو؟"

"اس کی بات مت کرنا شیلی۔ میں اس کے خیال سے بھی گریزپا ہوں۔" میں نے کہا "حالانکہ یہ ناممکن ہے۔"

"ٹیلی فون کرکے اس کی خیریت تو معلوم کرلو۔"

"وہ سو رہی ہوگی۔ ٹھیک ہوگی" میں نے کہا "ٹی وی چلا دوں؟"

"نہیں یار۔ اندھیرا اچھا لگتا ہے" وہ بولی۔

میں نے سگریٹ جلالی "میں شراب نہیں پی سکتا۔ غم غلط کرنے کے لیے وہ چیز پی رہا ہوں جو میں نے خود پر حرام کرلی تھی۔"

"اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہو؟"

"شاید۔" میں نے کہا "کبھی کبھی اچھا لگتا ہے اپنے آپ سے جھوٹ بولنا۔ کل تک میں اس منظر کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ کہ ایسے تم اور میں یہاں بیٹھے ہوں گے۔ اندھیرے میں چوروں کی طرح چھپے ہوئے۔ اس بیڈ روم میں۔ اور بلیک کافی پی کے رات گزاریں گے۔"

"تمہیں کیوں یقین ہے کہ وہ آئیں گے؟"

"پتا نہیں۔ میری چھٹی حس غلط نہیں کہتی۔ دس بجے رات تک انہیں معلوم ہوجائے گا کہ ہم ان کے پھیلائے ہوئے جال سے نکل گئے۔ ہر شکاری کے لیے ناکامی ایک چیلنج بن جاتی ہے۔"

میں نے کہا "افسوس یہ ہے کہ رفیق قربانی کا بکرا بنا۔ خود میں نے کبھی شیر کا شکار دیکھا تک نہیں مگر جم کاربٹ کی کتابوں میں قصے بہت پڑھے ہیں۔ شکاری کوئی بکرا یا بچھیا جنگل میں باندھ دیتے ہیں اور مچان پر بیٹھ کے انتظار کرتے ہیں۔ شیر گارا کرکے چلا جاتا ہے۔"

"گارا کیا؟"

"بکرے یا بچھیا کو مار کے چلا جاتا ہے۔ اسے گارا کرنا کہتے ہیں۔ اسے کھانے کے لیے وہ پھر آتا ہے۔ اس وقت وہ خود مارا جاتا ہے۔ خیر چھوڑو، یہ باتیں تو بڑی دل دُکھانے والی ہیں۔ رفیق کے بارے میں بتاؤ کہ تم اسے کیسے جانتی تھیں اور زیڈیو نقوی صاحب کے پی اے سے تمہارا کیسے رابطہ ہوگیا تھا؟"

"جیسے تم سے ہوگیا....."

"تم ٹال رہی ہو۔ تم نے کہا تھا کہ رفیق میرا خاص آدمی ہے۔ اس کا چودھری دلاور سے بھی تعلق تھا۔ یہ معما میری سمجھ میں نہیں آتا" میں نے کہا۔

"میں نے تم سے ایک شیخ صاحب کا ذکر کیا تھا جن کا اصل نام کچھ اور تھا" وہ بولی "انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ پاکستان جاکے رفیق سے ملنا۔ وہ تمہارے سارے مسائل حل کرسکتا ہے۔ انہوں نے رفیق کے نام ایک خط بھی دیا تھا۔ رفیق غالباً زیڈیو نقوی صاحب کی بہن کا بیٹا ہے۔ اس بہن نے تقسیم ہند سے پہلے کسی ہندو سے محبت کی شادی کرلی تھی۔ اس کے نتیجے میں نقوی صاحب نے اس سے قطع تعلق کرلیا تھا۔ حالانکہ وہ ان کی ایک ہی بہن تھی اور وہ خود بھی اس بہن کے ایک بھائی تھے۔ نقوی صاحب پاکستان آگئے اور وہ بہن وہیں رہ گئی لیکن پاکستان بننے کے بعد حالات نے ایسا رُخ اختیار کیا کہ محبت پر مذہبی جنون غالب آگیا۔ انتہا پسند ہندوؤں کے دباؤ میں شوہر نے بیوی کو گھر سے نکال دیا اور خود پاک وصاف ہوکے پھر اپنی براہمن برادری میں شامل ہوگیا۔ وہ دولت مند اور والدین کا اکلوتا تھا۔ اس کے ماں باپ ہر قیمت پر اپنا بیٹا واپس چاہتے تھے اور اس کی شادی اپنے جیسے عزت داروں میں کرنا چاہتے تھے۔ پیسہ ہو تو آدمی کی ساری غلطیاں، کوتاہیاں، گناہ اور جرم معاف ہوجاتے ہیں۔ لیکن نقوی صاحب کی بہن سخت مشکلات میں گھر گئی۔ ایک طرف اس کا کوئی گھر اور خاندان نہیں رہا تھا، وہ محبت نہیں رہی تھی جس کو اس نے تمام عمر کا سہارا سمجھ لیا تھا اور نفرت کرنے والوں کے درمیان اپنے پاپ کی گٹھڑی اٹھائے پھرنے پر مجبور تھی۔ کیسی عجیب بات ہے یار۔ وہی بچہ ماں باپ کے گھر میں جنم لیتا ہے تو محبت کا ثمر کہلاتا ہے اور خوشیوں سے گھر بھر دیتا ہے اور کوئی بے ضمیر اور ذلیل آدمی اپنی جان چھڑانے کے لیے جھوٹ بول دے کہ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں تو وہی بچہ بارِ گناہ اور ناجائز ہوجاتا ہے۔ ماں کی بات تو وہی رہتی ہے لیکن اولاد اس کے لیے داغ رُسوائی بن جاتی ہے۔ خیر اس لڑکی نے ہمت سے کام لیا اور دہلی پہنچ گئی۔ یہ واقعہ تھا برند کا۔ اس نے سنا تھا کہ دہلی سے ہجرت کرنے والے مسلمانوں کو لے کر اسپیشل گاڑیاں پاکستان جارہی ہیں۔ وہ لڑکی غصے میں گھر سے نکل آئی تھی ورنہ عقل سے کام لیتی تو اپنے اونچی ذات والے، عزت دار اور رئیس زادے شوہر سے قطع تعلق کی قیمت اچھی خاصی وصول کرسکتی تھی۔ وہ سودا کرتی کہ اچھا یار میں تمہاری جان چھوڑتی ہوں۔ اس بچے کی پرورش کے لیے اور میری زندگی گزارنے کے لیے مناسب بندوبست کردو۔"

میں نے کہا "جذبات غالب ہوں تو عقل سے کون کام لے سکتا ہے۔"

"ہاں، کچھ ایسی ہی بات ہے یار۔ وہ راضی خوشی دیتے۔ اس کو پاکستان بھجوادیتے بائی ائر" شیلی نے کہا "وہ دہلی میں نظام الدین اولیا" کے مزار پر بہت عرصہ پڑی رہی کیونکہ اسے کسی اسپیشل ٹرین میں جگہ دلوانے والا کوئی نہیں تھا۔ نہ پیسہ تھا نہ اثر ورسوخ۔ اس نے کچھ زیور پہن رکھا تھا۔ بالآخر وہ اس کے کام آہی گیا اور وہ ایک ٹرین میں بیٹھ کے لاہور پہنچ گئی۔ وہ اپنے بھائی کو تلاش کرنا چاہتی تھی جس کے بارے میں اسے معلوم ہوا تھا کہ وہ پاکستان پہنچ چکا ہے مگر یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ یوں ہی بھٹکتی ہوئی ایک دن وہ شیخ صاحب کے بنگلے میں داخل ہوئی۔ شیخ صاحب ریلوے میں افسر تھے۔ وہ صبح آفس جانے کے لیے نکلے تو انہیں برآمدے میں وہ عورت پڑی نظر آئی جس نے گزشتہ رات ہی ایک بچے کو جنم دیا

تھا۔ انہوں نے فوراً ڈاکٹر کو بلوایا اور عورت کو گھر کے اندر شفٹ کر دیا لیکن اس کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ مرنے سے پہلے اس نے شیخ صاحب کو ساری بات بتادی اور نقوی صاحب کے بارے میں بھی سب کہہ دیا۔ شیخ صاحب سمجھ دار آدمی تھے اور کسی قانونی معاملے میں ملوث ہونا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے پولیس کو اطلاع دی اور ایک مجسٹریٹ کی موجودگی میں نقوی صاحب کی بہن کا پورا بیان ریکارڈ کروالیا۔ اس نے اپنے دستخط بھی کیے اور انگوٹھے کا نشان بھی لگایا۔ اس بیان کی ایک تصدیق شدہ نقل شیخ صاحب کے پاس آج بھی موجود ہے۔ میں بتا چکی ہوں کہ وہ بے اولاد تھے۔ انہوں نے بچے کی پرورش کی اور اس کا نام رفیق شیخ رکھا۔ ساتھ ہی وہ نقوی صاحب کو بھی تلاش کرتے رہے اور بالآخر ان کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو گئے مگر اس وقت تک نقوی صاحب بہت ترقی کر چکے تھے اور ان کا مستقبل تو شاندار تھا ہی۔ وہ اپنا ایک شاندار ماضی بھی بنا چکے تھے۔ اپنی خاندانی تاریخ اور شجرہ نسب کو اپنی حیثیت کے مطابق کرنے کے بعد انہوں نے بوگس کلیم داخل کیے تھے اور لاکھوں کی متروکہ جائداد اپنے نام الاٹ کرالی تھی۔ نقوی صاحب نے پہلے تو رفیق کو اپنا بھانجا تسلیم کرنے سے یکسر انکار کیا۔ اسی بنیاد پر کہ ان کی کوئی بہن نہیں تھی۔ پھر یہ مانا کہ بہن تو تھی مگر ایک ہندو سے شادی کے بعد وہ ان کے لیے مرچکی تھی.... شیخ صاحب نے انہیں یاد دلایا کہ ان کی بہن ہندو نہیں ہوئی تھی' وہ لڑکا مسلمان ہو گیا تھا جس نے اس سے شادی کی تھی مگر بعد میں اس کے خیالات بدل گئے۔ اس پر ذات برادری کا دباؤ بھی بڑھا اور اسے یہ خیال بھی پریشان کرنے لگا کہ وہ ایک لڑکی کے چکر میں ساری دولت اور جائداد سے محرومی قبول کر رہا ہے۔ لڑکی جیسی بھی تھی' غیر مذہب کی تھی اور اب محبت کا بھوت اترا تھا تو اسے باپ دادا کے دھرم سے ایک ناری کے لیے ہٹنا مہاپاپ لگنے لگا تھا۔ شادی سو فیصد جائز تھی اور رفیق ہر طرح سے ان کا بھانجا تھا۔ شیخ صاحب کی معلومات پر نقوی صاحب کو شک ہوا اور شیخ صاحب نے بالآخر ترپ کا آخری پتا ان کے سامنے پھینک دیا۔ ان کی بہن کا پورا بیان جس کی تصدیق ایک مجسٹریٹ نے کی تھی کہ یہ مرتے وقت دیا گیا تھا۔ اس کی صداقت کو قانون تسلیم کرتا تھا۔ نقوی صاحب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس بیان کے سامنے آجانے سے ان کا ماضی غلط ہو جاتا تھا اور ظاہر ہے' مستقبل مخدوش ہو جاتا تھا۔ انہوں نے شیخ صاحب سے وعدہ کیا کہ وہ رفیق کی ہر ممکن طریقے سے مدد کریں گے۔ اسے اپنے گھر میں رکھیں گے اور اس کی حفاظت بھی کریں گے۔ ہر طرح سے مطمئن ہو جانے کے بعد شیخ صاحب نے رفیق کو یہاں بھیج دیا اور نقوی صاحب نے اس سے اپنا تعلق پوشیدہ رکھتے ہوئے اسے ملازمت دلوائی پھر ترقی دلوائی اور بالآخر اپنے پی اے کے طور پر ساتھ رکھ لیا۔ جب مجھے شیخ صاحب نے رفیق کے نام خط دیا تھا تو یہ سب بتا دیا تھا اور مجھ سے کہا تھا کہ میں اپنے پتے سوچ سمجھ کے استعمال کروں۔ رفیق میرے لیے سب کچھ کر سکتا ہے۔ اس لیے کہ وہ جس شخص کا پی اے ہے' وہ سب کچھ کر سکتا ہے اور رفیق سب کچھ کروا سکتا ہے۔ جب رفیق مجھ سے ملا تو میں نے اسے اپنے بارے میں صرف یہ بتایا کہ میں لندن سے آئی ہوں۔ وہاں میں ڈاکٹر تھی اور اب میرا ارادہ پاکستان میں پریکٹس کرنے کا ہے یا پھر کسی اچھے اسپتال میں جاب کرنے کا۔ اس نے کہا کہ وہ میری ہر طرح سے مدد کرے گا۔ پھر میں نے کہا کہ ویسے تو میرا دشمن کوئی نہیں لیکن میں ایک شخص کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں کہ آج کل وہ کہاں ہے اور کیا کرتا ہے؟ میں نے چوہدری دلاور کا نام لیا تو وہ حیران ہوا کہ آپ کا اس سے کیا تعلق؟ میں نے کہا کہ میرا تعلق سکندر بخت سے بہت قریبی رہا ہے لیکن میں نے سنا ہے کہ چوہدری دلاور کی سکندر سے جانی دشمنی ہے۔ میں سکندر بخت سے ضرور ملوں گی اور اکثر ملوں گی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ میرے پیچھے پڑ جائے۔ رفیق ہنسنے لگا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ چوہدری دلاور آپ کو کچھ نہیں کہے گا۔ میں نے کہا کہ اچھا یہ ساری باتیں ہمارے درمیان رہنی چاہئیں۔"

میں نے کہا "اس کے بعد رفیق نے میری اور چوہدری دلاور کی ملاقات کی راہ ہموار کی تھی۔ تمہارے کہنے پر۔"

"میرے کہنے پر! نہیں یار۔ میں نے تو اس سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ اور میں کر بھی کیسے سکتی تھی۔ ایسے تو میں براہِ راست ملوث ہو جاتی۔"

"پھر یہ کیا چکر تھا؟" میں نے کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا "اتنی دیر سے ہم باتیں کر رہے ہیں اور ابھی صرف نو بجے ہیں۔"

"باتیں کہاں کر رہے تھے۔ میں بول رہی تھی اور تم سن رہے تھے۔ ایک بات پوچھوں سکندر؟"

"نہیں۔ دو باتیں پوچھو" میں نے کہا۔

"کیا تم رفیق کو یہاں دفن کرنے کے لیے لائے ہو؟"

"خیال تو یہی تھا پہلے۔"

"اب بدل گیا ہے؟"

"ہاں۔ سوچ رہا ہوں کہ یہ معاملہ نقوی صاحب کے سپرد کردوں۔ وہ اس سے بہتر طور پر نمٹ لیں گے۔"

"شاید اسی لیے رفیق نے نقوی صاحب کا نام لکھا تھا۔"

"مگر وہ بھا..... جا اور جا.... جا..."

"اگر لفظ مکمل کیے جائیں۔ فرض کرو یہ معما حل کرنا ہو تو بھا اور جا کے آگے پیچھے یہ لگایا جا سکتا ہے۔"

"میں نے بھائی جان سمجھا تھا۔"

"بھاگ جاؤ۔ اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

میں اچھل پڑا "رائٹ۔ ویری رائٹ۔ یہی مطلب تھا اس کا۔ تم نے تو کمال کر دیا یار۔"

"اب تو تم بھی بُری عادت کا شکار ہو گئے؟" اس نے طنز سے کہا۔

میں نے کہا "صحبت کا اثر تو ہوتا ہے نا۔ ویسے میں تمہاری دلیل سے قائل ہو گیا تھا کہ یار کہنے میں کوئی برائی نہیں۔ برائی آدمی کے دماغ میں ہوتی ہے جو اس کا برا مطلب نکالتا ہے۔ اگر رفیق کی آدھی بات کا مطلب یہ تھا تو باقی آدھی بات بھی سمجھ میں آتی ہے۔ جان بچا کے۔ وہ پورا لفظ نہیں بول پا رہا تھا۔ جا کا مطلب جان... با... جا کا مطلب بچا کے.... بھاگ جاؤ اپنی جان بچا کے۔ یہی چاہتا تھا وہ۔"

"اس کا مطلب سمجھے بغیر بھی ہم نے ایسا ہی کیا...."

"لیکن بات اس سے زیادہ ہو گی۔ ہم اس وقت خطرے میں تھے تو اس وقت بھی ہوں گے۔ یا تو ہم گاڑی وہیں چھوڑ دیتے۔ گاڑی ہی ہمارے لیے جال تھی جسے ہم ساتھ لیے پھر رہے ہیں۔ یقیناً کوئی یہ رپورٹ دے چکا ہوگا کہ شکار جال میں پھنس گیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ شکاری کیا کرتے ہیں۔"

"یار ایک دوسرے کی شکل تو دیکھ نہیں سکتے۔ اور کیا دیکھیں گے۔ اندھیرے میں بیٹھے رہیں گے رات بھر۔ کافی پیتے رہیں گے اور جاگتے رہیں گے۔ الوؤں کے جوڑے کی طرح جو ویرانے میں...."

اس کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ میں نے روشنی کی ایک چمک سی دیکھی اور پھر ایک آواز سنی۔ کوئی گاڑی گھوم کے گیٹ تک آئی تھی اور اس کی ہیڈ لائٹس شیشوں پر پڑی تھیں۔ رات کی خاموشی میں جیپ کے انجن کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

میں نے ایک پردے کا کونا ہٹا کے باہر جھانکا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں دو سائے گیٹ کھول رہے تھے۔ جیپ سیدھی اندر آئی اور اس کا انجن خاموش ہو گیا۔ ڈرائیور اور اس کے ساتھ والی سیٹ پر سے دو افراد کود کے باہر آئے۔ گیٹ کھولنے والے بھی بڑی بے خوفی سے قدم بڑھا رہے تھے اور میں ان سب کے ایک جیسے حُلیوں سے اندازہ کر سکتا تھا کہ ان موت کے فرشتوں کو کس نے بھیجا ہوگا۔ وہ سب گہرے رنگ کی قمیص اور پتلون پہنے ہوئے تھے اور بے حد چوکس تھے۔ اگر پتا بھی ہلتا تو وہ جیب سے ریوالور نکالنے میں دیر نہ لگاتے۔

مجھے بالکل پتا نہیں چلا کہ عین میرے پیچھے شیلی مجھ سے تقریباً چمٹ کے کھڑی ہوئی ہے۔ جب اس کا جسم خوف سے کانپنے لگا تو مجھے جنبش ہوئی۔

"ڈاکٹر صاحب! اتنا کمزور دل ہے آپ کا تو کوئی گولی ساتھ لاتی تھی اعصاب کو تقویت پہنچانے والی۔" میں نے کہا۔

"سکندر! یار فرض کرو' یہ اندر آ گئے...."

میں نے اطمینان سے کہا "فرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ اندر ہی آئیں گے۔"

"پھر تم کیا کرو گے؟"

"میں انہیں کہوں گا السلام علیکم۔ پھر ان سے مصافحہ کر کے بیوی بچوں کی خیریت معلوم کروں گا۔ ابھی دیکھو یہ کیا کرتے ہیں۔"

حسبِ توقع انہوں نے ٹارچ کی روشنی میں گیٹ سے گیراج تک آنے والے راستے کو دیکھا۔ میں دوسری کھڑکی کے پاس چلا گیا اور اس کا ایک ٹوٹا ہوا شیشہ دیکھ کے مجھے خوشی ہوئی۔ میں نے ایک کان شیشے سے باہر رکھتے ہوئے ان کی گفتگو سننے کی کوشش کی۔

"یہاں کوئی گاڑی نہیں آئی" ایک نے کہا۔

"اوئے گاڑی کیسے نہیں آئی؟"

"کیا اُڑ کے آئی ہو گی۔ مٹی میں کوئی نشان نظر آ رہے ہیں ٹائروں کے؟"

"میاں جی۔" تیسرے نے کہا "یہ راستہ کچھ ضرورت سے زیادہ صاف نہیں ہے؟"

چوتھا بولا "ہاں۔ کسی نے جھاڑو دی ہے اس پر۔"

"جھاڑو کیا تیرے باپ نے دی ہو گی؟"

"اوئے باپ تک مت جا...."

"بکواس بند کرو اپنی۔ گیراج کو دیکھو۔" پہلے شخص نے کہا "گاڑی اندر جاتی تو پہلے سامان ہٹانا پڑتا۔"

"گاڑی پیچھے بھی ہو سکتی ہے۔"

"پیچھے کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ آس پاس کے علاقے میں کسی سڑک پر کھڑی ہو۔ یا کسی دوسری کوٹھی میں۔"

"باس! وہ کہیں اور بھی تو جا سکتے ہیں۔"

"پاگل کے بچے! ہم یہاں ایسے ہی نہیں آئے ہیں۔ ایک ایک لفظ سنا تھا ہم نے۔ سارے راستے انہوں نے کیا باتیں کی تھیں۔"

"گاڑی میں خفیہ مائیکروفون تھا؟ واہ استاد۔"

"اب چلو اندر۔ ایک آدمی یہاں ٹھہرے' ایک باہر گیٹ پر جائے۔ دو پیچھے سے اندر داخل ہوں گے۔ اپنے واکی ٹاکی آن رکھنا۔ کوئی بھی ایسی ویسی آواز سُنے تو وہ دیر نہ کرے۔"

اس انکشاف نے کہ کار میں خفیہ مائیکروفون لگا ہوا تھا اور اس کی مدد سے انہوں نے ہماری ساری باتیں سن لی تھیں' میرے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لی تھی۔

میں نے شیلی کو پیچھے کھینچ لیا۔ "بڑی غلطی ہو گئی ہم سے۔"

"صرف ایک غلطی.... جو کوئی بات نہیں۔"

"تم مذاق سمجھ رہی ہو۔" میں نے اسے گھورا "وہ لوگ اندر آ رہے ہیں۔ اٹھاؤ یہ سب کھانے کا سامان۔ کافی کے مگ اور کیتلی۔ اچھا ہوا کہ تم نے صرف کرسیاں صاف کی تھیں' بیڈ کی چادر' تکیے نہیں بدلے تھے ورنہ وہ تو فوراً تاڑ جاتے کہ کسی نے صفائی کی ہے۔"

اس نے گھبرا کے کہا "یہ کرسیاں جن پر ہم بیٹھے تھے یار۔"

میں نے دونوں کرسیوں کو فولڈ کر کے دیوار کے سہارے کھڑا کردیا "چلو دو کرسیوں پر تو گرد ہے۔"

"اتنی گرد میں فرش پر ہمارے قدموں کے نشانات بھی صاف نظر آئیں گے۔"

میں نے چند سیکنڈ سوچا "اب نشانات مٹانے کے لیے تو وقت نہیں ہے۔ تمہارے پاس کوئی سکہ ہے۔"

"سکہ.... کیسا سکہ؟"

"کوئی بھی ہو۔ دس پیسے کا' چار آنے یا آٹھ آنے کا۔"

"کیا کرو گے؟ کیا ٹاس کرنا ہے؟" اس نے اپنے ہینڈ بیگ میں ہاتھ ڈالا اور مجھے ایک سکہ تھمادیا۔

"اب تم چلو بیڈ کے نیچے۔ سانس روک کے لیٹ جاؤ" میں نے بیڈ کے سرہانے والی لائٹ کا بلب نکال لیا۔

بلب کے اوپر سکہ رکھ کے میں نے اسے پھر اپنی جگہ ہولڈر میں فٹ کردیا۔ مجھے معلوم تھا کہ دروازے کے ساتھ والے بورڈ پر پہلا سوئچ اسی لائٹ کا ہے۔ جو بھی اندر آئے گا وہ لائٹ جلانے کے لیے پہلا سوئچ آن کرے گا اور اس کے ساتھ ہی فیوز اُڑ جائے گا۔ اگر کسی نے فیوز دوبارہ لگانے کی زحمت کی تو اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ جب تک سکہ بلب کے اوپر موجود ہے تار شارٹ رہیں گے اور فیوز اُڑتا رہے گا۔ ان کے لیے فیوز اُڑنے کا سبب تلاش کرنا آسان کام نہیں تھا۔ اول تو ان کی عقل میں یہ بات آہی نہیں سکتی تھی کہ فیوز کیوں اُڑ رہا ہے۔ اسے وہ پرانے تاروں کی خرابی ہی سمجھتے اور بفرض محال کسی کے ذہن میں یہ خیال آتا تو پورے گھر کے بلب نکال کے فیوز اُڑانے والے سکے کو تلاش کرتے انہیں صبح ہوجاتی۔

ڈبل بیڈ کے اوپر پڑے ہوئے کور کو اٹھا کے میں دوسری طرف سے اندر لیٹ گیا۔ وہاں لیٹنا مجھے بہت عجیب لگا۔ یہ ایک پُرتکلف بیڈ روم تھا اور یہ بیڈ روم اس گھر کا حصہ تھا جس کا میں مالک تھا مگر یہاں میں ایسے چھپ کر لیٹا ہوا تھا جیسے میں چور ہوں۔ چور روندناتے ہوئے اوپر آرہے تھے۔ میں نچلی منزل پر ان کے باتیں کرنے کی' گالیاں بکنے کی اور دروازے دھڑ دھڑ مارنے کی آوازیں سن رہا تھا۔

میرے بہت قریب ایک اجنبی لڑکی لیٹی ہوئی تھی جس کے قرب کی خوشبو اس محدود سی جگہ میں بھر گئی تھی۔ وہ کوئی بہت اعلیٰ قسم کی پرفیوم استعمال کرتی ہوگی لیکن اس وقت یہ دلنواز مہک بھی مجھے ڈرا رہی تھی۔ غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا۔ یہ خوشبو پکار کے نہ کہے کہ وہ گل کہاں کھلا ہے جس نے اس ویران اندھیرے کو مہکا دیا ہے۔ شیلا گرد اور دُھول کے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ لڑکی جو پیشے کے اعتبار سے بہت ماہر ڈاکٹر تھی' لندن کے ماحول کی پروردہ تھی اور فلیٹیز جیسے ہوٹل میں قیام پذیر تھی' میری طرح مجبور تھی اور خوف زدہ تھی۔ اسے نہ اپنے کپڑوں کا خیال تھا' نہ بالوں کا۔ نہ یہ احساس تھا کہ اس وقت فرش خاک پر لیٹی ہوئی وہ لندن میں ایک لاکھ پونڈ کا بینک بیلنس' ذاتی مکان اور گاڑی رکھنے والی ڈاکٹر شیلا خان نہیں بلکہ کوئی بے آسرا' بے گھر اور بے امان فقیر ہے۔ اس شہر میں آسمان کی کھلی چھت کے نیچے ایسے ہی خدا کی زمین پر پاؤں پسارے نہ جانے کتنے مفلس ہوں گے مگر وہ ہم سے یوں بہتر تھے کہ انہیں جان کے خوف سے تحفظ حاصل تھا اور ان کی آنکھوں کو نیند میسّر تھی۔

میں نے تاریکی میں آہستہ سے ہاتھ بڑھایا اور شیلی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کا ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

"یار' مجھے ایسے لگتا ہے کہ میں مرچکی ہوں اور یہ میری قبر ہے۔ لوگ مجھے دفنا کے جاچکے ہیں اور اب اندھیرا ہے۔"

میں نے کہا "اگر تم مرچکی ہو تو خاموش رہو۔ مُردے بولتے نہیں۔"

اس نے اپنی بات سرگوشی میں جاری رکھی "بس اب کچھ دیر میں یہاں منکر نکیر آئیں گے اور مجھ سے سوال کریں گے کہ تم کون ہو۔"

"یہ خوشبو بہت اچھی ہے۔ لیکن مس شیلی! اگر ہم پکڑے گئے تو اسی خوشبو سے پکڑے جائیں گے۔"

"میں کیا کروں یار۔ عادت ہے مجھے تو...... اور تم اسے بری عادت بھی نہیں کہہ سکتے۔"

"شش...." میں نے آہستہ سے کہا "وہ لوگ اوپر آگئے ہیں۔"

"اچھا... یار! انہوں نے پکڑلیا ہمیں تو کیا بالکل مار ڈالیں گے؟" اس نے میرے اور قریب آکے بالکل میرے کان میں کہا۔

"مجھے ضرور مار ڈالیں گے" میں نے دانت پیس کے کہا۔

"مجھے کیوں نہیں؟"

"اس لیے کہ تم لڑکی ہو' خوب صورت ہو' ایک ترچھی نظر اور ایک قاتل ادا سے سب کو ڈھیر کردو گی۔"

باہر سے کسی نے گالی دے کر کہا "اوئے.... یہاں تو بھوت بھی نہیں ہیں۔"

"بھونک مت کتے۔ وہ کہیں بھی ہوسکتے ہیں۔"

"وہ کہاں ہوں گے؟ سب جگہ تو دیکھ لیا۔"

پھر دھڑ سے لات مار کے کسی نے دروازہ کھولا۔ باہر سے تھوڑی سی روشنی اندر آئی۔ اب تک وہ ہر کمرے میں لائٹ جلا کے دیکھتے آئے تھے۔ میں منتظر رہا کہ وہ اس کمرے کی روشنی کے سوئچ کی طرف ہاتھ بڑھائیں۔

"اوئے پاگل دے پُتر' ان کی گاڑی...."

"پھر وہی بکواس! گاڑی نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ خود بھی یہاں نہیں ہوسکتے۔"

"اچھا استاد۔ گرمی کیوں دکھاتے ہو۔ سارے گھر کی خاک تو چھان لی۔"

"ملا کچھ نہیں۔ کوئی سراغ نہیں" پہلے نے کہا۔

دوسرا بولا "ہاں یار۔ جہاں آدمی ہوتا ہے، کوئی نشانی تو چھوڑتا ہے۔"

"پھر کافی کی خوشبو کیوں تھی کچن میں؟" اس شخص نے دہاڑ کے کہا جو غالباً اس شکاری ٹولے کا استاد تھا۔

"میری تو ناک خراب ہے" ایک نے کہا۔

دوسرا بولا "میں نے کبھی کافی پی ہی نہیں۔"

استاد نے کہا "وہ یہاں آئے ضرور تھے۔ الماریوں میں دیکھو۔ باتھ روم میں جھانک کے دیکھو۔ بے وقوفوں کی طرح کھڑے مت رہو۔"

خلاف امید اس نے لائٹ آن نہیں کی تھی۔ شاید باہر سے آنے والا اجالا انہیں کافی محسوس ہوا تھا۔

"استاد جی! ذرا لائٹ تو جلاؤ پھر پتا چلے کچھ۔"

جب لائٹ آن ہوتے ہی ایک دم تاریکی چھا گئی تو مجھے تھوڑی سی ڈھارس بندھی ورنہ یہ اندیشہ پیدا ہونے لگا تھا کہ ذرا سا بھی سراغ ملا تو استاد بیڈ کے نیچے جھانکنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے اور روشنی میں گرد پر انسانی قدموں کے تازہ نشانات واضح نظر آسکتے تھے۔

"اوئے ایہہ کی ہویا...؟"

"تیری بے بے دا سر۔ اندھیرا ہوگیا اور کیا ہوا۔ فیوز اُڑ گیا۔"

"کیسے اُڑ گیا؟"

"جیسے نور جہاں کے ہاتھ سے کبوتر اُڑ گیا تھا۔ یوں۔ مجھ سے کیا پوچھتا ہے کھوتے۔ استاد سے پوچھ" جواب دینے والا ہنسا۔

"چلو نکلو یہاں سے۔" استاد نے حکم دیا "یہاں کوئی نہیں ہے۔"

"استاد جی! فیوز ٹھیک کروں؟"

"دفع کر۔ یہ لائٹ خراب تھی۔" استاد نے ناگواری سے کہا۔ "سب جگہ دیکھ لیا ہم نے۔"

"کوئی کونا نہیں چھوڑا۔"

"واپسی میں پانی کا ٹینک دیکھ لینا۔ نیچے والا بھی اور اوپر والا بھی۔"

استاد واقعی استاد تھا۔ "کیا پتا وہ وہاں چھپے ہوں۔"

"پانی کے اوپر یا نیچے؟ انسان کے بچے ہیں یا مچھلی کے؟"

"الو کے پٹھے۔ یہ بہت پرانا طریقہ ہے۔ جس بات کا پتا نہ ہو اس پر بولنا بھی نہیں چاہیے۔" استاد نے جاتے جاتے کہا "مجرم ڈھکن کھول کے اندر اتر جاتے ہیں۔ کوئی ڈھکن کھول کر جھانکے تو پانی میں غوطہ مار جاتے ہیں ورنہ سر اوپر رکھتے ہیں۔ خود میں نے ایک بار پولیس کو ایسے ہی دھوکا دیا تھا۔"

آہستہ آہستہ ان کی آوازیں دور ہوگئیں۔ وہ جاتے وقت دروازہ بند کر کے نہیں گئے تھے۔ میں نے ان کے زینے سے اترتے قدموں کی چاپ بھی رات کے سناٹے میں صاف سُنی اور کھسک کے بیڈ کے نیچے سے نکل آیا۔ شیلی نے بھی ادھر سے ہی سرک کے خود کو باہر کیا اور مجھ سے ٹکرائی۔

"یار، رک کیوں گئے؟" وہ ہنسی۔

میں نے ایک دم اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا "ڈاکٹر صاحب! دماغ کیا پڑھائی میں خرچ کردیا سارا یا لندن چھوڑ آئی ہو۔"

"تمہارے ہاتھ تو بالکل گنواروں جیسے ہیں" اس نے آہستہ سے کہا "ایسے دباتے ہیں کسی لڑکی کا منہ۔"

"مجھے کسی بے وقوف لڑکی کا منہ دبانے کا پہلے کبھی تجربہ نہیں ہوا ڈاکٹر شیلی۔" میں نے خفگی سے کہا۔

میرے اندیشے ابھی تمام نہیں ہوئے تھے۔ استاد نسبتاً ذہین تھا اور اگر کمرے میں روشنی زیادہ ہوتی تو وہ یقیناً گرد پر ہمارے قدموں کے نشانات بھی دیکھ لیتا اور قریب آتا تو شاید کافی کی مہک کو بھی سونگھ لیتا۔ باقی احمقوں کے مقابلے میں استاد کے حواسِ خمسہ تیز تھے۔ اب بھی مجھے ڈر تھا کہ وہ گیراج میں گھسنے کی کوشش نہ کرے۔

شیلی کا ہاتھ تھام کے میں نے دبے پاؤں اندھیرے میں قدم بڑھایا۔ اس گھر میں میرا بچپن گزرا تھا اور یہاں میں آنکھ بند کر کے کسی بھی کمرے کے کسی بھی کونے یا دروازے تک پہنچ سکتا تھا۔

ہمارے تعاقب میں آنے والوں نے ایک فاش غلطی کی تھی۔ ان کی جگہ میں ہوتا تو خاموشی سے آتا اور ہر کمرے میں ایسے داخل ہوتا کہ کسی کو پتا نہ چلتا مگر وہ مسلسل بول رہے تھے۔ ان کی قسمت ان کا ساتھ دے رہی تھی اور میں خون خرابہ کر کے اپنے مسائل میں اضافہ نہیں چاہتا تھا ورنہ ان کے آنے کی خبر مجھے پہلے ہی مل گئی تھی اور میں باری باری ان سب کو ایک منٹ سے کم وقت میں لمبا لٹا سکتا تھا۔ میں مسائل کے چیستاں میں اتنا اُلجھ چکا تھا کہ اب میری خواہشات کی لگام عقل کے ہاتھ میں تھی۔ میرے جذبات پر جوش سے زیادہ ہوش کا غلبہ تھا اور میں جارحانہ عزائم پر دفاعی حکمتِ عملی کو ترجیح دے رہا تھا۔

شیلی کے ساتھ میں ایک ایک زینہ سنبھل کے اُتر رہا تھا اور اس کا ایک ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا اور دوسرا ریلنگ پر۔ مجھے دوسری طرف سے دیوار کا سہارا لینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ سب زینوں پر قالین تھا۔ ان کی چوڑائی اور اونچائی برابر تھی مگر برا ہو اونچی ایڑی کا۔ اچانک شیلی کا توازن بگڑ گیا اور میں نے اسے نہ کھینچا ہوتا تو وہ منہ کے بل گرتی اور لڑھکتی ہوئی نیچے جاتی۔ ظاہر ہے وہ چیخ بھی مارتی اور یہ کوئی ناز نخرے والی چیخ نہ ہوتی جو عموماً خواتین بڑی الائچی کو کاکروچ سمجھ کے بھی مار دیتی ہیں۔ یہ دلخراش، فلک شگاف، قیامت خیز قسم کی چیخ اس ویران حویلی کے گوشے گوشے میں پہنچتی اور وہ شکاری کتے جو مایوس لوٹ رہے تھے، فوراً پلٹ آتے۔ نتیجے میں مارا ماری ہوتی اور ایک ہائی ہیل کم سے کم چار افراد کی جان لے لیتی۔

شیلی نے ضبط سے کام لے کر مجھے حیران کردیا۔ اس نے حلق سے "ہائے اللہ" یا "اوئی اماں" جیسی آواز تک نہیں نکالی۔

"ہوا کیے؟" میں نے اسے سنبھالنے کے بعد کہا۔

"ہاں یار۔ یہ پاؤں کچھ مُڑ گیا ہے" اس کی آواز سے صاف تکلیف کا احساس ہو رہا تھا "موچ آگئی ہے شاید۔"

"اچھا بیٹھ جاؤ یہاں" میں نے اسے زینے کے درمیان میں بٹھادیا۔

"یہ اونچی ایڑی..."

میں نے کہا "تم عورتوں کے فیشن کا تعلق عقل سے بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ اچھا بھلا قد ہے تمہارا۔ ساڑھے چار فٹ کی تو ہو نہیں کہ چار انچ کی ہیل ضروری ہو۔"

"یار، تمہیں کمپلکس ہوگیا ہے کہ میرا قد بڑھ گیا۔" وہ کراہ کے بولی۔

"ایک فٹ اونچی ایڑی ہو تو شاید تم میرے برابر آجاؤ۔" میں نے کہا "تم چل سکتی ہو یا نہیں؟"

"تم بیساکھی بن جاؤ تو چل لوں گی۔ ورنہ یار، میرا وزن ہی کتنا ہے۔ ایک سو اٹھارہ پونڈ" وہ ہنسی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

باہر گاڑی کا انجن غرایا اور پھر ہیڈ لائٹس نے اس گھر کے اندھیرے کو ذرا سی دیر کے لیے اُجال دیا۔ مجھے ایک انجانی سی خوشی کے احساس نے سرشار کردیا۔ میری تھوڑی سی پیش بندی، احتیاط اور چالاکی نے اس شکاری ٹولے کے عزائم کو خاک میں ملا دیا تھا، ان کی آنکھوں میں دھول جھونک دی تھی اور ان کی عقل کو گمراہ کردیا تھا۔ یا پھر اسے بھی میں اپنی زندگی کے ان گنت مواقعوں میں سے ایک شمار کرسکتا تھا جب بچانے والے ہاتھ نے زبردست ہونے کا ثبوت دیا اور مارنے والے ہاتھ کو روک لیا۔

میں نے خوشی سے نعرہ لگایا "یو... ہو... وہ مارا پاپڑ والے کو۔"

شیلی ہنسی "کسے مارا؟ کون پاپڑ والا؟"

میں نے اسے ہاتھ پکڑ کے گھمادیا "اب چلو واپس۔ دشمن گئے۔ میدان صاف ہے۔"

اس نے چیخ ماری "اُف۔ یار، میرا پاؤں۔"

میں نے اسے گرنے سے پہلے ہی اٹھالیا "سوری۔ میں بھول گیا تھا کہ تم لنگڑی لولی اور معذور ہو۔"

اس کا وزن مجھے ایک سو اٹھارہ پونڈ بھی نہیں لگا لیکن یہ بڑا عجیب لگا کہ جس لڑکی سے میں کچھ دیر پہلے لارڈز ریسٹورنٹ میں سیدھے منہ بات کرنے کا روادار بھی نہ تھا، اب وہ میری آغوش میں تھی اور حالات نے ایسی کروٹ لی تھی کہ ذہنی طور پر بھی وہ میرے بہت قریب آگئی تھی۔ اسے جذباتی قربت کا نام دینا غلط ہوگا۔ یہ صرف مجبوری تھی جس نے مجھے اور اسے یکجا کردیا تھا اور اس ویران گھر کی رات میں اعتماد کے رشتے سے باندھ دیا تھا۔ اسے واپس بیڈ روم کی طرف لے جاتے ہوئے میں نے سوچا کہ اگر یہ سب رابعہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے یا میں اسے بتاؤں تو وہ کیا سمجھے گی؟ میری فطرت، میری عادت اور میری محبت کو اچھی طرح سمجھنے، جاننے اور ماننے کے باوجود یہ ناممکن ہوگا کہ وہ شک، حسد اور رقابت کے جذبات کا شکار نہ ہو۔ اور ایک رابعہ پر ہی کیا منحصر۔ شاید نازو اور گل کو بھی یقین نہ آئے کہ شیلی نے میرے قریب آنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ بظاہر معصوم اور بے ضرر محسوس ہونے والے اتفاقات کو حالات کی سازش کا نام دے کر خود کو الزام سے بچانا مشکل ہوگا۔ ممکن ہے محسن یا غالب مجھ پر اعتبار کرلیں مگر عورت ہونے کے ناتے نازو اور گل کا متفقہ فیصلہ جذباتی ہوگا اور وہ مجھے شک کا فائدہ بھی نہیں دیں گی۔ رابعہ کے طرز عمل کے بعد میں نے جان بوجھ کے شیلی کو ملتفت ہونے کا بہانہ فراہم کیا۔ یہ ایک گھٹیا انتقامی جذبہ تھا جس سے مجبور ہوکے میں اسے یہاں لایا ورنہ کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ میں غالب کو، منظر یا وقار یوسف کو فون کرکے ساری صورت حال بتادیتا اور پھر سب مل کے اس مشکل کا کوئی آسان حل تلاش کرلیتے۔

اچانک مجھے اپنے طرز عمل پر ندامت کی خلش پریشان کرنے لگی۔ ان حالات میں کہ یہاں فون بھی ہے، میں نے ابھی تک کسی کو کیوں اطلاع نہیں دی کہ میں کس مصیبت میں ہوں اور کہاں ہوں۔ باقی سب لوگ دہری پریشانی سے دوچار ہوں گے۔ ایک طرف انہیں رابعہ کی فکر ہوگی جو اپنے ہی جذبات کے آتش فشاں میں خاکستر ہو رہی تھی۔ دوسری طرف میری گمشدگی انہیں تشویش میں مبتلا کرے گی کہ مایوسی اور دل شکستگی کی کیفیت میں سکندر بخت پر کیا گزری کہ وہ لوٹ کے نہیں آیا۔ میری فطرت سے سب ہی واقف تھے کہ میں شدید ترین ڈپریشن کی حالت میں بھی خودکشی نہیں کروں گا۔ فلمی ہیرو کی طرح میرا اس رات کی تنہائی میں راوی کے کنارے بیٹھنا اور چاند کو تکتے ہوئے کوئی دردناک گیت گانا۔ (مثلاً۔ پریت لگاکے میں نے یہ پھل پایا۔ سُدھ بُدھ کھوئی چین گنوایا) مشکل تھا۔

شیلی کو گرد آلود بیڈ پر لٹاکے میں نے فیصلہ کیا کہ میرا اس طرح رات بھر یہاں روپوش رہنا میرے مسائل میں اضافہ تو کرسکتا ہے، مسئلے کو حل نہیں کرے گا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ میں منظر یا غالب سے فون پر رابطہ کروں ورنہ میرا کوئی عذر بھی قابل قبول نہیں سمجھا جائے گا کہ جب شکاری ٹولہ واپس چلا گیا تھا اور فون بھی ٹھیک تھا تو آپ اس بیڈ روم میں شیلی کے ساتھ صبح تک صرف باتیں تو نہیں کرتے رہے ہوں گے اور پھر ایسی کون سی باتیں تھیں کہ آپ کو ہم بھی یاد نہ آئے۔

میں نے کہا "ڈاکٹر شیلی! تم ذرا آرام کرو۔"

"آرام خاک کروں۔ اس بیڈ پر تو اتنی دھول ہے۔"

میں نے طنز سے کہا "شکر تمہارا میک اپ خراب ہو رہا ہے، کپڑوں پر داغ لگ گئے ہیں۔ بھول گئیں ابھی کچھ دیر پہلے بیڈ کے

نیچے کس حال میں پڑی تھیں۔"

"وہ مجبوری تھی یار..."

"اچھا تو تم جادر جھاڑو' میں آتا ہوں فیوز چیک کر کے۔ تمہیں ڈر نہیں لگنا چاہیے۔"

"یار' جب آدمی اپنے آپ سے نہ ڈرتا ہو تو پھر صرف خونخوار جانوروں سے ڈرتا ہے۔ مثلاً لال بیگ' مکڑی' چھپکلی وغیرہ سے۔ بھیڑیے یا شیر وغیرہ تو یہاں آنہیں سکتے۔ جن بھوت پر میرا اعتقاد نہیں" وہ بولی "بس تم آجانا۔"

"اس فضول بات کا کیا مطلب ہے آخر؟ میں فرار ہو رہا ہوں فیوز لگانے کے بہانے...؟" میں بگڑ گیا۔

وہ ہنسی "یار' کیوں اتنے TENSE ہو رہے ہو۔ ٹیک اِٹ ایزی۔ کیا مجھے معلوم نہیں کہ تم ہی میرے محافظ بنے ہو اور اپنی مرضی سے۔ تم مجھے یہاں چھوڑ کے کیسے جاسکتے ہو؟ میں مذاق کر رہی تھی۔"

میں نے دل ہی دل میں اسے گالی دی۔ ٹینشن کی اولاد۔ بات بات پر کہتی ہے' ٹینس کیوں ہو رہے ہو۔ ٹیک اِٹ ایزی۔ بابا یہ کوئی فلم کا سین ہے یا ڈراما چل رہا ہے کہ میں سکون سے بیٹھا دیکھتا رہوں۔ میں نے زینے سے نیچے جاتے ہوئے سوچا۔ اپنا یہ حال ہے کہ پاؤں مُڑ گیا تو ہائے میں مرگئی۔ اپنا سایہ دیکھا تو چیخ ماردی۔ فلم میں دردناک منظر دیکھا اور رونا شروع کردیا۔ ہسٹریا کا تماشا کر کے اندر کا سارا غبار نکال دیا۔ مرد بے چارے چپ رہتے ہیں۔ خاموشی سے برداشت کرتے ہیں تو کہتی ہیں کہ ٹینس کیوں ہو رہے ہو۔ گوشت پوست کا بنا ہوا آدمی TENSE بھی نہ ہو۔

میں نے ماچس کی تیلی جلا کے فیوز دیکھا۔ دوراندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے فیوز وائر بھی وہیں رکھ دیا گیا تھا۔ اسکریو ڈرائیور بہرحال نہیں تھا۔ کہ میں پرانا' جلا ہوا تار ہٹا کے نیا تار ٹائٹ کرتا۔ میں نے فیوز کے دونوں کناروں کو تار سے باندھا اور کٹ آؤٹ لگا دیا۔ ایک شعلہ سا چمکا اور فیوز پھر اُڑ گیا۔ میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ اسے کہتے ہیں اپنی جوتی اپنا سر۔ جن کو اندھیرے میں رکھنے کے لیے بلب کے نیچے ہکہ لگایا تھا' وہ تو چلے گئے فیوز لگائے بغیر اور ہکہ ہٹائے بغیر فیوز لگانے کی حماقت کا اعزاز میرے حصے میں آیا۔ لائٹ پل بھر کے لیے چمکی تھی۔ شیلی اگر عقلمندی سے کام لیتی تو سمجھ جاتی کہ پھر فیوز اُڑ گیا اور خود ہی بلب ہٹا دیتی مگر ایک تو اس کے پنجے میں موچ تھی۔ وہ بیڈ کے سرہانے پر چڑھ کے بلب اتارتی تو اس کے دوسرے پنجے میں بھی موچ آجاتی یا گر میں بل پڑ جاتا۔

مجھے خود اوپر جا کے بلب نکالنا پڑا پھر واپس آکے دوسری بار فیوز لگاتے ہی اوپر نیچے کے سب کمرے روشن ہو گئے۔ یہ لائٹس جلانے والے وہی تھے جو عقل سے پیدل نہ ہوتے تو ہماری موجودگی کا سراغ لگا سکتے تھے مگر عام آدمی ایسا باریک بیں' سراغ رساں نہیں ہوتا جیسا کہ شرلاک ہومز تھا ورنہ گیٹ کے باہر ہی نشانات دیکھ کے ٹائر کا سائز' گاڑی کا میک اور ماڈل' رفتار اور رنگ سے لے کر چلانے والے یا والی کی عمر اور عادات تک جان لیتا۔

اجالے میں شیلی کو دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی "تم بالکل بھتنی لگ رہی ہو۔"

وہ مسکرائی "ہاں یار۔ آئینہ دیکھا تھا میں نے۔ سب مٹی ہو رہی ہے۔ بالوں میں' کپڑوں میں۔ چادر جھاڑی تھی نا۔"

میں نے کہا "چاہو تو نہا کے دوسرے کپڑے پہن لو۔"

وہ بولی "یہی میں بھی سوچ رہی تھی۔"

اس کے پاؤں میں موچ نہیں آئی تھی۔ مُڑ جانے سے کوئی رگ پٹھا متاثر ہوا تھا مگر وہ چل سکتی تھی۔ اس نے اپنے لیے وارڈ روب میں سے کپڑے منتخب کیے اور غسل خانے میں بند ہو گئی تو میں نے فون اٹھایا۔ ابھی میں نے دو ہی نمبر ڈائل کیے تھے کہ کھڑکی پر ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی پڑی اور میں ریسیور رکھ کے دوڑا۔ باہر پھر کوئی گاڑی آئی تھی اور مجھے یقین تھا کہ آنے والے نے اوپر کی منزل کے بیڈ روم کی روشنی ضرور دیکھ لی ہوگی۔ اب اسے گل کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

میں نے پردہ ہٹا کے دیکھا تو ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے میری آنکھیں غلط دیکھ رہی ہیں اور میرے اندیشے ہی میرے حواس کو دھوکا دینے لگے ہیں۔ کار کی لائٹ بند ہوتے ہی دو سائے سے اترے تھے اور وہ گیٹ کھول کے اندر آگئے تھے۔ دور سے آنے والی اسٹریٹ لائٹ کی مدھم روشنی نہ ہوتی تو تب بھی میں انہیں چال سے پہچان سکتا تھا۔ ان میں سے ایک غالب تھا اور غالب کے ساتھ رابعہ تھی۔ مجھے زمین آسمان گھومتے محسوس ہوئے۔ میرے دل میں چھپ کر بیٹھنے والا شک کا کالا ناگ ایک دم پھن پھیلا کے سامنے آگیا اور جھومنے لگا۔ کچھ دیر پہلے میں جس خیال سے خائف تھا وہ حقیقت کا روپ دھار چکا تھا اور اب اس رُسوا کن' دل شکن اور حوصلہ شکن صورت حال سے مجھے اکیلے ہی نمٹنا تھا۔ میں نے خدا سے مدد کی دعا کی کہ وہ مجھے کسی جذباتی طوفان سے دوچار نہ کرے جس میں اس بندۂ پُر تقصیر کا بیڑا غرق ہو جائے مگر ہر دعا قبول نہیں ہوتی اور ایسی سب دعائیں تو یقیناً مسترد ہو جاتی ہوں گی جب کوئی اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے سے پہلے کہے کہ 'اللہ میاں' میرے قدم نہ لڑکھڑائیں یا پاؤں کٹ جائیں تب بھی میں منہ کے بل نہ گروں'۔

ستم بالائے ستم شیلی نے باتھ میں سیٹی بجانی شروع کردی۔ باتھ روم سنگر میں بھی تھا اور ان بہت سے لوگوں سے بہتر تھا جن کی آواز سن کے پھٹے ڈھول کی آواز بھی بیٹھ جائے یا خوشی سے ہنہنانے والے گدھے پر رقت طاری ہو جائے۔ شیلی غالباً اس سے بھی برا گاتی ہوگی کہ اس نے سیٹی پر اکتفا کی۔ بس وہ دُھن انتہائی تباہ کُن ثابت ہوئی جو وہ نہ جانے کیسے سنا رہی تھی۔ غسل خانے کے ٹائل والی دیواروں کو۔ تمہی ہو محبوب میرے' میں کیوں نہ تمہیں

پیار کروں۔

میں نے دروازہ بجا کے کہا "اے شیلی! یہ کیا بے ہودگی ہے۔"

اس نے سیٹی روک کے اور تنک کے جواب دیا "کیا ہے یار۔"

"لڑکیاں.... شریف لڑکیاں سیٹی نہیں بجاتیں۔ اور یہ.... بہت فضول گانا ہے" میں نے کان آہٹ پر رکھے۔

"مجھے پسند ہے۔ تم کو میرے جذبات کا خیال رکھنا چاہیے۔ کیا سیٹی بجانے سے میں لڑکی نہیں رہی... یا شریف لڑکی نہیں رہی؟"

بحث یا زبردستی سے اسے قائل کرنے کے لیے وقت نہیں تھا اور اب تو اس نے یہی گانا بہ آواز بلند خود گانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے آنے والی مصیبت سے بچنے کے لیے آیت الکرسی پڑھنے کی کوشش کی تو وہ بھی مجھے یاد نہ آئی حالانکہ بچپن سے آج تک میں اس دعا کو ہر رات سونے سے پہلے اسی طرح عادتاً پڑھ لیتا تھا جیسے صبح اٹھتے ہی کلمہ پڑھتا تھا۔ میری ماں نے مجھے بتایا تھا کہ زندگی کے ہر دن کا آغاز اور اختتام ایسے ہی ہونا چاہیے اور میں یہ بات کبھی نہیں بھولا تھا۔

جب میں نے راہداری میں قدموں کی چاپ اور غالب کی آواز سنی تو میرا دل ڈوبنے لگا۔ پھر میں نے خود کو سمجھایا کہ جب میں بے گناہ اور حق پر ہوں تو مجھے بے باک بھی ہونا چاہیے کیونکہ سانچ کو آنچ نہیں۔ بس ایک تو مجھے مشتعل ہونے سے گریز کرنا چاہیے ورنہ عقل متاثر ہوگی اور میں حقائق کو معصومیت کے پُراعتماد انداز میں پیش نہ کر سکا تو ثابت ہوگا کہ سچ کڑوا ہوتا ہے اور چور کی داڑھی میں تنکا ہوتا ہے۔

غالب نے عین دروازے پر آ کے کہا "دال میں کچھ کالا ہے۔"

میں نے اس خیال سے کہ وہ جیمز بانڈ کی طرح دروازہ توڑ کے اور ہاتھ میں ریوالور اٹھا کے داخل نہ ہو' کنڈی کھول دی تھی مگر اس نے ایسا ہی کیا۔ نتیجہ یہ کہ وہ اپنے ہی زور میں سیدھا گزرا اور دھڑام سے فرش پر گرا۔ اس کے پیچھے کھڑی ہوئی رابعہ اندر آئی اور پھر یوں منجمد ہوگئی جیسے اس کے سامنے میں نہیں' خلائی مخلوق کا تصوراتی نمونہ ہو۔ کبھی ہم ان کو کبھی ان کے گھر کو دیکھتے ہیں۔

غالب شرمندگی اور غصے میں کپڑے جھاڑے بغیر اٹھ کھڑا ہوا "تم...."

میں نے مسکرا کے کہا "میرے گھر میں آخر اور کون ہو سکتا تھا۔"

باتھ روم میں سے آواز آئی "تم ہی.... نہ....ہی.... ہو.... ہو۔" وہ غالباً سردی سے کانپ رہی تھی۔

غالب نے دروازے کو اور پھر مجھے دیکھا "یہ کون ہی ہی اور ہو ہو کر رہا ہے؟"

"کر رہی ہے۔" میں نے کہا "یہ شیلی ہے۔ ڈاکٹر شیلا خان۔"

رابعہ کی نظر دروازے پر جم گئی تھی۔ اس کا چہرہ فق ہو رہا تھا۔

باتھ روم میں سے شیلی نے چلا کے کہا "کیا ہوا یار؟ یہ دھماکا کیسا ہوا تھا؟ باتیں کس سے کر رہے ہو' اپنے آپ سے؟"

میں نے جھینپ کے کہا "رابعہ اور غالب آئے ہیں۔ جب یہ آتے ہیں تو دھماکا ضرور ہوتا ہے۔"

اس کا ریاض ختم ہو گیا "واٹ اے سرپرائز۔"

غالب نے سپاٹ لہجے میں کہا "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

سوال کا باقی حصہ اس نے نہیں بولا مگر میں نے سن لیا کہ اس لڑکی کے ساتھ؟ "میں ابھی بتاتا ہوں۔ تم پہلے اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔"

رابعہ نے کہا "مجھے کوئی ضرورت نہیں...."

"دیکھو رابعہ! مجھے یہ شک ضرور تھا کہ تم شک کرو گی مگر یقین نہیں تھا کہ...."

وہ ایک دم پلٹی "غالب! میں جا رہی ہوں۔"

"رابعہ! پلیز' ڈونٹ بی سلی" میں اس کی طرف لپکا "یہاں تک آ کے ایسے مت جاؤ۔ میری بات تو سن لو۔"

"شٹ اپ۔ مجھے معلوم نہیں تھا.... کہ تم...." رقت اور جذبات کی شدت سے اس کی آواز گھٹ گئی۔

"تم غلط سمجھ رہی ہو۔ توہین کر رہی ہو میرے جذبات کی۔ میں اتنا ذلیل ہوں.... رابعہ...."

"تم اس سے کہیں زیادہ ذلیل ہو.... جتنا میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔" رابعہ کے لہجے میں نفرت کا زہر بول رہا تھا "ذلیل مجھے کیا میرے نصیب نے اور غالب نے.... یہاں لا کے۔" وہ پھر دروازے کی طرف بڑھی۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا مگر وہ جاتے جاتے دروازے کو دھڑ سے مار گئی تھی۔ میں بند دروازے سے ٹکرا کے رک گیا۔

چوٹ کی پروا کیے بغیر میں نے دروازہ کھولا۔ میرے کان رابعہ کے قدموں کی آواز سن رہے تھے۔ وہ تیزی سے دوڑتی ہوئی زینے کی طرف جا رہی تھی۔ سینڈل کی سخت ایڑی فرش پر گونج پیدا کر رہی تھی اور سکوت میں یہ آواز گولیوں کی طرح تھی جو میرے دل پر چل رہی تھیں۔

میں نے چلا کے کہا "رابعہ...."

اسی وقت غالب نے پیچھے سے میرا ہاتھ پکڑ لیا "کوئی فائدہ نہیں۔ وہ نہیں رکے گی اور نہ تمہاری بات سنے گی۔"

غالب کے لہجے نے مجھے مشتعل کر دیا اور میں بھول گیا کہ ابھی چند منٹ پہلے میں نے اپنے آپ سے پُرسکون رہنے کا عہد کیا تھا "تمہارا ابھی دماغ خراب ہو رہا ہے۔"

غالب نے سپاٹ لہجے میں کہا "اور کیا کہہ سکتے ہو تم؟ ہم سب کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ پاگل ہم تھے۔ دیوانے تھے۔ ایک تم سیانے تھے...."

"بکواس بند کرو غالب....." میں نے دہاڑ کے کہا۔

"میں بڑی مشکل سے اسے یہاں لایا تھا... اسے میرے دلائل نے قائل نہیں کیا تھا۔ نازو اور منظر اسے سمجھانے میں ناکام رہے تھے لیکن اپنے جذبات کے سامنے وہ نہ ٹھہر سکی۔ اسے معلوم ہوا کہ تم لاپتا ہو تو اس نے جو مصنوعی غصے' بیزاری اور لاتعلقی کی نقاب ڈال رکھی تھی' وہ خود اتر گئی۔ یہ اصل..... وہی پرانی رابعہ تھی جو کل بھی تمہارے لیے پاگل تھی اور آج بھی ہے۔ ہمیشہ رہے گی۔ کوئی کسر نہیں چھوڑی تم نے اسے پاگل خانے پہنچانے میں سکندر۔"

گیلے بال بکھرائے' شانے پر تولیہ پھیلائے اور رابعہ کے کپڑے پہن کے باتھ روم سے برآمد ہونے والی شیلی کسی مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑی سب سن رہی تھی۔ حالات و واقعات کی شہادت نے اس پر بھی وہی فردِ جرم عائد کردی تھی جس میں اس کے ساتھ مجھے برابر کا شریک قرار دیا جاچکا تھا۔ میرے پاس ایسی کوئی دلیل نہ تھی جس سے میں اپنے سچ کو سچ ثابت کرسکتا۔ کون کہتا ہے کہ جیت ہمیشہ سچ کی ہوتی ہے۔ یہاں ایک بے بنیاد الزام کے کوہِ گراں نے سچ کے وجود کو کچل کے مسخ کردیا تھا اور زمین میں دفن کردیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے ہاتھی کا پاؤں چیونٹی پر ہو تو چیونٹی کی آواز بے وجود ہوجاتی ہے اور انسدادِ بے رحمی والوں سے لے کر خود اس کے قریب پھرنے والی کوئی چیونٹی بھی اس کی پکار نہیں سنتی۔

میرا دماغ اچانک گھوم گیا۔ جب عقل ناکام ہو تو جنوں کام آتا ہے۔ احساسِ ذلت اور قوتِ برداشت کی انتہا کو پہنچ کے میں مجبور ہوگیا کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دوں اور یہ پتھر بھی مجھے پتھر مارنے والے ہاتھوں سے چھین لوں۔ الزام ہوتا تو میں سر جھکاتا کہ مجھے سنگسار کردو مگر بے گناہی کے جرم میں سزا قبول کرنا میرا مسلک نہیں تھا۔

میں نے ایک دم غالب کو اٹھا کے بیڈ پر پھینک دیا اور ایک دم چھلانگ مار کے اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا "میں تجھے جان سے ماردوں گا غالب۔ تو میرا دوست ہے' اس کے باوجود میں تجھے اجازت نہیں دے سکتا کہ تو مجھے ایسی گالی دے...."

شیلی نے چیخ ماری "سکندر! آریو میڈ۔ یو سلی فول..."

(ARE YOU MAD? YOU SILLY FOOL?)

چھوڑو اسے۔"

غالب میری آنکھوں میں وحشت کے آثار دیکھ کے ساری مزاحمت بھول گیا تھا۔ اس شخص کی طرح جو کسی خوں آشام آدم خور شیر کے پنجے میں ہو۔ وہ مفلوج پڑا مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے پہلے کبھی اس نے نہ دیکھا تھا۔ پھر شیلی نے پیچھے سے میرے سر پر کوئی چیز ماری اور ایک دم میرے ہاتھ ڈھیلے پڑگئے۔ میرے جسم کی ساری توانائی پریشر ککر کے سیفٹی والو سے خارج ہونے والی بھاپ کی طرح نکل گئی اور میں چکرا کے اسی بیڈ پر گر گیا۔ شیلی نے ایک نیورو فزیشن سے زیادہ ایک ماہرِ نفسیات ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے میرے پاگل پن کے دورے کا بالکل صحیح علاج کیا تھا۔ جسمانی طور پر تو کوئی بھی مجھے زیر نہیں کرسکتا تھا۔

چند سیکنڈ کے لیے میری نظروں کے سامنے اندھیرا آیا پھر میں نے بجھ جانے والے فانوس کی روشنی کو آہستہ آہستہ بڑھتا دیکھا۔ غالب اب میرے قریب کھڑا مجھے تشویش سے دیکھ رہا تھا۔

شیلی مجھ پر جھکی ہوئی میرے گالوں کو اپنے ہاتھوں سے تھپک رہی تھی اور مجھ پر بیک وقت گرم اور ٹھنڈے پانی کے قطرے برس رہے تھے۔ ٹھنڈے پانی کی بوندیں اس کے بکھرے ہوئے گیلے بالوں سے ٹپک رہی تھیں اور گرم قطرے اس کی آنکھوں سے۔

"آئی ایم سوری یار۔ سکندر... پلیز مجھے معاف کردو۔ تمہیں زیادہ چوٹ آگئی۔ بائی گاڈ میں ایسا نہیں چاہتی تھی۔ میں تو یار' تمہیں کنٹرول کرنا چاہتی تھی۔ لو یہ پانی پی لو..... آریو اوکے؟"

میں اٹھ بیٹھا "میں ٹھیک ہوں۔ غالب' یار کیا میں پاگل ہوگیا ہوں؟ میں کیا کررہا تھا آخر..... رابعہ...."

"رابعہ چلی گئی" غالب نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا "چلی گئی... اور تو نے اسے جانے دیا؟"

"اس وقت..... رابعہ کا جانا ہی مناسب تھا" غالب نے عجیب سی نظروں سے شیلی کو دیکھا "لیکن اس کی فکر مت کر۔ کہاں جائے گی وہ یار۔ قیدِ حیات و بندِ غم۔ اصل میں دونوں ایک ہیں۔"

"غالب! وہ جذباتی لڑکی...."

غالب نے نفی میں سر ہلادیا "نہیں۔ وہ پاگل ہوجائے صدمے سے تب بھی خودکشی نہیں کرے گی۔ تجھے اس دنیا میں چھوڑ کے وہ دوسری دنیا میں پہنچ جائے' یہ اسے ہرگز منظور نہیں ہوگا۔ اگر اسے مرنا ہوگا تا.... تو وہ پہلے یہاں آئے گی۔ تجھے گولی مارنے۔ اور جب اسے تیرے مرنے کا یقین آجائے گا تو وہ مرتے وقت بہت خوش ہوگی۔ نہ اسے زندگی میں کوئی تجھ سے جدا کرسکتا ہے' نہ موت...."

مجھے نہیں معلوم کہ غالب نے یہ سب کچھ عمداً شیلی کو یہ بتانے کے لیے کہا تھا کہ وہ کبھی مجھے رابعہ سے نہیں چھین سکتی۔ نہ اپنی دولت' نہ اپنے حسن و شباب کی ساحری سے' نہ اپنی سادگی و پرکاری کے ناز و انداز سے۔ نہ اس بے تکلف' دوستانہ جارحیت سے جو دیارِ مغرب کے ماحول کی عطا کردہ تھی اور جس کی مدد سے وہ رابعہ کی محبت پر غاصبانہ قبضے کو بھی آدابِ عشق میں شامل سمجھتی تھی۔ اور اسے عار نہ تھی کہ یہ دل بری کا انداز کسی طرح معیوب یا خلافِ اخلاق ہے۔ غالب شاید یہ سمجھتا تھا کہ لندن میں پرورش اور تعلیم پانے والی لڑکی تو ایسا ہی سوچتی ہوگی کہ کیا ہوا اگر اس نے کسی کے بوائے فرینڈ پر قبضہ کرلیا۔ وہ کوئی دوسرا تلاش کرلے گی۔ ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔

میں نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ غلط فہمی پر مبنی غالب کے رونے کا شیلی نے کیا اثر قبول کیا تھا اور اس کا ردِعمل کیا تھا۔ میں سخت ذہنی اذیت میں مبتلا ہونے کے باوجود کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح غالب کو اپنے دُکھ درد کا ہم راز اور شریک کرلوں۔ ایک دوست کی حیثیت سے یہ اس کا فرض اور میرا حق تھا۔

میں نے کہا "غالب! رابعہ کا مسئلہ نہیں۔"

غالب نے نظر اٹھا کے شیلی کو دیکھا "پھر کس کا مسئلہ ہے؟"

میں نے کہا "ایک لاش کا جو اس وقت بھی گیراج میں موجود ہے۔"

"گیراج میں۔۔۔؟ کس کی لاش؟" غالب چونکا۔

"رفیق کی۔ اور یہ لاش ہے شیلی کی گاڑی کی ڈکی میں۔"

"گیراج تو بند ہے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ سامنے سے ایسا ہی نظر آتا ہے لیکن ابھی میں تجھے دکھا بھی دیتا ہوں اور بتا بھی دیتا ہوں کہ میں اور شیلی یہاں کیوں چھپے ہوئے تھے۔"

شیلی نے آہستہ سے کہا "میں خود اپنی نظر سے گر گئی ہوں۔ مجھے نہیں معلوم تھا یار کہ جن کو تم دوست کہتے ہو۔۔۔۔ اور سمجھتے ہو۔۔۔۔ وہ تم پر اعتماد نہیں کرتے، اعتبار نہیں کرتے۔ کیسی دوستی ہے یہ آخر۔"

غالب نے دفاعی انداز میں کہا "میں یہ کیسے بھول سکتا ہوں کہ تم اپنے چوہدری دلاور کی بہن ہونے کا دعویٰ بھی رکھتی ہو۔ ایسا ہی ایک دعوے دار اکبر خان تھا جسے ہم خوب بھگت چکے ہیں۔"

"تمہاری بات کو میں کیسے غلط کہوں۔ وقت کی کسوٹی میرے ہاتھ میں نہیں جس پر دوستی اور دشمنی یا محبت اور ہوس کو پرکھا جا سکتا ہے۔ اور تو کوئی ایسا آلہ یا مشین ابھی تک ایجاد نہیں ہوئی جس سے جذبات کی تشخیص ممکن ہو۔ اور فرق کو DIAGONISE کیا جا سکے۔۔۔ تم مجھے نفرت سے قتل کرنا چاہتے ہو۔۔۔"

میں نے شیلی سے کہا "ہم اتنے بے رحم لوگ نہیں ہیں جتنے اس وقت تمہیں نظر آرہے ہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم اپنا حلیہ ٹھیک کرو ڈاکٹر شیلی۔ اس وقت تم خود بہت TENSE ہو۔"

وہ تلخی سے مسکرائی "بہت کہتی تھی میں یار۔ کہ ٹیک اٹ ایزی۔"

"ہاں۔ ٹیک اٹ ایزی۔ میں آتا ہوں غالب کو جائے واردات دکھا کے" میں نے کہا۔

"کیا واردات بھی یہاں ہوئی تھی۔۔؟"

"نہیں۔ میری مُراد تھی وہ جگہ جہاں واردات موجود ہے"

میں اب ابتدائی صدمے سے خاصا سنبھل گیا تھا لیکن میرا سابقہ اس حال نہیں ہوا تھا۔

غالب بھی افسردہ اور پریشان تھا "خدا سمجھے تم سے سکندر۔ پتا نہیں تم کیا کرتے پھر رہے ہو اور کیوں۔۔۔؟"

میں نے برہمی سے کہا "تم سمجھنا نہیں چاہتے تو جاؤ۔ میں خود اپنے معاملات سے نمٹ لوں گا۔"

"بکواس مت فرماؤ۔ چلو۔" اس نے مجھے کھینچ کے دروازے کی جانب دھکیلا۔

رفیق کی لاش ڈکی میں پڑے پڑے اکڑ گئی تھی۔ اس کا خون جم کے سیاہی مائل ہونے لگا تھا اور اس کی بُو کا بھپکا ڈکی کھولتے ہی میرے حواس پر حملہ آور ہوا تو مجھے متلی سی محسوس ہوئی۔

میں نے لائٹ آن کر دی تھی۔ اس کی روشنی ڈکی کے اندر براہِ راست نہیں پہنچ رہی تھی مگر منعکس ہونے والا اُجالا کم نہ تھا۔ غالب نے ایک نظر رفیق پر ڈالی اور پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے ڈکی بند کرنے سے پہلے اسے وہ حروف دکھائے جو رفیق نے اپنے لہو سے لکھے تھے۔

دس منٹ سے بھی کم وقت میں اس نئی اُفتاد کی ساری روداد غالب تک پہنچ گئی تھی۔ اب وہ مجھ سے زیادہ متوحش اور پریشان نظر آنے لگا تھا۔ وہ بار بار افسوس یا ملامت کے اظہار میں سرہلاتا تھا جیسے اسے مجھ سے ایسی حماقت کی توقع نہیں تھی "حد کر دی تم نے" اس نے کئی بار کہا۔

"یہ کیا حد کر دی، حد کر دی کی رٹ لگا رکھی ہے۔ اور میں کیا کرتا؟" میں نے بالآخر چڑ کے کہا "اس لاش سمیت تمہاری خدمت میں حاضر ہو جاتا؟"

"ہاں۔ ہمارے پاس آجاتے۔ کچھ نہ کرتے اور اس اُلو کی پٹھی سے کہتے کہ گاڑی لے کر سیدھی پولیس اسٹیشن چلی جاؤ" غالب نے کہا۔

"کیا تمہیں اندازہ نہیں کہ پولیس کا رویّہ کیسا ہوتا۔۔۔؟"

"بھاڑ میں جائے پولیس کا رویّہ۔ تمہیں اتنی ہمدردی کیوں ہے شیلی سے؟" غالب نے کہا "اور پولیس اسٹیشن نہ سہی، وہ نقوی صاحب کے گھر جا کے سب بتا سکتی تھی۔ وہ سب سنبھال لیتے۔ وقار یوسف کی بیوی ہمارے ساتھ ہے۔ وہ اپنے باپ سے سب کچھ منوا سکتی تھی۔"

"اس کا وقت بھی آئے گا۔ میرے سارے مقدمات کی فائلیں اس وقت نقوی صاحب کی تحویل میں ہیں" میں نے کہا۔

"آخر کیوں؟ کیوں منگوائی ہیں اس نے یہ فائلیں؟"

"ایڈیشنل ہوم سیکریٹری کو تم کیا سمجھتے ہو؟"

"بظاہر تو وہ چوہدری دلاور کا مددگار ہے۔ اس نے دلاور کو اپنے گھر بلا کے موقع فراہم کیا کہ وہ تمہیں بلیک میل کرے۔ انہی فائلوں کی مدد سے۔ اور دلاور نے تم پر دباؤ ڈالا۔۔۔"

"میری معلومات کے مطابق اس نے دلاور پر بھی دباؤ ڈالا تھا۔ اور عین ممکن ہے کہ اس نے تمام مقدمات کی فائلیں نظرِ ثانی کے لیے منگوائی ہوں۔ اس نے دلاور کو موقع فراہم کیا ہو کہ خود معاملات طے کرلو ورنہ میں کیس واپس لینے کے احکامات جاری کرتا

ہوں۔"

"یہی تو سوال ہے۔ دلاور کو یہ موقع کیوں دیا اس نے؟ کیا تعلق ہے اس کا دلاور سے کہ اس نے احکامات جاری کرنے سے پہلے دلاور کو بلایا؟ وہ تمہارا ہمدرد ہوتا' تمہیں شک کا فائدہ دینا چاہتا تو کردیتا آرڈر۔ اسے کون چیلنج کرتا۔ ایڈووکیٹ جنرل یا ڈپٹی ایڈووکیٹ جنرل کی طرف سے عدالت میں مقدمات واپس لینے کی درخواست پیش کردی جاتی۔۔۔۔وہ ضرور دلاور کو کوئی فائدہ پہنچانا چاہتا تھا۔"

"یا اس سے فائدہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔" میں نے کہا "جو بات ہوگی سامنے آجائے گی۔ دیکھتے ہیں وہ بیٹی کی بات کس حد تک مانتا ہے اور بیٹی کیا کرسکتی ہے۔ فی الحال ایک بات کی وضاحت کردوں میں۔ مجھے یہ ڈاکٹر شیلی کسی سازش میں شریک نہیں لگتی۔ تم مجھ سے اختلاف کرنے کا حق رکھتے ہو لیکن میرا دل گواہی دیتا ہے۔۔۔۔"

"تمہارا دل۔۔۔!" غالب نے طنز سے کہا "تمہارے پاس ہے؟ وہ تو غالباً تم رابعہ کو دے چکے تھے۔"

"بکواس سے کیا فائدہ۔ میں اپنی بات پر قائم ہوں۔ شیلی نے جو کچھ بتایا ہے' اس کی تصدیق ہوجائے گی۔ غلط ثابت ہو تو کہنا کہ سکندر بخت تمہاری عقل کی طرح تمہارا دل بھی ناقابلِ اعتبار۔۔۔ فی الحال میں اس سے لاتعلق نہیں ہوسکتا۔ وہ مدد کی مستحق ہے اور میں اسے چوہدری دلاور کا آسان شکار نہیں ہونے دوں گا۔"

"خواہ اس کوشش میں خود شکار ہوجاؤ؟"

"تمہاری مُراد شیلی سے ہے تو وہ مجھے شکار کرنے نہیں آئی تھی۔ اس کے یہاں آنے کا مقصد کچھ اور تھا۔"

"پہلا مقصد کچھ اور تھا۔ ثانوی مقاصد کچھ بھی ہوسکتے ہیں۔"

"تم اسے بلاوجہ نزاعی مسئلہ بنا رہے ہو۔ اگر بعد میں اسے کچھ ہوگیا تو میں نہ تمہیں معاف کروں گا اور نہ خود کو۔"

"چلو چھوڑو۔ یہ بحث لاحاصل اور قبل از وقت ہے۔ میں رابعہ کے حق میں اپنے جذبات سے مغلوب ہوں۔" غالب بولا "ابھی تو تم فون اٹھاکے بات کرو زیڈ یو نقوی صاحب سے۔ ان سے کہو کہ ہم ملنے آرہے ہیں۔"

"کیوں نہ یہ بات شیلی کرے؟"

"شیلی بات کرلے۔ یہ مزید بہتر ہے" غالب نے کہا "ہم گاڑی لے کر ان کے گھر پہنچ جاتے ہیں اور ان سے صاف بات کرلیتے ہیں۔"

"کیا صاف بات۔؟"

"یہی کہ ہم رفیق کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ تو بلیک میلنگ ہوگی۔"

"جینے کا حق مانگنے کے لیے سب جائز ہے۔ وہ فائلیں ہمارے حوالے کردیں" غالب نے کہا۔

"یہ مشکل۔۔۔ بلکہ ناممکن ہے' وہ عدالتی ریکارڈ ہے۔"

"اوّل تو نقوی صاحب جیسے لوگ کوئی کنکر پتھر نہیں جسے کوئی ٹھوکر مار سکے۔ وہ بہت بڑی چٹان بلکہ ایک پہاڑ ہیں۔ ان سے ٹکرانے والا خود پاش پاش ہوجائے گا۔ پھر یہ کہ وہ قانون کو بنانے' بگاڑنے' معطل کرنے اور بدلنے کا حق جانتے ہوں گے۔ ہر بڑے بیورو کریٹ کی طرح۔ وہ ایک ڈکیتی کی رپورٹ لکھواکے عدالتی ریکارڈ کے بارے میں پرانی بات کو سچ ثابت کرسکتے ہیں کہ۔۔۔۔ آں دفتر را گاؤ خورد۔۔۔ گاؤ را قصاب بُرد و قصاب ہم کرد۔ یعنی فائل کو گائے کھا گئی' گائے کو قصائی لے گیا اور اب تو قصائی بھی فوت ہوچکا۔ لیکن ایک ڈائریکٹ طریقہ بھی ہے۔ وہ ہمارے سامنے ہر کیس فائل پر احکامات صادر فرمادیں۔"

"اور نہ فرمائیں تو۔۔۔؟" میں نے کہا۔

"تو ہم پولیس اور اخبار والوں کی موجودگی میں رفیق کی لاش کہیں سے برآمد کراتے ہیں۔ چوہدری دلاور کے گودام سے یا پائیں باغ سے۔۔۔ اور پھر تفصیلات جاری کرتے ہیں شیخ صاحب کے حوالے سے۔۔۔۔"

ہم پھر پچھلی طرف سے نکلے اور کچن سے گزر کے اوپر پہنچے تو شیلی گم صم بیڈ پر بیٹھی تھی۔ شاید وہ اپنی بے سبب تذلیل کے احساس پر آزردہ اور دل شکستہ تھی۔ اسے نہ صفائی پیش کرنے کا موقع ملا تھا اور احتجاج کی اس میں ہمت نہ تھی۔ ملامت اور ندامت کے جذبات کی یورش میں اس کی قوت فیصلہ کا متاثر ہونا فطری بات تھی۔ اس کا تصور کچھ بھی نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ اس نے مجھ سے مدد مانگی تھی اور میری مدد کا فیصلہ کیا تھا۔ یہی ایک فیصلہ تھا جو اس نے خود اپنی عقل سے سوچ سمجھ کے کیا تھا۔ باقی فیصلے تقدیر کے تھے۔ مثلاً یہ کہ وہ چوہدری دلاور کے باپ کی بیٹی تھی۔ خود کو وہ اس کی سوتیلی بہن کہلوانا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ اس کی حد سے بڑھی ہوئی بے تکلفی کی عادت اس کی خوداعتمادی کی مظہر تھی۔ لندن میں پرورش پاکے ڈاکٹر بننے والی کسی لڑکی کے لیے یہ کوئی معیوب بات ہی نہ تھی مگر یہاں معیار مختلف تھے۔ دُہرے معیار تھے اور ان میں لچک نہ تھی ورنہ انصاف سے دیکھا جاتا تو تمام عمر مغربی تہذیب اور مادر پدر آزاد معاشرے میں گزارنے کے باوجود اس کی مشرقیت برقرار تھی۔ وہ بہترین اُردو بولتی تھی' پاکستانی لباس پہنتی تھی' بے تکلفی کے باوجود فاصلے برقرار رکھتی تھی اور اس کی نسوانیت کا تقدس کسی حصار کی طرح اس کی شخصیت کو گناہ گار نظروں سے تحفظ فراہم کرتا تھا۔

میں نے کہا "ڈاکٹر شیلی! واٹ از دی میٹر۔ " WHAT IS THE MATTER

اس نے مجروح نظریں اٹھائیں DONT YOU KNOW۔ کیا تمہیں واقعی نہیں معلوم؟"

میں نے کہا "چھوڑو یار۔ تم جیسی لڑکی کو ایسی چھوٹی

باتوں سے رنجیدہ نہیں ہونا چاہیے۔"

"کیوں یار؟ صرف اس لیے کہ میں لندن سے آئی ہوں۔ چوہدری دلاور کا باپ میری بدقسمتی کے باعث میرا بھی باپ تھا۔ میں اس معاشرے کے دوغلے معیاروں کی گھٹن میں پل کے بڑی نہیں ہوئی۔ مجھ پر کوئی بھی الزام عائد کیا جاسکتا ہے۔ ہر شخص سے میرا تعلق نہیں مگر تم جیسے پڑھے لکھے' روشن خیال اور باضمیر کہلانے والے بھی مجھے بے حیا اور آبرو باختہ سمجھنے لگیں...."

"فار گاڈ سیک شیلی! کیا کہہ رہی ہو تم...."

"وہ جو تمہاری نظریں کہہ رہی تھیں یار۔ یہ میرے نہیں تمہارے جذبات ہیں مسٹر غالب۔" اس نے تلخی سے کہا "تم صحافی ہو۔ تمہارا ذہن تو مختلف ہونا چاہیے۔ تمہاری OUT LOOK میں وسعت اور فراخ دلی ہونی چاہیے یار۔ یہ زرد صحافت YELLOW JOURNALISM کا گھٹیا پن نہیں۔"

غالب سخت شرمسار تھا "دیکھو' میں تمہارے الزامات کی نفی نہیں کروں گا اور اپنی صفائی پیش نہیں کروں گا۔ کیچڑ میں جتنے پتھر پھینکے جائیں اتنے ہی چھینٹے اچھلتے ہیں۔ میں تم سے معافی مانگ سکتا ہوں۔ میری سوچ غلط تھی۔ یار I WAS WRONG۔ کیا یہ کافی ہے؟"

شیلی مسکرانے لگی "تم بھی اب میری زبان بولنے لگے ہو۔ او کے کہا سُنا معاف۔ ہاتھ ملاؤ۔"

غالب نے اس سے ہاتھ ملایا "NO HARD FEELINGS اب دل میں رنجش نہیں رہنی چاہیے۔"

میں نے کہا "شیلی! وقت کم ہے۔ تم یہ ریسیور اٹھاؤ اور بات کرو توپ.... میرا مطلب ہے اپنے ڈیڈ یو نقوی صاحب سے۔"

"یہ توپ کا لفظ بیچ میں کہاں سے آگیا تھا؟" شیلی نے ریسیور اٹھاتے ہوئے کہا۔

"وہ.... دراصل۔ ان کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ وہ بڑی توپ چیز ہیں۔ جیسے انگریزی میں کہتے ہیں کہ " HE IS A BIG GUN

"ان سے کیا کہوں؟"

"کہو کہ میں بڑی مشکل میں ہوں۔ اسی وقت تشریف لانا چاہتی ہوں کیونکہ دنیا میں آپ ہی میرے مشکل کشا ہیں۔" میں نے کہا "میرا یا غالب کا حوالہ بالکل مت دینا۔ یہ بھی مت بتانا کہ کہاں سے بول رہی ہو اور مشکل کیا ہے۔ بس یہ کہنا کہ میں آکے بتاتی ہوں۔ وہ بہت ٹالیں گے کہ لڑکی کیا دماغ خراب ہے تمہارا۔ آدھی رات کے وقت کیا قیامت آرہی ہے۔ صبح آنا۔ مگر تم ایک مت سننا۔"

شیلی نے سرہلایا "میں سمجھ گئی مگر کیا ہم...."

"ہاں۔ ہم رفیق کو ان کے سپرد کرنے کا فیصلہ کرچکے ہیں۔ یہ ایک ماموں کا فرض ہے کہ وہ بھانجے کی آخری رسوم کی ذمے داری قبول کرے اور اس کی تجہیز و تکفین...."

میری بات نامکمل رہ گئی کیونکہ شیلی نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کردیا تھا۔ "ہیلو.... سر میں شیلی ہوں۔ ڈاکٹر شیلا خان۔ سوری سر.... معاملہ ہی کچھ ایسا تھا کہ میں نے آپ کی نیند ڈسٹرب کی۔ یہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے میرے لیے۔ میں نہیں بتاسکتی سر۔ نو سر۔ فون پر کچھ نہیں کہہ سکتی۔ سخت خطرہ لاحق ہے مجھے۔ نہیں سر.... پولیس کا نام بھی مت لیں۔ سوری.... میرا مطلب تھا کہ مجھے نہیں لینا چاہیے۔ ناممکن سر۔ میں.... میں آنا چاہتی ہوں۔ جی ابھی' آپ کے پاس.... نو سر۔ صبح؟ صبح تک مجھے زندگی کا اعتبار نہیں۔ میں نکل رہی ہوں سر۔ اپنے گارڈ سے کہہ دیں۔ میں کچھ نہیں جانتی سر۔ آپ کے دروازے پر میرا خون ہوجائے گا تو لاش پڑی رہے گی صبح تک وہیں۔ میں کہیں اور نہیں جاسکتی۔ مرنے کے لیے بھی نہیں...." اس نے ایک دم ریسیور رکھ دیا۔

"گڈ۔ ویری گڈ۔ تمہاری پرفارمنس اچھی رہی۔"

"اب چلو۔" غالب نے چٹکی بجائی۔

"یار' میں بھی حُلیہ ٹھیک کرلوں۔ بھوت بنا ہوا ہوں۔"

"تازہ ہوتی تو میں کہتا کہ کوئی میرا سُسر نہیں بن سکتا" غالب نے کہا "یہ حُلیہ بالکل ٹھیک ہے۔ ایک پریشان حال' بدبخت اور مصیبت کے مارے کا گیٹ اپ ایسا ہی ہونا چاہیے۔"

"یار' وہ نقوی صاحب اس پر بھی خفا ہوں گے.... خیر.... جہاں سیر وہاں سوا سیر۔" میں نے کہا۔

میں نے لائٹس آف کرتے ہوئے اس خواب گاہ کو دیکھا جس کے درودیوار مجھے خفا خفا سے لگتے تھے۔ میری لاتعلقی اور عدم توجہی پر شکوہ کناں تھے۔ اس بیٹے کی طرح جسے والدین سے گلہ ہو کہ اپنی مصروفیت میں وہ اس کو شفقت دینا بھولے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ دیواروں کے کان تو ہوتے ہیں مگر ان کا دل کس نے دیکھا ہے۔ یہ تو احساس کی بات ہے کہ گھر کی دیواریں' بام و در کس طرح اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ جب صاحب خانہ کی میت اٹھتی ہے تو کیسے وہ سب کے ساتھ آنسو بہاتے ہیں اور جب گھر میں خوشی کے شادیانے بجتے ہیں تو وہ کیسے مسکراتے رہتے ہیں۔ کچھ خواب میرے تھے جن میں اس گھر کے درودیوار شامل تھے۔ شاید ایسے ہی خواب یہ گھر بھی دیکھتا تھا اور اسے بھی تعبیر کا انتظار تھا جو طویل ہوتا جارہا تھا۔

نیچے جاتے ہوئے میں نے ایک دیوار پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ میں آؤں گا۔ بہت جلد' پھر نہ جانے کے لیے۔

نیچے غالب نے گیراج کے دروازے کا راستہ صاف کرنے کے لیے سامنے پڑا ہوا کاٹھ کباڑ ہٹانا شروع کردیا تھا۔ شیلی اس کام میں غالب کا ہاتھ بٹانے پر مُصر تھی۔

"ڈاکٹر شیلی! یہ تمہارے کرنے کا کام نہیں۔"

"کیوں؟ کیا میں معذور ہوں؟" اس نے کہا۔

"یہ کام عورتوں کا نہیں ہے یار" میں نے کہا۔

"تم مرد بڑے خود غرض، متعصب اور سازشی ہو یار۔ تم نے ہمیں ناکارہ بنانے کے لیے صنف نازک کا خطاب دیا۔ زبان سے ضرور کہتے ہو کہ عورتوں کو مرد کے شانہ بشانہ کام کرنے کا حق حاصل ہے مگر اس کے لیے مواقع فراہم نہیں کرتے۔" شیلی نے اپنا کام جاری رکھا "بھئی میں کیا کرسکتی ہوں اور کیا نہیں، اس کا فیصلہ مجھے کرنے دو۔"

اس وقت تک میں نے غالب کے ساتھ مل کے راستہ صاف کردیا تھا "او کے ڈاکٹر صاحب۔ ہم مرد سخت شرمندہ ہیں۔ اب کیا آپ ڈرائیونگ سے بھی شوق فرمائیں گی؟"

"آف کورس۔ ڈرائیونگ میں کروں گی۔ بس تم راستہ بتاتے جانا" اس نے چابی کے لیے ہاتھ پھیلایا۔

"سوری۔ میں دونوں کام خود کرسکتا ہوں اس لیے کہ میں آپ کے مقابلے میں زیادہ COMPETANT ہوں" میں نے کہا مگر شیلی نے نہیں مانا۔

چند منٹ بعد ہم اس جگہ سے رخصت ہوئے تو سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا کہ ہمارے آنے سے پہلے تھا۔ گزرے ہوئے وقت کا کوئی سراغ تھا تو صرف ہمارے ذہن میں۔ یادوں کی صورت میں۔ کاتبِ وقت نے عمرِ گزشتہ کی کتاب میں چند سطریں اور لکھ دی تھیں۔ وقت اور مقام کے ساتھ زندگی کے ایک تجربے کا احوال۔

سڑکیں سنسان تھیں اور ہمارا راستہ روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ شیلی اچھی ڈرائیور تھی اور گاڑی اتنی اچھی تھی کہ اس کی خواہش کی پوری طرح اطاعت کرتی تھی۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں کو زیادہ زحمت نہیں اٹھانی پڑ رہی تھی۔ ماڈل ٹاؤن کی خستہ اور خراب سڑکوں پر بھی اس کے جمپ ہر زیادتی برداشت کررہے تھے۔ میں اور غالب سمٹ کر آگے ہی فٹ ہوگئے تھے۔

اچانک غالب نے کہا "تو پھر پینے لگا ہے؟"

میں سمجھ گیا "ہاں۔ اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی۔ اس آگ کو آگ ہی بجھاسکتی ہے۔"

غالب بولا "شراب سمجھ کے پی رہے ہو سگریٹ، تو حرام ہے۔"

"میں روح افزا سمجھ کے پی رہا ہوں" میں نے شیلی کو مزید ہدایات جاری کرتے ہوئے کہا "یہ گلی...."

"یار، اب مجھے معلوم ہے۔ وہ سامنے والا مکان ہے نا؟" شیلی نے کہا۔

"مکان! افسوس لڑکی۔ تم ایسی توپ چیز کے قصرِ عالی شان کو صرف مکان کہہ رہی ہو۔ نقوی صاحب کے سامنے ایسی گستاخی کروگی تو مار کھاؤگی۔" میں نے کہا۔

شیلی نے گاڑی کو گیٹ پر روکا ہی تھا کہ سائڈ کی کھڑکی سے گارڈ نے جھانک کے دیکھا۔ اس نے شیلی سے نام پوچھا اور پھر انٹرکام پر نقوی صاحب کو گاڑی کا نمبر بھی بتایا۔ ایک منٹ بعد اس نے ہمارے بارے میں پوچھا "صاحب بولتے ہیں کہ مس شیلی کے ساتھ کون ہے؟"

میں نے کہا "ان کو بولو کہ سکندر بخت اور غالب۔"

گارڈ نے یہ اطلاع اندر پہنچائی اور پھر سہلانے لگا "صاحب بولتے ہیں کہ صرف مس شیلی اندر جاسکتی ہیں۔"

اب شیلی نے چلّا کے کہا "یار ٹو ہیل ود یور صاحب۔ گیٹ کھولتے ہو یا میں دروازہ توڑتی ہوئی گاڑی اندر لے جاؤں۔ کرتے رہنا فائرنگ۔"

گھبراہٹ میں چوکیدار نے فوراً یہ دھمکی اندر پہنچائی اور پھر "یس سر۔ یس سر" کہتے ہوئے گیٹ کھول دیا۔ شیلی نے گاڑی کو غصے میں زیادہ ہی تیز دوڑایا اور پھر ایک دم بریک لگائے۔ رُکتے رُکتے بھی گاڑی پورچ میں موجود سرکاری کار سے ٹکراگئی۔ اس وقت تک نقوی صاحب نائٹ گاؤن میں باہر آچکے تھے اور ہاتھ جیبوں میں ڈالے کھڑے تھے۔ نیچے اترنے سے پہلے ہی میں نے ناگواری کے آثار شکنوں کی صورت میں دیکھ لیے تھے جو اُن کے ماتھے پر بہت نمایاں تھیں۔

انہوں نے میرے اور غالب کے مؤدبانہ سلام کا جواب بڑی نخوت سے سہلا کے دیا۔ مصافحے کے لیے ہاتھ جیب سے نکالنا ان کی شان کے خلاف تھا۔

شیلی نے کہا "معاف کیجیے گا، آپ کی گاڑی..."

"گولی مارو گاڑی کو۔" نقوی صاحب نے کہا "ڈاکٹر شیلی! اب میں سمجھ گیا کہ زندگی اور موت کے مسئلے سے تمہارا کیا مطلب تھا۔"

"نو سر۔ آپ کا غلط خیال ہے کہ آپ سمجھ گئے ہیں۔" شیلی نے صاف گوئی سے کام لیا "ابھی آپ کو کچھ نہیں معلوم۔"

نقوی صاحب بگڑ گئے۔ "ان دونوں کو تمہارے ساتھ دیکھنے کے بعد میں تمہارے رویے کو سمجھ گیا ہوں لڑکی۔ اور کون ہوسکتا ہے تمہارے پیچھے شامت اعمال کے سوا۔ میں سب جانتا ہوں۔"

لیکن شیلی ایسے خاموش ہونے والی نہیں تھی "میں پھر کہوں گی سر کہ آپ فرض کررہے ہیں۔ مسئلے کا ان دونوں سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ یہ میرا مسئلہ ہے اور مجھ سے زیادہ آپ کا لیکن یہاں کھڑے کھڑے تو سب باتیں نہیں ہونی چاہئیں۔"

وہ کچھ کہے بغیر پلٹ گئے۔ آگے شیلی اور اس کے پیچھے ہم مجرموں کی طرح سر جھکائے ڈرائنگ روم میں پہنچے۔ اتنے صاف ستھرے اور سجے سجائے ڈرائنگ روم میں مجھے اپنا وجود کسی خارش زدہ کتے کی طرح محسوس ہوا جو کسی اسپتال کے وارڈ میں گھس گیا ہو۔ میرے کپڑوں پر، بالوں میں اور ہاتھوں پیروں پر وہ سب دھول تھی جو میں نے اپنے گھر کے فرش سے حاصل کی تھی۔ یہ مٹی مجھے عزیز ہوسکتی تھی، نقوی صاحب کے لیے یہ انتہائی ناقابلِ برداشت

تھی۔
توپ کا رخ اب میری طرف ہوگیا۔ "مسٹر سکندر! مجھے یقین ہے کہ شیلی کے ساتھ تم بلاوجہ نہیں آئے ہو۔ میں بد اخلاق ضرور ہوں لیکن تم جیسے بدتمیزوں کے ساتھ۔ تم کو شاید نہ آتی ہو مگر مجھے شرم آرہی ہے تمہارا یہ حُلیہ دیکھ کر۔"
میں نے کہا "معاف کیجئے گا سر۔ میں کسی بوفے ڈنر پارٹی سے نہیں آیا ہوں۔ اور آپ پریشان ہیں اس خیال سے کہ صوفے اور قالین گندے ہوجائیں گے۔"
"شٹ اپ۔ میں صرف تمہیں احساس دلانا چاہتا تھا کہ کسی مجبوری کی وجہ سے میں نے تمہیں اندر نہیں بلایا۔ نہ میں دھمکی سے ڈرا تھا اور نہ میری اجازت کے بغیر تم اس ڈرائنگ روم میں قدم رکھ سکتے تھے۔ یہ صوفے اور قالین میں روز بدل سکتا ہوں... سمجھے۔"
"جی سمجھ گیا۔" میں نے اطمینان سے ایک صوفے پر بیٹھ کے کہا "میں آپ کا احترام کرتا ہوں۔ اس لیے کہ آپ بزرگ ہیں اور ہم جیسے نامعقول بچوں کے لیے بھی دل میں ایک نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ کسی ایڈیشنل ہوم سیکریٹری کا عہدہ مجھے متاثر نہیں کرتا۔"
وہ شیلی کی طرف متوجہ ہوگئے "تم کو جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں تھی کہ تمہارے ساتھ کوئی نہیں ہے۔"
"وہ ایسا ہے کہ تھوڑا بہت جھوٹ ضرورت کے مطابق ہم سب ہی بولتے ہیں یار...." شیلی روانی میں کہہ گئی۔
حسب توقع نقوی صاحب اچھل پڑے "یار! یو کال می یار! تمہاری اتنی جرائت لڑکی۔ ذرا اپنی عمر دیکھو۔ میرے بچپن کے دوست مجھے یار نہیں کہتے۔ حد ہوتی ہے بے ہودگی کی...."
"سوری سر۔ ویری سوری۔ بس ایک بری عادت ہے مجھے" شیلی نے ہکلا کے کہا "اب یہ غلطی نہیں ہوگی۔ میں انکل کہوں گی آپ کو۔ غالباً آپ کا بی پی بہت ہائی ہے۔ دوا کون سی لیتے ہیں آپ؟ ALDOMAT؟ اور نمک کون سا استعمال کرتے ہیں؟ پوٹاشیم کلورائڈ۔ عام نمک تو نہیں..."
نقوی صاحب صوفے پر بیٹھ گئے۔ "میں بھول گیا تھا کہ تم ڈاکٹر ہو۔"
ڈاکٹر شیلی نے نقوی صاحب کی کمزوری دریافت کرلی تھی اور اچانک ان کی ہمدردی حاصل کرنے کا یہ نسخہ کامیاب رہا تھا۔ نقوی صاحب نے چند منٹ اس سے اپنے بلڈ پریشر، ڈاکٹروں کی نااہلی، دواؤں کی بے اثری اور اپنے پرائے سب کے غصہ دلانے والے رویّے کا گلہ کیا جن کی وجہ سے انہیں کم خوابی اور ڈیپریشن تک ہوجاتا ہے۔ انہوں نے اپنی بے احتیاطی، تفکرات مول لینے کی عادت، حصولِ زر کی ہوس اور اس کے لیے دن رات کی تگ ودو کا ذکر کرنے سے گریز کیا۔ ہم انتظار کرتے رہے کہ وہ ہماری موجودگی کا بھی نوٹس لیں۔
دس منٹ بعد انہوں نے قدرے مُربیانہ لہجے میں کہا "بھئی میں تو اس وقت کچھ نہیں پیتا۔ تم لوگ کافی پی لو۔"
وہ پوچھنے کے عادی نہیں تھے۔ حکم دینے کے عادی تھے۔
"اب بتاؤ کیا قیامت آرہی تھی آدھی رات کو؟"
شیلی نے کہا "آپ ذرا پُرسکون رہیں انکل۔ یہ بات کچھ ایسی ہے کہ آپ کو ڈسٹرب کرسکتی ہے۔ میں نے وضاحت تو کردی تھی کہ مسئلہ میرا بھی ہے اور آپ کا بھی۔"
"او کے۔ او کے۔ اتنی تمہید کافی ہے" وہ جھنجلا کر بولے "آگے بولو۔"
"انکل! آپ کا پی اے ہے رفیق" شیلی نے کہا "اس کے بارے میں کچھ معلوم ہے آپ کو، وہ کہاں ہوگا؟"
"وہ.... ہوگا اپنے گھر میں۔ سورہا ہوگا۔ ویسے تو لڑکا ٹھیک ہے لیکن اسے پولیس نے پکڑلیا ہو کسی الزام میں تو مجھے صدمہ نہیں ہوگا۔ زمانہ ہی ایسا ہے...."
اب میں نے کہا "آپ کے پی اے کو بھلا پولیس کسی جھوٹے الزام میں پکڑ سکتی ہے۔ معاملہ اس سے کہیں زیادہ سیریس ہے۔"
اب وہ متفکر ہوئے "کیا قتل کردیا ہے اس نے کسی کو؟ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے؟ دشمن تو کوئی رقیب ہی ہوگا۔ اس عمر میں سب پاگل ہوتے ہیں۔ ایک ہی لڑکی کے لیے مرنے مارنے پر اتر آتے ہیں۔"
میں نے کہا "معاملہ اس کے برعکس ہے سر۔"
"کیا مطلب؟ صاف کیوں نہیں کہتے۔ میں یہ چکروالی بات بالکل پسند نہیں کرتا" نقوی صاحب بگڑ گئے۔
"اسے کسی نے قتل کردیا ہے سر۔" میں نے کہا اور اپنے الفاظ کا ردِعمل دیکھنے لگا۔
نقوی صاحب چونکے اور مجھے گھورنے لگے۔ آہستہ آہستہ میرے الفاظ کا مفہوم ان پر عیاں ہوتا گیا۔ ان کے ماتھے کی شکنوں کا جال گہرا ہوگیا "رفیق کو قتل کردیا ہے۔ کس نے.... کیوں؟"
میں نے نفی میں سرہلایا "ان دونوں سوالوں کا جواب غالباً آپ کی پولیس بھی نہیں دے سکتی۔ نہ آج نہ کل۔ کچھ جواب ایسے ہی ہوتے ہیں جو گول کردیے جاتے ہیں۔"
"کیا مطلب؟"
"کیا میں اس ملک کی سیاسی تاریخ کے قتل گنواؤں؟ رفیق کا قتل سیاسی تو خیر نہیں مگر اسی نوعیت کا ہے۔"
"یہ سب تم کیسے جانتے ہو؟" انہوں نے اچانک دہاڑ کے کہا۔
"آپ بیٹھ جائیں انکل۔ کون سی گولی کھاتے ہیں آپ...."
"گولی مارو گولی کو۔" نقوی صاحب نے گاؤن کی جیب میں سے ایک شیشی نکال کے ایک گولی منہ میں رکھ کے پانی کا ایک گھونٹ لیا۔ گلاس کو ٹرے میں رکھ کے وہ پھر بیٹھ گئے اور انہوں نے شیلی کو ہاتھ سے اشارہ کیا کہ کافی بنائے۔

چند منٹ کی خاموشی کے بعد نقوی صاحب نے ایک گہری سانس لی "کہاں ہے رفیق؟ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"دیکھ لیجیے گا۔ جلدی کیا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں اس کے قاتل کے سارے خاندان کو پھانسی کے تختے تک پہنچادوں گا۔" انہوں نے شعلہ فشاں لہجے میں کہا۔

"بہت مشکل ہے سر۔ اگر میں آپ کو بتادوں کہ اس قتل کے پیچھے کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے تب بھی۔ تفتیش تک آپ کے اختیار میں نہیں۔"

نقوی صاحب گرجے "تم جانتے ہو میں کون ہوں؟"

"میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ رفیق صرف آپ کا پی اے نہیں تھا۔ وہ آپ کا بھانجا تھا۔" میں نے ہمت کرکے توپ کے سامنے گولہ داغ دیا۔

ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے ان کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ ان کا چہرہ کھنچ گیا اور آنکھوں کے نیچے کے عضلات پھڑکنے لگے۔ ان کی نظر مجھ پر ٹھہر گئی اور ان کے ہاتھوں نے صوفے کے کشن کو یوں جکڑلیا جیسے وہ کسی کا گلا گھونٹ رہے ہوں۔

شیلی نے فوراً صورت حال کو سنبھالا "انکل! میں نے کہا تھا۔"

نقوی صاحب کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی "یہ.... تم کیسے جانتے ہو؟"

میں نے کہا "مجھے ڈاکٹر شیلی یعنی شیلا خان نے بتایا ہے اور ان کو بتایا تھا شیخ صاحب نے۔"

"کون شیخ صاحب؟"

شیلی نے کہا "ان کا اصل نام کچھ اور ہے۔ آپ چاہتے ہیں میں ان کا نام لوں؟ ویسے آپ سمجھ گئے ہوں گے انکل کہ اس راز سے کون واقف تھا؟"

ان کا چہرہ آہستہ آہستہ سپاٹ ہوتا گیا۔ انہوں نے گاؤن کی جیب میں سے ایک اور گولی نکالی "پانی دو مجھے۔ اور دس منٹ کی مہلت تاکہ میں اس صورت حال کو سمجھنے کے قابل ہو جاؤں۔"

دس منٹ بعد وہ پھر پرسکون ہو گئے تو میں نے کہا "سہولت کی خاطر ہم اصل نام کی جگہ شیخ صاحب کا نام استعمال کریں گے۔ یہ شیخ صاحب آج بھی لندن میں ہیں اور....."

"دی بلیک میلر۔ دی باسٹرڈ...." نقوی صاحب زیرِ لب دانت پیس کر بولے "وہ کیا چاہتا ہے مجھ سے؟"

میں نے کہا "آپ جاننا چاہتے تھے کہ رفیق کے قتل کے پیچھے کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ فرض کیجیے میں کہوں کہ اسے مروانے والا چوہدری دلاور ہے تو کیا کریں گے آپ؟ تختۂ دار تک پہنچادیں گے اسے؟"

"تمہارے کہنے پر؟" انہوں نے حقارت اور تلخی سے کہا۔

"میں نے نشاندہی کی ہے۔ آپ تفتیش کرانے کا اختیار رکھتے ہیں۔ آپ کو ثبوت بھی مل جائے گا۔ لیکن سر.... آپ کچھ نہیں کریں گے۔"

"ڈونٹ سے دیٹ اگین۔ DONT SAY THAT AGAIN"

میں نے اپنی بات جاری رکھی "آپ اس لیے کچھ نہیں کریں گے کہ ایک تو چوہدری دلاور معمولی آدمی نہیں، بڑا بزنس مین ہے۔ آپ کو یقیناً معلوم ہو گا کہ اس کے ذرائع آمدنی کیا رہے ہیں۔ آج کل وہ کیا کرتا ہے جو اسے نہیں کرنا چاہیے۔ مثلاً وہ اسمگلنگ کرتا ہے اور ایسے ہی دیگر غیر قانونی کاروبار۔ امورِ داخلہ کے ماتحت دس قسم کے محکمے ہیں۔ پولیس، ایف آئی اے، سی آئی اے، اسپیشل پولیس، انٹیلی جنس بیورو، کوسٹ گارڈ، بارڈر پولیس۔ ان سب سے آپ کو مکمل معلومات حاصل ہوتی ہیں۔"

"کم ٹو دی پوائنٹ۔ کیا کہنا چاہتے ہو تم؟"

میں نے کہا "دلاور بہت کچھ نہیں کرتا جو اسے کرنا چاہیے۔ مثلاً اسے پورا انکم ٹیکس دینا چاہیے۔ ملک کا پیسہ ملک میں رکھنا چاہیے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس ملک میں کوئی ایک چوہدری دلاور نہیں۔ سیکڑوں ہزاروں سے بھی زیادہ تعداد ہے ایسے لوگوں کی لیکن میں چوہدری دلاور کا ذکر کررہا ہوں۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ اس سے آپ کا یقیناً کوئی تعلق ہے۔ کاروباری یا...."

"بکواس بند کرو۔"

"میں سُنی سُنائی بات نہیں کہتا نقوی صاحب۔ میں چشم دید گواہ ہوں۔ میں نے اسی گھر میں چوہدری دلاور سے ملاقات کی تھی۔ کیوں موجود تھا وہ یہاں؟ اس کے پاس میرے تمام مقدمات کی فائلیں کیسے پہنچ گئی تھیں؟"

"یہ جھوٹ ہے" نقوی صاحب نے کمزور لہجے میں کہا۔

"لیکن آپ مانتے ہیں کہ میرا جھوٹ ہی سب سے بڑا سچ ہے۔ ورنہ یہ کیسے ممکن ہوا کہ چوہدری دلاور نے رفیق سے کہا کہ وہ فائلیں لاؤ اور آپ کے پی اے نے اسے تمام فائلیں پیش کردیں۔ عدالتی ریکارڈ آپ کے گھر میں کیسے آیا؟ رفیق خود تو اتنے اختیارات نہیں رکھتا تھا اور نہ چوہدری دلاور۔ ہاں عدالتی عملے پر اور محکمۂ داخلہ کے حکام پر آپ کا حکم چلتا ہے۔ یہ فائلیں آپ نے منگوائی تھیں اور شاید اس وقت بھی آپ کے پاس ہوں گی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ فائلیں میرے دشمن کے ہاتھ میں دینے والا کون تھا؟ اور میرے جانی دشمن کی مدد کرنے کا مقصد کیا تھا؟ یہاں، اسی کمرے میں اس نے مجھے بلیک میل کیا۔ انہی فائلوں کی مدد سے مجھے دھمکی دی کہ میرے خلاف سارے کیس پھر کھول دیے جائیں گے لیکن میں اس کے سامنے ہتھیار ڈال دوں تو سب ختم۔ کیا وہ اتنا با اختیار ہے نقوی صاحب؟ کیسے دعویٰ کررہا تھا وہ اتنا بڑا؟ یہ بات آپ کہہ سکتے تھے۔ آپ کے پاس ہوم سیکریٹری کہہ سکتے تھے۔ آپ کا ماتحت کوئی ڈپٹی سیکریٹری، کوئی انسپکٹر جنرل پولیس کہہ سکتا تھا۔

چوہدری دلاور کیا چیز ہے آخر؟ آپ کہیں گے کچھ نہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ کتنا بڑا شکاری ہے۔ آپ بھی ڈرتے ہیں اس سے۔ آج تک آپ کے اختیار اور اس کی دولت کے درمیان ایک توازن تھا جس کی بنیاد پر آپ نے اور اس نے ایک انجمن مفادِ باہمی بنا رکھی تھی۔ ایسی کوئی نہ کوئی انجمن ہر جگہ ہے۔ ہر بیوروکریٹ' بدعنوان سیاست داں' نام نہاد قانون کے محافظ' پبلک سرونٹ' بزنس مین' صنعت کار' ٹھیکے دار۔ ہر سطح پر ایسے لوگ ہیں جو اپنے مفاد کے سودے کرتے ہیں۔ میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاسکتا۔ آپ سے بھی چوہدری دلاور نے کوئی سودا کیا ہوگا؟"

"تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میں تمہارے مقدمات کی فائلوں پر نظرِثانی کررہا تھا۔ میں تمہیں شک کا فائدہ پہنچا کے تمہاری مشکلات آسان کرنا چاہتا تھا۔"

"آخر کیوں؟"

"صرف اپنی پاگل بیٹی کی وجہ سے جس نے ایک کنگال وکیل سے شادی کی۔ میری مرضی کے خلاف" نقوی صاحب نے شکست خوردہ لہجے میں کہا "سب ماؤں کو بلیک میل کرتے ہیں ان کے بیٹے۔ پیدائش کے وقت سے مرتے دم تک۔ اور میرے جیسے باپ بھی بلیک میل ہوتے ہیں تو صرف بیٹی سے......"

"میں قدر کرتا ہوں آپ کے اعتراف کی لیکن معاملے کا دوسرا پہلو بھی ہے میری نظر میں۔" میں نے کہا "آپ نے اپنی مجبوری کو بھی کیش کرالیا۔"

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟"

"ثبوت! کیا اس حقیقت کو ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے جو سب پر عیاں ہوجائے۔ مثلاً شیخ صاحب کی گواہی کے بعد کسی کو ثبوت کی ضرورت نہیں ہوگی کہ رفیق آپ کا بھانجا تھا اور آپ کی خاندانی تاریخ کا ایک سیاہ باب سب کے سامنے آجائے گا۔"

"تم... مجھے بلیک میل کرنے آئے ہو؟" نقوی صاحب چلّانے لگے۔

"آہستہ نقوی صاحب! آہستہ۔ ابھی صرف ہم سُن رہے ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ باہر کا کوئی بھی آدمی کچھ سُنے" میں نے کہا "جسے آپ بلیک میلنگ کہہ رہے ہیں' وہ میرے نزدیک سودا ہے۔ سودا آپ نے بھی کیا تھا چوہدری دلاور سے۔ اگر میرا مفروضہ غلط ہو تو تردید کردیں۔ آپ نے اسے بُلا کے کہا کہ دیکھو' میں مجبور ہوں۔ مجھے سکندر کے خلاف کیس کمزور بنانے ہیں یا ختم کرنے ہیں۔ اس کام کو تھوڑا سا مؤخر کیا جاسکتا ہے مگر ٹالا نہیں جاسکتا۔ درمیانی مدت میں تم کوئی فائدہ اٹھانا چاہو تو سکندر سے بات کرلو۔ دیکھو شاید وہ مان جائے تمہاری بات۔ اور دونوں کا مسئلہ حل ہوجائے۔ ممکن ہے چوہدری دلاور نے کہا ہو کہ نقوی صاحب' فائلیں میرے گھر پہنچادو پھر میں بلاتا ہوں اسے۔ لیکن اتنا بڑا خطرہ آپ نہیں مول لے سکتے تھے۔ آپ نے کہا کہ فائلیں میرے پاس ہیں۔ کسی دن میری عدم موجودگی میں آجاؤ' رفیق سے فائلیں منگوالو اور میرے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کے بات کرلو۔ یہ رعایت کیوں دی آپ نے چوہدری دلاور کو؟ کیوں بتایا اسے کہ آپ میرے خلاف کیس ختم کررہے ہیں؟ ظاہر ہے ہر بات کی کوئی وجہ ہوتی ہے۔ اور گستاخی معاف' آپ جیسے یا دلاور جیسے لوگ بلامعاوضہ نیکی بھی نہیں کرتے۔ چلئے میرے معاملے میں آپ مجبور تھے۔ چوہدری دلاور کے ساتھ مجبوری کا کوئی سلسلہ نہیں تھا۔ اس سے تو آپ نے قیمت وصول کی ہوگی اس احسان کی۔"

"خدا گواہ ہے' میں نے اس سے ایک پیسہ نہیں لیا تھا اس معاملے میں۔" نقوی صاحب نے کہا۔

"یعنی اور بھی معاملات تھے اس کے ساتھ۔ خیر..... یہ میرا دردِسر نہیں ہے..... اگر آج آپ نے اس سے نقد قیمت نہیں لی تو اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ آپ آنے والے وقت کے لیے پیش بندی کررہے ہیں۔ کل تک دلاور ایک اسمگلر تھا' بدمعاش تھا یا غدار تھا۔ لیکن اب وقت پر اس کی دولت کی گرفت ہے اور اسے یقیناً آپ جیسے بیوروکریٹس کی تائید وحمایت حاصل ہے۔ چور تو چاہے گا کہ دوسرا چور بھائی ہی کوتوال بنے تو اپنے وارے نیارے ہوں۔ آپ کی ریٹائرمنٹ کے دن قریب ہیں۔ آپ غروب ہونے والا سورج ہیں۔ وہ چڑھتا سورج ہے جس کے سب پجاری ہوں گے۔ آپ ان پجاریوں کی صف میں پہلے سے شامل ہوگئے ہیں تاکہ وقت بدلے تو وقت کی نظر نہ بدلے۔ حاکم کل بھی مہربان تھا' حاکم کل بھی مہربان رہے۔ اب آپ پر ساری بات واضح ہوچکی ہوگی کہ میرا الزام بے سبب نہیں تھا۔ رفیق کو قتل کروانے والا چوہدری دلاور ہے مگر نہ اس کے خلاف ثبوت ہے نہ گواہ۔ نہ آپ اس کے خلاف تفتیش کراسکتے ہیں اور نہ جرم ثابت ہونے پر اسے سزا ہوسکتی ہے۔"

"تمہیں کیوں یقین ہے کہ چوہدری دلاور ہی رفیق کا قاتل ہوگا؟ وہ تمہارا دشمن تھا' رفیق کا دشمن کیسے ہوگیا؟"

میں نے کہا "یہ بہت لمبی بات ہے اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کا نہ جاننا ہی آپ کے حق میں بہتر ہے۔ ان کا تعلق چوہدری دلاور سے ہے۔ اگر اسے معلوم ہوگیا کہ آپ اس کے بارے میں وہ سب جانتے ہیں جو ہم جانتے ہیں تو وہ آپ کا نام بھی ہمارے نام کے ساتھ دشمنوں میں لکھ لے گا۔ ہم ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ ہماری وجہ سے آپ کی شہرت اور نیک نامی کو' جان ومال کو یا مستقبل کو کسی قسم کا خطرہ لاحق ہو۔ ہم تو آپ کو اپنا غائبانہ محافظ سمجھتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ آپ بھی محفوظ رہیں۔"

نقوی صاحب کمر کے پیچھے ہاتھ باندھے کمرے میں ٹہلتے رہے۔ ان کی صورت سے ظاہر تھا کہ وہ صورت حال کو سمجھتے ہوئے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کررہے ہیں اور اپنی پوزیشن کا مثبت اور منفی پہلو سے جائزہ لے رہے ہیں۔ دو گھنٹے بعد صبح ہونے

والی تھی لیکن ہمارے لیے یہ مہلت کافی تھی۔ میں نقوی صاحب پر دباؤ ڈال چکا تھا لیکن عجلت میں ان سے بھی حماقت سرزد ہوسکتی تھی۔ میں نے کافی کا تیسرا کپ ختم کیا۔ شیلی نے حیرت انگیز طور پر خاموشی اختیار کیے رکھی اور ایک فیشن میگزین کی ورق گردانی کرتی رہی۔ غالب صوفے کی پشت سے سر لگائے چھت کو دیکھتا رہا۔

بالآخر نقوی صاحب نے کہا "واٹ ڈو یو وانٹ فرام می؟ (مجھ سے تم کیا چاہتے ہو؟)"

میں نے کہا "پہلی بات تو یہ کہ جو کارِ خیر آپ کر رہے ہیں یعنی میرے خلاف مقدمات واپس لینے کا۔ وہ جاری رکھیں۔"

"اس میں وقت لگے گا۔"

"مجھے کوئی جلدی نہیں۔ ایک ایک کرکے تمام مقدمات کو واپس لیں یا کوئی ایسی ترکیب کریں کہ شک کا یقینی فائدہ مجھے حاصل ہو۔ میری ضمانت ہو جائے اور بالآخر باعزت رہائی۔"

"اس وقت تم کون سی قید میں ہو؟"

"ابھی میں ایک مفرور مجرم ہوں۔ میری پوزیشن اس حد تک بہتر ہو جائے کہ میں خود کو عدالت میں پیش کرکے ضمانت حاصل کرسکوں۔ تو یہ رہائی ہی ہوگی۔ تفکرات سے اور اندیشوں سے" میں نے کہا۔

"یہ کام چھ مہینے یا سال میں ہوگا۔"

"ہونے دیں۔" میں نے کہا "لیکن اس عرصے میں میرے خلاف نئے مقدمات کھڑے نہ ہوں۔"

"اس کی ضمانت میں کیسے دے سکتا ہوں۔ کل کو تم قتل کردو..."

"میں قتل کروں گا تو دو صورتیں ہیں.... یا تو میں رنگے ہاتھوں پکڑا جاؤں گا اور جائے واردات پر چشم دید گواہ بہت ہوں گے۔ حالات اور واقعات کی شہادت میرے خلاف ہوگی اور ثبوت واضح ہوں گے۔ اگر میں پکڑا نہ گیا تو میں خود فون کرکے یا پیغام بھیج کے بتادوں گا کہ قتل میں نے کیا تھا تو کیوں۔ اور نہیں کیا ہوگا تو بتادوں گا کہ مجھے بلاوجہ ملوث کیا جا رہا ہے اور ملوث کون کر رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھ پر جھوٹے مقدمات نہ بنائے جائیں۔"

انہوں نے سر ہلایا اور گویا منظوری دی کہ چلو ایسا ہی ہوگا۔

"آگے بولو۔"

میں نے کہا "آپ کو خدا ہوم سیکریٹری بنائے۔ جب میری ضمانت کی درخواست پیش کی جائے تو سرکاری وکیل اس کی مخالفت نہ کرے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں چاہتا۔ میں اپنی حفاظت خود کرسکتا ہوں اور اپنے دشمنوں سے بھی نمٹ سکتا ہوں۔"

"تمہیں بھی میرا مشورہ ہے کہ جینا سیکھو۔ مرکے' مار کے نہیں۔ جیو اور جینے دو کے اصول پر۔ دشمن مت بڑھاؤ۔ بی ڈپلومیٹک BE DIPLOMATIC۔ میرے اختیارات کی حدود بھی سیاسی ہیں۔ اگر اوپر سے دباؤ ہوگا تو وہ نیچے منتقل ہوگا۔ کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ کچھ عرصے کے لیے تم روپوش ہو جاؤ؟"

ایک دم شیلی نے رسالہ رکھ دیا "یار' میں بھی ان سے یہی کہہ رہی ہوں۔"

"اسٹاپ دس یار لڑکی!" نقوی صاحب برہمی سے بولے۔

"سوری... ویری سوری سر" شیلی بوکھلا گئی "میرا مطلب تھا انکل کہ یہ میرے ساتھ لندن چلے جائیں مگر مسئلہ یہ ہے کہ ان کو وہاں سے ڈی پورٹ کیا گیا تھا۔ یعنی بے آبرو کرکے رخصت کیا گیا تھا۔ اگر نیا پاسپورٹ مل جائے.....تو....."

شیلی کے نامکمل جملے کو غالب نے پورا کیا "تمہارا مطلب ہے' نئے نام سے نا؟ یہ تو بہت چھوٹے چھوٹے مسائل ہیں انکل کے لیے۔"

"بلکہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہیں۔ عام آدمی دو چار پاسپورٹ رکھتا ہے اپنے پاس" میں نے کہا۔

نقوی صاحب کی خاموشی کو میں نے ان کی رضامندی پر محمول کیا۔ "اب رہ گئی بات بے چارے رفیق کی.... تو جیسے ماموں چاہیں۔"

"چاہیں' کیا مطلب؟" نقوی صاحب چونکے۔

"مطلب یہ کہ اس کی تدفین پوسٹ مارٹم کے بغیر کرائیں یا پوسٹ مارٹم رپورٹ لیں۔ کیس پولیس کو دیں یا نہ دیں" میں نے کہا "تفتیش..."

"تم نے یہ نہیں بتایا ابھی تک کہ اس کا قتل کہاں ہوا اور کیسے؟"

میں نے کہا "یہ تو ہمیں بھی نہیں معلوم۔"

"کیا تم نے اسے قتل ہوتے دیکھا تھا؟"

میں نے شیلی کی طرف دیکھ کر سر ہلایا "نہیں۔ قتل ہوتا دیکھتے تو قاتل کو بھی دیکھتے۔ لیکن اس کا انتقال ہمارے سامنے ہوا۔ اس وقت ہم کچھ بھی نہیں کرسکتے تھے۔ بس وہ چند منٹ میں مرگیا۔ کچھ بتائے بغیر۔"

"لیکن مرتے مرتے وہ اپنے خون سے آپ کا نام لکھ گیا تھا" شیلی نے کہا۔

"میرا نام۔ واٹ نان سنس..... کہاں لکھا تھا؟" نقوی صاحب اب کچھ نروس ہونے لگے تھے۔

"گاڑی کی ڈکی کے اندر" میں نے کہا "نام کیا.... ایک اشارہ تھا۔ زیڈ۔ یو... این۔"

"اس وقت کہاں ہے رفیق کی لاش؟" نقوی صاحب نے مجھے گھورا۔

"اسی گاڑی میں" میں نے عمداً ایک ہی مرتبہ میں پوری بات بتانے سے گریز کیا "کرائے کی مرسیڈیز تھی جو اس وقت باہر کھڑی ہے۔"

"آپ کی پورچ میں" غالب نے کہا۔

نقوی صاحب بے اختیار اٹھے "واٹ؟ یو ایڈیٹس! تم... اتنی دیر سے یہاں بیٹھے بکواس کر رہے ہو۔ جیسے اس بات کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ او مائی گاڈ۔ ایک لاش میرے گھر کے اندر گاڑی کی ڈکی میں... میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ مجھے بتاؤ تم سیریس ہو؟ یو جوکرز۔"

میں نے کہا "اس قسم کا بے ہودہ مذاق ہم نہیں کرتے۔"

غالب نے کہا "ہم نے تو آتے ہی رفیق کی بات کی تھی۔ آپ نے کب پوچھا کہ اس کی لاش کہاں ہے، قتل کب ہوا، کیسے ہوا۔"

"آپ تو بس قاتل کا نام پوچھتے رہے تھے جو ہمیں بھی معلوم نہیں تھا" میں نے کہا۔

"شٹ اپ۔ شٹ اپ" نقوی صاحب چلّانے لگے "تم سب بدمعاشوں کا ایک ٹولہ ہو۔ بلیک میلرز۔ قاتل اور ڈاکو۔ میں تم سب کو اندر کرادوں گا۔ رفیق کو تم نے ہی مارا ہوگا... لاش بھی تم لائے ہو۔"

ان کی یہ کیفیت بڑی جنونی تھی۔ وہ بری طرح کانپ رہے تھے اور اس اندیشے کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اچانک وہ فلمی اسٹائل میں سینے پر ہاتھ رکھیں، نیچے جھک کر کلمہ پڑھیں اور اللہ کو پیارے ہو جائیں۔ شیلی نے فوراً اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے انہیں تسلی دی۔

"انکل! پلیز، آپ بیٹھیے۔ لیجیے پانی" اس نے نقوی صاحب کو بٹھا کے گلاس ان کے لبوں سے لگا دیا۔

نقوی صاحب نے تیسری گولی حلق سے اتاری۔ وہ لمبے لمبے سانس لے رہے تھے اور انہیں پسینہ آگیا تھا مگر شیلی کے اطمینان سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ کیفیت تشویشناک نہیں ہے۔ وہ بڑے غور سے ان کا جائزہ لے رہی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ ابھی تک اندر سے ان کی آواز پر کوئی اٹھ کے نہیں آیا تھا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ان کی ایک معذور بیوی تھی جو بیڈ سے اٹھ بھی نہیں سکتی تھی اور اکلوتی بیٹی ان کی مرضی کے خلاف شادی کرکے گھر سے نکل گئی تھی۔ ان کا بیٹا کوئی نہیں تھا چنانچہ انہوں نے سوچا ہوگا کہ اپنی دولت، مرتبے اور اثرورسوخ سے کوئی اچھا سا، فرمانبردار گھر داماد خرید لیں گے جو عمر کے آخری حصے میں ان کی خدمت کرے گا لیکن اس خواب کی تعبیر انہیں نہ مل سکی۔ اب صرف نوکر تھے جو معاوضہ لے کر خدمت کرتے تھے۔ آدھی رات کے بعد نقوی صاحب کی آواز سن کے دوڑنا ان کے فرائض میں شامل نہ تھا۔

"مجھے... مجھے بتاؤ... دو منٹ میں" نقوی صاحب نے نقاہت سے کہا "مجھے کچھ کرنا ہے... ایسا نہ ہو میں مرجاؤں... یا تمہیں گولی ماردوں۔"

میں نے کہا "نقوی صاحب! ابھی آپ کو ہوم سیکریٹری بننا ہے۔ آپ نے تو بہت بڑے بڑے چیلنج پہلے بھی قبول کیے ہوں گے اور آج بھی اصل اختیارات کس کے پاس ہیں۔ یہی دو چار لوگ۔ چیف سیکریٹری، ہوم سیکریٹری، یا فنانس سیکریٹری۔ وزیر بے چارے تو آتے جاتے رہتے ہیں۔"

شیلی نے کہا "انکل، یہ گاڑی میں نے منگوائی تھی۔ رفیق کی معرفت۔ وہ نہ جانے کہاں سے روز یہ کار بھجوا دیتا تھا۔ ادائیگی بھی وہی کرتا تھا۔ آج جب گاڑی آئی تو ڈرائیور نے چابی اندر بھجوا دی۔ یہ ذرا خلافِ معمول تھا۔ ہر روز ڈرائیور خود حاضر ہو کے سلام کرتا تھا۔ میں ٹھہری ہوئی ہوں..."

"ایمبیسڈر ہوٹل میں" میں نے اس کی بات کے بیچ میں کہا۔

"وہ مجھے معلوم ہے یار" شیلی نے مجھے ٹوکنے پر ٹوکا۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ نقوی صاحب جیسے کائیاں شخص کو شک نہیں ہوا۔ شیلی نے بڑی خوبی سے بات بنائی تھی۔

"لیکن اب... ان حالات میں میرا وہاں قیام مناسب نہیں انکل۔"

"بالکل۔ تم کو صبح ہونے سے پہلے چیک آؤٹ کرجانا چاہیے۔" میں نے تائید کی "ہم تمہیں کسی محفوظ مقام پر شفٹ کردیں گے۔"

"میری طرف سے تم جہنم میں جاؤ۔ تم سب" نقوی صاحب نے انگلش میں کہا "وہ جگہ سب سے محفوظ ہے تمہارے لیے۔ اور دنیا کے لیے بھی جو تمہاری ان مجرمانہ قسم کی سرگرمیوں سے محفوظ ہوجائے گی۔"

"مجرمانہ قسم کی۔ تھینک یو سر کہ آپ نے مجرمانہ نہیں کہا..."

اندر کہیں کال بیل بجنے لگی۔ "یہ کون بدتمیز ہے؟" انہوں نے دیوار پر نصب انٹرکام اٹھا کے دو نمبر بٹن دبایا "یہ کیا ہے چوکیدار؟ کیوں ڈسٹرب کررہے ہو؟ بے وقوف، تمہیں اندر آکے بات کرنی چاہیے۔ چوکیدار! بولتے کیوں نہیں۔ کیا...؟ پولیس۔ تم اندر آچکے ہو۔ کیسے؟ کسی نے روکا نہیں تمہیں۔ اور تمہاری ہمت کیسے ہوئی؟ کون ہو تم آخر؟ ایس ایچ او۔ علاقہ ایس ایچ او۔ کیا بات ہے؟ خیر جو بھی بات ہے، پہلے تو تم باہر جاؤ۔ گیٹ سے باہر۔ ورنہ میں بلااجازت اندر داخل ہونے پر تمہیں برخواست کرادوں گا۔ ہاں ہاں سن لیا ہے میں نے۔ میرے دروازے سے دور کھڑے رہو۔ خبردار جو گاڑی بھی سامنے نظر آئی مجھے۔ میں ابھی آتا ہوں تھوڑی دیر میں۔ شٹ اپ۔ آسمان نہیں گرے گا چند منٹ میں۔ بیڈروم سے میں نائٹ سوٹ میں باہر نہیں آسکتا۔ یو فول۔"

انہوں نے غصے سے زیادہ پریشانی کی کیفیت میں انٹرکام رکھا "دس از دی اینڈ آف ایوری تھنگ THIS IS THE END OF EVERY THING۔ ہوگیا سارا معاملہ چوپٹ) وہ آگئے ہیں علاقہ ایس ایچ او صاحب اور انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ میرے گھر کے اندر ایک گاڑی موجود ہے اور اس میں ایک لاش ہے۔ بتاؤ مجھے، میں کیا کروں؟ میں پاگل ہوجاؤں گا۔ بائی گاڈ میں کسی کو شوٹ کردوں گا۔ تمہیں یا اپنے آپ کو۔"

ڈاکٹر شبلی نے پھر مسیحائی کے فرائض پورے کیے "سر! آپ کو اس CRISIS سے نمٹنا ہے۔ ٹھنڈے دل اور دماغ کے ساتھ۔"

میں نے کہا "ایک معمولی ایس ایچ او سے آپ کو ڈرنے کی کیا ضرورت ہے..... بلکہ..... میرا تو خیال ہے کہ یہ فرشتۂ غیب ہے۔"

"ایس ایچ او.. فرشتہ..... مائی فٹ۔ شیطان کہتے تو میں مان لیتا جو ایسے ہی نازل ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "سر! آپ سب کچھ اس کے سپرد کردیں۔ اپنا دردِ سر مت بنائیں کسی بات کو۔ ایس ایچ او جیسے لوگ اس قسم کے معاملات سے نمٹنا جانتے ہیں۔"

"کیا تمہارا مطلب ہے..... میں... زیڈ یو نقوی۔ ایڈیشنل ہوم سیکریٹری۔ ایک معمولی ایس ایچ او کے سامنے مجرم بن کے اس سے کہوں کہ میں مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ مجھے بچالے..." نقوی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آپ چاہیں تو ایس ایس پی یا ڈی آئی جی سے بات کرلیں مگر میرا مشورہ ہے کہ بات کو اتنا اوپر لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ چھوٹے افسر ہی اصل کام کرتے ہیں اور ڈی آئی جی بھی بالآخر اسی سے کہے گا۔ یا وہ ایس ایس پی سے کہے۔ وہ ایس پی ہے تھرو پروپر چینل THROUGH PROPER CHANNEL بات ہوگی تو بلاوجہ کئی لوگ ملوث ہوں گے اور آپ کو ایک نہیں' چار چھ منہ بند کرنے پڑیں گے۔ یہ چھوٹا سا منہ ہے' اس کے لیے یہ بڑی بات ہے کہ ایڈیشنل ہوم سیکریٹری خود اس سے کوئی کام کہے۔ اشارے میں انعام کی بات کریں۔ وہ خوشی خوشی دُم ہلاتا جائے گا اور سر کے بل واپس آ کے کہے گا کہ سر' آپ فکر ہی نہ کریں۔ سب ٹھیک کرلیا ہے میں نے۔"

"انعام! میں اس سے انعام کا وعدہ کروں..... ناممکن۔"

"نقوی صاحب! ان کے لیے انعام کیا ہوتا ہے۔ بس ایک پروموشن۔ کندھے پر ایک پھول ہے تو دو کرادیں۔ دو ہیں تو تین۔ یا اس کی مرضی کے تھانے میں پوسٹنگ کرادیں۔ اور اس میں آپ کا کیا جاتا ہے۔ کل پرسوں' دو چار دن یا ہفتے بھر بعد ایس ایس پی کے آرڈر سے انعام اسے مل جائے گا تو ساری عمر اس کی زبان آپ کی غلامی کا اقرار کرتی رہے گی۔ آپ کے خلاف تو بھونکنے کی ہمت وہ کر نہیں سکتا۔ اشارے میں بھی آپ یہ واضح کرسکتے ہیں کہ اس نے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ نہ کیا تو..... اور بس۔"

"آئی تھنک' یہی ٹھیک ہے۔ مگر میں اس سے کیا کہوں؟ میری عقل تو بالکل کام نہیں کررہی ہے۔"

"آپ کہیں کہ مجھے کیا معلوم یہ گاڑی کون چھوڑ گیا ہے۔ تم نے ہی جگا کے یہ انکشاف کیا ہے ابھی ابھی۔"

غالب نے کہا "وہ.... چوکیدار کی کیا بات تھی؟"

"وہ غائب ہے۔ گیا ہوگا نماز پڑھنے۔" انہوں نے چوکیدار کو ایک گالی سے نوازا "میں اسے برطرف کردوں گا۔ ایسے وقت میں چور ڈاکو اندر آجائیں جب وہ خدا کے سامنے سر جھکائے پڑا ہوا۔ تو بس ہوچکا کام۔ کوئی میرا کام تمام کرجائے گا۔ میں صاف کہہ دوں گا آج کہ یا نوکری کرلو یا نمازیں پڑھ لو گھر بیٹھ کے۔ پیسہ کمالو یا ثواب۔ یہ حرام خوری ہے صاف....."

مجھے نقوی صاحب کی فرعونیت پر افسوس ہوا مگر اس سوچ کا کوئی علاج نہیں تھا۔ یہ ان فرنگی آقاؤں کی ذہنیت کا عکس تھی جو ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہب پرستی' عقائد اور دینی شعائر کے دشمن تھے اور جاتے وقت یہ نمرود کی خدائی کا انداز اپنے تربیت کردہ آئی سی ایس افسران کو سکھا گئے تھے۔ اس کے بعد سے یہی نظریاتی تضاد ان حکمرانوں کے طبقے کی سوچ میں رچ بس گیا تھا جو مجبوراً زبان سے خود کو پبلک سرونٹ کہتے تھے مگر عملاً پبلک سے اسی طرح پیش آتے تھے جیسے آج بھی مملکتِ خداداد پاکستان میں دورِ غلامی ہے اور اسلامی مساوات فقط سیاسی بیانوں اور تقریروں کی اصطلاح رہ گئی تھی۔ اُلٹا یہ احساس عوام کے ذہنوں میں بیدار ہونے لگا تھا کہ فرنگی سامراج کے دور میں حاکم و محکوم میں اتنے فاصلے حائل نہیں تھے اور وہ غلامی آج کی جمہوریت سے زیادہ جمہوری تھی۔

نقوی صاحب کے باہر جاتے ہی غالب نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا "یہ کس کی حرکت ہوسکتی ہے؟"

میں نے معصومیت سے کہا "معاف کرنا یار۔ میں نے غلطی سے پولیس کو فون کرکے سب بتادیا تھا۔ بے وقوف شخص! اس سوال کی ضرورت نہیں تھی۔"

شبلی کا رنگ فق ہونے لگا تھا "تم لوگ سیریس نہیں ہو؟"

غالب نے کہا "میں تو سیریس تھا بلکہ ہوں۔"

"میں کون سا دانت نکال رہا ہوں" میں نے اٹھ کے ایک پردہ ہٹاتے ہوئے باہر جھانکا۔

غالب میرے دائیں جانب آگیا اور شبلی نے جگہ نہ پا کے صوفے کے اوپر چڑھتے ہوئے میرے کندھے پر کہنی ٹکادی۔ میں نے شانے پر نوکیلی ہڈی کا دباؤ مجبوراً برداشت کیا۔ باہر عجیب منظر تھا۔ کھلے گیٹ کے سامنے نقوی صاحب گاؤن کی جیب میں ہاتھ ڈالے کھڑے تھے اور کسی مجسٹریٹ ٹائپ شخص سے بحث کررہے تھے۔ ایس ایچ او وردی میں پیچھے مظلوم و مسکین شکل بنائے کھڑا ہوا تھا۔ نقوی صاحب کے سامنے کھڑے ہوئے شخص کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔

"غالب! یار میں نے اچانک اپنی چھٹی حس کی آواز سن لی ہے۔ یہ وارنٹ ہیں خانہ تلاشی کے۔"

غالب نے سرہلایا "ٹھیک فرماتے ہو تم۔ ایسے کون جرأت کرسکتا تھا ایڈیشنل ہوم سیکریٹری کے گھر پر چھاپا مارنے کی۔"

"پکا کام کیا جس نے بھی کیا۔"

میں نے کہا "شکاری بڑے گھاگ اور تجربہ کار ہیں۔ کوئی یقیناً

پیچھے لگا ہوا تھا۔"

"یار' یہاں سے بھاگنے کی کرو ورنہ پکڑے ہم ہی جائیں گے۔ نقوی صاحب کا کچھ بھروسہ نہیں۔"

"مگر کیسے یار...." شیلی نے گھبرا کے کہا "وہ جانے دیں گے؟"

میں نے کہا "تم ذرا مسکرا کے کہنا۔ ایکس کیوزمی۔ ذرا سامنے سے ہٹ جائیے۔ مجھے باہر جانا ہے۔ اُف' پیچھے ہٹو شیلی' میرے ناتواں کندھے اس سے زیادہ بارِ نزاکت نہیں اٹھا سکتے۔"

غالب نے کہا "سکندر! بس اب وہی پرانی چالیں۔ تخت یا تختہ۔ پیچھے سے نکلنے کا راستہ بناتے ہیں۔"

سوچے سمجھے بغیر میں نے شیلی کا ہاتھ پکڑا "چلو۔"

شیلی کو سوال کرنے کا موقع دیے بغیر میں ایک دروازے سے اندر گھس گیا۔ غالب مجھ سے آگے تھا۔ یہ کھانے کا کمرا تھا۔ اس سے اگلے ایک دروازے سے جھانک کے وہ دوسری طرف گیا پھر اس نے مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ہم اچانک کچن میں پہنچ گئے۔ وہاں فرش پر دو افراد لمبی تانے سو رہے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ایک سونے کی اداکاری میں مصروف تھا تاکہ اسے کسی کام کے لیے پکارا جائے تو وہ نظرانداز کردے۔ اب وہ ہڑبڑا کے اٹھا۔ اس نے انڈرویئر' بنیان میں اپنے سوکھے' کالے جسم کی نمائش کرتے ہوئے زور سے کہا "کون ہے... کون ہے؟"

میں نے اسے جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور ایک ہاتھ مار کے پھر لٹا دیا مگر وہ دوسرے پر گرا جو اس کی آواز پر بیدار پہلے ہی ہو چکا تھا۔ دوسرا کچھ فربہ بدن تھا اور اس صحت کا راز وہ دودھ' مکھن' انڈے' گوشت ہو سکتے تھے جو عموماً خانساماں قسم کے ملازم فراخ دلی سے چُرا کے کھاتے ہیں۔ اس نے ہکلا کے یہ کہنے کی ناکام کوشش کی کہ اس کی جاں بخشی کی جائے مگر میں یہ رعایت دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ میرا ہاتھ پڑنے سے قبل ہی وہ لیٹنے کے لیے تیار تھا۔

ہم کچن کے دوسرے گیٹ سے باہر نکلے تو آٹھ دس فٹ کا کورٹ یارڈ سامنے تھا اور پھر ایک دیوار۔ یہ ساتھ والے بنگلے کے گیراج یا سرونٹ کوارٹر کی دیوار لگتی تھی۔ میں نے شیلی کو دائیں طرف گھسیٹا۔ اونچی ہیل والی سینڈل میں وہ کئی بار گرتے گرتے بچی۔ متعدد بار اس نے ہائے اور اوئی قسم کی آوازوں کے بعد اعلان بھی کیا کہ "میں مری۔" مگر میں متاثر نہیں ہوا۔

ساتھ والے بنگلے کو جُدا کرنے والی دیوار چھ سات فٹ اونچی تھی مگر اس پر نوکیلے شیشے جڑے ہوئے تھے۔ خالی ہاتھوں سے اس پر چڑھنے کا انجام یہ ہوتا کہ ڈاکٹر شیلی کی نیورولوجی میرے کام نہ آتی۔ مجھے کسی جراح کے زیرِ علاج رہنا پڑتا۔ تاہم اس وقت میرا ذہن پوری طرح فعال تھا اور اپنی نارمل سے زیادہ کارکردگی کا مظاہرہ کر رہا تھا جو حالات کے پیشِ نظر فطری بات تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ دیر کی صورت میں شاید ہم نقوی صاحب کے گھر میں ہی گرفتار کرلیے جائیں اور فرار ہوتے ہوئے پکڑا جانا ہمارے خلاف جرم کی ایک دلیل بن جائے۔ سرچ وارنٹ کی موجودگی میں نقوی صاحب قانون کا راستہ نہیں روک سکتے تھے۔ ان کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ انسپکٹر جنرل پولیس یا کسی اور سے رجوع کرسکتے.... وہ تو بے خبری میں اچانک مجسٹریٹ آگیا تھا ورنہ نقوی صاحب کے کانوں میں بھنک بھی پڑ جاتی تو وہ پہلے سے بندوبست کرلیتے۔ صبح وہ مجسٹریٹ اور ایس ایچ او دونوں کو معطل کرادیں یا ٹرانسفر مگر اس وقت وہ مجبور تھے اور ان سے کچھ بعید نہ تھا کہ اپنی پوزیشن کو بچانے کے لیے وہ ہماری حمایت سے ہاتھ کھینچ لیں اور مزاحمت کر کے عزت کو داؤ پر لگانے سے بہتر سمجھیں کہ ہمیں پولیس کے حوالے کردیں۔

میں نے غالب کو آواز دی "ادھر مرغا بن جاؤ۔"

میری بات سمجھتے ہوئے اس نے فوراً رکوع میں جا کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ لیے "بس اتنا خیال رکھنا کہ جب اوپر پہنچ جاؤ تو ہمیں بھی کھینچ لینا۔"

"بھیا! دنیا میں بڑی نفسا نفسی ہے۔ اوپر جا کے دیکھیں گے۔" میں نے اس کی کمر پر چڑھ کے اوپر دیکھا۔

"اُف۔ آج مرزا غالب کی روح کو کتنی تکلیف ہو رہی ہوگی۔ غالب پر ایک گدھا جوتوں سمیت چڑھ گیا ہے۔ اُف.... یار' اب مجھے سیدھا کون کرے گا۔ میں تو مستقل جھک گیا۔"

میں اوپر دیوار کی طرف ہاتھ بڑھا کے اچھلا تھا اور چھت کے کنارے کو پکڑ لیا تھا۔ جھٹکا غالب کی کمر میں آیا تھا لیکن میری پہلی کوشش ناکام رہتی تو میں اس کی کمر پر گرتا۔ پھر ہم دونوں گرتے مگر میرے ہاتھ سرونٹ کوارٹر کی چھت کے کنارے پر جم گئے تھے۔ میں نے خود کو اوپر کھینچا اور چھت پر پہنچ گیا۔ اوپر سے میں نے گیٹ کی طرف دیکھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ نقوی صاحب تلاشی کے لیے آنے والوں کو روکنے میں ناکام رہے تھے۔ پولیس کی گاڑی وہیں موجود تھی۔ ایک کانسٹیبل بڑے جارحانہ انداز میں بندوق تھامے گیٹ پر کھڑا تھا۔ جیسے شاہِ جنات بھی نکلنے کی کوشش کریں تو وہ گولی مار دے۔ باقی لوگ اندر پہنچ چکے تھے اور غالباً گاڑی میں لاش کا معائنہ کر رہے تھے یا کمروں میں مجرموں کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ وہ کسی وقت بھی کچن کی طرف سے نمودار ہوسکتے تھے۔

غالب نے شیلی کو اوپر اٹھانے کی کوشش کی مگر وہ خود بہت ڈھیلی ثابت ہوئی۔ اگر وہ جسم کو لکڑی کی طرح سخت کرلیتی تو غالب اسے میرے ہاتھوں تک پہنچا سکتا تھا۔ میں چھت پر اُلٹا لیٹا ہوا تھا اور میرے ہاتھ نیچے دو فٹ تک لٹکے ہوئے تھے۔ شیلی ہاتھ اوپر اٹھاتی تو دو فٹ اوپر میرے ہاتھوں میں اپنے ہاتھ دے دیتی مگر وہ گھبرا گئی تھی۔ غالب نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں پیوست کر کے ایک جھولا سا بنا لیا اور شیلی سے کہا کہ وہ چڑھ جائے۔ پھر اس نے دیوار کے ساتھ ساتھ شیلی کو اوپر اٹھایا اور بڑی

صفائی سے ہاتھوں کو سر تک لے گیا۔ اس نے کسی ویٹ لفٹر کی طرح شیلی کو اٹھایا اور پھر انگڑائی کے انداز میں ہاتھ سر سے اوپر تک اٹھا کے اسے میری دسترس تک پہنچانے میں کامیاب رہا۔ شیلی نے ہاتھ اوپر کیے تو میں نے اسے ایک جھٹکے سے کھینچ لیا۔ اب مسئلہ غالب کے اوپر آنے کا تھا۔

گھر کے اندر مجھے ہنگامہ آرائی کے آثار سنائی دے رہے تھے۔ خانہ تلاشی کے لیے آنے والے قانون کے تقاضے ضرور پورے کر رہے تھے۔ غالب نے تھوڑا سا پیچھے جا کے دوڑتے ہوئے ایک پاؤں سامنے کی دیوار پر رکھا۔ اس کا پاؤں تقریباً تین فٹ کی بلندی پر پڑا۔ اپنی پوری قوت کے ساتھ غالب اوپر اچھلا اور میں نے اس کے اوپر اٹھے ہوئے ہاتھوں کو گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ اگر میری کوشش ناکام رہتی تو غالب دھڑام سے فرش پر گرتا۔ جب اس کا ایک ہاتھ میرے ہاتھ میں آیا تو میرے جسم کو ایک جھٹکا لگا۔ میری ہدایات کے مطابق شیلی نے ٹخنے سے اوپر میرے پاؤں کو دونوں ہاتھوں میں جکڑ رکھا تھا اور وہ اپنا سارا زور پیچھے کی طرف لگا رہی تھی۔

جھٹکا لگتے ہی میں نے کہا "شیلی! چھوڑنا نہیں مجھے ورنہ میں سر کے بل نیچے جاؤں گا۔"

"نہیں یار۔ تم گئے تو میں بھی جاؤں گی۔ مگر چھوڑوں گی نہیں تمہارا پیچھا" اس نے ایک ذومعنی جملہ ہانپتے ہوئے بولا۔

شیلی نے مجھے پیچھے سے نہ پکڑ رکھا ہوتا تو میں یقیناً غالب کے ساتھ ہی نیچے جاتا۔ وہ کوئی شہ زور نہیں تھی مگر مجھے بھی معمولی سے سہارے کی ضرورت تھی۔ میرا جسم کسی چھپکلی کی طرح چھت سے چپکا ہوا تھا۔ غالب کا ہاتھ پکڑتے ہی میں نے سکون کا سانس لیا اور اسے اوپر کھینچنے کے لیے پیچھے ہٹا۔ غالب نے دیوار پر چلنے کے انداز میں دوسرا قدم آگے بڑھایا اور میں نے اسے ایک جھٹکے سے اوپر کھینچ لیا۔ میرے پیچھے ہٹنے میں لات شیلی کو لگی اور وہ چھت پر ہی لڑھک گئی مگر اس نے اتنی عقلمندی سے کام لیا کہ چیخ نہیں ماری۔

میں نے ہانپتے ہوئے کہا "سوری۔ تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

"وار دل پر کیا تھا تم نے" وہ بولی "چوٹ اوپر سے کہاں نظر آئے گی یار۔"

غالب نے کہا "ایسے ہی موقعے کے لیے یہ شعر ہے کہ ؎ جگر کی چوٹ اوپر سے کہیں معلوم ہوتی ہے۔ جگر کی چوٹ اوپر سے نہیں معلوم ہوتی ہے۔"

میں نے چھت کے پیچھے جھانک کر دیکھا۔ "پتا نہیں یہ کس توپ کا گھر ہے اور اس گھر میں چوروں کی طرح کودنے کی کیا سزا ہے؟"

"کودنے کی سزا زیادہ سے زیادہ ٹانگ ٹوٹنا ہو سکتی ہے۔ پکڑے جانے کی سزا چھ ماہ کی جیل" غالب نے کہا "یا دونوں۔"

خرابی بعض اوقات خوبیٔ تقدیر سے اچھائی بن جاتی ہے۔ یہی اس وقت ہمارے ساتھ ہوا۔ ہم چھت پر ہی تھے کہ نقوی صاحب کے کچن کا دروازہ کھلا اور ایک ساتھ بہت سے لوگ اندر آ گئے۔ ہم سب فوراً چھت پر سیدھے لیٹ گئے۔ مجھے یقین تھا کہ نیچے سے کسی کو بھی اوپر ہماری موجودگی کا احساس نہیں ہو سکتا لیکن میں ذہنی طور پر اس کے لیے بھی تیار تھا کہ کوئی پولیس والا اوپر آ جائے تو اس سے نمٹ لوں۔ جب فرار کے راستے ہی مسدود ہوں تو آدمی مرنے مارنے کے سوا کیا کر سکتا ہے۔

میں ایک شخص کو یا زیادہ سے زیادہ دو کو مار سکتا تھا مگر اس کے بعد جب ثابت ہو جاتا کہ مجرم اوپر تشریف فرما ہیں تو مجسٹریٹ شہر کی ساری پولیس فورس کو تمام دستیاب وسائل کے ساتھ طلب کر لیتا اور وہ کسی بھی دشواری کے بغیر ہمیں نیچے اتر کے خود کو قانون کے حوالے کرنے پر مجبور کر دیتے یا اوپر دستی بم پھینک دیتے۔ خبر یہ آتی کہ مجرم مقابلہ کرتے ہوئے ہلاک ہوئے۔

لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ میں نے مجسٹریٹ کی آواز سنی "وہ اس طرف سے فرار ہوئے ہیں غالباً۔"

"پھر انتظار کیوں کرتے ہو؟ چڑھ کے تم بھی اُدھر اُتر جاؤ اگر ہمت ہے" نقوی صاحب نے دہاڑ کے کہا "اُدھر چیف سیکریٹری رہتے ہیں۔"

مجسٹریٹ نے معذرت کے انداز میں کہا "سر! آپ سے پھر معذرت، میں مجبور تھا۔ اوپر سے آرڈر ملے تھے مجھے۔ ایک رسمی قانونی کارروائی ضروری تھی۔"

"شٹ اپ۔ رسمی کارروائی کے لیے تمہارا یہاں آنا ضروری نہیں تھا۔ تم مجھ سے فون پر پوچھ سکتے تھے اور رپورٹ دے سکتے تھے۔ یہ ایس ایچ او خاموشی سے آ کے اپنی کارروائی مکمل کر سکتا تھا۔"

"آئی ایم سوری سر..."

"افسوس تمہیں صبح ہوگا۔ چند گھنٹے بعد کہ تم نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔ تم نے میرے گھر میں گھس کے مجھے ہراساں کیا۔ تم میری بیمار بیوی کے بیڈ روم میں گئے۔ کوئی ملا تمہیں؟" نقوی صاحب آتش فشاں بنے ہوئے تھے۔

"سر، ہم نوکر لوگ ہیں.... ہماری مجبوری کا خیال کریں" یہ ایس ایچ او کی آواز تھی "ورنہ ایسی گستاخی کرتے ہم؟"

"بکومت۔ تمہیں کسی نے شہ دی تھی ورنہ تم ایسی جرأت نہ کرتے کہ میری بات کا یقین نہ کرو۔ جب میں نے بتا دیا کہ مجھے نہیں معلوم یہ گاڑی کس کی ہے اور رفیق کی لاش یہاں کون چھوڑ گیا ہے۔ تو کیا یہ کافی نہیں تھا؟ وہ میرا پی اے تھا۔ اس کے قتل کی تفتیش ہوگی اور میں قاتلوں کو معاف نہیں کروں گا۔ تم کو بھی معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اتنی بے عزتی میں نے زندگی میں کبھی برداشت نہیں کی۔" نقوی صاحب گرجتے رہے "ورنہ مجھے بتاؤ کہ کس نے جھوٹ بکا تھا، کس نے اطلاع دی تھی تمہیں۔ وارنٹ

کس نے نکلوائے؟"

"سوری سر۔ یہ ہم نہیں بتا سکتے۔"

"تو پھر گیٹ آؤٹ۔ ایک منٹ میں دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ مسٹر مجسٹریٹ، تم تو خود کو برطرف سمجھو۔ اور ایس ایچ او، تم میری طرف سے ایف آئی آر لکھو۔ تمہارے بارے میں سوچوں گا میں۔ تم واقعی مجبور تھے۔"

"سر جی، بڑا احسان ہوگا آپ کا۔ میں تو غریب، مسکین سا بندہ ہوں۔ حکام کا غلام۔"

وہ سب جدھر سے آئے تھے، اُدھر ہی چلے گئے تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ شاید اتنی دیر سے میں سانس روکے لیٹا ہوا تھا۔ شیلی اور غالب کی حالت بھی ایسی ہی تھی۔

"اُف۔ بال بال بچے" میں نے کہا "اِدھر چیف سیکریٹری صاحب کا بنگلا نہ ہوتا تو مارے جاتے۔"

غالب نے کہا "ہاں۔ وارنٹ صرف اس گھر کا تھا۔ وہ اس سے آگے ایک قدم نہیں بڑھا سکتے تھے۔ خدا کا شکر ہے، نقوی صاحب اپنے بیان پر قائم رہے۔"

"لیکن کیا واقعی وہ ایف آئی ار لکھوائیں گے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "یہ ایسے ہی دھمکی تھی۔ اندر جا کے مجسٹریٹ ان کے پاؤں پکڑلے گا اور ایس ایچ او قدموں میں سر رکھ دے گا۔ وہ معاملات کو اپنی مرضی کے مطابق طے کرالیں گے۔ مجسٹریٹ کی جاں بخشی کر کے اور اسے اس گستاخی پر معاف کر کے۔ ایس ایچ او تو ہے ہی حکم کا غلام۔"

"دیکھو یار، کیا فرعونیت ہے افسر شاہی کی۔ ایک مجسٹریٹ بہرحال ایک عدالتی افسر ہوتا ہے۔ کتنا بے عزت کیا نقوی صاحب نے اسے۔ اختیارات ہیں اس کے پاس توہین عدالت کے مگر وہ استعمال کیسے کرے۔ سرکاری ملازم ہے، کوئی ہائی کورٹ کا جج نہیں ہے۔"

"پس عدلیہ کو انتظامیہ سے جُدا ہونا چاہیے۔" میں نے کہا "اب سوچو، ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ یہ صبح کاذب کا اجالا ہے۔"

"اس کے بعد صبح صادق ہوگی۔ پھر صبح۔ اور چیف سیکریٹری صاحب اگر لان پر ٹہلنے نکلے۔ اپنے کتے کے ساتھ۔ تو سرونٹ کوارٹر کی چھت پر ہم تینوں کو دیکھ کے بہت خوش ہوں گے۔ سمجھیں گے، آسمان سے فرشتے اترے ہیں۔ مہمان رحمت کا فرشتہ ہوتا ہے۔"

شیلی نے کہا "یار، مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ ذرا دیکھو، میں کہاں بیٹھی ہوں، کس حال میں۔ ڈاکٹر شیلا خان نیورولوجسٹ... مائی فٹ۔"

میں نے کہا "او کے۔ اب ہم ادھر سے اتریں گے اور گیٹ کے اوپر سے باہر نکل جائیں گے۔ دعا کرو ہمارے پیچھے کتے نہ لگ جائیں۔ اندر کوئی خفیہ سسٹم کا الارم نہ ہو اور گارڈ سو رہا ہو۔"

وہ بولی "اتنی دعائیں ایک ساتھ قبول نہیں ہوں گی۔"

"چلو ایک ایک مانگ لیتے ہیں۔" غالب نے کہا۔

چیف سیکریٹری صاحب کے گھر میں اترے بنا چارا ابھی نہ تھا۔ نقوی صاحب کے گھر میں ابھی پولیس اور مجسٹریٹ دونوں موجود تھے۔ اگر ہم ان کی واپسی کا انتظار کرتے تو سورج نکل آتا اور اس سے پہلے ہی سرونٹ کوارٹر میں رہنے والے ہمیں دیکھ لیتے۔ ملازمین سے تو نمٹا جا سکتا تھا مگر گارڈ کا مسلح ہونا یقینی تھا۔

میں نے چھت کے کنارے سے جھانک کے نیچے دیکھا اور پھر کنارے کو پکڑ کے لٹک گیا۔ میرے پیر اب بھی فرش سے چار فٹ کے قریب اوپر تھے۔ میں پکے فرش پر گرتا تو آواز سے کوئی ملازم ضرور جاگ اٹھتا۔ ویسے بھی ملازم جلدی اٹھتے ہیں اور ان کے جاگنے کا وقت ہو گیا تھا۔ میں نے غالب کی مدد حاصل کی اور اس نے نیچے لٹک کر میرے ہاتھ پکڑے۔ اب اس کی ایک ٹانگ شیلی نے کھینچی اور غالب نے آہستہ آہستہ آگے جھک کر مجھے فرش پر اتار دیا۔ یہ اندیشہ ہمہ وقت میرے ذہن میں رہا کہ شیلی نے غالب کی ٹانگ چھوڑ دی تو میں نیچے اور غالب میرے اوپر گرے گا یا شیلی ساتھ ہی آگئی تو ہم ایک زنجیر کی طرح ٹپک جائیں گے۔

زمین پر قدم جماتے ہی مجھے کچھ اطمینان ہوا۔ پہلے غالب نے شیلی کو لٹکایا اور وہ میرے کندھے پر اتری تو میں نے اس کی مختصر سی کمر کو پکڑ کے اسے نیچے رکھ دیا۔ اتنی احتیاط سے جیسے وہ شیشے کی گڑیا ہو۔ پھر مرزا غالب میرے کندھوں پر وارد ہوئے اور پیر تسمہ پا کی طرح ٹانگیں میری گردن پر لٹکا کے بولے "چلو۔"

میں نے رکوع میں جا کے اسے نیچے گرانے کی کوشش کی مگر گرنے نہیں دیا۔ گیٹ مجھے سامنے نظر آ رہا تھا۔

میں نے کہا "ڈاکٹر شیلی! ایک ایکٹ کا چھوٹا سا ڈراما ہے، کر سکتی ہو؟"

"یار، اسکرپٹ بتاؤ۔"

میں نے کہا "اطمینان سے ٹہلتی ہوئی گیٹ تک جاؤ۔ گارڈ بالکل شک نہیں کر سکتا کہ تم چوروں کی طرح دوسری طرف سے دیوار پھاند کے آئی ہو۔ وہ سمجھے گا، تم چیف سیکریٹری صاحب کے گھر میں سے ہو۔ کوئی مہمان یا کوئی فرینڈ فار ون نائٹ۔ پتا نہیں وہ کیسے آدمی ہیں مگر عموماً ایسے لوگوں کے مہمان ایسے ہی ہوتے ہیں جو اندھیرے میں آتے ہیں اور اندھیرے میں ہی رخصت ہو جاتے ہیں۔"

"تمہیں شرم نہیں آتی یار" شیلی نے خفگی سے کہا۔

"یار، یہ شرم کی بات تو ہے مگر مجبوری میں شرم کو چھوڑ دینا چاہیے۔ تم کو سمجھنا چاہیے کہ نظریہ ضرورت کے تحت سب جائز ہوتا ہے۔ جھوٹ بھی۔ کم آن، بی اے گڈ گرل۔"

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ بی اے بیڈ گرل۔" (BE A BAD GIRL)

اس نے کہا "گارڈ نہ مانا تو..."

"مانے گا ڈیئر شیلی۔ تم منوا سکتی ہو۔ اس سے کہو' دروازہ کھول دے۔ تمہیں جانا ہے باہر۔ جب تم باہر نکلو گی تو وہ پھر گیٹ لاک کرے گا۔ اس سے پہلے ہی ہم اسے لٹا دیں گے آرام سے۔"

"مار ڈالو گے اسے بلاوجہ...؟"

"لاحول ولا قوۃ۔ لٹانے کا مطلب ہے لٹانا۔ ایک دو گھنٹے چپ لیٹا رہے گا۔ اس سے پہلے ہی کوئی دیکھ لے گا۔ ڈاکٹر کو بلا لے گا۔ پولیس خود آجائے گی شاید مگر اس وقت تک ہم محفوظ ہوں گے۔ وہ خاک بتائے گا ہمارے بارے میں؟"

شیلی نے گیٹ کی طرف چلنا شروع کیا۔ گارڈ اپنے کیبن میں تھا۔ شیلی نے گیٹ پر پہنچ کے اسے متوجہ کیا تو حسب توقع اس نے کوئی سوال کئے بغیر دروازہ کھول دیا۔ میں اور غالب اتنی دیر میں دیوار کے ساتھ ساتھ تاریکی میں چلتے ہوئے بہت قریب پہنچ گئے تھے۔ گارڈ کی ہماری طرف پشت تھی۔

چند قدم کے فاصلے سے میں نے چیتے کی طرح حملہ کیا اور گارڈ پلٹا ہی تھا کہ میں نے اسے دبوچ لیا۔ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا اور اسے واپس کیبن میں پہنچا دیا۔ ایک منٹ بعد غالب کے ساتھ میں باہر نکلا اور میں نے گیٹ کو ایسے برابر کر دیا کہ وہ بند ہی نظر آئے۔

اب سکون سے چلتے ہوئے ہم بنگلوں کے درمیان سے گزرے۔ ایک اخبار والے اور ایک دودھ والے نے سائیکل پر گزرتے ہوئے صرف شیلی کو دیکھا۔ ظاہر ہے وہی ایک دیکھنے کی چیز تھی۔ ہماری اشکال پر پھٹکار برس رہی تھی اور ہمارے "بوتھے" ویسے بھی فضول تھے۔

مال روڈ تک کا فاصلہ چند منٹ کا تھا۔ مجھے جو پہلی کار اپنی طرف آتی نظر آئی' میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا مگر وہ نہیں رکی۔ پھر شیلی نے کوشش کی اور ہم ایک درخت کے پیچھے چھپ گئے۔ یہ ناممکن تھا کہ صبح دم کوئی اکیلی حسینہ کسی ویران سڑک پر کسی مرد کو روکے اور وہ نہ رکے۔ مرد بوڑھا ہو یا متقی' اس سے فرق نہیں پڑتا۔ شیلی کے اشارے پر جو کار رکی اسے ایک درمیانی عمر کا عیاش نظر آنے والا شخص چلا رہا تھا۔ اس نے بہت مسکرا کے شیلی کے لیے دروازہ کھولا ہی تھا کہ ہم دونوں جانب سے نازل ہوئے اور اس کے احتجاج کرنے سے پہلے پچھلی سیٹ پر قابض ہو گئے۔ شیلی نے اپنا زنانہ ماڈل کا ریوالور میرے حوالے کر دیا تھا۔ وہ پہلے ہی دہشت زدہ ہو گیا تھا۔ ریوالور دیکھ کے اس کی آواز بھی بند ہو گئی۔

اس نے بڑی مشکل سے کہا "کیا..... کیا چاہتے ہو؟"

میں نے آہ بھر کے کہا "ساری دنیا کا بھلا لیکن ایک ہمارے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔"

"یہ..... یہ بھلائی ہے؟"

"ہاں۔ ہماری جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک تمہاری لاش پیچھے چھوڑ کے بہت دور جا چکا ہوتا۔" میں نے کہا "ہم نے تو صرف لفٹ لی ہے۔ ہم تمہاری کار بھی چھین لیں گے مگر واپس کر دیں گے۔ بالکل اسی حالت میں آج ہی۔ اب چلو۔"

اس نے کار کو آگے بڑھایا "کار.... کیا کرو گے تم؟ کہیں ڈاکا ڈالو گے؟ پولیس تو مجھے پکڑ لے گی۔"

میں نے اسے تسلی دی "پولیس کو کچھ معلوم ہوگا تو پکڑے گی۔ اب تم ایسا کرو کہ اچھے بچوں کی طرح گاڑی روک کے نیچے اُتر جاؤ۔"

وہ چلّایا "کیا.... نیچے اُتر جاؤں۔ مگر کیوں؟"

"اس لیے کہ ہم تمہیں اپنے ساتھ رکھنا نہیں چاہتے۔ تم ساتھ رہو گے تو سب دیکھو گے۔"

"میں.... خدا کی قسم' کسی کو نہیں بتاؤں گا۔"

"گڈ۔ ہم بھی نہیں بتائیں گے۔" غالب نے کہا "اس میں نہ تمہارا نقصان ہوگا نہ ہمارا۔"

میں نے کہا "ٹھیک ایک گھنٹے بعد ہم تمہیں فون کر کے بتا دیں گے کہ گاڑی کہاں کھڑی ہے۔ چابیاں اندر گلوز کمپارٹمنٹ میں ہوں گی۔ گاڑی روکو۔"

اس نے بادل ناخواستہ بریک لگائے "میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔ مجھے پولیس کو رپورٹ کرنی پڑے گی۔"

غالب نے کہا "ضرور کرو۔ اس سے ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ تم پولیس کے چکر میں پڑو گے تو کار مشکل سے واپس ملے گی۔ نذر نیاز پیش کرنے کے علاوہ خاصی منت سماجت کے بعد۔"

"اور عین ممکن ہے کہ اصل حالت میں نہ ملے۔ ٹائر نئے ہوں تو ایک گھنٹے میں پُرانے ہو جائیں۔ کسی چھوٹے تھانے دار کی بڑی کار میں فٹ ہو جائیں' کیا پتا ریڈیو ٹیپ او بیٹری کے پسند آجائیں۔"

غالب نے کہا "ایک گھنٹا انتظار کرنے میں کوئی نقصان نہیں۔ اس کے بعد جو چاہو کرو۔ فون نمبر بتا دو اپنا۔"

شاید بات اس کی سمجھ میں آگئی "اچھا۔ ایک گھنٹا انتظار کرتا ہوں میں.... لیکن یہ تو بتا دو کہ اس ایک گھنٹے میں تم کیا کرو گے؟ یہ میرا کارڈ ہے۔"

"ہم کوئی واردات نہیں کریں گے۔ یہ ہمارا وعدہ ہے" غالب نے اس کی جگہ بیٹھ کے گاڑی آگے بڑھا دی۔

شیلی نے یہ سب کارروائی بڑی ناگواری سے برداشت کی تھی "یہ تو جرم ہے یار" کار چھیننا۔"

میں نے کہا "مجبوری آدمی سے بہت کچھ کراتی ہے۔"

شیلی نے پیچھے دیکھا "بے چارہ۔ کیسے پیدل آرہا ہے۔ کیا گاڑی چھینے بغیر کام نہیں چلتا تھا؟ یار اس سے درخواست کرتے۔"

"بعد میں وہ نشاندہی کرتا کہ انہیں میں نے یہاں ڈراپ کیا تھا اور تفتیش کا چکر شروع ہو جاتا۔ ڈاکٹر مس شیلا خان عرف غزالہ

سہگل! تم اپنے خوب صورت لب بند رکھو یا لبِ لعلیں سے صرف مسکرا کے بجلی گرانے کا کام لو تو بہتر ہے۔"

"صاف کیوں نہیں کہتے یار کہ شٹ اپ۔"

"او کے۔ شٹ اپ۔ ہم باہر انتظار کرتے ہیں، تم ہوٹل سے اپنا سامان اٹھاؤ اور چیک آؤٹ کرو" میں نے کہا "ورنہ رینٹ اے کار والے اور پریشان کرنے والے یا قتل کرنے والے سیدھے یہاں پہنچ جائیں گے۔"

"اور ٹیڑھے راستے سے ہم کہاں جائیں گے؟" غالب نے کہا

"جہاں خاتون محفوظ رہیں جملہ آفاتِ ارضی سے....."

میں نے کہا "چراغ تلے۔ جہاں اندھیرا ہوتا ہے۔"

"کیا مطلب؟ یہ کسی بجلی کے کھمبے کے نیچے کھڑی رہیں گی۔"

میں نے کہا "ہم نے نقوی صاحب سے جھوٹ بولا تھا کہ یہ ایمبیسڈر ہوٹل میں قیام پذیر ہیں۔ انہوں نے سچ مانا اور یہاں سے نکل کے ہم وہیں جائیں گے۔ نقوی صاحب وہاں پہنچے تو معلوم کریں گے کہ اس نام کی خاتون یہاں مقیم ہیں تو ظاہر ہے جواب نفی میں ملے گا۔ بعد میں پولیس تفتیش کرے گی تو نقوی صاحب بتائیں گے کہ وہ ایمبیسڈر ہوٹل میں بھی نہیں ہیں۔ انہوں نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ لیکن ہم وہیں ہوں گے۔ ہم سے میری مراد ہے ڈاکٹر شیلا خان جو کسی اور نام سے رجسٹریشن کرائیں گی۔"

اس کے بعد شیلی نے بھی کوئی سوال نہیں کیا۔ ہم فلیٹیز پہنچے تو سورج طلوع ہوگیا تھا۔ ہم نے کار کو بہت سی دوسری کاروں کے درمیان پارک کیا اور شیلی کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ الگ کھڑی ہوئی گاڑی زیادہ نمایاں ہوتی اور بہت سے لوگ ہماری صورت بھی ملاحظہ کرتے۔

"کیا تم واقعی لندن چلے جاؤ گے؟" غالب نے کہا۔

"یہی بہتر ہے۔"

"شیلی کے ساتھ بہتر نہیں ہے۔ رابعہ پہلے ہی بدگمان ہے، وہ تم سے نفرت کرنے لگے گی۔"

"کیا تم اسے سمجھا نہیں سکتے؟" میں نے کہا۔

"محبت کے پاگل پن میں عقل کے دلائل سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔"

"اس وقت ہر صورت میں میرا روپوش ہوجانا ہی میرے مسائل کا حل ہے۔ جب تک نقوی صاحب اپنا وعدہ نہیں نبھاتے، میرے خلاف مقدمات ختم نہیں ہوتے یا کمزور نہیں پڑتے میں سامنے کیسے رہ سکتا ہوں۔"

"روپوشی کے لیے لندن جانا ضروری ہے؟"

"پھر کہاں جاؤں؟ ہمالیہ کی ترائی میں جہاں آدم خور شیر رہتے ہیں یا افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں یا پھر برفانی خطے میں۔ بلاوجہ نیل کے ساحل سے لے کے تابہ خاکِ کاشغر پھروں۔ اس کے باوجود کیا تم رابعہ کو یقین دلادو گے کہ میں شیلی کے ساتھ لندن میں نہیں ہوں؟ یا جہاں بھی ہوں، وہ میرے ساتھ نہیں ہے اور میں اس کے ساتھ نہیں ہوں؟ آخر وہ بھی تو غائب ہوگئی، بدگمانی پہلے سے ہے۔"

"تمہیں یقین ہے کہ نقوی صاحب اپنے وعدے پر قائم رہیں گے؟"

"اس کا اندازہ ہوگیا ہے۔ انہوں نے پولیس سے وہی کہا جو ہم چاہتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کا جھوٹ چلا نہیں مگر انہوں نے اپنے جھوٹ کو تسلیم ہی نہیں کیا اور یہ نہیں مانا کہ مجرمان سکندر بخت، غالب اور ڈاکٹر شیلی ان کے گھر میں تھے۔ اگر رفیق کے قتل کی تفتیش نہیں ہوئی اور خبر عام نہیں ہوئی تو سمجھ لو کہ نقوی صاحب نے معاملے کو دبادیا۔ ایس ایچ او پر تو انہوں نے واضح کردیا تھا کہ وہ اسے قصوروار نہیں سمجھتے۔ مجسٹریٹ کو بھی وہ بخش ہی دیں گے اور وہ رپورٹ دے گا کہ کہیں کچھ نہیں۔ نہ کوئی قتل ہوا، نہ کوئی گاڑی ملی۔ نقوی صاحب کے گھر میں سب سکون سے سو رہے تھے۔ گارڈ ڈیوٹی پر موجود تھا۔ اندر پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔ تاہم اس کارروائی سے ہمیں ایک اضافی فائدہ ہوگا۔ نقوی صاحب اپنی بے عزتی پر برافروختہ ہیں۔ وہ معلوم کریں گے کہ ان کے گھر چھاپا پڑوانے کا بندوبست کس نے کیا تھا اور اتنی رازداری سے ان کے خلاف سازش کس نے کی تھی۔ یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ کوئی ایس پی یا مجسٹریٹ فون پر ان سے دریافت کرلیتا کہ سر ہم نے کچھ ایسا سنا ہے۔ خدانخواستہ آپ کے گھر میں کوئی سیاہ مرسڈیز تو نہیں کھڑی ہوئی ہے جس میں ایک لاش ہے اور نقوی صاحب کہہ دیتے کہ واٹ نان سنس۔ کیا تم نشے میں ہو؟ یہاں صرف میری گاڑی کھڑی ہے۔ بات ختم ہوجاتی مگر ان کے کسی برابر کے حریف نے انہیں ذلیل کرنے کی کوشش کی اور قربانی کا بکرا مجسٹریٹ کو بنالیا۔ اب نقوی صاحب سازش کرنے والوں کو معاف نہیں کریں گے۔ ایک ایک کا پتا چلالیں گے اور میرا خیال ہے کہ ابتدا ہوگی چوہدری دلاور کے نام سے۔"

"آپ کے منہ میں گھی شکر۔ کاش ایسا ہو۔"

"ایسا ہوگا۔ نقوی صاحب خاموش کیسے بیٹھ سکتے ہیں۔ اتنی بڑی توپ ہیں وہ۔ توپ کا رخ جس کی طرف ہوگیا وہ مارا گیا۔"

"میں پھر وہیں آتا ہوں۔ شیلی کے ساتھ لندن مت جاؤ۔ تم یہاں بھی روپوش رہ سکتے ہو۔" غالب نے کہا "رابعہ کی بدگمانی دور ہوجائے گی کہ شیلی تو گئی۔ وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے لیکن اپنا بیمار یہیں ہے۔ تم بھی کبھی کبھار اس کے حضور میں حاضری لگوانے جاسکتے ہو۔"

"دیکھ یار، بات تیری سولہ آنے درست مگر میں عورت ذات کے جذبات کی انتہا سے ڈرتا ہوں۔ انتہائی محبت کرنے والی اگر اچانک نفرت کرنے لگے۔ خواہ نفرت کی وجہ کوئی نہ ہو۔ تو اس میں بھی انتہا ہوگی۔ کہیں وہ خود نہ پکڑوادے مجھے۔ عورت کی نفسیات

میں ایک کجی یہ ہے کہ وہ کسی کو حاصل نہ کرسکے تو پھر یہ بھی برداشت نہیں کرتی کہ کوئی اور اس کے محبوب کا ہوجائے۔ تم میرے نہیں تو کسی کے بھی نہیں۔ بس اللہ کو پیارے ہوجاؤ۔ اس فارمولے سے ڈر لگتا ہے۔"

"رابعہ پاگل نہیں ہے۔"

"فی زمانہ وہ ہم سب سے زیادہ پاگل ہے۔ تم دیکھو اس کا رویّہ اور ردّعمل۔ اسے سمجھاؤ' قائل کرو کہ سکندر سے بڑا سچا عاشق تو نہ مجنوں تھا نہ فرہاد۔ اس کی برین واشنگ کرتے رہو' یہاں تک کہ بدگمانی اور نفرت کا سارا زہر دُھل جائے۔ پھر مجھے مطلع کرنا۔ میں سیدھا مکھڑے پہ سہرا ڈالے گھوڑے پر سوار' قاضی کو پیچھے بٹھا کے بگٹٹ دوڑتا ہوا آجاؤں گا۔ تم اور محسن گواہ بن کے موجود رہنا۔ چٹ منگنی کے بغیر پٹ بیاہ' فافٹ روانگی برائے ہنی مون اور کھٹاکھٹ بچے۔ دو دو تین تین۔ پانچ سات سال میں منظر کو شکستِ فاش۔ ایک بہت بڑا چیلنج یہ بھی ہے دوست۔"

غالب نے ہنستے ہوئے کہا "محسن کہتا ہے' لندن میں تمہارے پندرہ بچے موجود ہیں۔ بیوی ایک بھی نہیں۔"

"بکواس کرتا ہے وہ۔ سولہ کا حساب تو میرے پاس ہے۔ دراصل یہ اینگلو انڈین نسل انگریز اپنے دورِ حکومت میں چھوڑ گئے تھے۔ ہم جوابی انتقامی کارروائی میں مصروف تھے۔ بڑے بڑے لارڈز اور عالی نسب' مغرور اور متعصب انگریزوں سے بدلہ لینا ایک قومی فریضہ تھا۔ ہماری اس تحریک میں انڈین اور پاکستانی بڑے جوش و خروش سے حصہ لیتے تھے۔"

"تحریک ہی ایسی تھی۔ تحریکِ حرامی پن۔ تم کو شرم نہیں آتی؟"

"اب آتی ہے یار۔ بس جوانی دیوانی کا قصور تھا۔"

شیلی کو دیکھ کے میں نے ہاتھ ہلایا اور وہ سیدھی کار کی طرف آئی۔ رات بھر جاگنے سے اور خوف کے باعث اس کا بُرا حال تھا۔ غالب نے آگے جاکے اس کا سوٹ کیس لے لیا جو ہوٹل کا ایک پورٹر لا رہا تھا۔ وہ بخشش لے کر واپس ہوگیا۔ میں بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ ہماری مسروقہ کار دیکھے۔

ایمبیسیڈر ہوٹل پر میں شیلی کے ساتھ اتر گیا۔ "اب تم گاڑی کہیں چھوڑ کے اس بے چارے کو فون کردو۔ پھر ٹیکسی لے کر سیدھے گھر جاؤ اور میرے جملہ لواحقین کو تسلی دو کہ صبح کا بھولا شام کو گھر آنے کا وعدہ کرچکا ہے۔"

غالب نے کہا "تم شرفا کے اس ہوٹل میں قیام فرماؤ گے۔ اس حلیے میں؟"

"حلیہ بدل کے کوئی شریف آدمی نہیں ہوجاتا۔ میں خود اپنی شرافت کی سند ہوں" میں نے کہا۔

کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے بے حد شائستہ اور صاف ستھرے کپڑوں والے کلرک نے ہم دونوں کو دیکھ کے سر کھجایا مگر خاموشی سے رجسٹر سامنے کردیا۔ میں نے اپنا اور شیلا کا نام "مسٹر اینڈ مسز رستم جی ٹین والا" لکھا اور پتا کراچی کا۔ ظاہر ہے شیلی کو نہ کچھ معلوم ہوا' نہ اسے اعتراض ہوسکتا تھا۔

میں نے بے حد غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا "یہ ملک اب جنگل ہوتا جارہا ہے۔ میرا خیال ہے اب یہاں نہیں رہنا چاہیے۔"

کلرک نے رجسٹر پر ایک نظر ڈال کے کہا "کس قسم کا روم پسند کریں گے آپ؟"

میں نے فرنچ میں شیلی سے کہا "دیکھو میں نے خود کو اور تمہیں میاں بیوی لکھا ہے۔ ظاہر ہے ہم لوگ الگ الگ کمروں میں نہیں رہ سکتے۔ دوسری بات یہ کہ میری جیب میں تو پھوٹی کوڑی نہیں ہے۔ اسے ایڈوانس دے دو۔ ایک ہزار کے قریب۔"

"میرے پاس ٹریولر چیک ہیں۔"

"امریکن ایکسپریس کے چیک چلتے ہیں" میں نے کہا اور کلرک سے مخاطب ہوگیا "ہمارے پاس نقد رقم نہیں ہے۔ فی الحال' امریکن ایکسپریس ٹریولر چیک ہیں۔"

"نو پرابلم سر۔" کلرک ہماری فرنچ سے سخت متاثر ہوا تھا اور میرا گرد و غبار سے اٹا ہوا لباس اور مضحکہ خیز حلیہ اس کے لیے غیر اہم ہوگیا تھا۔

"ہم آئے تھے شکار کے لیے۔ خود شکار ہوگئے۔ بدمعاشوں نے ہماری گاڑی بھی چھین لی۔" میں نے خفگی سے کہا "بڑی مشکل سے یہ ایک سوٹ کیس دیا جس میں کپڑے تھے۔ ٹریولر چیک ان کے لیے بے کار تھے اس لیے بچ گئے۔"

"آئی ایم سوری سر۔ کیا آپ نے رپورٹ کی پولیس کو؟"

"ہاں۔ کی ہے مگر اس سے کیا ہوگا؟" میں نے مایوس لہجے میں کہا "ہم نے رات کو دس میل پیدل سفر کیا جنگل میں پھر لفٹ لے کر یہاں پہنچے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں نو وزیٹر' نو فون کالز۔ "NO VISITORS- NO PHONE CALLS

شیلی نے کہا "کمرا پچھلی طرف اور پرسکون ہو۔ اوپر' جہاں سے شہر نظر آئے مشرق کی طرف۔"

کلرک مزید متاثر ہوا اور اس نے ایک پورٹر کو بُلا کے ہمارے ساتھ کردیا جس نے شیلی کا سوٹ کیس اور بیگ اٹھالیا۔ جب وہ ٹپ اور ناشتے کا آرڈر لے کر چلا گیا تو میں نے بیڈ پر گر کے کہا "اف۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔ بھوک اور نیند سے میرا برا حال ہے۔"

"تم تو عادی ہو" شیلی صوفے پر بیٹھ گئی "یہ میرے لیے تو بہت اعصاب شکن تجربہ تھا۔"

ناشتا کرتے ہی میں پڑ کے سویا تو شام کی خبر لی۔ آنکھ کھلی تو کمرے میں لائٹس آن تھیں۔ شیلی مشرق کے رخ کھلنے والی کھڑکی سے شہر کا نظارہ کر رہی تھی۔ میں نے پیچھے سے جا کے "ہیلو" کہا تو وہ

اُچھل پڑی۔
"تم نے تو ڈرا دیا مجھے یار' دیکھو میرا دل کیسے دھڑک رہا ہے" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے کہا۔

میں نے ہاتھ اس کے دل پر رکھنے کے بجائے نرمی سے چھڑالیا "دل کا تو کام ہی دھڑکنا ہے ڈاکٹر شیلی۔ تم سوئی نہیں؟"

"ہم بھی اٹھی تھی کچھ دیر پہلے یار۔ سوچا چائے پی لوں۔ پھر سوچا تمہیں اٹھاؤں۔ پھر سوچا کہ انتظار کروں" وہ ہنس پڑی۔

"مسز رستم جی نین والا! تم نے تو نہادھو کے کپڑے بدل لئے تھے۔ میں ابھی تک بھوت بنا ہوا ہوں۔ اس طرح میرا باہر جانا بھی ممکن نہیں۔ تم ایسا کرو کہ غالب کو فون کرو" میں نے کہا "اچھا چھوڑو۔ ایسا نہ ہو' اس کے پیچھے پیچھے کوئی یہاں بھی پہنچ جائے۔"

"میں بازار سے کپڑے لے آتی ہوں" اس نے مجھے نظروں سے ناپ کے میرے سائز کا اندازہ کیا۔

"یہاں ہوٹل سے کار لو۔ ان کے اپنے آدمی قابل اعتبار ہوتے ہیں۔ انارکلی میں یا مال پر بہت سی دُکانیں ہیں۔ کسی بھی بڑے اسٹور میں چلی جاؤ۔ وہ ٹریولر چیک لے لیں گے۔"

"یار' مجھے شیخ صاحب کو کال بھی کرنی ہے.... لندن۔"

"وہ کیوں؟"

"انہیں بتادوں کہ اب میں یہاں ہوں۔ وہ پریشان نہ ہوں۔"

"انہیں بتادینا کہ آئندہ تم خود انہیں فون کروگی۔ وہ زحمت نہ کریں۔ انہیں سمجھادینا کہ رفیق لاپتا ہے اور ان حالات میں تم خود کو غیر محفوظ محسوس کرتی ہو اس لیے ایک ہی ہوٹل میں زیادہ عرصہ قیام کرنا ممکن نہیں۔"

"یار' تمہارے بارے میں.... کیا کہوں؟"

"کچھ نہیں۔ کسی کے بارے میں کوئی بات نہ کرنا۔ جیسے ابھی تک نہ تم کسی سے ملی ہو' نہ کوئی ایسی بات ہوئی ہے جس کا ذکر کیا جائے۔ ہاں یہ کہہ دینا کہ تمہارا ارادہ واپس لندن آنے کا ہے۔"

"یار' وہ پوچھیں گے نہیں کہ کیوں؟"

"کہہ دینا کہ رفیق کے لاپتا ہوجانے کے بعد تم کو شبہ ہے کہ کچھ لوگ تمہارا تعاقب کرتے ہیں۔ اسی لیے تم نے ہوٹل بدل لیا ہے اور شاید پھر بدلو۔ زیادہ خطرہ محسوس ہوا تو تم یہاں نہیں ہوگی.... رائٹ؟"

"رائٹ۔ اگر تم کہتے ہو" وہ مسکرائی۔

میں نے فون اٹھا کے روم سروس کو کافی کے لیے کہا اور شیلی ہاتھ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ میں نے اسے اندازے سے بتایا کہ ادھر پہلے شاہین رضوی کا گھر تھا۔ ماڈل ٹاؤن کا وہ گھر کہاں ہے جہاں ہم گزشتہ رات تھے۔ شاہی مسجد کے مینار نظر آرہے تھے۔ مقبرہ جہانگیر کے بھی تین مینار دیکھے جاسکتے تھے۔

"یہ ایک عجیب بات ہے۔ جہانگیر کے مقبرے کے کسی بھی مینار پر چڑھ کے دیکھو' بادشاہی مسجد کے تین مینار نظر آئیں گے اور

فرق

قرضہ دینے والی کمپنی نے اخبار میں یہ اشتہار شائع کروایا۔
"آپ کیوں پریشان ہیں؟ اپنے دوستوں سے قرضہ نہ لیں' ہم سے لیں۔۔۔ دونوں کے فرق کو سمجھیں۔ آپ کے دوست آپ کو چھوڑ دیں گے' ہم آپ کو کبھی نہیں چھوڑیں گے۔"

بادشاہی مسجد کے ہر مینار سے مقبرے کے تین۔"

"واقعی؟ تم نے دیکھا ہے یار؟" شیلی نے بے حد حیرانی سے کہا۔

"نہیں۔ ہر مینار پر چڑھنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ ویسے بھی میں نے جب بھی دیکھا' ایک ہی مینار پر جانے والا راستہ کھلا دیکھا۔ باقی تین بند تھے۔"

"اور اس مینار سے۔۔"

"وہاں سے تو تین ہی نظر آئے مجھے۔ یہ بات بہت مشہور ہے۔ ایسا کوئی شخص آج تک ملا نہیں جو کہے کہ میں نے یہ تجربہ کیا ہے۔ مقبرۂ جہانگیر کے چاروں اور بادشاہی مسجد کے چاروں میناروں پر چڑھ کے۔ ہوسکتا ہے یہ روایت ہو۔"

"کیا روایات غلط ہوتی ہیں یار؟"

"روایات۔۔ بس روایات ہوتی ہیں۔ یہ بھی سُنا تھا کہ قلعۂ لاہور سے شالیمار باغ تک زیرِ زمین راستے ہیں۔ بیشتر لوگ اس پر یقین رکھتے ہیں مگر یہ غلط ہے۔"

"یار! تم میرے ساتھ ایک اچھے ٹورسٹ گائیڈ بن کے چلو۔ میں سب دیکھنا چاہتی ہوں۔ پاکستان ایک اجنبی وطن ہے میرے لیے۔ اس کا گوشہ گوشہ مجھے بُلاتا ہے۔"

"شامتِ اعمال آپ کو بُلاتی ہے میڈم۔ گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے" میں نے کہا۔

"تم مجھے گیدڑ کہہ رہے ہو۔ میں بزدل نہیں ہوں یار۔"

"تم یہاں ٹورسٹ نہیں ہو۔ اپنے مقصد کو مت بھولو اور یہ بھی کہ نہ میں ٹورسٹ گائیڈ ہوں۔ نہ یہ ساتھ مستقل ہے۔ حالات کی مجبوری نے ہمیں ایسے ہی یکجا کردیا ہے جیسے بارش سے پناہ لینے کے لیے دو اجنبی ایک ہی درخت کے نیچے کھڑے ہوں۔"

اس کا چہرہ ایک دم بجھ گیا "ہم اچھے دوست بھی نہیں ہوسکتے؟"

"ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں تو تمہیں جانتا تک نہیں۔ جو تم نے کہا وہ میں نے FASE VALUE پر مان لیا۔ تصدیق کئے بغیر۔ میں نے زندگی میں بہت فریب کھائے ہیں اس لیے انسانیت پر اعتماد کے باوجود انسانوں پر اعتبار مشکل سے کرتا ہوں۔ مجھے خوشی

ہو گی، اگر وہ سب سچ ہوا جو تم نے مجھے اپنے بارے میں بتایا ہے۔"
"اور جھوٹ ہوا تو...؟" وہ خلا میں دیکھنے لگی۔
"تو میں رعایت دیے بغیر تمہیں جان سے بھی مار سکتا ہوں۔"
"تم... بڑے بے رحم ہو یار۔" اس نے دکھی لہجے میں کہا۔
"میں کیا کروں۔ دنیا بڑی بے رحم ہے۔"
دروازے پر دستک ہوئی اور میں نے دروازہ کھولا تو ویٹر نے اندر آ کے کافی رکھی۔ واپس جانے سے پہلے اس نے ایک نظر شیلی کو اور پھر مجھے دیکھا۔ اس ایک لمحے میں مجھے اس کی آنکھوں میں اُلجھن اور تذبذب کی جھلک نظر آئی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا مگر وہ پلٹ چکا تھا۔ میں شیلی پر اپنے شک کا اظہار کر کے اسے خوف زدہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔
"ویٹر!" میں نے کہا۔
وہ رک گیا اور واپس آیا "یس سر۔"
"میڈم کو شاپنگ کے لیے جانا ہے۔ یہاں رینٹ اے کار سروس ہے؟"
"ہے سر۔ آپ منیجر کو بتادیں" اس نے پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھا۔
میں نے یاد کرنے کی کوشش کی مگر مجھے اس کے چہرے یا آواز میں شناسائی کی رمق تک محسوس نہ ہوئی "او کے۔ تم جاؤ۔"
شیلی کے جاتے ہی میں نے دوبارہ کافی منگوائی لیکن اس بار کافی لانے والا ویٹر دوسرا تھا۔
میں نے کہا "ابھی کچھ دیر پہلے کافی کون لایا تھا؟"
"مجھے نہیں معلوم سر۔ اس روم سروس کے لیے تو میں ہوں۔"
میں نے کہا "کیا کوئی اور نہیں آسکتا؟ فرض کرو تم نہ ملو۔ مصروف ہو۔"
"یہ دس کمرے میرے ہیں سر۔ اس فلور پر۔ میں کہاں جاسکتا ہوں۔ چند منٹ تو لگ جاتے ہیں۔ اور کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہوتی....."
میں نے کہا "اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہاں تمہاری ڈیوٹی ہے؟"
وہ گھبرا گیا "آپ منیجر کو فون کرسکتے ہیں سر۔ یہ میرا نمبر ہے۔ میرا نام ہے مراد خان۔"
میں نے کہا "ٹھیک ہے، تم جاؤ۔"
اس کے باہر نکلتے ہی میں نے چند منٹ توقف کیا پھر دروازہ کھول کے راہداری میں دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے ریسیور اُٹھا کے آپریٹر سے کہا کہ منیجر سے بات کرائے۔
"میں رستم جی ٹین والا بول رہا ہوں۔ ابھی کچھ دیر پہلے چیک اِن کیا ہے میں نے۔" میں نے انگریزی میں کہا۔
"یس سر۔ اینڈ واٹ کین آئی ڈو فار یو۔ (میرے لیے کوئی خدمت؟)"
"اس کمرے میں ویٹر کون ہے؟ روم سروس کے لیے۔"
"کیا بات ہے سر؟ کوئی شکایت؟"
"کچھ نہیں۔ اس کا نام... نمبر اور حلیہ..."
"نام ہے شاہ دین۔ نمبر نوسیون۔ لمبا، قدرے کالا۔ ایبٹ آباد کی طرف کا رہنے والا ہے۔"
میں نے ریسیور رکھ دیا اور کافی کو گھورنے لگا۔ یہ کافی لانے والا ویٹر پستہ قد، فربہی مائل اور گورا تھا۔ اس کا نمبر بھی غلط تھا۔ وہ اٹھائیس نمبر تھا۔ اچانک تحفظ اور سکون کا احساس ختم ہو گیا تھا۔ مجھے شک نہیں، یقین تھا کہ کافی میں زہر ہو گا یا خواب آور دوا ہوگی مگر ایسا کوئی طریقہ نہیں تھا کہ میں اس کافی کا تجزیہ کسی لیبارٹری سے کرا سکتا یا یہ کافی کسی اور کو پلا کے اپنے شکوک رفع کرسکتا۔ جرائم کی کہانیوں میں تو عموماً کتے بلی کو زہر آلود چیز کھلا کے مار دیا جاتا ہے اور ہیرو صاف بچ جاتا ہے مگر یہاں کتے بلی ہوتے تب بھی کافی شاید نہ پیتے۔ میں کسی اور کو مثلاً خود منیجر کو دعوت دیتا تو غیر ارادی قتل کا مرتکب ٹھہرتا اور لمبے چکر میں پڑ جاتا۔ صورتِ حال کی سنگینی واضح ہو کے سامنے آنے لگی تھی۔ شیلی کے یا میرے تعاقب میں کوئی ویٹر بن کے اندر پہنچ چکا تھا۔ شاید اب اس کا سراغ لگانا مشکل ہو جائے۔ وہ اپنا کام کر کے نکل جائے گا اور جس نے بھی اسے بھیجا تھا اسے رپورٹ دے گا کہ وہ ناکام نہیں رہا۔
اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے فون کی طرف یوں دیکھا جیسے اس خطرناک آلے سے سوائے اس شخص کے کسی کی آواز نہیں نکلے گی جس کا خیال میرے ذہن میں خطرے کا احساس پیدا کر رہا تھا۔ میں نے واضح ہدایت دی تھی کہ مجھے کوئی بھی فون کرے، میرا نمبر نہ ملایا جائے۔ میں نے اس خیال سے ریسیور اُٹھا لیا کہ شاید میرا خوف بے بنیاد ہو اور منیجر مجھ سے مزید وضاحت چاہتا ہو کہ میں ویٹر کے بارے میں کیوں پوچھ رہا تھا۔
آپریٹر نے کہا "سوری سر۔ آپ کی ہدایات مجھے معلوم ہیں لیکن فون مسز رستم کا ہے۔"
"او کے۔ میں بات کروں گا۔"
شیلی نے کہا "رستم! میں نے لندن کال کی تھی۔"
"پھر...؟ پریشانی کی کیا بات ہے...؟"
"یار وہ..." شیلی نے باقی بات فرنچ میں کی "اس پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔ اس کی بیوی مر گئی۔ وہ اسپتال میں ہے۔ کوما میں۔ بالکل بے ہوش....."
اسی وقت میری نظر دروازے کی طرف گئی۔ کسی نے ایک لفافہ نیچے سے سرکا دیا تھا۔

شکار گاہوں کے اسرار۔ شکنجے۔ شکاری۔ شکار
باقی واقعات آئندہ ماہ جاسوسی ڈائجسٹ میں پڑھیے

جاسوسی ڈائجسٹ : اپریل 1994

ناول سکینینگ و کمپوزنگ
محمد سجاد بھٹی
03045503086

خصوصی تعاون: جاسوسی نشست ایڈمن

ڈاکٹر حامد حسن۔ساگر زمان۔عقیل قریشی۔
ممتاز علی کیانی۔سیف الملوک عباسی۔
یاسر حسنین۔ناصر محمود بلوچ۔محمد
نعمان & صائم بھائی

اردو ادب کے سب رنگ۔ادبی محفلے۔قدیمی
جاسوسی دنیا۔اولڈ سہانے ناولز..... فینز گروپ

پسِ نقاب

عائشہ جمال

اُن نازک لمحات کی رُوداد جن کی سنسنی خیزی اعصاب شکن ہوتی ہے

قتل کی ایک واردات کا ماجرا جس میں قاتل کا چہرہ ایک ایسی نقاب کے پیچھے پوشیدہ تھا جس پر کسی کی نظر ہی نہ پڑ سکے۔ اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ قاتل اپنے پیچھے اپنا کوئی نشان ضرور چھوڑتا ہے۔



سراغرساں لیفٹیننٹ کولسن اندازہ نہیں کر پا رہا تھا کہ لاش کو دیکھ کر سلویا نامی اس لڑکی کا ردِ عمل کیا ہوگا۔ وہ صحافی تھی مگر صحافت میں بھی نو آموز معلوم ہوتی تھی اور لگتا یہی تھا کہ قتل و غارت یا لاشوں وغیرہ سے بھی اسے پہلے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ وہ نہایت نازک اندام اور نفیس سی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔

اس کے سیاہ بال ریشمی اور گھنگریالے تھے۔ چھوٹی سی خوبصورت ناک اور نازک سا دہن اس کے حسن میں اضافہ کر رہا تھا۔ لگتا یہی تھا کہ وہ خون بہتے نہیں دیکھ سکتی اور سراغرساں کولسن کو اندازہ تھا کہ جو لاش وہ دیکھنے جا رہے تھے وہ خون میں لتھڑی ہوگی۔

"تم واقعی لاش دیکھنے کے لئے میرے ساتھ جانا چاہتی ہو؟"

اس نے بارھویں مرتبہ سوال کیا۔ ہر بار یہ سوال کرتے وقت وہ کہنی میز پر ٹکا لیتا تھا' ایک انگلی ناک پر رکھ لیتا تھا اور اس کی بھوؤں میں سے ایک اوپر کو اٹھ جاتی تھی' دوسری نیچے آجاتی تھی۔

پولیس فورس میں سبھی اس کے اس انداز سے بے حد محظوظ ہوتے تھے۔ بعض مذاق بھی اڑاتے تھے لیکن سراغرساں کولسن بُرا

نہیں مناتا تھا۔ وہ عموماً کسی بھی بات کا بُرا نہیں مناتا تھا۔ بہت خوش مزاج آدمی تھا۔ اس کا چہرہ گول مٹول اور معصوم سا تھا۔ اسے دیکھ کر خیال آتا تھا کہ اس شخص کو پولیس میں نہیں ہونا چاہیے تھا بلکہ بچوں کے استعمال کی چیزوں کے لیے ماڈلنگ کرنی چاہیے تھی۔ مثلاً اس کی تصویر اگر بے بی ٹیلکم پاؤڈر کے اشتہار میں ہوتی تو بہت بھلی معلوم ہوتی۔

سلویا نے اپنا ہینڈ بیگ بغل میں دبایا اور اٹھتے ہوئے بولی۔ "یقیناً میں جانا چاہتی ہوں مسٹر کولسن! میں نے بڑی مشکل سے اس ملاقات اور آپ کے ساتھ ساتھ رہنے کی اجازت حاصل کی ہے۔ میں پوری کارروائی کا مشاہدہ کرنا چاہتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی چیز میری نظر سے اوجھل رہے۔"

کولسن ناک سے انگلی ہٹاتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے۔ جیسے تمہاری مرضی۔ تمہیں وہاں دیکھنے کو کوئی ایسی خاص چیز نہیں ملے گی اور نہ ہی تمہارے صحافتی تجربے میں کوئی خاص اضافہ ہوگا۔ بلکہ شاید تم کچھ اچھا محسوس نہ کرو۔"

سلویا پہلے بھی یہ بات سن چکی تھی۔ کندھے اچکا کر رہ گئی۔ کولسن اسی کی گاڑی میں بیٹھ کر جائے واردات پر پہنچا جہاں انہیں تین منزل کی سیڑھیاں چڑھنا پڑیں۔ وہ زرد پتھروں سے بنی ہوئی ایک پرانی سی عمارت تھی جسے کئی حصوں میں تقسیم کرکے اپارٹمنٹس بنادیے گئے تھے۔

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کولسن بولا۔ "سچی بات تو یہ ہے سلویا.... کہ قتل کی بیشتر وارداتوں کی تفتیش تقریباً یکساں انداز میں ہی ہوتی ہے۔ سب کچھ لگے بندھے سے اصولوں کے تحت ہوتا ہے۔ اس میں کوئی نیاپن یا دلچسپی کا پہلو نہیں ہوتا۔"

"شاید تمہیں اس میں نیاپن یا دلچسپی اس لیے محسوس نہیں ہوتی کہ تمہارے لیے یہ روز کا کام ہوگیا ہے۔" وہ بہت تیکھے اور نپے تلے انداز میں بولتی تھی اور ہر لفظ کے ساتھ گویا اس کے سر کو خفیف سا جھٹکا لگتا تھا۔

"ہاں۔ قتل کی تفتیش بھی دوسرے کاموں کی طرح ایک کام ہے۔ جب انسان اس میں بہت تجربہ کار ہوجاتا ہے تو اکثر اسے تفتیش کے دوران ہی نتائج سامنے نظر آنے لگتے ہیں۔ بہت سی باتوں کا اسے پہلے سے اندازہ ہونے لگتا ہے کہ کیا ہوگا۔"

"تمہارے خیال میں یہاں کیا ہوگا؟" سلویا نے پوچھا۔

"یہاں.....؟" کولسن نے اپنی ناک ہولے سے مسلی۔ "میں اندازہ لگانے کی کوشش کرتا ہوں۔ مقتولہ ٹرینا تھارن ایک خوبصورت عورت تھی۔ ماڈل تھی..... لاش مالک مکان نے دریافت کی ہے۔ مجھے یقین ہے لاش بیڈ روم میں ہوگی۔ خون کافی بہا ہوگا۔ اس کے بال خون سے چپ چپے ہورہے ہوں گے......"

سلویا کی چال میں ایک لمحے کے لیے لڑکھڑاہٹ سی آگئی۔ کولسن جلدی سے بولا۔ "معاف کرنا.... مجھے چونکہ خرانٹ اور تجربہ کار قسم کے کرائم رپورٹرز وغیرہ سے بات چیت کرنے کی عادت ہے، اس لیے میں اسی طرح سیدھے سادے بلکہ کھردرے انداز میں واردات کے بارے میں بولتا چلا گیا۔ مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ تم تو خواتین کے ایک خوبصورت فیشن میگزین میں کالم نگار ہو۔"

سلویا گویا مضبوطی سے قدم بڑھاتے ہوئے بولی۔ "مجھے نازک اندام اور نفاست پسند خواتین کی نمائندہ سمجھ کر ترس کھانے کی ضرورت نہیں۔ قتل کی ایک واردات کا مشاہدہ کرنا ایک کام ہے، جو میرے سپرد کیا گیا ہے اور میں اسے پورا کرکے رہوں گی۔"

وہ ارادے کی پکی معلوم ہوتی تھی اور اچھی خاصی خوبصورت بھی تھی۔ اس کی رفاقت میں تفتیش کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ کولسن ہنکارا بھر کر رہ گیا۔

اپارٹمنٹ کے دروازے پر دو باوردی پولیس والے تعینات تھے۔ کولسن اور سلویا اندر پہنچے تو میڈیکل ایگزامنر ڈاکٹر ڈریک انہیں لاش کے پاس لے گیا۔ لاش واقعی بیڈ روم میں تھی۔ فنگر پرنٹس کا ماہر جارڈن مختلف چیزوں پر پاؤڈر چھڑک رہا تھا۔

لاش دیکھ کر سلویا کی رنگت کچھ زرد پڑ گئی۔ وہ کمرے کے ایک کونے میں جاکر سبز اور سنہرے رنگ کی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے اسے کھڑے رہنے میں دشواری پیش آرہی ہو۔

کولسن خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ "آدھا جسم چادر سے ڈھکا ہوا.... ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی..... اس کا مطلب ہے اسے سوتے میں قتل کیا گیا۔ پیشانی پر بڑا زخم اور خون..... اس کا مطلب ہے اس پر کسی بھاری اور ٹھوس چیز سے وار کیے گئے۔ وہ چیز یقیناً جلد ہی مل جائے گی۔"

ڈاکٹر بولا۔ "اس کی موت آج صبح ہی واقع ہوچکی تھی....." پھر وہ طبّی اصطلاحوں میں اسے بتانے لگا کہ سر کی کون کون سی ہڈی ٹوٹی یا چٹخی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" کولسن سر ہلاتے ہوئے بولا۔ اور ایک بار پھر انگلی سے ناک مسلتے ہوئے اس نے کاہلی آمیز سے انداز میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ اسے نیلے رنگ کا ایک بھاری اور آرائشی قسم کا ٹیبل لیمپ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا نظر آیا۔ اس نے جارڈن کی توجہ لیمپ کی طرف مبذول کرائی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور انگلیوں کے نشانات تلاش کرنے کے لیے آگے بڑھ کر لیمپ پر بھی پاؤڈر چھڑکنے لگا۔

کولسن نے گھوم کر سلویا کی طرف دیکھا جو کرسی پر قدرے اکڑی ہوئی سی بیٹھی تھی۔ وہ پُرسکون لہجے میں بولا۔ "مقتولہ ٹرینا کے مالک مکان سے پوچھ گچھ کرنے کے بعد ہمیں اس کے بوائے فرینڈز کے بارے میں بہت سی باتوں کا اندازہ ہوجائے گا۔ پھر ہم ان سے پوچھ گچھ کریں گے۔ امید ہے، رات کے کھانے تک قاتل پکڑا جائے گا۔ یہ قطعی طور پر روٹین کا کام ہے۔"

"سلویا کی سیاہ آنکھیں قدرے پھیل گئیں۔ "کیا واقعی؟

میرے لیے تو یہ سب کچھ بڑی حیرت کا باعث ہوگا۔"

کولسن منہ پھیر کر گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ عورتیں اکثر معاملات میں اداکاری کیوں کرتی تھیں۔ خصوصاً حیرت کے اظہار میں وہ اپنی اداکاری کے ذریعے کافی مبالغہ کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔

اسی اثنا میں جارڈن لیمپ کے پاس سے ہٹتے ہوئے کولسن کی طرف دیکھ کر بولا۔ "آلۂ قتل یہ لیمپ ہی ہے۔ اسے گو کہ نہایت احتیاط سے صاف کردیا گیا ہے لیکن اس پر خون اور بالوں کے ذرات موجود ہیں۔ تاہم مجھے اندیشہ ہے کہ اس پر انگلیوں کے نشانات نہیں ملیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" کولسن ناک مسلتے ہوئے بولا۔ "نہ جانے کیوں اس قتل کا انداز کافی مانوس سا لگ رہا ہے۔"

سلویا کرسی سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "اس کی وجہ شاید یہ لیمپ ہی ہو مسٹر کولسن! یاد ہے' چند سال پہلے ایک کلب کی رقاصہ کو بھی اسی انداز میں' سر پہ بھاری لیمپ مار کر قتل کیا گیا تھا۔ وہ ایک دولت مند جواری..... کیا نام ہے اس کا..... مجھے یاد نہیں آرہا۔ اس پر اس قتل کے الزام میں مقدمہ چلا تھا مگر وہ بری ہوگیا تھا۔"

"ہاں..... ہاں۔ یاد آگیا۔" کولسن ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اس شخص کا نام کین کارٹر تھا۔"

سلویا مسرور انداز میں مسکرائی۔ "لگتا ہے' میں بھی تفتیش سیکھ رہی ہوں۔ کیا اب تم اِدھر اُدھر گھوم پھر کر سراغ وغیرہ تلاش نہیں کروگے؟ جیسا کہ کہانیوں وغیرہ میں بتایا جاتا ہے۔"

"یقیناً۔" کولسن سرسری سے انداز میں بولا۔ "لیکن یہ بھی محض ضابطے کی کارروائی ہے۔ عام طور پر اس طرح بھی کوئی خاص معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔ کبھی کبھار ہی اتفاقاً کوئی اہم سراغ ہاتھ لگ جاتا ہے۔"

"اگر تم بُرا نہ مناؤ تو میں بھی اِدھر اُدھر کوئی سراغ تلاش کرنے کی کوشش کروں؟ میرا مطلب ہے..... صرف شغل کے طور پر؟" سلویا پُراشتیاق لہجے میں بولی۔

"نہیں۔" کولسن نے بلا تامل جواب دیا۔ سلویا کے چہرے پر مایوسی چھاگئی۔ گویا کسی بچے کو کھیل سے منع کردیا گیا ہو۔ وہ غالباً پانی پینے کچن میں چلی گئی۔ کولسن نشست گاہ میں آگیا جہاں مالک مکان بھی موجود تھا۔ اس کا نام جوزف تھا' وہ پہلی منزل کے ایک اپارٹمنٹ میں رہتا تھا۔ وہ ایک دُبلا پتلا گنجا سا آدمی تھا جس کا سامنے کا ایک دانت سونے کا تھا۔

کولسن نے اس سے گفتگو شروع کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے سُنا ہے ٹرینا کو الارم کلاک وغیرہ پر زیادہ بھروسا نہیں تھا اور اس کی ہدایت پر تم خود روزانہ دوپہر کو بارہ بجے اسے جگانے آتے تھے؟"

جوزف نے اثبات میں سرہلایا۔ اس کی آنکھیں گویا گڑھوں میں اُتری ہوئی تھیں۔

"کیا وہ ہمیشہ رات کو لیٹ آتی تھی؟" کولسن نے پوچھا۔

"ہاں۔" جوزف نے ہنکارا بھرنے کے سے انداز میں کہا۔

"کس کے ساتھ؟"

"مختلف افراد کے ساتھ لیکن زیادہ تر مسٹر کین کارٹر یا پھر جونی اسمتھ کے ساتھ گھر آتی تھی۔"

"اوہ.....!" اس نے ایک بار پھر اپنی ناک مسلی اور ایک ٹک جوزف کی طرف دیکھنے لگا۔ حتیٰ کہ وہ اپنی نشست پر پہلو بدلنے لگا۔ بالآخر کولسن بولا۔ "بس ٹھیک ہے۔ مجھے صرف یہی کچھ پوچھنا تھا۔ فی الحال تم شہر سے باہر یا کہیں دور مت جانا' شاید ہمیں دوبارہ تمہاری ضرورت پڑجائے۔"

جوزف نے ایک بار پھر ہنکارا بھرا اور رخصت ہوگیا۔ کولسن کچن کی طرف منہ کرکے سلویا کو آواز دے کر بولا۔ "تم بڑے فیشن ایبل رسالے میں کالم لکھتی ہو۔ شہر کے تقریباً سبھی دولت مند اور چلتے پُرزے قسم کے لوگوں کو جانتی ہو۔ جونی اسمتھ کے بارے میں تمہیں کیا معلوم ہے؟"

"کیا وہ اس معاملے میں ملوث ہے؟" سلویا نے دریافت کیا۔

"ہو بھی سکتا ہے۔" کولسن مُبہم لہجے میں بولا۔

وہ کچن سے باہر آگئی اور خفیف سے انداز میں سرہلاتے ہوئے بولی۔ "وہ عموماً نائٹ کلبوں میں پایا جاتا ہے۔ جب بھی اس کی کوئی تصویر کھنچتی ہے' نائٹ کلب میں ہی کھنچتی ہے اور وہ وہیں بھلا معلوم ہوتا ہے۔ خوشحال ہے' اس لیے نائٹ کلبوں میں جانے کا بھی متحمل ہوسکتا ہے اور ٹرینا جیسی عورت کو ساتھ لے کر گھومنے پھرنے کا بھی۔ ابھی اس کی عمر تیس سال بھی نہیں ہوئی۔ خوب پیتا پلاتا ہے مگر ابھی اس کے خدوخال بگڑنے شروع نہیں ہوئے....."

اسی اثنا میں باہر سے ایک باوردی پولیس والے نے آکر کولسن کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے بتایا۔ "ایک نوجوان آیا ہے۔ اپنا نام جونی اسمتھ بتاتا ہے۔"

سلویا کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ بولی۔ "میں دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہوں تاکہ تم اطمینان سے اس سے سوال جواب کرسکو۔"

"ٹھیک ہے۔" کولسن بولا۔

جونی اسمتھ' ٹرینا کی موت کی خبر سُن کر دہشت زدہ سا رہ گیا تھا۔ وہ کاؤچ پر بیٹھ کر قالین پر نظر جماتے ہوئے دھیرے دھیرے نفی میں سرہلاتے ہوئے بولا۔ "میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ ٹرینا کو کون قتل کرسکتا ہے۔ وہ اتنی خوبصورت' اتنی زندہ دل عورت تھی۔ اتنی....."

"ہاں۔" کولسن بات کاٹتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں بولا۔ "میرا خیال ہے' ٹرینا کے سبھی دوستوں کا رویّہ اس کے ساتھ بہت اچھا ہوگا؟"

اسمتھ نے پہلے تو گویا بے خیالی میں اثبات میں سرہلا دیا پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا، سر اٹھاتے ہوئے بولا۔ "سوائے کین کارٹر کے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ٹرینا اسے برداشت کیسے کرتی تھی۔"

کولسن اپنی ناک کو چھوتے ہوئے پُرخیال انداز میں ہنکارا بھر کر بولا۔ "ٹرینا کو آج صبح قتل کیا گیا ہے۔ تم یقیناً یہ تو ثابت کر ہی سکتے ہو کہ اس وقت تم کہیں اور تھے؟"

"وہ..... میرا خیال ہے.... شاید نہیں۔" اسمتھ دھیمے لہجے میں بولا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی سُرخی آگئی۔ "میں کچھ دل شکستگی کے سے عالم میں گھر سے نکلا ہوا تھا۔ رات کے پچھلے پہر تک میں کین کارٹر کے نائٹ کلب میں تھا۔ میں کلب کے بار میں بیٹھا پی رہا تھا۔ آخری بات بس مجھے یہی یاد ہے، اس کے بعد کا ہوش نہیں۔"

"کین کارٹر یقیناً وہیں ٹرینا کے ساتھ موجود تھا؟" کولسن نے پوچھا۔

اسمتھ نے قدرے خفت سے اثبات میں سرہلایا۔ کولسن بولا "ٹھیک ہے، تم جاسکتے ہو لیکن فی الحال شہر سے باہر مت جانا۔"

اس کے جانے کے بعد کولسن نے کین کارٹر کو فون کیا۔ کارٹر کو بھی ٹرینا کی موت کا سن کر شدید دھچکا لگا۔ وہ ہیڈ کوارٹرز آکر پولیس کے ہر سوال کا جواب دینے اور ہر طرح سے تعاون کرنے کے لیے تیار تھا۔

کولسن فون بند کر کے سلویا کی طرف مُڑتے ہوئے بولا۔ "آؤ میرے ساتھ۔ اب ہمیں ایک اور انٹرویو کرنا ہے۔"

"کوئی سُراغ ملا؟" سلویا نے پُراشتیاق لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔" کولسن نے جواب دیا۔ وہ بے توجہی سے تپائی پر پڑے اسی رسالے کے ایک شمارے کے اوراق پلٹ رہا تھا جس میں سلویا کام کرتی تھی۔ اس کے سرورق پر ٹرینا کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔

"ٹائٹل پر اس خوبصورت عورت کی تصویر چھپنے کی وجہ سے یہ شمارہ کچھ زیادہ ہی بِکا ہوگا؟" اس نے سرسری سے لہجے میں کہا۔

سلویا نے براہِ راست اس سوال کا جواب نہیں دیا۔ تاہم اعتراف کیا۔ "اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹرینا ایک خوبصورت عورت تھی۔"

ہیڈ کوارٹرز کی طرف واپس جاتے ہوئے کولسن نے راستے میں سلویا سے پوچھا۔ "تمہارا رسالہ تو رنگا رنگ سا فیشن میگزین ہے۔ تم اس میں آج کی واردات پر فیچر کیسے لکھو گی؟ میرا مطلب ہے کیا تمہاری قارئین قتل اور خون کی باتیں پڑھنا پسند کریں گی؟"

سلویا اپنے مخصوص انداز میں سر کو حرکت دیتے ہوئے بولی۔ "میں اسے کچھ اس طرح لکھوں گی کہ اس کی خوفناکی اور گھناؤنا پن نمایاں نہ ہونے پائے۔"

"تمہارا مطلب ہے تم حقائق سے نظر چُراتے ہوئے لکھو گی؟"

"نہیں۔ یہ بات بھی نہیں ہے۔" پھر وہ گویا اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "میں حقیقت کو افسانوی انداز میں لکھوں گی۔ اس خوبصورت عورت کو ایک پھول سے تشبیہ دوں گی جس نے رات کو ستانے کے لیے اپنی پتّیاں سمیٹیں لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ صبح اسے دوبارہ کِھلنا نصیب نہیں ہوگا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ اس کی خوبصورت زندگی کی آخری رات تھی۔ اس تشبیہ کے ساتھ میں ٹرینا کا تذکرہ لاؤں گی کہ رات کو جب اس نے اپنے پھول سے پیکر پر نرم و ملائم نائٹ گاؤن لپیٹا ہوگا..... بستر میں بیٹھ کر گرم گرم دودھ کے گلاس سے ہونٹ بھرے ہوں گے تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ یہ اس کی خوبصورت اور ہنگامہ خیز زندگی کی آخری رات ہے..... وغیرہ وغیرہ۔ بس اس طرح کی کچھ لفاظی کرتے ہوئے اصل باتیں بھی لکھ جاؤں گی۔"

"ٹھیک۔" کولسن نے سرہلایا۔ چند لمحے وہ کسی خیال میں ڈوبا رہا پھر بولا۔ "تم جن لوگوں کے بارے میں لکھتی ہو ان کے متعلق تمہیں ساری معلومات ہوتی ہوں گی؟ میرا مطلب ہے ان کی نجی زندگی وغیرہ کے بارے میں؟"

"ہاں۔ کافی حد تک۔" سلویا نے کندھے اچکائے۔

کین کارٹر ان سے پہلے ہی ہیڈ کوارٹرز پہنچ چکا تھا اور اسکواڈ روم میں بیٹھا پولیس والوں سے باتیں کررہا تھا۔ انہیں دیکھ کر وہ سگار منہ سے نکالتے ہوئے ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ایک فربہی مائل اور شاطر صورت شخص تھا۔

"پولیس فورس کے ذہین ترین سراغ رساں کا کیا حال ہے؟" وہ گرم جوشی سے بولا پھر اس کی نظر سلویا پر جم کر رہ گئی۔ "اور یہ خوبصورت خاتون کون ہے؟"

کولسن نے سلویا کا تعارف کرانے کے بعد کہا۔ "یہ سراغ رسانی کے دھندے کا مشاہدہ کرنے آئی ہوئی ہیں۔ کچھ "آنکھوں دیکھا حال" قسم کی چیز... لکھیں گی۔"

"اوہ...." کارٹر نے گھنی بھویں اُچکاتے ہوئے کہا۔ "آپ کا تو بڑا تذکرہ سنا ہے خاتون! آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔"

"کیا تم بھی زنانہ رسالے پڑھتے ہو؟" کولسن نے دریافت کیا۔

کارٹر نے گونج دار قہقہہ لگایا۔ "نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے صرف ان کا تذکرہ سنا ہے۔" اس نے سگار سے سلویا کی طرف اشارہ کیا۔

"اوہ....." کولسن نے تفہیمی انداز میں سرہلایا پھر وہ اسکواڈ روم کے ایک کونے میں چلا گیا اور وہاں کھڑے ہوئے پولیس آفیسر کے کان میں کچھ کہا۔ وہ آفیسر باہر چلا گیا۔

واپس آکر کولسن نے کارٹر اور سلویا دونوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر سرسری سے انداز میں نائٹ کلب کے مالک کارٹر سے پوچھا۔

"تمہارے پاس تو یقیناً جائے واردات سے اپنی غیر حاضری کا کوئی ثبوت موجود ہوگا؟"

کین کارٹر سگار کو انگلیوں میں گھماتے ہوئے بولا۔ "یہی بات تو یہ ہے کہ میرے پاس ایسا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے کولسن! شاید اس کی وجہ سے میرے لیے تھوڑی بہت دشواری بھی پیدا ہوجائے۔ گزشتہ رات ٹرینا میرے ساتھ ہی تھی۔ اسے زندہ دیکھنے والا آخری فرد شاید میں ہی تھا۔ میرا مطلب ہے' قاتل کے علاوہ۔"

کولسن چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کارٹر! یہ پہلا موقع ہے کہ تم نے جائے واردات سے اپنی غیر حاضری کا کوئی ٹھوس ثبوت جوش و خروش سے پیش کرنے کی کوشش نہیں کی' اس لیے میں سوچ رہا ہوں' تمہاری بات کا یقین کر ہی لوں لیکن پھر بھی..... میں تمہیں کچھ وقت کے لیے روکنا ضروری سمجھتا ہوں۔ چند سال پہلے بھی ایک لڑکی بالکل اسی انداز میں قتل ہوئی تھی اور اس واقعے میں تم مشتبہ پائے گئے تھے۔"

"میں تم سے تفتیش میں ہر طرح سے تعاون کرنے کے لیے تیار ہوں..... اور اگر کوئی خاص بات ہے تو میرا وکیل تم سے بات کرلے گا۔" کارٹر ملائمت سے بولا۔

"گزشتہ رات تم ٹرینا کے ہاں سے کس وقت رخصت ہوئے تھے؟" کولسن نے پوچھا۔

"تقریباً صبح ہی ہوگئی تھی۔ شاید چار یا ساڑھے چار بجے تھے۔ جب میں اس کے ہاں سے نکلا تو اس کے دروازے پر دودھ کی بوتل موجود تھی۔ دودھ والا گھروں پہ دودھ پہنچا کر جا چکا تھا۔" کارٹر نے جواب دیا۔

"سونے سے پہلے وہ گرم دودھ کا گلاس ضرور پیتی تھی۔ اس سے اسے آسانی سے نیند آجاتی تھی۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟" کولسن بولا۔

"ہاں۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"بس..... معلوم ہو ہی گیا۔" کولسن ٹالنے والے انداز میں بولا۔ وہ چند لمحے چھت کو گھورتا رہا پھر گویا کسی خیال سے چونکتے ہوئے بولا۔ "معاف کرنا..... ذرا ایک فون کرلوں۔ میں ابھی آیا۔"

فون کرنے کے لیے وہ اٹھ کر کیپٹن کے آفس میں آگیا۔ اپنا مطلوبہ نمبر مل جانے پر اس نے اپنا نام اور عہدہ وغیرہ بتایا پھر ٹرینا تھارن کا مکمل ایڈریس بتانے کے بعد بولا۔ "اس علاقے میں آپ کی جو وین دودھ پہنچانے جاتی ہے' ذرا اس کے ڈرائیور سے یہ پوچھ کر بتائیں کہ کیا آج صبح بھی اس نے اس خاتون کے دروازے پر دودھ چھوڑا تھا؟"

اسے کافی دیر انتظار کرنا پڑا پھر وہ بڑی توجہ سے دوسری طرف سے بولنے والے کی بات سنتا رہا۔ آخر وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "آج صبح وہاں دودھ نہیں پہنچایا گیا؟ بس ٹھیک ہے۔ مجھے یہی تصدیق کرنا تھی۔ شکریہ۔"

وہ جب واپس اسکواڈ روم میں پہنچا تو دوسرے دروازے سے ایک باوردی پولیس والا ٹرینا کے مالک مکان جوزف اور ٹرینا کے دوست جونی اسمتھ کو ساتھ لیے اندر آرہا تھا۔ اسمتھ نے تیکھی نظروں سے سلویا کی طرف دیکھا۔ اس کی پیشانی پر شکنیں تھیں۔ جوزف کی نظر فرش پر جمی ہوئی تھی۔

"سب لوگ بیٹھ جائیں۔" کولسن خوشگوار لہجے میں بولا۔ "میں اس پورے قصے کا سرسری انداز میں جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

اسی اثنا میں ایک اور باوردی پولیس والا ٹرے میں کافی کے برتن سجائے کولسن کی میز پر پہنچا اور ٹرے رکھتے ہوئے بولا۔ "برابر والے کیفے سے منگوائی ہے۔ تین ڈالر مجھے دے دینا۔"

"ٹھیک ہے' دے دوں گا۔ مرے کیوں جا رہے ہو۔" کولسن بولا۔

پولیس والے نے برتن ٹرے سے نکال کر میز پر سجا دیے۔ ان میں دودھ کی ایک بوتل بھی شامل تھی۔ کولسن کافی کپوں میں انڈیلتے ہوئے بولا۔ "میں نے سوچا' بات چیت کے دوران کافی کا دور چلتا رہے تو ماحول ذرا خوشگوار رہے گا۔"

پھر وہ کافی میں دودھ ڈالنے کے لیے بوتل اٹھاتے ہوئے بولا۔ "دودھ کی قیمت البتہ میں نے بچالی ہے۔" اس نے دودھ کی بوتل ایک لمحے کے لیے بلند کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بوتل مجھے مقتولہ ٹرینا کے کوڑے دان میں پڑی ملی تھی۔ یہ آج صبح ہی کی ڈلیوری سے آئی ہوئی بوتل ہے اور آدھی سے زیادہ بھری ہوئی ہے۔ یعنی تازہ ہی دودھ ہے۔ میں نے سوچا' اسے ضائع کیوں ہونے دیا جائے۔ ایسی حرکتیں کفرانِ نعمت کے مترادف ہوتی ہیں۔ اس لیے میں اسے اٹھا لایا۔"

چاروں ایک ٹک کولسن کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جوزف کے چہرے پر ناگواری تھی۔ کولسن نے کافی تیار کرکے سب کو تھمائی اور کاہلی آمیز سے انداز میں کرسی سے ٹیک لگا لیا۔ سلویا بولی۔ "میں کافی پینا نہیں چاہتی۔"

"میرا بھی دل نہیں چاہ رہا۔" جونی اسمتھ بولا۔

"میرے سامنے اگر کافی آجائے تو پھر چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔" کین کارٹر کپ ہونٹوں کی طرف لے جاتے ہوئے بولا۔

سلویا اچانک اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ آگے بڑھ کر اس نے کارٹر کے ہاتھ سے کپ تقریباً چھین کر واپس میز پر رکھتے ہوئے برہمی سے کہا۔ "یہ کیا مذاق ہے؟ ہم لوگ یہاں آرام سے بیٹھے کافی پیتے رہیں..... گپ شپ کرتے رہیں اور ٹرینا کا قاتل کہیں آزاد پھرتا رہے۔ یہ کوئی تفتیش کا طریقہ ہے؟"

کولسن مسکراتے ہوئے بولا۔ "شکریہ مس! آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ ہمیں واقعی اپنے اصل کام کی طرف توجہ دینی چاہیے۔"

اس کی انگلی ایک بار پھر ناک پر جا ٹکی اور ایک لمحے کے توقف سے وہ پُرسکون لہجے میں بولا۔ ”سلویا! میں تمہیں ٹرینا کے قتل کے الزام میں حراست میں لیتا ہوں۔“

”کیا صرف اس لیے کہ میں نے تمہارے طریقۂ تفتیش پر تنقید کی ہے اور ایک مقتولہ عورت کے گھر سے اٹھائے ہوئے بچے کھچے دودھ کی کافی پینے سے انکار کیا ہے؟“ وہ خونخوار لہجے میں بولی۔

”نہیں سلویا! وجہ تمہیں معلوم ہے۔“ کولسن اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ کاہلی اور کچھ افسردگی سے بولا۔

وہ ایک لمحے وہیں کھڑی گویا غصے سے ہانپتی رہی لیکن اس کا یہ غصہ مصنوعی تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ تیزی سے گھومی اور دروازے کی طرف دوڑی۔ طلسمی سے انداز میں دروازے پر ایک باوردی پولیس والا نمودار ہوا۔ اس نے سلویا کا راستہ روک لیا۔ اس کی گرفت میں سلویا نے بہت ہاتھ پاؤں چلائے، اسے نوچنے اور ٹھوکریں مارنے کی کوشش کی لیکن پولیس والے نے اسے قابو میں کرلیا۔

بعد میں کولسن نے اخباری نمائندوں کو بتایا۔ ”قصہ اصل میں کچھ یوں تھا کہ سلویا اپنے کالم کے لیے مواد کی تلاش میں اِدھر اُدھر تاک جھانک، جوڑ توڑ اور لوگوں سے میل ملاقات میں مصروف رہتی تھی۔ اکثر مقامات پر صحافیوں کے مخبر بھی موجود ہوتے ہیں۔ یہاں تک تو کوئی حرج نہیں لیکن سلویا کا مسئلہ یہ تھا کہ ان طریقوں سے اسے لوگوں کی نجی زندگیوں کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوجاتی تھیں اس کی بنیاد پر وہ انہیں بلیک میل کرتی تھی۔ جونی اسمتھ بھی ایسے ہی لوگوں میں سے ایک تھا۔ یعنی سلویا کا شکار!

سلویا نے تمام معلومات ایک چھوٹی سی نوٹ بک میں محفوظ کررکھی تھیں۔ جونی اسمتھ ذرا کوڑھ مغز سا نوجوان ہے۔ ٹرینا سے اس کی دوستی تھی اور وہ اپنا ہر مسئلہ اس کے سامنے بیان کردیتا تھا، اپنا دل کھول کر اسے دکھاتا رہتا تھا۔ ٹرینا کا رویّہ اس کے ساتھ دوستانہ ہی نہیں، مشفقانہ بھی تھا۔ جونی اسمتھ نے اسے اپنا تازہ ترین مسئلہ بھی بتادیا۔ یہی کہ سلویا اسے بلیک میل کررہی تھی۔

ٹرینا نے یہ بات اپنے خاص الخاص دوست کین کارٹر کو بتائی۔ اس کا مقصد تو جونی اسمتھ کے لیے مدد حاصل کرنا ہوگا لیکن کارٹر کا شاطر ذہن کسی اور طرف چل پڑا۔ اس نے سوچا اگر وہ نوٹ بک اس کے ہاتھ لگ جائے تو شہر کی کئی ممتاز شخصیتوں کی کمزوریاں اس کے ہاتھ آجائیں گی اور وہ لوگ گویا اس کی مٹھی میں ہوں گے۔ اس مقصد کے لیے اس نے ٹرینا ہی کو استعمال کیا۔

ٹرینا اپنے انٹرویو اور فوٹو سیشن کے سلسلے میں رسالے کے دفتر گئی تو سلویا کی میز کی دراز سے وہ نوٹ بک پار کرلائی۔ سلویا کو یہ بات جلد ہی معلوم ہوگئی اور وہ سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ معاملات کو سُلجھانے اور اپنے ہاتھ صاف رکھنے کا اب یہی طریقہ تھا کہ ٹرینا کو قتل کردیا جائے اور اس کے الزام میں کین کارٹر کو پھنسوا دیا جائے۔“

کولسن نے ایک لمحے کے لیے خاموش ہوکر جماہی لی پھر سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا ”سلویا کو یاد تھا کہ کارٹر ایک بار کلب کی ایک رقاصہ کے قتل میں ملوث ہوا تھا۔ اسے بھی بھاری ٹیبل لیمپ سے سر پہ وار کرکے قتل کیا گیا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ٹرینا کو بھی اسی انداز میں قتل کرے گی۔ پہلے اس نے مجھ سے انٹرویو کرنے اور میرے ساتھ قتل کی ”کسی واردات“ کی تفتیش وغیرہ کا مشاہدہ کرنے کی اجازت حاصل کی لیکن اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس روز ہم کس قتل کی تفتیش کے لیے جائیں گے۔ کارٹر ہمیشہ اتوار کی رات ٹرینا کے ساتھ گزارتا تھا۔

سلویا نے اس رات دودھ کی ایک بوتل میں زہر ملایا اور بوتل ٹرینا کے دروازے پر چھوڑ دی۔ دودھ سپلائی کرنے والی کمپنی کو اس نے ٹرینا کی طرف سے فون کردیا کہ اس روز اس کے ہاں دودھ نہ پہنچایا جائے۔ ٹرینا نے رات کے پچھلے پہر کارٹر کو رخصت کیا اور دودھ کی بوتل اٹھا کر اندر لے گئی۔ سلویا نے اس کے تقریباً مرجانے کا انتظار کیا۔ ٹرینا کو ہلاک کرنے کے لیے تو زہریلا دودھ ہی کافی تھا لیکن سلویا صرف واردات کو مخصوص رنگ دینے کے لیے اور بعد کے دو ضروری کام نمٹانے کے لیے اس کے گھر گئی۔

اس نے لیمپ سے ٹرینا کی کھوپڑی توڑی اور لیمپ کو اچھی طرح صاف کرکے وہیں رکھ کر بھاگ آئی۔ آج دوپہر کے قریب وہ طے شدہ پروگرام کے مطابق میرے ساتھ وہاں پہنچی۔ وہ ذرا کارروائی پر بھی نظر رکھنا چاہتی تھی اور دودھ کی وہ بوتل بھی ٹھکانے لگانا چاہتی تھی جس میں بچا کھچا دودھ تھا۔ نظر بچا کر اس نے وہ بوتل کوڑے دان میں ڈال دی۔ میں نے وہ بوتل بعد میں ایک آدمی کو بھیج کر تلاش کروائی تھی پھر اسی جیسی ایک دوسری بوتل کا انتظام کرکے میں نے اپنے چاروں ملاقاتیوں کو کافی پلانے کا ڈراما رچایا۔ کافی پینے سے انکار کرکے اور یک دم کارٹر کے ہاتھ سے کپ چھین کر گویا سلویا نے اپنا بھید کھول دیا۔ مجھے اس وقت تک اس پر صرف خفیف سا شبہ ہی ہوا تھا۔ باقی سب باتیں تو اس کے بوکھلانے اور پھر اس کے اعترافِ جرم کے بعد ہی معلوم ہوئی ہیں—“

کولسن نے ایک لمحے کے لیے ناک کو مسلا اور گہری سانس لے کر بولا۔ ”آپ لوگ یقیناً سوچ رہے ہوں گے کہ مجھے سلویا پر شُبہ کیسے ہوا؟ اس کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ وہ مجھے بتا رہی تھی کہ وہ اس واردات کے بارے میں فیچر کس طرح لکھے گی۔ اس نے ذکر کیا کہ ٹرینا جب گرم دودھ کا گلاس پی کر بستر پر لیٹی...... یہ بات کسی کو بھی، حتیٰ کہ مجھے بھی معلوم نہیں تھی کہ ٹرینا رات کو سونے سے پہلے گرم دودھ کا گلاس پیتی تھی۔ یہ بات سلویا کو کس طرح معلوم تھی؟ اس سوال نے مجھے سوچنے پر مجبور کردیا اور پھر تفتیش کا راستہ متعین ہوتا چلا گیا......“

DIE BEFORE BAD TIME
WALT SHELDON

جاسوسی ڈائجسٹ: اپریل 1994

ناول سکینگ و کمپوزنگ
محمد سجاد بھٹی
03045503086

خصوصی تعاون: جاسوسی تشنت ایڈمن

ڈاکٹر حامد حسن۔ساگر زمان۔عقیل قریشی۔
ممتاز علی کیانی۔سیف الملوک عباسی۔
یاسر حسنین۔ناصر محمود بلوچ۔محمد
نعمان & صائم بھائی

اردو ادب کے سب رنگ۔ادبی محفل۔قدیمی
جاسوسی دنیا۔اولڈ سہانے ناول..... فینز گروپ

خیر اور شر کے درمیان پُل صراط سے گزرنے والے کا احوالِ خاص

قانون کے اُس محافظ کا ماجرا جس کے سامنے ایک طرف دولت کی چمک تھی تو دوسری طرف سچائی اور فرض کی ادائیگی اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ ایسے گرداب میں پھنس کر اُس نے ایک عجیب سا فیصلہ کرلیا۔

دام اور صیاد

پاکیزہ خان

میں اپنے بہنوئی رابرٹ کے ساتھ مرفی کے ریستوران میں کھانا کھا رہا تھا جب میں نے مشہور وکیل جیمس کارٹر کو ہیڈ ویٹر کی رہنمائی میں ایک میز کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ میں نے اپنے بہنوئی کی توجہ اس کی طرف مبذول کراتے ہوئے کہا۔ "ایریزونا جانے سے پہلے تمہیں کبھی نہ کبھی اس سے واسطہ پڑا ہوگا۔ جب تم ڈسٹرکٹ اٹارنی کے آفس میں کام کرتے تھے۔ بڑا زبردست وکیل ہے۔ ایک خاص قبیل کے وکیلوں کی جو نسل ختم ہوتی جارہی ہے یہ اسی کا آخری نمائندہ معلوم ہوتا ہے۔ اب تو غالباً جج بن گیا ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" میرے بہنوئی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بڑی شاطر چیز ہے۔ سنا ہے اس نے زندگی میں جتنے بھی کیس ہاتھ میں لیے ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں تھا جس کے بارے میں اسے پہلے سے معلوم نہ ہو کہ اس کا کیا فیصلہ سنایا جائے گا۔ یہ بھی سنا ہے کہ یہ آج تک کبھی کسی کے قابو میں نہیں آیا۔"

"میرے قابو میں آیا تھا۔" میرے بہنوئی نے مسکراتے ہوئے کہا۔



اس سے پہلے کہ میں اپنے بہنوئی کی اس بات پر ناک بھوں چڑھا سکتا، جیمس کارٹر ہماری میز کے قریب سے گزرنے لگا اور اچانک ہی اس کی نظر میرے بہنوئی پر پڑی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ وہ غش کھا کر گر جائے گا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا اور آنکھیں پھیل گئیں لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل گیا۔

"ہیلو رابرٹ!" اس نے میرے بہنوئی کو مخاطب کیا۔ "میرا خیال تھا کہ آئندہ کبھی تم سے ملاقات نہیں ہوگی۔"

"میں صرف دو تین روز کے لیے یہاں آیا ہوں۔" رابرٹ نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا پھر اس نے میری طرف اشارہ کیا "یہ میری بیوی کا بھائی ایڈگر ہے۔"

"کیسی ہیں مسز رابرٹ؟" جیمس کارٹر نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"بہت اچھی۔ آپریشن کے بعد اسے ایروزونا لے جانا اس کی صحت کے لیے نہایت مفید ثابت ہوا۔ وہاں کی آب و ہوا میں وہ بہت جلد صحت یاب ہوگئی۔ تم سناؤ.... بک کیسا ہے؟"

کارٹر کے چہرے کی رنگت ایک بار پھر متغیر ہوگئی لیکن اس بار بھی وہ فوراً سنبھل گیا اور سپاٹ لہجے میں بولا "میں کسی بک کو نہیں جانتا۔"

پھر وہ ہیڈ ویٹر سے مخاطب ہوا۔ "چارلس! مجھے اچانک ایک ضروری کام یاد آگیا ہے۔ میں یہاں کھانا نہیں کھا سکوں گا۔" اس نے اپنا استخوانی ہاتھ ہماری طرف بڑھایا، الوداعی مصافحہ کیا اور فوراً رخصت ہوگیا۔

میں نے اپنے بہنوئی کی طرف دیکھا جو شاید ہنسی ضبط کیے بیٹھا تھا۔ میں نے سرہلاتے ہوئے کہا۔ "یقین نہیں آرہا۔ کیا واقعی کارٹر تم سے خوفزدہ ہے؟ اور یہ بک کون ہے؟"

"اس کا پورا نام بگ بک ولیم ہے لیکن تم اسے اور بھی بہت سے ناموں سے پکار سکتے ہو۔" رابرٹ گویا کسی خیال سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ "مسٹر بگی کہہ سکتے ہو، مسٹر قاتل کہہ سکتے ہو، مسٹر منشیات فروش کہہ سکتے ہو، مسٹر دلال کہہ سکتے ہو، مسٹر بھتہ کہہ سکتے ہو۔ نیویارک میں جتنے بھی ناجائز دھندے پھیلے ہوئے ہیں ان میں سے ہر ایک کا کوئی نہ کوئی سرا جا کر بک سے ضرور ملتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جیمس کارٹر اور میں نے اس کی جان بچائی تھی۔"

"کیا تم نے واقعی اس کی جان بچائی تھی؟" میں نے دریافت کیا۔

"کیا کہا جا سکتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ سڑک پار کرتے ہوئے کسی شخص کو ماچس مانگنے کے لیے روک لیتے ہیں۔ عین ممکن تھا کہ وہ شخص اگر آپ کو ماچس دینے کے لیے نہ رُکتا تو کسی ٹرک کے نیچے آکر کچلا جاتا.... لیکن آپ تو نہیں جان سکتے کہ آپ نے کسی کی جان بچائی ہے۔"

"ایک سیدھے سادے سوال کا جواب دینے کا یہ کون سا طریقہ ہے؟" میں نے کہا۔

رابرٹ ایک بار پھر مسکراتے ہوئے بولا "حقیقت یہ ہے کہ کارٹر اور بگ بک نے مسز رابرٹ .... یعنی تمہاری بہن کی زندگی بچائی تھی۔"

"واہ... کیا عمدہ وضاحت کی ہے" میں نے جل کر کہا "تم نے تو معمے کو اور بھی الجھا دیا۔ کارٹر تم سے اس لیے خوفزدہ ہے کہ بگ بک کے خیال میں تم نے بک کی جان بچائی ہے جبکہ حقیقت میں ان دونوں نے ایڈنا کی زندگی بچائی ہے؟" ایڈنا میری بہن اور رابرٹ کی بیوی کا نام تھا۔

"ہاں۔ مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے۔" رابرٹ نے جواب دیا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟ اگر تم نے سیدھی طرح بات نہ کی تو میں تمہارا بازو مروڑ ڈالوں گا۔" میں نے اسے گھورا۔ رابرٹ کے اور میرے درمیان اچھی خاصی بے تکلفی تھی۔

"اس کے بجائے اگر تم مہذبانہ طریقہ اختیار کرو تو زیادہ بہتر ہوگا۔ یعنی میرے لیے مارٹنی منگواؤ۔" رابرٹ بولا اور میں نے فوراً مارٹنی کا آرڈر دے دیا۔ مارٹنی کے چند گھونٹ حلق سے اتارنے کے بعد رابرٹ نے کہنا شروع کیا:

"اس قصے کا آغاز اس روز ہوا جس روز میں ڈاکٹر ہینسن سے ملاقات کے لیے گیا اور اس نے ایک خبر سنا کر دنیا میری نظر میں اندھیر کر دی۔ میں اس کے آفس سے نکلا تو سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کوئی بینک لوٹنا چاہیے یا اپنا گلا کاٹ لینا چاہیے؟ برسات کی رات میں کوئلے کی کسی کان میں پھنسے ہوئے کوّے کے گرد بھی اتنی تاریکی نہیں ہو سکتی تھی جتنی اس وقت مجھے اپنے اردگرد پھیلی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ مایوسی اور دل شکستگی کی تاریکی تھی۔

اپنی پریشانی اور منتشر خیالی کے باعث میں یہ بھی محسوس نہ کر سکا کہ میرے عقب میں فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ کوئی کار رینگتی آرہی تھی پھر اچانک ہی وہ شاندار کار ذرا تیزی سے مجھ سے آگے آکر رک گئی اور دو ٹانگوں والے دو عدد انسان نما جانور اس سے برآمد ہوئے جنہوں نے میرا راستہ روک لیا۔

"وکیل تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔" ان میں سے ایک جانور نے کہا پھر دونوں جانوروں نے مجھے گاڑی کی طرف تقریباً دھکیل دیا۔ میرا سر تقریباً زبردستی گاڑی کی کھڑکی پر جھکا دیا گیا اور اندر مجھے جیمس کارٹر کا چہرہ نظر آیا۔ اس زمانے میں وہ جج نہیں تھا۔ انسان نما جانوروں کے حلقے میں اسے صرف 'وکیل' کہا جاتا تھا اور اس سے مُراد کوئی دوسرا وکیل نہیں، صرف جیمس کارٹر ہوتا تھا۔

کارٹر بولا "میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے کہ تم انکار کا ارادہ کرو، یہ بتا دوں کہ اس بات کا تعلق ڈاکٹر ہینسن کی رپورٹ سے ہے جو اس نے تمہیں تمہاری بیوی کے

بارے میں دی ہے۔ تم چند منٹ کے لیے گاڑی میں بیٹھنا پسند کرو گے؟"

میں گاڑی میں بیٹھ گیا۔ دونوں جانور بھی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ان کے نام اور حلیے بتانا غیر ضروری ہو گا۔ جیمس کارٹر کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ وہ فوجداری معاملات کا شاطر ترین وکیل تھا۔ میں ڈسٹرکٹ اٹارنی کے آفس سے تعلق رکھنے والا سرکاری سراغرساں اور تفتیشی افسر تھا۔ اس حیثیت میں میرا کارٹر کے ساتھ دیکھے جانا میری ساکھ اور میرے مستقبل کے لیے سخت نقصان دہ تھا لیکن اس وقت ساکھ اور مستقبل وغیرہ سب کچھ میرے ذہن سے نکلا ہوا تھا۔ صرف ڈاکٹر ہینسن کے الفاظ میرے ذہن میں گونج رہے تھے جو اس نے ایڈنا کے بارے میں کہے تھے... اور کارٹر نے اسی کا حوالہ دیا تھا۔

دونوں جانور اگلی سیٹوں پر تھے۔ ہمارے اور ان کے درمیان شیشے کی دیوار تھی۔ کارٹر نے اسپیکنگ ٹیوب کے ذریعے ڈرائیور کو ہدایت کی "سینٹرل پارک چلو مونک! وہیں دائرے میں گھومتے رہنا۔"

پھر وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "مطمئن رہو، اس گاڑی کے شیشوں سے کوئی تمھیں نہیں دیکھ سکتا۔ ویسے بھی سینٹرل پارک کے علاقے میں تمھیں کوئی نہیں پہچانے گا۔"

"تم نے میری بیوی کا حوالہ کس سلسلے میں دیا تھا؟" میں نے دریافت کیا۔

"اس کی بیماری کے سلسلے میں۔" وہ اپنی مخصوص، پُراعتماد اور شاطرانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "ڈاکٹر ہینسن نے تمھیں بتایا ہے کہ اس کا ایک اور آپریشن ضروری ہے۔ اس بار اس کے بائیں پھیپھڑے کا بیشتر حصہ نکال دیا جائے گا۔ اس آپریشن کے بعد اسے اپنی باقی زندگی خشک آب و ہوا والے کسی علاقے میں گزارنا پڑے گی ورنہ وہ چند ماہ سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکے گی۔"

"درست ہے۔ ڈاکٹر ہینسن نے یہی کہا ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔

"آپریشن کے اخراجات کے بارے میں بھی بات ہوئی تھی۔ یہ ایک مہنگا اور پیچیدہ آپریشن ہے۔ بہت سی بلا معاوضہ سہولیات میسر ہونے کے باوجود اس پر کم از کم پچیس ہزار ڈالر خرچ آجائے گا۔" کارٹر بولا۔

"ہاں۔ ڈاکٹر ہینسن نے یہ بھی بتایا تھا۔" میں نے کہا۔

"میں وسائل رکھنے والا شخص ہوں۔" کارٹر گہری سنجیدگی سے بولا۔

"تو پھر؟" میں نے ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"مسئلہ صرف آپریشن ہی کا نہیں ہے۔ اس کے بعد تمھیں یہاں سے مغرب کی طرف نقل مکانی کرنے اور وہاں پاؤں جمانے کے لیے بھی مزید رقم کی ضرورت ہو گی۔ اندازاً مزید پچیس ہزار ڈالر کی ضرورت تو پڑے گی۔ گویا کل ہو گئے پچاس ہزار ڈالر۔ جو تمھارے پاس نہیں ہیں۔" وہ بولا۔

"تمھاری معلومات قابلِ رشک ہیں۔" میں نے کہا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "تمھارے پاس کوئنز کے علاقے میں جو مکان ہے اس کی تم نے ایک بھی قسط ادا نہیں کی۔ یعنی وہ مکمل طور پر رہن شدہ ہے۔ بیوی کے علاج معالجے کے سلسلے میں ابھی تمھاری طرف چھ ہزار چار سو چونسٹھ ڈالر کے بل واجب الادا ہیں اور نیشنل بینک کی ایک برانچ میں تمھارے اکاؤنٹ میں صرف ایک سو چوہتر ڈالر ساٹھ سینٹ موجود ہیں۔ تم پچاس ڈالر تک قرض لینے کے بھی تمام ذرائع استعمال کر چکے ہو۔ یعنی اب تمھیں کہیں سے پچاس ڈالر بھی قرض نہیں مل سکتا، پچاس ہزار تو بہت دور کی بات ہے۔ تمھاری موجودہ تنخواہ تمام کٹوتیوں وغیرہ کے بعد دو سو پچیس ڈالر فی ہفتہ ہے۔ کوئی بات رہ تو نہیں گئی نا؟"

"نہیں، کوئی قابلِ ذکر بات نہیں رہی۔" میں نے جواب دیا۔

"اب تم چاہو تو یہ گاڑی تمھیں گھر چھوڑ آئے گی۔ اس طرح تمھیں وہ کچھ سننا نہیں پڑے گا جو میں مزید کہنا چاہتا ہوں۔ اس کا تعلق مسز رابرٹ کی ذات سے نہیں ہے۔ کم از کم براہِ راست نہیں ہے۔ تم چاہو تو اس ملاقات کو اور میری غیب دانی کے اس مظاہرے کو بالکل بھول جانا۔"

ہم دونوں اچھی طرح جانتے تھے کہ ہم کس موڑ پر کھڑے تھے۔ میرا جواب اس بات کا فیصلہ کر دیتا کہ میں اس کے ہاتھوں میں کھیلنے کے لیے تیار تھا یا اس کے ہاتھوں سے پھسل جانا چاہتا تھا لیکن میں نے اپنے آپ کو بہلایا کہ میں اس کی مزید گفتگو سننے کے بعد بھی اپنے آپ کو اس کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بننے سے محفوظ رکھ سکتا تھا۔ محض سُن لینے میں کیا حرج تھا؟

میں نے سیٹ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا "میرے پاس وقت ہے، تم بات جاری رکھو اور اپنے فنکارانہ وماہرانہ ہتھکنڈوں سے مجھے اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کرو۔"

"تمھاری ذہانت میں کوئی شک نہیں رابرٹ!" وہ ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولا "میں تھوڑی سی مزید غیب دانی کا مظاہرہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں اپنے تمام پتے تمھارے سامنے رکھ دینا چاہتا ہوں۔ تمھارے پاس اختیار ہو گا کہ تم کوئی بھی ایسا پتّا اٹھا لو جس کی قیمت پورے پچاس ہزار ڈالر ہو گی اور یہ قیمت چھوٹے، استعمال شدہ اور ناقابلِ شناخت نوٹوں کی صورت میں ادا کی جائے گی۔ کیا تم میری بات توجہ سے سُن رہے ہو؟"

میں پوری توجہ سے سُن رہا تھا!

"میرا پہلا کارڈ بگ بک ولیم ہے۔" اس نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بک کو غائب کر دیا گیا ہے۔ کسی پولیس اسٹیشن، حوالات یا جیل میں اس کا کوئی اندراج نہیں جس

کی وجہ سے فوری طور پر حبسِ بیجا کی رٹ دائر کر کے اسے رہا کرانا ممکن نہیں۔ یہ درست ہے کہ بہتر گھنٹے بعد اسے عدالت میں پیش کرنا یا رہا کرنا ضروری ہوگا لیکن وہ ایک الگ مسئلہ ہے۔"

میں خاموش رہا۔

وہ بولا "یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اسے حکام نے غائب کیا ہے اور پولیس اسے غائب ہی رکھنے کے سلسلے میں ہر طرح کا دردِ سر مول لے رہی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بک کو کسی معمولی سلسلے میں حراست میں نہیں لیا گیا۔ وہ کسی سنگین اور بڑے مسئلے میں پھنسا ہوا ہے۔"

"تمہیں یہ یقین کیوں ہے کہ اسے پولیس نے ہی غائب کیا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔ "ممکن ہے کسی مخالف گروہ نے اسے سیمنٹ کے خول میں پیک کر کے دریا کی تہ میں پہنچا دیا ہو۔ ممکن ہے اس کے اپنے جانوروں میں سے کسی نے برف کے سُوئے کے ذریعے کوئی متنازعہ مسئلہ حل کر ڈالا ہو اور لاش کسی تہ خانے میں دفن کر دی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس پر اچانک کسی بیماری کا دورہ پڑا ہو۔ وہ کسی اسپتال میں بے ہوش پڑا ہو اور اس کی جیبوں میں کوئی شناختی کاغذ نہ ہو۔"

"اسے ایک نجی محفل سے 'پوکر' کے کھیل کے درمیان سے دو باوردی پولیس والے اٹھا کر ایک پولیس کار میں لے گئے تھے۔" کارٹر نے بتایا "بک کی گاڑی... جو نئے ماڈل کی ایک بیش قیمت 'ڈوسن برگ' کار ہے... وہ میرا دوسرا کارڈ ہے۔ اسے بھی پولیس نے غائب کیا ہے لیکن پولیس بک کو غائب رکھنے میں جتنا تردد کر رہی ہے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ محض ٹریفک چالان کا مسئلہ نہیں ہے۔"

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا "ڈوسن برگ کو تلاش کرنے میں قسمت نے میرا ساتھ دیا۔"

"اور مجھے تلاش کرنے میں بھی۔" میں نے لُقمہ دیا۔

"ہاں، تمہیں تلاش کرنے میں بھی۔" اس نے تسلیم کیا۔ "مجھے معلوم ہو گیا کہ ڈوسن برگ کو کس پولیس گیرج میں لے جایا گیا ہے۔ مجھے یہ بھی پتا چل گیا کہ پولیس لیبارٹری کے ماہرین نہایت باریک بینی سے اس کا تجزیہ کر رہے ہیں یا کر چکے ہیں۔ میرا تیسرا کارڈ تھامس ڈوگن نامی ایک شخص ہے جو لنٹ اسٹریٹ بروکلین میں رہتا ہے۔"

اس نے مجھے بلڈنگ اور اپارٹمنٹ کا نمبر بھی بتا دیا پھر کہا "یہ شخص بھی اپنے گھر اور مخصوص ٹھکانوں سے غائب ہو چکا ہے لیکن شاید تم تصدیق کر سکو کہ اس کی روپوشی رضاکارانہ تھی۔"

"یہ تمہارے کارڈ ہیں۔ تمہیں ہی ان کے بارے میں معلومات ہونی چاہیے۔" میں نے کہا۔

"کارڈ بے شک میرے ہیں لیکن ڈسٹرکٹ اٹارنی کے ہاتھ میں ہیں۔" وہ زہریلے سے انداز میں مسکرایا۔ "بہرحال..... تھامس ڈوگن کی روپوشی خواہ رضاکارانہ ہو یا کسی اور طرح کی۔ ہم اب چوتھے اور سب سے اہم کارڈ کی طرف آتے ہیں۔ میرا چوتھا کارڈ انتھونی لوکس نامی ایک شخص ہے جو اپنے قریبی حلقوں میں 'لِٹل ٹونی' کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ بلکہ پہچانا جاتا تھا۔ اس کے نام کے ساتھ 'لِٹل' کا اضافہ اسی طرح کی ستم ظریفی تھی جیسے بک کے نام کے ساتھ بگ کا اضافہ۔ کیونکہ بگ بک اپنے نام کے برعکس جس طرح مختصر الوجود ہے 'اسی طرح لِٹل ٹونی دیو قامت تھا۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے وضاحت کی "میں نے لٹل ٹونی کے لیے صیغۂ ماضی استعمال کیا ہے۔ اس کی وجہ تمہیں معلوم ہی ہے کہ پچھلے منگل کو آدھی رات کے وقت وہ لنٹ اسٹریٹ کے ایک گٹر کے قریب مُردہ پڑا پایا گیا تھا۔ اس کی لاش پٹرول کار میں گشت کرنے والے دو پولیس والوں نے دیکھی تھی۔ اس کی موت کی ظاہری وجہ یہی معلوم ہوتی تھی کہ کسی بھاری گاڑی کا پہیّہ اس وقت اس کی گردن پر سے گزر گیا تھا جب وہ گٹر کی جالی پر سر ٹکائے بے ہوش پڑا تھا۔ اس وقت اس کی موت کا ذمّے دار... کسی ایسے ہی نامعلوم کار ڈرائیور کو قرار دیا گیا تھا جو حادثاتی طور پر اسے کچل دینے کے بعد جائے حادثہ سے فرار ہو گیا تھا۔ تم کم از کم میرے اس بیان کی تصدیق تو کر ہی سکتے ہو۔"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا "کیونکہ ابتدائی تفتیش کے بعد حادثے کی یہ رپورٹ میں نے ہی تیار کی تھی۔"

"مجھے معلوم ہے۔" کارٹر پُرسکون لہجے میں بولا "اسی لیے میرے پانچویں کارڈ کی قیمت پچاس ہزار ڈالر ہے۔"

"اور وہ کارڈ جوکر ہے۔" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

"جوکر بھی بڑے کام کا پتّا ہوتا ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی بات توجہ سے سُننا کم از کم اپنا گلا کاٹنے یا بینک لُوٹنے سے تو بہتر تھا۔

"پتّوں کی اس وقت تک کوئی اہمیت نہیں ہوتی جب تک انسان کو معلوم نہ ہو کہ وہ کیا کھیل کھیل رہا ہے۔" بالآخر میں نے کہا۔

وہ چند لمحے بغور میری طرف دیکھتا رہا گویا میرے ذہن کو پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ آخر وہ بولا "میں تمہارے ساتھ چوہے بلّی کا کھیل ہرگز نہیں کھیل رہا۔ غور سے سنو۔ تھامس ڈوگن سے چند دن پہلے میری بات چیت ہوئی تھی۔ وہ لٹل ٹونی کی موت کا عینی شاہد تھا۔ اس کے اپارٹمنٹ کی کھڑکی لنٹ اسٹریٹ کی طرف کھلتی ہے۔ ڈوگن اس وقت کھڑکی میں کھڑا گلی میں جھانک رہا تھا جب اس نے دو افراد کو سڑک پر آتے دیکھا۔ ان کی چال سے ظاہر تھا کہ دونوں نشے میں تھے۔

ڈوگن کی کھڑکی بلندی پر تھی۔ وہ ان کی آوازیں تو نہیں سُن سکتا تھا لیکن محسوس یہی ہو رہا تھا کہ دونوں میں کسی بات پر بحث اور تلخ کلامی ہو رہی تھی۔ جب وہ ڈوگن کی کھڑکی کے عین نیچے پہنچے تو

ان کا جھگڑا زبانی حدود سے بڑھ گیا۔ حیرت انگیز طور پر، مختصرالوجود شخص نے گھونسا مار کر دیو قامت شخص کو گرادیا۔ وہ بے ہوش ہوگیا۔ اس کا سر گٹر کی جالی پر جا ٹکا۔

پھر ڈوگن نے مختصرالوجود شخص کو ایک ڈوسن برگ کار میں بیٹھتے دیکھا جو سڑک کے پار کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے گاڑی میں بیٹھ کر ایک بوتل سے چند گھونٹ پیے۔ پھر گاڑی اسٹارٹ کی جو چند لمحے بعد لہراتی ہوئی آگے بڑھی اور بے ہوش پڑے شخص کے اوپر سے گزر گئی۔

ڈوگن کے اپنے الفاظ میں، وہ اس منظر کو دیکھ کر دہشت سے سُن ہو کر رہ گیا۔ جب اس کے حواس ذرا بحال ہوئے تو اسے پہلا خیال یہی آیا کہ وہ پولیس کو فون کردے لیکن کچھ نجی مجبوریوں نے اسے اس ارادے پر عمل کرنے سے باز رکھا پھر اس نے سوچا، نیچے جاکر تصدیق تو کرلے کیا واقعی گٹر کے پاس پڑا ہوا شخص مرچکا ہے؟

اس ارادے پر عمل کرنے کے لیے وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا لیکن جب وہ عمارت کے صدر دروازے سے نکل رہا تھا تو اس نے پولیس کی ایک پٹرول کار کو لاش کے قریب رُکتے دیکھا۔ دو پولیس آفیسر گاڑی سے اُتر رہے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ لوگ وہاں جمع ہونے لگے تھے۔ ڈوگن بھی جاکر ان تماشائیوں میں شامل ہوگیا لیکن اس نے اپنی زبان بند رکھی۔

دوسری صبح اخبارات سے اسے پتا چلا کہ مرنے والے شخص کا نام انتھونی لوکس عرف بٹل ٹونی تھا اور اسے بگ بک کا باڈی گارڈ سمجھا جاتا تھا۔ اس حوالے سے اخبارات میں بگ بک کی تصویر بھی چھپی تھی اور ڈوگن اسے پہچان کر حیران رہ گیا کیونکہ وہ وہی شخص تھا جسے اس نے ڈوسن برگ میں بیٹھتے اور پھر اسے بے ہوش شخص پر سے گزارتے دیکھا تھا۔ تم کچھ کہنا چاہ رہے ہو؟"

"اس سلسلے کی ایک کڑی غائب ہے۔ تم نے ابھی تک مجھے یہ نہیں بتایا کہ تم ڈوگن سے یہ سب کچھ سننے کے لیے اس کے پاس کیسے جا پہنچے؟"

"میں اسی طرف آرہا تھا۔" وہ مسکرایا۔ "یہ واقعہ منگل کی رات کا تھا۔ بگ بک نشے میں تھا۔ نشے کی حالت میں گزرے ہوئے واقعات صحیح طور پر تو یاد نہیں رہتے نا۔ ہم فرض کرلیتے ہیں کہ کئی نکات بگ بک کے ذہن سے محو ہوگئے۔ مثلاً اسے یہ تو یاد تھا کہ بٹل ٹونی سے گزشتہ رات اس کی بحث و تکرار ہورہی تھی لیکن یہ یاد نہیں آرہا تھا کہ کس بات پر ہورہی تھی۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ اس نے بٹل ٹونی کو گھونسا رسید کیا تھا لیکن یہ یاد نہیں تھا کہ بے چارہ ٹونی کہاں گرا تھا اور نہ ہی اسے یہ یاد تھا کہ اس نے اپنی ڈوسن برگ اس پر سے گزار دی تھی۔

لیکن ایک بات کا بگ کو یقین تھا۔ اور وہ یہ کہ جب اس نے گاڑی اسٹارٹ کی تو اسے سامنے والی عمارت کی 'سیکنڈ فلور کی ایک کھڑکی میں ایک ہاتھ اور ایک شخص کا ہیولا نظر آیا تھا جو پردہ ذرا سا

ہٹائے کھڑا تھا۔ ظاہر ہے بگ بک کو کچھ انتظامات کرنا پڑے۔ بدھ کی صبح سے بگ بک کے کم از کم دو آدمی ہر لمحے ڈوگن کی نگرانی کر رہے تھے۔ جمعے تک یہ بات یقینی محسوس ہونے لگی کہ ڈوگن نے جو کچھ دیکھا تھا اس کی اطلاع پولیس کو نہیں دی تھی۔ اس بات نے بگ بک کو سخت تجسس میں مبتلا کر دیا کہ آخر اس نے ایسا کیوں نہیں کیا تھا؟ یہی وہ موقع تھا جب مجھے بلایا گیا۔

میں نے ڈوگن سے ملاقات کی۔ تمہیں معلوم ہے کہ مجھے اس قسم کے معاملات میں خصوصی مہارت حاصل ہے۔ اب اگر مسٹر ڈوگن نے یہ تاثر لیا کہ میں پولیس کی نمائندگی کر رہا تھا، تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ میں نے اس قسم کی کوئی دو ٹوک بات نہیں کی تھی۔ وہ میرے سامنے کھل گیا۔ لوگ عموماً مجھ سے بات چیت کے دوران وہ باتیں بھی بتا دیتے ہیں جو بتانے کا ان کا ارادہ نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے ڈوگن بھی دوسرے لوگوں سے مختلف نہیں تھا۔

مجھے معلوم ہو گیا کہ اس نے جو کچھ دیکھا تھا اس کی اطلاع پولیس کو کیوں نہیں دی تھی۔ وہ پولیس کی نظر میں آنا نہیں چاہتا تھا جس کا پس منظر کچھ یوں تھا کہ موصوف ایک عدد بیوی اور تین عدد بچوں کو کیلیفورنیا میں چھوڑ کر بھاگ کر نیو میکسیکو چلے گئے۔ وہاں بھی موصوف چند ماہ کی ایک شادی سے لطف اندوز ہوئے جبکہ پہلی بیوی کو طلاق نہیں دی تھی۔ آج کل موصوف نیویارک میں تھے۔ ممکن ہے تیسری شادی کے لیے پر تول رہے ہوں۔

میں باتوں باتوں میں انہیں یہ تاثر دینے میں کامیاب ہو گیا کہ اپنے اس پس منظر کی وجہ سے وہ کسی مقدمے میں عینی شاہد بننے کے لیے نااہل تھے۔ موصوف نے سکون کی سانس لی۔ وہ بھلا کب یہ ناگوار اخلاقی فریضہ انجام دینا چاہتا تھا؟ میں نے نہایت کامیابی سے ڈوگن کو یہ تاثر بھی دے دیا کہ مجھے اس کے نجی معاملات اور شادی وغیرہ کے چکروں سے تو بالکل ہی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس پر تو وہ میرا اچھا بھلا شکر گزار نظر آنے لگا۔

میں اس کے ہاں سے اس یقین کے ساتھ رخصت ہوا کہ اس کے دل میں بگ بک کے لیے کوئی عناد یا پرخاش نہیں تھی لیکن کل، یعنی اتوار کو..... " کارٹر نے جملہ ادھورا چھوڑ کر افسردگی سے سر ہلایا۔

میں نے اس کی بات مکمل کی "کل بگ بک اور ڈوگن منظرِ عام سے غائب ہو گئے اور ساتھ ہی ڈوسن برگ بھی۔"

"بے شک۔ ایسا ہی ہوا۔" کارٹر نے اثبات میں سر ہلایا۔

"لیکن میرا خیال ہے بگ بک کے گرگوں نے ڈوگن کی نگرانی تو جاری رکھی ہوگی؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ لیکن ایک سب وے اسٹیشن پر مسافروں کے ہجوم میں وہ اس کا سراغ کھو بیٹھے تھے۔" کارٹر نے کندھے اُچکائے۔ "یہ ٹائمز اسکوائر اسٹیشن کی بات ہے۔ کوئی شخص برونکس ایکسپریس کے سامنے گر کر مر گیا تھا۔ اسٹیشن پر جو افراتفری برپا ہوئی اسی میں ڈوگن کہیں غائب ہو گیا۔ اس وقت تو یہ محض ایک اتفاق محسوس ہوا تھا لیکن اب یہی ظاہر ہوتا ہے، ڈوگن اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا تھا۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور افراتفری میں غائب ہو کر پولیس سے رابطہ قائم کر لیا۔"

"تو پھر اب تم کیا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔ وہ مسکرایا۔ میں بھی مسکرایا۔

وہ بولا۔ "ڈوگن کے بغیر ڈسٹرکٹ اٹارنی ثابت نہیں کر سکتا کہ لِٹل ٹونی کی موت سے ڈوسن برگ کار گاڑی کا کوئی تعلق ہے۔"

"میں تمہاری تھوڑی سی غلط فہمی دور کر دوں۔" میں نے کہا "لِٹل ٹونی کو ہیموفیلیا کی بیماری تھی۔ گاڑی کے نیچے کچلے جانے سے اس کا بہت خون بہا تھا۔ ڈوسن برگ کی حیثیت دوسری اہم شہادت کی ہے۔"

"تم بھی اپنی یہ غلط فہمی رفع کر لو۔" کارٹر مسکرایا۔ "بگ بک اپنی گاڑی کے ٹائروں کو بہت صاف ستھری حالت میں رکھنا پسند کرتا ہے۔ بدھ کی صبح اس نے گاڑی کے ٹائر اور نچلا حصہ 'لائی' کے محلول سے دھلوالیا تھا۔ 'لائی' کا محلول صفائی کے لیے بے مثال ہے۔"

"ربر مسام دار چیز ہے۔" میں نے کہا۔ "جب گاڑی تیزی سے حرکت میں آتی ہے تو رگڑ سے ٹائروں کو حرارت ملتی ہے اور وہ زیادہ مسام دار ہو جاتے ہیں۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس حالت میں خون کے ذرّات ربر میں کس طرح پیوست ہو جاتے ہیں۔ جبکہ لائی کے محلول سے دُھلائی کے وقت ٹائر ٹھنڈے رہے ہوں گے۔ تم یہ بھی اندازہ نہیں کر سکتے کہ کچل کر پھٹنے والی نسوں سے خون کس طرح پچکاری کی سی صورت میں نکلتا ہے اور گاڑی کے کن کن حصوں تک اس کے پہنچنے کے امکانات رہتے ہیں۔"

کارٹر چند لمحے پُرخیال انداز میں میری طرف دیکھتا رہا۔ میں نے کہا "مزید یہ کہ بک نے روانہ ہونے کے بعد راستے میں دو جگہ سگنل توڑا، ایک جگہ ٹیکسی کو ہلکی سی سائیڈ ماری، ایک جگہ تیز رفتاری کی وجہ سے پولیس والے نے اسے ٹکٹ دیا۔ یہ سب واقعات تسلسل کے ساتھ اسی راستے پر پیش آئے جو لنٹ اسٹریٹ کی طرف سے آ رہا تھا اور اس وقت لِٹل ٹونی کی موت کو صرف چند منٹ گزرے تھے۔"

"مجھے ٹکٹ والی بات تو معلوم تھی، باقی باتیں میرے لیے نئی ہیں۔" کارٹر بولا۔ اس کی پیشانی پر شکنیں تھیں۔

"میں پچاس ملین ڈالر لے کر بھی ڈسٹرکٹ اٹارنی کی توجہ اس کیس سے نہیں ہٹا سکتا اور نہ ہی بک کو بے گناہ قرار دیے جانے کے سلسلے میں کوئی کارروائی کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔" کارٹر پُرسکون لہجے میں بولا "ناممکن کو ممکن بنانے کی کوشش کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ ڈسٹرکٹ اٹارنی، بک پر قتل عمد کے بجائے اتفاقیہ یا حادثاتی قتل

کا مقدمہ چلائے۔ اگر ڈوگن کی شہادت میسّر نہ ہو تو بک اتفاقیہ یا حادثاتی قتل کا اقرار کرلے گا اور ڈسٹرکٹ اٹارنی اس پر یہی مقدمہ چلانے پر مجبور ہوگا۔ یعنی مسئلہ ڈوگن کی شہادت کو ختم کرنے پر آکر اٹک رہا ہے۔"

"یہ تو درست ہے۔ ڈوگن کی شہادت ختم ہونے پر یہ قتلِ عمد کا مقدمہ نہیں رہے گا۔" میں نے تسلیم کیا۔

"اسی کام کے لیے تمہیں پچاس ہزار ڈالر کی پیشکش کی جارہی ہے۔ ڈوگن کو گواہی سے باز رکھنا مشکل نہیں ہے۔ وہ بالکل چوہا ہے۔ اگر تم اس کام کی ہامی بھر سکو تو پچیس ہزار ڈالر تمہاری بیوی کے آپریشن کے لیے فوری طور پر مہیّا کردیے جائیں گے اور پچیس ہزار مقدمے کے فیصلے کے بعد۔"

"فرض کرو میں پچیس ہزار ڈالر لے لیتا ہوں اور بک کو پھر بھی سزائے موت ہوجاتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بگ بک کے دوست اور خیر خواہ اس بات کو بالکل پسند نہیں کریں گے۔" اس نے نہایت ملائمت سے کہا لیکن مجھے اندازہ ہوگیا کہ اس کے بعد جو کچھ ہوگا اسے میں بھی بالکل پسند نہیں کروں گا۔

"میں ایک دیانتدار انسان ہوا کرتا تھا۔" میں نے کہا۔

"مجھے اس جملے میں صیغۂ ماضی کا استعمال پسند آیا ہے۔" کارٹر مسکرایا اور بریف کیس کھول کر اس نے پچیس ہزار ڈالر نکال کر میری جیبوں میں ٹھونس دیے۔

یہ سب کچھ بتانے کے بعد رابرٹ خاموش ہوا تو میں چند لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ بالآخر میں نے متاسفانہ لہجے میں کہا "میں تمہیں بک جانے والا آدمی نہیں سمجھتا تھا۔"

"کارٹر بھی مجھے بک جانے والا آدمی نہیں سمجھتا تھا' اسی لیے تو اس نے اتنی اونچی قیمت لگائی تھی ورنہ وہ دس پندرہ ہزار ڈالر میں کام چلانے کی کوشش کرتا۔" رابرٹ نے اطمینان سے جواب دیا۔

"مجھے وہ مقدمہ یاد ہے۔" میں نے ناگواری سے کہا "بگ بک پر حادثاتی قتل کا مقدمہ چلا تھا۔ اسے دس سال کی سزا ہوئی تھی جو جیل میں اس کے اچھے رویّے کی وجہ سے گھٹ کر چھ سال رہ گئی تھی۔ وہ پیرول پر رہا ہوچکا ہے۔ اگر واقعی صرف رقم سے ہی ایڈنا کی زندگی بچائی جاسکتی تھی تو تم کسی اور طریقے سے بھی رقم حاصل کرنے کی کوشش کرسکتے تھے۔ یہ کوئی ایسا ناممکن کام بھی نہیں تھا۔"

"میں نے کب کہا کہ یہ ناممکن تھا۔" رابرٹ بولا "میں نے تو صرف آسان راستہ اختیار کیا۔ رقم خود چل کر گھر آرہی تھی۔"

"تم نے ڈوگن کو کس طرح گواہی سے باز رکھا؟ اسے رشوت دی یا اس کی زبان بند رکھنے کے لیے بک کے دوستوں کو اس تک پہنچنے کا موقع فراہم کیا؟" میں نے جاننا چاہا۔

"ڈوگن۔۔۔؟" رابرٹ اطمینان سے بولا "اس کی زبان تو قدرت ہی بند کرچکی تھی۔ ٹائمز اسکوائر اسٹیشن پر ٹرین کے سامنے گر کر جو شخص مرا تھا وہ ڈوگن ہی تو تھا۔ میں نے اس کی باقیات پیر کی صبح مردہ خانے میں شناخت کیں۔"

"اس کا مطلب ہے' تمہارے پاس بک کے خلاف سرے سے کوئی کیس ہی نہیں تھا؟"

"کیس تو تھا۔ اس نے دو سگنل توڑے تھے' گاڑی حدِ رفتار سے تیز چلائی تھی' ٹیکسی والے کو سائڈ ماری تھی اور جائے حادثہ سے فرار ہوا تھا۔ اتوار کی رات جب کارٹر اسے تلاش کررہا تھا تو درحقیقت ہم ٹیکسی ڈرائیور کی شکایت پر اسے تلاش کرنے کے بعد پکڑ کر ٹیکسی ڈرائیور کے گھر لے گئے تھے تاکہ وہ اسے شناخت کرلے۔ اس کی ڈوسن برگ گاڑی بھی اسی لیے تحویل میں لی گئی تھی کہ اس پر موجود نشانات کا ٹیکسی کے نشانات سے موازنہ کیا جاسکے اور ثابت ہوسکے کہ اس نے واقعی ٹیکسی کو سائڈ ماری تھی۔ اس وقت تک تو ہمیں معلوم ہی نہیں تھا کہ لٹل ٹونی کی موت سے اس کا کوئی تعلق تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ کارٹر کے مجھ سے بات کرنے کے بعد بھی ہم بک کے خلاف اتفاقیہ قتل کا کیس ثابت کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھے کیونکہ ڈوگن ٹرین کے نیچے آکر مرچکا تھا اور بک کی گاڑی واقعی اتنی عمدگی سے دُھلی ہوئی تھی کہ ہمیں اس پر خون کا ایک خلیہ تک نہیں ملا تھا۔ اسے اتفاقیہ قتل کے جرم میں بھی سزا دلوانے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ خود اتفاقیہ قتل کا اقرار کرلے اور کارٹر سے 'میرے معاہدے' کے نتیجے میں اس نے پہلی پیشی پر خود ہی اقرار کرلیا اور اسی بنیاد پر مقدمہ لڑا۔ ورنہ وہ تو صرف ٹریفک والے مسائل کے سلسلے میں معمولی سی سزا پاکر یا جرمانہ ادا کرکے رہا ہوجاتا۔"

"جب کارٹر کو حقیقت معلوم ہوئی ہوگی تو اس کا غصے سے بُرا حال ہوگیا ہوگا؟" میں نے اب خوشگوار لہجے میں دریافت کیا۔

"اس کی حالت تو دیکھنے والی تھی۔" رابرٹ گویا اس تصور سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا "اس نے دھمکی دی کہ وہ بک کے غنڈوں سے مجھے سزا دلوائے گا لیکن میں اس کی دُکھتی رگ پکڑے بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر میں بگ بک کو بتادوں کہ اس کے قابل اور شاطر وکیل کارٹر نے پچاس ہزار ڈالر دے کر اس کے لیے دس سال کی سزا خریدی ہے تو اس کا اپنا کیا حال ہوگا؟"

"پھر۔۔۔ اس نے کیا جواب دیا؟" میں نے پوچھا۔

"اس نے مزید پانچ ہزار ڈالر مجھے اپنی طرف سے سفر وغیرہ کے اخراجات کے طور پر پیش کیے تاکہ میں جلد از جلد ایریزونا جاکر سیٹل ہوجاؤں اور اسے اپنی شکل نہ دکھاؤں۔" رابرٹ نے یہ بتاتے ہوئے بے اختیار قہقہہ لگایا۔ تب میں بھی ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔

HOWL IN SILENCE
PETER PAIGE

جاسوسی ڈائجسٹ : اپریل1994

مکمل ٹیکنیک و کمپوزنگ
محمد سجاد بھٹی
03045503086

خصوصی تعاون: جاسوسی نشست ایڈمن
ڈاکٹر حامد حسن۔ساگر زمان۔عقیل قریشی۔
ممتاز علی کیانی۔سیف الملوک عباسی۔
یاسر حسنین۔ناصر محمود بلوچ۔محمد
نعمان& صائم بھائی

اردو ادب کے سب رنگ۔ادبی محفل۔قلمی
جاسوسی دنیا۔اولڈ سہانے ناول۔۔۔۔ فینز گروپ



پہلا رنگ

ہنس کی چال

عبدالقیوم شاد

دولت کے بل پر شان و شوکت اور قدر کے طلب گاروں کے لیے لمحۂ فکریہ

بندگانِ دُنیا ازل سے عزت، دولت اور شہرت کی خواہش کرتے رہے ہیں۔ ماضی میں بھی کرتے تھے، آج بھی کرتے ہیں اور مستقبل میں بھی کرتے رہیں گے۔ جہاں تک دولت اور شہرت کا تعلق ہے تو یہ ناجائز ذرائع سے بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اسمگلر، منشیات فروش اور رشوت خور وغیرہ ناجائز ذرائع سے دولت کما رہے ہیں اور بظاہر خوب پھل پھول رہے ہیں۔ ان میں سے بعض لوگ دولت کے بل پر شہرت بھی حاصل کر لیتے ہیں اور سیاست کے اونچے ایوانوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ نادان بندے اُن کی ظاہری شان و شوکت دیکھ کر حسرت سے آہیں کھینچتے ہیں اور اپنے دلوں میں کہتے ہیں کہ کاش اُن کے پاس بھی ویسی ہی دولت اور شہرت ہوتی۔ اصل بات یہ ہے کہ ناجائز ذرائع سے دولت کمانے والوں کے عذاب عام طور پر مخفی ہی رہتے ہیں۔ اس لیے دیکھنے والوں کو یہی نظر آتا ہے کہ ناجائز دولت کمانے والے خوب عیش و آرام کر رہے ہیں۔ انہیں کوئی دُکھ تکلیف یا پریشانی نہیں ہے۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہوتا۔ جہاں تک عزت کا تعلق ہے اس کا انحصار بھی نیک اعمال پر ہے۔ کوئی شخص چالاکی سے عزت حاصل نہیں کر سکتا۔

عبدالقیوم شاد اس دفعہ ایک ایسے شخص کی کہانی پیش کر رہے ہیں جو عزت اور شان و شوکت کی تلاش میں گھر سے نکلا تھا۔ اُس نے دولت کے بل پر دُنیا میں جنت بنا لی تھی اور اس جنت میں ایک حورِ ارضی کا انتظام بھی کر لیا تھا لیکن...

اُس نودولتیے کی عبرت اثر داستان جو ماضی کو فراموش کر کے نئی زندگی شروع کرنا چاہتا تھا

قصرِ شنگراف ایک پُرفضا کوہستانی علاقے میں واقع تھا۔ اس کے بارے میں مختلف روایات مشہور تھیں۔ بعض روایات کے مطابق اسے کسی انگریز رئیس نے ڈیڑھ سو برس قبل گرمائی تفریح گاہ کے طور پر تعمیر کروایا تھا لیکن بعض کا خیال تھا کہ وہ دو سو برس پُرانا تھا اور اسے کسی شہزادے نے تعمیر کرایا تھا۔ اس کا ثبوت وہ یہ پیش کرتے تھے کہ عمارت کا طرزِ تعمیر مغلیہ تھا۔

بہرحال سرخ پتھروں کی بنی ہوئی وہ عمارت برسوں سے ویران پڑی تھی۔ اسے مختلف ادوار میں مختلف رؤسا نے خریدا اور آباد بھی کیا مگر کچھ عرصے بعد بعض پُراسرار سانحات کی وجہ سے خالی کرنا پڑا۔

اب قصرِ شنگراف کی دوبارہ تزئین و آرائش ہو رہی تھی۔ راج مزدور عمارت کی مرمت میں لگے ہوئے تھے اور مالی' دو ایکڑ پر محیط باغ میں نئے سرے سے پھلوں کے پودے لگا رہے تھے۔ باغ کے کونے پر بنا ہوا ٹیوب ویل روزانہ تین چار گھنٹے تک چلتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک ٹریکٹر بھی دن بھر باغ میں مصروف رہتا تھا۔

چونکہ قصرِ شنگراف کی شہرت اچھی نہیں تھی' اس لیے اس کے پاس سے گزرنے والے حیرت سے ہونے والے ترقیاتی کاموں کو دیکھتے اور ایک دوسرے سے اس کے نئے مالک کے بارے میں دریافت کرتے لیکن نئے مالک کی ذات ہنوز پردۂ راز میں تھی۔ یہاں تک کہ مرمت کا کام کرنے والے کاریگر بھی مالک کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ صرف اتنا سننے میں آیا تھا کہ نیا مالک کسی نواب خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔

جس قصبے کے نواح میں قصرِ شنگراف واقع تھا اسے امرا اور رؤسا نے تفریح کے لیے آباد کیا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہاں غریب اور درمیانی طبقے کے لوگ بھی آباد ہو گئے تھے۔

قصبے کے شمال میں ایک خوبصورت کلب بھی موجود تھا' جو کنٹری کلب کہلاتا تھا۔ اس کلب کی فیس اتنی زیادہ تھی کہ معمولی آدمی اس کا ممبر بننے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ فیس کے علاوہ ممبر شپ کی شرائط بھی بہت سخت تھیں جن کی وجہ سے بعض پیسے والے بھی ممبر نہیں بن سکتے تھے۔

اس کلب میں ان دنوں قصرِ شنگراف کا بہت چرچا تھا۔ اس کے نئے مالک کے بارے میں اکثر چہ میگوئیاں ہوتی رہتی تھیں۔ وہاں بھی یہی سُننے میں آیا کہ نیا مالک کسی نواب خاندان کا فرد تھا۔ اس شہرت سے کم از کم یہ فیصلہ یقینی طور پر ہو گیا تھا کہ "نواب صاحب" کو کلب کی ممبر شپ حاصل کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔

سات مہینے میں قصرِ شنگراف کی تزئین و آرائش کا کام مکمل ہو گیا۔ باغ میں مختلف اقسام کے پودے نظر آنے لگے۔ رات کے وقت عمارت کے چاروں طرف بتیاں روشن ہو جاتیں۔ خوبصورت لان بھی تیار ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود عمارت پُراسرار اور اداس نظر آتی تھی۔ ہر طرح کی چمک اور روشنی کے باوجود وہ زندگی کی حرارت سے محروم تھی۔

موسمِ بہار کی ایک خوشگوار شام کو ایک چم چم کرتی کار کلب کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوئی اور ڈرائیو وے میں رک گئی۔ باوردی شوفر جلدی سے باہر نکلا اور پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔

چند لمحوں کے بعد ایک وضع دار قسم کا شخص گاڑی سے باہر آیا اور نہایت شان سے چلتا ہوا ہال کمرے میں داخل ہوا۔ وہ شیروانی اور ترکی ٹوپی میں ملبوس تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہاتھی دانت کے دستے والی چھڑی تھی۔ اس نے فرنچ کٹ داڑھی رکھی ہوئی تھی اور سنہرے فریم والا چشمہ پہن رکھا تھا۔

کلب میں موجود لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ استقبالیہ کلرک کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل کر اس کے قریب پہنچا اور سلام کرنے کے بعد کہا۔ "غالباً آپ پہلی دفعہ کلب میں تشریف لائے ہیں؟"

"غالباً۔" شیروانی پوش نے رک کر کلرک کا جائزہ لیا۔ "تمہیں یہاں ملازمت کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟"

کلرک مؤدب ہوتے ہوئے بولا۔ "پانچ سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔"

"تم نے اس سے پہلے ہمیں اس کلب میں دیکھا تھا؟"

"نہیں سر' پہلی دفعہ دیکھ رہا ہوں۔"

"پھر تم نے "غالباً" کیوں کہا؟"

"غلطی کی معذرت چاہتا ہوں سر۔ دراصل میں صرف آٹھ گھنٹے ڈیوٹی دیتا ہوں۔" کلرک نے غلطی تسلیم کرنے کے باوجود اپنی بات کا جواز پیش کیا۔ "اور لوگ میری عدم موجودگی میں بھی یہاں آتے رہتے ہیں۔"

"ہمیں منیجر کے پاس لے چلو۔"

"تشریف لائیے......" کلرک نے کہا اور شیروانی والے کو منیجر کے کمرے میں لے گیا۔

دروازہ کھلنے کی آواز سن کر خوش پوش منیجر نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ بہترین تراش کے سوٹ میں ملبوس تھا اور میز پر لگی ہوئی تختی کے مطابق اس کا نام طارق حسن تھا۔

"ہمیں نواب معظم حسین کہتے ہیں۔" شیروانی پوش نے کہا۔ "ہم اس کلب کے رکن بننا چاہتے ہیں۔"

طارق حسن نے کھڑے ہو کر معظم حسین سے ہاتھ ملایا اور رسمی کلمات کے بعد بولا۔ "تشریف رکھیں۔"

معظم حسین نے اپنی چھڑی میز کے ساتھ ٹکائی اور نہایت احتیاط کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گیا۔

"اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو...... قصرِ شنگراف آپ ہی نے خریدا ہے۔"

"آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔ ہم چند روز کے لیے اس

علاقے میں آئے تھے۔ قصرِ شنگراف کو دیکھ کر ہمارے دل میں اپنے اجداد کی یاد تازہ ہوگئی اور ہم نے اسی وقت یہ عمارت خریدنے کا فیصلہ کرلیا۔"

"اور آپ نے یقیناً بہت اچھا فیصلہ کیا۔" طارق حسن نے کہا۔ "چند روز پہلے مجھے قصرِ شنگراف دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ آپ کے دم سے اس قدیم عمارت کی شان و شوکت بحال ہوگئی ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ کی آمد سے ہمارے کلب کی رونق میں بھی اضافہ ہوگا۔"

"ہم اتنے مجلسی تو نہیں ہیں۔ دراصل تنہائی کے خوف سے کلب کے رکن بننے کا ارادہ کیا ہے۔ نہ جانے حاضری دینے کا موقع بھی ملتا ہے یا نہیں۔"

منیجر نے دراز سے ممبر شپ فارم نکالتے ہوئے پوچھا۔ "کیا بیگم صاحبہ بھی کلب کی ممبر بننا پسند فرمائیں گی؟"

"کاش یہ ممکن ہوتا۔" معظم حسین نے گہرا سانس لیا۔ "بیس سال قبل بیگم صاحبہ' ٹریفک کے ایک حادثے میں اللہ کو پیاری ہوگئی تھیں۔"

"اوہ! بہت صدمہ ہوا یہ سن کر۔ بیس سال بہت طویل عرصہ ہوتا ہے۔ کیا آپ نے دوسری شادی نہیں کی؟"

"کاروباری مصروفیات نے موقع ہی نہیں دیا لیکن اب..... جب کہ ہم نے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے علاوہ تمام کاروبار فروخت کردیا ہے تو پہلی دفعہ یہ احساس ہوا ہے کہ ہم بہت تنہا ہیں۔"

"یہ ہوٹل..... پاکستان میں ہے؟"

"امریکا کے شہر سینٹ مسوری میں ہے' ہمارا سارا کاروبار امریکا میں تھا لیکن اب ہم تھک گئے ہیں۔ آرام کرنا چاہتے ہیں..... اور آرام کے لیے اپنے وطن سے اچھی جگہ کوئی نہیں ہے۔"

"آپ بالکل بجا فرماتے ہیں۔" منیجر نے کہا اور فارم پُر کرکے دستخط کے لیے معظم حسین کے سامنے رکھ دیا۔ "آپ کے بچے کہاں ہوتے ہیں؟"

"آہ..... بچوں کی نعمت سے بھی محروم ہیں۔" معظم حسین نے فارم پر دستخط کرکے طارق حسن کی طرف سرکایا اور مطلوبہ فیس کا چیک لکھ کر فارم کے اوپر رکھ دیا۔

"اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔" منیجر نے فارم اور چیک کلرک کے سپرد کرنے کے بعد کہا۔

معظم حسین اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔ "کسی زمانے میں ہم سوچا کرتے تھے کہ دولت سے دنیا کی ہر خوشی خریدی جاسکتی ہے لیکن اب اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دولت سے کچھ بھی نہیں خریدا جاسکتا۔ آہ..... کروڑوں کی جائیداد اور کروڑوں کا بینک بیلنس ہمارے لیے بے حقیقت ہے۔ ہم اس دولت سے زندگی کی خوشیاں نہیں خرید سکتے۔"

"نواب صاحب' یہ اتنا مشکل کام بھی نہیں ہے۔ اگر انسان کی اپروچ صحیح ہو تو زندگی کی خوشیاں بھی خریدی جاسکتی ہیں۔ میں یہی عرض کرنا چاہ رہا تھا۔"

"جی! کیا عرض کرنا چاہ رہے تھے آپ؟"

"بات یہ ہے کہ آپ اس عمر میں بھی ماشاءاللہ خوب صحت مند اور اسمارٹ ہیں اور آپ کے پاس دولت کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ آپ بڑی آسانی سے دوسری شادی کرسکتے ہیں۔"

"اگر آپ نے ہماری بیگم کو دیکھا ہوتا تو یہ بات نہ کہتے۔ حادثے کے وقت ان کی عمر صرف بتیس سال تھی اور خوبصورتی میں وہ بے مثال تھیں۔ ہمارے دل کے آئینے میں آج تک ان کی تصویر نقش ہے۔ ہمارے دل کو کوئی دوسری صورت مشکل ہی سے پسند آئے گی۔"

منیجر نے اس بات کو نیم رضامندی سمجھا۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھا اور نواب معظم حسین کو کلب کے چیدہ چیدہ ممبروں سے ملانے کے لیے باہر لے گیا۔

○☆○

چند روز کے اندر نواب معظم حسین کا شمار کلب کے مقبول ممبروں میں ہونے لگا۔ خواتین میں یہ بات مشہور ہوگئی تھی کہ معظم حسین کی بیوی فوت ہوچکی ہے اور وہ بے اولاد بھی ہیں۔

ان کی کروڑوں کی جائیداد کا کوئی وارث نہیں ہے' اس انکشاف نے نہ صرف بعض بیوہ خواتین کے دلوں میں ہلچل پیدا کردی تھی بلکہ بعض موقع پرست کنواریاں بھی معظم حسین کا قرب حاصل کرنے کی متمنی نظر آنے لگی تھیں۔

جہاں تک معظم حسین کا تعلق تھا اس کا رویہ بظاہر بے نیازی کا تھا۔ تاہم کچھ عرصے بعد اس نے شہلا گل نامی ایک خاتون میں دلچسپی لینا شروع کردی۔

پینتیس سالہ شہلا گل ایک ریٹائرڈ فوجی افسر کی بیٹی تھی اور بلا کی حسین تھی۔ اس کا حسن کلاسیکل انداز کا تھا۔ بال بھورے اور گھونگھریالے' پیشانی کشادہ' ناک ستواں اور خمدار ہونٹ نہایت پُرکشش تھے۔ چہرے پر بچوں کی سی معصومیت پائی جاتی تھی اور بھوری آنکھوں میں بلا کی کشش تھی۔

وہ اپنے والدین کی سب سے چھوٹی اولاد تھی اور بڑے لاڈ پیار میں پلی تھی۔ پانچ سال پہلے اس کی ایک میجر سے شادی ہوئی تھی۔ بڑی دھوم دھام سے ہونے والی وہ شادی چند ماہ کے بعد ہی اختلافات کا شکار ہوگئی۔

شہلا گل کے شوہر کا نام عرفان علی تھا۔ وہ پُرانے خیالات کا سخت گیر مرد تھا اور عورتوں کی آزادی کے سخت خلاف تھا۔ اس نے شہلا پر صرف اتنی مہربانی کی تھی کہ اسے برقع نہیں پہنایا تھا۔ بصورت دیگر تمام پابندیاں عائد کردی تھیں' وہ کلب نہیں جاسکتی تھی' اس کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر قدم نہیں نکال سکتی تھی'

اپنے نامحرم مرد رشتے داروں کے ساتھ باتیں نہیں کر سکتی تھی۔ شوہر کی عدم موجودگی میں کسی مرد کی تواضع نہیں کر سکتی تھی اور یہاں تک کہ اپنی آزاد خیال سہیلیوں کے ساتھ شاپنگ یا تفریح کرنے نہیں جا سکتی تھی۔

ان پابندیوں کی وجہ سے دونوں میں کشیدگی بڑھتی چلی گئی جو بالآخر طلاق پر منتج ہوئی۔

طلاق کی وجہ سے شہلا کو شدید ذہنی صدمہ پہنچا اور اس کے دل میں مردوں کے لیے نفرت پیدا ہو گئی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ دوبارہ شادی نہیں کرے گی لیکن کچھ عرصے کے بعد اس کے خیالات میں تبدیلی پیدا ہو گئی اور اس نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ سب مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ان میں کچھ اچھے بھی ہوتے ہیں۔ اس تبدیلی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے اپنے ایک کزن میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ اس کزن کا نام راجا افتخار تھا۔ وہ اس کے ماموں کا بیٹا تھا اور ایک پرائیوٹ فرم میں ملازم تھا۔ اگرچہ اس کی تنخواہ خاطر خواہ تھی' تاہم وہ دولت مند نہیں تھا اور شہلا کے خیال میں یہ بہت بڑی خامی تھی۔ وہ راجا افتخار میں دلچسپی ضرور لے رہی تھی لیکن شادی کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میاں بیوی کے بعض جھگڑے مالی تنگی کے باعث بھی ہوتے ہیں۔ نیز اگر شوہر دولت مند ہو تو بیوی اس کی زیادتیاں آسانی سے برداشت کر سکتی ہے۔

شہلا کے بوڑھے والدین اس کے بارے میں بہت فکر مند تھے اور جب انہوں نے اسے افتخار میں دلچسپی لیتے دیکھا تو قدرے مطمئن ہو گئے۔

راجا افتخار کا دفتر ایبٹ آباد میں تھا۔ وہ ہفتے میں ایک بار مرگ شیر آتا اور شہلا کو اپنے ساتھ کنٹری کلب لے جاتا تھا۔ اس کی عمر شہلا کے برابر ہی تھی۔ دونوں بچپن میں اکٹھے کھیلتے رہے تھے۔ افتخار اسے بچپن ہی سے پسند کرتا تھا لیکن شہلا نے کبھی اس کو اپنا آئیڈیل نہیں سمجھا تھا۔ وہ شروع سے چمک دمک اور شان و شوکت کی دلدادہ رہی تھی۔ اب بھی اس کی پسند میں مجبوری کا دخل زیادہ تھا اور جب سے نواب معظم حسین نے کنٹری کلب میں آنا جانا شروع کیا تھا تب سے شہلا کی افتخار میں دلچسپی کم ہو گئی تھی۔

اس شام بھی وہ افتخار کو زبردستی نواب معظم حسین کی میز پر لے گئی تھی۔ اس وقت نواب معظم حسین ایک معمر جوڑے کو اپنی زندگی کے دلچسپ واقعات سنا رہا تھا۔

"نواب صاحب' ہم یہاں بیٹھ سکتے ہیں؟" شہلا نے پوچھا۔

"یقیناً یقیناً...." معظم حسین نے خوش دلی سے کہا۔

"وہ کیا کہتے ہیں۔ اے آمدنت باعث شادی ما.... تشریف رکھیے.... تشریف رکھیے۔ آپ کیا لینا پسند کریں گے؟"

"جو آپ پی رہے ہیں وہی ہم بھی پی لیں گے۔"

معظم حسین کافی پی رہا تھا۔ اس نے ویٹر کو بلا کر کافی لانے کے لیے کہا' پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "زندگی بڑی عجیب چیز ہے۔ اس کی باریکیوں کا کھوج لگانا بہت مشکل ہے۔ ہم ساری زندگی خوشیوں کی تلاش میں لگے رہتے ہیں لیکن جن چیزوں کو ہم خوشیوں کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں وہ درحقیقت ہماری تکلیفوں میں اضافہ کر رہی ہوتی ہیں۔"

راجا افتخار کو اس شخص سے چڑ سی ہو گئی تھی۔ اسے اس کی باتوں میں خودنمائی زیادہ نظر آئی تھی۔ اس نے کہا۔ "نواب صاحب' آپ بڑی الجھی ہوئی بات کر رہے ہیں۔ کیا آپ اپنی بات کی وضاحت کرنا پسند کریں گے؟"

"نوجوان' اگر میں نے اس بات کی وضاحت شروع کر دی تو آپ بور ہو جائیں گے۔ لہٰذا میں ایک چھوٹی سی مثال دیتا ہوں۔ ایک غریب آدمی کو' جسے پیٹ بھر کر کھانا بھی نصیب نہیں ہوتا تھا' اچانک بہت بڑی دولت مل گئی۔ اس نے سارے دھندے چھوڑ کر عیاشی شروع کر دی۔ شراب اور شباب کے چکر میں پڑ گیا' اس کے نزدیک یہی زندگی کی سب سے بڑی خوشی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دس سال کے اندر وہ ایک مہلک بیماری کا شکار ہو کر نہایت تکلیف کے ساتھ موت کے منہ میں چلا گیا۔"

"اس بات کو ہم کم علمی بھی کہہ سکتے ہیں۔" افتخار نے دلیل دی۔ "اس غریب کو شراب اور شباب کے نتائج کا علم نہیں تھا۔ ورنہ وہ ان چیزوں سے دور رہتا۔"

"برخوردار' یہی تو ہم کہہ رہے ہیں کہ انسان کو اس چیز کی خواہش ہی نہیں کرنی چاہیے جس کے نتائج کا اسے علم نہ ہو لیکن ایک بات اس سے بھی سوا ہے۔ انسان نتائج کا علم ہونے کے باوجود بہت سی حرکتوں سے باز نہیں آتا۔ اسے اس وقت احساس ہوتا ہے جب وہ چاروں طرف سے تباہی میں گھر جاتا ہے۔ اس میں آپ بھی شامل ہیں۔ میں بھی شامل ہوں اور بہت سے دیگر لوگ بھی شامل ہیں۔ اس لیے ایسی چیزوں سے بچنا ہی بہتر ہے۔"

"مجھے ایسے لوگوں میں شامل ہونے کا شوق نہیں ہے۔" افتخار نے تلخی سے کہا۔ "میں بہت محتاط آدمی ہوں اور اپنا برا بھلا خوب سمجھتا ہوں۔"

معظم حسین نے قدرے سخت نظروں سے اس کی طرف دیکھا' اس کا بایاں ہاتھ غیر ارادی طور پر شیروانی کے بٹنوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ صاف لگ رہا تھا کہ اسے افتخار کا لہجہ خاصا ناگوار گزرا تھا۔

شہلا گل نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "نواب صاحب' آپ اتنا عرصہ امریکا میں رہے' آپ نے وہاں شادی کیوں نہ کی۔ حالانکہ آپ کے پاس دولت بھی بہت ہے اور آپ.... خاصے اسمارٹ بھی ہیں۔"

معظم حسین نے پرخیال نظروں سے افتخار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "امریکا میں شراب اور شباب بہت ہے' لیکن زندگی کو

سکون بخشنے والی روح نہیں ہے۔" وہ شہلا کی طرف مڑا۔ "مگر اپنے ملک میں حسن بھی ہے اور زندگی کو سکون بخشنے والی روح بھی ہے۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں اپنے ملک میں ہی شادی کروں گا۔"

اس نے جس انداز سے شہلا کو گھورتے ہوئے یہ بات کہی تھی اس سے راجا افتخار تلملا کر رہ گیا۔ اس نے اپنے جوش کو دباتے ہوئے کہا۔ "اس ملک میں دولت کے بل پر بہت کچھ ہو جاتا ہے۔ اس میں بے جوڑ شادیاں بھی شامل ہیں۔ دولت مند دولت کی جھلک دکھا کر کم عمر لڑکیوں سے شادیاں کر لیتے ہیں، لیکن ایسی شادیاں دیرپا ثابت نہیں ہوتیں۔"

معظم حسین نے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔ "ہر چیز کو تقابلی پس منظر میں پرکھنا چاہیے، تازہ ترین سروے کے مطابق سب سے زیادہ ناکام شادیاں وہ ہیں جنہیں عرفِ عام میں محبت کی شادی کہا جاتا ہے۔ دوسرے نمبر پر دیگر شادیاں آتی ہیں اور اگر بہ نظرِ غور دیکھا جائے تو دنیا میں کوئی شے دیرپا نہیں ہے۔ ہر شے کی ایک طبعی عمر مقرر ہے۔ جب یہ عمر پوری ہو جاتی ہے تو پھر ٹوٹ پھوٹ شروع ہو جاتی ہے اور یہی قدرت کا قانون ہے۔"

راجا افتخار اس نستعلیق قسم کے نواب کی باتوں پر اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس لیے وہ جلدی وہاں سے اٹھ گیا اور شہلا کو بھی اٹھنا پڑا۔

"یہ شخص ہے کون؟" راستے میں افتخار نے پوچھا۔

شہلا جلدی سے اٹھنے پر خوش نہیں تھی۔ اس نے منہ بنا کر کہا۔ "دیکھنے میں تو انسان ہی لگتا ہے۔"

"وہ تو ہے، لیکن باتیں بڑی عجیب کرتا ہے۔ خود بھی بہت عجیب ہے۔ مجھے اس کے نواب ہونے پر شک ہے!"

"تم اس کے انسان ہونے پر بھی شک کر سکتے ہو۔"

"کیا بات ہے؟" افتخار نے سڑک سے نظر ہٹا کر شہلا کی طرف دیکھا۔ "تمہارا موڈ کیوں بگڑا ہوا ہے؟"

"تمہاری فضول باتوں کی وجہ سے۔" شہلا نے منہ بنایا۔ "تمہیں بحث کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"مجھے اس کی باتوں پر غصہ آ رہا تھا اور جس طرح وہ تمہاری طرف دیکھ رہا تھا، مجھے وہ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔"

"کیا مطلب؟" شہلا نے برہمی سے پوچھا۔

افتخار نے شہلا کا موڈ بگڑتے دیکھ کر خاموشی اختیار کر لی، تاہم نواب معظم حسین کے بارے میں اس کے دل میں زیادہ تلخی پیدا ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے معظم حسین کو اپنا رقیب سمجھنا شروع کر دیا تھا۔

○☆○

شہلا گل کو افتخار کی تنگ نظری نے محتاط کر دیا تھا۔ اسے اس کے اندر اپنے پہلے شوہر کی جھلک نظر آنے لگی تھی۔ اس نے سوچا، جو شخص شادی سے پہلے اتنی رقابت محسوس کر رہا ہے اس کا بعد میں کیا حال ہو گا۔

دو ہفتے کے بعد ایک اور ایسا واقعہ پیش آیا جس سے دونوں کے درمیان مزید تلخی پیدا ہو گئی۔

رات کے وقت دونوں کلب کے اندر اِن ڈور گیمز کے مقابلے دیکھ رہے تھے۔ تب ہی ایک باوردی بیرا شہلا کے پاس آیا اور ایک چھوٹا سا رقعہ اسے دیا۔ وہ رقعہ نواب معظم حسین کی طرف سے تھا۔ اس میں لکھا تھا۔

"میڈم شہلا گل۔ کیا آپ چند منٹ کے لیے لان میں آنا پسند کریں گی؟ ہم آپ سے تنہائی میں کچھ کہنا چاہتے ہیں۔" نواب معظم حسین۔

"کیا بات ہے؟" افتخار نے پوچھا۔ "یہ کیسا کاغذ ہے؟"

شہلا رقعہ تہ کرتے ہوئے کھڑی ہو گئی، بولی۔ "تم بیٹھو، میں ابھی آتی ہوں۔"

"کہاں جا رہی ہو؟" افتخار پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "میں بھی چلتا ہوں۔"

"افتخار... کیا بات ہے، تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں رہا یا تم مجھے اپنا قیدی سمجھتے ہو؟"

افتخار نے گہرا سانس لیا اور دوبارہ کھیل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ شہلا، بیرے کے ساتھ باہر نکل گئی۔ افتخار کے دل میں تجسس پیدا ہو چکا تھا۔ وہ صوفے سے اٹھا اور شہلا کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔

نواب معظم حسین لان کے ایک نیم تاریک گوشے میں تنہا بیٹھا ہوا کافی پی رہا تھا۔

"آؤ شہلا....." اس نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ "بیٹھو، کچھ پینا پسند کرو گی؟"

"شکریہ....." شہلا کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "آج کچھ پینے کی گنجائش نہیں ہے۔"

"شہلا، ہم ایک جسارت کرنا چاہتے ہیں۔ تم بُرا تو نہیں مانو گی؟"

"نواب صاحب، آپ بہت نفیس اور سلجھے ہوئے انسان ہیں۔ آپ کوئی ایسی جسارت نہیں کر سکتے جس پر بُرا مانا جا سکے۔"

معظم حسین نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "چند روز پہلے ہم بازار سے گزر رہے تھے کہ ایک جیولری شاپ میں رکھے ہوئے ایک نیکلس نے ہماری توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ ہم دکان کے اندر چلے گئے اور نیکلس نکلوا کر دیکھا۔ ہمیں وہ اتنا اچھا لگا کہ ہم سے رہا نہیں گیا اور ہم یہ نیکلس خرید رہے تھے تو ہمارے لاشعور میں تمہارا خوبصورت چہرہ موجود تھا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہم اس نیکلس کو تمہارے گلے میں دیکھ رہے تھے۔" اس نے قریبی کرسی پر رکھا ہوا شاپنگ بیگ اٹھا کر شہلا کی طرف بڑھایا۔ "میری طرف سے یہ حقیر

ساتحفہ......"

شہلا تامل کرتے ہوئے بولی۔ "نواب صاحب' یہ کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔" تاہم دل میں وہ نیکلس دیکھنے کے لیے بے چین ہورہی تھی۔ "یہ تو بہت قیمتی ہوگا۔ میرے لیے اس احسان کا بدلہ چکانا بہت مشکل ہوگا۔"

"اس کے برعکس......" معظم حسین نے کہا۔ "تم یہ تحفہ وصول کرکے ہم پر احسان کرو گی' ہماری نظر میں پیسے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔" وہ اداس نظر آنے لگا۔ "ہمیں پتا ہے کہ ہماری ساری دولت یہیں رہ جائے گی۔ ہم اگر کوشش بھی کریں تو اس دولت کو خرچ نہیں کرسکتے۔ ہم اپنی خوشی کی خاطر تمہیں یہ تحفہ پیش کررہے ہیں۔ پلیز......"

شہلا نے لرزتے ہاتھوں سے شاپنگ بیگ لیا اور اس کے اندر سے مخملیں ڈبا نکال کر اسے کھولا۔ ڈبے کے اندر رکھا ہوا جڑاؤ نیکلس واقعی بے مثال تھا۔ اس میں سچے ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ جن میں سے رنگ برنگی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔

"اللہ! کتنا خوبصورت نیکلس ہے۔" شہلا نے کہا۔ "یہ تو واقعی بہت قیمتی ہے۔"

"تم سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔ اسے اپنے ہینڈ بیگ میں رکھ لو۔ میرا خیال ہے افتخار کو یہ بات پسند نہیں آئے گی۔"

"وہ میرا سرپرست نہیں ہے۔" شہلا نے کہا۔ تاہم یہ خدشہ ضرور اس کے دل میں بھی موجود تھا۔ اس نے ڈبا بند کرکے اپنے ہینڈ بیگ میں ٹھونس لیا۔ "نواب صاحب...... آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کسی دن ہمارے گھر تشریف لائیں۔ میرے ممی ڈیڈی آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔"

"دراصل ہم بہت گوشہ نشین قسم کے آدمی ہیں۔" معظم حسین نے انکساری سے کہا۔ "یہاں بھی صرف تنہائی دور کرنے آجاتے ہیں۔ ورنہ سچی بات یہ ہے کہ ہم مجلسی آدمی نہیں ہیں۔ ویسے ہم کسی روز آپ کے ممی ڈیڈی کی قصرِ شنگراف میں دعوت کریں گے۔"

شہلا وہاں سے جلدی اُٹھ جانا چاہتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ افتخار اس کے بغیر بہت بے چین ہورہا ہوگا۔ تاہم اسے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ افتخار برآمدے کے ایک گوشے میں کھڑا اسے معظم حسین سے باتیں کرتے دیکھ رہا تھا۔ غصے کی وجہ سے اس کی سانس کی رفتار خاصی تیز ہورہی تھی۔

شہلا نے ایک بار پھر معظم حسین کا شکریہ ادا کیا اور اٹھ کر رخصت ہوگئی۔ افتخار اسے اٹھتے دیکھ کر جلدی سے اندر چلا گیا۔

"بور تو نہیں ہوگئے؟" شہلا نے اندر پہنچ کر پوچھا۔

"نہیں...... بس کھیل رہا تھا۔" افتخار نے اپنا غصہ چھپاتے ہوئے جواب دیا پھر بظاہر سرسری سے انداز میں پوچھا۔ "کہاں گئی تھیں؟"

"مسز عالمگیر نے بلایا تھا۔"

افتخار اس کے سفید جھوٹ پر دنگ رہ گیا۔ غصہ ضبط کرنے کی وجہ سے اس کے سر میں درد کی شدید لہر اُٹھی۔

"آؤ چلیں۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس دفعہ وہ اپنے جذبات چھپانے میں ناکام رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟" شہلا نے پوچھا۔ "تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"نہیں' طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میرے سر میں درد ہورہا ہے۔" وہ بیرونی دروازے کی طرف چل پڑا۔

شہلا نے بھویں سکیڑ کر سوچا اور اس کے پیچھے چل پڑی۔ دونوں گیٹ سے نکل کر اپنی کار میں جابیٹھے' جو درختوں کے نیچے ایک نیم تاریک حصے میں کھڑی تھی۔

افتخار نے اسٹیئرنگ وہیل پر سر ٹکا دیا اور کچھ دیر تک اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ بالآخر اس نے سر اٹھایا اور شہلا کو گھورتے ہوئے بولا۔ "شہلا' مجھے تم سے یہ اُمید نہیں تھی۔"

"کس بات کی اُمید نہیں تھی؟" شہلا نے پوچھا۔

"تم نے جھوٹ کیوں بولا؟"

"کیسا جھوٹ؟" شہلا نے تیوری چڑھائی۔

"تم مسز عالمگیر سے نہیں اس بوڑھے سے ملنے گئی تھیں جو اپنے آپ کو نواب کہتا ہے۔"

"اوہ...... گویا تم میری جاسوسی کرتے رہے ہو۔ مجھے بھی تم سے ایسی اُمید نہیں تھی۔"

"میری اتفاقاً تم پر نظر پڑگئی تھی۔" افتخار نے اپنی غلطی چھپانے کی کوشش کی۔ "میں ذرا ہوا کھانے کے لیے برآمدے میں نکلا تھا۔ میں نے دیکھا کہ تم معظم حسین کی ٹیبل پر بیٹھی تھیں۔"

"اب تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

"اس بات کو بھول جاؤ......" افتخار کا غصہ بڑھتا جارہا تھا۔ "معظم حسین نے تمہیں کیا چیز دی ہے؟"

"تمہارا اس بات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"میری قوتِ برداشت کو مت آزماؤ شہلا۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس...... نواب نے تمہیں کیا تحفہ دیا ہے؟"

"اچھا!" شہلا کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ اس نے ہینڈ بیگ سے نیکلس کا ڈبا نکالتے ہوئے کہا۔ "میں نے تمہارے جذبات کا خیال کرتے ہوئے یہ بات چھپائی تھی لیکن اگر تم بات بڑھانے پر تلے ہوئے ہو تو دیکھ لو...... نواب صاحب نے یہ نیکلس مجھے تحفے میں دیا ہے۔ اچھی طرح دیکھ لو۔"

افتخار نے ڈبے کو ہاتھ سے پرے کرتے ہوئے کہا۔ "اسے واپس کردو۔"

"کیوں؟" شہلا نے تیزی سے پوچھا۔

"تمہارا اس شخص سے کوئی..... رشتہ نہیں ہے۔ اس تحفے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی نیت اچھی نہیں ہے۔"

"افتخار..... "شہلا نے چیخ کر کہا۔ "اس سے آگے کچھ نہ کہنا۔ تم اس کی نیت پر نہیں، میری نیت پر حملہ کر رہے ہو۔"

"میں نے تمہارا نام نہیں لیا۔"

"جو بات تم کہنا چاہتے ہو اس میں مرد کے ساتھ عورت کی نیت کا خراب ہونا بھی ضروری ہے۔ ایک آدمی کی خراب نیت سے کچھ نہیں ہوتا۔"

"بات کو بحث میں الجھانے کی کوشش نہیں کرو۔ یہ تحفہ خرابی کی طرف پہلا قدم ہے اور اس قدم کو یہیں روک دینا چاہیے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم اس شخص سے مراسم بڑھاؤ۔ پتا نہیں یہ شخص کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ کسی کو اس کا پس منظر معلوم نہیں ہے۔ ایسے آدمی سے بچ کر رہنا چاہیے۔"

"بحث تم کر رہے ہو۔ تحفہ میں نے لیا ہے اور میں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔ تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا مجھ پر حکم چلانے کا۔"

"شہلا..... میں تمہارا کزن ہوں اور اس کے علاوہ عنقریب..... ہم ایک اور رشتے میں بھی منسلک ہونے والے ہیں۔"

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے افتخار۔" شہلا نے تلخی سے کہا "ہمارے درمیان ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں تمہیں کزن سمجھ کر تمہارے ساتھ آجاتی ہوں۔ اس سے زیادہ کوئی بات نہیں ہے۔ میں چھوٹی بچی نہیں ہوں۔ اپنا برا بھلا خوب سمجھتی ہوں۔"

دونوں کا غصہ عروج پر پہنچتا جا رہا تھا۔

"اوہ، مائی گاڈ..... " افتخار نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔ "میں احمق تھا میں نے پھوپی جان کی پریشانی کا خیال کرتے ہوئے تمہاری طرف محبت کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اتنی عمر ہونے کے باوجود تمہارا ضدی پن نہیں گیا۔"

"اوہ..... تم مجھے عمر کا طعنہ دے رہے ہو!" شہلا نے چیخ کر کہا۔ "یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم ایک ڈھلتی ہوئی عمر کی مطلقہ پر اپنی جوانی قربان کر دینا چاہتے ہو۔ اپنی پھوپی اور اس کی بیٹی پر احسان کر رہے ہو۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اتنے گھٹیا خیالات کے انسان ہو۔"

"عرفان نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ تمہیں زندگی گزارنے کا سلیقہ نہیں آتا۔ تم سے شادی کرنا اپنی زندگی کو عذاب میں ڈالنے کے برابر ہے۔"

شہلا نے سخت حیرت اور غصے سے افتخار کو گھورا۔ "تت..... تم عرفان سے ملتے رہے ہو؟ میرے خلاف اس ذلیل آدمی کی باتیں سنتے رہے ہو!" اس نے دروازہ کھولا اور اپنا ہینڈ بیگ سنبھالتی ہوئی باہر نکل گئی۔ "آئندہ میں تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔"

"ایک بات کان کھول کر سن لو۔ وہ رنڈوا نواب تم جیسی عورتوں کو صرف تفریح کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ یہ خیال دل سے نکال دینا کہ وہ تمہیں اپنی بیگم بنالے گا۔"

یہ بات سن کر شہلا کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس وقت اس کے پاس پستول ہوتا تو وہ افتخار کو شوٹ کر دیتی۔

"میں گھڑی دیکھ کر پانچ منٹ تک تمہارا انتظار کروں گا۔" افتخار نے مزید کہا۔ "غصہ ٹھنڈا ہو جائے تو گاڑی میں بیٹھ جانا۔ پانچ منٹ کے بعد میں چلا جاؤں گا۔"

شہلا اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرتی ہوئی کلب... کے اندر چلی گئی۔ نواب معظم حسین لان کے ایک نیم تاریک حصے میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ شہلا تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اس کے قریب گئی اور اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ غصے کی وجہ سے اس کے لیے بولنا مشکل ہو رہا تھا۔

"شہلا بیگم کیا بات ہے؟" معظم حسین نے پوچھا۔ "تم بہت پریشان نظر آرہی ہو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟"

"ہم..... میرا افتخار سے جھگڑا ہو گیا ہے۔" شہلا نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ "میں..... اس کے ساتھ گھر نہیں جاؤں گی۔"

معظم حسین کے چہرے پر ہلکی سی چمک پیدا ہو گئی۔ واضح طور پر وہ بات اسے اچھی لگی تھی۔ "فکر کرنے کی کوئی بات نہیں۔" اس نے خوشدلی سے کہا۔ "میری گاڑی حاضر ہے۔ میں تمہیں گھر چھوڑ آتا ہوں۔ آؤ میرے ساتھ۔"

دونوں گیٹ سے نکل کر سفید رنگ کی کار کی طرف بڑھے۔ باوردی شوفر، گاڑی کے قریب ہی موجود تھا، جلدی سے آگے بڑھا اور بڑے ادب سے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔

افتخار کی دس سال پرانی کار چند قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ اس نے حیرت اور غصے سے شہلا کی طرف دیکھا۔ ساتھ ہی اسے اپنی حماقت پر افسوس بھی ہوا۔ اگر وہ برداشت سے کام لیتا تو بات اتنی آگے نہ بڑھتی۔ اس نے شہلا کو معظم کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھتے دیکھا تو خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا اور جلدی سے اپنی گاڑی آگے بڑھا دی۔

○☆○

شہلا کے باپ کرنل رحمٰن کی عمر پچھتر سال کے لگ بھگ تھی۔ اگرچہ وہ بظاہر صحت مند نظر آتا تھا مگر اندر سے وہ بہت کمزور ہو چکا تھا۔ اس کی بیوی جہاں آرا بیگم اس سے تین چار سال چھوٹی تھی۔ وہ بھی خاصی کمزور ہو چکی تھی۔ دونوں شہلا کی طرف سے بہت فکر مند تھے۔ وہ اپنی زندگی میں اس کا گھر آباد دیکھنا چاہتے تھے لیکن شہلا کا مزاج بہت عجیب تھا اور طلاق کے بعد وہ شادی سے مسلسل انکار کرتی چلی آرہی تھی لیکن کچھ عرصے قبل جب اس نے افتخار میں دلچسپی لینا شروع کی تھی تو انہیں کچھ امید ہو چلی تھی۔ جہاں آرا بیگم نے اس سلسلے میں اپنے بھائی سے بات بھی پکی کرلی

تھی لیکن ابھی باقاعدہ اعلان نہیں کیا تھا۔ وہ کسی مناسب موقع پر شہلا سے بات کرنا چاہتی تھی۔

اس روز جب افتخار کلب سے اکیلا واپس آیا تو دونوں پریشان ہو گئے۔

”شہلا کہاں ہے؟“ جہاں آرا بیگم نے فکرمندی سے پوچھا۔

”میرا اس سے جھگڑا ہو گیا ہے۔“ افتخار نے جواب دیا اور کسی تھکے ہوئے انسان کی طرح صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔

”جھگڑا ہو گیا ہے! تم اسے کلب میں چھوڑ آئے ہو؟“

”وہ...... نواب معظم حسین کے ساتھ آرہی ہے۔ تھوڑی دیر میں پہنچنے ہی والی ہوگی۔“

”جھگڑا کس بات پر ہوا تھا؟“ کرنل رحمٰن نے پوچھا۔

”معظم حسین نے شہلا کو ایک نیکلس تحفے میں دیا ہے۔ مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی۔ میں نے اس پر اعتراض کیا تو شہلا غصے میں آگئی اور گاڑی سے اُتر گئی۔“

اتنے میں باہر گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی۔ چند لمحوں کے بعد شہلا اندر داخل ہوئی اور افتخار کی طرف ناگواری سے دیکھتے ہوئے اندر چلی گئی۔ باہر جو گاڑی رکی تھی اس کے واپس جانے کی آواز سنائی دی۔ جہاں آرا بیگم بیٹی کے پیچھے اندر گئیں اور جھگڑے کے بارے میں پوچھا۔

”اس وقت میرا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔“ شہلا نے جواب دیا۔ ”مجھے تنہا چھوڑ دو۔“

”دیکھو بیٹی‘ انسان کو چھوٹی چھوٹی باتوں پر اتنا زیادہ غصہ نہیں کرنا چاہیے......“

”چھوٹی چھوٹی باتیں!“ شہلا اپنے جوش کو دباتے ہوئے بولی۔ ”آپ کو نہیں پتا کہ افتخار نے مجھ پر کیسے بے ہودہ الزامات لگائے ہیں۔ بس آپ مجھ سے کچھ نہ پوچھیں۔ میں ان الزامات کو دُہرا نہیں سکتی۔“ اس نے بستر پر گر کر رونا شروع کر دیا۔

جہاں آرا بیگم واپس ڈرائنگ روم میں گئیں اور افتخار سے کہا۔ ”شہلا کہتی ہے تم نے اس پر بہت بُرے الزام لگائے ہیں۔“

افتخار نے ندامت سے کہا۔ ”وہ...... غصے میں کچھ باتیں منہ سے نکل گئی تھیں۔ میں شہلا سے معافی مانگنے پر تیار ہوں۔“

”اس وقت تم جاؤ۔ اس کا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔ کل کسی وقت آجانا۔“

اگلے روز افتخار کو ڈیوٹی پر واپس جانا تھا مگر وہ نہیں گیا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ غصے میں اس کے منہ سے کچھ زیادہ ہی سخت باتیں نکل گئی تھیں۔

شام کے وقت وہ شہلا کے گھر پہنچا تو اسے باہر ہی ٹھٹک جانا پڑا۔ گیٹ کے سامنے نواب معظم حسین کی سفید مرسڈیز کار کھڑی تھی اور سفید یونیفارم میں ملبوس شوفر ڈکی کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ افتخار کا پارہ چڑھ گیا۔ اس نے ڈرائیور سے پوچھا کہ وہ وہاں کیوں آیا تھا۔

”میں بی بی جی کو لینے آیا ہوں۔“ ڈرائیور نے بظاہر ادب سے جواب دیا لیکن افتخار نے محسوس کیا تھا کہ اس کے لہجے میں استہزا پایا جاتا تھا۔ وہ تیس بتیس سال کا دراز قد اور قوی الجثہ شخص تھا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”جہاں زیب خان......“

”گاڑی واپس لے جاؤ۔“ افتخار نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ”بی بی جی کو اب گاڑی کی ضرورت نہیں رہی۔“

”سر میری بات کا بُرا نہیں ماننا۔“ جہاں زیب نے استہزائیہ مسکراہٹ سے کہا۔ ”میں اپنے مالک کے سوا کسی کا حکم نہیں مان سکتا۔“

”اگر بی بی جی نے جانے سے انکار کر دیا تو پھر بھی یہاں کھڑے رہو گے؟“ افتخار نے اپنے جوش کو دباتے ہوئے پوچھا۔

”پھر دوسری بات ہے لیکن بی بی جی نے انکار نہیں کیا۔ وہ جانے کے لیے تیار ہو رہی ہیں۔“

”ٹھیک ہے...... ابھی انکار ہو جائے گا۔“ افتخار نے کہا اور کوٹھی کے اندر چلا گیا۔

شہلا تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی اور افتخار کو دیکھ کر دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ وہ انگوری رنگ کی ساری میں ملبوس تھی اور خوشبو میں بسی ہوئی تھی۔ کسی اندرونی کمرے سے ٹی وی چلنے کی آواز آرہی تھی۔

”شہلا میں تم سے معذرت کرنے آیا ہوں۔“ افتخار نے اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔ ”کل رات میں ذہنی طور پر...... بہت اپ سیٹ ہو رہا تھا۔ م...... مجھے معاف کر دو پلیز......“

”بس یا کچھ اور کہنا چاہتے ہو؟“ شہلا نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”پلیز...... شہلا‘ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ مجھے ساری رات نیند نہیں آئی۔ تمہاری وجہ سے آج میں ڈیوٹی پر بھی نہیں گیا۔ کل رات میں نے جو کچھ کہا تھا‘ اس پر مجھے شرمندگی ہے۔“

”میں نے تمہاری بات سُن لی ہے‘ میرا راستہ چھوڑ دو۔“

”پلیز...... شہلا‘ غصہ جانے دو۔“ افتخار نے زور دے کر کہا۔ ”میرا امتحان مت لو۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ معظم حسین کے ڈرائیور سے کہو کہ گاڑی واپس لے جائے۔“

”میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔“ شہلا نے سخت لہجے میں کہا۔ ”میں ایسے شخص کی مہربانیاں برداشت نہیں کر سکتی جس نے میری ممی کی پریشانی اور میری عمر دیکھ کر میری طرف محبت کا ہاتھ بڑھایا تھا۔“

”وہ سب کچھ میں نے غصے کی حالت میں کہا تھا اس وقت میرا دماغ ٹھکانے پر نہیں تھا۔“

شہلا صوفے کے اوپر سے گھوم کر باہر نکل گئی۔ افتخار تھکے

تھکے انداز میں اس کمرے کی طرف بڑھا جس میں سے ٹی وی کی آواز آرہی تھی تب ہی اسے خیال آیا کہ شہلا نے اپنے ممی اور ڈیڈی کی اجازت سے معظم حسین کی گاڑی منگوائی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بھی معظم حسین کی دولت سے متاثر ہو گئے تھے۔

اس خیال کے آتے ہی وہ واپس پلٹ گیا۔ جب وہ باہر پہنچا تو سفید مرسیڈیز روانہ ہو چکی تھی۔ وہ اپنی کار میں جا بیٹھا اور اسٹیئرنگ وہیل پر بازو ٹکا کر صورت حال کے بارے میں غور کرنے لگا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ معظم حسین کا ماضی کنگالنا چاہیے۔ ممکن ہے کہ اس کے ماضی میں کوئی ایسی بات نکل آئے جو شہلا کو اس سے متنفر کرنے کا موجب بن سکے۔

○☆○

نواب معظم حسین بہت خوش تھا۔ شہلا اور افتخار کی لڑائی نے اس کا راستہ آسان کر دیا تھا۔ کنٹری کلب میں شہلا ہی وہ واحد لڑکی تھی جس پر اس کی نظرِ انتخاب پڑی تھی۔

چند ہفتوں کے اندر وہ شہلا کے ممی اور ڈیڈی کو بھی اپنا گرویدہ بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے دو تین دفعہ انہیں قصرِ شنگراف میں مدعو کیا اور اپنی امارت کا خوب مظاہرہ کیا۔

اگرچہ وہ شہلا سے بیس سال بڑا تھا' تاہم اسے یقین تھا کہ اس کی دولت اور شہلا کی طلاق اس خامی پر پردہ ڈال دے گی۔ اس نے کرنل رحمٰن گل کی مالی حالت کے بارے میں چھان بین کی تھی۔ کرنل کے پاس کچھ واجبی سی جائیداد تھی' جس کا نو دس ہزار روپے ماہوار کرایہ آتا تھا۔ اس کے علاوہ سوائے پنشن کے اس کی اور کوئی آمدنی نہیں تھی۔

شہلا کے بارے میں اسے شروع ہی میں اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو دولت اور چمک دمک کی خواہاں ہوتی ہیں۔ ایک روز وہ اسے قصرِ شنگراف میں لے گیا اور بڑی تفصیل سے تمام جگہوں کی سیر کرائی۔ وہاں کی ہر شے خوبصورت اور بے مثال تھی۔ باغ میں پھلوں اور پھولوں کے پودے خاصے قد آور ہو چکے تھے اور عجیب بہار دکھا رہے تھے۔ چاروں طرف گھاس سے ڈھکی ہوئی خوبصورت روشیں بنی ہوئی تھیں جو باغ کے وسط میں ایک شاندار فوارے پر اختتام پذیر ہوتی تھیں۔ ان روشوں کے کناروں پر سفید اور سرخ رنگ کی ٹائلیں لگی ہوئی تھیں۔ فوارے کے گرد چار رنگ برنگی چھتریاں استادہ تھیں جن کے نیچے میزیں اور کرسیاں دیکھی جا سکتی تھیں۔

ڈیڑھ سو سالہ قدیم عمارت کی داہنی جانب ایک خوبصورت سوئمنگ پول بنا ہوا تھا جس کے ساتھ گہری سبز گھاس سے ڈھکا ہوا ایک خوبصورت لان تھا۔

عمارت کے برآمدوں اور ستونوں کے ساتھ رنگ برنگے پھولدار پودوں کے گملے آویزاں تھے۔ عمارت کے اندر اور باہر درجن سے زیادہ ملازم اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔

شہلا نے یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد کہا۔ "آپ نے اس ویرانے کو جنت بنا دیا ہے۔ ہر چیز شاندار اور مکمل ہے۔"

"نہیں' ابھی ایک چیز کی کمی ہے۔" معظم حسین نے کہا۔ اس وقت وہ دونوں فوارے کے سامنے چھتری کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ "یہ جنت میں نے کسی کے استقبال کے لیے بنائی ہے۔"

میز پر پھلوں سے بھری ہوئی سینیاں رکھی تھیں۔ شہلا ایک انگور کا دانہ منہ میں رکھتے ہوئے بولی۔ "کون ہے وہ خوش قسمت؟"

"اس خوش قسمت کی تصویر تم اس حوض میں دیکھ سکتی ہو۔" معظم حسین نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

"واقعی؟" شہلا نے چونک کر کہا۔ "آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ کس حصے میں ہے وہ تصویر؟"

"اس حصے میں۔" معظم حسین نے حوض کے قریبی حصے کی طرف اشارہ کیا۔

شہلا اپنی نشست سے اُٹھی اور منڈیر پر ہاتھ رکھ کر حوض میں جھانکا۔ تب ہی معظم حسین کی بات اس کی سمجھ میں آئی اور وہ جھینپ سی گئی۔ حوض میں اسے اپنا ہی عکس نظر آیا تھا۔

"آپ مذاق کرتے ہیں۔" وہ اپنی جھینپ چھپاتے ہوئے بولی۔ "حوض میں کوئی تصویر نہیں ہے۔"

"بخدا اتنے سنجیدہ معاملے پر ہم مذاق نہیں کر سکتے۔ تم نے جو عکس حوض کے پانی میں دیکھا ہے وہ برسوں سے ہمارے دل پر نقش ہے۔ جب یہ عکس اس جنتِ ارضی کا حصہ بن جائے گا تو ہمارے خوابوں کی تعبیر مکمل ہو جائے گی۔"

"اور اگر ایسا نہ ہوا تو؟"

"تو ہم اس جنت کو آگ لگا دیں گے اور خود بھی اس آگ میں جل کر راکھ ہو جائیں گے۔"

شہلا چپ سی ہو گئی۔ دل میں اس نے سوچا کہ اگر نواب صاحب اس کے بارے میں اتنے سنجیدہ ہیں تو وہ اپنی شرطوں پر بات آگے بڑھا سکتی تھی۔

چند روز کے بعد اس نے اپنی ممی سے معظم حسین کی خواہش کا ذکر کیا۔ جہاں آرا بیگم کی جہاندیدہ نگاہیں پہلے ہی اس بات کا اندازہ کر چکی تھیں۔ اس نے اس سلسلے میں اپنے شوہر سے بھی بات کی تھی جس نے اس کی بات سُن کر صرف اتنا کہا تھا۔ "جہاں آرا' ہم بوڑھے اور کمزور ہو چکے ہیں اور یہ لڑکی ہمارے اختیار سے باہر ہو چکی ہے۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ یہ نفسیاتی مریضہ بن چکی ہے۔ اگر ہم نے اس کو اپنی مرضی پر چلانے کی کوشش کی تو یہ ہمارے لیے عذاب بن جائے گی۔ اگر یہ نواب معظم حسین سے شادی کرنا چاہتی ہے تو ہمیں اس کے راستے میں روک نہیں بننا چاہیے۔ تنہائی کی زندگی سے ایک سہارا بہرحال بہتر ہے۔"

جہاں آرا بیگم نے بیٹی کی بات سن کر کہا۔ "دو باتیں بہت قابلِ غور ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم نواب کے بارے میں کچھ نہیں

جاننے کہ وہ کون ہے اور اس کا ماضی کیا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ تمہاری اور اس کی عمر میں بہت فرق ہے۔"

"ایک اچھی بات بھی ہے۔" شہلا نے کہا۔ "معظم حسین بے حساب دولت کا مالک بھی ہے۔ میرے سوا اس کا کوئی وارث نہیں ہوگا پھر وہ نرم مزاج اور مفاہمت پسند بھی ہے۔"

"بیٹی! اچھی طرح سوچ لو۔ دنیا میں دولت ہی سب کچھ نہیں ہوتی اور یہ بھی ضروری نہیں کہ نواب کا تم سے پہلے انتقال ہو جائے۔ اس کی صحت بہت اچھی ہے۔ وہ تم سے لمبی عمر بھی پا سکتا ہے پھر شادی کے بعد اختلافات بھی ہو سکتے ہیں۔"

"ہم شادی سے پہلے اپنے تحفظ کے لیے کچھ شرطیں منوا سکتے ہیں مثلاً میں شنگراف اپنے نام لکھوا سکتی ہوں۔"

"نواب بھی اتنا سیدھا نہیں ہے۔ وہ اتنی بڑی قربانی پر راضی نہیں ہوگا۔"

"تو پھر ہمیں بھی کوئی مجبوری نہیں ہے۔ ہم انکار کر سکتے ہیں۔"

"بیٹی، اگر تمہیں اصرار ہے تو ہم تمہارے راستے میں روک نہیں بنیں گے۔ یہ تمہاری زندگی ہے۔ اگر تم نے غلط فیصلہ کیا تو تمہیں نقصان ہوگا۔ ہم اپنا وقت پورا کر چکے ہیں۔ پتا نہیں کب اوپر سے بلاوا آجائے۔"

چند روز کے بعد شہلا نے معظم حسین کے سامنے آمادگی کا اظہار کر دیا۔ ساتھ ہی اپنی شرط کا ذکر بھی کر دیا۔

معظم حسین اتنا بدھو بھی نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ "ہمیں قصرِ شنگراف تمہارے نام کرنے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن یہ گفٹ مشروط ہوگا۔"

"کیا مطلب؟"

"دیکھو شہلا، ہماری بات کا برا مت ماننا لیکن میاں بیوی کا رشتہ بہت نازک ہوتا ہے۔ ذرا سے اختلاف سے اس رشتے میں دراڑ پڑ سکتی ہے۔ ہم قصرِ شنگراف تمہارے نام کرنے پر بہ دل و جان سے آمادہ ہیں، لیکن...... اس کے لیے چند شرائط ہوں گی۔ مثلاً تم ناراض ہو کر میکے چلی گئیں اور طلاق کا مطالبہ کر دیا تو قصرِ شنگراف کی ملکیت سے محروم ہو جاؤ گی۔"

شہلا کو یہ بات پسند نہیں آئی، تاہم اس نے چند روز تک سوچ و بچار کے بعد اسے تسلیم کر لیا۔

معظم حسین نے اپنے وکیل کے مشورے سے ایک شرط اور شامل کر دی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ میاں بیوی کے درمیان خواہ کوئی بھی صورتِ حال پیدا ہو، معظم حسین تاحیات قصرِ شنگراف میں رہنے کا حق دار ہوگا اور شہلا اس کی زندگی میں اسے فروخت نہیں کر سکے گی۔

شہلا نے اپنے ممی ڈیڈی کی مرضی کے خلاف یہ شرط بھی مان لی اور شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی۔

O☆O

راجا افتخار اس صورتِ حال پر بہت برہم تھا لیکن اس کا کوئی زور نہیں چل رہا تھا کیونکہ وہ شادی شہلا کے ممی ڈیڈی کی رضامندی سے ہو رہی تھی۔ تاہم اس نے نواب معظم حسین سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

ایک شام وہ معظم حسین کی گاڑی کے پیچھے لگ گیا۔ اس کی جیب میں بھرا ہوا پستول تھا اور وہ معظم حسین کو شادی سے باز رکھنے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا تھا۔

معظم حسین کی کار کلب جانے کے بجائے قصبے کے مرکزی بازار میں پہنچ کر ایک ٹیلر کی دکان کے سامنے رک گئی۔ باوردی شوفر نے نکل کر دروازہ کھولا اور معظم حسین ٹیلرنگ شاپ کی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

ان دنوں ٹورسٹ سیزن تھا اور بازاروں میں ہر طرف سیاح گھومتے پھرتے دکھائی دیتے تھے۔ افتخار نے اپنی کار، مرسیڈیز سے چند گز دور روکی اور باہر نکل کر احتیاط سے معظم حسین کی طرف بڑھا۔ احتیاط اس لیے ضروری تھی کہ معظم حسین کا شوفر ہر وقت مسلح رہتا تھا۔ واضح طور پر وہ شوفر کے علاوہ باڈی گارڈ بھی تھا اور افتخار اس کے سامنے معظم حسین سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

جس دکان میں معظم حسین داخل ہوا تھا وہ اس علاقے کی سب سے بڑی ٹیلرنگ شاپ تھی۔ افتخار بھی شیشے کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ شاپ میں اس وقت دس بارہ گاہک موجود تھے اور کونے میں انتظار کرنے والوں کے لیے صوفے بھی لگے ہوئے تھے۔

افتخار، معظم حسین کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ ایک پستہ قد شخص جو کاؤنٹر کے پاس کھڑا تھا چونک کر معظم حسین کی طرف مڑا اور حیرانی سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ "ابے موجو، تم یہاں کہاں! ایمان سے بڑے غضب کا حلیہ بنا رکھا ہے!"

یہ بات سن کر افتخار کا چونکنا لازمی تھا۔ وہ رک گیا اور دونوں کی باتوں پر کان لگا دیے۔

"کیسے ہو بشارت علی؟" معظم حسین نے پستہ قد شخص سے کہا اور معنی خیز انداز میں اس کا کندھا دبایا۔

افتخار نے اس کی یہ حرکت دیکھ لی۔ اس حرکت کا مطلب یہ تھا کہ وہ بشارت علی نامی اس شخص کو خاموش رہنے کا ارادہ کر رہا تھا۔

"یار، تمہارا نقشہ ہی......" بشارت علی نے مزید کچھ کہنا چاہا۔

معظم حسین نے دوبارہ اس کا کندھا دبایا اور اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "آؤ میرے ساتھ۔ یہ جگہ بات چیت کے لیے مناسب نہیں۔ آج رات کے لیے تم میرے مہمان ہو۔"

"تمہارا رات کا کھانا ہمارے ساتھ ہوگا۔" بشارت علی نے

کہا۔ "ہم چترال ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

"چلو تو..... کھانا بھی کھالیں گے۔" معظم حسین نے کہا اور بشارت علی کو کھینچتا ہوا باہر لے گیا۔

افتخار نے بات کرنے کا ارادہ ملتوی کردیا اور شیشے کے دروازے سے دونوں کی طرف دیکھنے لگا۔ بشارت علی نے مرسیڈیز کار دیکھ کر بھی حیرت کا اظہار کیا تھا لیکن افتخار اس کی بات نہیں سُن سکا تھا۔ دونوں کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔

افتخار نے ان کا پیچھا نہیں کیا۔ تاہم بشارت نامی شخص کے منہ سے نکلنے والے دو جملوں سے اس نے بہت کچھ اندازہ لگا لیا تھا۔

واضح طور پر بشارت علی معظم حسین کا لنگوٹیا یار تھا اور چونکہ وہ اسے اس حلیے میں دیکھ کر حیران ہوا تھا اس لیے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں تھا کہ معظم حسین کی اصلیت کچھ اور تھی۔ اس کا وہ حلیہ دراصل ایک بہروپ تھا اور شاید اس کا اصل نام بھی کچھ اور تھا۔ موجو' ماجد یا مجید وغیرہ کی بگڑی ہوئی شکل تھی۔

افتخار نے معظم حسین سے بات کرنے سے پہلے بشارت علی سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ ان دنوں اسے بہت زیادہ سفر کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ علی الصباح کار پر ایبٹ آباد جاتا تھا اور ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد واپس مرگ شیر آجاتا تھا۔

اگلے روز شام کو وہ چترال ہوٹل پہنچا اور کاؤنٹر سے بشارت علی کے بارے میں پوچھا۔ کاؤنٹر کلرک اپنا کام چھوڑ کر فوراً اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"آپ بشارت علی کو کیسے جانتے ہیں؟" کلرک نے جلدی سے پوچھا۔ "کیا وہ آپ کا دوست ہے؟"

"دوست تو نہیں' شناسا کہہ سکتے ہیں۔" افتخار نے محتاط انداز میں جواب دیا۔

کاؤنٹر کلرک نے کہا۔ "وہ کل رات سے غائب ہے۔ اس کے دوست بہت پریشان ہیں۔"

"اچھا! ان کا کمرا نمبر کیا ہے؟"

"کمرا نمبر ۱۴۲ ہے۔ فرسٹ فلور پر چلے جائیں۔"

افتخار سیڑھیوں کی طرف بڑھا اور ساتھ ہی بشارت علی سے شناسائی کا کوئی اچھا سا جواز سوچنے لگا۔

چترال ہوٹل درمیانے درجے کا ہوٹل تھا جہاں زیادہ تر متوسط طبقے کے لوگ قیام کرتے تھے۔

کمرا نمبر ۱۴۲ میں تین بیڈ لگے ہوئے تھے اور دو آدمی پریشان بیٹھے تھے۔ تعارف کے بعد ان میں سے ایک کا نام شکور خان اور دوسرے کا منصور علی معلوم ہوا۔ دونوں ادھیڑ عمر کے سیدھے سادے شریف آدمی تھے۔ انہوں نے بھی یہی بتایا کہ بشارت علی گزشتہ رات سے واپس نہیں آیا تھا۔

"آپ بشارت علی کو کیسے جانتے ہیں؟" شکور خان نے پوچھا۔

"کل میری اس سے ایک ٹیلرنگ شاپ میں ملاقات ہوئی تھی۔" افتخار نے کہا۔ "ہمارے درمیان اس علاقے کے بارے میں کچھ بات چیت ہوئی تھی۔ میں چونکہ مقامی ہوں اس لیے..... یہاں کے بارے میں میری معلومات بھی زیادہ ہیں۔ بشارت علی نے میری باتوں میں دلچسپی لی تھی اور دوبارہ ملنے کے لیے کہا تھا۔ آج میں اپنے ایک کام سے ادھر آیا تو سوچا بشارت علی کو بھی سلام کرتا چلوں۔"

"صاحب ہم تو بڑے پریشان بیٹھے ہیں۔" منصور علی نے کہا۔ "کل شام کو ہم دونوں خریداری کے لیے بازار گئے تھے۔ اس وقت بشارت علی ہوٹل کے لاؤنج میں ایک ٹورسٹ کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ بعد میں وہ اس کے ساتھ بازار چلا گیا۔ یہ بات اس ٹورسٹ سے معلوم ہوئی ہے۔ اس نے بھی ٹیلرنگ شاپ کا ذکر کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ بشارت علی کو باہر چھوڑ کر کپڑے چیک کرنے کے لیے ٹرائی روم میں چلا گیا' چند منٹ کے بعد وہ باہر آیا تو بشارت علی غائب تھا۔"

"عجیب بات ہے۔" افتخار نے کہا۔ "میری بھی اس کے ساتھ ایک دو منٹ بات ہوئی تھی پھر میں واپس چلا گیا تھا۔ آپ نے ٹیلرنگ شاپ سے پتا نہیں کیا؟"

"آج ہم سارا دن یہی کام کرتے رہے ہیں۔ ٹیلرنگ شاپ والوں کو بشارت علی کے بارے میں کچھ یاد نہیں۔"

افتخار..... نے معظم حسین کا ذکر دانستہ نہیں کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ معظم حسین نے بشارت علی کو اپنے پاس روک لیا تھا۔ چونکہ وہ پرانے دوست تھے اس لیے باتوں میں وقت گزرنے کا پتا نہیں چلا ہوگا۔ تاہم اس کے دل میں ایک اندیشہ بھی تھا۔

"آپ بشارت علی کے کسی پرانے دوست موجو کو جانتے ہیں؟"

دونوں نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر شکور خان نے کہا۔ "ہم کسی موجو کو نہیں جانتے۔ بشارت علی سے ہماری دوستی زیادہ پرانی نہیں ہے۔ ہماری شناسائی کو زیادہ سے زیادہ تین سال ہوئے ہوں گے۔"

"آپ..... کسی معظم حسین کو جانتے ہیں؟"

"نہیں....." شکور خان نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ نام بھی ہمارے لیے نیا ہے لیکن یہ کون لوگ ہیں؟"

افتخار نے قدرے سوچتے ہوئے کہا۔ "جب میں ٹیلرنگ شاپ سے نکل رہا تھا۔ تو میرا خیال ہے کہ بشارت علی نے کسی شخص کو موجو کے نام سے مخاطب کیا تھا۔ تاہم میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اور شخص کی آواز ہو' جسے میں بشارت علی کی آواز سمجھا تھا۔ آپ نے پولیس میں رپورٹ درج نہیں کرائی؟"

"دراصل..... کل ہمیں واپس جانا ہے۔ اگر ہم نے پولیس میں رپورٹ درج کرادی تو وہ لوگ جلدی ہماری جان نہیں چھوڑیں

گے۔ آپ کو تو پتا ہی ہے کہ پولیس شریف لوگوں سے کیا سلوک کرتی ہے؟"

"ہاں' یہ تو ہے۔ میرا خیال ہے کہ بشارت علی کو کوئی پرانا دوست مل گیا ہوگا اور وہ اس کے ساتھ تفریح کرنے چلا گیا ہوگا۔ ممکن ہے وہ آج یا کل واپس آجائے۔ ویسے آپ لوگ کہاں سے آئے ہیں؟"

"کراچی سے۔"

"کافی لمبا سفر کرکے آئے ہیں۔ ایسا کریں کہ اپنا یا بشارت علی کا ایڈریس مجھے دے دیں۔ اگر مجھے بشارت علی کے بارے میں کچھ پتا چلا تو آپ کو اطلاع کردوں گا۔"

دونوں اپنا پتا دینے میں متامل تھے۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کرکے بشارت علی کا پتا دے دیا۔ وہ کراچی کی ایک پرانی آبادی اے بی سینیا لائنز کا رہنے والا تھا۔

○☆○

معظم علی تین روز سے کلب نہیں آرہا تھا۔ بلکہ وہ گھر سے باہر ہی نہیں نکلا تھا۔ چوتھے روز افتخار نے قصر شنگراف جانے کا فیصلہ کرلیا۔ شام کے وقت وہ اپنی کار میں وہاں پہنچا اور لکڑی کے بھاری گیٹ پر دستک دی۔

تھوڑی دیر کے بعد چوکیدار نے دروازہ کھولا اور افتخار کے استفسار پر کہا۔ "نواب صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ ایک ہفتے تک کسی سے نہیں مل سکتے۔"

افتخار نے چوکیدار کو باہر بلایا اور اپنی کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ..... میری گاڑی کھڑی ہے۔ میں اس میں جاکر انتظار کررہا ہوں۔ نواب سے کہو کہ....."

"جناب' آپ میری بات نہیں سمجھے۔" چوکیدار نے قدرے ترشی سے کہا۔ "نواب صاحب کسی سے نہیں مل سکتے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اگر امریکا کا صدر بھی آجائے تو اسے منع کردینا۔"

"ان سے صرف اتنا کہہ دو کہ بشارت علی کا دوست موجو سے ملنے آیا ہے۔"

"جی' کیا کہا؟"

"ان سے کہو کہ بشارت علی کا دوست موجو سے ملنے آیا ہے۔ اور یہ بھی کہہ دینا کہ وہ گھڑی دیکھ کر صرف پانچ منٹ انتظار کرے گا۔"

چوکیدار نے تیوری چڑھائی اور دروازہ بند کرکے واپس چلا گیا۔ افتخار اپنی کار میں جاکر بیٹھ گیا جو وہاں سے سو گز کے فاصلے پر کھڑی تھی۔

تقریباً دس منٹ کے بعد چوکیدار گیٹ سے باہر نکلا اور کار کے قریب پہنچ کر بولا۔ "نواب صاحب نے آپ کو اندر بلایا ہے۔"

"ان سے کہو کہ ملاقات یہیں پر ہوگی۔ میں تین منٹ اور انتظار کروں گا اس کے بعد نہیں رکوں گا۔"

چوکیدار واپس چلا گیا۔

چند لمحوں کے بعد معظم حسین گیٹ سے باہر نکلا اور چھڑی ٹیکتا ہوا کار کی طرف بڑھا۔ وہ لکھنئو طرز کے کرتے پاجامے میں ملبوس تھا لیکن آج اس کی چال میں پہلی سی خود اعتمادی نہیں تھی۔

افتخار نے اس کے بیٹھنے کے لیے اگلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔

"کیا بات ہے؟" معظم حسین دروازے کے سامنے رکتے ہوئے بولا۔ "ہمیں اس طرح کیوں بلایا گیا ہے؟"

"میں آپ کو..... موجو کہہ کر مخاطب نہیں کرسکتا کیوں کہ میری اور آپ کی عمر میں بہت فرق ہے۔" افتخار نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "لیکن اس بات سے آپ کو یہ ضرور معلوم ہوجانا چاہیے کہ میں آپ کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں۔"

"پھر؟" معظم حسین نے کہا۔ اس کا چہرہ قدرے سفید پڑ گیا تھا۔

"بشارت علی کہاں ہے؟"

"کون بشارت علی؟"

"وہی..... جس سے آپ کی ٹیلرنگ شاپ میں ملاقات ہوئی تھی۔ ہوٹل چترال میں اس کے دوست بہت پریشان بیٹھے ہیں۔ میں نے ان کو ابھی یہ نہیں بتایا کہ بشارت علی قصرِ شنگراف میں آپ کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہورہا ہے۔"

معظم حسین آہستہ آہستہ سیٹ پر بیٹھ گیا اور افتخار کو گھورتے ہوئے بولا۔ "تم چاہتے کیا ہو؟ پیسوں کی ضرورت ہے تمہیں؟"

"پیسوں کی ضرورت ہر شخص کو ہوتی ہے لیکن فی الحال میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ شہلا سے شادی کا ارادہ ترک کردیں۔"

"یہ شادی شہلا اور اس کے والدین کی خواہش پر ہورہی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ہم اس شادی کے لیے نصف کروڑ کی قربانی دینے پر مجبور کردیے گئے ہیں۔ شادی سے پہلے ہمیں قصرِ شنگراف شہلا کے نام کرنا پڑے گا۔"

"آپ اس شادی سے انکار کردیں اور اپنا نصف کروڑ بچائیں۔" افتخار کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔ "ورنہ اس بستی کا ہر باشندہ کراچی کے موجو کو پہچان لے گا۔"

"ویسے سچی بات یہ ہے کہ ابھی ہم نے شادی کا حتمی فیصلہ نہیں کیا۔ ہم خود بھی بہت متذبذب ہیں اور شادی سے انکار کرنے والے ہیں۔ آپ کو چند روز بعد ہمارے فیصلے کا علم ہوجائے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم کسی موجو کو نہیں جانتے۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"اگر آپ شادی سے انکار کردیں گے تو میں یہ سب کچھ بھول جاؤں گا۔ ویسے بشارت علی کہاں ہے؟"

"ہم کیا جانیں۔ وہ ایک گھنٹے کے بعد واپس چلا گیا تھا۔" معظم حسین نے کہا۔ "کیا آپ ہمیں میزبانی کا شرف عطا نہیں کریں

گے؟"

"شکریہ۔" افتخار نے ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا۔ "مشیر کے پنجرے میں داخل ہونے سے پہلے حفاظتی انتظام مضبوط ہونا چاہیے پھر بھی سہی۔"

"کوئی بات نہیں' جب آپ کا جی چاہے تشریف لائیے۔ ہمارے دروازے آپ ہمیشہ کھلے پائیں گے اور جاتے جاتے ہم آپ کو ایک مشورہ دینا چاہیں گے۔"

"فرمایئے۔"

"شملا سے شادی کا خیال ترک کردیجیے۔ وہ آپ کو گھر کی خوشیاں نہیں دے سکے گی۔ اسے بہت ساری دولت کی ضرورت ہے' جو آپ مہیا نہیں کرسکتے۔"

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔"

معظم حسین کار سے باہر نکلا اور کچھ کہے بغیر واپس چل دیا۔ افتخار نے گاڑی کا دروازہ بند کیا اور انجن اسٹارٹ کرکے اسے آگے بڑھا دیا۔ اسے معظم حسین کے فیصلے پر حیرت ہو رہی تھی۔ یا تو لفظ "سوجو" جادو اثر ثابت ہوا تھا اور یا معظم واقعی شادی کے بارے میں متذبذب تھا۔

○☆○

راجا افتخار کو اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ جس شخص سے اس نے ٹکر لی تھی وہ انتہائی سفاک اور شاطر شخص تھا۔

معظم حسین سے بات چیت کے پانچویں روز افتخار ایبٹ آباد سے مرگ شیر آ رہا تھا۔ اس وقت آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ افتخار کے ساتھ ذوالفقار نامی ایک شخص بھی تھا جسے اس نے راستے میں لفٹ دی تھی۔ اسے مرگ شیر سے چند کلو میٹر والے گاؤں جانا تھا۔ وہ پڑھا لکھا نوجوان تھا اور افتخار نے اس خیال سے اسے لفٹ دے دی تھی کہ باتوں میں سفر آسانی سے کٹ جائے گا اور اب وہ باتیں کرتے ہوئے سفر کر رہے تھے۔

باتوں باتوں میں ذوالفقار نے ایک حادثے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ دو روز قبل ایک کھڈ سے کسی سیاح کی لاش برآمد ہوئی تھی۔

"سیاح کی لاش برآمد ہوئی تھی؟" افتخار نے چونک کر پوچھا۔

اسے بشارت علی نامی سیاح یاد آ گیا تھا۔

"ہاں' وہ کوئی سیاح ہی تھا۔" ذوالفقار علی نے کہا۔ "غالباً اکیلا سیر کرنے نکل گیا تھا اور پیر پھسلنے سے کھڈ میں گر گیا تھا۔"

"اس کا کچھ اتا پتا معلوم ہوا؟" افتخار نے ایک موڑ کاٹتے ہوئے پوچھا۔ اس نے کار کی رفتار ہلکی کر دی تھی۔ کیوں کہ بل کھاتی ہوئی پہاڑی سڑک بوندا باندی کی وجہ سے خطرناک ہو رہی تھی۔

"مجھے اس بات کا علم نہیں کیوں کہ میں اسی دن ایبٹ آباد چلا گیا تھا۔ ویسے پولیس اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔"

"مرنے والے کا حلیہ کیسا تھا؟ عمر کتنی تھی اور قد وغیرہ کتنا تھا؟"

"اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور عمر پچپن سال سے زیادہ ہی لگتی تھی۔"

"کیا وہ چھوٹے قد کا آدمی تھا؟"

"قد اس کا واقعی چھوٹا تھا۔ کیا آپ اس کو جانتے ہیں؟"

افتخار کے بدن میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ اسے یقین ہو گیا کہ متوفی بشارت علی تھا اور اسے معظم حسین نے قتل کیا تھا۔

"اس حلیے کا ایک شخص مرگ شیر میں گم ہو گیا تھا۔" اس نے کہا۔

"یہ لاش اسی کی ہوگی۔"

"یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ اکیلا اس ویرانے کی طرف کیا کرنے گیا تھا؟"

یہ بات افتخار کی سمجھ میں آ چکی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ مرگ شیر پہنچ کر وہ سیدھا پولیس اسٹیشن جائے گا اور انہیں حقیقت سے آگاہ کر دے گا۔ اب خاموش رہنا مناسب نہیں تھا لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ مرگ شیر پہنچ نہیں پائے گا۔

نصف راستہ طے کرنے کے بعد ایک موڑ پر اس نے ایک خوفناک منظر دیکھا۔ تقریباً سو گز کے فاصلے پر دو نقاب پوش رائفلیں تانے کھڑے تھے۔ ان کا حلیہ خاصا عجیب و غریب تھا۔ انہوں نے گہرے رنگ کی پتلون اور قمیص پہن رکھی تھی اور چہروں پر دھاری دار کپڑے لپیٹ رکھے تھے۔ عجیب بات یہ تھی کہ جس جگہ پر وہ کھڑے تھے وہاں روشنی کا ایک ہالہ نظر آ رہا تھا۔ پتا نہیں وہ روشنی کہاں سے آ رہی تھی۔ یہ سارا منظر دونوں نے موڑ مڑتے ہی دیکھ لیا تھا۔

"ڈاکو....." ذوالفقار نے تھرتھراتی آواز میں کہا۔ "خدا خیر کرے!"

افتخار کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ گاڑی کو واپس موڑنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ سڑک بہت تنگ تھی۔ ایک طرف بلند پہاڑی اور دوسری طرف گہری کھڈ تھی۔ بظاہر یہی نظر آتا تھا کہ ڈاکو ان کو لوٹنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن دفعتاً دونوں نقاب پوشوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ گولیوں کی آواز سے پوری وادی گونج اٹھی۔

افتخار کے ہاتھ کپکپائے اور اس نے غیر ارادی طور پر اسٹیئرنگ داہنی طرف گھما دیا۔ گاڑی کنارے پر پہنچ کر اچھلی اور کئی سو فٹ گہرے کھڈ میں لڑھکتی چلی گئی۔

کھڈ میں پہنچنے سے چند ثانیے قبل ڈرائیونگ سیٹ والا دروازہ قبضوں سمیت گاڑی سے الگ ہو گیا اور افتخار اچھل کر جھاڑیوں میں جا گرا۔ اس کے فوراً بعد پیٹرول ٹینک میں آگ لگ گئی اور گاڑی شعلوں میں گھر گئی۔ ذوالفقار نامی نوجوان گاڑی کے اندر

پھنس چکا تھا۔

اوپر صرف ایک نقاب پوش تھا۔ وہ ایک کھوہ میں بیٹھا ہوا تھا اس کے سامنے بیٹری سے چلنے والا پروجیکٹر رکھا تھا۔ گاڑی کے لوھکنے کے ساتھ ہی اس نے پروجیکٹر بند کردیا اور راس کے مختلف حصے الگ کرکے انہیں ایک اٹیچی کیس میں رکھنے لگا۔ پروجیکٹر کے بند ہوتے ہی چٹان پر نظر آنے والی وہ تصویر بھی غائب ہوگئی جس میں وہ نقاب پوش فائرنگ کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ اصلی نقاب پوش نے عمودی چٹان پر پھیلا ہوا اسفید کپڑا بھی تہ کرکے اٹیچی کیس میں رکھ لیا اور کنارے پر پہنچ کر شعلوں میں گھری ہوئی کار پر ایک نظر ڈالی پھر وہ تیزی سے ایک طرف روانہ ہوگیا۔ اس کی چال میں اطمینان تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے مشن کی تکمیل پر بہت خوش تھا۔

○☆○

تاریکی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جارہی تھی' ابھی تک اس کوہستانی سڑک پر کوئی دوسری گاڑی نمودار نہیں ہوئی تھی۔

بیس منٹ کے بعد آگ بجھ گئی اور کھڈ میں دو ڈھانچے رہ گئے۔ ایک انسانی ڈھانچا تھا اور دوسرا کار کا ڈھانچا۔

ایک گھنٹے بعد افتخار کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس کے جسم کے مختلف حصوں سے خون بہہ رہا تھا۔ تاہم اسے کوئی مہلک چوٹ نہیں آئی تھی۔ وہ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلتا ہوا جھاڑیوں سے باہر نکلا اور چشمے کے کنارے ایک صاف جگہ پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر تک وہ بے حرکت وہاں پڑا رہا پھر اس نے جانوروں کی طرح چشمے میں منہ ڈال کر پانی پیا اور کراہتا ہوا آگے بڑھا اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر تباہ شدہ کار کے اندر دیکھنے لگا۔

کار کے اندر جلی ہوئی لاش دیکھ کر اس کے دماغ میں جھماکا سا ہوا اور ایک ثانیے کے لیے حادثے کا منظر اس کے تصور میں روشن ہوگیا لیکن اس نے جو نتیجہ نکالا وہ ٹھیک نہیں تھا۔ اس نے قیاس کیا کہ وہ مرچکا تھا اور گاڑی کے اندر اس کی اپنی لاش پڑی تھی۔ تاہم اسے یہ یاد نہیں آرہا تھا کہ وہ کون تھا اور اس کا نام کیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں حادثے کے باعث اس کی یادداشت کھوچکی تھی پھر وہ چشمے کے ساتھ ساتھ ترائی میں قدم بڑھانے لگا۔ اس کے جسم کے مختلف حصوں سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

آسمان پر پھیلے ہوئے بادل چھٹ گئے اور کچھ دیر کے بعد چاند نکل آیا۔ افتخار کسی روبوٹ کی طرح گرتا پڑتا کسی نامعلوم منزل کی طرف بڑھتا جارہا تھا۔ اس دوران وہ دو تین دفعہ گر کر بے ہوش بھی ہوا تھا۔ جب اسے ہوش آتا تو وہ زندگی بچانے والی اس جبلت کے تحت دوبارہ چل پڑتا جو حیوانوں میں بھی پائی جاتی ہے۔

وہ کئی گھنٹے تک چلتا رہا اور جائے حادثہ سے کئی میل دور نکل گیا۔ اگلی صبح ایک چرواہے نے اسے چشمے کے کنارے بے ہوش پڑا ہوا دیکھا اور گاؤں کے لوگوں کو بلا لایا۔ لوگ اسے اٹھا کر گاؤں لے گئے اور مقامی حکیم سے اس کی مرہم پٹی کرواکے اسے قریبی قصبے کے سرکاری اسپتال میں بھجوادیا۔

ادھر علی الصبح بعض لوگوں نے کھڈ میں جلی ہوئی گاڑی دیکھ کر پولیس کو اطلاع کردی۔ پولیس نے موقع پر پہنچ کر جلی ہوئی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوادی اور حادثے کی تحقیقات شروع کردیں۔

گاڑی کے رجسٹریشن نمبر سے یہ پتا چلا کہ وہ راجا افتخار کی گاڑی تھی۔ اس کے دفتر والوں سے یہ پتا چلا کہ وہ شام کے پانچ بجے مرگ شیر کے لیے روانہ ہوا تھا۔ لہٰذا یہ فرض کرلیا گیا کہ گاڑی کے اندر سے جو سوختہ لاش برآمد ہوئی تھی وہ راجا افتخار کی تھی۔

پولیس نے تحقیقات کے بعد فیصلہ کیا کہ حادثہ بارش اور پھسلن کی وجہ سے پیش آیا تھا۔

معظم حسین بہت خوش تھا۔ شہلا اس کی بیوی بن کر قصرِ شنگراف میں رونق افروز ہوچکی تھی اور ہر شے بڑی حسین لگ رہی تھی۔

شادی کے بعد دو مہینے تک معظم حسین اور شہلا دعوتوں میں الجھے رہے۔ اس کے بعد انہوں نے قصرِ شنگراف میں تقریبات اور محفلوں کا سلسلہ شروع کردیا۔ ہر ہفتے وہاں کوئی نہ کوئی تقریب منعقد ہوتی تھی۔ اب کنٹری کلب سے زیادہ رونق قصرِ شنگراف میں رہنے لگی تھی۔ معظم حسین نے وہاں اِن ڈور اور آؤٹ ڈور گیمز کا اہتمام بھی کرلیا تھا پھر سوئمنگ پول بھی موجود تھا۔ قصبے کے بعض روسا نے باقاعدگی سے وہاں آنا شروع کردیا تھا۔

تاہم معظم حسین مہمانوں کے چناؤ میں بہت محتاط تھا۔ اس نے خاص خاص لوگوں کی ایک فہرست تیار کرلی تھی اور کوئی ایسا شخص وہاں نہیں آسکتا تھا جس کا نام فہرست میں موجود نہ ہو۔

ایک سال خیریت سے گزر گیا۔

ایک صبح معظم حسین اسٹڈی میں داخل ہوا تو وہاں ٹرے میں ایک لفافہ رکھا ہوا دکھائی دیا۔ بظاہر وہ ایک عام سا لفافہ دکھائی دیتا تھا لیکن جب معظم حسین نے اسے اٹھا کر دیکھا تو وہ پھولا ہوا اور پلپلا سا محسوس ہوا۔ اس نے جیسے ہی اسے کھولا تو خون سے ملتا جلتا ایک سیال مادہ اس کے کناروں سے نکل کر میز پر پھیلنا شروع ہوگیا۔ لفافے کے اندر سے ایک تہنیتی کارڈ برآمد ہوا جس کے کنارے سے تھوڑا سا جما ہوا مادہ چپکا ہوا تھا۔

معظم حسین نے لفافہ ہاتھ سے چھوڑ دیا اور خوفزدہ نظروں سے اس سیال مادے کو گھورنے لگا۔ اس کریہہ المنظر مادے کی وجہ سے اس کے بدن میں جھرجھری آگئی تھی۔ اس نے تہنیتی کارڈ پر جمے ہوئے مادے کو جھٹک کر الگ کیا اور اسے پلٹ کر دیکھا۔ اس طرف یہ مصرع لکھا تھا۔

؎ سوچ کر موجو تمہاری موجوں کے دن پورے ہوئے

یہ مصرع پڑھ کر معظم حسین کے بدن میں کپکپی سی طاری ہوگئی۔ اس نے کارڈ دراز میں رکھ دیا اور چند لمحے اپنے حواس درست کرنے کی کوشش کرتا رہا پھر اس نے گھنٹی بجا کر بٹلر کو طلب کیا اور غصے سے پوچھا۔ "یہ خط کون لایا تھا؟"

"کک...... کون سا خط؟" بٹلر نے گھبرا کر پوچھا۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر میز پر پھیلے ہوئے خون نما سیال مادے کو گھور رہا تھا۔

"ہم اس خط کی بات کر رہے ہیں۔" معظم حسین نے سفید لفافے کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ دیکھ رہے ہو تم۔ یہ سارا گند اسی لفافے سے نکلا ہے!"

"جی سرکار' دیکھ رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ خط ہاؤس کیپر نے یہاں رکھا ہوگا۔"

"بلاؤ اس کو۔"

ہاؤس کیپر ادھیڑ عمر کی خوش شکل عورت تھی۔ اس نے سفید یونیفارم پہنی ہوئی تھی اور خاصی چرب زبان عورت تھی۔

"یہ لفافہ دیکھ رہی ہو!" معظم حسین نے کہا۔ "یہ سارا گند اسی لفافے سے نکلا ہے۔ یہ کہاں سے آیا تھا؟"

"ہائے اللہ! یہ تو خون لگتا ہے۔" ہاؤس کیپر نے کہا۔ "یہ لفافہ ڈاکیے نے دیا تھا۔ مجھے بھی بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔" شور کی اونچی آوازیں سُن کر شہلا بھی وہاں پہنچ گئی اور میز پر جمے ہوئے سیال مادے کو دیکھ کر بولی۔

"یہ کیا ہے؟"

"یہ چیز اس لفافے سے برآمد ہوئی ہے۔" معظم حسین نے کہا۔ "پتا نہیں کس نے یہ شرارت کی ہے!"

وہ مادہ جیلی کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ بٹلر نے چھری سے اسے اوپر کیا تو وہ میز پر کوئی نشان چھوڑے بغیر اوپر اٹھتا چلا گیا۔

"اس کو صاف کر دو۔" شہلا نے بٹلر سے کہا۔ "اور یہ لفافہ بھی لے جاؤ۔"

معظم حسین نے کہا۔ "ایک منٹ۔ ہم یہ لفافہ بغرضِ تفتیش پولیس کے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔"

"اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یہ کوئی قابلِ سزا فعل نہیں ہے۔"

بٹلر نے چند لمحے انتظار کیا پھر معظم حسین کو خاموش دیکھ کر لفافے کو ردّی کی ٹوکری میں ڈال کر لے گیا۔ ہاؤس کیپر بھی واپس چلی گئی۔

"آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟" شہلا نے کہا۔ "کیا لفافے میں سے کوئی خط بھی نکلا ہے؟"

"نہیں...... نہیں' خط کوئی نہیں نکلا۔" معظم حسین نے جھوٹ بولا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ شہلا کارڈ پر لکھا ہوا مصرع پڑھے۔ معظم حسین کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنے دل کی دھڑکن کو متوازن کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

شہلا دوسری کرسی پر بیٹھ گئی اور غور سے شوہر کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ "معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اس چھوٹی سی بات سے بہت اثر لیا ہے۔ حالانکہ یہ محض ایک بھونڈا مذاق لگتا ہے۔"

معظم حسین گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ اس نے تہنیتی کارڈ پر جو مصرع پڑھا تھا وہ اس کی نظر میں بہت سیریس بات تھی۔ اس مصرعے نے اسے پریشان کر دیا تھا لیکن وہ بیوی کو اس پریشانی میں شامل نہیں کر سکتا تھا ورنہ اسے اپنے ماضی کے بارے میں بہت سے سوالات کے جواب دینے پڑتے۔

"آپ ذرا تہ خانہ کھلوا کر دیکھ لیں۔" شہلا نے کہا۔

"کیوں؟" معظم حسین نے برہمی سے کہا۔ "ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم تہ خانے کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو۔"

تہ خانہ دونوں کے درمیان تنازعے کا باعث بنتا جا رہا تھا۔ شادی کے بعد کم از کم چھ مہینے تک شہلا کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ قصر شنگراف میں کوئی تہ خانہ بھی ہے۔ ایک دن اس نے اتفاق سے معظم حسین کو تہ خانے سے باہر آتے دیکھ لیا۔ تہ خانے کی سیڑھیاں ایک ایسے کمرے میں تھیں جو عموماً بند رہتا تھا۔ معظم حسین نے شہلا کے استفسار پر گول مول جواب دیا تھا لیکن شہلا کے دل میں زبردست تجسس پیدا ہوگیا' کیوں کہ معظم حسین تہ خانے کا دروازہ مقفل ضرور رکھتا تھا اور کسی کو نیچے جانے کی اجازت نہیں تھی۔

"رات کو تہ خانے سے کچھ آوازیں آ رہی تھیں۔" شہلا نے کہا۔

"کیسی آوازیں؟ ہم نے تو کوئی آواز نہیں سُنی۔" معظم حسین کی پریشانی فزوں تر ہوگئی۔ "تم نے یہ بات رات کو کیوں نہیں بتائی؟"

"یہ رات کے دو بجے کی بات ہے۔ کھٹکے کی آواز سُن کر میری آنکھ کھل گئی تھی۔ میں نے غور کیا تو تہ خانے سے کسی کے تیز تیز چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ ہو سکتا ہے کوئی بلی یا کوئی جنگلی جانور اندر گھس گیا ہو۔"

"تیز چلنے کی آواز! جانور تو بھاگتے دوڑتے ہیں۔"

"ممکن ہے کہ مجھے اندازہ لگانے میں غلطی ہوئی ہو مگر میں نے آواز ضرور سُنی تھی۔ آپ نیچے جا کر دیکھ لیں۔"

معظم حسین کو بیوی کی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا لیکن اس کے انکشاف نے اسے پریشان ضرور کر دیا تھا۔ اس نے میز کی دراز سے ریوالور نکال کر اسے لوڈ کیا اور بولا۔ "بلی کے چلنے کی آواز کیسے سنائی دے سکتی ہے! بلی اگر بستر کے نیچے بھی چل رہی ہو تو اس کے چلنے کی آواز نہیں سنائی دیتی۔"

شہلا اپنے شوہر کو خوفزدہ دیکھ کر دل میں خوش ہو رہی تھی۔ ایک سال کی ازدواجی زندگی میں دونوں ایک دوسرے کی خامیں

سے آگاہ ہو گئے تھے اور کئی اختلافات بھی جنم لے چکے تھے۔

شملا کے دل کے نہاں خانے میں شوہر کی موت کی خواہش سر اُٹھانے لگی تھی۔ معظم حسین کی موت سے وہ مرگ شیر کی امیر ترین بیوہ ہونے کا اعزاز حاصل کر سکتی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ اب اسے اپنا کزن افتخار بھی بہت یاد آنے لگا تھا۔

معظم حسین مختلف کمروں سے ہوتا ہوا اس کمرے میں پہنچا جس میں تہ خانے کی سیڑھیاں تھیں۔ عام طور پر وہ کمرے کو اندر سے بند کر کے سیڑھیوں کا دروازہ کھولتا تھا لیکن آج اس نے دروازہ بند نہیں کیا کیونکہ وہ خوفزدہ تھا اور فرار کا راستہ کُھلا رکھنا چاہتا تھا۔

سیڑھیوں پر قدم رکھنے سے قبل اس نے ریوالور ہاتھ میں پکڑ لیا اور چند لمحوں تک نیم تاریک تہ خانے میں دیکھتا رہا پھر وہ احتیاط سے زینے طے کرنے لگا۔

جیسے ہی اس نے نچلے زینے پر قدم رکھا اس کے کانوں میں مدھم سی غراہٹ کی آواز آئی۔ اس کا جسم بُری طرح تن گیا اور اس نے تیزی سے آواز کی سمت دیکھا۔ داہنی طرف لکڑی کی پرانی پیٹیوں کی اوٹ میں اسے دو چمکتی ہوئی آنکھیں اور سیاہ جسم دکھائی دیا۔ اس نے ریوالور کا رخ اس سیاہ جسم کی طرف کیا اور فائر کر دیا۔

تب ہی ایک قد آور جنگلی بلا خوفناک غراہٹ کے ساتھ اس پر حملہ آور ہوا۔ اس نے کم از کم چار پانچ فٹ اونچی چھلانگ لگائی تھی۔ اگر معظم حسین تیزی سے پیچھے نہ ہو جاتا تو جنگلی بلا اس کے چہرے پر اپنے پنجے گاڑ چکا ہوتا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پہلا نشانہ خطا گیا تھا۔

بلا فرش پر گرنے کے بعد واپس پلٹا اور دوبارہ حملہ آور ہونے کے لیے چیتے کی طرح زمین پر چپک گیا۔ معظم حسین نے یکے بعد دیگرے تین فائر کیے مگر ایک بھی گولی نشانے پر نہیں بیٹھی۔ جنگلی بلے نے خوفناک آواز نکالی اور دوبارہ معظم حسین کی طرف جھپٹا۔ معظم حسین پیچھے ہٹتے ہوئے پیٹیوں سے ٹکرایا اور ساتھ ہی فائر بھی کر دیا۔ اس دفعہ بلے کے منہ سے کراہنے کی آواز نکلی اور وہ سیڑھیوں پر دوڑتا چلا گیا۔ اس کی پچھلی ٹانگ گھسٹتی ہوئی جا رہی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آخری گولی اس کی ٹانگ پر لگی تھی۔

معظم حسین لکڑی کی پیٹی پر بیٹھ کر بُری طرح ہانپنے لگا۔ اس کے ہاتھ پیر شل ہو گئے تھے اور جسم سے پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔ اگر اس کے ہاتھ میں ریوالور نہ ہوتا تو وہ جنگلی بلا اس کے لیے موت کا پیغام بن جاتا۔

"کیا ہوا؟" معظم حسین کے کانوں میں اپنی بیوی کی آواز آئی۔ "آپ کس پر گولیاں چلا رہے تھے؟ سارے ملازم پریشان ہو رہے ہیں۔"

معظم حسین آنکھیں جھپکاتے ہوئے بیوی کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے کچھ پتا نہیں چلا تھا کہ وہ کب سیڑھیاں طے کر کے تہ خانے میں پہنچی تھی۔

"اُف میرے خدا!" اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تہ خانے میں جنگلی بلا گھسا ہوا تھا۔"

"جنگلی بلا!" شملا کی آواز میں حیرت تھی۔ "کہاں ہے؟"

"میں نے اسے زخمی کر دیا تھا۔ وہ اوپر چلا گیا ہے۔"

"اوپر تو کوئی جنگلی بلا نہیں آیا۔ پہلی گولی کی آواز سن کر میں سیڑھیوں والے کمرے میں پہنچ گئی تھی۔"

"اوہ، میرے خدا!" معظم حسین ہمت کر کے کھڑا ہو گیا۔ "ہو سکتا ہے کہ وہ جنگلی بلا تمہیں دیکھ کر واپس پلٹ آیا ہو۔ خدا خیر کرے۔ وہ بہت خوفناک بلا ہے۔ تم نے اس کے غرانے کی آواز بھی نہیں سُنی؟"

"ہرگز نہیں۔ میں نے فائرنگ کے علاوہ کوئی آواز نہیں سُنی۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کو وہم ہوا ہو۔"

معظم حسین نے سیڑھیوں کی بتی جلائی اور ایک ایک سیڑھی کا بغور جائزہ لینے لگا۔

"یہ دیکھو..." اس نے تیسری سیڑھی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ تازہ خون کے دھبے۔ گولی سے اس کی پچھلی ٹانگ زخمی ہو گئی تھی۔ یہ... اگلی سیڑھیوں پر بھی خون کے دھبے موجود ہیں۔"

دونوں خون کے دھبے دیکھتے ہوئے اوپر پہنچ گئے۔ وہاں ایک حیرت انگیز چیز مشاہدے میں آئی۔ خون کے دھبے جو مسلسل سیڑھیوں پر نظر آ رہے تھے۔ کمرے میں پہنچ کر معدوم ہو گئے تھے۔ خون کے دھبے آخری سیڑھی سے دو فٹ آگے تک موجود تھے۔ اس کے بعد ان کا کوئی نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ کمرے میں پہنچ کر زخمی بلا ہوا میں تحلیل ہو گیا تھا۔

"یہ تو بڑی عجیب بات ہے!" معظم حسین نے کہا۔ "اگر زخمی بلا واپس پلٹتا یا آگے جاتا تو خون کے دھبے ضرور اس کے راستے کی نشاندہی کرتے۔"

"اس سے بھی عجیب بات یہ ہے کہ میں نے کسی بلے کو اوپر آتے نہیں دیکھا۔" شملا نے کہا۔

بیوی کی بات نے معظم حسین کو مزید خوفزدہ کر دیا۔ اس نے سیڑھیوں کے دروازے کو قفل لگا دیا اور باری باری تمام کمرے دیکھ ڈالے۔ کسی کمرے میں خون کا کوئی دھبا نظر نہیں آیا۔

ملازموں نے بھی کسی جنگلی بلے کے وجود سے لاعلمی ظاہر کی۔

* * *

اس سانحے کے بعد معظم حسین بیمار پڑ گیا اور ایک ہفتے تک صاحبِ فراش رہا۔ جنگلی بلے کی تہ خانے میں موجودگی اور پراسرار روپوشی نے اس کے اعصاب کو بری طرح جھنجوڑ کے رکھ دیا تھا۔ پہلی بات یہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ وہ جنگلی بلا تہ خانے میں داخل کہاں سے ہوا تھا۔ تہ خانے کے روشندانوں میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور اتنی جسامت کا بلا ان کے درمیان سے نہیں

گزر سکتا تھا۔ اگر وہ گزر ہی گیا تھا تو زخمی ہونے کے بعد کہاں گیا؟

یہ ایسے سوالات تھے جو معظم حسین کے اعصاب پر سوار ہوتے جا رہے تھے۔ صحت یاب ہونے کے بعد وہ کئی روز تک تہ خانے میں نہیں گیا۔ وحشت کی وجہ سے اسے سیڑھیوں پر بھی قدم رکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے کئی دفعہ سیڑھیوں کا دروازہ کھولا اور کان لگا کر آوازیں سننے کی کوشش کرتا رہا مگر اندر سے کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ اگر اندر کوئی جانور ہوتا تو اتنے دنوں میں اسے بھوک سے مر جانا چاہیے تھا۔

پانچویں روز اس نے دروازہ کھولا تو پہلی سیڑھی پر اسے ایک سفید شے دکھائی دی۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہو گیا پھر اس نے غور سے دیکھا تو سیڑھی پر ایک سفید لفافہ پڑا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے جھک کر لفافہ اٹھا لیا اور کپکپاتے ہاتھوں سے اسے کھول کر دیکھا۔ اندر سے ایک ہلکے گلابی رنگ کا کارڈ برآمد ہوا جس پر خون کے دھبے تھے۔ ان دھبوں کے درمیان یہ عبارت لکھی تھی۔

"خون کی موجوں میں موجو کی قضا لکھی ہے!
پہلے تو نے مجھے کار کے حادثے میں جلایا اور اب گولی سے زخمی کیا لیکن میں دوبارہ آؤں گا۔"

نیچے کسی کا نام نہیں تھا۔ یہ تحریر پڑھ کر معظم حسین کے جسم پر تھرتھری طاری ہو گئی۔ اس نے دہشت سے سوچا کہ کیا وہ جنگلی بلا افتخار کی روح تھا؟ ایک روح ہی مقفل تہ خانے میں داخل ہو سکتی تھی۔

"کیا ہوا؟ آپ کے ہاتھ کیوں کانپ رہے ہیں؟" معظم حسین کے کانوں میں اپنی بیوی کی آواز آئی۔ "یہ خط کس کا ہے؟"

وہ چونک کر بیوی کی طرف مڑا اور خط پیچھے کر لیا۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ شہلا بغیر آواز کیے اس کے عقب میں پہنچ گئی تھی اور یہ دونوں مواقع ایسے تھے کہ وہ خوفزدہ تھا۔

"کک...... کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"میں آپ کی چیخنے کی آواز سن کر آئی ہوں۔" شہلا نے جلدی سے کہا۔ اس کا لہجہ بہت پرسکون تھا۔

"میرے چیخنے کی آواز!" معظم حسین نے حیرت سے شہلا کی طرف دیکھا۔ "تم نے کوئی خواب تو نہیں دیکھا؟"

لیکن شہلا کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں آیا' بولی۔ "میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔ آپ کے چیخنے کی آواز میں نے ہی نہیں بٹلر نے بھی سنی تھی پھر آپ اس خط کو دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ یہ ناممکن ہے...... یہ قطعی ناممکن ہے...... افتخار مر چکا ہے۔"

معظم حسین چکرا گیا۔ شہلا بڑی سنجیدگی سے یہ بات کر رہی تھی۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کہیں اس کے دماغ پر اثر تو نہیں ہو گیا؟ شہلا نے ایک خاص بات یہ نوٹ کی کہ دہشت کے موقعے پر اس کا شوہر اپنا نوابی لب و لہجہ بھول جاتا تھا۔

"یہ خط کس کا ہے؟" شہلا نے پوچھا۔

"یہ...... یہ تو ایسے ہی لفافہ ہے۔ خط تو نہیں ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ آپ مجھ پر اعتماد نہیں کرتے حالانکہ میں آپ کی بیوی ہوں اور بیویاں دکھ درد کی ساتھی ہوا کرتی ہیں۔ خیر...... میں اپنی بات پر اصرار نہیں کروں گی۔ آئیے میرے ساتھ۔ اس وقت آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔"

معظم حسین نے تہ خانے کے دروازے کو تالا لگایا اور خاموشی سے بیوی کے ساتھ ہو لیا۔ تاہم اس نے خط نہیں دکھایا۔

خواب گاہ میں پہنچ کر شہلا نے معظم حسین کو آرام کرنے کے لیے کہا اور تھوڑی دیر کے بعد شربت کا ایک گلاس بنا کر لے آئی۔

"یہ...... یہ کیا ہے؟" معظم حسین نے گھبرا کر پوچھا۔ اس نے بیوی پر شک کرنا شروع کر دیا تھا۔

"یہ شربت صندل ہے۔ دل و دماغ کے لیے مفید چیز ہے اور وحشت دور کرتا ہے۔"

"نن...... نہیں۔ مجھے کسی شربت کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" شہلا نے کہا اور بہت اصرار کر کے شربت پلا دیا۔

اس وقت دن کے ڈھائی بجے تھے۔ شربت پینے کے بعد معظم حسین نے محسوس کیا کہ اس کا سر بھاری ہونے لگا تھا۔ وہ بستر پر لیٹ گیا اور چند منٹوں کے بعد اس پر گہری نیند طاری ہو گئی۔

شہلا گلاس رکھ کر واپس آئی اور بستر کے قریب رک کر اپنے عمر رسیدہ شوہر کو گھورنے لگی۔ کنٹری کلب میں وہ بہت اسمارٹ اور متاثر کن شخصیت کا مالک نظر آتا تھا مگر بستر پر پڑا ہوا وہ بہت نحیف و نزار لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد پڑی جھریاں بہت نمایاں نظر آ رہی تھیں۔ شہلا کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ اس نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "نواب معظم حسین شاہ اعلیٰ حضرت......"

* * *

قصرِ شنگراف قصبے کے نواح میں واقع تھا۔ اس کے شمال میں دور تک سرسبز جنگل پھیلا ہوا تھا۔ اگرچہ قصرِ شنگراف کے اندر وسیع باغ موجود تھا اور چہل قدمی کے لیے بہت جگہ تھی۔ تاہم شہلا کبھی کبھی اپنی خاص ملازمہ کے ہمراہ جنگل کی سیر کو نکل جاتی تھی۔ یہ سیر وہ عموماً صبح کے وقت کرتی تھی کیونکہ شام کے وقت مہمانوں کی آمد و رفت شروع ہو جاتی تھی۔

تہ خانے والے واقعے کے چھ روز بعد شہلا حسبِ معمول ملازمہ کے ہمراہ سیر کے لیے نکلی۔ اس وقت سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا اور موسم قدرے سرد تھا۔ شمال کی طرف سے ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ملازمہ کا نام راحیلہ تھا۔ اس کی عمر شہلا کے برابر

تھی اور شہلا اسے ملازمہ سے زیادہ دوست سمجھتی تھی۔

تقریباً نصف کلو میٹر جانے کے بعد شہلا کو درختوں کے جھنڈ کے پیچھے حرکت دکھائی دی۔ یہ حرکت راحیلہ نے بھی دیکھ لی۔

"وہاں کوئی ہے۔" اس نے کہا۔

"کوئی آدمی لگتا ہے۔" شہلا نے کہا۔

اس کا اندازہ ٹھیک ہی تھا۔ ایک شخص جس نے گرم چادر اوڑھ رکھی تھی' پودوں کی تاریکی سے نکل کر ان کی سمت بڑھا۔ اس نے اپنا چہرہ بھی چادر میں چھپا رکھا تھا۔ شہلا نے جلدی سے اپنا ہینڈ بیگ کھولا اور اعشاریہ بائیس بور کے پستول پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کون ہو تم؟" اس نے کہا۔

"بیگم معظم علی' میں آپ سے علیحدگی میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔" چادر پوش نے کہا۔ اس نے آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا۔ شہلا کو اس کی آواز کچھ جانی پہچانی سی لگی۔ اس نے اپنی یادداشت پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"میں علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"یہ میری رازدار ملازمہ ہے۔ میں اس سے کوئی بات نہیں چھپاتی۔ تمہیں جو کچھ کہنا ہے' سامنے کہو۔"

"میں اپنا تعارف کرانے سے پہلے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔ آپ میری نبض چیک کرکے بتائیں کہ میں بیمار تو نہیں۔"

اس نے چادر سے اپنا ہاتھ باہر نکال دیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔"

"میں جو بات بتانا چاہتا ہوں اس کا تعلق میری نبض سے ہے۔ دیکھیے انکار مت کیجئے۔"

شہلا نے محسوس کیا کہ وہ شخص آواز بدل کر بول رہا تھا۔ تو بھی اس کی آواز کچھ جانی پہچانی لگ رہی تھی۔

راحیلہ حیرت سے چادر پوش کی باتیں سن رہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کی نبض چیک کی اور بولی۔ "تم ٹھیک ٹھاک ہو۔ چلو راستہ ناپو۔"

"میں بیگم صاحبہ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔" چادر پوش نے اصرار کیا۔ "اگر یہ میری نبض چیک نہیں کریں گی تو بہت بڑے انکشاف سے محروم رہ جائیں گی۔"

"لاؤ ہاتھ آگے کرو۔" شہلا نے کہا۔

چادر پوش نے اپنی ہتھیلی اوپر کی طرف کر رکھی تھی۔ جب شہلا نے نبض چیک کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو اس نے ہتھیلی کا رخ نیچے کی طرف کرتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھایا۔ شہلا نے ناگواری سے اس کی نبض پر انگلیاں رکھیں۔ اچانک وہ چونک کر اس انگوٹھی کو گھورنے لگی جو اس ہاتھ میں نظر آرہی تھی۔ یہ وہ انگوٹھی تھی جو وہ افتخار کے ہاتھ میں دیکھ چکی تھی۔

"یہ انگوٹھی تم نے کہاں سے لی ہے؟" اس نے پوچھا۔

جواب میں چادر پوش نے چشمہ اتار کر اپنا چہرہ قدرے نمایاں کر دیا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی شہلا کے منہ سے چیخ نکل گئی اور اگر راحیلہ اسے بروقت سہارا نہ دیتی تو چکرا کر گر پڑتی۔ اس کے سامنے افتخار کھڑا تھا۔

"تم..... تم.....!" اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "تم تو....."

"وہ میں نہیں تھا۔" چادر پوش نے کہا۔ "وہ ایک مسافر تھا جس نے مجھ سے لفٹ لی تھی۔ میں زخمی ہو گیا تھا اور اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ کچھ نیک لوگوں نے مجھے ایک خیراتی اسپتال میں داخل کرا دیا تھا۔ میں طویل عرصے تک وہاں زیر علاج رہا۔"

"مجھے یقین نہیں آرہا۔" شہلا کی آنکھیں ہنوز خوف سے پھیلی ہوئی تھیں۔

"تم مجھے چھو کر دیکھ چکی ہو اور میری نبض بھی چیک کر چکی ہو۔ میں وہ چیز نہیں ہوں جو تم سمجھ رہی ہو۔" افتخار نے کہا۔ وہ ملازمہ کی وجہ سے مبہم انداز میں بات کر رہا تھا۔

"اب تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"میں تم سے علیحدگی میں چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"مجھے تم سے خوف محسوس ہو رہا ہے۔"

"میں فاصلہ رکھ کر بات کروں گا اور بات تمہارے فائدے کی ہے۔"

شہلا نے کچھ دیر سوچنے کے بعد ملازمہ کو چند قدم دور بھیج دیا پھر افتخار سے بولی۔ "میں تمہیں زیادہ وقت نہیں دے سکتی۔"

"شہلا' آج میں تم سے کچھ مانگنے نہیں آیا' بلکہ تمہیں ایک خطرے سے آگاہ کرنے آیا ہوں۔"

"کیسا خطرہ؟"

"تم جس شخص کی بیوی ہو وہ ایک جنونی شخص ہے اور کم از کم دو آدمیوں کا قاتل ہے۔"

"اوہ..... نہیں! معظم حسین کسی کو قتل نہیں کر سکتا۔ وہ تو بہت بزدل شخص ہے۔ ذرا سی بات پر خوفزدہ ہو جاتا ہے۔"

"قتل کرنے والا عموماً بزدل ہی ہوتا ہے۔" افتخار نے کہا۔ "اور قتل کے پیچھے بسا اوقات خوف کار فرما ہوتا ہے۔ جن لوگوں سے انسان کو خطرہ محسوس ہوتا ہے وہ ان کو قتل کرنے کے درپے ہو جاتا ہے یا ان کی موت کی خواہش کرنے لگتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ایسے لوگوں کی موت سے وہ محفوظ ہو جائے گا۔ حالانکہ حقیقت میں ایسی حرکت سے وہ خود کو مزید خطرے میں ڈال رہا ہوتا ہے۔"

"معظم حسین نے کن دو آدمیوں کو قتل کیا ہے؟"

"پہلا قتل اس نے اپنے دوست بشارت علی کا کیا تھا۔ یہ تمہاری شادی سے پہلے کی بات ہے۔ قصبے کی ایک مشہور ٹیلرنگ شاپ میں معظم حسین اور بشارت علی کا آمنا سامنا ہو گیا۔ بشارت علی اپنے دو دوستوں کے ہمراہ سیاحت کے لیے یہاں آیا ہوا تھا۔ اتفاق سے میں بھی اس ٹیلرنگ شاپ میں موجود تھا۔ بشارت علی نے معظم حسین کو بے ساختہ پکارا' ابے موجو' تم یہاں کہاں! ایمان

سے بڑے غضب کا حلیہ بنا رکھا ہے۔ میں اس اندازِ گفتگو سے سمجھ گیا کہ بشارت علی، معظم کا لنگوٹیا یار تھا۔ معظم حسین، بشارت علی کو دیکھ کر اچھا خاصا پریشان ہوگیا اور اسے کار میں بٹھا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ اس کے چند روز کے بعد بشارت علی کی لاش ایک کھڈ سے برآمد ہوئی۔ بظاہر اس کی موت حادثہ معلوم ہوتی تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ معظم حسین نے اپنا ماضی چھپانے کے لیے اسے قتل کردیا تھا۔ اس کے ماضی میں ضرور کوئی ایسی بات ہے جس کا انکشاف اس کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔"

افتخار کی بات سن کر شملا سوچ میں پڑگئی۔ اسے وہ مصرع یاد آگیا جو اس نے چند روز پہلے اس کارڈ پر لکھا ہوا پڑھا تھا جو معظم حسین کو تہ خانے کی سیڑھیوں سے ملا تھا یعنی خون کی موجوں میں موجو کی قضا لکھی ہے اور اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ معظم حسین یہ عبارت پڑھ کر کانپنے لگا تھا۔

"یہ موجو کا کیا مطلب ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ یہ معظم حسین کا نک نیم ہے۔ اس نام کو سن کر اس کی حالت غیر ہوجاتی ہے۔ بشارت علی کی گمشدگی کے بعد میں قصر شنگراف میں اس سے ملنے گیا تو اس نے ملنے سے انکار کردیا۔ ملازموں کو اس نے یہ کہہ رکھا تھا کہ اگر امریکا کا صدر بھی آجائے تو اس کو واپس بھیج دینا۔ میں نے چوکیدار سے کہا، صاحب سے کہو کہ بشارت علی کا دوست موجو سے ملنے آیا ہے۔ یہ جادوئی لفظ سنتے ہی معظم حسین تین منٹ کے اندر باہر آگیا۔ اس کے چند روز کے بعد دو بدمعاشوں نے اس وقت میری کار پر فائرنگ کردی جب میں ایبٹ آباد سے واپس آرہا تھا۔ فائرنگ کے نتیجے میں میں اسٹیئرنگ پر قابو نہ رکھ سکا اور گاڑی کھڈ میں گرگئی۔ میرے ساتھ ذوالفقار نامی ایک اجنبی بھی موجود تھا۔ میں گاڑی سے باہر گرگیا مگر ذوالفقار علی گاڑی کے اندر جل کر کوئلہ ہوگیا۔ چونکہ اس کی لاش ناقابلِ شناخت ہوچکی تھی۔ اس لیے اسے میری لاش سمجھ کر دفنا دیا گیا۔ میں اس حادثے کی وجہ سے اپنی یادداشت کھو بیٹھا۔ کچھ نیک دل دیہاتیوں نے مجھے اسپتال میں داخل کردیا جہاں طویل عرصے تک میرا علاج ہوتا رہا۔ مجھے یقین ہے کہ میری کار پر معظم حسین نے حملہ کرایا تھا۔"

شملا گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ ایک قاتل کی بیوی ہونا خاصا اذیت ناک احساس تھا۔ اس نے سوچا کہ اس احساس کے بعد وہ معظم حسین کے ساتھ نارمل زندگی نہیں گزار سکے گی۔

"شملا تمہارے شوہر کا یہ جرم چھپا ہوا نہیں رہ سکتا۔" افتخار نے مزید کہا۔ "اگر قدرت کی مدد میرے شاملِ حال نہ ہوتی تو میری ہڈیاں اس وقت واقعی کسی قبر میں پڑی سڑ رہی ہوتیں۔ میں اس شخص کو کیفرِ کردار تک پہنچائے بغیر دم نہیں لوں گا۔ اب یہ فیصلہ کرنا تمہارا کام ہے کہ تم ایک قاتل کی بیوی کہلوانا پسند کرتی ہو یا اس سے چھٹکارا پانا چاہتی ہو۔"

"چھٹکارا پانے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ کیا میں اس سے طلاق لے کر گھر بیٹھ جاؤں؟"

"ایسا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے معظم حسین اور قصر شنگراف کے بارے میں بہت اہم معلومات حاصل کی ہیں۔ یہ معلومات ہمارے بہت کام آسکتی ہیں۔ بشرطیکہ تم میرے ساتھ تعاون کرو۔"

شملا کو معلوم تھا کہ شوہر سے ناراضگی یا علیحدگی کی صورت میں اسے قصر شنگراف سے محروم ہونا پڑے گا۔ اس لیے وہ تعاون کے سلسلے میں بہت محتاط رہنا چاہتی تھی۔

"تم مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

افتخار اسے تفصیل سے ساری بات سمجھانے لگا۔

★ ★ ★

"خون کی موجوں میں موجو کی قضا لکھی ہے۔"

یہ وہ مصرع تھا جو معظم حسین کے شعور سے چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ اسے جتنا بھولنے کی کوشش کرتا وہ اتنا زیادہ اس کے تصور میں گونجنے لگتا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ تہ خانے میں کیا ہورہا تھا۔ وہ جنگلی بلا کس طرح تہ خانے میں گھس گیا تھا اور سفید لفافہ کس نے سیڑھیوں پر رکھا تھا؟ اور اگر وہ روح تھا تو گولی سے زخمی کیوں ہوا تھا اور اچانک کہاں غائب ہوگیا تھا؟

ان وحشت ناک خیالات کی وجہ سے وہ کئی روز صاحبِ فراش رہا اور تہ خانے کا رخ نہ کرسکا۔

تقریباً پندرہ دن کے بعد رات کے دو بجے شملا نے اسے جھنجوڑ کر جگایا اور سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔ "اٹھیں، اٹھیں۔ باہر سے کسی کے چلنے کی آواز آرہی ہے۔"

"کک..... کون ہے؟ کیا ہوا؟ کیا ہوا؟" معظم حسین نے ہڑبڑا کر کہا۔

شملا نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "آہستہ بولیں۔ باہر کوئی ہے۔"

معظم حسین اٹھ کر بیٹھ گیا اور سائیڈ ٹیبل کی دراز کھول کر ریوالور تلاش کرنے لگا۔ اس طرح اچانک اٹھائے جانے پر اس کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔

اس کی خواب گاہ بالا خانے پر تھی اور اس وقت آس پاس کوئی ملازم بھی نہیں تھا۔ معظم حسین نے ریوالور نکالا اور بیوی کے ہمراہ دروازے کی طرف بڑھا لیکن دروازے کے قریب پہنچ کر وہ رکا اور سرگوشی میں بولا۔ "اس طرح اچانک دروازہ کھولنا ٹھیک نہیں، پہلے کھڑکی سے باہر دیکھنا چاہیے۔"

وہ دروازے سے ہٹ کر کھڑکی کی طرف گیا اور پردہ ہٹا کر باہر نظر ڈالی۔ باہر ہر سو چاندنی پھیلی ہوئی تھی اور کھڑکی کے آس پاس کوئی متحرک شے نظر نہیں آرہی تھی۔

"باہر تو کوئی بھی نہیں ہے۔" معظم حسین نے کہا۔

"ہو سکتا ہے کہ مجھے وہم ہوا ہو۔" شہلا نے کہا۔ "میں نے کچھ ایسی آواز سنی تھی جیسے کوئی بھاری پرندہ پر پھڑپھڑا رہا ہو۔ آئیں باہر نکل کر بھی دیکھ لیتے ہیں' تاکہ تسلی ہو جائے۔"

اس نے معظم حسین کے بولنے سے قبل ہی دروازہ کھول دیا اور برآمدے میں نکل گئی۔ معظم حسین کو مجبوراً اس کی تقلید کرنی پڑی۔ برآمدہ انگریزی کے حرف ایل کی شکل کا تھا۔ دونوں ابھی چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ ایک ستون کی اوٹ میں حرکت دکھائی دی اور سفید چادر میں لپٹا ہوا ایک شخص برآمدے سے نکل کر چاندنی میں پہنچ گیا۔ اس کا چہرہ چاند کے سامنے تھا اور بہت واضح دکھائی دیتا تھا۔

وہ راجا افتخار تھا جو لٹھے کی سفید چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر معظم حسین کے بدن پر کپکپی طاری ہو گئی اور ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔ اگر شہلا اسے سہارا نہ دیتی تو وہ خود بھی گر جاتا۔

"کیا ہوا؟ کیا ہوا؟" شہلا نے پوچھا اور اسے سہارا دے کر جلدی سے خواب گاہ میں لے گئی۔

معظم حسین بستر پر لیٹ کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ کئی منٹوں کے بعد جب اس کی طبیعت سنبھلی تو اس نے اٹک اٹک کر کہا۔ "وہ... وہ... کون تھا؟ وہ... جو سفید چادر میں... لپٹا ہوا تھا۔"

"میں نے تو کسی کو نہیں دیکھا۔" شہلا انجان بنتے ہوئے بولی۔ "آپ کو یونہی وہم ہوا ہوگا۔"

"وہ... افتخار کی روح تھی۔ جلدی سے دروازہ بند کر دو۔ وہ... اندر آجائے گی...."

"آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔" شہلا نے کہا۔ "یہاں کوئی روح وغیرہ نہیں ہے۔ آپ آرام سے لیٹے رہیں۔ میں باہر دیکھ کر آتی ہوں۔"

"وہ... میرا ریوالور بھی باہر رہ گیا ہے۔"

"میں ریوالور بھی لے آتی ہوں۔" شہلا نے کہا اور اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی۔

"شہلو' میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے۔"

شہلا نے ملازمہ کو بلانے کے لیے گھنٹی بجائی اور باہر نکل گئی۔ معظم حسین نے اپنا سینہ پکڑ لیا اور بستر پر دائیں بائیں کروٹیں بدلنے لگا۔ اس کے چہرے پر تشنج کے آثار نمودار ہو گئے۔

تین منٹ کے بعد شہلا واپس آگئی۔ اس نے ہاتھ میں ریوالور پکڑا ہوا تھا۔ "باہر کوئی نہیں ہے۔" اس نے شوہر کی تکلیف کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "اور یہ آپ کا ریوالور بالکل خالی ہے۔ اس میں گولیاں نہیں ہیں۔"

"میرے دل کو کچھ...." معظم حسین نے کہنا شروع کیا۔

تب ہی باہر قدموں کی چاپ اُبھری اور ملازمہ کمرے میں داخل ہوئی۔ "بیگم صاحبہ' خیریت ہے؟" اس نے کہا۔

"صاحب کی طبیعت خراب ہے۔" شہلا نے کہا۔ "جلدی سے صندل کا شربت بنا لاؤ۔"

"ڈاکٹر...." معظم حسین نے بڑی مشکل سے کہا۔ "کسی ڈاکٹر کو فون کرو...."

"اس وقت رات کے سوا دو بجے ہیں۔" شہلا نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ویسے میں ڈاکٹر سکندر کو فون کرتی ہوں۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ صندل کے شربت سے آپ کو سکون ملے گا۔"

اس نے فون کے پاس جا کر ایک نمبر ملایا اور کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد بولی۔ "دیکھیے' میں نواب معظم حسین کی بیگم بول رہی ہوں۔ میں آپ کو اس وقت جگانے پر معذرت چاہتی ہوں۔ دراصل نواب صاحب کی طبیعت بہت خراب ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے کہیں کہ وہ.... جس طرح بھی ممکن ہو۔ جی' کیا کہا' ڈاکٹر صاحب حسن ابدال گئے ہوئے ہیں....؟ اوہ' یہ تو بہت بُرا ہوا.... جی' انھیں ہارٹ ٹربل معلوم ہوتا ہے.... کون سی دوا....؟ میرا خیال ہے کہ یہ دوا میرے پاس ہوگی.... شکریہ' میں صبح پھر فون کروں گی۔" فون بند کرنے کے بعد وہ شوہر کی طرف مڑی۔ "ڈاکٹر سکندر حسن ابدال گئے ہوئے ہیں۔ ان کی بیوی نے ایک دوا تجویز کی ہے۔ وہ اتفاق سے گھر میں موجود ہے۔"

معظم حسین نے کروٹیں بدلنا موقوف کر دیا تھا اور آنکھیں بند کیے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ اپنی بیوی کی بات سُن رہا تھا یا نہیں۔

چند منٹوں کے بعد ملازمہ شربت بنا کر لے آئی۔ شہلا نے دراز سے ایک کیپسول نکالا اور ملازمہ سے بولی۔ "نواب صاحب کو سہارا دے کر بٹھاؤ' یہ دوا کھلانی ہے۔"

ملازمہ نے شربت کا گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور معظم حسین کو سہارا دے کر بٹھا دیا۔

"منہ کھولیں...." شہلا نے کہا "یہ کیپسول کھا لیں۔"

معظم حسین نے نیم وا آنکھوں سے بیوی کی طرف دیکھا پھر پوچھا۔ "ڈاکٹر آ گیا؟"

"جی ہاں' یہ دوا کھا لیں۔ ذرا منہ کھولیں...."

معظم حسین نے آنکھیں بند کر لیں اور منہ کھول دیا۔ شہلا نے اس کے منہ میں کیپسول ڈالا اور پھر شربت کا گلاس ہونٹوں سے لگا دیا۔ بولی۔ "یہ شربت بھی پی لیں' صبح تک آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔"

معظم حسین نے مشکل سے چند گھونٹ شربت کے پیے۔ کچھ شربت اس کے منہ کے کناروں سے بہہ کر قمیص اور بستر کی چادر پر گرا۔ ملازمہ نے نیپکن سے اس کا منہ صاف کیا اور اسے لٹا کر چادر

ٹھیک کردی۔

"بیگم صاحبہ' یہ شربت واپس لے جاؤں؟" اس نے پوچھا

"نہیں' ادھر ہی رہنے دو۔" شہلا نے کہا۔ "شاید رات کو ضرورت پڑ جائے۔" پھر وہ ملازمہ کے ساتھ برآمدے تک گئی اور رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔ "نیچے سب ٹھیک ہے نا؟ کوئی اور ملازم تو نہیں جاگا؟"

"جب میں شربت لینے واپس گئی تھی جہاں زیب خان ڈرائیور بھی پریشان کھڑا تھا۔" ملازمہ نے جواب دیا۔ "مجھے دیکھ کر پوچھنے لگا۔ کیا بات ہے؟ نواب صاحب تو خیریت سے ہیں؟ میں نے جواب دیا۔ ہاں' خیریت سے ہیں۔ تم جاکر اپنا کام کرو۔ بیگم صاحبہ نے شربت منگوایا ہے۔ اس کو نواب صاحب کی زیادہ ہی فکر لگی رہتی ہے۔"

"اس کا بندوبست بھی کرنا پڑے گا۔" شہلا نے کہا۔ "یہ نواب صاحب کا زیادہ ہی وفادار بننے کی کوشش کرتا ہے۔"

★ ★ ★

اگلی صبح معظم حسین دیر تک سوتا رہا۔

گیارہ بجے شہلا نے ڈاکٹر سکندر کو فون کیا اور رابطہ ملنے کے بعد کہا۔ "ڈاکٹر صاحب' میں شہلا بول رہی ہوں۔ نواب صاحب کی حالت بہت خراب ہے۔ آپ فوراً یہاں پہنچیں۔"

ڈاکٹر سکندر' شہلا کا فیملی ڈاکٹر تھا۔ وہ نصف گھنٹے کے اندر قصر شگراف پہنچ گیا۔ شہلا نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور رسمی کلمات کے بعد کہا۔ "نواب صاحب کی طبیعت رات کے دو بجے خراب ہوئی تھی۔ وہ اسی وقت آپ کو بلوانا چاہتے تھے' مگر میں نے آپ کو بے آرام کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس کے لیے مجھے تھوڑا سا جھوٹ بولنا پڑا تھا۔ اگر وہ اس بارے میں پوچھیں تو آپ ذرا خیال رکھیں۔"

ڈاکٹر سکندر نے بھویں سکیڑیں۔ نواب معظم حسین ان لوگوں میں سے تھا جن کے لئے وہ اپنی نیند خراب کر سکتا تھا۔

"نواب صاحب کو تکلیف کیا تھی؟" اس نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ نواب صاحب فریب نظر کا شکار ہوتے جا رہے ہیں۔ گزشتہ رات ایک اجنبی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ وہ آواز کسی پرندے کی پھڑپھڑاہٹ سے ملتی جلتی تھی۔ میں نے گھبراہٹ میں نواب صاحب کو جگا دیا۔ حالانکہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ نواب صاحب نے اپنا ریوالور نکال لیا اور ہم دونوں پتا کرنے باہر نکلے۔ اچانک نواب صاحب کے ہاتھ سے ریوالور گر گیا اور وہ بری طرح کانپنے لگے۔ میں انہیں سہارا دے کر اندر لے گئی اور بستر پر لٹا دیا۔ ان کا اصرار تھا کہ انہوں نے چاندنی میں ایک بھٹکی ہوئی روح کو دیکھا ہے۔ حالانکہ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس فریب نظر کی وجہ سے ان پر گھبراہٹ طاری ہو گئی تھی۔"

"آپ نے ان کو کوئی دوا دی تھی؟"

"جی ہاں ایک تھالاویٹ کیپسول دیا تھا۔"

ڈاکٹر نے گہرا سانس لیا۔ "اس وقت نواب صاحب کہاں ہیں؟"

"اوپر اپنے بیڈ روم میں ہیں۔" شہلا نے کہا اور ڈاکٹر کو اوپر لے گئی۔

معظم حسین چند منٹ پہلے بیدار ہوا تھا اور بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر کمزوری اور خوف کے آثار نمایاں تھے۔

"ہیلو' نواب صاحب...." ڈاکٹر نے خوش دلی سے کہا۔ "آپ تو بالکل ٹھیک ٹھاک نظر آرہے ہیں۔ آپ کی بیگم آپ کے بارے میں فکر مند ہو رہی ہیں۔ کیسی طبیعت ہے آپ کی؟"

"اس وقت ہم کچھ بہتر محسوس کر رہے ہیں۔" معظم حسین نے کہا اور کہنی کے سہارے اٹھنے کی کوشش کی۔

شہلا ایک فرض شناس بیوی کی طرح آگے بڑھی اور شوہر کو سہارا دے کر بیٹھنے میں مدد کی پھر اس کی کمر کے پیچھے چند تکیے رکھنے لگی۔

"نواب صاحب' آپ بہت خوش قسمت ہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "آپ کو بیوی بڑی خدمت گزار ملی ہے۔"

"جی ہاں' ہم اللہ کا ہر وقت شکر ادا کرتے رہتے ہیں۔" معظم حسین نے کہا۔ "شہلا بیگم ہمارا بڑا خیال رکھتی ہیں۔"

ڈاکٹر بیڈ کے قریب کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا اور اپنے بیگ سے مختلف آلات نکالنے لگا۔ سب سے پہلے اس نے بلڈ پریشر چیک کیا اور بولا۔ "آپ کا بی پی بہت لو ہے۔"

"اس وقت ہم بہت کمزوری اور گھبراہٹ محسوس کر رہے ہیں۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ غالباً آپ نے ابھی تک ناشتہ نہیں کیا۔" ڈاکٹر سکندر نے کہا۔ پھر شہلا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ان کے لیے چکن سوپ اور ہلکا سا ناشتہ تیار کروا کے لے آئیں۔ ان کو بیماری وغیرہ کوئی نہیں ہے۔ صرف بے خوابی اور غذا کی کمی کی شکایت ہے۔" پھر وہ معظم حسین کی طرف مڑا۔ "رات کو آپ کتنے بجے سوئے تھے؟"

"تقریباً.... ساڑھے بارہ بجے۔"

"کیا آپ روزانہ اسی وقت سوتے ہیں؟"

"کبھی کبھی اس سے بھی زیادہ دیر ہو جاتی ہے۔" جواب شہلا بیگم نے دیا۔

"رات کو عموماً مہمان آجاتے ہیں۔" معظم حسین نے کہا۔

"اس وجہ سے دیر ہو جاتی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ کھانا بھی دیر سے کھاتے ہوں گے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "آپ کو یہ معمول تبدیل کرنا پڑے گا۔ رات کو دیر سے کھانا اور دیر سے سونا' دونوں ہی صحت کے لیے خطرناک ہیں۔"

شملا نے دیکھا کہ بات چیت بے ضرر قسم کی ہو رہی ہے تو وہ ناشتا تیار کروانے کے لیے نیچے چلی گئی۔

اس کے جاتے ہی ڈاکٹر سکندر نے رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔ "نواب صاحب' رات کو کیا ہوا تھا؟"

"بیگم نے رات کو دو بجے ہمیں جگا دیا اور کہا کہ ان کو باہر سے کوئی آواز سنائی دی تھی۔ ہم نے دراز سے ریوالور نکالا اور بیگم کے ہمراہ باہر نکلے۔ وہاں ہم نے سفید کپڑے میں لپٹے ہوئے ایک ایسے شخص کو دیکھا جو کافی عرصے پہلے فوت ہو گیا تھا لیکن بیگم کا کہنا ہے کہ انہوں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس منظر سے ہمارا کیا حال ہوا ہو گا۔ جیسے ہی ہم کمرے میں واپس آئے ہم پر ہارٹ اٹیک ہو گیا لیکن بیگم ہماری بات کو مذاق سمجھتی رہیں اور انہوں نے طبی امداد کے سلسلے میں کوئی کوشش نہیں کی۔ اللہ کو ہماری زندگی منظور تھی اس لیے ہم بچ گئے ورنہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔"

ڈاکٹر سکندر نے بڑے غور سے ساری بات سنی' پھر پوچھا۔ "جس شخص کو... یا جس شخص کی روح آپ نے دیکھی تھی اس کا نام کیا تھا؟"

معظم حسین نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ "ہم اس شخص کے صرف صورت آشنا تھے۔ ہمیں اس کا نام نہیں معلوم۔"

"بیگم صاحبہ نے آپ کو کوئی دوا بھی کھلائی تھی؟"

"انہوں نے آپ کی بیگم کے مشورے پر ایک کیپسول کھلایا تھا اور شربتِ صندل بھی پلایا تھا۔"

"کیپسول کون سا تھا؟"

"ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ سائیڈ ٹیبل کی دراز میں کچھ دوائیں رکھی ہیں۔ انہوں نے شاید وہیں سے کیپسول نکالا تھا۔"

ڈاکٹر نے دراز کھول کر دوائیں چیک کیں۔ ان میں دو قسم کے کیپسول تھے مگر وہ کیپسول نہیں تھے جن کا شملا نے ذکر کیا تھا۔

ڈاکٹر نے معظم حسین کا مزید معائنہ کرنے کے بعد پوچھا۔ "آپ کا یہاں پر کوئی قریبی رشتے دار بھی ہے؟"

"قریبی رشتے دار تو کوئی نہیں ہے۔ یہاں پر بیگم ہی ہماری قریبی رشتے دار ہیں۔" معظم حسین نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر نے وہ سوال فکرمندی سے کیا تھا۔ "لیکن ہم آپ کے سوال کا مقصد نہیں سمجھے۔"

ڈاکٹر نے دروازے کی طرف دیکھا اور رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "نواب صاحب' ممکن ہے کہ میری بات آپ کو اچھی نہ لگے لیکن میں آپ کو ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔ آپ بہت بڑی جائیداد کے مالک ہیں اور... آپ کی وفات کے بعد شملا بیگم ہی آپ کی جائیداد کی وارث قرار پائیں گی۔ اس لیے آپ کو بہت محتاط رہنا چاہیے۔"

"جی...!"

"بات یہ ہے کہ دولت بہت سی برائیوں کو جنم دیتی ہے۔ دولت کے ساتھ بے شمار خطرات لگے ہوئے ہیں۔ دولت کی وجہ سے بعض اوقات سگی اولاد بھی باپ کی موت کی تمنا کرنے لگتی ہے۔ شملا بیگم اگرچہ آپ کی بیوی ہیں لیکن شادی سے پہلے وہ آپ کے لیے مکمل اجنبی تھیں پھر ان کی عمر بھی آپ سے بہت کم ہے۔ میں ان کی وفاداری پر شبہ نہیں کر رہا' صرف امکانات کی بات کر رہا ہوں۔ آپ کے ساتھ کوئی ایسا رشتے دار ضرور ہونا چاہیے جو آپ کی سلامتی اور آپ کے مفادات کا خیال رکھنے والا ہو۔ دوسرا مشورہ میں آپ کو یہ دوں گا کہ اپنی تمام دوائیں تالے چابی میں رکھیں اور صرف ڈاکٹر کی تجویز کردہ دوا ہی استعمال کریں۔ کسی اور کے ہاتھ سے نہ کوئی شربت پئیں اور نہ کوئی دوا کھائیں۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ اپنے آپ کو کمزور ظاہر نہ کریں۔ جب آدمی کمزور ہو جاتا ہے تو اس کے اپنے اس پر غالب آجایا کرتے ہیں اور اسے اپنی مرضی کے مطابق چلانا شروع کر دیتے ہیں۔"

"ہم آپ کے مشوروں پر عمل کرنے کی کوشش کریں گے۔ دراصل..... کچھ عرصے سے ہمیں بعض عجیب و غریب واقعات پیش آرہے ہیں جن کی وجہ سے ہمارے اعصاب بری طرح متاثر ہوئے ہیں۔"

"کیسے عجیب و غریب واقعات؟"

معظم حسین کھل کر ساری بات نہیں بتانا چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ "ایک تو یہی رات والا واقعہ تھا۔ اس سے پہلے تہ خانے میں ایک جنگلی بلا گھس گیا تھا۔ اس نے اچانک مجھ پر حملہ کر دیا لیکن میں بال بال بچ گیا' اس کے علاوہ کچھ دھمکی آمیز خط بھی ملے تھے۔"

"آپ کے خیال میں ان واقعات کے پیچھے کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

"جو شخص بھی یہ حرکت کر رہا ہے وہ اپنے مقصد میں بہت سنجیدہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ آپ کو اعصابی اور نفسیاتی طور پر کمزور کرنا چاہتا ہے۔ گزشتہ رات جو دل کا دورہ آپ کو پڑا ہے وہ آپ کے دشمن کی مرضی کے عین مطابق ہے۔ دوسرا اور تیسرا دورہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ آپ اپنے اعصاب کو مضبوط رکھیں اور ان باتوں سے اثر نہ لیں۔ ایک کام یہ کریں کہ کم از کم ایک مہینے کے لیے کسی پُرفضا مقام پر چلے جائیں۔"

تب ہی برآمدے میں قدموں کی چاپ ابھری اور شملا کمرے میں داخل ہوئی۔

ڈاکٹر سکندر نے چالاکی سے بات آگے بڑھائی۔ "......اور بیگم صاحبہ کو بھی ساتھ لے جائیں۔ جگہ بدلنے سے بھی صحت پر اچھا اثر پڑتا ہے۔"

شملا نے کہا۔ "مرگ شیر سے زیادہ پُرفضا مقام اور کون سا ہو گا!"

"یہ محض ایک تجویز ہے۔ آپ آپس میں مشورہ کرلیں۔" ڈاکٹر نے اپنے بیگ سے سرنج اور انجکشن نکالتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کو ایک انجکشن لگا دیتا ہوں۔ اس کے علاوہ آپ کو کسی اور دوا کی ضرورت نہیں ہے۔ کل میں دوبارہ آپ کا معائنہ کرنے آؤں گا۔"

اس نے معظم حسین کو انجکشن لگایا اور اپنی چیزیں بیگ میں رکھنے لگا۔

★ ★ ★

معظم حسین کو اپنی نوجوان بیوی کی بعض باتوں پر پہلے ہی شک تھا لیکن اس نے سنجیدگی سے اس طرف توجہ نہیں کی تھی۔ اب ڈاکٹر سکندر کی باتوں نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔

دو روز کے بعد اس نے اچانک مختصر سا سامان پیک کیا اور اسلام آباد چلا گیا۔ بیوی سے اس نے یہی کہا کہ وہ بعض قانونی معاملات نمٹانے کے لیے لاہور جارہا ہے۔

اسلام آباد پہنچ کر وہ میڈیکل چیک اپ کے لیے ایک اسپتال میں داخل ہوگیا۔ ڈاکٹروں نے اس کے مختلف ٹیسٹ کروائے اور اسے صحت مند رہنے کے لیے بعض مشورے دیے کیونکہ دوسرے ہارٹ اٹیک کا خطرہ موجود تھا۔

معظم حسین ایک ہفتہ اسپتال میں گزارنے کے بعد ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں منتقل ہوگیا۔ جہاں اس نے تین ہفتے قیام کیا۔

جب وہ قصرِ شنگراف واپس پہنچا تو اس کی صحت پہلے سے بہتر تھی اور اعصابی تناؤ بھی ختم ہوچکا تھا۔

دوسرے دن اس نے اپنے ڈرائیور رحمان زیب خان کے ساتھ تہ خانے کا معائنہ کیا اور دیکھا کہ وہاں کوئی خطرے کی بات نہیں تھی۔ تاہم یہ بات ہنوز پردۂ راز میں تھی کہ جنگلی بلا کیسے تہ خانے میں داخل ہوا تھا اور زخمی ہونے کے بعد کہاں غائب ہوگیا تھا۔

اس کے بعد اس نے ہر دوسرے دن تہ خانے میں جانا شروع کردیا اور اپنی بیوی کے معمولات پر بھی نظر رکھنی شروع کردی۔ ڈاکٹر سکندر کی باتوں سے وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ بیوی پر اندھا اعتماد ٹھیک نہیں تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ شہلا اس کے نئے رویے پر خوش نہیں تھی۔ تاہم اس نے کوئی شکایت بھی نہیں کی تھی۔

چند روز کے بعد وہ ڈاکٹر سکندر کے مشورے پر اعصابی تھکن اور گھبراہٹ کا بہانہ کرکے بستر پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد شہلا اس کے لیے صندل کا شربت بنا کر لے آئی۔ دراصل ڈاکٹر سکندر یہ چیک کرنا چاہتا تھا کہ شربتِ صندل کے نام پر اسے کیا چیز پلائی جاتی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ ہم اپنی چابیاں نیچے ڈرائنگ روم میں بھول آئے ہیں۔" معظم حسین نے اپنی بیوی کو باہر بھیجنے کے لیے بہانہ بنایا۔ "انہیں جا کر لے آنا۔"

شہلا نے شربت کا گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔ "میں دیکھتی ہوں۔ آپ یہ شربت پی لیں۔"

معظم حسین کراہتا ہوا اٹھا اور گلاس ہاتھ میں پکڑ لیا پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "ہمارا خیال ہے کہ شربت کے ساتھ وٹامن کی ایک گولی بھی مناسب رہے گی لیکن الماری کو تالا لگا ہوا ہے اور دوائیں الماری کے اندر ہیں۔"

شہلا چابیاں لانے کے لیے کمرے سے باہر نکل گئی۔ معظم حسین نے چند سیکنڈ انتظار کیا پھر جلدی سے اُٹھا' الماری کھول کر اندر سے ایک خالی بوتل نکالی اور سارا شربت اس کے اندر ڈال دیا۔ الماری کے اندر ایک دوسری بوتل موجود تھی جس میں اصلی شربتِ صندل تھا۔ معظم حسین نے باتھ روم میں جاکر گلاس کو کھنگالا اور اس میں اصلی شربتِ صندل ڈال کر اسے میز پر رکھ دیا۔

اسے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ شہلا کھڑکی کے شیشے سے اس کی یہ کارروائی دیکھ رہی تھی۔ اس نے الماری بند کردی اور دوبارہ بستر پر جالیٹا۔

شہلا کھڑکی سے ہٹ کر نیچے چلی گئی۔ ڈرائنگ روم میں چابیاں موجود نہیں تھیں۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور واپس جا کر شوہر کو اطلاع دی کہ چابیاں نہیں ملیں۔

"شاید ہم بھول رہے ہیں۔ ہم نے چابیاں کہیں اور رکھ دی ہیں۔" معظم حسین نے کہا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "چلیے ایسے ہی شربت پی لیتے ہیں۔" اس نے گلاس اٹھالیا اور آہستہ آہستہ شربت پینے لگا۔

★ ★ ★

شام کے وقت جب معظم حسین مہمانوں کے ساتھ مصروف تھا' شہلا نے افتخار کو فون کیا اور رابطہ ملنے کے بعد کہا۔ "افتخار کچھ گڑبڑ ہوگئی ہے۔"

"کیا ہوا؟" افتخار نے جلدی سے پوچھا۔

"معظم حسین کو شربتِ صندل کے بارے میں شک ہوگیا ہے۔ آج وہ کمزوری کا بہانہ کرکے بستر پر لیٹ گیا اور میں اس کے لیے شربت بنا کر لے گئی تو اس نے مجھے چابیاں تلاش کرنے کے لیے نیچے جانے کے لیے کہا لیکن میں نے کمرے سے نکل کر کھڑکی کے شیشے سے اندر دیکھا۔ معظم حسین نے الماری کھول کر اندر سے ایک خالی بوتل نکالی اور شربت اس میں ڈال لیا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ وہ شربت کو لیبارٹری میں ٹیسٹ کروانا چاہتا ہے۔ ہمیں آج ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ تم ایسا کرو کہ...... تھوڑا سا سلوف معظم حسین کی کافی میں ملا دو اور رات کے بارہ بجے مجھے تہ خانے میں ملو۔"

قصرِ شنگراف جس کسی نے بھی تعمیر کروایا تھا۔ اس نے تہ خانے میں فرار کا ایک راستہ رکھا ہوا تھا جو قریبی جنگل میں کھلتا تھا۔ افتخار کو اتفاق سے وہ راستہ معلوم ہوگیا تھا۔ صحت مند ہونے کے بعد وہ کسی کی نظر میں آئے بغیر مرگ شیر پہنچا تھا اور قصرِ

شگراف کے شمال میں واقع ایک متروک کھنڈر نما مکان میں ڈیرا ڈال دیا تھا۔ وہ معظم حسین سے انتقام لینا چاہتا تھا اور رات کے وقت قصر شگراف کے ارد گرد منڈلاتا رہتا تھا۔ اس دوران اسے یہ خفیہ راستہ نظر آیا جو گھنی جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے اوپر پھیلے ہوئے پتے اور جھاڑ جھنکاڑ کو ہٹا کر دیکھا تو نیچے ایک فرشی دروازہ نمودار ہو گیا۔ وہ بظاہر بوسیدہ سا دروازہ مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ نیچے ایک سات فٹ اونچی اور ڈھائی فٹ چوڑی سرنگ تھی جو قصر شگراف کے تہ خانے تک جاتی تھی۔ اس کے اختتام پر ایک دیواری الماری بنی ہوئی تھی اور بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ آگے جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

لیکن افتخار اس تاریکی میں مختلف طریقے آزماتا رہا اور بالآخر دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔ دیواری الماری دروازے کی طرح کھل گئی تھی۔ سطحی نظر سے یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ الماری دروازے کی طرح کھل سکتی تھی اور اس کے پیچھے کوئی سرنگ موجود تھی۔

افتخار نے جنگلی بلا اسی سرنگ کے ذریعے تہ خانے میں پہنچایا تھا جب بلا زخمی حالت میں اوپر پہنچا اور کمروں سے ہوتا ہوا باہر نکلا تو شہلا نے اپنی خاص ملازمہ راحیلہ سے کہا کہ وہ فوراً خون کے دھبے صاف کر دے اور کسی سے اس بات کا ذکر نہ کرے۔ اس طریقے سے وہ اپنے شوہر کو خوفزدہ کرنا چاہتی تھی اور اس مقصد میں خاصی کامیاب رہی تھی۔ تاہم اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ نادانستہ طور پر افتخار کی مدد کر رہی تھی۔

★ ★ ★

رات کے پچھلے پہر معظم حسین کی آنکھ کھل گئی۔ فوری طور پر اسے دو باتوں کا اندازہ ہوا۔ اول یہ کہ اس کا چہرہ پانی سے بھیگا ہوا تھا اور دوم یہ کہ اس پر زبردست غنودگی طاری تھی اور اس کے لیے آنکھیں کھولنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کے اعصاب سخت مضمحل تھے اور وہ سو جانا چاہتا تھا۔ لہٰذا اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ تب ہی اسے احساس ہوا کہ وہ اپنی خواب گاہ میں نہیں تھا بلکہ کسی سخت جگہ پر لیٹا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھوں سے ٹٹول کر محسوس کیا کہ وہ فرش پر لیٹا ہوا تھا اور اس کے نیچے ایک پتلا سا گدا بچھا ہوا تھا۔

اس کے بدن میں خوف کی سرد لہر سرایت کر گئی اور وہ اپنی قوتِ ارادی کو بروئے کار لاتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ تب اس نے اندازہ لگایا کہ وہ تہ خانے میں تھا۔ اس کے سامنے دو موم بتیاں جل رہی تھیں۔ ایک دائیں طرف تھی اور ایک بائیں طرف۔ ان کی مدھم روشنی ماحول کو پُراسرار بنا رہی تھی۔

ان موم بتیوں کے وسط میں ایک تابوت رکھا تھا۔ اچانک اس تابوت کا ڈھکنا اوپر اٹھنا شروع ہو گیا۔ ڈھکنے کو دو ہاتھوں نے تھام رکھا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر معظم حسین پر سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر اس ڈھکنے کو دیکھ رہا تھا جو رفتہ رفتہ عمودی شکل اختیار کر رہا تھا۔ اب ہاتھوں کے پیچھے دو بازو بھی نظر آ رہے تھے۔ ان پر سفید کپڑا لپٹا ہوا تھا مگر ان بازوؤں کا مالک نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ تابوت کے کھلے ڈھکنے کے پیچھے تھا۔ تہ خانے میں کافور کی بو بھی پھیل گئی تھی۔ عجیب و غریب موسیقی کی مدھم آواز بھی سنائی دینے لگی تھی۔ معظم حسین کے بدن سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ سب کچھ حقیقت تھا یا وہ خواب دیکھ رہا تھا۔

چند لمحوں کے بعد تابوت کا ڈھکنا ایک طرف ہو گیا اور کفن میں لپٹا ہوا ایک شخص سامنے آ گیا۔ وہ سر سے پیر تک لٹھے کی چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کا صرف چہرہ نمایاں تھا۔ وہ تابوت سے نکل کر آگے بڑھا اور معظم حسین کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔

تب معظم حسین نے دیکھا کہ وہ راجا افتخار تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے گونج دار آواز میں کہا۔ "خون کی موجوں میں موجو کی قضا لکھی ہے۔ موجو، میرے قاتل، میں اپنے وعدے کے مطابق دوبارہ یہاں آ گیا ہوں۔ قدرت نے آج تمہیں میرے بس میں کر دیا ہے۔ میں تمہیں لینے آیا ہوں..... یہ تابوت تمہارے جسمِ فانی کے لیے ہے۔ تمہاری روح میرے ساتھ جائے گی۔ اگر تمہاری کوئی آخری خواہش ہو تو بتا دو۔"

معظم حسین نے بڑی مشکل سے کہا۔ "مم... مجھ پر رحم کرو۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔"

"کیوں.....؟" کفن پوش نے پوچھا۔

"میں نے یہ سب کچھ آخری عمر کے عیش و آرام کے لیے کیا تھا۔ ابھی تو میری..... اس نئی اور..... عزت والی زندگی کے دو سال بھی پورے نہیں ہوئے۔ اگر میں اس حال میں مر گیا تو میرے لیے یہ بڑے گھاٹے کا سودا ہو گا۔"

"کون سا گھاٹے والا سودا؟"

"یہ بہت لمبی بات ہے۔" معظم حسین نے عاجزی سے کہا۔ باتیں کرنے سے اس کی دہشت کم ہو رہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ جب تک بات چیت کا سلسلہ جاری رہے گا تب تک اس کی جان بچی رہے گی۔

"میں سچ سننا چاہتا ہوں۔" افتخار نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "تمہارا اقرارِ جرم سننا چاہتا ہوں۔ آج تمہاری چالاکی کام نہیں آئے گی۔"

"ٹھیک ہے..... میں سچ بولوں گا۔ مجھ پر صرف ایک مہربانی کرو۔ مجھے مارو نہیں، زندہ رہنے دو۔ میں تمہارے وارثوں کو خون بہا دینے پر تیار ہوں۔ جتنی رقم تم کہو گے اتنی ادا کر دوں گا۔"

"اس کا فیصلہ بعد میں کیا جائے گا۔ تمہارا اقراری بیان سننے کے بعد یہ دیکھا جائے گا کہ تم کس حد تک ہمدردی کے مستحق ہو۔"

معظم حسین کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ اس کی بیوی ایک تاریک گوشے میں ٹیپ ریکارڈر لیے بیٹھی تھی۔ اس نے ٹیپ ریکارڈر کا مائیکروفون معظم حسین کے تکیے کے قریب رکھا تھا۔

★ ★ ★

معظم حسین نے رقت آمیز لہجے میں اپنا بیان شروع کرتے ہوئے کہا کہ وہ کسی نواب خاندان کا فرد نہیں تھا۔ اس کی سات پشتوں میں کوئی نواب نہیں تھا۔ پچیس سال قبل اس نے ایک معمولی کلرک کی حیثیت سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا لیکن جو پوسٹ اسے ملی تھی وہ بڑی غیر معمولی تھی۔ وہاں رشوت کی آمدنی بہت زیادہ تھی۔ اس کا اصل نام ماجد علی عرف موجو تھا۔ جس پوسٹ پر اس کی تقرری ہوئی تھی وہاں زیادہ دنوں تک کوئی نہیں ٹک سکتا تھا کیونکہ اس پوسٹ کے لیے بڑے جوڑ توڑ چلتے رہتے تھے لیکن ماجد علی بہت ہوشیار اور چلتا پرزہ نوجوان تھا۔ اس نے نیچے سے لے کر اوپر تک تمام افسروں کو رشوت میں سے حصہ پہنچانا شروع کردیا۔ اس کے علاوہ اس نے افسروں کی بیگمات سے بھی روابط قائم کرلیے اور ان کی شادی غمی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کردیا۔ یہاں تک کہ اس نے افسروں کے مسئلے بھی حل کرنے شروع کردیے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ہر بڑے افسر کو حصہ پہنچاتا تھا اور ان کی بیگمات کو تحفے دیتا رہتا تھا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اس سیٹ پر پکا ہوگیا۔ افسروں نے سوچا کہ جب وہ ان کے ساتھ ٹھیک چل رہا ہے تو اسے ٹرانسفر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ دفتر کا دیگر عملہ بھی اس سے دب کر رہتا تھا۔ ان کو پتا تھا کہ افسر اس کی بہت سنتے تھے اور اس کا کہا نہیں ٹالتے تھے۔

ٹھیکیداروں اور سپلائروں کو بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ موجو کی مرضی کے بغیر کوئی ٹینڈر منظور نہیں ہوسکتا۔ اس لیے وہ اس کا خاص خیال رکھتے تھے اور پوری "ایمان داری" سے رشوت کی رقم پہنچادیتے تھے۔

ماجد علی عرف موجو شادی شدہ اور صاحبِ اولاد تھا۔ اس کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ ملازمت کے پانچویں سال اس نے اپنی بیوی مختار بیگم کے نام سے دو سو چالیس گز کا بنگلہ خرید لیا۔ رشوت کی آمدنی بے تحاشا تھی اور گھر میں ہر قسم کا عیش و آرام تھا۔ تاہم بعض چیزوں کے بارے میں وہ قدرے محتاط تھا۔ ایک دفعہ اس نے نئی گاڑی خریدنے کا ارادہ کیا تو اس کے افسر نے اسے روک دیا۔

"موجو' زیادہ پھیلنے کی کوشش نہ کرو۔" افسر نے کہا۔ "ورنہ دھر لیے جاؤ گے۔ گاڑی مت خریدو۔ تنخواہ کے حساب سے تو تم موٹر سائیکل بھی نہیں خرید سکتے۔"

"سر' وہ...... بچوں کو بڑی پریشانی ہوتی ہے۔" ماجد علی نے کہا۔ "میں بیوی کے نام سے گاڑی خریدوں گا۔"

"تمہاری بیوی کون سی نواب خاندان کی فرد ہے۔ اس کے ماں باپ کے پاس کون سی جائیداد ہے' جس کی آڑ میں تم گاڑی خریدو گے! فی الحال کھاؤ پیو خوب لیکن نظر آنے والی چیزوں سے پرہیز کرو۔"

ماجد نے گاڑی خریدنے کا ارادہ ترک کردیا۔ کچھ عرصے کے بعد حکومت کی تبدیلی کے ساتھ ہی رشوت خور افسروں کی جائیدادوں کا سروے شروع ہوگیا اور کئی افسر چھری تلے آگئے۔ تب ماجد علی نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے نئی کار نہیں خریدی تھی اور اپنی شان و شوکت میں بھی اضافہ نہیں کیا تھا۔ ایک ہمدرد کے مشورے پر اس نے ایک اسٹیٹ ایجنسی بنالی اور اس کی آڑ میں جائیداد خریدنا شروع کردی۔ جہاں کوئی چانس کا سودا نظر آتا وہ فوراً موقع سے فائدہ اٹھاتا۔ اس طرح اس نے رشوت کی دولت کو جائیداد کی خرید و فروخت میں لگا دیا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے ایک نہایت ایماندار منیجر مل گیا تھا جو ناجائز آمدنی کا ایک پیسہ بھی اپنے اوپر خرچ کرنا گناہ سمجھتا تھا۔

جب ماجد علی کی ریٹائرمنٹ کا وقت قریب آیا تو اس کی دولت میں کئی گنا اضافہ ہوچکا تھا لیکن دوسری طرف اس کی اولاد سرکش ہوچکی تھی۔ ان کے اندر جدید دور کی تمام برائیاں جمع ہوچکی تھیں لیکن ماجد علی کو ان کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اس کا اپنا مسئلہ کچھ اور ہی تھا۔

وہ اپنے ماحول میں ایک رشوت خور کلرک کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا۔ کچھ لوگ بظاہر اس کی عزت کرتے تھے مگر ان کی نظروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دل سے اس کی عزت نہیں کرتے۔

ماجد علی کا دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ اس کی بیوی مختار بیگم بوڑھی اور بے کشش ہوچکی تھی۔ مرغن غذائیں کھانے کی وجہ سے اس کا جسم بے تحاشا پھیل چکا تھا۔ ماجد علی کسی شوخ حسینہ کو اپنی شریکِ حیات بنانا چاہتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ وہ دولت کے بل پر ایسا کرسکتا ہے۔

غرضیکہ وہ اپنی بقیہ زندگی نوابی شان و شوکت سے گزارنا چاہتا تھا۔ ایک شاندار محل' حسین بیوی اور روسا کے شہر میں بلند مرتبہ!

اس نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی اور آہستہ آہستہ اپنی جائیداد فروخت کرنا شروع کردی۔ تقریباً ایک سال کے اندر اس کے پاس ساڑھے چھ کروڑ روپے سے زیادہ رقم جمع ہوگئی۔ یہ رقم نئی زندگی شروع کرنے کے لیے بہت تھی۔ پھر اس نے ملک کے پُرفضا مقامات کا سروے شروع کیا اور بالآخر مرگ شیر کو اپنی مستقل سکونت کے لیے پسند کرلیا۔

ایک شوہر نے ڈاکٹر کو اپنی بیوی کے بارے میں بتایا "سر! میری بیوی کے حلق سے کافی دنوں سے کوئی آواز نہیں نکل رہی۔ کوئی ایسی دوا تجویز کریں کہ وہ باتیں کرنے لگے۔"

ڈاکٹر نے کہا "بہت آسان ترکیب ہے' آج ہی رات اپنی کسی گرل فرینڈ کو لے کر گھر چلے جایئے۔"

وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔ محل نما رہائش گاہ، حسین بیوی اور روسائے شہر کی رفاقت بھی میسر آگئی تھی لیکن دو باتیں غلط ہو گئیں۔ شہلا کا منگیتر اس کے پیچھے لگ گیا اور اس کا ایک دیرینہ دوست بشارت علی سیاحت کرنے اس علاقے میں آنکلا۔

اس نے اپنی ارضی جنت بچانے کے لیے دونوں کو نہایت صفائی سے قتل کر دیا۔ پہلے وہ بشارت علی کو سیر کے بہانے ایک ویران علاقے میں لے گیا اور موقع پا کر اسے کھڈ میں دھکا دے دیا پھر اس نے ایک ایکشن فلم کے ذریعے افتخار کو حادثے سے دوچار کر دیا۔ اس نے دونوں قتل اتنی ذہانت سے کیے تھے کہ اس پر گرفت نہیں کی جا سکتی تھی لیکن اچانک ہی بعض پُراسرار واقعات رونما ہونے لگے اور سارا کھیل بگڑنا شروع ہو گیا۔

★ ★ ★

افتخار نے لٹھے کی چادر اُتار کر ایک طرف رکھ دی اور تہ خانے کی بتی روشن کر دی۔ چادر کے نیچے اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔

"وہ... اوہ!" ماجد علی عرف موجو معظم حسین نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "ک... کیا تم روح نہیں ہو؟ کیا تم واقعی زندہ ہو؟ وہ... وہ جلی ہوئی لاش کس کی تھی؟"

"موجو، وہ لاش ایک بے گناہ مسافر کی تھی جس نے مجھ سے لفٹ لی تھی۔" افتخار نے کہا۔ "خدا کے فضل سے میں بچ گیا تھا لیکن میری یادداشت کھو گئی تھی۔ میں ایک سال تک دھکے کھاتا رہا اور بہت تکلیفیں اُٹھائیں۔" اس نے تاریک گوشے کی طرف دیکھ کر آواز لگائی۔ "شہلا، ٹیپ ریکارڈر لے آؤ۔ آج اس رشوت خور کلرک کا یومِ حساب ہے۔"

ماجد علی نے گھوم کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور کمزور سی آواز میں بولا۔ "شہلا، میں نے تمہارے ساتھ تو کوئی زیادتی نہیں کی۔ تمہیں تو میں نے دنیا بھر کی نعمتیں اور آسائشیں دے رکھی ہیں..."

"تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔" شہلا نے تلخی سے کہا۔ "مجھ سے اپنی اصلیت چھپائی اور اپنے بیوی بچوں کے بارے میں جھوٹ بولا۔ کیا یہ معمولی بات ہے؟"

"ماجد علی گرفتار ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ!" افتخار نے کہا۔ "ہم نے تمہارا اقراری بیان ریکارڈ کر لیا ہے۔ ذوالفقار علی اور بشارت علی کے ورثا تمہیں پھانسی کے پھندے پر پہنچا کر ہی دم لیں گے۔"

ماجد علی نے اچانک اپنا سینہ پکڑ لیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

"اسے کیا ہوا ہے؟" افتخار نے پوچھا۔

"شاید دوبارہ دل کا دورہ پڑا ہے۔" شہلا نے کہا۔ "اسے جلدی سے اوپر لے چلو۔ ڈاکٹر کو بلانا پڑے گا۔"

افتخار نے ماجد علی کو کندھے پر ڈالا اور اوپر خواب گاہ میں پہنچا دیا۔ اس وقت رات کے ڈھائی بجے تھے اور قصرِ شنگراف میں مکمل سناٹا چھایا ہوا تھا۔

"میں تہ خانے میں جا رہا ہوں۔" افتخار نے کہا۔ "تابوت اور دیگر چیزوں کو چھپانا پڑے گا۔"

"ٹھہرو، میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔" شہلا نے کہا۔ "تہ خانے کے دروازے کو تالا بھی تو لگانا ہے۔"

افتخار نے ماجد علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ تو شاید... مر گیا ہے۔"

"نہیں..." شہلا نے خوفزدہ نظروں سے اپنے بے حرکت شوہر کی طرف دیکھا۔

افتخار نے آگے بڑھ کر ماجد علی کی نبض دیکھی، آنکھیں چیک کیں اور ناک کے سامنے ہاتھ رکھ کر دیکھا۔

"یہ مر چکا ہے۔" اس نے کہا۔ "تم ایسا کرو کہ... اس وقت خاموشی سے سو جاؤ۔ صبح اُٹھ کر ڈاکٹر کو فون کرنا اور یہی ظاہر کرنا کہ رات کو تمہیں کچھ پتا نہیں چلا۔"

"مجھے ایک لاش کی موجودگی میں کبھی نیند نہیں آئے گی۔"

"اچھی طرح سوچ لو۔ میرا اب یہاں رکنا مناسب نہیں۔" افتخار دروازے کی طرف بڑھا۔ "اگر کسی نے مجھے دیکھ لیا تو تمہاری پوزیشن خراب ہو جائے گی۔"

دونوں سیڑھیاں طے کر کے نیچے پہنچ گئے۔

افتخار تہ خانے کی سیڑھیوں کے پاس رکتے ہوئے بولا۔ "ایک بات اور میرے ذہن میں آئی ہے۔ تم یہ کیسٹ ڈاکٹر کو سنا دینا۔ اس سے کہنا کہ تمہارے شوہر نے ضمیر کی ملامت سے مجبور ہو کر اپنے جرم کا اقرار کر لیا تھا اور یہ کیسٹ اس کی خواہش پر ریکارڈ کی گئی تھی۔ بیان ریکارڈ کرانے کے فوراً بعد اس پر دل کا دورہ پڑا اور وہ جاں بحق ہو گیا۔"

شہلا کو یہ تجویز کچھ مناسب معلوم ہوئی لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس وقت اس کا دماغ ٹھیک کام نہیں کر رہا تھا۔

★ ★ ★

ڈاکٹر سکندر نے ماجد علی کا معائنہ کرنے کے بعد اس کی موت کی تصدیق کی اور یہ بھی تصدیق کر دی کہ موت کا سبب ہارٹ اٹیک ہی تھا۔ تاہم اس نے احتیاطاً پولیس کو بھی فون کر دیا کیونکہ ماجد علی نے پہلے ہارٹ اٹیک کے بعد قصرِ شنگراف میں وقوع پذیر ہونے والے بعض پُراسرار واقعات کا ذکر کیا تھا۔

پولیس انسپکٹر نے ڈاکٹر کا بیان سننے کے بعد شہلا بیگم پر جرح شروع کر دی۔

"دراصل میرے شوہر کے ذہن پر بہت بڑا بوجھ تھا۔" شہلا نے کہا۔ "جس کی وجہ سے وہ بہت پریشان رہتے تھے اور انہیں

عجیب عجیب چیزیں نظر آتی رہتی تھیں۔"

"کس چیز کا بوجھ؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"آپ کے سوال کا جواب اس کیسٹ میں موجود ہے۔" شہلا نے کیسٹ نکال کر سامنے رکھ دی۔ "میرے شوہر رات کو اس کیسٹ میں اپنا اقراری بیان ریکارڈ کر رہے تھے کہ ان پر دل کا دورہ پڑ گیا۔"

"کیا یہ کیسٹ انہوں نے آپ کے سامنے ریکارڈ کی تھی؟"

"جی ہاں۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ ضمیر کے بوجھ کو مزید برداشت نہیں کر سکتے۔ اس اقراری بیان کے مطابق ان کا نام ماجد علی عرف موجو تھا اور وہ دو آدمیوں کے قاتل تھے۔"

پولیس انسپکٹر نے ڈاکٹر سکندر اور دیگر لوگوں کی موجودگی میں اس کیسٹ کو سُنا۔

شہلا بیگم کو کیسٹ دیتے وقت اس بات کا بالکل خیال نہیں آیا کہ ماجد علی کی پہلی بیوی کو اس کے شوہر کی موت کی اطلاع پہنچا دی جائے گی۔

پانچ روز کے بعد ماجد علی کے تقریباً دو درجن لواحقین قصرِ شنگراف پہنچ گئے۔ ان میں ماجد علی کی پہلی بیوی مختار بیگم اور چاروں بچے بھی شامل تھے۔ بڑے بیٹے کا نام واجد علی تھا۔ وہ چھبیس ستائیس سال کا تند مزاج اور قوی الجثہ نوجوان تھا۔ اس نے مرگ شیر کہتے ہی عدالت میں ایک درخواست دائر کر دی۔ اس درخواست میں اس نے شہلا بیگم پر اپنے باپ کے قتل کا الزام عائد کرتے ہوئے یہ استدعا کی تھی کہ اس کے باپ کی لاش کا قبر سے نکال کر پوسٹ مارٹم کروایا جائے۔

دوسرے دن اس نے شہلا بیگم کو قصرِ شنگراف سے بے دخل کر دیا اور اس کے تمام ملازموں کی بھی چھٹی کر دی۔

شہلا نے تھانے میں رپورٹ درج کرانے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ پولیس نے رپورٹ درج کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ واضح طور پر واجد علی نے پولیس کو بھاری رشوت دے کر پہلے ہی اپنی حمایت میں کر لیا تھا۔

شہلا کو مجبوراً عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔ چونکہ معاملہ ہنگامی نوعیت کا تھا اس لیے عدالت نے ایک ہفتے کی تاریخ مقرر کرتے ہوئے واجد علی کے نام سمن جاری کر دیا۔

مقررہ تاریخ پر جب عدالت کی کارروائی شروع ہوئی تو واجد علی کے وکیل نے کہا۔ "جنابِ عالی، مدعیہ نے اپنے عرضِ دعویٰ میں جو مؤقف اختیار کیا ہے وہ غلط فہمی پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ میرے مؤکل اور اس کے مرحوم باپ کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے جس کا عرضِ دعویٰ میں ذکر کیا گیا ہے۔"

جج نے پوچھا۔ "کیا آپ کے پاس اپنی بات کا کوئی ثبوت بھی ہے؟"

"جی ہاں، جنابِ عالی ثبوت موجود ہے۔" وکیل صفائی نے کہا۔ "ثبوت پیش کرنے سے پہلے میں مدعیہ سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔"

جج نے سوال کرنے کی اجازت دے دی۔

وکیل صفائی نے شہلا بیگم سے مخاطب ہو کر کہا۔ "محترمہ آپ نے اپنی درخواست میں یہ مؤقف اختیار کیا ہے کہ آپ کے مرحوم شوہر نے اپنی زندگی میں قصرِ شنگراف آپ کے نام کر دیا تھا اور اس سلسلے میں آپ نے ایک اہم قانونی کاغذ بھی عدالت میں پیش کیا ہے۔ کیا آپ اس عدالت کو اپنے شوہر کا نام بتانا پسند کریں گی؟"

"میرے مرحوم شوہر کا نام...." شہلا نے تامل کرتے ہوئے کہا۔ "نواب معظم حسین تھا۔"

"کیا آپ عدالت میں کوئی ایسی دستاویز پیش کر سکتی ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ قصرِ شنگراف کے مالک نواب معظم حسین ہی تھے؟"

شہلا کو متذبذب دیکھ کر اس کے وکیل نے کہا۔ "جنابِ عالی مدعا علیہ اور اس کے حواریوں نے میری مؤکلہ کو جبراً قصرِ شنگراف سے بے دخل کر دیا ہے جس کی وجہ سے اسے کاغذات نکالنے کا موقع نہیں مل سکا۔ میں عدالت سے استدعا کروں گا کہ ان ناجائز قابضین کو قصرِ شنگراف سے نکال کر میری مؤکلہ کا قبضہ بحال کیا جائے۔"

"وکیل صاحب، میں نے آپ کی مؤکلہ سے ثبوت طلب کیا تھا مگر آپ دوسری طرف نکل گئے۔" وکیل صفائی نے کہا۔ "میرے پاس اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ قصرِ شنگراف کا مالک نواب معظم حسین نہیں تھا۔ یہ دیکھیے....." اس نے ایک قانونی کاغذ جج کے سامنے رکھا اور ویسا ہی ایک کاغذ وکیلِ استغاثہ کو دیا۔ "یہ سیل ڈیڈ کی مصدقہ فوٹو کاپیاں ہیں۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس سیل ڈیڈ کی رو سے نواب معظم حسین نامی کوئی شخص قصرِ شنگراف کا مالک نہیں ہے۔"

جج نے سیل ڈیڈ پر نظر ڈالنے کے بعد کہا۔ "یہ ماجد علی کون ہے؟"

"یہ میرے مؤکل کا باپ تھا اور یہی قصرِ شنگراف کا مالک تھا۔"

"جنابِ عالی، یہ شخص یہاں معظم حسین کے نام سے مشہور تھا۔" وکیل استغاثہ نے کہا۔

تب ہی شہلا کو یاد آیا کہ ماجد علی کے اقرارِ جرم والی کیسٹ پولیس انسپکٹر اپنے ساتھ لے گیا تھا اور غالباً بھاری رقم کے عوض واجد علی کو دے دی تھی۔

عدالت نے دونوں طرف کے دلائل سُن کر کیس خارج کر دیا۔

شہلا بیگم سوچنے لگیں کہ شاید زندہ نواب معظم حسین اس کے لیے زیادہ بہتر اور فائدہ مند تھا۔

انسانی حقوق کے چیمپئن امریکہ بہادر کی ایک بیٹی کے رنگ ڈھنگ کا ماجرا سرورق کا دوسرا رنگ

غلام قادر

مغرب کا سورج

اُس مسافر کی کہانی جو اپنی منزل کا راستہ بھول بیٹھا تھا۔ اُس نے آوارگی ہی کو مقصدِ حیات سمجھ لیا تھا۔ وہ راستے میں ملنے والے ہر راہی کے ساتھ یہ سوچ کر چل پڑتا کہ شاید وہ اُسے اُس کی منزل تک پہنچا دے۔ یہ ہم سفری نت نئے گل کھلاتی رہی اور بالآخر وہ موڑ آ گیا جب دو راستوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ضروری ہو گیا تھا۔
پاکستان میں بیٹھ کر امریکا کے خواب دیکھنے والے نوجوانوں کے لیے ایک چشم کشا تحریر جسے مصنف نے کمال مہارت سے ایک ایسا آئینہ بنا دیا ہے جو ہر چہرے کے لیے روشن ہے ــــ اس کے لیے بھی جس کی آنکھیں طلوعِ مغرب سے خیرہ ہیں اور اس کے لیے بھی جو غروبِ مشرق کا نوحہ خواں ہے۔

ایک پاکستانی مسلمان کی امریکا یاترا کا احوال، وہ بظاہر اپنے ماضی سے کٹ گیا تھا

اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا آئے ہوئے اسے ابھی ایک مہینہ بھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ لیزا اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ اس کی زندگی میں اس طرح داخل ہوئی کہ آہستہ آہستہ اس کی پوری زندگی اسی ایک دائرے میں گھومنے لگی۔

"ہیلو۔" لیزا نے پہلی ملاقات میں تعارف حاصل کرنے کے لیے پہلا لفظ وہی استعمال کیا تھا جو ہر امریکن اس شخص سے تعارف حاصل کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے جس سے اس کی واقفیت نہیں ہوتی۔

"ہیلو۔" اس نے اپنی مصروفیت سے سر اٹھا کر اس کے جواب میں کہا اور پھر بغور اسے دیکھنے لگا۔

وہ دونوں اس وقت کالج کینٹین میں تھے اور اپنے ایشیائی نقوش کی بنا پر ممتاز نظر آنے والا اپنے سامنے موجود چیزوں کو بڑی تیزی کے ساتھ اس لیے اپنے معدے میں منتقل کر رہا تھا کہ اگلی کلاس شروع ہونے میں بہت تھوڑا وقت باقی بچا تھا۔ صبح فلیٹ سے چلتے ہوئے اس روز بھی وہ صرف چائے ہی پی سکا تھا اور اب بھوک ان حدوں کو چھونے لگی تھی جب چوہے پیٹ میں اچھل کود کرنے لگتے ہیں اور اچھلتے کودتے ان چوہوں کے ساتھ وہ پوری دلجمعی کے ساتھ کلاس میں شرکت نہیں کر سکتا تھا۔

"اگر آپ بُرا نہ مانیں تو کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟" لیزا نے اپنے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی ٹرے کو میز پر رکھتے ہوئے کہا تھا۔ اجازت تو اس نے رسماً اور تکلفاً ہی مانگی تھی ورنہ ٹرے رکھنے کے ساتھ ہی وہ بیٹھنے کے لیے کرسی کھینچ بھی چکی تھی۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔" اس نے جواب میں کہا تھا لیکن فقرہ مکمل ہونے تک وہ اس کے سامنے بیٹھ بھی چکی تھی۔ جیسے اسے اس بات کا یقین ہو کہ یہ ایشیائی اسے انکار کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔

"میں لیزا ہوں۔" اس نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا تھا "بلکہ لیزا ہاروے تھامسن ہوں۔" لیزا نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا تھا اور امریکی روایات کے مطابق اب اس ایشیائی کو اپنا تعارف کروانا تھا۔

"میں سیف ہوں۔" اس نے بھی اپنے تعارف کا آغاز ایک جوابی مسکراہٹ سے کیا تھا "بلکہ سیف اللہ خالد ہوں۔" تعارف کا اختتام بھی اس نے اسی کے انداز میں کیا تو لیزا کے چہرے پر بھی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی نیلی آنکھوں میں ایک نئی چمک پیدا ہو گئی اور اس سے سیف نے اندازہ لگایا کہ لیزا کو اس کی یہ شوخی بُری محسوس نہیں ہوئی تھی۔

"تمہارے اس جوابی فقرے کا یہ اسٹائل بتا رہا ہے کہ تم اچھے دوست ثابت ہو سکتے ہو۔" اس کے اگلے ہی فقرے نے سیف کے شبہات کی تصدیق کر دی تھی۔

"یہ تو آنے والا وقت ہی بتا سکے گا اور وہ بھی اس صورت میں کہ اگر ہم آئندہ بھی ملتے رہے۔" اس کی جانب سے حوصلہ افزائی ہوئی تھی اس لیے سیف نے ایک اور شوخ فقرہ اس کی جانب لڑھکایا تھا۔

"کیا کوئی ایسی وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہم آئندہ نہ مل سکیں؟" پیدائشی امریکی اس پاکستانی انداز کے مذاق کو سمجھ نہیں سکی تھی۔

"بہت سی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ مثلاً ایک وجہ تو یہی ہو سکتی ہے کہ اگلی ملاقات سے پہلے ہی میرا ایکسیڈنٹ ہو جائے اور میں ملنے کے قابل ہی نہ رہوں۔"

وہ سیف کے اس خوفناک مذاق کو پوری طرح سہار نہ سکی اور اسے ایسی نظروں سے دیکھنے لگی جیسے وہ کسی پاگل سے تعارف حاصل کرنے کی غلطی تو نہیں کر بیٹھی لیکن ادھورے فقرے کے

مکمل ہوتے ہی اس کی کھوئی ہوئی مسکراہٹ دوبارہ لوٹ چکی تھی۔

"دوبارہ نہ ملنے کی دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ تم اس بات پر ناراض ہو جاؤ کہ میں تمہاری خوبصورت رفاقت چھوڑ کر اپنی کلاس اٹینڈ کرنے چلا جاؤں۔" سیف نے اپنی خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ فقرہ مکمل کیا تھا۔

"اچھا تو کل بھی تم کینٹین سے اچانک اسی لیے غائب ہو گئے تھے کہ تمہیں کلاس میں جانا تھا۔" لیزا نے اس کی بتائی ہوئی دونوں وجوہ پر اظہارِ خیال کرنے کے بجائے ایک بالکل مختلف بات کی تھی۔

"کل بھی سے کیا مراد ہے....؟" سیف پوری طرح اس کا مطلب سمجھ نہیں سکا تھا۔

"میں کل ہی تم سے مل لیتی کیونکہ کل بھی میں نے تمہیں دیکھا تھا، لیکن جب تک میں کاؤنٹر سے فارغ ہوتی، تم اپنی سیٹ سے غائب ہو چکے تھے۔"

وہ اب اس 'کل بھی' کا مطلب اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ اس نے سوچا تو یہ محترمہ گزشتہ چوبیس گھنٹوں سے ملاقات کی متمنی ہیں لیکن زبان سے جو فقرہ ادا کیا وہ کچھ اور تھا۔

"میں بھی کتنا بدقسمت ہوں کہ ایک خوبصورت لڑکی مجھ سے ملنا چاہ رہی تھی اور مجھے خبر ہی نہیں تھی۔" اس کے جملے کی ساخت کے ساتھ ساتھ لہجے میں بھی تاسف تھا لیکن یہ سب کچھ اس نے جان بوجھ کر اتنا بناوٹی رکھا تھا کہ لیزا کو احساس رہے کہ یہ مصنوعی فقرہ ہے جو دل کی گہرائیوں سے ادا نہیں ہوا ہے۔

"میں بھی اسی کالج میں ہوں اور جرنلزم پڑھ رہی ہوں۔" لیزا نے اپنے تعارف کا سلسلہ آگے بڑھانا چاہا تھا لیکن سیف نے اسے درمیان میں ہی روک دیا۔

"میرے خیال سے یہ تمام باتیں لنچ کی میز پر ہوں تو زیادہ بہتر ہے۔" اس کے ہونٹوں سے لنچ کا ذکر سن کر وہ حیران بھی ہوئی تھی کیونکہ دوپہر کے کھانے کے وقت میں ابھی کافی وقت تھا اور وہ اس

کی بات کو فوری طور پر سمجھ بھی نہیں سکی تھی کہ وہ دراصل کہنا کیا چاہ رہا تھا۔

"جب تک لنچ بریک ہوگا تب تک میں اپنی کلاس سے فارغ بھی ہو جاؤں گا اور یوں ہماری وہ دوسری ملاقات ہو جائے گی اور جب دوسری ملاقات ہوگی تو پھر یقیناً تیسری بھی ہوگی اور پھر یوں ہم دوست بن جائیں گے اور شاید تمہارا وہ اندیشہ بھی درست ہی ثابت ہو کہ میں اچھا دوست ثابت ہوں لیکن اس کے لیے تمہیں اتنا انتظار کرنا پڑے گا کہ میں اپنی اس کلاس سے فارغ ہو جاؤں' یہ البتہ میرا وعدہ ہے کہ کلاس سے فارغ ہوتے ہی سیدھا یہیں آؤں گا۔" وہ اپنا طویل فقرہ ایک سانس میں ادا کرتا چلا گیا تھا اور لیزا اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں حیرت لیے اسے دیکھتی رہی تھی۔

"او..... کے....." اس نے امریکیوں کے مخصوص انداز میں شانے اُچکاتے ہوئے کہا تھا۔ "میں تمہاری دلچسپ گفتگو سننے کے لیے اتنا انتظار کرلوں گی۔" اور اس کے ساتھ ہی سیف ہلکے پلاسٹک کے گلاس میں بچی ہوئی چائے کا آخری گھونٹ لیتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھ گیا تھا۔

"واپسی پر اگر تم سے ملاقات نہیں ہوئی تو میں شاید خودکشی تو نہ کروں لیکن تمام زندگی خود کو برا بھلا ضرور کہتا رہوں گا کہ ایک بوڑھے' بے ہنگم اور گنجے شخص سے ملنے کے لیے میں نے نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں والی ایک خوبصورت لڑکی کو بس کر دیا۔" اس نے چلتے چلتے وہ فقرہ ادا کیا تھا جسے دنیا کی کوئی بھی عورت سن کر خوشی خوشی اس کا انتظار کرسکتی تھی۔ البتہ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پوری توانائی کے ساتھ موجود تھی کہ فاصلوں کے بڑھنے سے انتظار کا وقفہ کم سے کم تر ہوتا چلا جاتا تھا۔ جنوبی ایشیا کی لڑکی کے لیے یہ ڈوز اگر زندگی بھر کے لیے نہیں تو سال دو سال کے لیے ضرور کافی تھا لیکن اس حقیقت کے باوجود فاصلے اتنے زیادہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ امریکی لڑکی دو گھنٹے بھی انتظار نہ کرتی۔

"کس گنجے بوڑھے سے ملنے جا رہے ہو؟" اس کے چہرے پر ایک بار پھر حیرت ابھر آئی تھی۔

"مسٹر الفریڈ....." اس نے جواب دیا۔ "میرے وہ استاد جن کی میں کلاس اٹینڈ کرنے جا رہا ہوں۔" اور اس کے ساتھ ہی لیزا نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا تھا۔

"ویٹس گریٹ۔" اس نے ہنستے ہوئے امریکیوں کے انداز میں ہاتھ اٹھا کر داد دی تھی "لیکن فکر نہ کرو' یہ نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں والی لڑکی تمہاری اس بوڑھے سے ملاقات ختم ہونے کا انتظار کرے گی۔"

سیف کے لیے وہ کوئی بہت انوکھا فقرہ نہیں تھا۔ اپنے ملک میں اس سے ملتے جلتے فقرے نہ جانے کتنی ہی لڑکیاں اس کے لیے چپکے چپکے استعمال کر چکی تھیں لیکن ایک نئے ملک میں اس کے کانوں نے یہ فقرہ پہلی بار سنا تھا۔ یہ البتہ دو بڑا عظموں میں موجود معاشرتی فرق تھا کہ اس طرح کا کوئی فقرہ بہ آواز بلند ادا کیا گیا ہو۔ ماحول کے فرق نے جہاں زندگی کے اور بہت سے معمولات تبدیل کر دیے تھے وہیں اس فقرے کی ادائیگی میں بھی فرق آگیا تھا۔ جس ماحول سے وہ اٹھ کر آیا تھا وہاں یہی فقرہ تنہائی میں بھی اتنی بلند آواز اور آہنگ کے ساتھ نہیں بولا جاتا تھا لیکن یہاں کی تو بات ہی نرالی تھی۔ وہاں تو کسی بات کو چھپانے کا رواج بھی نہیں تھا جو کچھ بھی تھا وہ سب کے سامنے تھا اور کوئی شخص بھی اس پر توجہ دینے کے لیے تیار نہیں تھا کیونکہ اس کے خیال میں وہ سب کچھ اس کا ذاتی معاملہ ہے جو یہ کام کر رہا ہے اور کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی دوسرے کے ذاتی معاملات میں مداخلت کرے۔

اپنے انہی بکھرے بکھرے خیالات کے ساتھ سیف کلاس روم تک پہنچا تھا لیکن وہاں مسٹر الفریڈ کی ناسازیٔ طبع کے باعث کلاس ملتوی ہونے کا نوٹس اس کا منتظر تھا۔ سیف جیسے مجھے ہوئے شخص کی جگہ کوئی بھی دوسرا شخص ہوتا تو وہ اس سنہرے موقعے کو قدرت کی تائید گردانتے ہوئے کینٹین کی جانب دوڑ لگاتا لیکن اس نے وہ سب کچھ کرنے سے احتراز کیا جو کوئی بھی ایک عام آدمی کر سکتا تھا۔ اسے واپسی کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ اس لیے نہیں کہ اس کا انتظار کرنے والی لڑکی کوئی عام سی لڑکی تھی یا اس کے لیے لیزا کی وہ حیثیت نہیں تھی جو ایک مرد کے لیے کسی بھی خوبصورت لڑکی کی ہو سکتی ہے لیکن اس کی تمام تر جاذبیت اور اہمیت کے باوجود سیف اسے یہ احساس نہیں دلانا چاہتا تھا کہ خود وہ بھی اس سے ملنے کے لیے بے چین ہے۔ عورت کے بارے میں اس کے تجربے نے اسے یہی سکھلایا تھا کہ دولت اور عورت میں یہی فرق ہے کہ دولت اس کے ہاتھ آتی ہے جو اس کے پیچھے بھاگتا ہے اور عورت اس کے پیچھے بھاگتی ہے جو اس سے مصنوعی ہی سہی' اجتناب برتتا ہے۔

مسٹر الفریڈ کے نہ آنے کے باوجود سیف نے وہ وقت کلاس روم میں انڈیا سے آئی ہوئی ارادھنا پانڈے کے ساتھ خوش گپیوں میں گزارا تھا۔ ان کی گفتگو ایک روز پہلے کی کلاس کے نوٹس سے شروع ہوئی اور سیاسی حالات سے ہوتی ہوئی ایک دوسرے کے خاندانوں کے تعارف تک پہنچ گئی تھی اور یہ شاید ارادھنا کا پسندیدہ ترین موضوع تھا کیونکہ ان دونوں کے درمیان مذاکرات کی گاڑی وقت ختم ہونے کے باوجود اسی اسٹیشن پر رکی رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس بات کا فیصلہ کرنا اس کے لیے مشکل ہو گیا تھا کہ وہ ہر نئے ملنے والے سے اپنے باپ کے کاروبار کا اتنی ہی تفصیل سے تعارف کرواتی ہے یا یہ نظرِ کرم صرف اسی پر تھی۔

لیزا کی طرح پہل اس بار بھی ارادھنا کی جانب سے ہی ہوئی تھی لیکن ان دونوں میں فرق یہ تھا کہ ارادھنا کلاس فیلو ہونے کے باوجود پہلے روز سے پیش قدمی کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے اس بات کا انتظار کرتی رہی کہ کب سیف اس کی جانب متوجہ ہوتا ہے

لیکن کلاس روم میں ہونے والی اس ہلکی پھلکی "ہائے" اور "ہاؤ آر یو" کے علاوہ ان دونوں کے درمیان اس روز تک محض چند رسمی جملوں کا تبادلہ ہی ہوا تھا اور شاید اس روز بھی نہ ہوتا اگر سیف کے پاس اتنا وقت نہ ہوتا جسے اگر وہ خالص انگریزی زبان میں کہتا تو اس کا ترجمہ 'وقت کو قتل کرنے کے مفہوم میں نکلتا۔

"تم یہاں سے کہاں جاؤ گے؟" ارادھنا نے اسے رخصت ہونے پر کمربستہ دیکھ کر کہا۔

"ایک دوست سے ملوں گا پھر اس کے بعد جاب پر جاؤں گا جہاں سے فارغ ہو کر گھر۔" سیف نے سرسری طور پر اپنا شیڈول بتایا تھا اور یہ کوئی ایسا غلط بھی نہیں تھا۔

"اگر تم پسند کرو تو میں تمہیں راستے میں ڈراپ کر سکتی ہوں۔" اس نے اپنی امارت کے اظہار کا ایک اور زریں موقع ضائع نہیں ہونے دیا تھا۔

"ہم دونوں موٹر سائیکل پر جائیں گے۔" اس نے جھوٹ سے وہی کام لینے کا فیصلہ کیا جو سچ سے نہیں ہو سکتا تھا۔ "میرا دوست بھی یہیں اسی کالج میں ہے اور اس کے پاس موٹر سائیکل ہے اور یوں بھی ہمارا روزانہ کا ساتھ ہے۔" سیف بڑی صفائی سے جھوٹ پر جھوٹ بول رہا تھا اور وہ اس کے ہر جھوٹ کا یقین کر رہی تھی۔

"چلو تو پھر کل ملاقات ہو گی۔" اسے اپنے ارادے میں مصمم دیکھ کر آخر کار ارادھنا نے بھی اپنی سیٹ چھوڑ دی تھی۔

سیف کوریڈور میں آتے ہی اس سے رخصت ہو گیا۔ ان دونوں کی اس روز کی وہ آخری کلاس تھی' اس لیے اس سے رخصت ہوتے ہی ارادھنا پارکنگ لاٹ کی طرف چلی گئی جبکہ سیف کا رخ اس جانب تھا جہاں سے ایک طویل چکر کاٹ کر کینٹین تک پہنچتا تھا۔ وہ ارادھنا کو یہ تاثر نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ کینٹین کی جانب جا رہا ہے کیونکہ ایک روز پہلے کا لیکچر ہانکنے کے بعد اس نے فوراً ہی کینٹین چلنے کی پیشکش کی تھی جسے اس نے یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ وہاں تو اتنا شور ہو گا کہ گفتگو بھی نہیں ہو سکے گی اس لیے بہتر یہی ہے کہ یہیں بیٹھیں مگر صرف چند منٹ لیکچر پر بات کرنے کے بعد اس نے موضوع تبدیل کر دیا تھا۔ پہلے اس نے وہ بات کہی تھی جس سے وہ اتفاق نہیں کر سکا جس پر اس نے سیف کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی لیکن سیف کے رویے میں جارحیت دیکھ کر اس نے مزید بحث میں الجھنے سے احتراز کیا تھا اور گفتگو کو گھما کر اپنے خاندان کی شان و شوکت کے بارے میں بتانے لگی تھی اور یہی موضوع اختتام تک رہا تھا اور سیف کو شبہ تھا کہ اگلی ملاقات پر یہ سلسلہ وہیں سے دوبارہ شروع ہو گا جہاں سے منقطع ہوا تھا لیکن وہ اس کے باوجود اس سے تعلقات خراب کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ارادھنا اس کے لیے وہ چھتری بھی ثابت ہو سکتی تھی جو تیز دھوپ اور بارش میں کسی بھی شخص کو موسم کی چیرہ دستیوں سے اپنی بساط بھر بچانے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ ایک امیر باپ کی بیٹی تھی اور پہلی ہی ملاقات میں اس بات کا اندازہ بھی ہو گیا کہ کسی حد تک مائل بہ کرم بھی تھی' اب اگر وہ اس سے اپنے تعلقات خراب کر بھی لیتا تب بھی ارادھنا کو کوئی فرق نہ پڑتا بلکہ نقصان سیف کا ہی تھا۔

ارادھنا سے تعلقات خراب نہ کرنے کی کوششوں کی پہلی قسط سیف کو اس طرح ادا کرنی پڑی تھی کہ ایک طویل چکر کاٹ کر اسے کینٹین تک پہنچنا پڑا تھا کیونکہ پارکنگ لاٹ جہاں ارادھنا کی گاڑی کھڑی تھی اور کالج کینٹین آمنے سامنے تھے اور سیف یہ خطرہ کسی صورت میں بھی مول لینا نہیں چاہتا تھا کہ ارادھنا اسے کینٹین میں جاتا ہوا دیکھے اور پہلے ہی مرحلے پر اس کے ذہن میں اس کا تاثر ایک جھوٹے اور ناقابل اعتماد شخص کا بنے۔

ارادھنا کے اعتماد کو بحال رکھنے کی کوشش میں اسے ایک طویل چکر کاٹ کر اب اس دروازے سے کینٹین میں داخل ہونا تھا جو باہر میدان کی جانب تھا۔ واپسی کا سفر اس نے اس ایک بات پر غور کرتے ہوئے طے کیا تھا کہ آخر بھارت کا ہر شہری اپنی پہلی ہی ملاقات میں یہ تاثر دینے کی کوشش کیوں کرتا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان دو علیحدہ علیحدہ ملک نہیں ہیں بلکہ ایک ہی ملک ہے جسے کچھ سیاستدانوں کی نادانیوں نے تقسیم کر دیا ہے اور آج بھی دونوں ممالک میں مسائل کے جو انبار لگے ہیں ان کی وجہ کوئی اور نہیں بلکہ صرف اتنی سی ہے کہ ملک تقسیم ہو گیا ہے اور یہ کہ اگر ہندوستان تقسیم نہ ہوتا اور آج بھی اکھنڈ بھارت ہوتا تو کماڑی سے لے کر راس کماری تک دودھ اور شہد کی نہریں بہہ رہی ہوتیں۔

ارادھنا اور سیف اللہ کے درمیان گفتگو کا آغاز بھی اسی ایک نقطے سے ہوا تھا۔ اپنے پیشروؤں کی طرح ارادھنا نے بھی ابتدا انہی روایتی جملوں سے کی تھی۔

"اپنے دیس سے دور اگر اپنے ہی وطن کا کوئی شخص نظر آ جائے تو ایک انجانی سی خوشی ہوتی ہے' تمہیں دیکھ کر مجھے بھی ایسی ہی خوشی ہوئی تھی۔" ارادھنا نے کونین کی گولی پر شکر کا ملمع چڑھاتے ہوئے کہا تھا۔

"تمہارے پاسپورٹ کا رنگ نیلا ہے جبکہ میرا پاسپورٹ سبز رنگ کا ہے پھر ہم دونوں ایک وطن کے باشندے کس طرح ہوئے؟" سیف کے سوال نے بڑے خوبصورت انداز میں گیند دوبارہ ارادھنا کے کورٹ میں ڈال دی تھی۔

"کچھ پرانے لوگوں کی غلطیوں نے ہی تو ہمیں آج یہ دن دیکھنے پر مجبور کر دیا ہے کہ ہم الگ الگ پاسپورٹ پر یہاں موجود ہیں ورنہ تو ہمارا کلچر ایک ہے' ہمارا رہن سہن ایک ہے' ہمارا لباس ایک ہے' یہاں تک کہ ہماری تہذیب بھی ایک ہے۔" وہ اور بھی شاید کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن سیف اللہ کے چہرے پر بکھرتے ہوئے تاثرات سے اسے رک جانے کا اشارہ ملا تھا۔

"ہو سکتا ہے تمہارے بڑوں سے کوئی غلطی ہوئی ہو لیکن جہاں

تک ہمارا تعلق ہے ہم یہ نہیں سمجھتے کہ ہمارے بڑوں نے کوئی ایسا کام کیا ہو جس پر ہم شرمندہ ہوں بلکہ ہم تو بڑے فخر سے ان کا ذکر کرتے ہیں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں تلخی اُمنڈ آئی تھی۔ ارادھنا کو اس کی جانب سے اتنے سخت جواب کی توقع نہیں تھی' خود سیف اللہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ کسی بھی بھارتی ہندو کی طرح ارادھنا کے خیالات میں بھی تبدیلی نہیں لائی جاسکتی۔ اس نے منہ توڑ جواب دینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ "جہاں تک تہذیب' کلچر اور رہن سہن کی بات ہے تو اس میں بھی زمین آسمان کا فرق ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم مذہب کی بنیادوں پر تقسیم کو جائز سمجھتے ہو؟" ارادھنا نے اس کے مزید کچھ کہنے سے قبل ہی کہہ دیا۔

"اس لیے صحیح سمجھتا ہوں کہ جب برسوں نہیں بلکہ صدیوں تک ساتھ رہنے کے باوجود مجھے چھونے سے تمہارا دھرم بھرشٹ ہونے لگے تو پھر بہتر ہے کہ ہم الگ ہی رہیں۔" سیف اللہ نے اس کے نیم طنزیہ سوال کا جواب بھی اسی کے انداز میں دیا تھا۔

"وہ تو سب پرانی باتیں تھیں' آج کل کے زمانے میں کون ان باتوں کو تسلیم کرتا ہے۔" ارادھنا نے کاندھے اُچکاتے ہوئے ٹالنے والے انداز میں کہا تھا۔

"اس طرح سے کہیں تم یہ کہنے کی کوشش تو نہیں کررہی ہو کہ ہندومت اتنا پرانا ہوچکا ہے کہ ماڈرن زمانے میں اس کے احکامات ماننے کی کوئی صورت ہی نظر نہیں آتی۔" سیف نے ایک ہلکا سا کچوکا دیا تو وہ تڑپ سی گئی۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا...." اس نے تڑپ کر بل کھانے والے انداز میں کہا تھا۔ "میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ بھارت کی نئی نسل سیکولرازم پر یقین رکھتی ہے بلکہ اب تو ہمارے یہاں ہندو مسلم شادیاں بھی ہورہی ہیں۔" ارادھنا نے اپنی بات کی وضاحت کرنی چاہی تھی۔

"اور ان شادیوں کے بعد ہندو مسلم فسادات بھی ہو رہے ہیں۔" سیف اللہ نے اس بار بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا لیکن ارادھنا اتنی معصوم بھی نہیں تھی کہ اس مسکراہٹ کے پیچھے چھپے طنز کو نہ سمجھ سکتی۔

"ہر نئی بات کو قبول کرنے میں معاشرہ جو وقت لیتا ہے وہی وقت بھارت کا معاشرہ بھی لے رہا ہے۔" ارادھنا نے اس طرح کہا تھا جیسے کوئی انہونی بات نہ ہو۔

"اکبر بادشاہ اور رانی جودھابائی کی شادی پر جو شادیانے بجائے گئے تھے' صدیوں بعد اب وہ کیوں بجائے جاتے....؟" سیف سے گفتگو میں جیتنا تو یوں بھی محال ہوتا تھا اور ارادھنا نے تو غلطی سے اس موضوع کو چھیڑ دیا تھا جس پر وہ پاکستان میں لاتعداد مباحثوں میں انعامات جیت چکا تھا۔

"تمہارے ساتھ جو بھی وقت کٹے گا' وہ یقیناً بہت اچھا کٹے گا۔ کیونکہ میری طرح تمہارا شمار بھی ان لوگوں میں کیا جاتا ہوگا جو آخر وقت تک ہتھیار پھینکنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔" ارادھنا نے بظاہر موضوع تبدیل کیا تھا لیکن سیف موضوع کی اس تبدیلی کو بہت اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

"تمہارے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اپنے بارے میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں کہ صرف دلیل کے ذریعے مجھ سے کسی بات کو تسلیم کروایا جاسکتا ہے اور جب میں کسی بات کا قائل ہوجاتا ہوں تو اس کا برملا اظہار بھی کرتا ہوں۔" ارادھنا نے اگرچہ اس وقت تک اپنے باپ کا ذکر نہیں کیا تھا لیکن اس کے باوجود بھی وہ اسے یہ رعایت دینے کے لیے تیار ہوگیا تھا کہ موضوع تبدیل کردیا جائے۔

"اچھا تو تم اور کس کس بات کے قائل ہو؟" ارادھنا نے اس سے بے تکلف ہونے کے لیے پیش قدمی والا انداز اختیار کیا تھا۔

"مثلاً میں اس بات کا کہ.... خوبصورتی اور عقل صنفِ نازک میں کبھی ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتیں۔" ارادھنا کے سوال کو سیف نے انتہائی خوبصورتی کے ساتھ خود اس کی اپنی ذات کی جانب موڑ دیا تھا۔ "اور اس بات کا کہ تم ایک انتہائی بااعتماد لڑکی ہو جس پر اس کے خاندان کے افراد بھی اس حد تک اعتماد کرتے ہیں کہ انہوں نے اسے یہاں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا ہوا ہے۔" سیف نے اپنی تعریف پر شرماتی ہوئی ارادھنا کو مزید اپنی گفتگو کے دام میں اُلجھاتے ہوئے کہا تھا اور پھر یہیں سے گفتگو کا وہ حصہ شروع ہوا تھا جس میں ارادھنا نے اپنے خاندان کی دولت کے بارے میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے شروع کردیے تھے۔

فی الحال تو انتظار کرتی ہوئی اس امریکن چڑیا کے بارے میں غور کریں خالد صاحب۔ اس بھارتی بلبل کے بارے میں فکر کرنے کے لیے ابھی بہت وقت پڑا ہے۔ سیف اپنے آپ سے مخاطب تھا۔ وہ کینٹین کے جس دروازے سے داخل ہوا تھا وہ لیزا کی پشت پر تھا۔ اس لیے لیزا' سیف کو کینٹین میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ نہیں سکی تھی۔

"تو اس کا مطلب ہے تم اپنے وعدے پر پورا اُتریں کہ تم نے میرا انتظار کیا۔" سیف اللہ نے اس کے قریب جاکر ٹرے میز پر رکھنے سے قبل کہا اور لیزا چونک پڑی۔

"تم خراب آدمی' تم کس جانب سے آئے ہو....؟" سیف کو ایک بار پھر اپنے سامنے دیکھ کر وہ بری طرح چونکی تھی اور پھر اس کے چہرے پر خوشی کے رنگ بکھرتے چلے گئے تھے۔

"میں نے سوچا کہ اگر تم واقعی وعدے کی پابند نکلیں تو تمہیں تھوڑا سا سرپرائز بھی ملنا چاہیے۔ اس لیے میں چکر کاٹ کر اس دروازے سے آیا ہوں۔" سیف نے میدان کی جانب والے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

لیزا نے گھوم کر اس دروازے کی جانب دیکھا اور اس کے لبوں پر رقص کرتی ہوئی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔ اس مسکراہٹ میں اور باتوں کے علاوہ یہ پیغام بھی تھا کہ اسے سیف اللہ کی یہ ادا بھی پسند آئی ہے۔

"مجھے تو توقع تھی کہ تم اس رخ پر بیٹھی ہو گی کہ کلاس سے فارغ ہو کر آنے والوں پر تمہاری نظر رہے اور میری توقع کے عین مطابق جب تم مجھے اسی طرح ملیں تو میں کاؤنٹر سے اپنے اور تمہارے لیے چائے لینے چلا گیا تاکہ تم انتظار کی شدتوں کو اس چائے کے ذریعے کچھ کم کر سکو۔" سیف نے اپنا رنگ مزید گہرا کرتے ہوئے کہا۔

"تم ایشین واقعی بہت سے معاملوں میں ہم لوگوں سے بالکل مختلف ہوتے ہو۔" لیزا نے سیف کے حوالے سے پورے ایشیا کو داد دی تھی۔

"تم کتنے ایشیائی لوگوں سے واقف ہو؟" سیف نے بے اختیاری میں ایک سوال کیا۔

"تین مہینے پہلے تک میرا سب سے اچھا بوائے فرینڈ ایک ایشین ہی تھا' ایک پاکستانی۔" لیزا بولتے ہوئے اچانک رک گئی جیسے اسے اچانک کوئی احساس ہوا ہو۔

"تمہارا تعلق کہاں سے ہے' تم انڈین ہو یا.....؟"

"میں پاکستان سے آیا ہوں۔" لیزا کی زبان سے اس کے سابقہ پاکستانی بوائے فرینڈ کے بارے میں سن کر سیف اللہ کو ایک کسک سی محسوس ہوئی تھی لیکن وہ اسے سہار گیا۔ ظاہر ہے وہ اپنے ملک میں تو نہیں تھا جہاں لڑکیوں کا اپنے منگیتروں سے ملنا بھی کوئی قابلِ ستائش بات نہیں تھی۔

"اسی لیے شاید مجھے تم میں زیادہ کشش محسوس ہو رہی تھی کہ تمہارا تعلق بھی میری جان کے ملک سے ہے۔" لیزا نے یہ کہتے ہوئے چائے کا گلاس اٹھا لیا تھا۔

گفتگو اب تک انگریزی میں ہی ہو رہی تھی لیکن "جان" کا لفظ لیزا نے اردو کا ہی استعمال کیا تھا۔ امریکا آمد سے قبل وہ امریکیوں' خصوصاً ان کی نئی نسل کے بارے میں بہت کچھ سن چکا تھا لیکن جو کچھ یہاں آنے کے بعد وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا وہ اس سے کئی سو گنا زیادہ تھا جو وہ پاکستان میں رہ کر سنتا رہا تھا۔

لیزا نے جس طرح اپنے اس پاکستانی بوائے فرینڈ کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کے لیے 'جان' کا لفظ استعمال کیا تھا اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے کافی قریب رہے ہوں گے اور اس پاکستانی کے ذکر کے ساتھ ہی لیزا جس طرح خاموش ہو گئی تھی اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اسے اپنے اس بوائے فرینڈ سے بچھڑنے کا اس حد تک صدمہ تھا کہ وہ محض ذرا سی مماثلت پر بھی سیف کے اس قدر قریب آگئی تھی کہ چند منٹ کی پہلی ملاقات کے بعد وہ دوسری ملاقات کے انتظار میں بیٹھی رہی تھی۔

"مجھے کون سا تمام عمر کے لیے اس سے ناتا جوڑنا ہے!" سیف نے دل ہی دل میں خود کو ملامت کرتے ہوئے کہا تھا۔ لیزا کی یہ بات اسے کچھ زیادہ پسند نہیں آسکی کہ وہ اسے کسی اور کی پرچھائیں سمجھ کر اس کے قریب آئی تھی۔

"تو تمہارا وہ بوائے فرینڈ پاکستان واپس چلا گیا.....؟" اسے مستقل خاموش دیکھ کر ہی سیف اللہ کو گفتگو کا سلسلہ دوبارہ جوڑنے کے لیے مجبوراً وہ سوال کرنا پڑا تھا۔

"نہیں ہے تو وہ امریکا میں ہی لیکن بوسٹن چلا گیا ہے مگر اس کے بوسٹن جانے سے پہلے ہی ہمارے تعلقات ختم ہو چکے تھے۔"

اس حقیقت سے تو سیف بھی ناواقف نہیں تھا کہ امریکا میں اس عمر کی لڑکی کے نزدیک بوائے فرینڈ کی تبدیلی کی اتنی بھی اہمیت نہیں ہے جتنی کسی مشرقی ملک میں لڑکی کے لیے فون کی رانگ کال پر ہی کسی مردانہ آواز سے بات کر لینے کے لیے ہوتی ہے لیکن اچنبھے کی بات یہ تھی کہ لیزا کی آواز میں تاسف کا عنصر نمایاں تھا۔

ایک لمحے کے لیے سیف اللہ اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکا کہ لیزا کے اس افسردہ لہجے کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ لیزا سے اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے اس کے بوائے فرینڈ کے بچھڑنے کا اظہار کرے یا اپنے اس حقیقی تاثر کو ظاہر کر دے جو اس کے بوائے فرینڈ کے بوسٹن چلے جانے سے اس کے ذہن میں پیدا ہوا تھا۔

"میرا خیال ہے' یہ تذکرہ تمہیں ذہنی طور پر افسردہ کر رہا ہے اس لیے بہتر ہے' ہم کوئی اور بات کرتے ہیں بلکہ زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ اس چائے کے ختم ہوتے ہی ہم یہاں سے اٹھ کر کہیں اور چل پڑیں اور کسی جانے والے کے بارے میں گفتگو کرنے کے بجائے موجود لوگوں کے بارے میں گفتگو کریں۔" سیف اللہ نے مسکراتے ہوئے لیزا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"پہلے مجھے شبہ تھا لیکن اب میرا شبہ یقین میں بدلتا جا رہا ہے۔" لیزا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔

سیف نے وہ فقرہ بہت سوچ سمجھ کر کہا تھا اور اس کے نتائج بھی اسے فوراً ہی مل گئے تھے کہ لیزا اپنی افسردگی بھول کر مسکرانے لگی تھی لیکن لیزا کی جانب سے دیے گئے اس جواب کو وہ سمجھ نہیں سکا تھا۔ "کیسا شبہ.....؟ کیسا یقین؟" لیزا کی مسکراہٹ کے جواب میں اس نے حیرت سے پوچھا تھا۔

"تمہیں پہلی نظر دیکھنے کے ساتھ ہی مجھے شبہ ہوا تھا کہ تم ایک اچھے دوست ثابت ہو سکتے ہو لیکن تمہارے اس فقرے کے ساتھ ہی مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم واقعی بہت اچھے دوست ثابت ہو گے۔" لیزا نے اپنے کہے ہوئے فقرے کی وضاحت کی تھی لیکن سیف اللہ اب بھی کچھ نہیں سمجھ سکا تھا۔

"میں اب بھی تمہاری بات نہیں سمجھ سکا ہوں۔" سیف نے اپنی مجبوری چھپانے میں کوئی عار محسوس نہیں کی تھی۔

"ہماری ملاقات کو ابھی چند منٹ ہی ہوئے ہیں لیکن تم نے

اس بات کو محسوس کرتے ہوئے کہ جان کا ذکر مجھے افسردہ کر رہا ہے' اس موضوع پر گفتگو کرنے سے ہی احتراز کیا بلکہ میری دلجوئی کرنے کی کوشش کی جس کے لیے میں تمہاری شکر گزار ہونے کے ساتھ ساتھ یہ یقین کر رہی ہوں کہ ہم دونوں بہت اچھے دوست ثابت ہوں گے۔" لیزا کا طویل وضاحتی فقرہ ختم ہوا تو سیف اللہ یہ سوچ کر چپ ہو رہا کہ 'اسے ابھی معلوم ہی نہیں ہے کہ سیف اللہ خالد کی کامیابی کے ہر زینے پر کسی نہ کسی خاتون کا نام ہی درج ہے۔'

"میرے خیال سے اب ہمیں یہاں سے اٹھ جانا چاہیے۔" سیف اللہ نے یہ دیکھتے ہوئے کہ لیزا بھی اپنی چائے ختم کر چکی ہے' آفر کی اور اس نے یہ بات تسلیم کرنے میں دیر نہیں لگائی مگر کینٹین سے باہر نکلتے ہی اس نے وہ سوال کیا تھا جو قاعدے سے اسے کینٹین کے اندر ہی کرنا چاہیے تھا۔

"ہم کہاں چل رہے ہیں....؟" لیزا کے سوال کا قطعی جواب اس کے پاس بھی نہیں تھا۔

"اس کا انحصار تو تم پر ہے۔" اپنی چرب زبانی کا سہارا لیتے ہوئے اس نے گیند ایک بار پھر لیزا کے کورٹ میں ڈال دی تھی۔

"میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ آج کا لنچ میری جانب سے ہوگا اور ہمارے یہاں میزبان صرف بل دیتا ہے جبکہ جگہ کے چناؤ سے لے کر کھانے کے انتخاب تک' سب کچھ مہمان کی ذمے داری ہوتی ہے۔"

"یہ سب فارملٹی ہے۔" لیزا نے اس کے تکلفانہ انداز کو بظاہر مسترد کرتے ہوئے کہا تھا۔

"پھر تم بتاؤ کہ کیا کرنا چاہیے۔" سیف نے تکلف کی دیواریں گرانی شروع کیں۔

"اگر تم پانچ بجے تک فارغ ہو تو ہم راستے سے برگر لیتے ہوئے اپنے فلیٹ پر چلتے ہیں اور وہیں بیٹھ کر گفتگو کریں گے' اس کے بعد تم چلے جانا کیونکہ چھ بجے مجھے جاب پر جانا ہوگا۔"

لیزا کے ترتیب دیے ہوئے پروگرام میں سیف کو بچت کے علاوہ بھی بہت کچھ نظر آ رہا تھا اس لیے اس نے اس پروگرام کو تسلیم کرنے میں تاخیر نہیں کی تھی۔

صرف اس ایک ترمیم کے ساتھ کہ میں پانچ کے بجائے چار بجے وہاں سے اٹھ جاؤں گا کیونکہ میں جس لیبارٹری میں کام کر رہا ہوں وہاں مجھے چار بجے پہنچنا ہے اور لیزا نے خوش دلی کے ساتھ یہ ترمیم پسند کر لی تھی۔

وہ دونوں کالج سے لیزا کی کار میں ہی روانہ ہوئے تھے اور بعد کے تمام پروگرام پر بھی سیف کی توقعات کے مطابق عمل ہوا' یہاں تک کہ سیف پونے پانچ تک لیزا کا مہمان رہا تھا کیونکہ لیزا کا فلیٹ اس لیبارٹری سے جہاں سیف اللہ پارٹ ٹائم جاب کر رہا تھا' اتنا قریب تھا کہ وہ بہ آسانی دس منٹ میں وہاں تک پہنچ سکتا تھا۔

"یہ فلیٹ دراصل جان کا تھا لیکن بعد میں ہم دونوں اس میں برابر کے حصے دار بن گئے تھے لیکن اب جب سے وہ ہیوسٹن چلا گیا ہے' یہ اکیلے میرے استعمال میں ہے۔" لیزا نے سیف اللہ کے اس سوال کے جواب میں کہ "کیا وہ اس فلیٹ میں اکیلی رہتی ہے؟" کہا تھا۔

"اور تمہارے والدین....؟" سیف اللہ نے یونہی برسبیل تذکرہ یہ سوال بھی کر لیا تھا ورنہ اتنے دنوں میں یہ بات تو اس کے علم میں آ چکی تھی کہ لیزا کی عمر تک پہنچتے پہنچتے امریکا کی نوے فیصد نوجوان نسل کا اپنے بزرگوں سے تعلق محض کرسمس کارڈ تک محدود رہ جاتا ہے۔

"ان دونوں میں تو اس وقت ہی علیحدگی ہو گئی تھی جب میں ڈھائی تین سال کی تھی۔" لیزا نے یہ بات اتنے سکون سے کہی تھی جیسے دو روز قبل ہونے والی بارش پر گفتگو کر رہی ہو۔

"ماں مجھے اپنے ساتھ لے کر نانا کے یہاں چلی گئی تھی مگر چھ مہینے بعد ہی اسے اچانک ایک اور شخص پسند آ گیا اور وہ مجھے نانا نانی کے پاس چھوڑ کر اپنے نئے شوہر کے ساتھ چل دی۔"

لیزا کا انداز سیف کو اس لیے ناگوار نہیں گزرا تھا کہ اب تک نئی نسل سے تعلق رکھنے والے جتنے بھی امریکن لڑکے لڑکیوں سے اس کی گفتگو ہوئی تھی' ان... سب نے اپنے بزرگوں کے بارے میں یہی رویّہ اپنایا ہوا تھا۔ ان میں دونوں طرح کے نمائندے شامل تھے۔ وہ بھی جو اپنے والدین کے ساتھ رہ رہے تھے اور وہ بھی جو اپنے والدین کا گھر چھوڑ کر علیحدہ زندگی بسر کر رہے تھے۔

"میرا نانا کافی امیر آدمی ہے' اس نے اپنی پوری زندگی میں سوائے نوٹوں کو دگنا کرنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کیا ہے لیکن اس میں خرابی یہ ہے کہ وہ اب تک اس زمانے میں زندہ ہے جسے گزرے ہوئے بھی ایک زمانہ ہو گیا۔" لیزا کا یہ پرابلم بھی انوکھا اس لیے نہیں تھا کہ وہاں کون تھا جسے اپنے بڑوں سے اس طرح کی شکایت نہ ہو۔

"تو تم نے اپنے نانا کا گھر اس لیے چھوڑ دیا کہ وہ تم پر پابندیاں لگاتے تھے؟" سیف اللہ نے لیزا کی مشکل حل کرتے ہوئے کہا۔

پچھلی نسل کے تجربے سے فائدہ اٹھانے سے انکار کو امریکا کی نئی نسل نے جنریشن گیپ کا نام دے رکھا تھا اور امریکا میں ایجاد ہونے والے اور بہت سے فیشنوں کی طرح بعد میں ہنس کی چال چلنے والوں نے اسے اپنی چال بنا لینے کو قابل فخر سمجھا تھا۔

"میں نے اپنے طور پر پوری کوشش کر لی تھی کہ یا تو وہ میری بات سمجھ لیں یا میری سمجھ میں ان کی بات آ جائے لیکن دو نسلوں کا فرق آخر رنگ لا کر رہا اور میرے پاس اپنے اوپر بڑھاپا طاری ہونے سے بچنے کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں رہا کہ میں ان بوڑھی روحوں کو خیرباد کہہ دوں۔" لیزا کے فقرے اس گفتگو کا پرتو تھے جو یورپ اور امریکا کی نوجوان نسل اپنے بڑوں کے بارے میں

کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتی تھی۔

"تمہارے اس طرح چلے آنے سے تمہارے نانا' نانی تو بہت افسردہ ہوئے ہوں گے؟" سیف اللہ کو اچانک لیزا میں ایک نئی دلچسپی نظر آئی تھی۔ اپنی جس مجبوری کے تحت سیف نے ارادتاً سے تعلقات خوشگوار بنانے کی کوششیں شروع کی تھیں' وہی مجبوری اب اسے لیزا میں زیادہ دلچسپی لینے پر مجبور کر رہی تھی۔

"شاید..." اس نے کاندھے اُچکاتے ہوئے جواب دیا تھا۔ "لیکن اگر میں ان کے جذبات کا خیال کرنے بیٹھ جاتی تو میری زندگی تباہ ہو جاتی۔" لیزا نے ریڈی میڈ جواب اپنی پٹاری سے نکالا تھا۔

سیف اللہ اس فلیٹ تک جس مقصد کے تحت آیا تھا وہ لیزا کی اس گفتگو کے بعد یکسر تبدیل ہو گیا تھا۔ اب تک اس نے اگر لیزا کو چند اچھے لمحات کا ساتھی بنانے کا فیصلہ کیا تھا تو اب اس نظریے سے غور کرنے لگا تھا کہ لیزا اپنی دیگر خوبیوں کے ساتھ ایک مالدار شخص کی نواسی بھی ہے۔

"تم اپنے بارے میں بتاؤ..." لیزا نے اسے سوچ کے دھاروں میں گم ہوتے دیکھ کر کہا۔

"کیا بتاؤں...؟" سیف اللہ چونکتے ہوئے بولا۔

"کیا تمہارے پاس بتانے کو کچھ بھی نہیں ہے؟" اس بار لیزا کا سوال سیف اللہ کو حقیقت سے قریب تر نظر آیا تھا۔ حقیقت تھی بھی یہی کہ اس کے پاس اپنے بارے میں بتانے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ اپنی اس کم عمری میں ہی زمانے نے اسے ہر سرد و گرم سے گزارا تھا اور وہ اس حقیقت سے آشنا ہو گیا تھا کہ فی زمانہ' خالص اور کھرا سچ لوگوں کو ہضم نہیں ہو پاتا۔ اسے اس تلخ حقیقت سے آگاہی ہو چکی تھی کہ اس دور میں صرف اُجلے کپڑوں کی ہی حیثیت ہے' چاہے ان کے اندر شخصیت کتنی ہی گندی کیوں نہ ہو۔

"میرے خاندان کا شمار ہمارے ملک کے چند امیر ترین خاندانوں میں ہوتا ہے۔" سیف اللہ نے اپنے نئے جھوٹ کو تراشنے سے قبل اس کے لیے چمکدار ریپر بناتے ہوئے ابتدا کرتے ہوئے کہنا شروع کیا اور لیزا ایک پُر تجسس کہانی کی ابتدا ہوتے دیکھ کر پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہو گئی۔ "ہمارا خاندان صرف سرمائے میں ہی نہیں بلکہ اپنے اثر و رسوخ اور اعلیٰ ترین حلقوں میں اپنی پہنچ کی وجہ سے بھی اس لیے مشہور ہے کہ ان کا شمار ملک کے چند بڑے جاگیردار گھرانوں میں ہوتا ہے۔"

سیف اللہ نے کہانی کے تجسس میں مزید اضافے کے لیے وقفہ دیا تو لیزا کو اپنی جانب پوری طرح متوجہ دیکھ کر سوچا کہ دنیا کے ہر علاقے کی عورت ایک ہی طرح سے سوچتی ہے۔ آزاد ہونے کے تصور اور آزاد رہنے کے نعرے کے باوجود اس کے ذہن میں ہمیشہ وہ ننھی بچی موجود رہتی ہے جو بازار میں اپنے باپ کی انگلی محض اس اعتماد کی وجہ سے نہیں چھوڑتی کہ اس کے خیال میں اس کا باپ دنیا کا سب سے طاقتور آدمی ہے جس میں اتنی طاقت ہے کہ وہ اسے بڑے سے بڑے خطرے سے بہ آسانی بچا لے گا۔

"تم امریکا میں پیدا ہونے والے' ہمارے یہاں کے جاگیردارانہ ماحول کو اس لیے نہیں سمجھ سکو گے کہ تم ان چیزوں کا تصور بھی نہیں کر سکتے جو وہاں کی دیہاتی زندگی میں روز مرہ کے معمولات میں شامل ہیں۔" سیف اللہ نے کہانی کے بنیادی جھوٹ کو بیان کرنے کے لیے سچ کی مضبوط بنیادیں فراہم کرتے ہوئے کہا اور لیزا خود کو کچھ کہنے سے روک نہ سکی۔

"مثلاً...؟" لیزا کے اس یک لفظی سوال سے سیف کو بہت کچھ کہنے کا موقع مل رہا تھا اور ایسا سنہری موقع ضائع کرنے والا اس کے نزدیک بیوقوف ہوتا۔ اس کی اب تک کی تمام تر کامیابیوں کا راز بھی یہی تھا کہ اس نے ہاتھ آئے ہوئے ہر موقعے سے فائدہ اٹھایا تھا۔

"اگر میں یہ کہوں کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی جاگیرداروں کی زمینوں پر کام کرنے والے کسان ان زمین کے مالکوں کے غلام ہوتے ہیں تو کیا تم یقین کر لو گی؟"

"لیکن یہ کس طرح ممکن ہے...؟" لیزا کے لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس نے سیف کے اس فقرے کا یقین نہیں کیا ہے۔

"امریکا میں یہ ممکن نہیں ہے لیکن میرے ملک میں یہی ہو رہا ہے۔" سیف کے لہجے میں موجود سچ کے اعتماد نے لیزا کے یقین کو ڈانواڈول کر دیا تھا۔

"ہمارے یہاں زمین پر محنت کر کے فصل اُگانے والا اناج سے اس لیے محروم رہتا ہے کہ وہ جو فصل اُگاتا ہے وہ اس کی ملکیت نہیں ہوتی ہے بلکہ اس جاگیردار کی ملکیت ہوتی ہے جس کی زمین پر وہ کام کر رہا ہے اور ایک فصل ہی کیا کسان کا گھر تک اس کا اپنا گھر نہیں ہوتا... اس کے جانوروں سے لے کر اس کی بیٹیوں تک جسے چاہے جاگیردار بزور طاقت اپنے زیر استعمال لا سکتا ہے۔" سیف اللہ نے جو نقشہ کھینچا تھا وہ انسانی حقوق کے چیمپئن ملک کی ایک شہری کو کپکپانے کے لیے کافی سے زیادہ تھا۔

"قانون انہیں کچھ نہیں کہتا ہے؟" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد لیزا نے سوال کیا۔

"کونسا قانون...؟" سیف کے چہرے پر ایک تلخ مسکراہٹ آگئی تھی اور لیزا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس بے تکے سوال کا کیا جواب دے۔

"ملکی قانون اور کیسا قانون...؟" اس نے اپنے تئیں وضاحت کی تھی لیکن سیف نے اسی کے ساتھ اپنے ملک کے قوانین کے بخیے اُدھیڑ کر رکھ دیے۔ "قانون بنانے والی اسمبلیوں سے لے کر ان پر عمل درآمد کروانے والے پولیس اسٹیشن تک سب کو ان جاگیرداروں اور زمیں داروں نے یرغمال بنایا ہوا ہے۔"

لیزا کے لیے یہ بات اسی طرح انہونی تھی جیسے اسے کوئی خبر دے کہ سورج مغرب سے بھی نکل سکتا ہے اس لیے وہ یہ کہے بغیر

نہیں رہ سکی کہ "یہ کس طرح ممکن ہے؟"

"یہ اس طرح ممکن ہے کہ اسمبلیوں میں نوّے فیصد یہی افراد بیٹھے ہوتے ہیں کیونکہ الیکشن میں کوئی ان کے سامنے کاغذات نامزدگی بھرنے کی اس لیے جرأت نہیں کر سکتا کہ اگر اس نے ایسا کیا تو یہ ظالم لوگ اس کا انتقام اس کے پورے خاندان سے لیتے ہیں اور جب قانون ہی ان کی مرضی کا بنے گا تو تم خود سوچ لو کہ آگے کیا ہو سکتا ہے۔"

لیزا سیف اللہ کی گفتگو میں اس لیے بھی زیادہ دلچسپی لے رہی تھی کہ وہ جرنلزم کی طالبہ تھی اور سیف اللہ اسے وہ کچھ بتا رہا تھا جو کتابوں میں نہیں لکھا تھا۔

"اخبارات بھی اس پر کچھ نہیں لکھتے.....؟" اس احساس کے باوجود کہ گفتگو کچھ آف ٹریک ہو گئی ہے لیزا یہ سوال کیے بغیر نہیں رہ سکی۔

"لکھتے ہیں لیکن صرف اس وقت تک جب تک ان کا سودا نہیں ہو جاتا یا جس کے ایما پر لکھ رہے ہوتے ہیں اس سے رقم ملنی بند نہیں ہو جاتی۔" سیف اللہ نے طنزیہ انداز میں جواب دیا۔

"یہ تو تم بہت بھیانک تصویر دکھا رہے ہو۔" لیزا چاہتی تھی کہ اب یہ موضوع تبدیل ہو جائے لیکن جو بات کہنے کے لیے سیف اللہ نے اتنی لمبی تمہید باندھی تھی وہ اسے کہے بغیر کیسے رہ سکتا تھا۔

"یہ تصویر نہیں بلکہ... سرسری سا خاکہ ہے جبکہ اصل تصویر کا تو ہر رنگ اتنا بھیانک ہے کہ میں ان رنگوں سے خوفزدہ ہو کر ہی وہاں سے بھاگ آیا ہوں۔" سیف اللہ نے اب اصل مقصد پر آتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "میں حکمران طبقے کا ایک رکن ہونے کے باوجود بھی انسانی حقوق کی اس پامالی کو برداشت نہیں کر پاتا تھا اور نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ میرے اپنے خاندان کے بزرگ مجھ پر لعن طعن کرتے تھے۔ اس سے بڑی پریشانی میرے بزرگوں کو یہ تھی کہ میرے دادا کے تین بیٹوں کی سات بیویوں میں سے صرف میری ماں بیٹا پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکی تھی اور خاندانی روایتوں کے مطابق اب کروڑوں کی اس جائیداد کا میں واحد وارث بنتا تھا۔"

"اور تم نے محض انسانیت کے ناتے وہ جائیداد ٹھکرا دی۔" لیزا کے لہجے میں ستائش تھی۔ سیف اللہ نے اسے اپنا جو چہرہ دکھلایا تھا لیزا اس چہرے کے خدوخال سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گئی تھی۔

"مجھے خطرہ تھا کہ اگر میں وہاں رہا تو میرے بزرگ مجھے بھی وہ کچھ کرنے پر مجبور کر دیں گے جو میں کسی بھی صورت میں کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

اب تک سیف اللہ اسے جو کچھ باور کروانا چاہتا تھا اس میں وہ سو فیصد کامیاب ہو رہا تھا۔ اس کی بیان کردہ کہانی میں ایسا کوئی جھول نہیں تھا جس سے لیزا کو شک گزرتا کہ سیف اللہ اپنے بارے میں جو کچھ کہہ رہا ہے اس میں سچ کا شائبہ تک نہیں ہے۔

"لیکن جب تمہاری تعلیم ختم ہو گی اور تم واپس اپنے وطن جاؤ گے تب بھی تو وہ تمہیں مجبور کر سکتے ہیں؟" لیزا نے یونہی تذکرتاً کہہ دیا تھا لیکن سیف اللہ کو اس کے سہارے وہ کچھ کہنے کا موقع مل گیا جو اس کہانی کو بیان کرنے کا مقصد تھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے کہ میں اپنے بزرگوں سے اجازت لے کر آیا ہوں یا انہوں نے مجھے اعلیٰ تعلیم کے لیے یہاں بھیجا ہے....؟" سیف اللہ نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے سوال کیا۔

"تو کیا ایسا نہیں ہے؟" لیزا نے حیرت سے کہا اور سیف اللہ نے ایک بیساختہ قہقہہ لگایا۔

"اگر میں اپنے بزرگوں کی اجازت کے ساتھ یہاں آتا تو میرا قیام نہ یوں اپنے سابقہ کلاس فیلو کے بڑے بھائی کے ساتھ ہوتا اور نہ ہی مجھے یوں کالج کے بعد اپنے گزارے کے لیے چھوٹی سی جاب کرنی پڑتی۔" سیف نے لیزا کے سامنے اپنی موجودہ زندگی کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا۔ "بلکہ آج بھی میرے گھر والوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ میں یہاں ہوں اور اس طرح زندگی گزار رہا ہوں تو کل ہی وہ یہاں پہنچ جائیں اور مجھے اپنے ساتھ واپس لے جائیں۔"

سیف کے فقرے میں حقیقت نہ ہونے کے باوجود لیزا اس کے لہجے کے اعتماد سے متاثر ہو کر اس کی بات کا یقین کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

"ہمارے خاندان کی تاریخ میں جہاں تک بھی مجھے معلوم ہے میں پہلا شخص ہوں جس نے کوئی نوکری کی ہے۔" سیف نے جھوٹ کے نہلے پہ دہلا جماتے ہوئے کہا اور پھر لیزا کو متاثر ہوتا دیکھ کر اس نے اچانک ہی موضوع تبدیل کر دیا۔

"لیکن وہ سب کچھ پرانی باتیں تھیں اور میں ان سب سے رشتہ توڑ کر یہاں آیا ہوں تاکہ اپنی زندگی اس طرح بسر کر سکوں کہ نہ مجھے کسی پر ظلم کرنا پڑے اور نہ ہی بدنصیبوں کی آہیں میرا پیچھا کریں بلکہ میں اپنی روزی اپنی محنت سے اپنے ہاتھوں سے پیدا کرنا چاہتا ہوں۔" سیف اللہ نے جذباتی انداز میں اپنی کہانی کو ایک نئے موڑ پر لا کر چھوڑا تو لیزا پوری طرح اس کے لفظوں میں کھوئی ہوئی تھی۔

"میں نے بھی تمہیں کس گفتگو میں اُلجھا لیا۔" سیف اللہ نے بظاہر تاسف کا اظہار کیا تھا لیکن دل ہی دل میں اپنے اس نئے جھوٹ کے کامیاب ردعمل پر خوش بھی بہت تھا۔

"تمہارا گفتگو کرنے کا انداز تو جان سے بھی زیادہ اچھا ہے۔" لیزا نے سیف اللہ کی تعریف میں بھی اپنے سابقہ بوائے فرینڈ کا تذکرہ نکالا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے اچانک کوئی کڑوا بادام چبا لیا ہو مگر اس کڑواہٹ کو اس نے ایک بار پھر اپنی مسکراہٹ میں چھپا لیا۔

'اگر تجھے اپنی جان سے بچھڑنے کا اتنا ہی افسوس ہے تو یہاں کیوں پڑی ہے اسی کے ساتھ چلی گئی ہوتی۔' سیف اللہ دل ہی دل میں غرایا لیکن زبان سے اس نے کچھ نہیں کہا۔

"جان بھی بالکل اس طرح گفتگو کرتا تھا کہ اس کا مخاطب اس کی باتوں میں کھو جاتا تھا۔" لیزا افسردہ لہجے میں بولی اور سیف اللہ بل کھا کر رہ گیا۔

"تم تو اس طرح افسوس کر رہی ہو جیسے اب تمہاری اس سے کبھی ملاقات ہو ہی نہیں سکتی۔" سیف اللہ کے ہاتھوں سے بالآخر ضبط کا بندھن چھوٹ ہی گیا لیکن اس کے باوجود بھی اس نے اپنے لہجے کو زیادہ تلخ نہیں ہونے دیا تھا۔

"یہاں سے جاتے ہوئے وہ یہی کہہ کر گیا تھا کہ احمد مسعود جان اگر ایک باپ کی اولاد ہے تو وہ آئندہ تم سے کبھی نہیں ملے گا۔"

سیف اللہ کا جی چاہا کہ وہ اپنی بتیسی پر زور زور سے قہقہے لگائے۔ لیزا کے بار بار جان کہنے کا مطلب جو کچھ وہ سمجھ رہا تھا وہ نہیں تھا بلکہ "جان" اس کے نام کا حصہ تھا۔

"کیا وجہ اختلاف بہت شدید تھی....؟" سیف اللہ نے خوشدلی سے سوال کیا۔

یہ بات اس کے لیے تقویت کا باعث تھی کہ لیزا کا محبوب بوائے فرینڈ جاتے ہوئے اتنی بڑی قسم کھا کر وہاں سے رخصت ہوا تھا۔ وہ اپنی طرف کے مردوں کو بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر وہ اتنی بڑی قسم کھا کر وہاں سے رخصت ہوا ہے تو اب اس کا پلٹ آنا کسی طور بھی ممکن نہیں تھا۔

"جان کا کہنا تھا کہ ہمیں اب شادی کر لینی چاہیے۔" لیزا نے اپنی وجہ اختلاف بتاتے ہوئے کہا۔

"یہ تو کوئی وجہِ اختلاف نہیں ہے۔" سیف اللہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔

"بات یہ نہیں ہے۔" لیزا نے اس کی قطع کلامی کرتے ہوئے کہا اور پھر فوراً ہی اپنے فقرے کی وضاحت کرنی شروع کر دی تاکہ اس کا یہ نیا دوست کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائے۔

"ابتدا میں جان بہت ہی اچھا تھا، وہ میری ہر ضرورت کا خیال بھی رکھتا تھا لیکن پھر آہستہ آہستہ اس نے مجھ پر مالکانہ حقوق جتانے شروع کر دیے۔" لیزا کا اعتراض اب سیف اللہ کی سمجھ میں آنے لگا تھا۔ "میرے بارے میں بھی وہ اس طرح فیصلے کرنے لگا تھا جیسے میں کوئی میز یا کرسی ہوں کہ وہ اس کا فیصلہ کرے گا کہ مجھے کہاں رکھنا چاہیے۔" لیزا کے لہجے میں ناراضگی تھی۔ "وہ مجھ سے کہتا کہ اس سے ملو اور اس سے نہیں، یہاں جاؤ اور وہاں نہیں۔ انتہا یہ کہ اس نے مجھ سے یہاں تک کہہ دیا کہ وہ مجھے اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ اس کے علاوہ بھی میرا کوئی بوائے فرینڈ ہو سکتا ہے۔" لیزا بولتے بولتے رکی تو سیف اللہ سوچنے لگا کہ 'احمد مسعود جان نے وہی کچھ کیا تھا جس کے لیے اس کے دل نے اسے مجبور کیا ہوگا۔ اس کی بھول یہ تھی کہ اس نے ایک آزاد امریکن لڑکی کو مشرقی لڑکی میں تبدیل کرنے کی کوشش کی تھی۔'

"یہ تو اس کی واقعی زیادتی تھی۔" محض غائبانہ طور پر اپنے پیشرو پاکستانی سے تمام تر ہمدردی ہونے کے باوجود سیف اللہ نے زبانی طور پر لیزا کی حمایت میں اپنے ہم وطن کی مذمت کر دی تھی۔ جانے والا تو جا چکا تھا، اب اسے کیا پڑی تھی کہ اس کی غیر موجودگی میں اس کی حمایت کر کے وہ لیزا سے اپنے تعلقات کے آئینے میں بال آنے دیتا۔

"جب جان نے یہ دیکھا کہ میں پوری طرح اس کے احکامات نہیں مان رہی ہوں تو اس نے ایک نئی چال چلی اور مجھے پرپوز کر دیا۔ اس کا خیال ہوگا کہ بیوی بنا لینے کے بعد وہ مجھ پر ہر طرح سے حاوی ہو جائے گا۔"

"اور جب تم نے انکار کیا تو وہ ناراض ہو کر چلا گیا....؟" سیف اللہ نے لیزا کا فقرہ مکمل کرنا چاہا لیکن لیزا نے انکار میں گردن ہلا دی۔

"میں نے اس سے صرف اتنا کہا تھا کہ چونکہ فی الحال ہم دونوں ہی پریکٹیکل زندگی میں نہیں ہیں، اس لیے ہمیں شادی نہیں کرنی چاہیے۔ ہاں جب تعلیم ختم کر لیں گے تب دیکھا جائے گا۔" لیزا نے اپنے ڈپلومیٹک انکار پر داد طلب نظروں سے سیف کی جانب دیکھا اور اس نے بھی فوراً اس کی یہ طلب پوری کر دی۔

"بہت مناسب جواب تھا۔" سیف اللہ نے منافقت بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا اور لیزا کے چہرے پر خوشی کے رنگ بکھر گئے۔

شادی کے بغیر ساتھ رہنے کا مرض امریکی معاشرے میں اس تیزی کے ساتھ پھیلا تھا کہ اب ان کے نزدیک یہ کوئی برائی ہی نہیں تھی۔ ایسے جوڑوں کو شخصی آزادی کے نام پر نہ صرف قانون تحفظ فراہم کرتا تھا بلکہ اس ملاپ کے نتیجے میں ہونے والے اضافے کو بھی معاشرے میں مساوات کے نام پر برابری کی جگہ دینے میں وہ معاشرہ فخر محسوس کرنے لگا تھا۔

"میں نے اس سے یہ بھی کہا تھا کہ ابھی ہمیں ساتھ رہتے ہوئے صرف چار ماہ ہی ہوئے ہیں اور ان چار مہینوں میں ہم دونوں ایک دوسرے کو پوری طرح سمجھ بھی نہیں سکے ہیں۔ ایسے میں اگر ہم نے شادی کا طوق بھی اپنی گردنوں میں ڈال لیا تو زندگی اجیرن ہو جائے گی لیکن میری ہر دلیل کو وہ اپنی ضد کے آگے مسترد کرتا رہا اور آخر کار اس نے ایک دن مجھے تھپڑ تک مارے اور پھر یہاں سے چلا گیا۔"

"شاید اسے خطرہ ہوگا کہ تم پولیس میں رپورٹ کر دو گی۔" لیزا کی افسردہ کہانی ختم ہوئی تو سیف نے اس سے ہمدردی کرنے والے انداز میں کہا تھا۔

"میں نے اسے دھمکی ضرور دی تھی لیکن میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔" لیزا نے سیف اللہ کی بھرپور توجہ حاصل کرنے کے لیے کہا اور اس کے کچھ اور قریب کھسک آئی۔

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہارے ذہن سے اس کی یاد اس

طرح کھرچ دوں گا کہ آئندہ وہ تمہیں خواب میں بھی یاد نہیں آئے گا۔" تجربہ کار سیف اللہ خالد اس بات سے اچھی طرح واقف تھا کہ کب اسے کیا کہنا چاہیے۔

اس کا تجزیہ ابھی پوری طرح مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ غم میں ڈوب کر دنیا ترک کر دینے کا ارادہ ظاہر کرنے والی لیزا اس سے لپٹ گئی۔

کالج کینٹین سے نکلتے ہوئے دونوں ہی اس بات سے واقف تھے کہ ان کی منزل کیا ہے۔ لیزا اگر یہ آفر کر رہی تھی کہ لنچ اس کے فلیٹ پر کر لیا جائے تو وہ اس بات کو اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ کیا دعوت دے رہی ہے' اسی طرح سیف اللہ بھی پوری طرح واقف تھا کہ لیزا کی جانب سے بظاہر سادہ سی دعوت کے پس منظر میں کیا مقصد چھپا ہوا ہے۔

اچھی طرح اپنے اپنے مقصد سے واقف ہونے کے باوجود ایک حجاب تھا جو اس طرح کی ابتدائی ملاقاتوں میں حائل ہوتا ہے لیکن اب آہستہ آہستہ وہ تمام حجاب دور ہو رہے تھے۔

○☆○

پہلے روز لیزا کے فلیٹ سے رخصت ہوتے ہوئے سیف اللہ کے ذہن کے کسی گوشے میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ لیزا سے پہلی ملاقات کے ٹھیک بارھویں روز اسے لیزا کے فلیٹ میں منتقل ہونا پڑے گا۔ اس پہلی ملاقات کے بعد سیف اللہ تین بار مزید لیزا کے فلیٹ گیا تھا اور ہر بار لیزا نے اس کا استقبال پہلے سے زیادہ پرتپاک طریقے سے کیا تھا بلکہ اس آخری ملاقات میں جو لیزا اور سیف کے درمیان ہوئی تھی' لیزا نے دبے لفظوں میں اسے بتایا تھا کہ شاید بہت جلد اسے وہ فلیٹ چھوڑنا پڑے۔

"جب تک ہم دونوں یہاں تھے' کرائے کا کوئی پرابلم نہیں تھا کیونکہ میں اور جان اسے ففٹی ففٹی شیئر کرتے تھے لیکن اب میں اکیلی اسے افورڈ نہیں کر سکتی۔"

لیزا نے بات بہت گھما پھرا کر کی تھی لیکن سیف اللہ جانتا تھا کہ اصل بات وہ نہیں ہے جو لیزا بظاہر کہہ رہی ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اپنی مجبوری کا پرچار کرنے سے لیزا کا مقصد اس خواہش کے اظہار کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ سیف اس کے فلیٹ میں شیئر کر لے اور وہ دونوں ساتھ رہنے لگیں۔

کالج میں سیف کی تقریباً روزانہ ہی اس سے ملاقات ہوتی تھی اور لیزا کا التفات دیکھتے ہوئے وہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ یہ امریکن لڑکی اسے کس راستے پر لے جانا چاہتی ہے لیکن سیف اللہ تعلقات کو اتنی تیزی سے آگے کی سمت لے جانا نہیں چاہتا تھا کہ وہ جی کا جنجال بن جائے' دوسری اہم بات یہ بھی تھی کہ جب اسے مفت کی رہائش ملی ہوئی تھی تو لیزا کے ساتھ شیئر کرنے میں سراسر اس کا نقصان ہی تھا۔

منور بھائی جن کی فیملی کے ساتھ وہ امریکا میں اپنی آمد کے بعد سے مقیم تھا' اس کے دوست فاروق کے بڑے بھائی تھے۔ ان کا خاندان سیف اللہ کے حالات سے کم از کم اس حد تک ضرور واقف تھا کہ کس طرح اس نے اپنی محنت سے ترقی کے زینے طے کیے تھے۔ منور بھائی جب شادی کے سلسلے میں پاکستان آئے تھے تب ہی سیف کی ملاقات ان سے ہوئی تھی اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ وہ امریکا جانے کی کوششوں میں مصروف ہے تو انہوں نے اسے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا تھا اور اس کی امریکا آمد کے بعد انہوں نے اس کے ساتھ وہی برتاؤ کیا تھا جو فاروق کے امریکا آنے پر وہ فاروق کے ساتھ کرتے۔

ڈاکٹر منور احمد یعنی منور بھائی سات آٹھ سال قبل امریکا آئے تھے لیکن ان سے ملنے کے بعد یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ اتنا طویل عرصہ امریکا میں گزار چکے ہیں۔ برسا برس پاکستان سے دور رہنے کے باوجود وہ اب بھی پاکستان کے بارے میں اس طرح گفتگو کرتے تھے جیسے انہیں امریکا آئے ہوئے ایک ہفتے سے زیادہ نہ ہوا ہو۔

"امریکا میں میرا قیام صرف اس وقت تک ہے جب میں سمجھوں گا کہ اب میں اس قابل ہو گیا ہوں اور یہاں کی تازہ ترین تکنیک میں میری مہارت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ میں اسے اپنے بعد میں آنے والوں کو منتقل کر سکتا ہوں۔" ایک بار سیف اللہ کے اس سوال کے جواب میں کہ اگر آپ کو پاکستان اتنا ہی یاد آتا ہے تو آپ واپس کیوں نہیں چلے جاتے' انہوں نے جواب دیتے ہوئے کہا تھا۔

سیف اللہ کو ان کی یہ باتیں کچھ بے معنی سی لگی تھیں لیکن اس نے فوراً ہی اپنا بھی ارادہ یہی ظاہر کیا تھا کہ تعلیم مکمل ہونے کے فوراً بعد وہ پاکستان واپس چلا جائے گا۔

اس روز سیف اللہ ارادھنا کے گھر سے ایک پارٹی اٹینڈ کر کے واپس آیا تھا جب منور بھائی نے اسے یہ خبر سنائی کہ پاکستان سے فاروق کا فون آیا تھا کہ دو روز قبل ان کے والد کو شدید دل کا دورہ پڑا ہے اور اگرچہ کہ ڈاکٹروں کے مطابق اب ان کی حالت خطرے سے باہر ہے لیکن والد صاحب کا اصرار ہے کہ وہ فوراً پاکستان آ جائیں۔

"مجھے کچھ یوں محسوس ہو رہا ہے کہ اس بار وہ مجھے واپس آنے نہیں دیں گے۔" منور بھائی نے کچھ دیر توقف کے بعد کہا تھا۔

"چلیں یہ بھی اچھا ہی ہو گا کیونکہ آپ تو یوں بھی واپس جانا ہی چاہتے تھے۔" سیف اللہ نے بظاہر خوش دلی سے کہا تھا لیکن دل ہی دل میں وہ آنے والے اخراجات کا تصور کر کے حساب کتاب میں مصروف ہو گیا تھا۔

"میں ابھی جانے کے موڈ میں نہیں تھا لیکن پہلی بار مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ اگر والد صاحب کو خدانخواستہ کچھ ہو جاتا تو میں باقی زندگی یہ سوچ کر افسردہ رہتا کہ آخری بار ان سے ملاقات

نہیں ہو سکی۔" آپ کی بیماری کی خبر نے منور بھائی پر کافی اثر ڈالا تھا۔

منور بھائی پانچویں روز پاکستان فلائی کر گئے تھے لیکن سیف اللہ ان کی روانگی سے پہلے ہی لیزا کے یہاں اٹھ آیا تھا جہاں لیزا نے اسے بڑی خوشدلی کے ساتھ خوش آمدید کہا تھا۔ منور بھائی سے البتہ اس نے یہی کہا تھا کہ وہ اپنے کالج کے ایک پاکستانی دوست کے ساتھ شفٹ ہو رہا ہے جو کچھ روز پہلے اسے اپنے ساتھ فلیٹ میں شیئر کرنے کی آفر کر چکا تھا۔

اپنی مصروفیات کی وجہ سے منور بھائی نے سیف اللہ کے کہنے کو ہی کافی سمجھا تھا ورنہ شاید وہ اس دوست سے مل کر اپنی تشفی ضرور کرتے لیکن چونکہ انہیں اپنی روانگی سے قبل بہت سے کام نمٹانے تھے اس لیے وہ اس جانب توجہ نہیں دے سکے کہ سیف اللہ اپنے کس دوست کے ساتھ شفٹ ہو رہا ہے۔ ویسے بھی سیف اللہ نے ان پر اپنا بہت اچھا تاثر قائم کر رکھا تھا۔ لیزا اور رادھا یا کسی اور لڑکی کا اس نے گھر پر ذکر تک نہیں کیا تھا اور نہ ہی کبھی اس حالت میں گھر آیا تھا کہ اس کی حالت پر شبہ کیا جا سکتا۔

منور بھائی نے پاکستان روانگی سے قبل جب سیف اللہ سے کہا کہ اسے پاکستان کوئی خط وغیرہ بھیجنا ہو تو دیدے' تو اسے یاد آیا کہ اس کے وطن میں ایسے مواقعوں پر وہ جو انتظار کے کٹھن لمحے گزار رہے ہوتے ہیں' ان کی کیا حالت ہوتی ہے۔

"میں خط ضرور دوں گا لیکن شرط یہ ہوگی کہ آپ اس کے ہاتھ میں وہ خط دیں گے جس کے نام وہ خط ہوگا۔" سیف اللہ نے جواب دیا اور وہ مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

"جہاں تک تمہارے بھائی کی رسائی نہیں ہو' تم وہاں کے لیے بھی میری خدمات بھی حاصل کر سکتے ہو۔" یہ منور بھائی کی بیگم تھیں جن کے ساتھ اس نے محض چند دن گزارے تھے لیکن شوہر کی طرح انہوں نے بھی سیف اللہ کو کبھی غیر نہیں سمجھا تھا۔

نزہت کے نام لکھے گئے خط میں اس نے اپنی بے قراری کا ایسا نقشہ کھینچا تھا کہ خود اسے بھی حیرت ہونے لگی تھی کہ وہ اتنا اچھا لکھ بھی سکتا ہے۔

"تم سے دوری کی شدت میں کمی آنے کی ایک صورت تو یہ تھی کہ تم روزانہ نہ سہی' ہفتے میں ہی ایک خط لکھ دیتیں لیکن میری قسمت کہ تم نے اسے بھی مناسب نہیں سمجھا جبکہ میری مجبوری یہ ہے کہ میں براہ راست تمہیں اس لیے خط نہیں لکھ سکتا۔۔۔ کہ وہ خط تم تک پہنچنے سے پہلے کسی اور کے ہاتھ میں جائے گا اور یوں بھی ہمارے یہاں یہ دستور نہیں ہے کہ براہ راست اپنی منگیتر کو خط لکھے جائیں یا اگر لکھے جائیں تو وہ بزرگوں کی پہنچ سے دور ہوں۔"

پاکستان سے روانگی کے وقت بھی اس نے نزہت سے اصرار کیا تھا کہ وہ اسے خط ضرور لکھے لیکن نزہت نے اس وقت بھی اس سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔

"نہیں سیفی' یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوگی۔" اس نے سیف اللہ کی فرمائش پر اپنے ردعمل کا اظہار کیا تھا۔ "اور اس سے بھی زیادہ بری بات یہ اس وقت ہو جائے گی جب ابا اور اماں تک یہ بات پہنچے گی کہ میں تمہیں سب سے چھپ کر خط لکھتی رہی ہوں۔"

"تو اس میں بری بات کیا ہے؟" سیف اللہ نے اصرار کیا تھا۔

"کس رشتے سے میں تمہیں خط لکھوں؟" سوال کے جواب میں سوال کیا گیا تو سیف اللہ اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ یہ سوال ان تمام لڑکیوں میں سے تو کسی نے نہیں کیا' جن سے اس کا واقعتاً کوئی رشتہ نہیں تھا جبکہ جس لڑکی سے ایک ناتا تھا وہ اس رشتے کو تسلیم کرنے سے بھی انکاری تھی۔

"کیا مجھے اب یہ بھی بتانا پڑے گا کہ ہمارے درمیان کون سا رشتہ ہے؟" سیف اللہ نے قدرے ناراض لہجے میں اسے مخاطب کیا تھا لیکن نزہت پر اس کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

"جس رشتے کی تم بات کر رہے ہو سیفی' اس کی نہ قانونی کوئی حیثیت ہے اور نہ شرعی۔" ہمیشہ کی طرح اس بار بھی وہ دوٹوک لہجے میں گفتگو کر رہی تھی۔

"تم اس رشتے سے انکار کر رہی ہو۔۔۔؟" سیف اللہ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ آخر نزہت کہنا کیا چاہ رہی ہے۔

"جس ماحول میں تم جا رہے ہو سیفی' وہاں کا آزاد ماحول ایک ایسی دلدل ہے' جس میں دھنس کر لوگ اپنی منکوحہ بیویاں تو کیا اولاد تک کو بھول جاتے ہیں۔" نزہت نے وہی بات کہی تھی جو اس نے اپنے اردگرد ہونے والے واقعات سے اخذ کی تھی۔

"نزہت' تم مجھ پر الزام۔۔۔" سیف اللہ نے کہنے کے لیے لب کھولنے چاہے لیکن اس نے درمیان میں سے ہی اس کی بات اُچک لی۔

"میں کوئی الزام نہیں لگا رہی ہوں بلکہ صرف وہ بات کر رہی ہوں جو سامنے نظر آ رہی ہے کہ امریکا جانے والے بیشتر افراد ایسے ہی ہیں جنہوں نے وہاں جا کر اپنے خون کے رشتے تک فراموش کر دیے ہیں۔ ایسے میں تم جس رشتے کا حوالہ دے رہے ہو وہ اب تک محض ایک زبانی وعدہ ہے جو میرے بزرگوں نے تمہارے والدین سے کیا تھا اور وہ آج بھی اس پر قائم ہیں۔" نزہت ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ سیف اللہ اس سے گھبراتا ہی صرف اس لیے تھا کہ وہ جب بھی بات کرتی تھی' جذبات میں آئے بغیر دلیل سے بات کرتی تھی۔

"اس کی آخری سرحدوں تک میں تمہارا انتظار کر سکتی ہوں لیکن ایسا کوئی کام نہیں کر سکتی جس کے لیے میرے والدین اجازت نہ دیں" چند لمحے رکنے کے بعد نزہت نے اپنے فقرے مکمل کیے اور واپسی کے لیے پلٹ گئی جیسے اب کہنے سننے کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں رہا ہو۔

سیف اللہ اسے خاموش نظروں کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھتا

رہ گیا تھا۔ اس میں اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ آواز دے کر اسے روک لیتا یا اسی طرح کے چند فقرے وہ اس کی جانب بھی لڑھکا دیتا جس طرح کے فقرے وہ مختلف اوقات میں مختلف لڑکیوں سے کہتا رہا تھا۔ بڑی بڑی آنکھوں اور کھلتے ہوئے رنگت والی نزہت کے چہرے پر کوئی ایسا دبدبہ موجود تھا کہ اس کے سامنے پہنچ کر سیف اللہ جیسے شخص کی زبان بھی گنگ ہو جاتی تھی۔

پاکستان سے روانہ ہوتے ہوئے بھی اس کے ذہن میں یہ بات واضح تھی کہ وہ اب پلٹ کر کبھی واپس نہیں آئے گا لیکن اس کے باوجود بھی اس نے نزہت پر نہ صرف اپنی پوری توجہ صرف کی تھی بلکہ چاہا تھا کہ کسی نہ کسی طرح وہ اسے رام کر ہی لے لیکن تمام تر کوششوں کے باوجود وہ اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ نزہت اس کی انا کے لیے وہ تازیانہ بن گئی تھی جو ہر لمحہ اسے بے چین رکھتا تھا۔

روشی، کوثر، سلمیٰ، رضیہ، مریم، سعدیہ، ثروت، فاخرہ، ذکیہ اور مہوش سمیت نہ جانے اس کی زندگی میں کتنی ہی لڑکیاں آئیں اور چلی گئیں، ان میں سے کچھ تو وہ تھیں جو اس کی وجاہت سے متاثر ہوئی تھیں اور کچھ ایسی تھیں جنہیں سیف اللہ نے اپنی چرب زبانی سے متاثر کیا تھا اور کچھ ایسی بھی تھیں جو اس کی مجنونانہ اداکاری کو حقیقت سمجھ کر اس کے جال میں پھنستی چلی گئی تھیں۔ دن رات ٹی وی اور وی سی آر کے ماحول میں سانس لینے والی ان لڑکیوں سے جب اسی طرح کے مکالمے بولے جاتے جو سلمان خان اور عامر خان اسکرین پر بولتے تھے تو وہ اپنی قسمت پر ناز کرتے ہوئے زمانے سے اسی طرح سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاتیں جس طرح جوہی چاؤلہ یا مادھوری ڈکشٹ فلموں میں تیار ہو جاتی تھیں۔ آئینوں کی سرگوشیوں کو ایک اور زبان مل جاتی تو ان کے پیر اس وقت تک زمین پر نہیں ٹکتے جب تک سراب کے پیچھے بھاگتے بھاگتے ان کی سانس نہ پھولنے لگتی۔

سیف اللہ کی پٹاری میں خواتین کو رام کرنے کے ان گنت نسخے تھے لیکن ان لاتعداد نسخوں میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جسے وہ نزہت پر آزما کر کامیابی حاصل کر لیتا۔

ناکامی کی یہی وہ خلش تھی جس نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ نزہت کو نہ صرف ایک بھرپور خط لکھے بلکہ کوئی ایسا تحفہ بھی روانہ کرے جسے وہ فخریہ انداز میں اپنی سہیلیوں کے سامنے پیش کر سکے کہ "یہ انہوں نے خاص طور پر امریکا سے بھیجا ہے۔"

منور بھائی کی بیگم نے خط پہنچانے کی ہامی تو بھرلی تھی لیکن تحفہ لیتے ہوئے انہوں نے بھی ابتدا میں انکار کر دیا تھا۔

"جب تم خود بتاتے ہو کہ ان کے گھر میں اس حد تک پابندی ہے کہ اسے تمہیں خط لکھنے تک کی اجازت نہیں ہے تو پھر تم خود ہی بتاؤ کہ وہ تمہارے بھیجے ہوئے تحفے کو کیا کہہ کر اپنے والدین کے سامنے پیش کرے گی؟"

"اس سے میرا ایک رشتہ اور بھی تو ہے۔" سیف اللہ نے جواز پیش کیا۔ "آخر وہ میری خالہ کی بیٹی یعنی میری کزن بھی تو ہے۔"

اپنے اس جواز سے خود سیف اللہ بھی مطمئن نہیں تھا لیکن کسی نہ کسی طرح اس نے انہیں اس بات پر آمادہ کر ہی لیا کہ وہ نزہت تک اس کا تحفہ پہنچا دیں۔

"ٹھیک ہے میں پہنچا تو دوں گی لیکن اگر اس کی جانب سے کوئی ردعمل ہوا تو اس کے ذمے دار تم خود ہو گے، بعد میں مجھے الزام مت دینا کہ میں نے تمہیں کیوں نہیں روکا۔" وہ راضی ہو جانے کے باوجود مزاحمت کر رہی تھیں لیکن سیف اللہ اس کے لیے بھی تیار ہو گیا تو ان کے پاس کوئی جواز نہیں بچا تھا کہ وہ انکار کرتیں۔

ایسے مواقع بہت کم آئے تھے جب سیف اللہ نے کسی لڑکی کو تحفہ دیا ہو۔ وہ تحفے لینے کا قائل تھا، دینے کا نہیں اور اگر اس نے کبھی کسی کو تحفہ دیا بھی تھا تو صرف سرمایہ کاری کے نقطۂ نظر سے دیا تھا۔ بقول شخصے، بوٹی دے کر بکرا لینے کے لیے، لیکن اس بار اس تحفے کو بھیجنے کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا کہ نزہت بھی اس کی "محبت" کا اسی طرح سے یقین کر لے جس طرح اس سے پہلے بہت سی لڑکیاں کر چکی تھیں۔

سیف اللہ شاید اس سرمایہ کاری پر ذہنی طور پر کبھی تیار نہ ہوتا اگر ائرپورٹ پر رخصت ہوتے ہوئے نزہت اس سے وہ آخری فقرہ نہ کہہ دیتی۔

"میرا انتظار کرو گی نا....؟" رخصت ہونے سے پہلے اس نے نزہت کے کان کے پاس سرگوشی کرتے ہوئے کہا تھا۔

"اس دن تک جس دن تک سورج مغرب سے طلوع نہیں ہو جاتا۔" نزہت نے جذبات سے مغلوب آواز میں کہا تھا۔

"اور خط....؟" سیف نے حوصلہ پا کر ایک قدم اور آگے بڑھایا تھا۔

"جذبوں کو عام کرنا کم حیثیت لوگوں کا شیوہ ہوتا ہے سیف...." نزہت شاید اور بھی کچھ کہتی لیکن اسی وقت اس کی والدہ قریب آ گئی تھیں اور وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ دینے پر مجبور ہو گئی تھی۔

وہ پہلا دن تھا جس روز سیف کے دل میں اس انجانے جذبے نے سر اٹھایا تھا جس کی طاقت اور قوت سے وہ اب تک ناواقف تھا۔ ڈیپارچر لاؤنج کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے اس نے آخری بار نزہت کی جانب نظر اٹھائی تو اسے ان آنکھوں میں اپنے لیے وہ جذبے نظر آئے تھے جن سے وہ آج تک ناواقف ہی رہا تھا۔

اس سے پہلے تک سیف اللہ کا خیال یہی تھا کہ نزہت برف کا وہ تودہ ہے جس سے ٹکرا کر سر لہولہان تو کیا جا سکتا ہے لیکن اس میں جذبات کی گرمی پیدا نہیں کی جا سکتی لیکن جن نظروں سے اس نے سیف اللہ کو رخصت کیا تھا انہوں نے اسے اپنے خیالات تبدیل

کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

یہ ان لفظوں کی حدت ہی تھی کہ سیف اللہ کے اٹھتے ہوئے قدم ایک لمحے کے لیے رکے تھے لیکن پھر فوراً ہی اس نے اپنے جذبات پر قابو بھی پالیا۔

"نزہت تمہاری حلیف نہیں سیفی!" اس کے ذہن نے سرگوشی کی اور اس نے اس جانب قدم بڑھا دیے جسے وہ اپنی حلیف سمجھتا تھا۔

امریکا تک کے طویل سفر میں وہ آنکھیں اس کا پیچھا کرتی رہی تھیں۔ بار بار وہ انہیں ذہن سے جھٹک کر ان سے پیچھا چھڑانا چاہتا اور بار بار وہ آنکھیں اس کے سامنے آموجود ہوتیں۔ "اس سے پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔۔۔؟" اس نے تھکے ہوئے ذہن کے ساتھ سوچا اور پھر ان آنکھوں کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے اس کے ذہن نے ماضی کا سفر شروع کر دیا تھا۔ طیارہ اسے اپنے اندر سموئے ہوئے اس کے مستقبل کی جانب رواں دواں تھا اور اس کے اندر کا آدمی اسے مجبور کر رہا تھا کہ وہ ماضی کی جانب چلے۔ اس وقت کی جانب جب وہ صرف سیفی تھا۔ اپنے اسکول کا سب سے شریر لیکن سب سے ذہین طالب علم، جس کے استاد بھی اس کی شرارتوں کو محض اس لیے سرسری انداز میں ٹال دیا کرتے تھے کہ انہیں اس لڑکے میں مستقبل کا بڑا آدمی بننے کی ہر صلاحیت نظر آرہی تھی۔

وہ اس وقت آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا جب اس کی زندگی میں سب سے بڑا زلزلہ آیا تھا۔ وہ اپنی والدہ کے ساتھ دوسرے شہر میں شادی کی ایک تقریب میں شرکت کے لیے گیا ہوا تھا کہ انہیں خبر ملی کہ اس کے والد نے اپنی کنپٹی پر پستول رکھ کر فائر کرتے ہوئے خودکشی کرلی ہے۔

اخبارات میں وہ خبر اس طرح شائع ہوئی تھی کہ شہر کے مشہور صنعت کار خالد صدیقی نے حالات کی سنگینی سے تنگ آکر خودکشی کرلی ہے۔ لیکن نہ تو اس کی والدہ نے مرتے وقت تک اس دلیل کو تسلیم کیا تھا اور نہ ہی خود اس کا اپنا ذہن آج تک اس بات کو تسلیم کرسکا تھا کہ ایسا ہو بھی سکتا ہے۔

تین روز پہلے تک اس کے والد نے جب انہیں رخصت کیا تھا تب تک ایسے کوئی آثار نہیں تھے۔ ایسا اس سے پہلے بھی کئی بار ہوا تھا کہ وہ اور اس کی والدہ کسی تقریب میں شرکت کے لیے پہلے چلے جاتے تھے اور ان کے والد بعد میں اپنی کاروباری مصروفیات میں سے تھوڑا سا وقت نکال کر آجاتے تھے لیکن اس بار تو حالات نے وہ رخ اختیار کیا تھا جس کا تصور بھی انہوں نے کبھی نہیں کیا تھا۔ باپ کا سایہ سر سے کیا جدا ہوا، سیف اللہ اور اس کی والدہ سے ہر چیز چھین لی گئی۔ چھیننے والوں نے ہر کاغذی کارروائی مکمل کرلی تھی۔ ان کے پاس وہ تمام شواہد موجود تھے جن کی رو سے خالد صدیقی ان کے اس حد تک مقروض تھے کہ ان کی تمام جائیداد اور کاروبار پر قبضہ کرنے کے باوجود ان کا قرض اُترتا نظر نہیں آرہا تھا۔

"میرے شوہر کو قتل کیا گیا ہے اور قتل کرنے والے وہی لوگ ہیں جو ان جعلی دستاویزات کے سہارے ہمیں ہمارے قانونی حق سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔" اخبارات نے مرحوم خالد صدیقی کی بیوہ کلثوم خالد کی عدالتِ عالیہ میں دائر کردہ اپیل کو بھی شہ سرخی سے شائع کیا تھا لیکن پھر اچانک نہ جانے کیا ہوا کہ سیف اللہ کی والدہ نے اپنے فیصلے تبدیل کر دیے۔ ایک روز قبل تک جو خاتون غاصبوں کے سامنے ڈٹ جانے کا اعلان کر رہی تھیں، انہوں نے نہ صرف اپنی اپیل واپس لے لی بلکہ وہ شہر ہی چھوڑ دیا۔

سیف اللہ اس وقت اتنا بالغ بھی نہیں تھا کہ اپنی والدہ کے کسی فیصلے پر اثر انداز ہوتا لیکن ساتھ ہی اتنا چھوٹا بھی نہیں تھا کہ راتوں رات تبدیل ہونے والے ان فیصلوں پر حیران بھی نہ ہوتا۔ اصل حقیقت کا علم تو اسے اس وقت ہوا تھا جب اس کی والدہ نے نزہت کی والدہ سے اپنے اس فیصلے کی تبدیلی کی وجہ بیان کی تھی۔

"میں کیا کرتی صفیہ، ان بدمعاشوں نے کھلے لفظوں میں دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے اگلے دو دن میں اپنی رپورٹ واپس نہیں لی تو وہ سیفی کو بھی وہیں پہنچا دیں گے جہاں اس کے باپ کو پہنچا دیا تھا۔" سیف اللہ کو اپنی رگوں میں لہو کی جگہ گرم گرم لاوا دوڑتا ہوا محسوس ہوا تھا لیکن ابھی اس نے عمر کی ان سرحدوں کو عبور نہیں کیا تھا جہاں وہ اس قابل ہوتا کہ تنہا کچھ کر گزرتا۔

"اس کا مطلب تو صاف ظاہر ہے کہ تمہارا شک صحیح ہے۔" نزہت کی والدہ نے ایک عجیب انداز میں وہ فقرہ کہا تھا، کچھ اس طرح جیسے وہ یہ بات اس ڈر سے سرگوشی میں کرنا چاہتی ہوں کہ کہیں یہ فقرہ ان لوگوں تک نہ پہنچ جائے جن کے خلاف ان کی بہن صف آرا تھیں۔

"مجھے پہلے دن سے یقین تھا کہ خالد خودکشی نہیں کرسکتے۔" ۔۔۔ سیف کی والدہ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا تھا "لیکن اب ان کے بزنس پارٹنروں نے جس طرح مجھے وہاں سے فرار ہونے پر مجبور کیا ہے، اس کے بعد تو شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی ہے۔" ان کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے لیکن ان کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ اپنے اندر دکھ کا ایسا سمندر لیے ہوئے تھا جو بیان سے باہر تھا۔

"امی! مجھے بڑا ہو جانے دیں، میں انکل ہاشم اور انکل عارف سے ایسا بدلہ لوں گا کہ وہ زندگی بھر یاد کریں گے۔" سیف اللہ نے یہ فقرہ زبان سے ادا نہیں کیا تھا لیکن دل ہی دل میں وہ اپنے اس عزم کو دُہراتا رہا تھا۔

اس وقت جب اس کی والدہ اپنا سب کچھ غاصبوں کے حوالے کر کے چھوڑ آنے پر مجبور ہو گئی تھیں، اس وقت سیف اللہ کا خیال تھا کہ اس کی والدہ نے بنیادی غلطی یہ کی ہے کہ صحیح انداز سے قانون کی مدد نہیں لی ہے۔ اس وقت اس کا خیال تھا کہ اگر

اس کی والدہ صحیح انداز میں قانون سے مدد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتیں تو وہ سب کچھ نہ ہوتا جو ہوا تھا لیکن جیسے جیسے وہ عمر کی منزلیں طے کرتا ہوا آگے بڑھتا گیا اس کے سامنے ہر چیز واضح ہوتی چلی گئی۔ پرانے نقش مٹتے چلے گئے اور ان کی جگہ وہ حقیقی رنگ ابھرتے چلے گئے جو زمانے کے سرد و گرم نے بنائے تھے۔ اس کا یہ احساس قوی سے قوی تر ہوتا چلا گیا کہ ماضی کی طرح آج کا قانون بھی صرف طاقتور کی.... اور پشت پناہی کے لیے موجود ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں یہ بات گھر کرتی چلی گئی کہ اسے ہر صورت میں طاقتور بننا چاہیے اور طاقت کے حصول کا دوسرا مطلب اس کے نزدیک سرمائے کا حصول تھا۔

اپنی اہمیت کا احساس سیف اللہ کو پہلی بار اس وقت ہوا تھا جب بچپن سے جوانی میں پہلا قدم رکھنے کے ساتھ اسے صنفِ نازک کی جانب سے بھرپور توجہ ملنی شروع ہوئی تھی۔ کالج میں اس کی کلاس فیلوز سمیت کون سی ایسی لڑکی تھی جس سے سیف اللہ نے دوستی کرنی چاہی تھی اور کامیاب نہیں ہوا تھا۔ پہلی کامیابی کے بعد دوسری اور پھر تیسری اور چوتھی کامیابی کا ہر زینہ طے کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے اعتماد میں پہلے سے زیادہ اضافہ ہو جاتا تھا۔

وہ پیدائشی ذہین تھا لیکن اب اس کی ذہانت کچھ اور ہی معنی لیے ہوئے تھی۔ ہر نئی کامیابی سے وہ ایک نیا سبق لیتا تھا اور پھر اس نئے سبق کو اس طرح اپنی اگلی کامیابی کے لیے استعمال کرتا تھا کہ کبھی کبھی تو اس کا خود اپنے آپ کو داد دینے کو جی چاہنے لگتا تھا۔ بظاہر وہ ایک سیدھا سادا، معصوم سا انسان تھا لیکن درحقیقت وہ بھیڑ کی کھال اوڑھے ہوئے ایک ایسا بھیڑیا تھا جو اپنی بھوک مٹانے کے لیے کسی آخری حد سے بھی گزر سکتا تھا۔

اپنی والدہ کی وفات تک تو وہ پھر بھی ہاتھ پاؤں بچا کر اپنی چرب زبانی کا مظاہرہ کرتا تھا کیونکہ اس حقیقت سے وہ بخوبی واقف تھا کہ اس کی خوددار والدہ اس کی بڑی سے بڑی غلطی تو معاف کر سکتی ہیں لیکن یہ چیز ان کے لیے ناقابل قبول ہوگی کہ اپنی جس اولاد کو انہوں نے محلے والوں کے کپڑے سی کر اس جگہ تک پہنچایا ہے وہ جھوٹی سچی کہانیوں کے ذریعے اپنی چھوٹی چھوٹی آسائشوں کا سامان بہم حاصل کرتا رہا ہے۔

والدہ کے اطمینان کے لیے اس نے بظاہر کچھ ٹیوشنز کر رکھی تھیں لیکن ان ٹیوشنوں کے ذریعے سے وہ اپنی شاہانہ زندگی کا محض ایک حصہ ہی بہم حاصل کر سکتا تھا۔ شوہر کی وفات کے بعد سے ایک محدود دائرے میں زندگی بسر کرنے والی خاتون نے اپنی زندگی کا محور اس کی ذات کو بنا رکھا تھا اس لیے جو کچھ بھی وہ کہتا وہ اس پر یقین کر لیتی تھیں۔ قیمتی پینٹ شرٹ اور پرفیوم کے تحفوں کو اگر وہ یہ کہہ کر پیش کرتا کہ نالائق بچے کے پاس ہونے پر اس کے والدین نے دی ہیں، وہ تب بھی اس کا یقین کر لیتی تھیں اور نئی موٹر سائیکل کے بارے میں اگر وہ انہیں یہ بتاتا کہ قسطوں پر خریدی ہے اور قسط پوری کرنے کے لیے ایک مزید ٹیوشن کر لی ہے تو وہ اس کا بھی یقین کر لیتی تھیں۔ سب کچھ چھن جانے کے بعد تو اب ان کی زندگی کا مقصد صرف یہ رہ گیا تھا کہ "جلد سے جلد سیفی اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے اور نزہت اس گھر میں آجائے تو میں سکون سے جان دے سکوں گی۔" لیکن اور خواہشوں کی طرح ان کی یہ خواہش بھی پوری نہ ہو سکی۔ موت نے انہیں اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ وہ اپنے سیفی کے ماتھے پر سہرا سجا دیکھ سکتیں۔

ماں کی موت کے ساتھ ہی سیف اللہ کے چھپے ہوئے جوہر کھل کر سامنے آنے لگے۔ اب اس نے اپنی کارروائیوں کا دائرۂ کار کچھ اور آگے بڑھایا تھا اور اس کے نتائج اس کی توقعات سے بھی زیادہ اچھے نکلے تھے مگر ہر طرح کی کامیابیوں کے باوجود سیف اللہ اس حقیقت سے بھی اچھی طرح واقف تھا کہ وہ ایک محدود مدت سے زیادہ اپنی اس کاریگری کو جاری نہیں رکھ سکے گا اور یہی وجہ تھی کہ تعلیم کی جانب سے اس کی توجہ کبھی اس حد تک کم نہیں ہوئی تھی کہ کسی ایک ہی جماعت میں اسے دو سال گزارنے پڑیں۔

اپنی تعلیمی زندگی کے بالکل آخری مہینوں میں سمیرا اس کی زندگی میں آئی تھی۔ وفاقی حکومت کے ایک بڑے سیکریٹری کی طلاق یافتہ بیٹی جس کی پہلی شادی اس لیے ناکام ہو گئی تھی کہ اس کا شوہر بھی کسی ایرے غیرے کا بیٹا نہیں تھا اور اسی لیے وہ سمیرا کے ان ناز نخروں کو سہنے کے لیے تیار نہیں ہو سکا تھا جس کی امید لے کر سمیرا اس کے گھر آئی تھی۔ اس پر طُرّہ یہ ہوا کہ حکومت کی تبدیلی نے اس کے والد کو زیر عتاب کر دیا تھا کیونکہ پچھلی حکومت میں ان کا شمار حکومت کے منظورِ نظر افراد میں ہوتا تھا۔

سیف اللہ کے تجزیے کے مطابق بیوٹی پارلر والوں کی اعلیٰ ترین کارکردگی کے بعد قبول صورت بن جانے والی سمیرا کو اب ایسے شوہر کی تلاش تھی جسے وہ نہ صرف دبا کر رکھ سکے بلکہ اس پر احسانات کی اتنی بھرمار کر دی جائے کہ وہ عمر بھر اس کے آگے سر نہ اٹھا سکے۔ شاید اسی منصوبے کے تحت سمیرا نے اس کے آگے لالچ کے دانے بکھیرے تھے۔

"زیادہ بہتر تو یہ ہوتا سیف کہ تم مزید تعلیم کے لیے امریکا نکل جاتے۔" اس نے سرسری انداز میں بات چھیڑی تھی۔

"ہم جیسے لوگوں کے لیے لاہور سے قصور جانا ایک پرابلم سے کم نہیں ہوتا اور تم کہہ رہی ہو کہ امریکا نکل جاتے۔" سیف اللہ اب تک سمیرا کے سامنے اسی طرح کا برتاؤ کرتا رہا تھا اور اسی وجہ سے وہ اس "بدھو" پر مہربان سے مہربان تر ہوتی چلی گئی تھی۔

"کم آن.... ڈونٹ بی سلی۔" اس نے ایک خاص انداز سے کہا تھا۔ "ادھر نیویارک میں ہمارا ایک فلیٹ بھی ہے، ہم میں سے جب بھی کوئی بھی امریکا جاتا ہے تو اسی فلیٹ میں قیام کرتا ہے.... تم چاہو تو میں پاپا سے بات کر لوں گی اور جب تک تم وہاں رہو گے وہیں قیام کر سکتے ہو۔"

"سمیرا بی بی، تمہارے پاپا کی مہربانی تو اس وقت شروع ہو گی جب میں امریکا پہنچوں گا لیکن یہاں ویزا کے حصول سے لے کر جہاز کے کرائے اور وہاں کے کالج کی فیس سب ہی ایک مسئلہ ہیں۔" سیف اللہ نے بظاہر اس کے بکھیرے ہوئے دانوں پر منہ مارنا شروع کر دیا تھا لیکن سمیرا اگر تجربہ کار تھی تو جہاندیدہ سیف اللہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔

"یہ بھی کوئی پرابلم ہیں...." اس نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "تم اگر کل مجھے پاسپورٹ دو تو میں اگلے تین روز میں تمہیں ویزا دلوا دوں گی۔" سمیرا کا اعتماد بتا رہا تھا کہ بالکل ویسا ہی ہو گا جیسا کہ وہ کہہ رہی ہے۔

"تمہارے وہاں جانے کی صورت میں تھوڑا سا فائدہ میرا بھی ہے۔" سمیرا نے آہستہ آہستہ اپنے اصل مقصد کی جانب پھسلنا شروع کیا تھا۔

"وہ کیا....؟" سب کچھ سمجھنے کے باوجود سیف اللہ نے انتہائی معصومیت سے سوال کیا تھا۔

"دراصل میں کافی عرصے سے وہاں جا کر بیوٹیشن کا کورس کرنا چاہ رہی ہوں لیکن پاپا کا خیال ہے کہ وہ مجھے اکیلا وہاں نہیں چھوڑ سکتے' اب تم وہاں ہو گے تو میرے پاس بھی ایک جواز ہو جائے گا اور پاپا کا اعتراض بھی دور ہو جائے گا کیونکہ وہ تم پر بہت زیادہ اعتماد کرتے ہیں۔"

اس اعتماد کے پس منظر میں چھپی ہوئی کہانی سے سیف اللہ اچھی طرح واقف تھا لیکن اس نے اس کا اظہار کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ اس بات سے بھی اچھی طرح واقف تھا کہ سمیرا پہلا زینہ کامیابی سے طے کر لینے کے بعد دوسرے زینے پر کس طرح قدم رکھے گی لیکن ابھی چونکہ وہ وقت آنے میں دیر تھی اس لیے سیف اللہ نے ابھی سے اس سے بچنے کی تیاریوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے سمیرا کا سہارا لے کر آگے بڑھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

لیکن اس سے قبل کہ سمیرا اپنے باپ کی زبان سے وہ کچھ کہلواتی جو وہ خود نہیں کہہ سکتی تھی' وہ ہو گیا جس کی توقع نہ سمیرا کو تھی اور نہ اس کے باخبر باپ کو تھی۔ وہی حکومت ایک بار پھر برسرِ اقتدار آ گئی جس سے بہتر تعلقات کی سزا سمیرا کا باپ بھگت رہا تھا۔

حکومت تبدیل ہو گئی تو ہر شے تبدیل ہو گئی۔ سمیرا کے والد اب سرکار میں ایک اہم آدمی تھے اور اہم آدمی کی بیٹی کے لیے رشتے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے تھے۔ بڑی بڑی کوٹھیوں اور لمبی لمبی گاڑیوں والے نوجوانوں نے اپنے بڑوں کی ہدایت کے پیشِ نظر ایک بار پھر سمیرا پر نظرِ کرم شروع کر دی تو اس کے خیالات نے ایک بار پھر یوٹرن لے لیا۔ اس قدر کہ اب وہ اپنے چند دن پہلے تک کے خیالات پر شرمندہ تھی۔

ادھر سیف اللہ اس تبدیلی سے بے خبر ان ابتدائی تیاریوں میں مصروف تھا جو امریکا کا ویزا حاصل کرنے کے لیے ضروری سمجھی جاتی تھیں۔ سمیرا اور اس کے درمیان بہت سی باتیں کہی نہیں گئی تھیں لیکن اس کے باوجود دونوں ہی کے سامنے اپنے اپنے مقاصد واضح تھے مگر جب تیاریاں مکمل ہونے کے بعد سیف اللہ آخری مرحلہ سر کرنے کی غرض سے سمیرا سے ملا تو وہاں کا موسم ہی تبدیل ہو چکا تھا۔

"سیف' مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکوں گی۔" اس نے معذرت خواہانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا تھا اور سیف اللہ چونکتا ہو گیا تھا۔

"میں سمجھا نہیں....؟" اس نے ایک بیوقوفانہ سادگی سے یہ فقرہ ادا کیا تھا' اگرچہ دل میں وہ اس بات پر خوش تھا کہ بغیر کسی کوشش کے ہی وہ رکاوٹ دور ہو گئی ہے۔

"میرا مطلب ہے' میں نے امریکا جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔" سمیرا نے اپنی مجبوری ظاہر کی تھی۔

'تو یہاں کس کی خواہش تھی کہ وہ تمہارے ساتھ امریکا جائے' سیف اللہ نے دل ہی دل میں اس پر لاحول پڑھی تھی۔ سمیرا کے ساتھ امریکا جانے کا تصور اس کے لیے اسی طرح کا تھا جیسے کوئی ماؤنٹ ایورسٹ پر جانا ہو اور برف سے بھرا ہوا تھیلا ساتھ رکھ لے۔

"اسلام آباد جانے سے قبل تو تمہارے خیالات کچھ اور تھے....؟" اپنے تمام تر خیالات کو اپنی ذات تک محدود رکھنے کے ساتھ ہی سیف نے سوال کیا تھا۔

"سیٹھ شوکت کے بیٹے فرحان نے مجھے پرپوز کیا ہے اور پاپا کا خیال ہے کہ اس شادی میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔" سمیرا نے اپنی مجبوری سیف اللہ کے آگے رکھی تو ایک ساتھ کئی قہقہے اس کے اندر گونجے تھے مگر جب اس نے لب کھولے تو اس کے لہجے میں زمانے بھر کی حسرت و یاس موجود تھی۔

"ایسی صورت میں تو مجھے فوراً ہی ملک چھوڑ دینا چاہیے...." بظاہر اس نے اپنے آپ کو مخاطب کیا تھا لیکن اس کا ردِعمل وہی نکلا تھا جو سیف اللہ چاہتا تھا۔

"دیکھو سیف' ہم اچھے دوست تھے اور اب بھی اچھے دوستوں کی طرح ملتے...." سمیرا اس کے لہجے سے کسی قدر خوفزدہ ہو گئی تھی اور اسی لیے اس نے سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن سیف اللہ نے اس کا فقرہ درمیان میں ہی اچک لیا تھا۔

"نہ میں منافق ہوں سمیرا اور نہ ہی میں جھوٹ بول سکتا ہوں۔" اس نے اس پہلے تاثر کو مزید گہرا کرنے کے لیے سمیرا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گفتگو شروع کی تھی۔

"میں نے کبھی براہِ راست تم سے اس لیے نہیں کہا کہ میں سمجھتا رہا کہ تم میرے جذبات سے واقف ہو لیکن آج مجھے معلوم ہوا کہ میں کس قدر غلطی پر تھا۔" سیف اللہ نے اپنی گفتگو میں وقفہ

رہا تو سمیرا سوچ میں پڑ گئی کہ اس پاگل کا کیا علاج کرے۔
'اگر یہ بیوقوف زیادہ ہی سنجیدہ ہو گیا تو رنگ میں بھنگ بھی ڈال سکتا ہے۔' اس نے سوچا تھا۔
"تم نے کہا تھا کہ تم اپنے پاپا کے ذریعے دو دن میں میرا ویزا لگوا سکتی ہو؟" خاموشی کے ایک طویل توقف کے بعد سیف اللہ نے سوال کیا اور خوفزدہ سمیرا نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔ جتنی دیر تک سیف اللہ خاموش رہا تھا، سمیرا اس کے سامنے بیٹھی دل ہی دل میں کانپتی رہی تھی۔
"ان چھوٹے لوگوں کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا....." اس نے جھکی ہوئی نظروں کے ساتھ بیٹھے ہوئے سیف اللہ کو کینہ توز نظروں سے گھورتے ہوئے سوچا تھا مگر جونہی سیف اللہ نے نظریں اٹھائیں، سمیرا نے ایک کامیاب منافق کی طرح چہرے پر مسکراہٹ سجا لی تھی۔
"میں آج ہی پاپا سے بات کروں گی....." سمیرا نے یقین دلانے والے انداز میں کہا تھا اور یہ کہتے ہوئے اس نے کسی بھی طرح کی غلط بیانی کا سہارا نہیں لیا تھا۔ سیف اللہ کے تیور دیکھنے کے ساتھ ہی اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ان حالات میں اسے یقیناً یہاں رہنا چاہیے۔
'زندگی نے اب تک مجھے دھوکا اور فریب کے سوا کچھ نہیں دیا ہے سمیرا اور آج تک میں ان تمام زیادتیوں کو بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت بھی کرتا رہا ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ اب ضبط کا بندھن میرے ہاتھوں سے چھوٹنے ہی والا ہے۔' سیف اللہ نے سمیرا کے اس تاثر کو مزید قوی کیا تھا جس سے وہ خوفزدہ ہو رہی تھی۔
"مجھے تمہارے جذبات کا احساس ہے لیکن میں مجبور....."
"تم مجبور نہ بھی ہو سمیرا تب بھی میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا...... بلکہ شاید اپنے ہوش و حواس میں کسی کو بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا.... لیکن ڈرتا ہوں کہ کسی دن یہ ہوش و حواس ہی میرا ساتھ نہ چھوڑ دیں اور میں وہ کر بیٹھوں جو میں خود بھی نہیں چاہتا ہوں۔" سیف اللہ نے سمیرا کی قطع کلامی کرتے ہوئے اپنا فقرہ مکمل کیا تو سمیرا کو اپنی رگ و پے میں ایک سنسنی سی دوڑتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی۔
'کیا یہ بیوقوف شخص وہ کچھ کر بھی سکتا ہے جس کے یہ دعوے کر رہا ہے؟' سمیرا نے خود اپنے آپ سے سوال کیا تھا اور فوراً ہی ذہن کے کمپیوٹر نے اس کا جواب بھی دے دیا۔
'بالکل کر سکتا ہے کیونکہ اس طرح کی حماقتیں اسی طرح کے پاگل کرتے ہیں ورنہ سمجھدار لوگ 'تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی' پر عمل کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔'
سمیرا کے چہرے پر آتے جاتے رنگوں نے اس پر ثابت کر دیا تھا کہ اس نے بالکل صحیح راستے کا انتخاب کیا ہے اور وہ لوہے کو گرم دیکھتے ہوئے چوٹ پر چوٹ لگائے جا رہا تھا۔
"میں یہاں رہوں گا اور تم دونوں بھی یہیں رہو گے تو ہمارا کہیں نہ کہیں آمنا سامنا بھی ہو گا اور....."
"تم کچھ نہیں کرو گے سیف....." اس بار سمیرا نے اس کی بات کاٹی تھی۔ جو کچھ وہ سیف کی زبان سے سن چکی تھی اس کے لیے اتنی ہی ڈوز کافی تھی، اب مزید کچھ سننے کا اس میں حوصلہ نہیں رہا تھا۔ سیف کے تیور دیکھتے ہوئے اسے یقین ہو گیا تھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے ویسا ہو بھی سکتا ہے۔
اس گفتگو کے ٹھیک تیسرے روز اس کا پاسپورٹ اس کے پاس صرف ایک تبدیلی کے ساتھ واپس آ گیا تھا۔ سمیرا کے پاپا کے تعلقات نے وہ کام کر دکھایا تھا جو سیف اللہ کے لیے ناممکن ہی تھا۔ ویزا لگا پاسپورٹ ہاتھ میں لینے کے بعد جس پہلی ہستی کا خیال سیف اللہ کے ذہن میں آیا تھا وہ نزہت تھی۔
'میرے امریکا جانے کی خبر سن کر ہی شاید وہ رام ہو جائے۔' اس نے سوچا تھا لیکن نزہت نے ایک بار پھر اس کے تمام اندازوں کو غلط ثابت کر دیا تھا۔
"ہمارا تو خیال تھا بیٹے کہ تعلیم مکمل کر کے تم بھی روزگار سے لگ جاؤ تو ہم بھی اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔" نزہت کی والدہ نے اپنا ردِ عمل ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا۔
"میں اپنی زندگی میں وہ سب کچھ حاصل کرنا چاہتا ہوں جو مجھ سے چھین لیا گیا تھا اور ایک چھوٹی سی نوکری سے وہ سب کچھ حاصل نہیں ہو سکتا جو میں چاہتا ہوں۔" اس طرح کی نقاب سیف اللہ ہمیشہ اس وقت اوڑھتا تھا جب اسے اپنے مخاطب کو اپنی شرافت کا یقین دلانا ہوتا تھا۔
"ہمارا جو کچھ ہے وہ بھی تو تمہارا ہی ہے بیٹے....." نزہت کی والدہ نے بڑی اپنائیت سے کہا تھا لیکن سیف اللہ تو اس وقت کسی اور ہی ہواؤں میں تھا۔
"آپ کا بہت بہت شکریہ خالہ جان لیکن میں جو کچھ بھی حاصل کروں گا وہ اپنے زورِ بازو سے حاصل کروں گا۔" بظاہر اس نے شکریے کے ساتھ ان کی پیشکش واپس کر دی تھی لیکن دل ہی دل میں وہ ان کی فراخدلی پر بہت ہنسا تھا۔
'دو سو گز کا مکان اور ایک چھوٹا سا کاروبار ان کے نزدیک بہت کچھ ہے۔' وہ ان کی سادگی کو حماقت سمجھ کر قہقہہ لگانا چاہتا تھا لیکن حالات ایسے نہیں تھے کہ وہ ایسا کر سکتا۔
"کب تک روانگی کا ارادہ ہے.....؟" نزہت کے والد نے سوال کیا تھا۔ سیف اللہ کے لہجے کی مضبوطی نے انہیں سمجھا دیا تھا کہ وہ کچھ کہنے سننے کی منزلوں سے گزر آیا ہے۔
"ایک دو روز میں پیسوں کا پرابلم حل ہو جائے گا پھر ہی میں کوئی قطعی تاریخ بتا سکوں گا۔" سیف اللہ نے یہ ذو معنی فقرہ جس مقصد کے تحت کہا تھا اس کا وہ مقصد بھی فوراً ہی حل ہو گیا۔ انکار

اور اقرار کی ایک مختصر سی بحث کے بعد وہ بظاہر بڑی خوش دلی کے ساتھ ان کی مدد لینے پر آمادہ ہوا تھا اور پھر اس کے چند روز بعد ہی وہ اس طیارے میں سوار ہو گیا تھا جو اسے اپنے ساتھ لے کر ایک نئی دنیا سے متعارف کروانے کے لیے اُڑا جا رہا تھا۔

مادرِ شکم سے نئی دنیا کی کھلی فضا میں پہلا سانس لیتے ہی اس نے ماحول کی تبدیلی پر احتجاج کی صدا بلند کی تھی لیکن دیارِ غیر میں پہلا قدم رکھنے کے ساتھ ہی ان آنکھوں نے سیف اللہ کا ساتھ چھوڑ دیا تھا جو پورے سفر میں اس کی شریک رہی تھیں۔ امیگریشن اور دیگر ضروری کارروائیوں سے فارغ ہونے تک اسے اس بات کا یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اس کا خواب حقیقت کا روپ اختیار کر چکا ہے۔ خوشی اور انبساط کی ایک لہر تھی جو اسے اپنے پورے جسم میں دوڑتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اپنا مختصر سامان ٹرالی پر لے کر وہ نہایت خوش خوش ایئرپورٹ کے لاؤنج تک آیا تھا جہاں فاروق کے بڑے بھائی اور ان کی بیگم اس کا انتظار کر رہے تھے لیکن گھر پہنچنے سے پہلے ہی منور بھائی نے جس طرح کی گفتگو کا آغاز کیا تھا اس نے سیف اللہ کو اچھی طرح یہ ذہن نشین کروا دیا تھا کہ اسے بھیڑ کی کھال میں چھپے ہوئے بھیڑیے کی طرح اپنے دُہرے کردار کو مزید کچھ روز جاری رکھنا پڑے گا۔

"یہاں کا آزاد ماحول ہمارے یہاں سے آئے ہوئے کسی بھی شخص کو گمراہ کر دینے کے لیے کافی ہے اور اگلے چند دنوں میں یہاں تم یقیناً ایسے بے شمار پاکستانی لڑکوں سے ملو گے جو وطن سے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے نکلے تھے مگر یہاں کی رنگین بھول بھلیوں میں ایسے کھوئے کہ اب وہ خود بھی چاہیں تو اپنے آپ کو تلاش نہیں کر سکتے۔" منور بھائی نے اپنے گھر والوں کی خیریت اور اس کے سفر کی مشکلات کے بارے میں سوالات کرنے کے بعد اس سے کہا تھا۔

"ماضی کے ان درخشاں ستاروں میں سے کچھ تمہیں کینڈی اسٹورز پر ملیں گے تو چند پیٹرول بھرتے ہوئے اور ہوٹلوں میں بیرا گیری کرتے اور میلی پلیٹوں کی صفائی کرتے ہوئے دیکھو گے۔ ان میں سے ہر ایک کے ماضی میں یہ دن اسی طرح آیا تھا جیسے آج تمہارے حال میں آیا ہے لیکن چونکہ ان لڑکوں نے خواہشات کے گھوڑے پر سواری کرنے کے بجائے اسے اپنے اوپر سوار کر لیا اس لیے آج ان کا یہ حال ہے کہ ان کا نہ کوئی حال ہے اور نہ مستقبل۔"

منور بھائی کے نزدیک وہ ایک ایسا شخص تھا جو اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے نئے ماحول کی چمک سے اس قدر متاثر بھی ہو سکتا تھا کہ گھر کا راستہ بھولنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی فراموش کر سکتا تھا کہ وہ کیا مقصد لے کر امریکا پہنچا تھا لیکن یہ بات انہوں نے اس لیے سوچی تھی کہ وہ سیف اللہ سے پوری طرح واقف نہیں تھے۔ انہیں یہ علم نہیں تھا کہ وہ ایک ایسے شخص سے گفتگو کر رہے ہیں جو عمر میں ان سے کم ہی سہی لیکن کچھ مخصوص معاملات میں ان سے زیادہ تجربہ کار ہے۔

سیف اللہ نے پہلے روز منور بھائی کی گفتگو نہ صرف پوری توجہ سے سنی تھی بلکہ ان کی زبان سے نکلی ہوئی چند اہم باتوں کو اس نے اپنی گرہ سے بھی باندھ لیا تھا۔ یہاں تک کہ لیزا کے فلیٹ میں منتقل ہو جانے کے باوجود بھی اس نے منور بھائی کے روزِ اول دیے گئے مشوروں کو نظرانداز نہیں کیا تھا۔ خود لیزا بھی بہت سے معاملات میں دیگر امریکی لڑکیوں سے قدرے مختلف لڑکی تھی مگر سیف اللہ کے ساتھ خصوصی برتاؤ کی سب سے بڑی اور اہم وجہ یہ تھی کہ لیزا سیف کی پسند نہیں تھی بلکہ سیف اللہ کو لیزا نے پسند کیا تھا۔

منور بھائی کے پاکستان واپس جانے سے جو وقتی پریشانی سیف اللہ کو ہوئی تھی اس کا حل بھی لیزا نے پہلے ہفتے میں ہی نکال لیا تھا۔ اسے اس بات پر حیرت تھی کہ سیف اتنے کم پیسوں میں لیبارٹری کی نوکری کیوں کر رہا ہے۔

"اس کے علاوہ لیبارٹری کی اس نوکری کی اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ حسین صاحب کے یہاں میں نیوارک میں آ کر رہا تھا۔ وہ ایک ڈاکٹر تھے اور فوری طور پر انہوں نے میرے لیے یہ کہتے ہوئے اس ملازمت کا بندوبست کیا تھا کہ چونکہ وہاں زیادہ کام بھی نہیں ہے اس لیے تم تھکے بغیر رات میں گھر آ کر آرام سے اسٹڈی کر سکو گے اور اتنے پیسے بہرحال مجھے اس جاب سے مل ہی جاتے ہیں کہ گزارا ہو جائے گا۔"

"صرف گزارا کر لینے کا نام تو زندگی نہیں ہے۔" لیزا نے ایک ادائے دلبری کے ساتھ کہا تھا۔

"تو پھر...؟" سیف کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ سکی تھی کہ لیزا کہنا کیا چاہ رہی ہے۔

"زندگی کے اصل خدوخال سے لطف اٹھانے کے یہی تو دن ہیں۔" لیزا اب بھی اپنے کہے کی وضاحت کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

"زندگی کے خدوخال سے لطف اٹھانے کے لیے تو ابھی ایک عمر پڑی ہے۔" سیف نے اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے ہوئے کہنا چاہا تھا مگر لیزا نے اس کی یہ دلیل تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

"بھول ہے تمہاری۔" اس نے اٹھلاتے ہوئے کہا تھا اور پھر قبل اس کے کہ سیف اللہ کچھ کہتا اُس نے اپنی بات کہنی شروع کر دی۔

"تعلیم مکمل ہو گی تو پھر تم جاب کی بھول بھلیوں میں اس طرح کھو جاؤ گے کہ تمہیں کچھ بھی یاد نہیں رہے گا، وہاں سے ابھی نکلنے بھی پاؤ گے کہ شادی کر لو گے اور پھر بچے اور پھر وہی صبح و شام کا ایسا چکر ہو گا کہ زندگی سے لطف اٹھانا تو کجا تمہیں سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ملے گی، بلکہ بہت ممکن ہے کہ اس وقت تم اتنے گنجے ہو جاؤ کہ تمہیں سر کھجانے کی ضرورت ہی نہ رہے۔"

لیزا نے جس انداز سے اپنی گفتگو کا اختتام کیا تھا، اس نے

دونوں کو قہقہہ لگانے پر مجبور کر دیا تھا لیکن سیف اللہ قہقہہ لگانے کے ساتھ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ لیزا کا تجزیہ حقیقت سے قریب تر ہے اور وہ جو یہ سوچ کر زندگی کی بہت سی سرگرمیوں سے دور تھا کہ "یہ سب کچھ میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد کرلوں گا۔" وہ تجزیہ غلط تھا۔

"زندگی کے خدوخال سے میں جتنا لطف اٹھا رہا ہوں اتنا ہی کافی ہے' کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ زیادہ لطف مجھے بدہضمی کردے اور میں کہیں کا نہ رہوں۔" سیف اللہ نے لیزا پر شرارتی نظر ڈالتے ہوئے کہا تھا لیکن وہ کوئی مشرقی لڑکی تو تھی نہیں کہ شرما کر منہ دوسری طرف پھیر لیتی یا دوپٹے کے کونے سے کھیلنے لگتی۔ وہ تو ایک جوان و بالغ امریکن لڑکی تھی اور اس کا جواب اس نے وہی دیا تھا جو اسے زیب دیتا تھا۔

"میں اس وقت اس موضوع پر وہ گفتگو نہیں کرنا چاہتی ہوں جو دنیا میں تمہیں سب سے زیادہ عزیز ہے بلکہ میں تو تم سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میں نے اپنے بار کے منیجر سے بات کرلی ہے' اب اگر تم چاہو تو پرسوں سے بارٹینڈر کی جاب جوائن کرسکتے ہو۔"

جس اعتماد سے لیزا نے وہ بات کہی تھی اس سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ لیزا کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں ہوگی کہ سیف اللہ اس جاب سے انکار کرسکتا ہے۔

"سوری لیزا..... میں یہ نوکری نہیں کرسکتا....." سیف اللہ کے فوری اور دوٹوک جواب نے ایک لمحے کے لیے تو جیسے لیزا کو گنگ کر دیا تھا۔

"تم جانتے بھی ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو....؟" اس نے حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز میں سوال کیا تھا۔

"جب شراب کے بارے میں میری معلومات صفر سے کچھ ہی زیادہ ہیں تو میں یہ....."

"یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" لیزا نے اس کا فقرہ درمیان میں سے ہی اچک لیا تھا۔ "زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے میں تم اتنے ایکسپرٹ ہو جاؤ گے کہ بہترین کاک ٹیل بنانے لگو گے۔" اپنا پہلا اعتراض اس بری طرح مسترد ہوتا دیکھ کر سیف اللہ کے پاس اور کوئی راستہ نہیں رہا تھا کہ وہ اصل بات زبان تک لے ہی آئے۔

"بات دراصل یہ ہے لیزا کہ میں مسلمان ہوں۔" سیف اللہ نے تمہید باندھنی چاہی لیکن اس بار بھی وہ درمیان سے فقرہ اچک گئی۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے میں بھی کیتھولک ہوں۔" وہ کچھ سننے کے لیے تیار ہی نہیں ہو رہی تھی۔

"میرا مطلب ہے کہ ہمارے مذہب میں شراب کو چھونا تک معیوب سمجھا جاتا ہے۔ ہم اسے حرام سمجھتے ہیں۔" سیف اللہ نے ڈرتے ڈرتے کسی نہ کسی طرح یہ بات کہہ دی تھی۔ اسے خطرہ تھا کہ کہیں بے لگام لیزا اس سے یہ نہ کہہ دے کہ اپنے مذہب کی تم اور کتنی باتوں پر عمل کر رہے ہو جو اس بات پر عمل نہ کرنے سے فرق پڑ جائے گا لیکن لیزا کے قہقہے نے اس کا یہ خوف دور کر دیا۔

"بیوقوف آدمی... اسی لیے تو میں کہہ رہی تھی کہ تمہیں پتا بھی نہیں ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔" اس نے اپنے قہقہے میں ایک وقفہ دیتے ہوئے کہا اور پھر دوبارہ ہنسنے لگی۔ "تمہارے بار میں تمہاری ایک دن کی آمدنی تمہاری اس نوکری کی ہفتہ بھر کی کمائی سے زیادہ ہوگی۔" آمدنی میں اچانک سات گنا اضافے کے تصور سے بھی سیف اللہ کے قدم لڑکھڑائے تھے۔

"جیب میں ایک بار پیسے آجائیں تو بہت سے وسوسے خود بخود دور ہو جاتے ہیں۔" لیزا نے لالچ کے چارے کو دگنا کرتے ہوئے کہا۔

"وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن....." سیف اللہ نے لالچ سے مغلوب آواز میں کہا مگر لیزا نے اس بار بھی اس کا فقرہ مکمل نہیں ہونے دیا۔

"اگر ٹھیک ہے تو پھر بحث کس بات کی ہے....؟" لیزا نے اس کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ "میں جہاں جاب کرتی ہوں اس کا شمار نیویارک کے چند بڑے کلبوں میں ہوتا ہے اور تم شاید اس بار کے پہلے ناتجربہ کار بارٹینڈر ہوگے ورنہ تو لوگ محض وہاں ملنے والی ٹپ کی خاطر اپنی اچھی خاصی نوکریاں چھوڑ دیتے ہیں اور ایک تم بیوقوف ہو کہ محض مذہب کے چکر میں آکر گھر آئی ہوئی دولت سے پیچھا چھڑانا چاہ رہے ہو۔"

"آخر تمہارے کلب کا مالک مجھ پر کیوں مہربان ہوگیا ہے کہ بغیر مجھ جیسے ناتجربہ کار سے ملے ہوئے نوکری بھی دے رہا ہے؟" سیف کے دل کی بات آخر زبان پر آہی گئی۔

"اس نے ملازمت تمہیں تو نہیں دی۔" لیزا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس ملازمت کا تو میں نے سودا کیا ہے۔"

"کیسا سودا.....؟" سیف کچھ نہیں سمجھا تھا۔

"کلب کا وہ کالا' موٹا' بے ہنگم منیجر ایک عرصے سے مجھ پر مہربان ہونے کے بہانے تلاش کر رہا تھا مگر میں سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی انجان بنی ہوئی تھی لیکن تمہاری اس نوکری کے لیے میں نے یہ ذہنی کوفت بھی برداشت کرلی۔" لیزا کے اشارے بہت واضح تھے۔ سیف اللہ نے اس کے چہرے پر شرمندگی کے آثار ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن وہاں اسے طمانیت کے علاوہ اور کچھ نہیں ملا۔ اپنا مقصد حاصل کرنے کے بعد وہ یہ بھی بھول چکی تھی کہ یہ مقصد اس نے کس طرح حاصل کیا ہے۔

لیزا کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے نہ جانے کیوں اسے ایک بار پھر نزہت کا خیال آیا تھا۔ ایسا اس سے پہلے بھی ایک دو بار ہوا تھا کہ غیر ارادی طور پر اس نے لیزا اور نزہت کے درمیان موازنہ کیا تھا لیکن پھر کسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے ہی اس نے اپنے ذہن کو دوسری باتوں میں الجھا لیا تھا۔

"کم آن سیف....." لیزا نے اپنی بانہیں اس کے گلے میں ڈال دی تھیں۔ "آخر ہم دوست ہیں اور دوستوں کے لیے اتنی

قربانی تو دی جانی چاہیے۔" لیزا کے پاس اپنی ہر حرکت کا جواز موجود ہوتا تھا۔

مزاحمت کی وہ ہلکی سی دیوار جو پہلے ہی ڈھلا ہی تھی لیزا کی جانب سے ملنے والا یہ آخری دھکا برداشت نہ کر سکی اور سیف اللہ نے یہ سوچتے ہوئے اس نوکری کو قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا کہ اس کے انکار سے لیزا کی دل آزاری بھی ہو سکتی ہے کہ میری خاطر اس نے جس جاب کے لیے اتنی محنت کی اسے میں یکسر مسترد کر رہا ہوں۔

"بعد میں کچھ عرصے بعد کوئی اور بہانہ بنا کر ایسی نوکری کو چھوڑا بھی جا سکتا ہے۔" ذہن نے جواز فراہم کیا۔

سیف اللہ کے اقرار کے ساتھ ہی لیزا کے چہرے پر خوشیوں کے وہ رنگ بکھرے تھے جن کا سیف تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

"اس سے زیادہ خوشی مجھے آج تک نصیب نہیں ہوئی تھی۔" اس نے اپنے آپ کو سیف کی گود میں جذبات سے بے قابو ہو کر گراتے ہوئے کہا تھا۔

سیف اللہ خوشی کے اس مظاہرے کو اپنے لیے لیزا کے دوستانہ جذبات کا اظہار سمجھا تھا لیکن ایک ہفتے بعد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ لیزا کی اصل خوشی یہ نہیں تھی کہ سیف اللہ نے اس کی بات تسلیم کر لی تھی بلکہ اس کی خوشی کا محور کچھ اور تھا۔

وہ اور لیزا ایک ساتھ کلب سے فارغ ہو کر گھر کی جانب آ رہے تھے تب اس نے ہفتہ بھر پہلے کی اپنی خوشی کا اصل سبب بتایا تھا۔ وہ ہفتے کا دن تھا اور دیگر پارٹ ٹائم جاب کرنے والے طالب علموں کی طرح وہ اور لیزا بھی جمعہ اور ہفتہ کو ایکسٹرا ڈیوٹی دیا کرتے تھے کیونکہ ہفتے اور اتوار کو تو کالج کی چھٹی ہونے کی وجہ سے انہیں سویرے بیدار ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔

"آج تمہیں اس نئی جاب پر آئے سات دن ہو گئے ہیں۔ اب بتاؤ کہ تمہیں یہ نوکری کیسی محسوس ہوئی ہے؟"

"بہت اچھی بلکہ بہت ہی اچھی......" اس ایک ہفتے میں سیف اللہ کو اتنے پیسے ملے تھے کہ جب انہیں وہ پاکستانی روپوں میں تبدیل کرتا تو خود حیرت زدہ رہ جاتا کہ وہ اتنے پیسے بھی کما سکتا ہے۔

"تم خوش ہو اپنی اس نئی جاب سے......؟" لیزا کا لہجہ یہ سوال کرتے ہوئے گمبھیر ہو گیا تھا لیکن سیف اللہ کی توجہ چونکہ ڈرائیونگ کی طرف تھی اس لیے وہ لیزا کے اس بدلتے ہوئے لہجے پر توجہ نہیں دے سکا' یوں بھی وہ اس برستے ہوئے دھن کی خوشی کے ساتھ شراب کے ہلکے سے سرور میں بھی تھا۔ گاہکوں کے لیے جام بناتے ہوئے ایک آدھ چسکی لے لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھا جاتا تھا اور مفت کی شے پینے میں سیف اللہ کو عار محسوس نہیں ہوتی تھی۔

"خوش ہوں......؟" اس نے لیزا کے سوال پر ایک لمحے کے لیے ڈرائیونگ کی جانب سے توجہ ہٹا کر اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"میں خوش نہیں ہوں بلکہ بہت زیادہ خوش ہوں۔" اس نے اتنی زور سے یہ فقرہ کہا تھا کہ کار میں اس کی آواز گونج کر رہ گئی تھی۔

"اور تمہیں میری جاب پر کوئی اعتراض بھی نہیں ہے؟" لیزا نے سوال کیا تو سیف اللہ کی توجہ ایک بار پھر ڈرائیونگ سے ہٹ گئی۔

"تمہاری جاب سے میرا کیا تعلق......؟" اس نے سوال کے جواب میں سوال کیا تھا۔

"میں اس لیے یہ سوال کر رہی ہوں کہ جان کو میری اس جاب پر اعتراض تھا۔" لیزا نے اپنے فقرے کی وضاحت کی تو رقابت کی ایک لہر جو کئی روز سے دبی ہوئی تھی' ایک بار پھر عود کر آئی۔ 'یہ کمینہ جان پھر بیچ میں آن مرا۔' اس نے دل ہی دل میں اپنے ہم وطن کو گالیوں سے نوازا تھا لیکن ہونٹوں سے کوئی لفظ ادا نہیں کیا۔

"جان کو اعتراض یہ تھا کہ میں اتنا مختصر لباس پہن کر وہاں سرو کیوں کرتی ہوں' حالانکہ میں نے اس سے کہا تھا کہ یہ میری ڈیوٹی ہے اور اسی بات کی مجھے تنخواہ بھی ملتی ہے مگر وہ اپنی اس بات پر ڈٹا رہا کہ وہ اس بات کو کسی طور بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ میں اس طرح کھلی ٹانگوں اور نیم برہنہ لباس میں ایک ٹیبل سے دوسری ٹیبل تک تھرکتی مٹکتی پھروں۔"

'وہ پاگل کیا اس آزاد تتلی کو برقع پہنانے کے چکر میں تھا۔' سیف نے سوچا اور پھر تصور میں لیزا کو برقعے میں دیکھ کر وہ مسکرا اٹھا تھا۔

"میں صحیح کہہ رہی ہوں۔" لیزا جو پوری طرح اس کی جانب متوجہ تھی' اس نے اس مسکراہٹ کے کچھ اور معنی لیے تھے۔

"تمہاری بات کا تو مجھے یقین ہے' میں تو اس احمق آدمی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔" سیف اللہ نے کہا اور لیزا کے چہرے پر اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی۔

"جان تو میری اس معمولی سی بات پر اتنا ناراض ہو گیا تھا کہ اس نے مجھے تھپڑ مار دیا تھا' جب میں نے کہا تھا کہ اگر قدرت نے مجھے ایک خوبصورت جسم دیا ہے اور لوگ اسے دیکھ کر اپنا دل بہلا لیتے ہیں تو میں اس کی داد وصول کیوں نہ کروں!"

سیف اللہ کے حلق نے لیزا کے اس جواز کو نگلنے سے انکار کر دیا تھا لیکن اس کے باوجود بھی وہ خاموش رہا تھا۔ جان کی طرح سے وہ لیزا سے اختلاف کا اظہار کر کے خود کو لیزا کے سابق بوائے فرینڈز کی صف میں شامل نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ فی الوقت اس کا تمام تر مفاد لیزا کی خوشنودی سے وابستہ تھا۔ فلیٹ کے کرائے اور دیگر اخراجات میں وہ ففٹی ففٹی کا پارٹنر ضرور تھا لیکن لیزا کی کار میں کالج آنے اور پھر وہاں سے واپس اور پھر شام میں اسی کے ساتھ کلب جانے اور واپسی کے اخراجات میں شیئر کرنے سے لیزا نے انکار کر دیا تھا۔

"تمہاری موجودگی میں تو میرا سکرا چھا کٹ جاتا ہے اس لحاظ سے تو معاوضہ مجھے دینا چاہیے۔" اس نے جواب دیا اور معاملہ ہنسی ہنسی میں ختم ہو گیا تھا۔

"اس بارے میں تو میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا کہ جان کیا کہتا تھا اور کیوں کہتا تھا لیکن ذاتی طور پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ تمہارا ذاتی مسئلہ ہے اور مجھے تمہارے ذاتی معاملے میں دخل دینے کا کوئی حق نہ پہلے کبھی تھا نہ آئندہ کبھی ہوگا۔" سیف اللہ کا جواب شاید لیزا کی توقعات سے کہیں بڑھ کر تھا اس لیے وہ چند لمحے خاموش اسے دیکھتی رہی' جیسے اسے یقین ہی نہ آرہا ہو کہ سیف یہ بات کہہ بھی سکتا ہے۔

سیف اللہ نے کن انکھیوں سے یہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود اور اچھی طرح یہ سب کچھ سمجھنے کے باوجود کہ لیزا کا یہ رد عمل کیوں ہے "انجان بن کر اپنی پوری توجہ ڈرائیونگ کی جانب مرکوز رکھی تھی۔

"کتنا فرق ہے تم میں اور جان میں!" لیزا بڑبڑانے والے انداز میں بولی تھی اور سیف اللہ کو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ لیزا اس کی تعریف کر رہی ہے یا اس کا یہ فقرہ محض غصے پر مبنی ہے۔

"آج جس جاب کو حاصل کر کے تم خوشی کا اظہار کر رہے ہو' کبھی میں نے اس جاب کی بات جان سے کی تھی لیکن وہ تو یہ سن کر ہی اس طرح بھڑک اٹھا تھا جیسے میں نے اسے کوئی گندی سی گالی دے دی ہو۔" لیزا کا فقرہ مکمل ہوا تو سیف اللہ کو یوں محسوس ہوا جیسے کہ اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ کر بکھر گئی ہو مگر بکھرتی ہوئی شے کی گونج ابھی باقی تھی کہ لیزا نے اپنا سر اس کے کاندھوں پر ٹکا دیا۔

"آئی لو یو سیف...." وہ بھرائی ہوئی آواز میں بول رہی تھی۔

"آئی رئیلی لو یو۔"

"می ٹو لیزا۔" وہاں کے مروجہ دستور کے مطابق اسے جواب دینا چاہیے تھا اس لیے سیف اللہ یہ کہے بغیر نہیں رہ سکا۔

اپنی محبتوں کی یقین دہانیاں کرواتے ہوئے ان دونوں کے ذہن میں یہ بات واضح تھی کہ جسے وہ محبت کا نام دے رہے ہیں وہ ہوس اور ضرورت تو ہو سکتی ہے لیکن محبت نہیں ہے لیکن ہر کمزور آدمی کی طرح وہ دونوں بھی اپنی کمزوری کا اعتراف کرنے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ نہیں تھے۔

لیزا کی مہربانی سے ملنے والی جاب نے سیف اللہ کو کسی حد تک استحکام بخشا تھا اور ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ اس کے اعتماد میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا اور آہستہ آہستہ وہ بہت سے ایسے معاملات میں بھی خود اعتمادی کا مظاہرہ کرنے لگا جہاں وہ اپنی کسی کمزوری کے پیش نظر خاموش ہو جاتا تھا۔ اس کی اس خود اعتمادی کا پہلا بڑا شکار ارادھنا بنی تھی جس سے سیف اللہ نے تعلقات بھی اس لیے استوار رکھے تھے کہ کسی ہنگامی ضرورت کے تحت وہ اس کے کام آسکتی تھی۔

"تعلیم مکمل کرنے کے بعد تم وطن واپس جاؤ گے کیا؟" تقریباً ہر روز کلاس میں آمنا سامنا ہونے کے باوجود ان دونوں کے تعلقات میں اس روز سے سرد مہری آتی چلی گئی تھی جس روز منور بھائی نے اسے بتایا تھا کہ وہ وطن واپس جا رہے ہیں۔ اس روز ارادھنا کی پارٹی میں سیف اللہ اس کے ایک انڈین چچا سے اس وقت الجھ گیا تھا جب انہوں نے تقسیم ہند کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے اچانک مسلم لیگ کے زعما کے بارے میں گندی زبان استعمال کرنی شروع کر دی تھی۔

ارادھنا نے اگرچہ فوراً ہی معذرت بھی کر لی تھی اور بات وقتی طور پر ختم بھی ہو گئی تھی لیکن سیف اللہ کے دل میں ایک بال ضرور آگیا تھا لیکن جب سیف اللہ نے اتنی بچت کرنی شروع کر دی کہ اسے ایک ذہنی یکسوئی حاصل ہو گئی تب سے ارادھنا کی ضرورت میں اور بھی کمی آگئی تھی' رہی سہی کسر ارادھنا نے لیزا سے اس کے تعلقات پر اعتراضات کر کے پوری کر دی تھی لیکن سیف اللہ پھر بھی محض اس لیے تعلقات نبھائے چلا جا رہا تھا کہ ارادھنا کو وہ اب بھی "اسامی" سمجھ رہا تھا۔

"ابھی میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے لیکن بہت ممکن ہے کہ میں واپس نہ جاؤں۔" سیف اللہ نے ایک محتاط جواب دیا تھا۔ وہ دونوں کلاس ختم ہونے کے بعد کلاس میں ہی اس لیے رک گئے تھے کہ ارادھنا نے اس سے کہا تھا کہ "وہ کچھ ضروری بات کرنا چاہتی ہے۔"

"پاکستان واپس نہ جانے کا تمہارا فیصلہ اس لیے بہت بہتر ہوگا کہ وہاں ابھی اتنی ترقی نہیں ہوئی ہے کہ وہ تمہاری تعلیمی قابلیت سے پوری طرح فائدہ اٹھا سکیں۔" ارادھنا کے فقرے کے جواب میں کوئی تلخ بات کہنے سے سیف اللہ نے صرف اس لیے گریز کیا تھا کہ وہ بات بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔

"اصل بات یہ ہے کہ میں یہاں رہ کر زندگی کو زیادہ قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں۔" اس نے ضبط کرتے ہوئے ایک بار پھر ڈپلومیٹک جواب دیا تھا۔

"ہاں.... یہ بات تو ہے۔ وہاں بغیر شادی کیے لڑکا لڑکی اس طرح ایک فلیٹ میں رہ نہیں سکتے جس طرح تم یہاں رہ رہے ہو۔" ارادھنا نے طنز کا ایک اور تیر چلایا لیکن سیف اللہ اسے سہہ گیا۔

"تمہیں کوئی ضروری بات کرنی تھی؟" سیف اللہ نے خون کے گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔

"رات میری اپنے پاپا سے فون پر بات ہوئی تھی۔" ارادھنا نے بھی موضوع تبدیل کر لیا تھا۔ "وہ کچھ اس طرح کا پلان کر رہے ہیں کہ میں یہاں سے واپسی پر اپنا بزنس اس طرح قائم کروں کہ میری یہ تعلیم بھی اس میں پوری طرح استعمال ہو سکے لیکن میں نے ان سے کہا ہے کہ میں اکیلی چونکہ وہ بزنس نہیں سنبھال سکوں گی اس لیے میرا ایک کلاس فیلو بھی میرے ساتھ ہوگا۔" اپنے طور پر

وہ بڑی عقلمند بن رہی تھی لیکن سیف اللہ کو یقین تھا کہ وہ ایک بار پھر اسے اپنی دولت سے مرعوب کرکے اپنے ٹرانس میں لینا چاہتی ہے۔

"تم نے یہ کیسے جان لیا کہ میں تمہارے ساتھ انڈیا جانے پر تیار ہو جاؤں گا؟" اس بار سیف اللہ اپنے لہجے میں غصے کی لہر کو چھپا نہیں سکا تھا۔

"اس طرح سے کہ میرا اندازہ تھا کہ تم پاکستان واپس جانا نہیں چاہتے اور اگر پاکستان نہیں جا رہے ہو تو تمہارے لیے امریکا اور انڈیا میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے۔"

"مگر ان دونوں ملکوں میں فرق ہے...." سیف اللہ پھنکارا لیکن ارادھنا نے اب بھی اس کے لہجے کی جانب توجہ دیے بغیر اپنی بات کہنے کی کوشش کی تھی۔

"پاپا نے کہا ہے کہ وہ ایک دو مہینوں میں یہاں کا چکر لگائیں گے۔ میرا خیال ہے ان سے مل کر ہی تم باقی تفصیلات بھی طے کر لینا۔" وہ اپنی رو میں کہتی چلی جا رہی تھی مگر سیف اللہ نے اس کا جملہ کاٹ دیا۔

"میں کسی قیمت پر بھی انڈیا نہیں جاؤں گا۔" اس بار اس کی آواز میں بھی تیزی تھی۔

"کیوں....؟" ارادھنا نے حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہاری مذہبی کتابوں کے مطابق دھرتی ماں ہوتی ہے ہے نا؟" سیف اللہ اس آفر پر بھنا گیا تھا۔

"لیکن اس بات کا کہ تم انڈیا...." ارادھنا نے اس کا فقرہ درمیان میں سے اچکنا چاہا لیکن سیف اللہ نے اسے یہ موقع نہیں دیا اور اس کی قطع کلامی کرتے ہوئے دوبارہ اپنی گفتگو شروع کی۔

"اگر تمہاری کتاب کے لکھے کو سچ مان لیا جائے تب تم بتاؤ کہ ایک بیٹا اپنی ماں کے دشمنوں کی ملازمت کیوں کرے۔" ارادھنا کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے منہ پر تھپڑ رسید کیا ہو۔

"اس کا مطلب ہے کہ بن مانس کے دیس کی وہ سفید بندریا تمہارے اس حد تک قریب ہو گئی ہے کہ اس کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔" ارادھنا نے ہفتوں سے تیار کردہ پلان تباہ ہوتے دیکھ کر اپنا غصہ لیزا پر اتارا تھا جبکہ سیف اللہ کا جواب اتنا واضح تھا کہ لیزا کا اس میں ذکر تک نہیں آنا چاہیے تھا لیکن وہ سیف اللہ سے تعلقات خراب نہیں کرنا چاہتی تھی اور ساتھ ہی اسے اپنا غصہ بھی کسی پر اتارنا ضرور تھا۔

ارادھنا کا خیال تھا کہ سیف اللہ اس کے جواب میں خاموش رہے گا لیکن جو کچھ اس کے بعد ہوا تھا اس سے ارادھنا کے تمام خیالات غلط ثابت ہوئے تھے۔

"کالی مائی کے دیس کی کالی بلی کو گلے لگانے سے تو بہتر ہے کہ میں کسی سفید بندریا ہی کے قریب ہو جاؤں۔" سیف اللہ کے جواب نے ارادھنا کے وجود میں چنگاریاں بھر دی تھیں۔

"تم میرا مقابلہ اس کمینی سے کر رہے ہو جو بکنی پہن کر اپنے جسم کی نمائش کرکے روزی کماتی ہے۔" ارادھنا نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا تھا۔

"تم میں اور لیزا میں فرق اگر کوئی ہے تو صرف اتنا کہ تم اپنے حوصلے میں کمی کی وجہ سے وہ سب کچھ براہ راست کہہ نہیں سکتی ہو جو وہ کہہ دیتی ہے ورنہ تم میں اور اس میں اور کوئی فرق نہیں ہے۔" سیف اللہ نے نتائج سے بے پروا ہوتے ہوئے کہا۔ "جو جگہ کل تک خالی تھی، آج تیزی سے پیش قدمی کرنے کی وجہ سے لیزا اس پر موجود ہے اور تم اسے ہٹا کر وہ جگہ لینا چاہتی ہو اور لے بھی سکتی ہو اگر اپنے پاپا کی دولت کا جھوٹا سہارا لینے کے بجائے اپنے اندر حوصلہ پیدا کرتے ہوئے اپنی خواہش کا براہ راست اسی طرح اظہار کرو جس طرح لیزا کرتی ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ لیزا کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا بلکہ وہ تو خوش ہوگی کہ تم بھی...."

"ٹاؤ دس از لیسٹ...." ارادھنا نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"سچ کڑوا ہوتا ہے لیکن حقیقت کا سامنا نہ کرنے والے صرف منصوبے بناتے رہ جاتے ہیں۔" سیف اللہ نے اس کے غصے کی جانب توجہ دیے بغیر کہا۔

ارادھنا پیر پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی تب بھی سیف اللہ نے کاندھے اچکانے کے علاوہ کسی اور ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔

○☆○

جب ارادھنا نے سیف اللہ کو لیزا کا جادو سر چڑھ کر بولنے کا طعنہ دیا تھا اس وقت صورت حال ویسی نہیں تھی لیکن آہستہ آہستہ بالکل ویسا ہی ہو گیا تھا جیسا کہ ارادھنا نے کہا تھا۔ لیزا آہستہ آہستہ اسے ہر معاملے میں اس طرح اپنا محتاج بناتی گئی کہ سیف اللہ کو لیزا کی غلط بات بھی صحیح نظر آتی تھی۔ لیزا اس کی زندگی کا محور اس طرح سے بن چکی تھی کہ اسے نہ تو لیزا میں کوئی خامی نظر آتی تھی اور نہ ہی وہ لیزا کی زبان سے نکلی ہوئی کسی بات سے انکار کر سکتا تھا۔ دوسری جانب لیزا کی بھی یہ حالت تھی کہ اس کے دوست بدلتے رہتے تھے لیکن سیف اللہ سے تعلقات کبھی مدوجزر کا شکار نہیں ہوئے تھے، اس نے سیف کو ہر حالت میں اپنی توجہ کا مرکز بنائے رکھا۔

دن گزرتے رہے، یہاں تک کہ ان دونوں نے تعلیم سے فراغت حاصل کرلی۔ لیزا کو تعلیم کے آخری دنوں میں ایک اخبار کی ملازمت مل چکی تھی لیکن سیف اللہ اب بھی کلب کی نوکری کر رہا تھا لیکن اب ترقی کرکے وہ بار اور ریسٹورنٹ کا انچارج بن چکا تھا۔ اس دوران اس کا پاکستان سے تعلق شاید ختم ہی ہو جاتا لیکن نزہت کے گھر ٹیلیفون آجانے کی وجہ سے یہ رابطہ برقرار رہا تھا کیونکہ خطوں میں بڑھتے ہوئے وقفے کی کسر وہ مہینے میں ایک دو فون

کر کے پوری کر لیتا تھا۔

لیزا کی موجودگی نے نزہت کے خدوخال مدھم ضرور کر دیے تھے لیکن ختم نہیں ہوئے تھے' البتہ پہلے وہ تقابل جو وہ لیزا اور نزہت کے درمیان اکثر کیا کرتا تھا اب وہ ختم ہو گیا تھا۔ اب سیف اللہ کو اپنے ہر جانب نزہت ہی نزہت نظر آئی تھی۔ اپنا آخری امتحان پاس کر لینے کی خبر پاکستان دیتے ہوئے سیف اللہ کے ذہن میں یہ بات نہیں رہی تھی کہ اس جانب سے لوٹ آنے کی فرمائش بھی ہو سکتی ہے۔ "خالہ جان' مجھے اب بھی شاید ایک سال لگ جائے واپس آنے میں کیونکہ میں کچھ تجربہ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے موضوع کو ٹالنا چاہا تھا۔

"بات یہ ہے سیفی بیٹے کہ تمہارے خالو جان کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے اور وہ اسپتال میں ہیں۔" انہوں نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"کیوں' خیریت...." اس نے سرسری انداز میں کہا لیکن اس کے جواب میں جو کچھ کہا گیا اس سے سیف اللہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

"دراصل تمہارے جانے کے سال بھر بعد ہی تمہارے خالو کو فالج ہو گیا تھا اور وہ جب سے گھر پر ہی ہیں کیونکہ اس فالج نے انہیں چلنے پھرنے سے معذور کر دیا تھا۔"

"آپ نے اب تک مجھے نہیں بتایا....؟" سیف اللہ نے احتجاج کیا۔

"نزہت کا خیال تھا کہ یہ خبر تمہاری توجہ تعلیم کی جانب نہیں رہنے دے گی۔" انہوں نے کہا تھا۔

"گزارے کی کیا صورت حال ہے....؟" سیف اللہ ان کے مالی حالات سے اچھی طرح واقف تھا اس لیے اس نے یہ سوال کر لیا تھا۔

"نزہت نے اپنی پڑھائی ختم کر کے نوکری کر لی ہے اور اسی کی تنخواہ سے گزارا ہو رہا ہے۔" سیف اللہ کے دل میں اتنا کچھ سننے کے بعد بھی ہمدردی کی لہر اٹھنے کے علاوہ اور کسی جذبے نے سر نہیں ابھارا تھا۔

"اگر آپ اتنی غیریت برتنے کے بجائے پہلے ہی اصل صورت حال بتا دیتیں تو کم از کم نزہت کو اپنی تعلیم تو ختم نہیں کرنی پڑتی۔" سیف اللہ نے شکایت کی تھی۔

"بس بیٹے کیا بتاؤں' نزہت کسی طرح تیار ہی نہیں تھی تمہیں بتانے کے لیے۔" بھولی خالہ کو بھانجے کی جانب سے کیے گئے تسلی کے چند لفظوں نے آبدیدہ کر دیا تھا۔ "آج بھی وہ گھر پر نہیں ہے تب میں تمہیں بتا رہی ہوں ورنہ تو وہ جب بھی تم سے بات ہوتی ہے' سر پر ہی کھڑی رہتی ہے بلکہ میرے کان سے کان لگا کر تمہاری آواز سن کر خود کو تسلی دے لیتی ہے۔" سیف اللہ کو دیگر تمام باتوں کا تو یقین آگیا تھا لیکن وہ اس آخری بات کو تسلیم کرنے کے لیے اپنے ذہن کو آمادہ نہ کر سکا کہ جس لڑکی نے آج تک اسے خط نہیں لکھا ہو اور نہ ہی کبھی ٹیلیفون پر بات کی ہو' وہ کس طرح اتنا آگے جا سکتی ہے۔

"میں آج ہی کچھ رقم روانہ کر رہا ہوں۔" سیف اللہ نے معاملے کو نمٹانے والے انداز میں کہا تھا۔

"نہیں بیٹا' یہ نہ کرنا۔" خالہ بولیں۔ "تم نے اگر رقم بھیجی تو نزہت سمجھ جائے گی کہ میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔" سیف اللہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تنگی ترشی سے گزارا کرنے اور رقم کی شدید ضرورت ہونے کے باوجود اس کی خالہ یا نزہت رقم لینے سے انکاری کیوں ہیں حالانکہ اگر وہ چاہیں تو اس سے کم از کم اس رقم کا تو مطالبہ کر ہی سکتی ہیں جو انہوں نے اسے روانگی کے وقت دی تھی۔

"بس بیٹا' جتنی جلدی ہو سکے آجاؤ کیونکہ میں تم دونوں کے فرض سے فارغ ہو کر سکون سے مرنا چاہتی ہوں۔" خالہ نے بھولی بسری یاد تازہ کی تو سیف اللہ مسکرا کر خاموش ہو رہا۔

'شادی اور وہ بھی نزہت جیسی لڑکی سے!' اس نے خالہ کی سادگی پر دل ہی دل میں قہقہہ لگایا۔

"اب تک تو تم دونوں کی شادی ہو کر دو تین بچے بھی ہو جانے چاہیے تھے۔" سیف اللہ کی خاموشی کا مطلب انہوں نے کچھ اور ہی لیا تھا۔ "یہاں پر تمہارے پرانے تمام دوست گھر بار والے ہو گئے ہیں بلکہ ان کے تین چار بچے بھی ہیں۔ آخر اب بھی شادی نہیں کرو گے تو کب کرو گے؟ کیا بوڑھے ہونے کے بعد اس بارے

میں سوچو گے؟" خالہ جان تو اور بھی کچھ کہہ رہی تھیں لیکن سیف اللہ کے دماغ میں یہی ایک بات اٹک کر رہ گئی۔

"میں ایک دو روز میں پھر رنگ کروں گا۔" سیف نے بات ختم کرنے والے انداز میں یہ کہہ کر جان چھڑائی تھی۔

'بڑی بی ہیں تو جاہل لیکن انہوں نے بات صحیح کہی تھی۔' اس نے ریسیور رکھنے کے بعد سوچا تھا۔ اس کے ذہن میں مستقبل کا تصور صاف اور واضح ہوتا چلا گیا تھا۔ کوئی بھی اچھی نوکری حاصل کرنے میں اس کے سامنے اب کوئی رکاوٹ نہیں رہ گئی تھی۔ لیزا سے شادی کرنے کا مطلب تھا کہ اسے فوراً ہی امریکی شہریت بھی مل جاتی اور اس کے ساتھ ہی بچوں کا مستقبل بھی محفوظ ہو جاتا۔

'مجھے آج ہی لیزا سے بات کرنی چاہیے۔' اس نے سوچا اور پھر اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا۔

شادی کے تصور کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں صرف ایک نام گونجا تھا۔۔۔ لیزا۔۔۔

'جہاں یہ صحیح تھا کہ وہ لیزا سے جدا ہونے کا تصور نہیں کر سکتا تھا' وہیں یہ بات بھی تھی کہ لیزا سے شادی کرنے میں اسے اپنا فائدہ ہی نظر آ رہا تھا۔

لیزا سے میری انڈراسٹینڈنگ بھی ہے' ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے بھی ہیں اور پھر یہ بات بھی ہے کہ وہ بھی جاب کرے گی اور مالی مسائل آدھے بھی نہیں رہیں گے۔ سوچ کا ہر راستہ لیزا ہی کی جانب جا رہا تھا اور پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اسے یقین تھا کہ لیزا کو بھی اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔

رات جب وہ گھر پہنچا تھا' اس وقت لیزا سو رہی تھی لیکن صبح اس نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ لیزا کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ لیزا اس کی زبان سے یہ فقرہ سنتے ہی اچھل پڑے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ شادی کے بارے میں سننے کے ساتھ ہی لیزا خاموش ہو گئی۔

"کیا تمہیں اس تعلق میں کوئی کمی محسوس ہونے لگی ہے؟" لیزا جب بولی تھی تو اس کی آواز سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"نہیں لیزا۔۔۔" اس نے فوراً ہی تردید کر دی تھی" لیکن میں اس تعلق کو مزید مستحکم کرنا چاہتا ہوں' اسے مزید وسعت دینا چاہتا ہوں۔" چرب زبان سیف اللہ اس وقت چرب زبانی کا مظاہرہ نہیں کر رہا تھا بلکہ لفظ خود بخود پھسلتے ہوئے اس کی زبان سے ادا ہو رہے تھے۔

"میں ایسے بچے چاہتا ہوں لیزا جن کے باپ کے نام کا خانہ خالی نہ ہو۔" ایک لمحہ رکنے کے بعد سیف اللہ نے وہ فقرہ ادا کر ہی دیا۔

"میں بھی اس مسئلے پر سوچ چکی ہوں لیکن کچھ چھوٹے پرابلم ہیں جنہیں اگر ہم پہلے ہی طے کر لیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔" لیزا نے اپنے لہجے کو قائم رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"مثال کے طور پر۔" سیف اللہ لیزا کو نیم رضا مند دیکھ کر خوش ہو گیا تھا۔

"میرا اور تمہارا تعلق دو مختلف تہذیبوں سے ہے اس لیے یہ سب کچھ طے کرنا لازمی ہے مثلاً شادی کے بعد تم کسی بھی مرحلے پر مجھے مجبور نہیں کرو گے کہ میں اس گرم مرطوب آب و ہوا والے ملک میں جا کر رہوں جو میرے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا۔" لیزا نے پہلا پرابلم بیان کیا تو سیف اللہ نے دل ہی دل میں 'وہ مارا' کا نعرہ لگایا۔

"میں کون سا واپس جانا چاہتا ہوں۔" اس نے سوچا لیکن زبان سے نہیں کہا۔ "اس کے علاوہ۔۔۔" وہ امریکی شہریت حاصل کرنے کے اپنے مقصد کو لیزا کی خواہش کا رنگ دے کر زیادہ فائدے میں رہ سکتا تھا۔

"تم مسلم ہو اور میں کیتھولک ہوں۔" لیزا نے دوسری رکاوٹ پر روشنی ڈالنی شروع کی" آئندہ کسی بھی مرحلے پر نہ تم مجھے مجبور کرو گے کہ میں مسلمان بن جاؤں اور نہ میں تم سے اصرار کروں گی کہ تم عیسائی بن جاؤ۔" سیف اللہ کو حیرت تھی کہ اتنا عرصہ ساتھ گزارتے ہوئے جو فرق کبھی واضح نہیں ہوا تھا' آج اچانک لیزا نے اس پر زور دینا کیوں شروع کر دیا تھا۔ "شادی البتہ اگر تم پسند کرو تو کیتھولک اسٹائل میں ہو گی' وہ بھی اگر تم پسند کرو ورنہ میں اصرار نہیں کروں گی۔"

"اور کچھ۔۔۔؟" سیف اللہ نے سرسری انداز میں کہا۔

"ہمارے بچوں کا اندراج البتہ کیتھولک کے طور پر ہو گا۔" لیزا نے بظاہر یہ بات یوں کہی تھی جیسے کوئی عام سی بات ہو لیکن سیف اللہ کو اپنے دل کے پاس ایک چٹکی لی جانے کی سی تکلیف محسوس ہوئی تھی۔

"لیزا! اس تمام عرصے میں جو ہم نے ساتھ گزارا ہے نہ تم چرچ گئی اور نہ میں مسجد گیا ہوں' اب اچانک تمہیں یہ کیوں یاد آ رہا ہے کہ تم۔۔۔"

"میں اپنی ذات سے زیادہ اپنے بچوں کے بارے میں فکر مند ہوں۔" لیزا نے اس کا فقرہ درمیان سے اچک لیا تھا۔ اس حرکت کا شمار لیزا کی عادتوں میں ہوتا تھا لیکن اس بار اس کی یہ حرکت سیف کو بہت بری محسوس ہوئی تھی۔

"تم اسے میری ضد کہو یا کچھ اور لیکن میں اس بارے میں کوئی سمجھوتا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ میری اولاد کی تربیت کیتھولک انداز سے نہ ہو۔" لیزا نے حتمی لہجے میں بحث ختم کرنے والے انداز میں کہا تھا۔ "دوسری صورت یہ ہے کہ ہم اسی طرح اس وقت تک ساتھ رہتے رہیں جب تک کوئی شدید اختلاف نہیں ہو جاتا۔" لیزا نے بحث ختم کر دی تھی لیکن سیف اللہ کے لیے اصل بحث کا آغاز اب ہوا تھا۔

کالج سے وہ فارغ ہو چکا تھا اس لیے لیزا کے اپنے دفتر روانہ ہو جانے کے بعد فراغت میں وہ اس موضوع پر جتنا سوچتا چلا جاتا

اتنی ہی اسے صورت حال تاریک سے تاریک تر نظر آنے لگی۔

"میں اس دن تک تمہارا انتظار کروں گی جس دن سورج مغرب سے طلوع نہیں ہو جاتا۔" سیف اللہ کو پہلی بار احساس ہوا تھا کہ وہ جس دلدل میں دھنستا چلا گیا تھا اس سے باہر نکلنے کی اب کوئی صورت نہیں ہے اور عین اس وقت جب وہ بالکل ہی مایوس ہو گیا تھا' یہ فقرہ اس کی یادوں کے نہاں خانے سے نکل کر ایک مددگار رسد کی طرح اس کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ کبھی اسے اپنی اولاد چرچ میں بیٹھی نظر آتی تو کبھی لیزا کی گود میں پروان چڑھنے والی بیٹی اسے اپنے کسی بوائے فرینڈ کے ساتھ بغیر شادی کے ایک فلیٹ میں برسا برس گزارتی نظر آتی تھی۔

سوچ کے دھارے ایک بار تبدیل ہوئے تو پھر تبدیل ہوتے چلے گئے' یہاں تک کہ وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا اور پھر وہ گھر سے نکل پڑا۔ رات میں جب لیزا اپنے دفتر سے لوٹی تو اسے سیف اللہ گہری نیند میں ڈوبا ہوا ملا تھا۔ سیف کا سامان بھی ایک جانب بندھا رکھا تھا۔ وہ بندھے ہوئے سامان کو دیکھ کر مسکرائی تھی۔ لیزا اسے ناراضگی کا اظہار سمجھ کر نہیں ہنسی تھی بلکہ یہ سوچ کر ہنسی تھی کہ نشے کا عادی کتنی دیر تک نشے سے دور رہنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ سیف کے لیے وہ ایک نشے کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔

"صبح تک ناراض رہو مائی ڈیئر....." اس نے سیف کی جانب فضائی بوسہ اچھالتے ہوئے کہا تھا۔ اسے اپنی ذات پر اعتماد تھا کہ وہ سیف کو منا لے گی لیکن صبح سیف نے اسے جگایا تو اسے احساس ہوا کہ بات کتنی آگے بڑھ چکی ہے۔

"میں ناشتا تیار کر چکا ہوں۔" سیف نے آنکھیں ملتی ہوئی لیزا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ لیزا ابھی یہ سمجھنے کی کوشش ہی کر رہی تھی کہ سیف اچانک مہربان کیوں ہو گیا ہے کہ اس نے وہ دھماکا کیا جو لیزا کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

"آخری بار میرے ساتھ ناشتا کر لو تو مجھے خوشی ہو گی۔"

"ناشتا کرنے سے پہلے ہی میں تمہیں منالوں گی۔" لیزا نے سیف کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا مگر سیف نے اس کے ہاتھ اپنی گردن سے نکال دیے۔

"میری فلائٹ کا وقت قریب آ رہا ہے' اس لیے بہتر ہو گا کہ تم جلدی سے تیار ہو جاؤ اور مجھے ہنسی خوشی رخصت کر دو۔" سیف نے دور ہٹتے ہوئے کہا۔

"تم مت ناراض ہو!" لیزا نے اپنا پرانا حربہ استعمال کیا تھا۔ اس کے یہی انداز تھے جن سے متاثر ہو کر سیف اس کا غلام بنا ہوا تھا۔

"نہیں' میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔" سیف نے تلخی سے گریز کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس میں اسے پوری طرح کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

"آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" لیزا نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں پاکستان واپس جا رہا ہوں۔" سیف نے جواب دیا۔

"جھوٹ.....؟" لیزا کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ سیف اتنا بڑا فیصلہ اکیلا بھی کر سکتا ہے۔

سیف نے اسے اپنا ٹکٹ دکھلایا جس کے مطابق تین گھنٹے بعد اس کی فلائٹ تھی۔

"یہ ٹکٹ سچ ہے یا جھوٹ لیکن میں اپنے تمام الفاظ واپس لیتے ہوئے کہتی ہوں کہ اب جیسا تم چاہو گے ویسا ہی ہو گا۔" لیزا کو معاملے کی نزاکت کا احساس ہوا تو اس نے اپنے ہتھیار پھینک دیے۔

"نہیں لیزا۔" سیف نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "تم نے مجھے احساس دلایا کہ آج تک میں جو کچھ کرتا رہا ہوں' وہ غلط تھا۔" سیف کے لہجے میں قطعیت ہونے کے باوجود لیزا نے ہمت نہیں ہاری تھی۔

سیف اللہ کے فلیٹ سے رخصت ہونے تک ان کے درمیان اسی طرح کی گفتگو ہوتی رہی تھی۔ لیزا نے اپنی پٹاری کا ہر حربہ نکال کر آزمایا لیکن کسی میں بھی اسے کامیابی نہیں ہوئی' آخر کار وہ وقت آ گیا کہ سیف کو ناشتا کیے بغیر ہی گھر سے رخصت ہونا پڑا۔

"تم ایشین سب کمینے ہوتے ہو' تم بے وفا ہوتے ہو' تم لوگ اس قابل ہی نہیں ہوتے ہو کہ تم لوگوں سے بات بھی کی جائے۔" فلیٹ سے رخصت ہوتے ہوئے یہ وہ آخری الفاظ تھے جو سیف نے سنے تھے۔ لیزا نے اس سے پہلے رو کر اور ہاتھ جوڑ کر اسے روکنے کی کوشش کی تھی لیکن نتیجہ اس کا بھی کچھ نہیں نکلا تھا۔

"السلامُ علیکم....." سوچ میں ڈوبے ہوئے سیف اللہ کے کانوں میں سلامتی کے الفاظ آئے تو وہ چونک گیا' وہ پی۔ آئی۔ اے کے طیارے میں داخل ہونے ہی والا تھا کہ ائر ہوسٹس نے اسے سلام کرتے ہوئے ٹکٹ آگے بڑھایا تھا۔

"وعلیکم السلام۔" ایک عرصے بعد یہ کہتے ہوئے سیف کو یوں محسوس ہوا تھا جیسے کوئی کھوئی ہوئی چیز اسے دوبارہ مل گئی ہو۔

طیارہ فضا میں بلند ہوا تو سیف نے گھڑی کی جانب نظر ڈالی۔ اسے اطمینان ہوا کہ چند گھنٹوں بعد وہ اپنے دیس میں 'اپنے لوگوں' کے درمیان ہو گا اور اس کے ساتھ ہی اس کے تصور میں نزہت کا مسکراتا ہوا چہرہ نمودار ہوا۔ سیف تصور کی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ اس کی پاکستان آمد پر نزہت کا ردِعمل کیا ہو سکتا ہے۔ "سورج کا مغرب سے نکلنا تو قیامت کی علامت ہے اور قیامت ابھی نہیں آنی چاہیے۔" اس نے سوچا اور پھر آنکھیں بند کر کے وہ نزہت کے قریب پہنچ گیا۔

صبح کا بھولا دوپہر میں گھر واپس جا رہا تھا اور مغرب سے مشرق کی جانب واپسی کے اس سفر نے سورج کو ایک بار پھر مشرق سے طلوع ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

*

قدم بہ قدم ایک نئی کروٹ بدلتی کہانی۔ اس ماہ کے سرورق کا تیسرا رنگ

زر دیدہ

سرور اکرام

دولت کی چمک انسان کو اندھا کر دیتی ہے اور ہوسِ زر میں وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ کوئی رشتہ ناتا اس کے نزدیک لائقِ احترام نہیں رہتا اور وہ ہر قیمت پر دولت اور صرف دولت کے حصول کی فکر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کہانی کے کردار بھی دولت کے جال میں جکڑے ہوئے، سازشوں میں مصروف ہیں۔ ایک معصوم اور سادہ دل نوجوان ان کا شکار بن گیا تھا۔ ایک حسینہ کی زُلفِ گرہ گیر کا پھندا اُس کی گردن میں یوں پڑا کہ پھر اسے کسی خطرے کی پروا ہی نہ رہی۔

چھوٹی چھوٹی خوب صورت آنکھیں' خمیدہ گلابی ہونٹ' سنہری زلفیں' کانوں میں آویزے' ہاتھوں میں چوڑیاں اور چہرے پر معصومیت اور شرارت کا ملا جُلا تاثر۔

یہ ایک تصویر تھی جو فرخ کو راہ چلتے ہوئے مل گئی تھی۔ وہ اس وقت ایک عمارت کے نیچے سے گزر رہا تھا۔ اس عمارت کے ایک فلیٹ میں اسے بُلایا گیا تھا۔ وہ مطلوبہ شخص سے مل کر واپس جا رہا تھا کہ اس نے یہ تصویر دیکھ لی۔ یہ تصویر کسی فلیٹ کی کھڑکی یا بالکونی سے گری ہوگی۔ اس نے تصویر اُٹھا کر اس کا جائزہ لیا اور قدرت کے شاہکار کا قائل ہو گیا۔ وہ لڑکی یقیناً بہت ہی خوب صورت ہوگی جس کی یہ تصویر تھی۔

فرخ نے گردن اُٹھا کر فلیٹ کی بالکونیوں کی طرف دیکھا۔ ایک بالکونی سے اسے کوئی جھانکتا ہوا دکھائی دے گیا۔ وہ کوئی لڑکی ہی تھی۔ شاید یہ تصویر اسی کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گری ہوگی۔ شرافت کا تقاضہ تو یہی تھا کہ تصویر' تصویر والی کو واپس کر دی جائے۔ اس نے تصویر کو اپنی جیب میں رکھا اور عمارت کی سیڑھیوں کی طرف چل پڑا۔ وہ لڑکی تیسری منزل کے ایک فلیٹ سے جھانک رہی تھی۔

فرخ نے اس فلیٹ کے دروازے پر دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ فرخ نے پہلی ہی نگاہ میں دروازہ کھولنے والی لڑکی کو پہچان لیا۔ یہ وہی تھی' سونی صندوقی۔ اسی کی تصویر اسے ملی تھی۔ ویسی ہی خوب صورت آنکھیں' ویسے ہی ہونٹ' ویسی ہی زلفیں۔

"شاید آپ کی یہ تصویر گر گئی تھی۔" فرخ نے اس کی تصویر اس کے سامنے کر دی۔

"جی ہاں۔" لڑکی جلدی سے بولی۔ "میں بالکونی میں اپنا البم دیکھ رہی تھی کہ یہ تصویر البم سے نکل کر نیچے جا گری۔ میں نے آپ کو تصویر اُٹھاتے اور اس طرف آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ بہت بہت شکریہ آپ کا۔"

فرخ نے اس کی تصویر واپس کر دی۔ وہ اس انتظار میں تھا کہ شاید وہ لڑکی اس سے کچھ اور کہے گی۔ یا کم از کم اخلاقی طور پر اس سے بیٹھنے کی درخواست کرے گی لیکن اس نے تصویر واپس لے کر دروازہ بند کر دیا تھا۔ فرخ نے ایک ٹھنڈی گہری سانس لی اور مایوسی سے گردن جھٹکتے ہوئے سیڑھیاں اُترنے لگا۔ وہ لڑکی اسے بہت اچھی لگی تھی۔ بہت کم لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں جو پہلی ہی نظر میں اتنی اچھی لگنے لگیں کہ انسان واپسی کا راستہ بھول جائے' پتھر کی طرح اپنی جگہ جم کر کھڑا ہو جائے یا اس کے پاؤں بوجھل ہو جائیں۔

نیچے آکر اس نے ناکام عاشق کی طرح ایک بار پھر اسی بالکونی کی طرف دیکھا اور اس بار اسے ایک آدمی دکھائی دے گیا جو اس کی طرف دیکھ کر زور زور سے ہاتھ ہلا رہا تھا۔

وہ شخص اسے اوپر آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ دور ہی سے وہ فرخ کو کچھ عجیب وحشی سا انسان محسوس ہوا تھا۔ اس نے صرف ایک دھوتی باندھ رکھی تھی۔ اتنے فاصلے سے واضح طور پر تو دیکھا نہیں جا سکتا تھا لیکن یہ اندازہ ضرور ہو رہا تھا کہ وہ شخص غصے میں بھرا ہوا ہے۔

فرخ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اپنے کم لیکھے

چلا جائے یا اس شخص کے بلانے پر دوبارہ واپس ہو جائے۔ بالآخر لڑکی کو دیکھنے کی خواہش غالب آگئی اور وہ دوبارہ اسی فلیٹ کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اس بار لڑکی کے بجائے وہ اشارہ کرنے والا شخص دروازے پر کھڑا تھا۔ اس کے چہرے سے اس کی سخت گیر طبیعت کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کے پورے جسم پر بال بھرے ہوئے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی ریچھ کو زبردستی انسان بنا دیا گیا ہو۔

"جی جناب۔" فرخ نے اسے مخاطب کیا۔ "آپ نے شاید مجھے بلایا تھا۔"

"جناب کا بچہ!" وہ ایک دم بھڑک اٹھا۔ "تجھ میں اتنی ہمت کہاں سے ہوئی کہ تو یہاں تک آگیا۔ تجھے نہیں معلوم کہ میں کون ہوں۔"

"جی!" فرخ سٹ پٹا گیا تھا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں! میں تو تصویر واپس کرنے آیا تھا۔"

"میں بھی یہی پوچھ رہا ہوں کہ تجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آئی؟"

اسی وقت فرخ نے اس لڑکی کو دیکھ لیا۔ وہ اس ریچھ نما شخص کے پیچھے کھڑی ہوئی فرخ کو خاموش رہنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ وہ کبھی اپنے دونوں ہاتھ جوڑتی اور کبھی زور زور سے گردن ہلانے لگتی اور کبھی ہونٹوں پر انگلی رکھ لیتی۔ اس کی حرکتوں سے یہ ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ یہ چاہتی ہو کہ فرخ اس وقت کچھ نہ بولے۔ لیکن کیوں! فرخ کا قصور ہی کیا تھا۔ اس نے تو ایک نیکی کی تھی اور وہ نیکی اس کے گلے پڑ گئی تھی۔

"دیکھیں جناب! آپ کو شاید غلط فہمی ہوئی ہے۔" فرخ نے کہا۔ "میں تو......" اس نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ فرخ نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ اس لڑکی کو مایوس نہیں کر سکتا تھا۔

اس شخص نے دو چار گالیاں دیتے ہوئے فرخ کو ایک ہاتھ رسید کیا۔ مار دھاڑ کی آوازیں سن کر برابر والے فلیٹ کا دروازہ کھلا اور بند ہو گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس شخص سے اس کے پڑوسی بھی خوف زدہ رہتے ہوں یا شاید وہ کسی اور کے معاملے میں دخل انداز نہ ہونا چاہتے ہیں۔

فرخ کو اچانک غصہ آگیا۔ ایسی توہین اس نے پہلے کبھی نہیں برداشت کی تھی۔ ایک شخص خواہ مخواہ بغیر کسی جواز کے اس کے پیچھے پڑ گیا تھا' اسے گالیاں دے رہا تھا اور اب تو اس نے فرخ کو ایک ہاتھ بھی مار دیا تھا۔

"میں کہتا ہوں چلا جا یہاں سے۔" وہ آدمی غرایا۔ "دوبارہ ادھر آنے کی کوشش کی تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔"

فرخ غصے' حیرت اور دکھ سے اپنے ہونٹوں کو بھینچتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے اتر آیا۔ وہ اس عمارت کے ایک فلیٹ میں اپنے ایک پرانے دوست سے ملنے آیا تھا۔ اس کا پتا بہت دنوں کے بعد معلوم ہوا تھا لیکن یہاں آکر اس نے فلیٹ کے دروازے پر جب تالا پڑا ہوا دیکھا تو اس کی کوفت بڑھ گئی تھی۔ ایک تو یہ فلیٹ اس کے اپنے گھر سے کافی فاصلے پر تھا اور دوسرا حادثہ یہ ہوا کہ واپس جاتے ہوئے ایک آدمی نے خواہ مخواہ اسے دو چار ہاتھ جڑ دیے تھے۔ جبکہ اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے ایک خوب صورت لڑکی کو اس کی خوب صورت تصویر واپس کی تھی۔

☆ ...... ○ ...... ☆

جیلر فیض محمد کے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے تھے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ حکومت کا کوئی اتنا اعلیٰ عہدیدار اچانک اس کے کمرے میں چلا آیا تھا۔ فیض محمد اس وقت بڑے آرام سے میز پر دونوں پاؤں پھیلائے ہوئے خراٹے لے رہا تھا۔ یہ خراٹے اسی وقت لیے جا سکتے ہیں جب ہر طرف سکون ہی سکون ہو۔ فیض محمد کو معلوم تھا کہ اس کی جیل میں سکون ہی سکون ہے۔ کہیں بھی کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔ وہ ایک سخت گیر اور ظالم شخص تھا اور ظلم اپنے ساتھ بزدلی' رشوت اور بے ایمانی جیسے جرائم کو بھی لے آتا ہے۔ اسی کے لیے فیض محمد میں یہ ساری خوبیاں تھیں۔ وہ صرف اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے فیض تھا جبکہ دوسروں کے لیے اسے بے فیض کہا جاتا تھا۔

خیر تو جس وقت وہ اعلیٰ عہدیدار اچانک اس کے کمرے میں داخل ہوا' اس وقت وہ گہری نیند میں تھا۔ اعلیٰ عہدیدار نے آگے بڑھ کر میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجا دی۔ گھنٹی کی آواز سن کر فیض محمد بڑبڑا کر رہ گیا۔ "ابے کون ہے' کیا ہو رہا ہے؟"

پھر جب اس کی نگاہ اعلیٰ عہدیدار پر پڑی تو وہ بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ "سر! سر! آپ۔"

"ہاں میں۔" وہ اعلیٰ عہدیدار جس کا نام تنویر کمال تھا' مسکراتا ہوا ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ "تمہیں اتنی حیرت کیوں ہو رہی ہے؟"

"سر! آپ کو اچانک اس طرح یہاں دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے۔" فیض محمد نے کہا۔ "آپ حکم دیتے تو میں خود حاضر ہو جاتا۔"

"نہیں فیض محمد۔ میرا یہاں آنا ضروری تھا۔ تم سے ایک کام ہے لیکن بہت ہوشیاری کے ساتھ کرنا ہو گا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیے۔"

"حکم دیں سر! میں اپنی جان حاضر کر دوں گا۔"

"نہیں۔ مجھے ایسی کوئی چیز نہیں چاہیے۔" تنویر کمال نے کہا۔ "مجھے تمہارے ایک قیدی کی ضرورت ہے۔"

"میں سمجھ گیا سر۔ کتنے دنوں کے لیے چاہیے؟"

"صرف ایک رات کے لیے۔ اس کا نام ابراہیم ہے۔ ابراہیم بخش۔"

"اوہ!" جیلر نے ایک گہری سانس لی۔ "وہ تو بہت خطرناک آدمی ہے سر۔ بہت زبردست قاتل۔ بپھرے ہوئے طوفان کی طرح ہے۔"

"ہم کو اسی طوفان کی ضرورت ہے۔ اس کو بتا دینا کہ اس کی سزا میں دو مہینے کی کمی ہو جائے گی اور بیس ہزار روپے بھی مل جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے سر۔ میں خود اس کے پاس جاتا ہوں اور اس کو کسی نہ کسی طرح آپ کے پاس لے آتا ہوں۔ باقی باتیں آپ خود کر لیجیے گا۔"

تنویر کمال نے صرف سر ہلا دیا۔ جیلر جلدی سے کمرے سے باہر چلا گیا۔ بہت دیر انتظار کے بعد جیلر کمرے میں واپس آیا تو اس کے ساتھ ابراہیم بخش بھی تھا۔ وہ ایک قوی الجثہ شخص تھا۔ جیل کے شب و روز نے اس کی صحت اور اس کے سکون میں کوئی خلل نہیں ڈالا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے تنویر کمال کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ خود جیلر بھی اس سے مرعوب دکھائی دیتا تھا۔

"کیا کام ہے مجھ سے؟" ابراہیم بخش نے ٹھہری آواز میں پوچھا۔

تنویر کمال نے جیلر کو اشارہ کیا۔ وہ بڑی سعادت مندی سے کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد تنویر کمال نے ابراہیم بخش کی طرف دیکھا۔ "تم سے مطلب کی بات ہوگی ابراہیم بخش۔ کیونکہ نہ تو میرے پاس زیادہ وقت ہے اور نہ تمہارے پاس ہوگا۔ تمہیں ایک رات کے لیے سرحد پار کر کے ایک آدمی کو ٹھکانے لگانا ہے پھر واپس آجانا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں، یہ کیسا منصوبہ ہے؟"

"دیکھو ابراہیم بخش! تم کو شاید یہ نہ معلوم ہو کہ ہماری سرحدیں ہمارے اپنے آدمیوں کی وجہ سے محفوظ نہیں رہیں۔ حالانکہ ہر طرف پہرے لگے رہتے ہیں اس کے باوجود غیر قانونی طور پر لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ ایسے لوگوں میں کچھ تو واقعی مظلوم اور ستائے ہوئے لوگ ہوتے ہیں اور کچھ دہشت گرد بھی ہوتے ہیں جو تخریب کاری کی نیت سے آتے ہیں لیکن ہمیں سچ اور جھوٹ کی پہچان نہیں ہو پاتی۔ سرحد کے پار گوپال نگر نامی ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ اس گاؤں میں مرلی دھر نامی ایک آدمی رہتا ہے۔ وہاں کی حکومت اور پولیس اس شخص کی طرف سے آنکھیں بند کر کے بیٹھی ہے۔ بلکہ اس شخص کو وہاں کے ان اداروں کی پشت پناہی حاصل ہے۔ اسی لیے وہ اپنی سرحد میں بیٹھ کر دہشت گردوں اور اس طرف آنے والوں کے جعلی کاغذات تیار کرتا ہے۔ انہیں پاکستان کے شہروں کے نقشے فراہم کرتا ہے۔ اس کے گھر میں یہاں کے لوگوں کے رہن سہن کی فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ زبان کی شین قاف درست کرائی جاتی ہے۔ یوں سمجھ لو کہ وہ ایک ایسا ٹریننگ سینٹر ہے جہاں بھاریوں کو پاکستانی بنا کر ہماری سرحدوں میں دھکیل دیا جاتا ہے۔"

"میں سمجھ گیا جناب۔" ابراہیم بخش خشک لہجے میں بولا۔ "مجھ کو اس طرف جا کر اس آدمی کو ٹھکانے لگانا ہے۔"

"ہاں۔ تمہارا یہی کام ہوگا۔"

"لیکن یہ تو قومی معاملہ ہے۔" ابراہیم بخش نے کہا "یہ کام تو حکومت کا کوئی آدمی کر سکتا ہے۔ کوئی پولیس کا آدمی، کوئی جاسوس۔ اس میں میری کیا ضرورت ہے؟"

"یہ ٹھیک ہے کہ یہ کام حکومت یا خفیہ اداروں کا کوئی کارندہ کر سکتا ہے لیکن ہم ایسا نہیں چاہتے، کیونکہ ہم نہیں چاہتے کہ پکڑے جانے کی صورت میں ہمارے خفیہ اداروں کی بدنامی ہو جائے۔ یہ معاملہ پوری دنیا میں اُٹھایا جائے گا کہ ہم نے اپنا ایک آدمی سرحد کے پار کسی کو قتل کرنے کے لیے بھیجا تھا۔"

"اور اگر میں پکڑا گیا جناب؟"

"تو ہم تمہاری ذمے داری قبول نہیں کریں گے۔ ہم تم سے لاتعلقی کا اظہار کریں گے بلکہ یہ کہا جائے گا کہ تم ایک خطرناک ملزم ہو جو ہماری جیل سے فرار ہو گئے ہو۔"

"اوہ!" ابراہیم بخش نے ایک گہری سانس لی۔ "میرے لیے تو یہ بہت گھاٹے کا سودا ہے جناب۔ آپ کسی اور کو دیکھیں۔"

"نہیں ابراہیم بخش! یہ کام تمہیں کرنا ہوگا اور یہ سودا گھاٹے کا نہیں ہے۔ ہم تمہاری دو ماہ کی سزا معاف کر دیں گے۔ اس کے علاوہ بیس ہزار روپے، چلو بیس نہیں چالیس ہزار روپے مل جائیں گے۔ کہو اب تو خوش ہو؟"

"فرض کرو صاحب، اگر میں اس کے باوجود انکار کر دوں تو؟"

"تم ایسا نہیں کر سکتے ابراہیم بخش۔" تنویر کمال ہنس پڑا۔ "کیونکہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تمہیں اپنے بچے سے بہت محبت ہے اور وہ اس وقت ہمارے قبضے میں ہے۔"

☆ —— ○ —— ☆

فیروز ہاشمی ایک جوان، پُرجوش اور پڑھا لکھا اخباری نامہ نگار تھا۔

اس کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ وہ اپنے اخبار کے لیے ایسی ایسی خبریں تلاش کرے جو کسی دوسرے اخبار کو نصیب نہ ہوں۔ وہ معاشرے کو آئینہ بھی دکھا سکے تاکہ معاشرے سے ظلم، جبر اور ناانصافی کا خاتمہ ہو سکے۔ وہ چونکہ ایک جوان اور پُرجوش آدمی تھا اسی لیے اس قسم کی خواہشات اس کے سینے میں موجود رہتی تھیں۔ جبکہ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ معاشرہ کتنا بے رحم اور ناانصاف ہے۔ یہاں اس قسم کے احمقانہ جذبوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

لیکن وہ اپنا فرض دیانت داری سے انجام دینے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ اخبار کا مالک اور اس کا ایڈیٹر دونوں اس پر بہت بھروسہ

کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ پُرجوش نوجوان جو خبر بھی تلاش کر کے لاتا ہے وہ عام طور پر درست ہی ہوتی ہے۔

ایک دن اخبار کے مالک نے اسے اپنے کمرے میں طلب کر لیا۔ عام طور پر اخبار کے ایڈیٹر سے اس کی ملاقات ہوتی رہتی تھی، مالک کے پاس جانے کا اور اس سے ملنے کا اتفاق بہت کم ہوتا تھا۔ مالک کے بلانے کا مقصد یہ تھا کہ کوئی خاص کام اس کے سپرد کیا جانے والا تھا۔ وہ اپنے بال ٹھیک کرتا ہوا مالک کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اخبار کا ایڈیٹر بھی اسی کمرے میں موجود تھا۔ ان دونوں کے علاوہ وہاں ایک تیسرا شخص بھی تھا جو فیروز کے لیے اجنبی تھا۔

فیروز نے ادب سے انہیں سلام کیا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھ جائیں فیروز صاحب۔" مالک نے ایک خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

فیروز شکریہ ادا کر کے بیٹھ گیا۔

یہ ممتاز صاحب ہیں۔" مالک نے تیسرے آدمی کا تعارف کرایا۔ "آپ کے لیے اتنا ہی جان لینا کافی ہے کہ ان کا تعلق حکومت کے ایک اہم محکمے سے ہے جہاں یہ ایک اہم عہدے پر فائز ہیں۔"

"جی جناب۔" فیروز نے سعادت مندی سے اپنی گردن ہلا دی۔

"میں نے آپ کی بہت تعریف سُنی ہے فیروز صاحب۔" ممتاز نے کہا۔ "اور ہمیں امید ہے کہ آپ ہمارے کام آسکتے ہیں، خاص طور پر یہ کام آپ ہی کے پیشے اور شوق سے وابستہ ہے۔ آپ کو یہ کام کر کے خوشی ہوگی۔"

"میں حاضر ہوں جناب" فیروز نے کہا۔ "فرمایئے، میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"آپ کو کچھ دن کے لیے جیل جانا ہوگا۔" وہ شخص، فیروز کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"جی! کیا فرمایا؟" فیروز حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"جی ہاں، لیکن یہ جیل جانا اس لیے نہیں ہوگا کہ آپ نے کوئی جرم کیا ہے بلکہ آپ اس لیے جیل جائیں گے کہ آپ کو ہماری مدد کرنا ہے۔ دیکھیں، میں آپ کو پوری بات سمجھاتا ہوں۔ اب سے کچھ عرصہ پہلے ایک برطانوی ماہر آثار قدیمہ یہاں کھدائی کرنے آیا تھا۔ اس نے ایک مقامی شخص کی مدد حاصل کی تھی۔ کھدائی کے دوران ایک بہت بڑے مدفون خزانے کا انکشاف ہوا۔ ایسا خزانہ جو اس ملک کی معیشت کو مضبوط کر سکتا تھا لیکن جس دن وہ خزانہ حاصل کرنے کے لیے اصل مقام پر کھدائی ہونے والی تھی اس سے صرف ایک رات پہلے اس ماہر کا قتل ہو گیا اور وہ خزانہ بھی اپنی جگہ سے غائب ہو گیا جبکہ وہاں کھدائی کے نشانات تھے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ خزانہ پہلے ہی نکال لیا گیا تھا۔"

"جی ہاں!" ممتاز نے اپنی گردن ہلائی۔ "اور وہ مقامی شخص بھی غائب تھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہی شخص خزانہ لے کر غائب ہوا ہے۔ ہم نے اس کی تلاش میں پورا ملک چھان مارا۔ بالآخر وہ ایک جگہ سے گرفتار ہو گیا لیکن اس کے پاس سے سوائے دو چار برتنوں کے اور کچھ بھی برآمد نہیں ہوا۔ ہم اپنی طرف سے پوچھ پوچھ کر تھک گئے لیکن اس نے ابھی تک کچھ نہیں بتایا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہاں ایسا کوئی خزانہ ہی نہیں تھا۔"

"اوہ! اب سمجھا۔ تو وہ شخص اس وقت جیل میں ہے اور مجھے اسی سے ملنے کے لیے جانا ہوگا۔"

"جی ہاں۔ وہ جیل میں ہے اور آپ صرف اس سے ملنے نہیں جائیں گے بلکہ ایک قیدی کی حیثیت سے اس کی کوٹھری میں رہیں گے۔ وہ ان دنوں بیمار ہے۔ آپ اس کی دل جوئی کریں، اس کی خدمت کریں تاکہ وہ آپ کو اپنا ہمدرد سمجھنے لگے۔ ہو سکتا ہے کہ پھر وہ آپ کو اس خزانے کے راز سے آگاہ کر دے۔ اس وقت آپ جیلر کو صرف اشارہ دے دیجیے گا۔ اس سے بھی یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہوگی کہ آپ نے کچھ معلوم کر لیا ہے۔ بس آپ اسے اشارہ دے دیں۔ وہ آپ کو جیل سے باہر بھیج دے گا۔ اس طرح آپ کا کام ختم ہو جائے گا۔ اب آپ بتائیں کہ آپ قومی مفاد کے لیے یہ کام کر سکتے ہیں۔"

"آپ نے شاید مجھے میری زندگی کا سب سے مشکل کام سونپ دیا ہے۔" فیروز نے کہا۔ "لیکن میں اسے ضرور کروں گا کیونکہ اب مجھے خود اس معاملے سے دلچسپی محسوس ہونے لگی ہے۔ میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا کہ اس شخص کو شیشے میں اُتار سکوں۔"

☆ ...... ○ ...... ☆

فرخ ایک بار پھر اسی بالکونی کے نیچے کھڑا ہوا تھا۔

آج وہ جان بوجھ کر اس طرف آیا تھا۔ صرف اس اُمید پر کہ شاید وہ لڑکی ایک بار پھر دکھائی دے جائے۔ ویسے اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ لڑکی اس ریچھ نما شخص کے جبر کا شکار تھی۔ اس لڑکی کی حرکتیں، اس کا خوف یہی ظاہر کرتے تھے کہ وہ اس شخص سے بے پناہ ڈرتی ہے اور وہ اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ لیکن وہ لڑکی کون تھی اور وہ شخص کون تھا؟ ان دونوں کا ایک دوسرے سے کیا تعلق تھا؟ اس قسم کے بے شمار سوالات اس کے ذہن میں تھے۔

وہ دوپہر کا وقت تھا اسی لیے اس فٹ پاتھ پر آنے جانے والوں کی تعداد بہت کم تھی اور ویسے بھی یہ عمارت کمرشل نہیں تھی اس لیے دکانیں وغیرہ بھی نہیں تھیں۔ صرف رہائشی فلیٹ تھے

اسی لیے سُنسان تھا۔ وہ کچھ دیر تک اس بالکونی کی طرف دیکھتا رہا پھر اچانک وہ لڑکی اسے دکھائی دے گئی۔ وہ ذرا سی دیر کے لیے بالکونی میں نمودار ہوئی‘ فرخ کو دیکھ کر اس نے ہاتھ ہلایا اور جلدی سے اندر چلی گئی۔ شاید اس لڑکی نے کسی قسم کا اشارہ کیا تھا جو اس کی سمجھ میں نہیں آسکا تھا۔

وہ لڑکی پھر نمودار ہوئی اور اس نے فرخ کی طرف دیکھتے ہوئے اوپر سے ایک لفافہ پھینک دیا۔ اس کے اشارے کا مطلب فرخ کی سمجھ میں اب آیا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر وہ لفافہ اٹھالیا۔ اس لفافے پر سُرخ رنگ لگا ہوا تھا۔ اس میں کارڈ تھا۔ ایسا کارڈ جو مُبارک باد کے لیے کسی کو دیا جاتا ہے۔ اس کارڈ پر بھی سُرخ رنگ موجود تھا۔ فرخ نے لفافہ لے کر بالکونی کی طرف دیکھا۔ لڑکی اب وہاں سے جاچکی تھی۔ فرخ کا دل بہت زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس کے ساتھ پہلی بار اس قسم کا کوئی واقعہ ہوا تھا ورنہ اب تک کوئی لڑکی اس کے اتنا قریب نہیں آسکی تھی کہ اس کے لیے خط لکھ کر چوری چھپے اس کی طرف پھینک دے‘ چاہے وہ خط کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ اب ایک لڑکی ملی بھی تھی تو وہ بے چاری نہ جانے کس قسم کے حالات کا شکار معلوم ہوتی تھی۔ بہرحال فرخ اس لفافے کو لے کر ایک قریبی پارک کی بینچ پر بیٹھ گیا۔ یہاں وہ سکون کے ساتھ اس کارڈ کو پڑھ سکتا تھا۔

اس کارڈ میں لکھا تھا۔ ”مجھے کاغذ نہیں مل سکا تھا اس لیے فوری طور پر اس کارڈ پر آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ آپ اس طرف ضرور آئیں گے کیونکہ میں نے آپ کی آنکھوں میں اپنے لیے ہمدردی کے تاثرات محسوس کرلیے تھے۔ میں سب سے پہلے آپ کے احسان کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ وہ احسان جو آپ نے خاموش رہ کر مجھ پر کیا ہے۔ آپ اگر اپنی صفائی پیش کردیتے تو نہ جانے کیا ہوتا۔ یہ شخص پرویز کی ہڈیاں توڑ کر رکھ دیتا۔ اب آپ کو میں یہ نہیں بتاسکتی کہ پرویز کون ہے اور اس شخص سے میرا کیا تعلق ہے۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ میں اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لیے سوسائٹی کے ایک بیوٹی پارلر میں ٹریننگ کے لیے جایا کرتی ہوں۔ پانچ بجے وہاں سے فارغ ہوتی ہوں لیکن پرسوں تین بجے نکل آؤں گی۔ اس بیوٹی پارلر سے کچھ فاصلے پر دل کشا ہے۔ آپ نے وہ ریستوران تو دیکھا ہی ہوگا۔ آپ وہاں تشریف لے آئیں۔ بلکہ آپ وہیں بیٹھے رہیں‘ میں خود آپ سے آکر مل لوں گی۔ جوریہ۔“

اس لڑکی کے اس خط نے فرخ کو اُلجھن میں مبتلا کردیا تھا۔ اس نے کبھی کسی لڑکی سے عشق تو نہیں کیا تھا یا اس کے کسی لڑکی سے تعلقات تو نہیں تھے لیکن وہ اتنا ضرور جانتا تھا کہ جو لڑکی اتنی جلد ملاقات کرنے پر آمادہ ہوجائے وہ یا تو فلرٹ ہوتی ہے‘ بے وقوف بنانا چاہتی ہے یا وہ اپنے ماحول سے اتنی اُکتائی ہوئی ہوتی ہے کہ جلد از جلد نجات حاصل کرنا چاہتی ہے۔ تو شاید یہ لڑکی بھی اپنے ماحول سے فرار چاہتی تھی۔

دل کشا ریستوران فرخ کا دیکھا ہوا تھا۔ وہ ایک پُرسکون ریستوران تھا۔ عام طور پر شاپنگ کرنے والے خاندان تھک کر اس ریستوران میں کچھ کھانے پینے کے لیے آیا کرتے تھے۔

فرخ دھڑکتے دل کے ساتھ ریستوران میں آکر بیٹھ گیا۔ پہلی بار کسی لڑکی سے اس کی ملاقات ہونے والی تھی اور لڑکی بھی ایسی‘ جو دُھندلکے میں چھپی ہوئی تھی جس کی شخصیت کے ارد گرد ایک گہرے راز کی چادر تھی۔ اب اس سے ملنے کے بعد ہی یہ معلوم ہوسکتا تھا کہ وہ کون ہے اور فرخ سے کیا چاہتی ہے۔

تین بجنے میں ابھی پانچ منٹ باقی تھے کہ وہ ریستوران میں داخل ہوئی۔ فرخ کا دل اور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے فرخ کو پہچان لیا تھا۔ وہ سیدھی اس کے پاس آگئی۔

”میں شاید وقت سے پہلے آگئی۔“

”بہت اچھا ہوا۔“ فرخ جلدی سے کھڑا ہوگیا۔ ”میری نگاہیں دروازے کی طرف لگی ہوئی تھیں۔“

فرخ نے اس کی پسند پوچھ کر کچھ کھانے کا آرڈر دے دیا۔ بہت دیر تک دونوں کے درمیان خاموشی رہی۔ اس لڑکی کے چہرے پر کشمکش کے آثار تھے جیسے گفتگو کرنے سے پہلے اپنے اندر کوئی جنگ لڑ رہی ہو۔ پھر اس نے فرخ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں بھی کیسی لڑکی ہوں جس نے اس طرح خط لکھ کر آپ کو یہاں بلوالیا ہے۔“

”نہیں۔ نہیں‘ یہ تو میری خوش قسمتی ہے۔“ فرخ جلدی سے بولا۔ ”سچ تو یہ ہے کہ میں خود آپ سے ملنا چاہتا تھا۔“

”میں آپ سے براہِ راست ایک بات پوچھوں تو آپ اس کا بُرا تو نہیں مانیں گے؟“

”ہرگز نہیں۔“

”یہ بتائیں کہ آپ کی شادی ہوچکی ہے؟“

”نہیں‘ میں ابھی تک بیوی جیسی نعمت سے محروم ہوں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ مجھے ابھی تک کوئی ایسی لڑکی نہیں مل سکی جو براہِ راست دل میں اُتر سکتی ہو۔“

”میرے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا آپ مجھ سے شادی کریں گے؟“

☆ ...... ○ ...... ☆

ابراہیم بخش کو بہت سی چیزیں فراہم کردی گئی تھیں۔

ضرورت کے وقت سرحد پار خرچ کرنے کے لیے اچھی خاصی کرنسی‘ ایک عدد جعلی پاسپورٹ اور سب سے بڑھ کر ایک ایسا پستول جسے بڑی آسانی سے چھپایا جاسکتا تھا۔ پہلے تو اس سے یہی کہا گیا تھا کہ یہ مہم صرف ایک دو راتوں کی ہوگی پھر اس سے یہ کہا گیا کہ وہ اپنی سہولت کے پیشِ نظر جتنے دن چاہے لگا سکتا ہے لیکن کام ہر حال میں مکمل ہونا ہے ورنہ...... اور یہ ورنہ ابراہیم بخش کے

لیے بہت بُرا تھا کیونکہ اسے اپنے بچے سے بے پناہ محبت تھی۔

اس دنیا میں سوائے اس بیٹے کے اس کا کوئی بھی نہیں تھا۔ بیوی بہت پہلے چند لوگوں کے ظلم کا شکار ہو کر مر چکی تھی۔ اس کے بعد ہی وہ ایک خطرناک قاتل بن گیا تھا۔ حالیہ قتل اس نے اس شخص کا کیا تھا جس نے اس کی بیوی کے ساتھ بُرا سلوک کیا تھا۔ اس قتل کے بعد وہ گرفتار ہو گیا۔ گرفتاری سے پہلے اس نے اپنے بیٹے موسیٰ کو اپنے ایک جاننے والے کے حوالے کر دیا تھا اور اب وہی بیٹا ان لوگوں کے قبضے میں تھا جو اس سے کسی ملی دھر نامی شخص کا قتل کروانا چاہتے تھے۔

بہت سی باتیں اس کے ذہن میں اُلجھی ہوئی تھیں۔ یہ تو طے ہو گیا تھا کہ اس سے کام لینے والے حکومت کے بڑے لوگ تھے لیکن یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اگر وہ معاملہ اتنا ہی اہم تھا تو حکومت کی کسی ایجنسی کا کوئی تربیت یافتہ شخص بھی یہ کام کر سکتا تھا۔ ابراہیم بخش کی ضرورت کیوں پڑ گئی تھی۔ وہ اس جھنجٹ میں پڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن بیٹے کی وجہ سے مجبور ہو کر اس نے رضا مندی ظاہر کر دی تھی۔ پھر اسے رات کے اندھیرے میں جیل سے باہر نکال دیا گیا۔

جیل کے باہر ایک گاڑی اس کے انتظار میں تھی جس میں چار مسلح لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ابراہیم بخش کو یہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ ان لوگوں سے سوال جواب کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔

اس نے ہدایت پر پوری طرح عمل کیا اور خاموشی کے ساتھ اپنا سفر کرتا رہا۔ اسے جس جیل سے رہا کیا گیا تھا وہ سرحد کے قریب ہی واقع تھی۔ وہاں سے سرحد کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا لیکن جب وہ گاڑی ایک مکان کے پاس آکر رُکی تو وہ چونک گیا۔ بہرحال یہاں بھی اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ اسے گاڑی سے اُتار کر عمارت میں لے جایا گیا۔

وہ اس مکان میں تنویر کمال کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

"میں آخری لمحوں کے انتظامات کا جائزہ لینے آیا ہوں۔" تنویر کمال نے اس سے کہا۔ "مجھے اُمید ہے کہ تم نے اپنا کام اچھی طرح سمجھ لیا ہو گا۔"

"جی جناب۔" ابراہیم نے اپنی گردن ہلا دی۔

"ہم نے ویسے تو ایک پاسپورٹ تمہیں دے دیا ہے لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ تمہیں اس پاسپورٹ کی ضرورت نہیں پڑے گی کیونکہ تم چوری چھپے سرحد پار کر رہے ہو۔ اور ہاں، تمہیں اپنا حلیہ بھی تبدیل کرنا ہو گا کیونکہ جب تم گوپال نگر پہنچو تو وہیں کے رہنے والے دکھائی دو۔"

ابراہیم بخش سمجھ گیا تھا کہ اسے اس عمارت میں کیوں لایا گیا تھا۔ اس کا حلیہ تبدیل کرنے والے دو آدمی تھے جنھوں نے بڑی مہارت سے اس کے بال تراشے، اس کی مونچھیں چھوٹی کیں اور اسے ہندوانہ لباس پہنا دیا۔ اب وہ بڑی حد تک تبدیل ہو چکا تھا۔

سفر پھر شروع ہو گیا۔ وزنی اور تیز رفتار گاڑی رات کے اندھیرے میں سرحد کی طرف سفر کر رہی تھی۔ ابراہیم بخش اس وقت ہر قسم کے خوف سے بے نیاز تھا۔ اس کے ذہن پر بس ایک ہی بات سوار تھی کہ وہ کس طرح اپنا کام انجام دے تاکہ اس کے بیٹے کی گلو خلاصی ہو جائے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی بدقسمتی کا سایہ اس کے بیٹے کی زندگی کا چراغ گل کر دے۔ اسے ان لوگوں کے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ یہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔

بالآخر یہ سفر ایک جگہ پہنچ کر ختم ہو گیا۔ اس وقت بھی گہری تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ اسے گاڑی میں ہی...... بیٹھے رہنے کی ہدایت کی گئی۔ اس کے ساتھ آنے والے شاید کسی سے بات چیت کرنے کے لیے گاڑی سے اُتر گئے تھے۔ کچھ دیر بعد اسے گاڑی سے اترنے کے لیے کہا گیا۔

"بس اب تم یہاں سے چل دو۔" اس سے کہا گیا۔ "تمہیں صرف پانچ منٹ کے اندر بارڈر کراس کرنا ہے۔ یاد رکھو، صرف پانچ منٹ میں۔ اس کے بعد سرچ لائٹ کام کرنے لگے گی اور تمہاری زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ بس اب دوڑ جاؤ، شاباش۔"

اور اس نے سرحد کی طرف دوڑ لگا دی۔ اس کا سارا سامان ایک تھیلے میں اس کی کمر سے بندھا ہوا تھا۔ حیرت انگیز طور پر خاردار تاروں کی باڑھ کے پاس بھی اس کو روکا نہیں گیا اور دوسری طرف بھی کوئی مزاحمت نہیں ہوئی۔ اس کے باوجود وہ دوڑتا چلا گیا۔ دوڑتے دوڑتے وہ اچانک لڑکھڑایا۔ اندھیرے میں اس کا پاؤں کسی گڑھے میں چلا گیا تھا۔ وہ خود کو سنبھال نہیں سکا۔ اس کے پیر کی ہڈی شاید مڑ گئی تھی۔ درد کی ایک تیز لہر اس کے پورے وجود میں سرایت کرتی چلی گئی اور وہ بے ہوش ہو کر ایک طرف لڑھک گیا۔

☆ ...... ○ ...... ☆

جیل، خوف و ہراس اور اندیشوں کی ایک تاریک دنیا۔

فیروز ہاشمی کو جیل حکام کی مدد سے جیل میں پہنچا دیا گیا تھا۔ جیلر نے اسے جیل کی وردی فراہم کرتے ہوئے کہا۔ "تم کو اس قیدی کی کوٹھری میں رکھا جائے گا۔ تم اپنے آپ کو ایک قیدی سمجھنے لگو گے کیونکہ ہم تمہارے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں کریں گے تاکہ یہ ڈراما حقیقی معلوم ہو۔"

"جی ہاں۔" فیروز نے اپنی گردن ہلا دی۔ "میں بھی یہی چاہتا ہوں۔"

"اس کے علاوہ تم یہاں کسی بھی قیدی سے اپنے بارے میں کوئی بات نہیں کرو گے۔" جیلر نے تاکید کی۔ "ورنہ وہ بوڑھا کھٹک جائے گا۔ اس جیل میں بھی اس کے بہت سے چاہنے والے موجود ہیں۔ وہ اسے تمہارے بارے میں بتا دیں گے۔"

"تو کیا وہ بوڑھا آدمی ہے؟" فیروز نے پوچھا۔ اسے یہ جان کر حیرت ہوئی تھی۔

"ہاں، وہ بوڑھا آدمی ہے کم بخت!" جیلر نے نفرت سے اپنے ہونٹ سکیڑے۔ "لیکن اتنا سخت جان ہے کہ کچھ بتاتا ہی نہیں ہے۔ ہم لوگ اپنی سی کوشش کر کے تھک چکے ہیں۔ اب یہی ایک راستہ رہ گیا ہے کہ اس سے پیار محبت کی زبان میں بات کی جائے۔ شاید وہ تم پر بھروسہ کرنے لگے۔"

فیروز کو اس کوٹھری میں پہنچا دیا گیا جس میں وہ بوڑھا موجود تھا۔ فیروز اس شخص کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ وہ ایک مہذب بزرگ معلوم ہوتا تھا۔ اس کے چہرے پر علم کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر یہ احساس ہو رہا تھا کہ ایسا شخص وطن دشمن یا مجرم نہیں ہو سکتا لیکن واقعات اور شواہد اس کے خلاف تھے...... ایجنسیاں یوں ہی اس کے پیچھے نہیں پڑی ہوئی تھیں۔ یہ شخص یوں ہی قید کی زندگی نہیں گزار رہا تھا۔ کوئی نہ کوئی بات ضرور تھی اور ویسے بھی صورتیں عام طور پر دھوکا دے جاتی ہیں۔

وہ بوڑھا ایک دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے جیسے کسی تکلیف میں مبتلا ہو۔ فیروز کو کوٹھری میں دیکھ کر اس نے اپنی گردن اٹھائی، چند لمحوں تک اس کی طرف دیکھتا رہا پھر دھیرے سے بولا۔ "بیٹے! ذرا مجھے ایک گلاس پانی تو پلا دو۔"

اس کوٹھری کے ایک کونے میں دیوار کے ساتھ ایک مٹکا اور گلاس رکھے ہوئے تھے۔ فیروز نے گلاس میں پانی انڈیلا اور بوڑھے کے پاس پہنچ گیا۔ اسے اپنا مقصد حل ہوتا نظر آرہا تھا۔ اس کو یہی ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اس بوڑھے کو اپنی مٹھی میں لینے کی کوشش کرے تاکہ وہ اسے اپنا ہمدرد جان کر سب کچھ اگل دے۔ بوڑھے نے پانی پی کر فیروز کو دعائیں دیں۔ کچھ دیر تک وہ آنکھیں بند کیے پڑا رہا پھر فیروز کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم مجرم تو نہیں معلوم ہوتے بیٹے! آخر تم سے کون سی غلطی ہوگئی ہے؟"

"بس بابا، نہ پوچھیں۔" فیروز اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ "انسان سے کبھی نہ کبھی غلط ہو ہی جاتی ہے اور اس کی سزا بھی اسے بھگتنا پڑتی ہے۔ میں تو آپ کو دیکھ کر حیران ہو رہا ہوں۔ آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟ پھر آپ کی طبیعت بھی خراب معلوم ہوتی ہے۔"

"نہیں، میری طبیعت کو کچھ نہیں ہوا۔ یہ اس تشدد کا نتیجہ ہے جو اس جیل میں مجھے تحفے کے طور پر دیا جاتا ہے۔"

"آخر کیوں! آپ پر یہ لوگ ظلم کیوں کر رہے ہیں؟"

بوڑھے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی تکلیف شاید بڑھ گئی تھی۔ وہ ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں فیروز کو اس سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے براہِ راست مجرم تو نہیں دیکھے تھے لیکن اخبار کی زندگی نے اسے اتنی تمیز سکھا دی تھی کہ وہ اچھے اور برے میں فرق کر سکے۔ یہ بوڑھا تو بالکل بے ضرر اور مظلوم معلوم ہوتا تھا۔ پھر اس سے اتنا بڑا جرم کیسے سرزد ہوگیا؟ بہت دیر بعد بوڑھے نے پھر اس کی طرف دیکھا۔ "بیٹے! میں ناانصافیوں اور تقدیر کا شکار ہو گیا ہوں۔ اب تو کچھ ایسی صورتِ حال ہوگئی ہے کہ اگر فرشتہ بھی آجائے تو میں اس پر بھروسہ نہیں کر سکتا، نہ جانے کیوں مجھے ہر ایک سے دھوکے کی بو آنے لگی ہے۔ کیا بدقسمتی ہے ہماری؟"

"آخر بات کیا ہے بابا؟" فیروز نے پوچھا۔ "مجھے بتائیں، شاید میں آپ کے کسی کام آسکوں۔"

"کیا تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو؟" بوڑھا اچانک ناراض ہوگیا۔ "جاؤ یہاں سے۔ تم بھی کوئی سرکاری آدمی معلوم ہوتے ہو۔ جاؤ۔"

فیروز ایک گہری سانس لے کر بوڑھے کے پاس سے ہٹ گیا۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس بوڑھے سے کوئی راز اگلوانا آسان نہیں ہوگا۔ بہت ہی شکی مزاج بوڑھا تھا۔ وہ بوڑھا اسی طرح دیوار سے ٹیک لگا کر سو گیا تھا۔ فیروز کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا پھر خود بھی ایک دیوار کے سہارے بیٹھ گیا۔ وہ اس بوڑھے کو اعتماد میں لینے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔ بہت دیر بعد اس کے ذہن میں ایک ترکیب آگئی لیکن اس پر عمل کرنے کے لیے جیلر کا تعاون درکار تھا۔ اسے یقین تھا کہ جب اس ترکیب پر عمل کیا جائے گا تو اس وقت یہ بوڑھا اس کے قریب آجائے گا۔

☆ — ○ — ☆

فرخ کو فیروز کی تلاش تھی۔

وہ فیروز ہی سے ملنے اس عمارت کی طرف گیا تھا جہاں سے واپسی میں اسے ایک لڑکی کی تصویر ملی اور اس لڑکی نے اس سے ایک ہوٹل میں ملاقات کی تھی۔ جویریہ نے پہلی ہی ملاقات میں شادی کی پیش کش کر دی تھی۔ اس نے جب فرخ سے یہ بات کی تو وہ سناٹے میں رہ گیا تھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے اتنی جلدی مجھ پر اتنا اعتماد کیسے کر لیا کہ شادی کرنا چاہتی ہو۔" اس نے پوچھا۔

"اس لیے کہ میں جانتی ہوں، تم چاہے جیسے بھی ہو اس شخص سے بہت اچھے ہو گے جس کے ساتھ میں سسکتی ہوئی زندگی گزار رہی ہوں۔"

"کیا تم مجھے یہ نہیں بتاؤ گی کہ تم کون ہو اور کیا چاہتی ہو؟ وہ آدمی کون ہے؟"

"ہاں، ضرور بتاؤں گی۔" جویریہ نے ایک گہری سانس لی۔ "حالانکہ میں تمہیں اچھی طرح نہیں جانتی، اس کے باوجود تم پر بھروسہ کر رہی ہوں۔ میری کہانی اس معاشرے کی ہزاروں مظلوم لڑکیوں والی کہانی ہے۔ میرے والد لاہور کے ایک چھوٹے سے دکاندار تھے۔ میں اپنے والدین کی تنہا اولاد ہوں اور یہ اتفاق ہے کہ ہمارا کوئی دور نزدیک کا رشتے دار بھی نہیں ہے۔ ہاں کا بہت

پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ صرف میں تھی اور میرے والد۔ میں نے اچھی خاصی تعلیم بھی حاصل کی ہے۔ پھر ہوا یہ کہ بدقسمتی نے ہمیں چاروں طرف سے اپنے محاصرے میں لے لیا۔ میرے والد کو کاروبار میں گھاٹا ہونے لگا۔ انہوں نے اپنی ساکھ اور کاروبار کو بحال رکھنے کے لیے اس شخص سے دو لاکھ روپے لیے تھے جو آج میری جان کا عذاب بنا ہوا ہے۔ اس کا نام عظیم ہے۔ میرے والد اس پر بہت بھروسہ کرنے لگے تھے۔ اس کا ہمارے یہاں آنا جانا شروع ہو گیا تھا جبکہ میں اسے ناپسند کرتی تھی اور آج بھی اس سے نفرت کرتی ہوں۔ مجھے اس کی آنکھوں میں بے رحمی اور مکاری دکھائی دیتی تھی۔ بدقسمتی یہ ہوئی کہ ایک دن والد صاحب کی طبیعت خراب ہو گئی۔ اس وقت یہ شخص ہمارے گھر میں ہی تھا۔ والد صاحب کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اب زندہ نہیں رہیں گے۔ اسی لیے انہوں نے میری حفاظت کی ذمے داری اس شخص کو سونپ دی اور خود انتقال کر گئے۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، میں اس شخص کے ساتھ بندھی ہوئی ہوں۔"

"ہوں۔" فرخ نے ایک گہری سانس لی۔ "اور تم دونوں کے درمیان رشتہ کیا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔ تم مجھے غلط مت سمجھو۔" جویریہ نے کہا۔ "ہمارے درمیان کوئی رشتہ نہیں ہے۔ حالانکہ وہ ایک بے پناہ ظالم اور بے مہر شخص ہے، درندہ ہے۔ اس کے باوجود اس میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ مجھے ہاتھ بھی لگا سکے۔ اس کی خواہش ہے کہ میں اس سے شادی کر لوں لیکن میں اس سے شادی کے بجائے موت کو ترجیح دوں گی۔"

"آخر وہ تم سے چاہتا کیا ہے؟"

"وہ بس اپنی رقم کا حصول چاہتا ہے۔ چاہے کسی طرح بھی ہو۔ مجھ پر کوئی خاص پابندی بھی نہیں ہے۔ بس اسے یہ خوف لگا رہتا ہے کہ میں کہیں اسے چھوڑ نہ جاؤں۔ اسی لیے وہ ان کے لیے درندہ بن جاتا ہے جو کسی طرح میرے قریب آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پچھلے دنوں ایک بے چارہ سیدھا سادا نوجوان مجھے راستے میں مل گیا تھا۔ ہوا یہ کہ میں رکشے سے اتر کر فلیٹ کی طرف جا رہی تھی کہ اس نوجوان کی موٹر سائیکل بے قابو ہو کر مجھ سے آ ٹکرائی۔ مجھے چوٹ تو زیادہ نہیں لگی لیکن میں پریشان ضرور ہو گئی تھی۔ میں نے اس نوجوان کو چلے جانے کے لیے کہا لیکن وہ بے چارہ ہمدردی میں مجھے فلیٹ تک پہنچانے آ گیا۔ عظیم اس وقت فلیٹ میں موجود تھا۔ اس نے نہ جانے کیا سمجھا کہ وہ اس نوجوان پر برس پڑا۔ وہ بے چارہ بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا۔ وہ تم پر بھی اسی لیے ناراض ہو رہا تھا کہ اس کے خیال میں، میں نے تمہیں اپنی تصویر تحفے میں دی تھی۔ شاید وہ اس شہر کے ہر شخص کو میرا عاشق سمجھتا ہے۔"

"میں تمہیں اپنانے کو تیار ہوں جویریہ۔" فرخ نے کہا۔ "تم یہ بتاؤ مجھے اس سلسلے میں کیا کرنا ہو گا؟"

"تم کسی طرح اس شخص سے ملو۔" جویریہ نے مشورہ دیا۔

"وہ تو مجھے دیکھتے ہی بھڑک اٹھے گا۔"

"میں کسی دن اس سے تمہارا تذکرہ کروں گی پھر دیکھتی ہوں کہ اس کا کیا رویّہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد تمہیں آگاہ کر دوں گی۔"

فرخ نے اپنا پتا اور فون نمبر دے دیا، وہ چلی گئی۔ اور اب فرخ کو فیروز کی ضرورت تھی جو اس کے بچپن کا ساتھی تھا۔ فیروز اس سلسلے میں بہت کارآمد ثابت ہو سکتا تھا۔ اس کے اچھے وسائل تھے کیونکہ اس کا تعلق ایک اخبار سے تھا۔ اس کے علاوہ وہ پیسوں کے حصول میں بھی فرخ کی مدد کر سکتا تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ فیروز سے ملاقات ہی نہیں ہو رہی تھی۔ جویریہ سے ملاقات کو تین دن ہو چکے تھے اور وہ اس عرصے میں کئی بار فیروز کے ہاں چکر لگا چکا تھا۔

آج بھی وہ فیروز کے فلیٹ سے مایوس ہو کر واپس جا رہا تھا کہ عمارت کے گیٹ پر جویریہ مل گئی۔ اس وقت وہ بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔

"میں نے تمہیں آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔" اس نے بتایا۔ "اسی لیے میں یہاں گیٹ پر تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ تمہیں ایک بہت زبردست خبر سنانی ہے۔"

"اچھا۔ جلدی بتاؤ۔"

"عظیم تم سے ملاقات پر راضی ہو گیا ہے۔" جویریہ نے بتایا۔ "اب یہ مت پوچھنا کہ اس سلسلے میں مجھے کیا کیا جتن کرنے پڑے ہیں۔ بس آج شام کو سات بجے آ جانا۔"

"کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ شخص مار پیٹ پر اتر آئے۔"

"میرے ہوتے ہوئے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس دن کی بات اور تھی، اس وقت تم سے ایسے تعلقات ہی نہیں تھے لیکن اب وہ تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ضرور آؤں گا۔"

"میں تمہارا انتظار کروں گی۔" جویریہ نے کہا۔ "شاید اب حالات بدلنے کے دن آ گئے ہیں۔"

فرخ جب اپنے مکان پر پہنچا تو وہاں ایک شخص اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ فرخ کے لیے وہ شخص اجنبی تھا۔ "میں آپ کا بہت دیر سے انتظار کر رہا تھا صاحب۔" اس نے کہا۔

"معاف کیجیے، میں آپ کو نہیں جانتا۔" فرخ نے کہا۔

"ہاں۔ آپ مجھے نہیں جانتے کیونکہ میں کل ہی جیل سے رہا ہوا ہوں۔" اس اجنبی نے کہا۔ "میرا نام راجا ہے اور میں آپ کے پاس آپ کے دوست کا خط لے کر آیا ہوں۔"

"جی۔ میرے دوست کا خط! کون سے دوست کا؟"

"فیروز۔ آپ کا وہ دوست آج کل جیل میں ہے۔"

☆ ...... ○ ...... ☆

ابراہیم بخش کو جب ہوش آیا تو وہ ایک کمرے میں تھا۔

بہت دیر تک اس کی یادداشت پر دھند لکے مسلط رہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ یہاں کیسے پہنچ گیا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے ذہن کی دھند صاف ہوتی گئی۔ اسے یاد آتا گیا کہ وہ کون ہے اور کس طرح اسے چوٹ لگی تھی اور اب وہ کس کے کمرے میں تھا۔

اس کی آنکھیں جب دیکھنے کے قابل ہوئیں تو اس نے ایک شخص کو اپنے اوپر جھکا ہوا پایا۔ وہ بڑی نرمی اور محبت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "شکر ہے کہ تمہیں ہوش آگیا۔"

"کون ہو تم؟" ابراہیم بخش نے پوچھا۔ "اور مجھے یہاں کیسے لے آئے؟"

"ایک جگہ تم بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔" اس شخص نے کہا۔ "میں اُدھر سے گزر رہا تھا کہ تمہیں بے ہوش پڑا دیکھ کر یہاں اُٹھا کر لے آیا۔ ویسے تم اس علاقے کے تو نہیں معلوم ہوتے۔ کہیں اور سے آئے ہو؟"

"ہاں۔" ابراہیم نے تصدیق کی۔ "میں کہیں اور سے آیا ہوں۔ یہ گوپال نگر ہے نا؟"

"ہاں یہ گوپال نگر ہے۔ تم یہاں کس سے ملنے آئے تھے؟"

"مرلی دھر سے۔" ابراہیم نے کہا۔ "کیا میری اس سے ملاقات ہوسکتی ہے؟"

"اوہ!" اس آدمی نے ایک گہری سانس لی پھر جلدی سے بولا۔ "ٹھہرو، میں تمہارے لیے کچھ کھانے کو لے کر آتا ہوں۔ پہلے کھا پی لو، اس سے بدن میں طاقت آجائے گی۔ اس کے بعد اطمینان سے باتیں ہوں گی۔"

اس سے پہلے کہ ابراہیم بخش کچھ کہہ سکتا، وہ آدمی کمرے سے باہر جا چکا تھا۔ اس کے جانے کے بعد ابراہیم بستر سے اُٹھ کھڑا ہوگیا۔ اسے نقاہت تو محسوس ہورہی تھی لیکن وہ ایک سخت جان آدمی تھا۔ اس کے پیروں میں ابھی تک تکلیف تھی۔ اس نے اپنے پیروں کو جھٹکا دیا تو درد کی ایک لکیر پورے بدن میں سرایت کرگئی۔ وہ جلدی سے بستر پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنی کمر کو تھپ تھپایا، اس کی تھیلی ابھی تک اس کی کمر سے بندھی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اجنبی اس کے لیے کھانا لے آیا۔ کھانا سادہ لیکن اچھا تھا۔ ابراہیم بخش نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا تو اسے اپنے بدن میں توانائی سی محسوس ہونے لگی۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے اجنبی کی طرف دیکھا۔ "ہاں تو تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ کیا مرلی دھر سے ملاقات ہوسکتی ہے؟"

"ملاقات ہوچکی ہے میرے دوست۔" وہ اجنبی مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں ہی مرلی دھر ہوں۔"

"کیا!" ابراہیم بخش نے بوکھلا کر اُٹھنا چاہا لیکن درد نے اسے پھر بے حال کردیا۔ "کیا تم ہی مرلی دھر ہو؟"

"ہاں۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم میرے پاس کسی اچھی نیت سے نہیں آئے۔" مرلی دھر نے کہا۔ "کیونکہ یہاں آنے والے اسلحہ لے کر نہیں آیا کرتے۔ تم اطمینان رکھو، تمہارا پستول تمہارے تھیلے میں موجود ہے، یہ اور بات ہے کہ اس کی گولیاں میرے پاس ہیں۔"

"کیا!" ابراہیم بخش سناٹے میں رہ گیا۔ یہ شخص تو اس سے بھی زیادہ ہوشیار ثابت ہوا تھا۔

"اب تم مجھے صاف صاف بتاؤ کہ تم کون ہو اور یہاں کیوں آئے ہو؟" مرلی دھر نے کہا۔ "میں نے ایک اجنبی اور مہمان ہونے کے ناتے تمہاری دیکھ بھال کی، تمہیں کھانا کھلایا، تمہیں آرام پہنچایا لیکن اب یہ معاملہ دوسرا ہے۔ اس لیے تمہیں بتانا ہوگا۔ اور ہاں، تم مجھے اکیلا مت سمجھنا۔ اس مکان میں میرے دس بارہ ساتھی موجود ہیں جو سب کے سب مسلح ہیں۔ تم یہاں سے نکلنے کی کوشش کروگے تو وہ تمہیں بھون کر رکھ دیں گے۔ چلو اب اچھے بچے کی طرح بتانا شروع کردو۔"

"میں نے سُنا تھا کہ تم لوگوں کو سرحد پار بھیجتے ہو۔" ابراہیم بخش نے کہا۔ "میں اسی لیے تمہارے پاس آیا تھا کہ تم مجھے سرحد پار کرادوگے۔"

"کمال ہے۔" مرلی دھر ہنس پڑا۔ "سرحد پار سے آنے کے بعد بھی کہتے ہو کہ تمہیں سرحد پار جانا ہے۔"

ابراہیم بخش پھر پہلو بدل کر رہ گیا۔ یہ شخص ضرورت سے زیادہ ہی باخبر ثابت ہو رہا تھا۔

"اب معلوم یہ کرنا ہے کہ تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟" مرلی دھر نے پوچھا۔ "اور دیکھو، مجھ سے جھوٹ مت بولنا کیونکہ بہت سی باتیں میں سمجھ رہا ہوں۔ میں اندازہ کرسکتا ہوں کہ تمہیں میرے پاس کیوں بھیجا گیا ہوگا۔ اس کے باوجود میں تم سے سُننا چاہتا ہوں۔"

"مرلی دھر!" ابراہیم بخش اچانک بھڑک اُٹھا۔ "میں اس وقت تمہارے سامنے بے بسی کی حالت میں پڑا ہوا ہوں، اس لیے تم جو سلوک چاہو کرسکتے ہو۔ اگر میں تندرست ہوتا تو تمہیں زندہ نہیں چھوڑتا۔"

"مجھے یہ معلوم ہے۔" مرلی دھر اطمینان سے بولا۔ "وہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ تمہیں مجھ سے ایسی کون سی دشمنی ہوگئی ہے؟"

"تم میرے نہیں، میرے وطن کے دشمن ہو۔" ابراہیم بخش نے کہا۔ "حالانکہ اپنے وطن میں خود میرا بھی ریکارڈ اچھا نہیں ہے۔ میں ایک قاتل اور ڈاکو ہوں لیکن وطن سے میں نے کبھی دشمنی نہیں کی جبکہ تم میرے وطن کے دشمن ہو۔ تم چاہے مجھے کوئی مار دو، لیکن میں یہ ضرور کہتا رہوں گا کہ میں تمہیں مارنے کے لیے آیا تھا۔"

"تمہارا اصل نام کیا ہے دوست؟" مرلی دھر کی آواز میں اب

بھی سکون تھا۔

"ابراہیم بخش۔"

"تو ابراہیم بخش! بات صرف اتنی ہے کہ تم سب نے مل کر ان معاملات کو بہت اُلجھا دیا ہے۔ میں آج تم سے صاف صاف باتیں کروں گا تاکہ تم بھی سُن لو اور تمہارے حوالے سے دوسروں کو بھی معلوم ہو جائے۔ تم یہ بتاؤ کہ ہندوستان میں جتنے مسلمان آباد ہیں کیا وہ سب غدار ہیں؟"

"نہیں۔ وہ سب ہندوستانی ہیں اور ہندوستان کے وفادار ہیں۔" ابراہیم بخش نے کہا۔

"بالکل یہی معاملہ ہمارا ہے ابراہیم بخش۔ تمہیں یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ میں بھی تمہاری طرح ایک پاکستانی ہوں۔"

"کیا!" ابراہیم بخش کو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو؟ تم پاکستانی ہو؟"

"ہاں' بالکل تمہاری طرح۔ یہ اور بات ہے کہ میرا اور تمہارا مذہب مختلف ہے۔ تم مسلمان ہو اور میں ہندو ہوں لیکن میرا خمیر بھی اسی مٹی سے اُٹھا ہے جس مٹی نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ مجھے بھی اپنے ملک سے اتنی ہی محبت ہے جتنی تمہیں یا کسی اور کو ہو سکتی ہے اور میں یہ بات صرف اپنے لیے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ پوری اقلیتوں کی طرف سے کہہ رہا ہوں کیونکہ ہمیں اپنے وطن میں بہت سکون اور چین ملا ہے' ہمیں ہر طرح کی آزادی حاصل ہے' ہماری عبادت گاہیں محفوظ رہتی ہیں۔ لیکن تمہارے یہاں کے کچھ سیاست دانوں اور بدعنوان سرکاری اہل کاروں نے پورا ماحول خراب کر دیا ہے۔ وہ اپنے مفاد کے لیے ہمیں کیا' کسی بھی پاکستانی کو غدار قرار دے سکتے ہیں اور انہیں چیلنج کرنے والا کوئی نہیں ہوتا کیونکہ ان کے پاس اخبارات' ریڈیو اور ٹی وی کی طاقت ہوتی ہے اور ہم اپنے وطن سے محبت کرتے کے باوجود خون کے آنسو روتے رہتے ہیں۔"

ابراہیم بخش حیرت سے اس کو دیکھتا رہ گیا۔ یہ ایک اُلجھا ہوا معاملہ تھا۔ مرلی دھر تو بالکل مختلف انسان ثابت ہو رہا تھا۔ "تو کیا یہ سب غلط ہے کہ تم ہندوستانی دہشت گردوں کو ہمارے ملک کی طرف بھیجتے رہتے ہو؟"

"ہاں' یہ سب غلط ہے۔" مرلی دھر نے کہا۔ "اس کی بھی ایک طویل کہانی ہے۔ جو میں تمہیں سُنانا چاہتا ہوں۔"

☆ ..... ○ ..... ☆

فیروز کا خط بہت طویل تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

"فرخ! تم میرے دوست ہو۔ اور دوست بھی ایسے جو مشکلوں میں کام آسکتا ہے یا جس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ میں اس وقت بہت ہی عجیب معاملے میں معاملے میں اُلجھا ہوا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارا ملک کس سمت جا رہا ہے۔ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ میں اپنے اخبار کے مالک اور ممتاز نامی ایک بہت بڑے سرکاری اہل کار کے کہنے پر جیل میں قیدی بن کر آگیا ہوں۔ میرا کام یہ تھا کہ ایک بوڑھے سے خزانے کا راز اُگلوا لوں (فیروز نے تفصیل سے وہ سب کچھ لکھ دیا تھا جو اس کے ساتھ پیش آیا تھا)

میرے دوست! جیل میں آکر میری آنکھیں کھل گئیں۔ میں تمہیں یہاں کے حالات سے آگاہ کرنے کے لیے خط نہیں لکھ رہا بلکہ اس سازش کی نشان دہی کر رہا ہوں جو ہمارے چاروں طرف پھیلا دی گئی ہے۔

"وہ بوڑھا اس ملک کا ایک ممتاز ماہر آثارِ قدیمہ ڈاکٹر شیرازی ہے لیکن چند مفاد پرستوں نے ڈاکٹر صاحب کا یہ حال کر دیا ہے کہ انہیں آپ پر بھی شبہ ہونے لگا ہے۔ اتنے بڑے آدمی پر اتنا تشدد کیا گیا ہے کہ میں بتا نہیں سکتا۔ یہ انہیں حُبّ الوطنی کی سزائیں مل رہی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اور یورپ کے ایک ماہر آثارِ قدیمہ ڈاکٹر شیرر نے کھدائی کے دوران ایک نایاب خزانے کا سراغ لگا لیا تھا۔ ڈاکٹر شیرازی کو یہ شبہ ہو گیا کہ ان لوگوں نے مزدوروں کی جو ٹیم حاصل کی ہے' اس میں سے دو چار مزدور در حقیقت مزدور نہیں بلکہ کچھ اور ہیں۔ شیرازی صاحب کو اندازہ تھا کہ یہ خزانہ کتنا بڑا ہے اور ملکی معیشت کے لیے کتنا کام آسکتا ہے۔ خزانہ نکالنے سے پہلے انہوں نے حکومت کے ایک اعلیٰ عہدیدار سے اس موضوع پر بات کی کہ اس خزانے کو خاموشی سے حکومت کی تحویل میں دے دیا جائے۔

"اس وقت یہ پتا چلا کہ وہ اعلیٰ عہدیدار اس خزانے کو حکومت کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ اس نے شیرازی صاحب کو لالچ اور دھمکیاں بھی دیں لیکن شیرازی صاحب اپنے مؤقف پر اڑے رہے۔ اب انہیں چونکہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا' اس لیے انہوں نے اپنے چند شاگردوں کو جمع کیا اور راتوں رات کھدائی کر کے خزانہ برآمد کر لیا اور اسے ایک محفوظ مقام پر چھپا دیا۔ اس کے بعد انہوں نے اور کئی لوگوں سے رابطہ قائم کیا لیکن ہر جگہ یہی اندازہ ہوتا رہا کہ سب کے سروں پر لالچ کا بھوت ناچ رہا ہے۔ ملک کے مفاد سے کسی کو دلچسپی نہیں ہے۔ اسی دوران ان لوگوں نے ڈاکٹر صاحب کے خلاف ایک بھیانک سازش تیار کی۔ ڈاکٹر شیرر کو قتل کروا دیا گیا اور شیرازی صاحب کو گرفتار کر لیا گیا تاکہ وہ خزانے کا پتا بتا دیں لیکن اس خدا کے بندے نے اب تک زبان نہیں کھولی ہے۔

"میں جیل میں آتے ہی ان سے متاثر ہو گیا تھا۔ پھر جب میں نے انہیں صورتِ حال سے آگاہ کیا تو شیرازی صاحب کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ انہیں اس بات کا افسوس ہے کہ اب اس ملک میں محبِّ وطن افراد کی اتنی شدید کمی ہو گئی ہے کہ ایسا کوئی نہیں ملتا جس کو یہ راز بتایا جا سکے۔ بہرحال شیرازی صاحب نے مجھے اس راز سے آگاہ کر دیا ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ میں یہ راز کس کو بتاؤں کیونکہ جن لوگوں نے مجھے تعینات کیا ہے وہ خود بھی اسی چکر

میں ہیں۔ نہ اس جیل کا جیلر' اخبار کا مالک اور وہ سرکاری اہل کار سب کے سب اس خزانے کی طرف دیکھ رہے ہیں' اسے اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ اب تم بتاؤ کہ میں کیا کروں؟ میں جیل میں ہوں اور میرے باہر نکلنے کی ایک ترکیب یہ ہے کہ میں ان لوگوں کو اس راز سے آگاہ کردوں لیکن میں ایسا نہیں کرسکتا۔ میں ڈاکٹر شیرازی جیسا عظیم محبِ وطن نہ سہی لیکن اتنا ضرور ہے کہ میں اپنے وطن کی خوش حالی کا سودا نہیں کرسکتا۔ اب ایک خطرہ یہ بھی ہے کہ اگر میں نے اپنی جان چھڑانے کے لیے انہیں راز سے آگاہ کر بھی دیا تو وہ مجھے نہیں چھوڑیں گے۔ یہ ایسے لوگ ہیں جو راز حاصل کرنے کے لیے مجھے قتل بھی کرسکتے ہیں تاکہ میں کسی اور کو نہ بتاسکوں۔"

"اب یہ بتاؤ کہ میں کیا کروں؟ میں تمام صورتِ حال سے تمہیں آگاہ کررہا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کی طرح میں بھی مایوس نہیں ہوں۔ اس ملک میں کوئی تو ایسا صاحبِ اختیار ہوگا جسے اپنے وطن سے محبت ہوگی۔ تمہارا کام یہی ہے کہ تم ایسے شخص کو تلاش کرکے اسے صورتِ حال سے آگاہ کردو تاکہ وہ خزانہ بھی محفوظ رہے اور میری جان بھی بچ سکے۔ میں یہ خط ایک ایسے قیدی کی معرفت روانہ کررہا ہوں جسے جیل سے رہائی مل چکی ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ خط بحفاظت تم تک پہنچ جائے گا۔ تمہارا فیروز۔"

اس خط نے فرخ کو دہلا کر رکھ دیا۔ وہ تو خود فیروز سے مشورہ مانگنے گیا تھا اور اب پتا چلا کہ اس کا دوست ایک انتہائی خطرناک عذاب میں مبتلا ہوگیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ خود اس کے وسائل بہت کم تھے' اعلیٰ عہدیداروں تک اس کی رسائی نہیں تھی۔ اگر وہ کسی طرح کسی کے پاس پہنچ بھی جاتا تو یہ کیسے معلوم ہوسکتا تھا کہ وہ شخص وطن سے محبت کرنے والا ہے۔ گویا اس کے لیے ایک عجیب و غریب الجھن کا آغاز ہوگیا تھا۔

بہت سوچ کر اس نے جویریہ سے مشورہ لینے کا ارادہ کرلیا۔ حالانکہ جویریہ خود ایک بے بس لڑکی تھی۔ وہ ایک شخص کے چنگل میں گرفتار تھی لیکن اس سلسلے میں کم از کم اسے کوئی مشورہ تو دے سکتی تھی۔ فرخ کو اس وقت کسی بہتر مشورے کی بھی ضرورت تھی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جویریہ اس سلسلے میں کچھ نہیں کرسکے گی لیکن اس کا تجربہ تھا کہ بعض اوقات انہونی بھی ہوجاتی ہے۔ بظاہر لاتعلق لوگ بھی ایسے ایسے مشورے دے جاتے ہیں جو بہت کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔

وہ ایک بار پھر جویریہ کی بالکونی کے نیچے پہنچ گیا۔ بہت دیر بعد جب وہ دکھائی دی تو اس نے ہوٹل پہنچنے کا اشارہ کردیا۔ جویریہ نے اس کا اشارہ سمجھ لیا تھا۔ اس کے انداز میں حیرت تھی۔ فرخ اس کو اشارہ کرکے ایک رکشے میں بیٹھ چکا تھا۔

جویریہ اس کے اشارے کو سمجھتے ہوئے دل کشا میں اس سے ملنے چلی آئی۔ وہ بہت حیران ہورہی تھی۔ "کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟ تم نے اس طرح مجھے کیوں بلالیا؟ میں تو اس انتظار میں تھی کہ تم عظیم سے ملنے ہمارے فلیٹ میں آؤ گے۔"

"میں اس سے بھی ملوں گا۔" فرخ نے کہا۔ "لیکن اس سے پہلے ایک ایسا معاملہ سامنے آگیا جس نے مجھے الجھا کر رکھ دیا ہے۔"

"آخر بات کیا ہے؟ کچھ بتاؤ تو۔"

فرخ نے اسے فیروز کی کہانی سے آگاہ کردیا۔

"اوہ!" جویریہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "یہ تو تم نے عجیب کہانی سنادی۔ وہ خزانہ ہے کہاں؟"

"یہ مجھے نہیں معلوم۔ فیروز نے اپنے خط میں اس کا صرف تذکرہ کیا ہے۔" فرخ نے کہا۔ "اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں' کس کے پاس جاؤں۔"

"میرا خیال ہے کہ تمہیں کسی کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔" جویریہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "دیکھو' یہ تم نے بتادیا ہے کہ تمہاری رسائی اعلیٰ حکام تک نہیں ہے۔ تم ذاتی طور پر بھی کسی کو نہیں جانتے۔ اس لیے ہوسکتا ہے کہ تم اپنی کہانی لے کر کسی کے پاس جاؤ تو وہ بھی غدار ہی ثابت ہو۔"

"یہی تو وہ الجھن ہے۔ جس کے مشورے کے لیے تمہارے پاس پہنچا ہوں۔"

"بعض اوقات راستے اور منزلیں خود بخود گھر بیٹھے انسان کے سامنے آجاتی ہیں۔" جویریہ نے کہا۔ "اور کہتی ہیں کہ آؤ مجھے حاصل کرلو۔ میرا مطلب ہے کہ تقدیر ہمیں غیر محسوس طور پر اس جگہ لے جاتی ہے جہاں ہمیں جانا چاہیے تھا۔ کیا ضروری تھا کہ تم مشورہ لینے میرے ہی پاس آتے۔ تمہیں کوئی اور بھی یہ مشورہ دے سکتا تھا' لیکن تقدیر کے کھیل بہت نرالے ہوتے ہیں۔ شروع شروع میں تو سمجھ ہی میں نہیں آتے۔"

"پتا نہیں تم کیا کہہ رہی ہو!"

"سنتے جاؤ۔ میں یہ کہہ رہی ہوں کہ تم بالکل صحیح جگہ آئے ہو۔ میں نہ صرف تمہیں مشورہ دے سکتی ہوں بلکہ اس الجھن کا حل بھی میرے پاس موجود ہے۔"

"کیا؟" فرخ نے حیران ہوکر اس کی طرف دیکھا۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ اب تم جلدی سے میرے ساتھ چلو۔ ہمیں اسی وقت عظیم سے ملنا ہے۔ بے فکر رہو' وہ اب تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔ تم آؤ میرے ساتھ۔"

☆ ..... ○ ..... ☆

"میں تمہاری طرح ایک پاکستانی ہوں۔"

حزیں ڈوگر نے اپنی کہانی شروع کی۔ "میں اپنے گاؤں کا سربراہ ہوں۔ میرا یہ گاؤں پاکستان ہی میں ہے لیکن سرحد کے اس طرف میرا کھلا جانا لگا رہتا ہے۔ اس کی وجہ کسی قسم کی دہشت گردی یا

اپنے وطن سے غداری نہیں تھی بلکہ کاروباری معاملات تھے۔ چھوٹی چھوٹی کچھ چیزیں ہم اس طرف سے لے آتے اور کچھ چیزیں اس طرف لے جاتے۔ بس یہی ہمارا دھندہ تھا۔ ایک دن مجھے اپنے گاؤں میں کچھ غیر ملکی سیاح ملے جو تلسی دیوی کے مندر کی زیارت کو آئے تھے۔ تمہیں شاید یہ نہ معلوم ہو کہ پاکستان میں ہندوؤں کی کئی مقدس یادگاریں موجود ہیں۔ تلسی دیوی کا مندر بھی ان ہی میں سے ایک ہے۔ یہ سیاح اس کی زیارت کے لیے آئے تھے۔ اتفاق یہ ہوا کہ میری ملاقات ان لوگوں سے ہو گئی اور میں بطورِ گائیڈ ان کے ساتھ ہو لیا۔ ہم مندر تک پہنچے لیکن وہاں پہنچنے کے بعد جو کچھ میں نے دیکھا وہ ناقابلِ یقین تھا۔ وہ مندر اپنی جگہ پر نہیں تھا۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو! کیا مندر ہی غائب ہو گیا تھا؟"

"ہاں' پورا مندر غائب تھا۔ میں وہاں اکثر جاتا رہتا تھا اس لیے مجھ سے راستے کے سلسلے میں کوئی غلطی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ مندر جنگلوں کے درمیان ہے۔ بہت کم لوگ اس طرف جایا کرتے ہیں۔ مندر غائب نہیں ہوا تھا بلکہ اسے کھود کر ڈھیر کر دیا گیا تھا۔ جگہ جگہ اس کے ملبے کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسا کس نے کیا ہے۔ اس مندر کے بارے میں ایک کہانی تو بہت مشہور تھی کہ اس میں پروہتوں اور پنڈتوں کا جمع کیا ہوا بہت سا سونا محفوظ ہے۔ گھوڑ دور میں ان پنڈتوں نے سونے کے ذخائر مندر میں کہیں دفن کروا دیے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ اسی خزانے کے چکر میں مندر کو نیست و نابود کر دیا گیا ہے۔ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اس موضوع پر خاموشی اختیار کر لوں' کسی کو نہ بتاؤں کہ ہمارے مندر کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ ایسی صورت میں خواہ مخواہ مذہبی فسادات برپا ہو جاتے۔ ہندو اس مقام سے بہت عقیدت رکھتے ہیں۔ یہ میری محبّ الوطنی تھی کہ میں نے خاموشی اختیار کر لی۔"

"لیکن میں نے اپنے طور پر ان لوگوں کی تلاش جاری رکھی جنہوں نے ایسا کام کیا تھا۔ پتا یہ چلا کہ حکومت کے کئی بااثر لوگ اس سازش میں شریک تھے۔ انہوں نے انتہائی خاموشی سے یہ کارروائی کی تھی۔ میں ان میں سے ایک کے پاس پہنچ گیا۔ اس کا نام محمود تھا۔ میں نے جب ایک ہندو اور ایک پاکستانی شہری ہونے کے ناتے اس سے یہ سوال کیا تو وہ شخص میری جان کا دشمن بن گیا۔ تم اسے میری خوش قسمتی سمجھو کہ میں اپنی اور اپنی بیوی بچوں کی جانیں بچا کر سرحد پار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس طرح میں اس دن سے یہیں مقیم ہوں۔"

"لیکن تم تو ایک پاکستانی ہو پھر سرحد پار تمہیں پناہ کیسے مل گئی؟"

"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میرا اس طرف آنا جانا تھا۔ تو گوپال نگر کے مکھیا سے میری جان پہچان بھی ہو گئی اور ہم ایک دوسرے کے رشتے دار بھی ہو گئے۔ وہ اس طرح کہ میں نے اپنی بیٹی کی شادی اس کے بیٹے سے کر دی۔ اس طرح مجھے اس گاؤں میں پناہ مل گئی۔"

"تم تو سرحد پار کر چکے ہو پھر مجھے تمہاری جان لینے کے لیے کیوں بھیجا گیا ہے؟"

"ظاہر ہے کہ میں وقتی طور پر اپنے ملک سے باہر آیا ہوں اور ابھی زندہ ہوں۔ ان لوگوں کو میری طرف سے یہ خطرہ ہو سکتا ہے کہ میں کسی وقت بھی واپس آ سکتا ہوں اور کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ اسی لیے انہوں نے میرا قصہ ہی ختم کرنے کی سازش کی اور تمہیں اس طرف بھیج دیا۔"

"لیکن مجھے تمہاری طرف بھیجنے والے کا نام محمود نہیں کچھ اور تھا۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے میرے دوست۔" مرلی دھر نے ایک گہری سانس لی۔ "ان لوگوں کے آپس میں بہت گہرے تعلقات ہوتے ہیں۔ ایک بڑا آدمی دوسرے بڑے آدمی سے دوستی رکھتا ہے۔ یہ سب ایک دوسرے سے ملے ہوتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ تم واپس جا کر کیا کہو گے؟"

"یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں کیونکہ میرا بچہ ان کے قبضے میں ہے۔"

"اب یہی ایک راستہ رہ گیا ہے کہ تم اپنی جان چھڑانے کے لیے یہ کہہ دو کہ تم نے مجھے مار دیا ہے۔" مرلی دھر نے کہا۔ "اس کے بعد میں یہ سوچتا ہوں کہ تم کو ہمیشہ کے لیے ان کے پنجے سے کیسے نکالا جائے۔"

"نہیں مرلی دھر! اس سے بات نہیں بنے گی۔ کیونکہ جلد یا بدیر انہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں نے جھوٹ بولا تھا۔ پھر دوسری بات یہ ہے کہ میں آزاد تو نہیں ہوں کہ اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ کر سکوں' واپس جاتے ہی مجھے جیل میں ڈال دیا جائے گا اور واپس تو ہر حال میں جانا ہے۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ تم سے میری ملاقات نہیں ہو سکی۔ تم گوپال نگر چھوڑ کر کہیں جا چکے ہو۔"

"نہیں' اس سے بات نہیں بنے گی۔" مرلی دھر سوچ میں پڑ گیا تھا۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لی۔ "ٹھیک ہے' اب یہی راستہ رہ گیا ہے کہ میں تمہارے ساتھ چلوں۔"

"میرے ساتھ! وہ کیوں؟" ابراہیم بخش حیران رہ گیا۔ "تم میرے ساتھ چلو گے تو وہ سمجھ جائیں گے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے دوست بن چکے ہیں۔ پھر وہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے مرلی دھر کو مارنے کے لیے کہا تھا' ساتھ لانے کے لیے نہیں۔ نہیں یہ معاملہ بہت پیچیدہ ہے۔"

"تو پھر ایک کام کیا جا سکتا ہے۔ تم اب یہیں رہ جاؤ۔ میرے اتنے تعلقات ہیں کہ میں تمہارے لیے کاغذات وغیرہ بنوا دوں گا اور جہاں تک تمہارے بچے کا تعلق ہے تو وہ لوگ اسے چھوڑ ہی دیں گے۔"

"نہیں۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ اتنی آسانی سے اسے نہیں چھوڑیں گے۔ اب تو یہی ہو سکتا ہے کہ میں واپس چلا جاؤں اور ان سے یہ کہہ دوں کہ میں تمہیں نہیں مار سکا۔ تم کہیں گئے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے انہیں میرے بچنے سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ میرے دوبارہ جیل پہنچ جانے کے بعد ہو سکتا ہے کہ وہ اسے چھوڑ ہی دیں۔ اگر نہیں چھوڑا تو میں سمجھوں گا کہ اس کی قسمت میں ہی یہ لکھا تھا۔ ہم قسمت سے تو نہیں لڑ سکتے نا۔ یہ سلسلہ تو چلتا ہی رہتا ہے۔"

"تم واقعی بہت اچھے آدمی ہو ابراہیم بخش۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ تم مجرم کیسے بن گئے۔"

"وہی قسمت اور معاشرے کے بااختیار لوگ جو کسی کو بھی مجرم بنوا سکتے ہیں۔ وہ جب کسی بندے پر ظلم کرتے ہیں تو وہ یا تو فریاد کرتے کرتے مرجاتا ہے یا پھر پلٹ کر سانپ کی طرح ڈسنے لگتا ہے۔ میں مرا تو نہیں البتہ مجرم ضرور بن گیا۔ میں نے کئی جرم کیے' کئی قتل بھی کیے لیکن ان کا ثبوت نہیں مل سکا۔ البتہ ایک آدمی کو گولی مار کر جب زخمی کر دیا تو اتفاق سے پکڑا گیا۔ بس اسی کی سزا بھگت رہا ہوں۔"

"لیکن ان لوگوں کے ساتھ تو کچھ بھی نہیں ہو گا۔ انہیں میری طرف سے زبان کھولنے کا خطرہ لگا رہے گا۔ اس کے علاوہ وہ ملک کے خزانے کو بھی اپنے استعمال میں لاتے رہیں گے۔"

"کاش' میری پہنچ کچھ ایسے لوگوں تک ہوتی جن کو میں یہ کہانی سنا سکتا۔" ابراہیم بخش نے کہا۔ "اس کے بعد چاہے میرا جو بھی حشر ہوتا مجھے اس کی پروا نہیں ہوتی۔ خیر...... ہو سکتا ہے کہ آج یا کل اس کا بھی کوئی راستہ نکل آئے۔ بہرحال مجھے تو واپس جانا ہے۔"

☆ ---- ○ ---- ☆

عظیم نے مسکراتے ہوئے فرخ کا استقبال کیا تھا۔

وہ پہلی بار جتنا تند خو دکھائی دیا تھا اب اس سے بالکل مختلف نظر آ رہا تھا۔ شاید جویریہ نے اسے رام کر لیا تھا۔ فرخ اور جویریہ ساتھ ہی فلیٹ تک آئے تھے۔ فرخ دروازے پر ہی کھڑا رہا جبکہ جویریہ اندر چلی گئی پھر کچھ دیر جب دروازہ کھلا تو عظیم سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"معاف کرنا دوست۔" اس نے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس دن میں ذرا غصے میں تھا اس لیے تم سے بدتمیزی کر دی۔"

"کوئی بات نہیں۔" فرخ نے جلدی سے اپنی گردن ہلا دی۔ "میں آج آپ کے رویے کو دیکھ کر اس دن کا واقعہ بھول گیا ہوں۔"

جویریہ اس دوران چائے بنانے جا چکی تھی۔

"ہاں تو اب سناؤ کیا بات ہے۔" عظیم نے کہا۔ "جویریہ نے مجھ سے ذکر تو کیا ہے لیکن بہت ادھورا۔ تم ذرا اطمینان سے بتاؤ۔"

فرخ نے اسے اپنے دوست کے خط کے بارے میں تفصیل بتا دی۔ "جویریہ نے کہا تھا کہ آپ اس سلسلے میں میری مدد کر سکتے ہیں۔"

"ہاں' ہاں۔ کیوں نہیں۔" عظیم جلدی سے بولا۔ "ہر شخص کے مدد کرنے کے انداز مختلف ہوتے ہیں۔ میں اس سلسلے میں تمہارے دوست کے کام آ سکتا ہوں۔ وہ ایک دفعہ جیل سے باہر آ جائے تو پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہے نا؟"

"جی جناب! یہی بات ہے۔ پھر وہ کسی کے پاس بھی جا سکتا ہے۔ ابھی تو جیل میں' پنجرے میں بند کسی پرندے کی طرح پھنسا ہوا ہے۔"

"میں تمہارے اور جویریہ کے لیے اس کو جیل سے رہا کروا سکتا ہوں۔"

"کیا کہا؟ اسے جیل سے رہا کروا سکتے ہیں؟" فرخ نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں' میرے کچھ ایسے ساتھی ہیں جو اس کام میں میری پوری مدد کریں گے۔" عظیم نے کہا۔ "جیل سے باہر آ کر وہ اپنی مرضی سے جس کو بھی مناسب سمجھے' خزانے کے بارے میں بتا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ کوئی مجرم تو ہے نہیں' اس لیے جیل سے فرار کا مقدمہ بھی اس پر نہیں بن سکتا۔ بلکہ الٹا حکومت اس کی احسان مند ہو گی۔ ہم لوگوں پر بھی کوئی الزام نہیں آئے گا کیونکہ ہم نے جو کچھ بھی کیا وہ ملک کی بھلائی کے لیے کیا ہے۔"

"بالکل درست۔" فرخ جلدی سے بولا۔ "میں اس کو فوراً اپنے پھوپا محمود صاحب کے پاس لے جاؤں گا۔ وہ ایک بہت بڑے سرکاری آفیسر ہیں۔ وہ ضرور اس کی مدد کریں گے۔"

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہو گی۔" عظیم کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "ایسے معاملات میں حکومت کے کسی اعلیٰ آدمی کا ساتھ ضرور ہونا چاہیے' لیکن اب ایک مسئلہ اور بھی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"اس کام کے لیے کم از کم پچیس تیس ہزار کا خرچہ ہو گا۔ تم تو جانتے ہو کہ یہ کام آسان نہیں ہے۔ نہ جانے کتنوں کی مٹھیاں گرم کرنی ہوں گی۔ سارے انتظامات کرنے ہوں گے۔"

"ہاں یہ تو ہو گا۔" فرخ نے اپنی گردن ہلائی۔ "آپ اپنا کام شروع کریں' میں پیسے لا کر دے دوں گا۔ میرے پاس بینک میں اتنے روپے ہیں۔ اگر یہ رقم اپنے دوست اور ملک کی بھلائی کے کام آ جائے تو اس سے اچھی بات اور کیا ہو گی۔"

اس دوران جویریہ چائے لے آئی تھی۔ "ہاں بھئی' دوستی ہو گئی آپ دونوں میں؟" اس نے ٹرے رکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہم میں دشمنی ہی کہاں تھی۔" عظیم نے کہا۔ "بس ایک غلط فہمی ہو گئی تھی۔"

چائے کے دوران بھی وہ اسی موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ عظیم کو اس بات پر حیرت تھی کہ فیروز نے اپنے خط میں فرخ کو اس

خزانے کے بارے میں کیوں نہیں بتایا۔

"ہو سکتا ہے کہ اس نے احتیاطاً ایسا کیا ہو کیونکہ وہ خط کسی کے بھی ہاتھ لگ سکتا تھا۔"

جب چائے ختم ہوئی تو جویریہ نے عظیم سے دریافت کیا۔ "کیا میں کچھ دیر کے لیے فرخ صاحب کے ساتھ جا سکتی ہوں؟"

"ہاں، ہاں۔ کیوں نہیں۔" عظیم مسکرایا۔ "اب تو یہ اپنے ہی آدمی ہیں۔"

اس عمارت سے باہر نکل کر جویریہ نے کہا۔ "میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ کسی ایسی جگہ چلو جو بالکل پُرسکون ہو۔"

"اگر تم چاہو تو میرے فلیٹ پر چل سکتی ہو۔" فرخ نے پیش کش کی۔ "بشرطیکہ تمہیں مجھ پر بھروسہ بھی ہو۔"

"کیسی بات کر رہے ہو۔ مجھے ابھی تو تم پر بھروسہ ہوا ہے۔ اب اس کا مطلب مت پوچھنا۔ میں تمہیں فلیٹ پہنچنے پر سب بتا دوں گی۔"

فرخ جویریہ کو اپنے فلیٹ پر لے آیا۔ یہ پُرسکون علاقے کا ایک خوب صورت فلیٹ تھا۔ "ہاں اب بتاؤ کیا بات ہے؟"

"شاید تمہیں یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ میں وہ نہیں ہوں جو تمہیں نظر آتی ہوں۔" جویریہ نے کہا۔ "میں تمہیں دھوکا دینے والی تھی۔"

"کیا؟" فرخ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "کیسا دھوکا!"

"میں اور عظیم ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔" جویریہ نے کہا۔ "ٹھہرو، میں تمہیں پوری بات بتاتی ہوں۔ میں اور عظیم ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ اب تم مجھ سے میرے خاندانی پس منظر کے بارے میں کچھ مت پوچھنا کیونکہ یہ میں نہیں بتاؤں گی۔ کالج کے زمانے میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ تھے اور ہمارے ذہنوں میں دولت حاصل کرنے کا بھوت سوار تھا۔ چاہے کسی طرح بھی ہو، ہم امیر بننا چاہتے تھے۔ اس زمانے سے ہم دونوں نے لوگوں کو دھوکے دینے شروع کر دیے اور آج تک دیتے آئے ہیں۔"

"تم یہ کیا کہہ رہی ہو؟" فرخ کی حیرانی بڑھتی جا رہی تھی۔ "تم اپنے ہوش میں تو ہو؟"

"میں اب جا کر تو اپنے ہوش میں آئی ہوں۔" جویریہ نے کہا۔ "کالج سے فارغ ہونے کے بعد بھی ہمارا یہ مشغلہ جاری رہا۔ ہم نے مختلف انداز سے لوگوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں ایک کارگر ترکیب تو وہی تصویر والی استعمال کرتے رہے۔"

"کیا مطلب؟ کون سی تصویر والی ترکیب....."

"تم جیسے کسی نوجوان کو دیکھ کر اوپر سے جان بوجھ کر اپنی تصویر گرا دینا۔ اس کے بعد تم نے جو کچھ بھی دیکھا وہ ایک ڈراما تھا۔ اس طرح کئی نوجوان میرے عشق میں مبتلا ہو کر میرے فلیٹ تک آ چکے ہیں اور میں انہیں اپنے مظلوم اور قرض دار باپ کی وہی کہانی سُناتی ہوں جو تمہیں سُنا چکی ہوں۔ پھر وہ نوجوان کسی نہ کسی طرح رقم کا انتظام کرتا ہے۔ تمہارے ساتھ بھی یہی ہونے والا تھا۔"

"خدا کی پناہ!" فرخ پر حیرت اور صدمے کا پہاڑ گر پڑا تھا۔ "تو تم ایسی ہو جویریہ؟"

"یہ کہو کہ میں ایسی تھی لیکن تمہاری ایک بات نے مجھے بدل کر رکھ دیا ہے۔" جویریہ نے کہا۔ "تم نے کہا تھا کہ کیا میں اپنے ملک کے لیے پچیس تیس ہزار بھی نہیں خرچ کر سکتا۔ بس اسی لمحے مجھے اپنے آپ سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ کہاں تم ہو کہ اپنے وطن کے لیے اپنے بینک بیلنس کو داؤ پر لگا رہے ہو اور تمہارا دوست ہے جس نے اپنی جان کی بازی لگا رکھی ہے اور کہاں ہم لوگ ہیں کہ دولت کی ہوس نے ہماری آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے کہ ہمیں اچھے بُرے کی بھی تمیز نہیں رہی۔"

"اوہ" فرخ ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ بہت دیر تک وہ سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ "تمہارا بہت بہت شکریہ جویریہ کہ تم نے مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ جس کا ضمیر زندہ ہو جائے اس کے دامن سے سارے داغ دُھل جاتے ہیں۔ تم اب میری نگاہ میں بہت اچھی لڑکی ہو۔ تم بھی حُبّ الوطنی میں کسی سے کم نہیں ہو۔"

"تمہارا بہت بہت شکریہ فرخ، تم نے مجھے سیدھی راہ دکھا دی ہے۔"

"ایک بات تو بتاؤ، کیا تم عظیم کے ساتھ ہی رہتی ہو؟"

"نہیں۔" جویریہ مسکرا دی۔ "میں اپنے گھر میں رہتی ہوں۔ عظیم کے ساتھ میرا صرف کاروباری تعلق ہے۔ میں اسی وقت اس کے فلیٹ میں آتی ہوں جب ہمیں کسی کو بے وقوف بنانا ہوتا ہے۔ اس کے بعد میں اپنے گھر چلی جاتی ہوں۔ بہرحال اب تم جلدی سے پچیس تیس ہزار کا بندوبست کر کے عظیم کو دے دو۔"

"کیا! جب تم خود ہی کہہ رہی ہو کہ یہ سب دھوکا ہے تو پھر....."

"لیکن یہاں دھوکا نہیں ہے۔" جویریہ نے ایک گہری سانس لی۔ "اب میں تمہیں بتاتی ہوں کہ اصل صورتِ حال کیا ہے۔ میں نے جب تمہارے دوست کے بارے میں عظیم سے بات کی تو اس نے یہ منصوبہ بنایا کہ وہ اس کو رہائی دلوا کر اپنے قبضے میں کر لے گا تاکہ اس سے خزانے کا راز اُگلوایا جا سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ عظیم اس کی رہائی میں مدد کر سکتا ہے۔ اس کے اچھے خاصے اختیارات اور ذرائع ہیں۔ اس لیے تمہارے دوست کی رہائی کے لیے اس موقع سے فائدہ اُٹھا لینا چاہیے۔ پھر جب وہ رہا ہو جائے گا تو ہم اسے عظیم کے چنگل سے نجات دلانے کی کوئی ترکیب سوچ لیں گے۔ تم اپنے دوست سے یہ کہنا کہ وہ اس خزانے کے بارے میں تمہیں بتا دے اور تم مجھے بتا دینا۔"

"کیوں، اس سے کیا ہوگا؟"

"تمہارے دوست کے خط اور تمہارے بیان سے پتا چلا ہے کہ یہ معاملہ بہت اہم اور خطرناک ہے۔ جن لوگوں نے تمہارے دوست کو اس حال تک پہنچایا ہے وہ اتنی آسانی سے اسے جانے نہیں دیں گے۔ وہ چاروں طرف سے اسے گھیرنے کی کوشش کریں گے۔ ایسی صورت میں یہی بہتر ہوگا کہ وہ راز تین آدمیوں میں تقسیم ہو جائے۔ پھر ہم تینوں میں سے کوئی ایک بھی اگر کسی ایماندار صاحبِ اقتدار تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تو ہمارا کام بن جائے گا۔"

"یہ تم ٹھیک کہتی ہو۔" فرخ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "لیکن....."

"تم شاید مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے ڈر رہے ہو۔ چلو تم مجھے مت بتانا لیکن خود ضرور معلوم کر لینا۔ اگر خدانخواستہ تمہارا دوست کہیں نہیں پہنچ سکا تو تم تو پہنچ ہی جاؤ گے۔ یہ درست ہے کہ میں نے تمہارے سامنے اپنا اعتماد کھو دیا ہے لیکن کیا تمہیں اس بات کا احساس نہیں ہے کہ میں نے تمہیں سچ سچ بتا دیا ہے۔ صرف اس لیے کہ میں تمہاری محبت حاصل کر سکوں۔ ہاں فرخ، میں ایک لڑکی ہونے کے باوجود تم سے صاف صاف کہہ رہی ہوں کہ میں تمہیں پسند کرنے لگی ہوں۔ اب یہ تمہاری مرضی ہے کہ تم مجھے اپناتے ہو یا ٹھکرا دیتے ہو۔"

"کیسی بات کرتی ہو جویریہ۔" فرخ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "تم جیسی لڑکی کو کون اپنانے سے انکار کر سکتا ہے۔ جہاں تک تمہاری پرانی حرکتوں کا تعلق ہے تو میں تمہارے اعتراف کے بعد سب کچھ بھول گیا ہوں۔"

جویریہ نے اپنی گردن جھکا لی۔ ان دونوں کے درمیان محبت کا وہ تعلق قائم ہو چکا تھا جو ایک دوسرے کو تقویت دیا کرتا ہے۔

☆ ..... ○ ..... ☆

ابراہیم بخش بہت دور سے کسی نقطے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

اس سے بہت دور ایک جیپ کھڑی تھی جس میں چار آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں دوربین تھی۔ وہ چاروں مسلح تھے۔

"وہ واپس آرہا ہے۔" دوربین سے دیکھنے والے نے اپنے ساتھیوں کو بتایا۔

"آنے دو۔" ایک نے کہا۔ "اور جیسے ہی قریب آئے اُسے گولیوں سے اُڑا دینا۔"

اس وقت ان کی جیپ عام راستے سے ہٹ کر درختوں کے درمیان کھڑی ہوئی تھی۔ ان سے کچھ فاصلے پر ایک بلند ریت کا ٹیلا تھا اور اس کے عقب میں بہت دور دونوں ملکوں کی سرحدیں تھیں۔ رات کا وقت تھا اس لیے ہر طرف گہری خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔

رات ہونے کے باوجود تقریباً پورے چاند کی روشنی نے آس پاس اُجالا کر رکھا تھا جس کی وجہ سے دوربین والے کو ابراہیم بخش کا دور سے آتا ہوا ہیولہ دکھائی دے گیا تھا۔

"یار، ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔" ایک شخص نے کہا۔ "اسے گولی مارنے کا کام تو سرحدوں کے محافظ بھی کر سکتے تھے۔ بس کسی طرح انہیں بتا دیا جاتا کہ غیر قانونی طور پر ایک آدمی سرحد پار کر رہا ہے۔ پھر وہ خود ہی اس سے نمٹ لیتے۔"

"اس میں ایک خطرہ بھی تھا۔ ہو سکتا تھا کہ وہ ابراہیم کو گولی مارنے کے بجائے اسے گرفتار کر لیتے۔ پھر وہ سب کچھ بتا دیتا۔ اسی لیے ہمیں بھیجا گیا ہے کہ ہم اس کا قصہ ہی ختم کر دیں۔"

اتنی دیر میں ابراہیم کچھ اور قریب آچکا تھا۔ اس جیپ اور ابراہیم سے کچھ فاصلے پر ایک خیمے میں اس وقت کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سوائے ممتاز کے سب فوجی تھے جو ممتاز کی باتیں بہت دھیان سے سُن رہے تھے۔

"آپ لوگوں نے ہمارے ساتھ بہت تعاون کیا ہے۔" ممتاز کہہ رہا تھا۔ "آپ ہی لوگوں کے تعاون سے ابراہیم بخش سرحد پار گیا تھا اور اب واپس بھی آرہا ہے۔"

"جی جناب۔" ایک فوجی آفیسر نے اپنی گردن ہلائی۔ "ہم نے جان بوجھ کر اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں ورنہ کس کی مجال تھی کہ سرحد پار بھی کر لے اور پھر آسانی سے واپس بھی آجائے۔ یہاں سے تو پرندہ بھی نہیں گزر سکتا۔"

"تو اب اس کے لیے کیا حکم ہے؟" ایک اور آفیسر نے پوچھا۔ "کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ ابراہیم کو پکڑ کر آپ کے محکمے کے حوالے کر دیا جائے؟"

"جی ہاں، میں یہی چاہتا ہوں۔" ممتاز نے کہا۔ "ہم نے ہی اسے جیل سے نکال کر سرحد پار بھیجا تھا۔ وہ ایک انتہائی خفیہ مشن تھا جس کے لیے ابراہیم بخش جیسے شخص کی ضرورت تھی۔ اب یہ شخص اپنا کام کر کے واپس آرہا ہے۔ ہمیں خطرہ ہے کہ یہ کہیں فرار نہ ہو جائے۔ اس لیے بہتر ہے کہ اس سے پہلے ہی اسے گرفتار کر لیا جائے۔"

اسی وقت گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ سب کے سب حیران ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ اچانک ایک فوجی تقریباً دوڑتا ہوا خیمے میں داخل ہوا۔ اس نے فوجی آفیسر کو سیلوٹ مارتے ہوئے کہا۔ "سر، جو آدمی سرحد پار سے آرہا تھا اسے مار دیا گیا ہے۔"

"کیا!" سب کے سب جلدی سے کھڑے ہو گئے۔ "کس نے مارا ہے؟" آفیسر چلایا۔ "میں نے تو منع کیا تھا۔"

"ایک جیپ میں چار آدمی تھے سر۔ انہوں نے گولیاں چلائی تھیں۔ ہم نے ان پر جوابی فائرنگ کر دی اور وہ چاروں ہی مر گئے۔"

"یہ تو بہت بُرا ہو۔ کون تھے وہ لوگ؟"

"یہ نہیں پتا چل سکا جناب۔" اس نے بتایا۔ "ان کی تلاشی لی جارہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ کاغذات وغیرہ مل جائیں۔"

سب کے سب خیمے سے باہر آگئے۔ ممتاز بھی ان کے ساتھ ہی تھا۔ اس وقت اس کے ہونٹوں پر ایک گہری مسکراہٹ رچی ہوئی تھی جو اس کے اطمینان کو ظاہر کررہی تھی۔

☆ ...... ○ ...... ☆

فیروز کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہورہا ہے۔

اسے بڑی آسانی سے کچھ لوگوں نے جیل سے باہر نکال لیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان لوگوں نے جیل کے پورے عملے کو خرید رکھا ہو۔ ایک دو مقامات پر کچھ رکاوٹیں پیش آئی تھیں مگر پھر وہ بھی دور ہوگئیں۔ دوپہر کے وقت ایک پولیس ڈالا اس کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا تھما گیا جس پر صرف اتنا لکھا تھا۔ "رات دس بجے تیار رہنا۔"

اس نے کاغذ کے اس ٹکڑے کو پھاڑ کر ایک طرف پھینک دیا اور شیرازی صاحب کی طرف متوجہ ہوگیا جن کی حالت پہلے سے کہیں زیادہ خراب ہوگئی تھی۔ فیروز نے جب شیرازی صاحب کو کاغذ کے اس ٹکڑے کے بارے میں بتایا تو ان کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ "ہوسکتا ہے قدرت نے تمہارے باہر نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کردیا ہو۔ تم اس موقعے سے فائدہ اُٹھالو۔"

"لیکن میں آپ کو چھوڑ کر کیسے جاسکتا ہوں۔ آپ کی حالت تو خراب ہوتی جارہی ہے۔"

"میری فکر مت کرو۔ میرا اللہ نگہبان ہے۔" شیرازی صاحب نے کہا۔ "بس تم اس بات کا دھیان رکھنا کہ قوم کا ایک قیمتی راز تمہارے سینے میں ہے۔ اس کی حفاظت کرنا۔"

"جب آپ جیسے بزرگ نے اس راز کے لیے اپنی جان کو عذاب میں ڈال رکھا ہے تو میں کیوں نہیں کرسکتا۔ آپ بالکل بے فکر رہیں، میں یہاں سے نکلنے کے بعد بہت سوچ سمجھ کر کوئی قدم اُٹھاؤں گا۔ میں اس راز کو صرف ایسے شخص کے سامنے ظاہر کروں گا جس کا کردار بے داغ رہا ہو لیکن ابھی تو اُلجھن یہ ہے کہ اس جیل میں میرا ہمدرد کون پیدا ہوگیا ہے۔"

"تم نے اپنے کسی دوست کو خط بھی تو لکھا تھا۔" شیرازی صاحب نے پوچھا۔

"جی ہاں، لیکن اس بے چارے کے اتنے وسائل کہاں ہیں۔ یا ہوسکتا ہے کہ اسی نے کوئی راستہ نکالا ہو۔ بہرحال یہاں سے نکلنے کے بعد ہی پتا چلے گا۔"

"تم اس موقعے کو ہاتھ سے جانے مت دو۔ ضرور جاؤ، دیکھو قسمت میں کیا لکھا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے تمہیں بھی تشدد برداشت کرنا پڑا ہے۔"

"آپ کے لیے نہیں قوم کے لیے اور قوم کے لیے اتنی قربانی تو دی جاسکتی ہے۔ شاید ان کا خیال تھا کہ میں انہیں آسانی سے بتا دوں گا لیکن شیرازی صاحب! آپ کے حوصلے کو دیکھ کر میں ایک نیا انسان بن چکا ہوں۔ اب مجھ پر ظلم کے پہاڑ بھی توڑ دیے جائیں تو میری زبان ان لوگوں کے سامنے نہیں کھلے گی۔ میں تو یہ دیکھ کر حیران ہورہا ہوں کہ یہ سب کے سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ سب ایک ہی جیسے ہیں۔"

"اسی بات کا تو رونا ہے کہ اب کسی پر بھروسہ کرنے کو دل نہیں چاہتا۔" ڈاکٹر شیرازی نے کہا۔

"اس کے باوجود کسی نہ کسی کے پاس تو جانا ہی ہوگا۔" فیروز نے کہا۔ "آپ میرے لیے دعا کیجئے گا۔"

"ضرور۔" ڈاکٹر شیرازی کے ہونٹوں پر ایک اُداس سی مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ "تم میرے لیے دعائے خیر کرنا کیونکہ اب مجھے اپنی زندگی کی اُمید نہیں ہے۔ یہ بے رحم لوگ اب کچھ بھی کرسکتے ہیں، کسی وقت بھی میری زندگی کے چراغ کو گل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن قیامت میں تم گواہ رہنا کہ میں نے اپنے وطن سے غداری نہیں کی۔"

رات دس بجے فیروز کو اس کال کوٹھری سے نکال لیا گیا۔ پھر کئی رکاوٹوں سے گزرتے ہوئے اسے جیل سے باہر پہنچا دیا گیا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اتنا مشکل کام اتنی آسانی سے بھی ہوسکتا ہے۔ اسے باہر نکالنے والے پولیس ہی کے اہل کار تھے جنہیں شاید کسی نے اچھی خاصی رقم دے کر اس کام پر آمادہ کیا ہوگا۔ جیل سے باہر اندھیرے میں ایک گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔

"جلدی جاؤ، وہ گاڑی تمہارے لیے ہے۔" ایک پولیس والے نے گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔

فیروز نے ان دونوں پولیس والوں کا شکریہ ادا کیا اور گاڑی کی طرف چل پڑا۔ وہ ابھی گاڑی کے پاس پہنچا ہی تھا کہ جیل سے سائرن کی چیخ سنائی دی۔ شاید جیل والوں کو اس کے فرار کا علم ہوگیا تھا۔ اسی لمحے کسی نے گاڑی سے سر نکال کر اس کی طرف دیکھا اور زور سے بولا۔ "جلدی آؤ، جلدی۔"

فیروز دوڑتا ہوا گاڑی میں سوار ہوگیا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے روانہ ہوگئی۔ اسی لمحے کسی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "تم ٹھیک تو ہو؟" ہاتھ تھامنے والے نے دریافت کیا۔

ہاتھ تھامنے والے کی آواز فیروز نے پہچان لی، وہ فرخ تھا۔

"فرخ تم!"

"ہاں میں۔" فرخ نے کہا۔ "میں نے یہ پوچھا ہے کہ تم ٹھیک تو ہو۔"

"تو کیا یہ سب کچھ تم نے کیا ہے؟" فیروز حیران ہوا جارہا تھا۔ "کیا یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے؟ آخر کیسے؟ کس طرح؟"

"ظاہر ہے کہ تم نے کچھ سوچ کر ہی مجھے خط بھیجا ہوگا۔ بہرحال اب ہم گاڑی سے اُتر کر اس موضوع پر بات کریں گے۔"

فیروز خاموش رہا۔ اس گاڑی میں فیروز کے علاوہ ایک اور آدمی بھی تھا جو گاڑی چلانے والے کے برابر بیٹھا ہوا تھا۔ گاڑی اب شہر کے مضافات کا رُخ کر رہی تھی۔ فیروز کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ فرخ اسے کہاں لے جارہا ہے لیکن اس وقت اس نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا تھا۔ گاڑی ایک بڑے سے مکان کے احاطے میں داخل ہوگئی جہاں کچھ لوگ پہلے سے موجود تھے۔ ان لوگوں کو ایک ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھا دیا گیا۔ کچھ دیر بعد ایک لڑکی چائے کی ٹرے لے کر کمرے میں داخل ہوگئی۔

"یہ جویریہ ہیں۔" فرخ نے جویریہ کا تعارف کرایا۔ "اور سچ تو یہ ہے کہ ان ہی کی کوششوں سے تم یہاں تک پہنچ سکے ہو۔"

"بہت بہت شکریہ آپ کا۔" فیروز نے کہا۔ "اب آپ لوگ میرے لیے کوئی ایسا بندوبست کردیں کہ میں فوری طور پر خاور صاحب کے پاس پہنچ سکوں۔"

"کون خاور صاحب، وہ ملٹری انٹیلی جنس والے؟" جویریہ نے دریافت کیا۔

"جی ہاں، کیا آپ ان کو جانتی ہیں؟"

"بہت اچھی طرح۔"

جویریہ نے اتنا ہی کہا تھا کہ وہ مکان گولیوں کی آوازوں سے گونج اٹھا۔ فرخ اور فیروز بوکھلا کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

☆ …… ○ …… ☆

اس کمرے میں ایک انتہائی ہنگامی میٹنگ ہو رہی تھی۔

اس میٹنگ میں حکومت کے اعلیٰ اہل کار، مختلف ایجنسیوں سے تعلق رکھنے والے اور وزیرِ داخلہ بھی موجود تھے۔ ان کے درمیان مُرلی دھر بھی دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اپنا بیان ختم کرلیا تھا اور اب اُمید بھری نگاہوں سے ان لوگوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"یہ انتہائی سنگین نوعیت کا معاملہ ہے۔" وزیرِ داخلہ کی آواز گونجی۔ "اگر یہ کہانی سچ ہے تو پھر ہمیں یہ سوچنا ہوگا کہ ہم نے اپنے معاشرے میں کہاں کہاں خامیاں چھوڑی ہیں کہ ایسے ایسے لوگ بھی وطن سے غداری کے مرتکب ہو رہے ہیں جن پر وطن کی محافظت کا بار رکھا جاتا ہے۔"

"فوری طور پر تو ہمیں ان لوگوں کے خلاف ایکشن لینا ہے جناب۔" ایک سرکاری آفیسر نے کہا۔

"میں نے ابراہیم بخش کو اپنی آنکھوں سے مرتے ہوئے دیکھا ہے حضور۔" مرلی دھر کی آواز گونجی۔ "وہ بے چارہ خواہ مخواہ مارا گیا۔ میں نے اسے پاکستان کی طرف روانہ تو کردیا تھا لیکن میرا دل نہیں مانا، میں بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ میں نے دیکھا کہ اس نے سرحد کراس بھی کرلی تھی۔ پھر کسی طرف سے اس پر گولیاں برسنے لگیں اور وہ اسی وقت مرگیا۔"

"ہاں، یہ رپورٹ بھی ہمارے سامنے ہے۔" وزیرِ داخلہ نے ایک فائل کی طرف اشارہ کیا۔ "اس رپورٹ کے مطابق ابراہیم بخش پر گولیاں چلانے والے چار افراد جو بعد میں ہمارے سرحدی محافظوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ حیرت انگیز طور پر ہمارے ایک اعلیٰ عہدیدار ممتاز صاحب بھی اس موقعے پر وہاں موجود تھے۔"

"میں ممتاز صاحب کو تو نہیں جانتا۔" مرلی دھر نے کہا۔ "البتہ محمود صاحب کو ضرور جانتا ہوں۔ ان ہی کی وجہ سے مجھے سرحد پار جانا پڑا تھا۔"

"یہی بات تو پریشانی کی ہے کیونکہ ممتاز اور محمود دونوں ایک دوسرے کے سالے بہنوئی ہیں۔"

"ایک تو ہمارے ملک کو اس قسم کی رشتے داریوں نے بہت تباہ کیا ہے۔" ایک ایجنسی کے سربراہ نے کہا۔

"ہاں۔ یہ بھی ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم وطن کے نہیں بلکہ رشتے داروں کے مفاد میں سوچتے ہیں، چاہے وہ جیسا بھی ہو۔ بہرحال ہم سب مرلی دھر کے مشکور ہیں جنھوں نے اپنی جان پر کھیل کر قومی ورثے کی حفاظت کی ہے۔"

"اس میں احسان کیسا جناب۔" مرلی دھر نے کہا۔ "میں بھی تو اسی ملک کا شہری ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ میرا مذہب دوسرا ہے لیکن وطن تو ایک ہے نا۔ میرے بزرگوں نے اسی دھرتی پر جنم لیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ہم میں کچھ غدار بھی ہوں لیکن ان کی غداری کو ہماری پوری قوم کی غداری نہیں سمجھنا چاہیے۔ ہم میں سے زیادہ تر ایسے ہیں جو اب بھی اپنے ملک کے لیے اپنی جان کی بازی لگا سکتے ہیں۔"

سب تحسین آمیز نگاہوں سے مرلی دھر کو دیکھ رہے تھے۔ جس نے اپنی جان کا خطرہ مول لے کر تلسی دیوی کے مندر کے خزانے کا راز ظاہر کردیا تھا۔

"ہمیں بہت ہوشیاری سے پلاننگ کرنا ہوگی جناب۔" ایک شخص نے کہا۔ "یہ بہت بااثر لوگ ہیں۔"

"یہ بات غلط ہے کیونکہ قانون سے زیادہ بااثر کوئی نہیں ہوتا۔" وزیرِ داخلہ بول پڑے۔ "اگر آپ یہ محسوس کریں کہ خود میں غداری کا مرتکب ہو رہا ہوں تو مجھے بھی گرفتار کرسکتے ہیں۔ بہرحال میں یہ چاہتا ہوں کہ فوری طور پر ان لوگوں کے خلاف ایکشن لیا جائے۔ اس سے پہلے کہ یہ ہماری قومی دولت کہیں اور منتقل کرنے میں کامیاب ہوجائیں، ہمیں انھیں روک لینا چاہیے۔"

☆ …… ○ …… ☆

گولیوں کی گونج ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک آدمی بوکھلایا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ "اس مکان کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔" اس نے اطلاع دی۔

"اوہ۔" جویریہ نے ایک گہری سانس لی۔ "یہ تو بہت برا ہوا۔" پھر اس نے اس آدمی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم اپنے آدمیوں میں اسلحہ تقسیم کردو۔ جلدی۔" وہ آدمی جس رفتار سے

دوڑتا ہوا کمرے میں داخل ہوا تھا اسی طرح باہر چلا گیا۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" فرخ نے بوکھلا کر پوچھا۔ "کس نے گھیرا ہے؟"

"ظاہر ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں جو اس خزانے کا راز حاصل کرنا چاہتے ہیں۔" جوریہ نے کہا۔ "اب اس خزانے کے راز کو محفوظ اور ایماندار ہاتھوں میں پہنچانے کا یہی طریقہ ہے کہ فیروز صاحب کو یہاں سے نکال دیا جائے اور یہ یہاں سے نکل کر کسی بااختیار آدمی کے پاس پہنچ جائیں۔"

"لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ انہیں راستے میں گھیر لیا جائے" فرخ نے خدشہ ظاہر کیا۔

"دیکھیں، مجھے اپنی جان کی پروا نہیں ہے۔" فیروز نے کہا۔ "میری تمنا ہے کہ جو قومی راز میرے سینے میں موجود ہے وہ غداروں پر ظاہر نہ ہو۔ میں ایسا کرتا ہوں کہ آپ لوگوں کو بھی بتا دیتا ہوں۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"اس سے یہ ہوگا کہ اس مکان سے ہم تینوں ہی نکلنے کی کوشش کریں گے اور ہم میں سے کوئی بچ جائے گا۔ بس جو بچ جائے وہ اپنا فرض پورا کردے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ جلدی بتائیں۔" جوریہ دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"ڈاکٹر شیرازی نے وہ سارا خزانہ اسی جگہ چھپا دیا تھا جہاں سے نکالا گیا تھا۔" فیروز نے بتایا۔

"کیا مطلب؟" جوریہ اور فرخ چونک گئے۔ "یہ کس طرح ممکن ہے؟"

"یہی تو ان کی عقل مندی ہے۔ انہوں نے تاثر یہی دیا کہ وہ خزانہ نکال لیا گیا ہے جبکہ وہ خزانہ اسی جگہ موجود ہے۔ اسے تلاش کرنے والے پورے ملک میں تلاش کرتے رہے اور کسی کا دھیان بھی اس کی طرف نہیں جاسکا۔"

"واقعی یہ تو کمال ہوگیا۔" جوریہ نے ایک گہری سانس لی۔ "لیکن اس سے بڑا کمال یہ ہوا کہ مجھے اب خزانے کے بارے میں معلوم ہوچکا ہے۔"

اسی وقت کمرے میں کئی آدمی داخل ہوئے۔ ان میں عظیم بھی تھا اور کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو غیرملکی دکھائی دے رہے تھے اور ان کے درمیان ایک ایسا شخص بھی تھا جس کو دیکھ کر فیروز چونک اٹھا تھا۔ وہ ممتاز تھا۔

"مبارک ہو ممتاز صاحب!" جوریہ نے ممتاز کو مخاطب کیا۔ "جو کام آپ اپنے وسائل کے باوجود نہیں کرسکے، وہ میں نے کر دکھایا ہے۔ مجھے خزانے کا راز معلوم ہوچکا ہے۔"

"تم واقعی آفت کی پرکالہ ہو جوریہ۔" عظیم نے کہا۔

"مسٹر عظیم! مجھ سے زبان سنبھال کر بات کرو۔" جوریہ پھنکاری۔ "یاد رکھو کہ تم میرے ماتحت ہو۔"

"آخر یہ قصہ کیا ہے جوریہ؟" فرخ نے اس کی طرف دیکھا۔ "یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

"یہ سب ایک بہت بڑے ڈرامے کا ڈراپ سین ہے۔" جوریہ مسکراتی ہوئی بولی۔ "ابھی جو گولیاں چل رہی تھیں وہ بھی اسی ڈرامے کا منظر تھا تاکہ تمہارا دوست بوکھلا کر اس خزانے کا راز ظاہر کردے۔"

"او خدا، مجھ سے بہت بڑا دھوکا ہوگیا۔" فیروز نے ایک گہری سانس لی۔

"تم سے بڑا دھوکا مجھے ہوا ہے۔"

"میں جانتا تھا کہ تم بھی ڈاکٹر شیرازی کی طرح اتنی آسانی سے کچھ نہیں بتاؤ گے۔" ممتاز نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ایک تو ہم اس ڈاکٹر شیرازی سے پوچھ پوچھ کر تھک گئے تھے۔ نہ جانے کتنی طاقت ہے اس شخص میں کہ اس نے تشدد کے باوجود اپنی زبان نہیں کھولی۔"

"وطن سے محبت کرنے والے اسی طرح کے ثابت قدم ہوا کرتے ہیں ممتاز صاحب۔"

"اچھا۔" ممتاز ہنس پڑا۔ "یہ تو بالکل فلمی سچویشن ہوگئی ہے۔ فلمی مکالمے بولے جا رہے ہیں۔"

"میرے دوست!" فرخ نے فیروز کی طرف دیکھا۔ "مجھے معاف کردینا، مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے بھی کسی جال میں پھنسایا جا رہا ہے۔"

"چاہے کچھ بھی ہو، ہمیں تمہارے منصوبے کی داد دینی ہوگی مسٹر فیروز۔" ممتاز نے کہا۔ "اس قسم کی کہانیوں اور فلموں وغیرہ میں ہیرو وغیرہ کے سامنے ساری سچویشن بیان کردی جاتی ہے۔ تو میں بھی تمہیں ساری صورتِ حال بتا دیتا ہوں۔"

"اس کے بعد ہیرو کامیاب بھی ہوجاتا ہے ممتاز صاحب۔" فیروز تلخ لہجے میں بولا۔

"ہاں، صرف فلموں اور کہانیوں میں۔" ممتاز نے کہا۔ "یہاں ایسی کوئی امید نہیں ہے۔ یہ کہانی اس وقت کی ہے جب ڈاکٹر شیرازی اور جرمنی کے ڈاکٹر شیرر نے ایک قدیم عمارت کی کھدائی کی تو اسی دوران انہیں بیش بہا خزانے کا پتا چل گیا اور دوسری طرف مجھے بھی معلوم ہوگیا کہ ان لوگوں نے کوئی خزانہ دریافت کرلیا ہے۔ ڈاکٹر شیرازی کو اندازہ ہوگیا کہ حکومت کے کچھ اہل کار اس خزانے کو اپنے لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تو اس شخص پر حب الوطنی کا بھوت سوار ہوا اور اس نے وہ خزانہ غائب کردیا۔ کچھ دنوں کے بعد ہم نے اس کو گرفتار کرلیا۔ اسے لالچ بھی دیا گیا لیکن وہ ہماری طرف سے کھٹک چکا تھا اس لیے اس نے کچھ نہیں بتایا۔ ہم نے اس پر تشدد بھی کرکے دیکھ لیا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اتفاق سے ایک اخبار کا مالک اور ایڈیٹر بھی ہمارے دوستوں میں تھے۔ اسے جب ہماری پریشانیوں کا پتا چلا تو اس نے یہ تجویز

پیش کی کہ کیوں نہ ایک آدمی کو ڈاکٹر شیرازی کا ہمدرد بنا کر جیل میں بند کروا دیا جائے تاکہ وہ ڈاکٹر شیرازی سے راز حاصل کر کے ہمیں بتا دے۔ اس کام کے لیے اس نے فیروز کا نام پیش کیا۔ ایک پُرجوش مہم پسند نوجوان۔ ہم نے فیروز کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو پتا چلا کہ وہ شہر کے ایک فلیٹ میں رہتا ہے اور اس کا صرف ایک ہی دوست ہے جو اکثر اس کے پاس آتا ہے۔ اور وہ ہے فرخ۔"

"اس کے بعد کی کہانی میں سنا دیتی ہوں ممتاز صاحب۔" جویریہ نے کہا۔

"ضرور۔" ممتاز مسکرا دیا۔ "کیونکہ اس ڈرامے میں تمہارا کردار سب سے اہم ہے۔"

"ممتاز صاحب اور ان کے ساتھیوں نے ایک پلاننگ کے ذریعے فیروز کو جیل بھجوا دیا۔ جہاں ان کی ملاقات ڈاکٹر شیرازی سے ہوگئی۔ لیکن ممتاز صاحب کو یہ اندازہ ہوگیا کہ ڈاکٹر شیرازی کی طرح فیروز پر بھی حُبّ الوطنی کا بھوت سوار ہے اور یہ بھی کسی کو کچھ نہیں بتائے گا لہٰذا اب یہ سوچا گیا کہ فیروز کو کس طرح دوسرے طریقے سے گھیرا جائے۔ اس سلسلے میں فرخ کا نام ذہن میں آیا جو مسٹر فیروز کے دوست ہیں۔ پھر میں نے اسی عمارت میں ایک فلیٹ حاصل کیا جس میں فیروز کی رہائش تھی۔ ہمیں معلوم تھا کہ فرخ وہاں آتا رہتا ہے۔ پھر ایک خاص انداز سے میں نے فرخ سے دوستی پیدا کی' اسے اپنی محبت کا یقین دلایا اور جب یہ دیکھ لیا کہ فرخ پوری طرح میرے سحر میں گرفتار ہوگیا ہے تو ہم نے جیل میں موجود فیروز کو یہ آسانی مہیا کردی کہ وہ اپنے دوست فرخ کو ایک خط لکھ دے۔"

"اوہ!" فیروز نے ایک گہری سانس لی۔ "تو یہ سب تم لوگوں کی سازش تھی؟"

"ہاں۔" ممتاز نے کہا۔ "کچھ حاصل کرنے کے لیے اس قسم کے اُلٹ پھیر کرنے ہی پڑتے ہیں۔ فیروز نے یہ سمجھا کہ وہ بہت ہی محفوظ ہاتھوں اور بڑی رازداری کے ساتھ اپنے دوست کو خط بھیج رہا ہے لیکن وہ خط فرخ سے پہلے ہمارے پاس آیا تھا۔ ہمیں یہ توقع تھی کہ فیروز اس خط میں خزانے کے بارے میں ضرور لکھ دے گا لیکن اس خط میں کوئی تذکرہ نہیں تھا اس لیے ہمیں فوری طور پر دوسرا منصوبہ تیار کرنا پڑا۔ ہم نے اپنے آدمیوں کے ذریعے فیروز کو جیل سے رہائی دلوا دی۔"

"تو مجھے جیل سے بھی تم ہی لوگوں نے رہا کیا تھا؟" فیروز نے پوچھا۔

"ظاہر ہے۔" اس بار عظیم بول پڑا۔ "میں بے چارہ اتنا بڑا کام کس طرح کر سکتا تھا۔"

"تو ہم نے تمہیں جیل سے رہا کروایا اور یہاں لے آئے۔" ممتاز نے کہا۔ "اب تم سے وہ راز اگلوانے کا مرحلہ رہ گیا تھا۔ تو ہم نے گولیاں چلانے کا ڈراما کیا۔ تم نے بوکھلا کر اپنا راز جویریہ کو بتا دیا اور اب ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے ہیں۔"

"جویریہ!" فرخ نے جویریہ کو مخاطب کیا۔ "میں نے تو تم پر بھروسہ کیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تم اس محبت کا مذاق اُڑاؤ گی۔"

"یہ محبت وغیرہ فالتو کی باتیں ہیں فرخ صاحب۔" جویریہ نے کہا۔ "آج کے دور کی سب سے بڑی حقیقت دولت ہے۔ اس حقیقت کے سامنے سارے جذبے' سارے رشتے ماند پڑ جاتے ہیں۔ انسان اپنے وطن تک کا سودا کر لیتا ہے۔ اور تم تو میرے لیے اجنبی ہو۔ جب میں نے اپنے باپ سے ہمدردی نہیں کی تو تم کیا چیز تھے۔"

"تمہارا باپ!" فیروز نے بوکھلا کر اس کی طرف دیکھا۔ "کون ہے تمہارا باپ؟"

"ڈاکٹر شیرازی۔" جویریہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ "میں انہیں سمجھاتی رہی کہ ڈیڈی' آپ کن چکروں میں پڑ رہے ہیں۔ اس دولت سے فائدہ اُٹھائیں۔ میں آپ کی بیٹی ہوں' مجھے بتا دیں کہ وہ خزانہ کہاں ہے۔ ہمارا مستقبل محفوظ ہوجائے گا۔ ہم یہاں سے کہیں اور چلے جائیں گے لیکن وہ کہاں ماننے والے تھے' وہ اپنی ضد پر اڑے رہے اور ہمیں مجبوراً ان کے خلاف سازش کر کے انہیں جیل بھجوانا پڑ گیا۔"

"شاباش۔" فرخ غصیلے لہجے میں بولا۔ "میں نے تم جیسی فرمانبردار اولاد آج تک نہیں دیکھی۔ خدا تم جیسی اولاد کسی کو نہ

دے۔"

"خاموش رہو مسٹر فرخ!" جویریہ زور سے چیخی۔ "میں نصیحتیں سننا نہیں چاہتی۔"

اسی لمحے کمرے میں ایک آدمی داخل ہوا۔ اس نے ممتاز کے ساتھ کھڑے ہوئے ایک آدمی کے کان میں سرگوشی کی' اس آدمی نے ممتاز سے کچھ کہا پھر آنے والے کے ساتھ باہر چلا گیا۔ اس دوران کمرے میں خاموشی رہی۔ سب اپنی اپنی جگہ کچھ سوچ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ آدمی کمرے میں واپس آگیا جس کے کان میں سرگوشی کی گئی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ کچھ بدلا ہوا تھا۔

"کیا بات ہوگئی محمود!" ممتاز نے اس آدمی سے دریافت کیا۔

"ملی دھر سرحد عبور کرکے حکام کے سامنے پیش ہوگیا ہے۔" اس شخص نے کہا جسے محمود کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا۔ "ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ اس نے حکام کو ہمارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔"

"اوہ! یہ تو بہت برا ہوا۔" ممتاز نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

"یہ کیا قصہ ہے ممتاز صاحب؟" جویریہ نے پوچھا۔ "کون ملی دھر؟"

"ہمیں ایک مندر کی کھدائی کے دوران سونے کی کچھ اینٹیں ملی تھیں۔" ممتاز نے بتایا۔ "لیکن ملی دھر نامی ایک آدمی کو ان کے بارے میں معلوم ہوگیا۔ ہم نے اس کے پیچھے اپنے آدمی روانہ کیے لیکن وہ کم بخت سرحد عبور کرگیا۔ پھر ہم نے ابراہیم بخش نامی ایک آدمی کو اسے مارنے کے لیے سرحد پار کروائی۔ ہم نے یہ سمجھا تھا کہ اس نے ملی دھر کو مار دیا ہوگا اسی لیے ہم نے اس کو بھی مروا دیا تھا لیکن اب پتا چلا کہ ملی دھر زندہ ہے۔ بہرحال اس کا بھی کوئی نہ کوئی علاج ہوجائے گا۔"

"ان سونے کی اینٹوں میں میرا کتنا حصہ ہوگا ممتاز صاحب؟" جویریہ نے پوچھا۔

"کیوں' تمہارا حصہ کیوں ہونے لگا۔" اس بار محمود بول پڑا۔ "یہ تو خالص ہمارا معاملہ ہے۔"

"خیر' اب تم جلدی سے بتا دو کہ وہ خزانہ کہاں ہے۔" ممتاز نے کہا۔ "تاکہ میں ان لوگوں سے سودا کرسکوں۔" یہ اشارہ اس نے ان غیر ملکیوں کی طرف کیا تھا جو اس کے ساتھ ہی کمرے میں داخل ہوئے تھے اور اب تک بالکل خاموش کھڑے تھے۔

"نہیں ممتاز صاحب۔" جویریہ نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتی۔"

"کیا بکواس کررہی ہو؟" ممتاز دہاڑ اٹھا۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔" جویریہ دھیرے سے بولی۔ "میں نے صرف یہاں تک آپ کا ساتھ دیا تھا کہ آپ میرے باپ کو گرفتار کرکے جیل میں رکھیں گے لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ آپ لوگوں کے کہنے پر ان پر تشدد بھی کیا جائے گا۔"

"بے وقوف لڑکی!" ممتاز دانت پیس کر بولا۔ "راز اگلوانے کے لیے اس بڈھے پر تشدد ضروری تھا۔"

"وہ آپ کا نقطۂ نظر تھا' آپ کا فعل تھا اور میرا فعل یہ ہے کہ میں اپنے باپ کا ساتھ دوں اور ان لوگوں کا ساتھ دوں جو آپ کی طرح کسی بڑے عہدے پر نہیں ہیں لیکن ان کے دلوں میں اپنے وطن کی محبت کے چراغ روشن ہیں۔"

"تیرا دماغ درست کرنا ہوگا۔" ممتاز غرایا۔ "شاید تو اپنے ہوش میں نہیں ہے۔"

جویریہ نے اسی وقت ایک چھوٹا سا پستول نکال کر اس کا رخ ممتاز کی طرف کردیا۔ "نہیں ممتاز صاحب' میں اب پوری طرح ہوش میں ہوں اسی لیے پوری تیاریوں کے ساتھ یہاں تک آئی ہوں۔"

ممتاز نے کچھ کہنا چاہا۔ اچانک باہر سے لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے کسی کی گونجدار آواز سنائی دی۔ "خبردار' اس مکان کو گھیرے میں لے لیا گیا ہے۔ سب لوگ ہاتھ اٹھا کر باہر آجائیں۔"

ممتاز اور محمود نے گھبرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"یہ...... یہ کون لوگ ہیں؟"

"وہ شریف اور ایماندار اہل کار جن کو یہاں آتے ہوئے میں نے اطلاع دے دی تھی۔" جویریہ نے کہا۔ "کیا آپ یہ سمجھتے تھے کہ میں اس سازش میں آپ کا ساتھ دے رہی ہوں؟ نہیں' میں آپ کے ساتھ صرف اس لیے تھی کہ ہر لمحہ آپ کے ارادوں سے باخبر ہوتی رہوں۔ اس وقت میں اتنی کمزور تھی کہ اپنے باپ کو بچانے کے لیے کچھ نہیں کرسکتی تھی لیکن اب بازی آپ کے خلاف ہوگئی ہے ممتاز صاحب۔ براہ کرم آپ لوگ باہر تشریف لے چلیں۔"

ممتاز اور محمود نے جھنجلا کر جویریہ کو گالیاں دینی شروع کردیں لیکن انہیں باہر آنا ہی پڑا۔

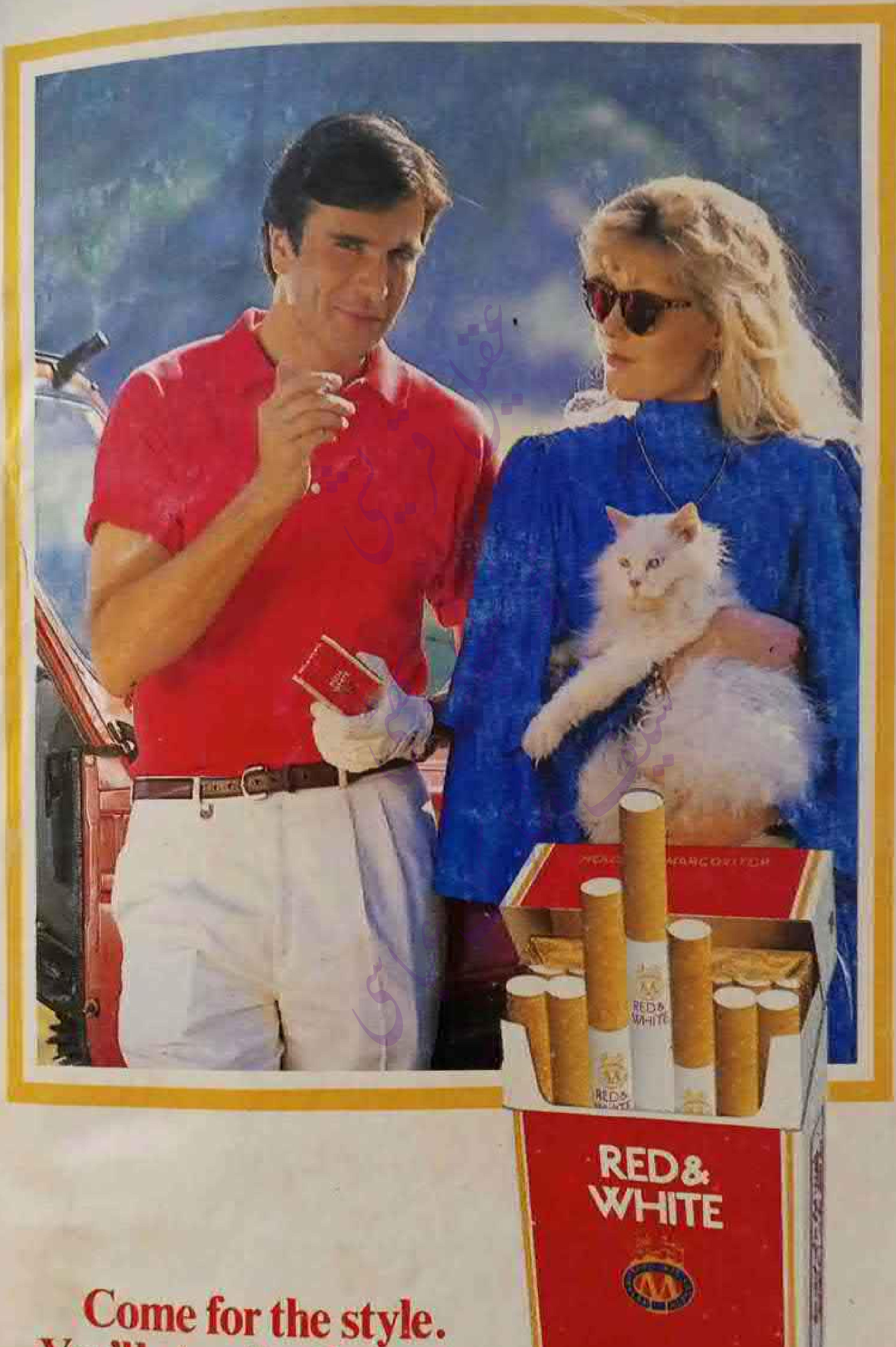
"خدا کی پناہ! تمہارے کتنے رنگ ہیں جویریہ؟" فرخ نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

"سیکڑوں۔" جویریہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "تم اس مناسبت سے مجھے گرگٹ بھی کہہ سکتے ہو۔"

"ایک بات یہ تو بتاؤ کہ جب تم شروع سے اپنے باپ کے ساتھ تھیں تو پھر وہ راز انہوں نے تمہیں کیوں نہیں بتایا؟" فیروز نے پوچھا۔

"صرف اس لیے کہ تمہاری طرح وہ بھی مجھے خراب سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میں کوئی گل کھلا دوں گی اسی لیے انہوں نے مجھے نہیں بتایا۔ جبکہ میں ایسی ہرگز نہیں ہوں۔ کیوں' کیا خیال ہے تمہارا؟"

"تم واقعی ایسی نہیں ہو۔" فرخ نے دھیرے سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔


RED &
WHITE
KING SIZE FILTER
Come for the style.
You'll stay for the taste.
SMOKING IS INJURIOUS TO HEALTH – MINISTRY OF HEALTH
ASIATIC

جاسوسی نشست

JASOOSI NASHIST